DUE DATE

Cl. No. ______________ Acc. No. ______________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

"ساقی"

"مشرقی پاکستان نمبر"

مرتبہ

شاہد احمد دہلوی

قیمت چار روپے



زمانۂ جدید کے عجائب



اِس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کب اور کس نے شعلہ کو دریافت کیا۔ آج یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہماری روزانہ زندگی کی اہم ضروریات میں دیاسلائی ایک ناگزیر چیز ہے۔

جو حضرات زیادہ روشنی، دیرپا شعلہ اور فوراً جلنے والی دیاسلائی کے خواہش مند ہیں اُن کی خدمت میں ہم اپنی دیاسلائی برائے امتحان پیش کرتے ہیں۔

دیرپا شعلہ کے لئے ایک دیاسلائی جلا کر دیکھئے۔

حبیب انڈسٹریز لمیٹڈ
ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر
شاہد احمد دہلوی
معاون
عاصمہ بیگم

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

ساقی

سالانہ چندہ
مع خاص نمبر
پاک و ہند دس روپے
قیمت چار روپے

جلد ۶۷ | ساقی کراچی "مشرقی پاکستان نمبر" | نمبر ۳

بھارت میں ثقافت کا چندہ بھیجنے کا پتہ :- بیگم جلال قاری، قاری ہاؤس، مٹیا محل، دہلی۔

شاہد احمد دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

نگاہِ اوّلیں

چار سال ہوئے ڈھاکہ کے چند اولوالعزم نوجوان ادیبوں نے بڑی دھوم دھام سے "یومِ خسرو" منایا تھا، اور اُس کی صدارت کا اعزاز مجھے بخشا تھا۔ "یومِ خسرو" کی تقریبات سے فارغ ہونے کے بعد انہی نوجوانوں نے شکایت کی تھی کہ مشرقی پاکستان کے اُردو کے ادیبوں کو مغربی پاکستان کے ادبی رسائل نے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ ساقی البتہ کسی قدر اشک شوئی کر لیتا ہے۔ میں نے اُن سے عرض کیا تھا کہ آپ اپنے آپ کو اِس لائق بنائیے کہ مغربی پاکستان کے رسائل بہ اصرار آپ سے مضامین طلب کرنے لگیں۔ میری یہ صاف گوئی بعض دوستوں کو اچھی نہیں لگی۔ فوراً ہی انہی میں سے ایک صاحب نے ساقی کا "مشرقی پاکستان نمبر" شائع کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ میں نے کہا "بسم اللہ، مضامین آپ حضرات فراہم کر دیجئے، مشرقی پاکستان نمبر چھپ جائے گا۔ مگر میں لگے ہاتھوں آپکو یہ بھی بتا دوں کہ یہ کام بھی آپ سے ہوگا نہیں، کیونکہ کام جذبات سے نہیں عمل سے ہوتا ہے۔" میں نے انہیں ترغیب اس لئے دی تھی کہ وہ واقعی کچھ کام کر کے دکھائیں۔ اُنہوں نے بڑے زور سے وعدے کئے اور مجھے یقین دلا کر رخصت کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نے بیسیوں خط یاد دہانی اور تقاضوں کے لکھے مگر صدائے بر نہ خاست۔ پچھلے سال انہی دنوں میں ایک مذاکرہ میں شرکت کیلئے ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے اُن میں سے اکثر نوجوانوں کو اُنکا وعدہ یاد دلایا۔ اُنہوں نے پھر مجھے یقین دلایا کہ اب کے ہم سب مِل کر کام کریں گے۔ میں نے محکمہ تعمیرِ نو کے افسروں سے بھی اِس خاص نمبر کی بات کی اور اُنہوں نے اس کے لئے کافی مواد بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔ میں نے کراچی واپس ہو کر "مشرقی پاکستان نمبر" کا اعلان کر دیا۔ اسکے بعد جو مجھے شدید مایوسی ہوئی اُس کی تفصیل نا قابلِ بیان ہے۔ میں چاہتا تو ایک اور اعلان کر کے اِس تجویز کو منسوخ کر دیتا مگر میری ضدّی طبیعت نہ مانی اور میں نے ایک ایک کا مُنہ تکنے کے بجائے چند احباب کی قلمی امداد سے ایک سال میں یہ خاص نمبر مکمّل کر لیا۔ اِن میں سے جناب سلیم اللہ فہمی، جناب وحید قیصر ندوی، جناب عابد دانا پوری، جناب افسر ماہ پوری، پروفیسر سعد مُنیر، یونس احمر صاحب، نسیم احمد صاحب اور محمد عیسٰی صاحب کا بطورِ خاص شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کر کے اِس خاص نمبر کے لئے کئی کئی مضامین عنایت فرمائے۔ میں جناب رفیق خاور، اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ مطبوعات (حکومتِ پاکستان) کا بھی نہایت شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے "ماہِ نو" کے چند منتخب مضامین بڑی تلاش سے مُہیّا کئے۔ میرے شکریہ کے مستحق وہ سب حضرات بھی ہیں جن کے مضامین اِس پرچے میں شامل ہیں۔ اُنکی شمولیت کے بغیر یہ خاص نمبر اِتنا رُودار نہ بنتا جتنا اب بن گیا ہے۔ اُردو میں کوئی کتاب یا رسالہ ایسا نہیں ہے جو مغربی پاکستان والوں کو اپنے مشرقی پاکستان کے بھائیوں کی مفصّل کیفیت بتائے۔ بارہ سو میل کے فصل نے دونوں کے درمیان معاشر اور علمی کی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ حکومت تو اِس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کر ہی رہی ہے مگر ہم ادیبوں پر بھی اِس بے تعلّقی کو دُور کرنے کی بہت بڑی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ ساقی کے مشرقی پاکستان نمبر کو اسی جہت میں ایک مفید اقدام سمجھئے۔ مجھے اِس کا اقرار ہے کہ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے مکمّل نہیں ہے، مشرق اور مغرب کے درمیان اسکی حیثیت صرف تعارفی سمجھ لیجئے۔ کچھ نہ جاننے سے کچھ جان جانا بہرحال بہتر ہے۔

سلیم اللہ فہمی

تمدّن

بیگانے ہی نہیں، اپنے بھی مشرقی پاکستان سے ناواقف ہیں۔ قیاس آرائی، تخیل کی کارفرمائی اور خوف و شبہ نے تصویر کے حقیقی خدوخال بگاڑ ڈالے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ اس کی فطرت ہمیشہ غلط سمجھی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا مطالعہ آسان نہیں۔ نشیب کی تہذیب نرم خیز ہی نہیں تیز گام بھی ہوتی ہے، اس میں ایک لچک ہوتی ہے، نرمی ہوتی ہے، ٹھہراؤ ہوتا ہے، یہاں انقلاب سینوں میں پرورش پاتا ہے۔ چراغ تہِ داماں جلائے جاتے ہیں۔ شعلے بھی لپکتے ہیں۔ لیکن زندگی یہاں چند لکیروں میں ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ نشیب اور فراز کی تہذیبوں میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ فراز کی تہذیب بڑی سادہ ہے۔ اس میں زندگی کی پیچیدگیاں، تجربات کے پیچ و خم، فکر رستخیز پائی نہیں جاتی۔ ہاں تہذیب میں ابھی تک گاڑھا پن ہے۔ شراب کھینچ کر دو آتشہ نہ ہو سکی اور صرف یہی نہیں مشرقی پاکستان کا مطالعہ یوں بھی دشوار ہے کہ یہاں ایک نہیں دو تمدّن محیط ہیں۔ ایک تہذیب وہ جو میناروں، کنگروں، کالجوں اور اسکولوں کی عمارتوں، فراخ اور کشادہ سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے، اس میں ایک اَل بَل ہے، بھبک ہے، جوش ہے، گرمی ہے، یہ تہذیب بجلی کے قمقموں، ایرانی غالیچوں، اسپرنگ کے گدّوں میں پروان چڑھتی ہے۔ دوسری تہذیب وہ ہے جو دھان کے کھیتوں میں پھولتی پھلتی اور پھیلتی ہے۔ تالاب کے کنارے ناریل کے لانبے لانبے سڈول درختوں کے جھنڈ اور پس منظر میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے دھان کے لہلہاتے کھیت، ابر آلود فضا میں جھومتے ہوئے ڈلی کے پیڑ اور سبز شاداب درختوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں، یہاں زندگی کی جڑیں زمین میں گڑی ہوتی ہیں اور ان دونوں تہذیبوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک تہذیب تنگ نظر ہے اور دوسری کی وسعت نظر پر اُفق بھی گراں۔

ہم آپ جس تہذیب سے آشنا ہیں، وہ شہری تمدّن ہے۔ یہ شہری تمدّن نسبتاً بالکل جدید ہے۔ اس کی تاریخ کی ابتدا اس وقت سے ہے جب حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے آزادی کا چراغ جلانے کے لئے خونِ جگر کا مطالبہ کیا تھا۔ اور مشرق کے اسی خطّہ کی نوجوان رگوں نے رنجیت سنگھ کے مقابلے میں سرزمین پنجاب پر مسلمانوں کی لاج رکھ لی تھی۔ لیکن وہابیت کی تحریک آزادی اس قدر ہمہ گیر تھی کہ اس کی لپیٹ میں انگریز کا آجانا ایک لازمی امر تھا۔ انگریز کو اگر حکومت کرنی تھی تو اس تحریک کا کچل ڈالنا اُس کا فرض اوّلین تھا۔ پھر تو انگریز سپاہی کی سنگین اور غیر مسلم مہاجن کی تجوری نے سازش کی۔ ایک مسلمان کا مادّی وجود فنا کرنا چاہتی تھی اور دوسری روحانی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ کلکتہ میں پاٹ کے کارخانے کھلے۔ ناریل کا تیل نکلنا شروع ہوا۔ سلہٹ کے سنگتروں کے چھلکوں سے تیار شدہ بیسن کے غازے نے اس شہر کے صبیح و ملیح چہروں کا رنگ نکھارنے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور ریل کی پٹریوں میں مشرقی بنگالہ کے دوڑتے ہوئے خون نے ہوگلی کے دوسرے کنارے شفق میں گھل مل کر کلکتہ کی فضاؤں کو رونق بخشنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

مشرقی پاکستان کا مسلمان غیور اور شجیع تھا۔ اسکی عصبیت دشمنوں کے ہاتھ شکست تسلیم کرنا گوارا نہ کرسکتی تھی۔ اس نے انگریز کے دسترخوان سے پھینکی ہوئی ہڈیاں چوسنے سے انکار کردیا۔ نانِ جویں پر قانع قوم، مردِ گرم چشیدہ سراج الدولہ کے ساتھ جان دینے پر آمادہ۔ جب کلائیو نے اس کی رگوں کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ لیا تو بھی اس کا دماغ کام کرتا رہا۔ نشیب کا تمدن سیف چھوڑ کر جب اس نے قلم اٹھایا تو وہ وہ حسین نقش و نگار پیدا کئے کہ عقل و نگاہ آج تک دنگ ہے۔ مشرقی پاکستانی کے دیہاتوں کا تمدن اب بھی اسلامی ہے۔ اور اس قدر شدید قسم کا اسلامی کہ دوسرا کٹر سے کٹر اسلامی ملک بھی اس کا جواب نہیں۔ یہی نہیں، اسلام اس کی تہذیب میں ہمیشہ پس منظر کی حیثیت سے موجود رہا ہے اور کیوں نہ ہوتا جبکہ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام مشرقی پاکستان میں آیا۔ محمد بن قاسم سے بہت پہلے عرب تاجر ساحل مالابار، کارومنڈل اور مشرق بعید سے تجارت کررہے تھے۔ ان کا بحری کارواں چاٹگام کے سواحل پر آکر ٹھہرتا تھا۔ اور ان ہی مسلمان سوداگروں کے پاکیزہ اخلاق نے مشرقی پاکستان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ قدیم روایتیں اور قلمی نسخے اس بات پر شاہد ہیں کہ سندھ سے بہت پہلے اسلام یہاں آیا۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے زمانے میں حضرت شاہ جلالؒ یمنی نے اس ولایت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ ان ہی جیسے بزرگوں کا فیض ہے کہ سلہٹ اور ڈھاکہ میں بالخصوص، اور دوسرے مقامات میں بالعموم مساجد اور مزارات کی وہ بہتات ہے جو ہند و پاکستان کے کسی شہر کو نصیب نہیں۔ یہاں کا مسلمان دیندار ہے۔ جہاد کا جذبہ اس کی میراث ہے۔ اس کے آرٹ میں مجاہدؒ ایک عنوان ہے جو بار بار آتا ہے وہ مٹی کے حسین کھلونوں میں مجاہد کے قصے پیش کرتا ہے، اس کے تماشے یہ ہیں کہ مجاہدوں کے کارناموں کی قلمی تصاویر، فنکار دیہاتوں میں دکھاتے پھرتے ہیں۔ جہاں بچے، جوان، بوڑھے جوق درجوق جمع ہوتے ہیں اور اس عنوان پر رقص کرتے ہیں۔ اس کے رقص، اسکے گیت، اس کے "آلہ اُددل" میں جو دلکشی، رنگینی اور زندگی پائی جاتی ہے وہ دُنیا کے بہترین ادب میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ چوپال کے اردگرد سادہ لوح، زود یقین قدرتی فن کاروں کا مجمع جب منظومانہ استعاروں میں گاتا ہے تو راز و نیاز کا کونسا پہلو ہے، حسن و محبت کی کون سی واردات ہے، جذب و سرور کی کون سی کیفیت ہے جو دل پر گزر نہیں جاتی۔ اور اس کی شاعری میں کیا نہیں؟ تالاب کے کنارے ناریل کے درخت، دھان کے لہلہاتے کھیت، ڈلی کے درختوں کی شرمیلی قطاریں، کیلے کے پیڑوں کی حسین صفیں، اور پھر پس منظر میں بل کھاتی ہوئی موج در آغوش ندیوں کا خرام، ہرے کے ہرے جھاڑ، کشتیوں کی سُبک رفتاری، بڑے بڑے جالوں میں تڑپتی ہوئی سیماب پیکر مچھلیاں، اُفق میں لہراتے ہوئے اُودے نیلے پیلے بادبان اور پھر کشتیوں کا مقابلہ، اور مقامی رنگ ہی نہیں اس کا مرثیہ جسے وہ کتنے پیارے نام سے پکارتا ہے۔ "زاری" تصوف میں ڈوبی ہوئی اسکی معرفتی اور مُرشدی دُھنیں، غرض کیا ہے جو نہیں ہے؟

یہ تصور کرنا غلط ہے کہ بنگلہ میں اسلامی ادب اور اسلامی رُوح نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بنگلہ زبان اپنی تخلیق اور نشو و نما کے لئے مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔ اس صوبہ سے باہر بنگلہ سے معاشرت کا یہ عالم تھا کہ بنارس کے پنڈتوں نے یہ فتویٰ صادر کردیا تھا کہ اس زبان میں دید او پران پڑھنے والوں کا ٹھکانا سوائے نرکھ کے اور کہیں نہیں جسین شاہی سلطنت کے زمانے میں بنگلہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ فارسی سے بنگلہ اور بنگلہ فارسی تراجم کی بنا پڑتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے آن دنوں بنگلہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، داہنے سے بائیں

پوتھی خاص طور پر اسی رسم الخط میں ہے۔ یہ ادب اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بنگلہ کی یہ قدیم ترین کتابیں کابر اسلام کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ حکومت پاکستان اب پھر اسی پرانی ڈگر پر چلنے کا ارادہ رکھتی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تجربہ بنگلہ ادب کے لئے کوئی نئی چیز نہ ہوگی۔

لیکن یہ تذکرہ تھا دیہات کے تمدن کا۔ شہری تمدن میں بعض عناصر ذاتی مفاد کی خاطر نفاق کی چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جہاں انفرادیت بڑی نمایاں ہے۔ ایسے جاہ پسندوں کو مواقع بھی یوں حاصل ہوگئے کہ یہاں کی نئی پود اسلام اور اسلام کے کارناموں سے اتنی ہی بے خبر تھی جتنی دوسرے ممالک میں۔ اپنی روایات سے اُس نے مُنہ موڑ لیا۔ بدقسمتی سے جدید بنگلہ ادب کی دلنوازا ور قدرتاً ہندوانہ طرز نگارش اور روایات سے بے خبری نے موجودہ پود کے فکری میلان کے لئے جو شاہراہ نکالی اُسے اہلِ کعبہ نے اس لئے ترکستانی سمجھ لیا کہ وہ کعبہ کی جانب نہ تھی۔ اور اہلِ ترکستان نے متضاد اسباب کی وجہ سے یہ سمجھ لیا کہ وہ عرب جاتی ہے۔ حالانکہ واقعہ صرف اس قدر تھا کہ یہ آزاد اور خودسر ہے۔ اس میں مشرقی پاکستان کی انفرادیت ہے جو بے راہ ہوگئی ہے۔ شک و شبہ نے اس پود میں خواہ مخواہ ایک احساس دغا پیدا کر دیا ہے جس کے دُور کرنے کا طریقہ محبت ہے نہ کہ نفرت۔

شاعر نامہ

مُصنّف :- محشر بدایونی

پبلشر :- ریپلیکا پبلی کیشنز۔

مانڈوی والا لین۔ صدر کراچی

قیمت چھ روپے۔

جناب محشر بدایونی جدید غزل گو شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بچوں کے نہایت کامیاب شاعر بھی ہیں۔ ننھے بچوں کی ذہنیت کو ملحوظ رکھکر ایسی نظمیں کہنا جو انکو اخلاق بھی سکھائیں اور اُنکا دل بھی بہلائیں آسان کام نہیں۔ مگر محشر صاحب کی کتاب "بین باجے" دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کام میں ذرا بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ بھلا بچوں کے کھیل کود، اُنکی بھولی بھولی اور کبھی کبھی اُلٹی پلٹی باتیں، سیدھے سادے لفظوں میں نظم کر دینا کون مشکل بات ہے۔ مگر یہ فہم کا فریب ہے۔ ان نظموں کی کیفیت سہل ممتنع اشعار کی سی ہے کہ بظاہر ان کا لکھنا آسان معلوم ہوتا ہے مگر جب لکھنے بیٹھیں تو لکھ نہ سکیں۔

محشر صاحب نے ننھے بچوں کی شاعری کی اس روایت کو قائم رکھا ہے جسکی ابتدا اسمٰعیل میرٹھی نے کی تھی، اور جسکو الوالاثر حفیظ، اختر شیرانی، مولانا چراغ حسن حسرت اور صوفی تبسم نے پروان چڑھایا۔

"شاعر نامہ" محشر صاحب کا تازہ کارنامہ ہے۔ یہ ایک منظوم تذکرہ ہے جسمیں اُردو کے پچاس سربرآوردہ شعراء ان کے سوانح اور انکے کلام کی خصوصیت قلم بند کی گئی ہیں۔ یوں تو یہ کتاب بچوں اور بڑوں سبھی کیلئے ہے۔ مگر طلباء خصوصیت کے ساتھ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ بیان جب ردیف اور قافئے میں منضبط ہو جاتا ہے تو اس کا یاد کرنا سہل بن جاتا ہے۔

(غلام عباس)

سلیم اللہ فہمی

دیہاتی زندگی

مشرقی پاکستان کی آبادی کا پانچ فی صد سے بھی کم حصّہ شہروں میں آباد ہے۔ باقی دیہاتوں میں جاگزیں ہے۔ شہر کی فضا میں آپ کو بیرونی اثرات کا تموّج نظر آئے گا۔ لیکن یہی موجیں صدیوں سے دیہات کی فصیل پر سر پٹک پٹک کر ناکام لوٹ رہی ہیں۔

اسلام مشرقی پاکستان میں محمد بن قاسم سے بہت پہلے آیا۔ مُسلمان تاجروں نے یہ پُودا لگایا۔ اور اولیاء اللہ نے اسے پروان چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات میں اب تک لوگ شدید قسم کے مُسلمان ہیں۔ اور اسلام کی جڑیں یہاں بڑی گہرائی تک زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔ فطرت نے اس خطے کے سنگار میں بے انتہا فراخدلی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر لوگوں کی طبیعت میں گُداز کی صورت مستحکم ہو کر رہ گیا ہے۔ دریاؤں کی تیز روانی، ندیوں کا پیچ و خم، سبزہ کی فراوانی، بادلوں کا جھُومنا، دھان کے کھیتوں کا لہلہانا اپنا جادو جگائے بغیر نہ رہ سکا۔ موسیقی یہاں کے ہر ذرّہ پر ثبت ہو کر رہ گئی ہے۔

مشرقی پاکستان کے دیہات کا تمدّن نرم خیز ہی نہیں، تیز گام بھی ہے۔ ان دیہاتیوں کے سینے ملّی جذبات سے بیگانے نہیں ہیں۔ آج بھی اسلام کے نام پر پروانگی کی تمنائیں چنگاریوں کی صورت میں دبی، لیکن جیتی جاگتی موجود ہیں۔ سمندر کے سینے پر اب بھی ان کے نقش پا ہر جگہ پھُول بکھیر رہے ہیں۔

دیہات کی زندگی بہت ہی سادہ ہے۔ زمینداروں کا طبقہ صوبہ کے بڑے بڑے شہروں میں رہتا ہے۔ "جوت دار" قسم کا معمولی زمیندار دیہات ہی میں رہتا ہے اور کچھ کاروبار بھی پھیلا کے ہوتا ہے۔ یہ لوگ "بڑے میاں" کہلاتے ہیں۔ دیہاتوں کے مشیر اور ناصح کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جس کے افراد کاج کاروبار یا نوکری ملازمت کے سلسلے میں باہر ہی رہتے ہیں اور کبھی کبھی آتے ہیں۔ لیکن بڑا اور اصل گروہ وہ ہے جو کھیتی اور مزدوری سے اپنا گُذارا کرتا ہے اور آج ان کا ذکر ہی کرنا مقصود ہے۔ غریبوں کی کثیر العیالی تو بہت ہی پریشان کُن مسئلہ ہے۔ لیکن اولاد کی یہی کثرت بیشتر خاندانوں کے لئے باعث برکت بن جاتی ہے۔ کھیت میں کام کرنے کے لئے مزدوروں کی احتیاج نہیں ہوتی۔ جن بے چاروں کے یہاں آدمی کم ہوتے ہیں اُن کے لئے مصیبتیں زیادہ ہیں۔

چھوٹے بڑے سب ہی عموماً کُرتے اور قمیصوں سے بے نیاز رہتے ہیں۔ جُوتے اور سلیپر کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ تہ بند جو عرب سے ورثہ میں آیا، لُنگی کی شکل میں ساری وجاری ہے۔ تقاریب ہوں یا مجالس، سیر کرنی ہو یا مُلاقاتیں، جسم پر یہ بے جا بار ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔ دیکھئے بڑے میاں بیٹھک میں بے تکلف حقّہ لئے چلے آ رہے ہیں۔ پُوری محفل میں یہ بے جان بولنے والا بلا تفریق و امتیاز چکّر لگاتا ہے اور سب کو ممنون کرتا ہے۔ غیر مسلم کا بھی یہی حال ہے۔ ہاں لُنگی کی جگہ دُھوتی ہے۔ داماد کے لئے "جامائی" کا لفظ مُستعمل ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف شادی ہی کے موقع پر یہ کپڑے پہنتا ہے۔ اور اسی لئے جامہ پوش کہلاتا ہے۔

پاٹ کی کاشت کوئی کھیل نہیں، اسے سڑانا پڑتا ہے۔ کمر کمر، کبھی گلے گلے، پانی میں دن رات کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہیں کے بلند ہمت اور سخت جان کسان کا دم خم ہے، کہ تعفن، کیچڑ، دھوپ اور بارش، سب کا مقابلہ تنہا کرتا ہے۔ اور پیشانی پر دیکھئے تو ذرا بل نہیں۔ عالم یہ ہے کہ حرارت عزیزی ۱۰۲/۱۰۳ ہے، لیکن کیا مجال کام ذرا دیر کیلئے بھی بند ہو جائے۔

افسوس یہاں صرف ایک بات کا ہوتا ہے کہ "بڑے میاں" شادی بیاہ کے معاملہ میں کسان مزدور گھرانوں سے ناطہ کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ عید کے دن البتہ یہ تفریق غائب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے گھر جائے، میٹھا کھائے اور کھلائے۔ بڑوں کی قدمبوسی کرے، چھوٹے بڑے سب کو گلے لگائے۔ قبروں کی زیارت اور ان پر فاتحہ خوانی کرے۔ اُس دن کے اختلاط اور پُرخلوص اختلاط کی رُوح پرور فضا سے رُوح کو بالیدگی ہوتی ہے۔ بقرعید کے دن قربانی بڑی ضروری چیز سمجھی جاتی ہے۔ جن کو اتنی استطاعت نہیں وہ دوسروں کے ساجھے میں یہ فریضہ بڑی پابندی سے ادا کرتے ہیں۔

محرّم کی دسویں تاریخ کو ہر گھر سے روٹی، کھچڑی، کھیر وغیرہ ایک جگہ آتی ہے۔ رات بھر جاری (زاری) گانا ہوتا ہے۔ یہ یہاں کا نوحہ اور مرثیہ ہے۔ عورتوں کے لئے بھی سننے کا انتظام ہوتا ہے۔ چقوں کے پیچھے ان کی کافی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن لاٹھی کے کھیل ہوتے ہیں۔ شب برات میں عموماً انفرادی طور پر ہر گھر میں میلاد شریف پڑھا جاتا ہے اور مُردوں کی رُوح کے لئے ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے جس تہوار میں سب سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے وہ فاتحہ دوازدہم کی مبارک تقریب ہے۔ عشرہ پہلے سے تیاری شروع ہوتی ہے۔ ایک مقام پر بہت بڑا شامیانہ لگایا جاتا ہے اور تاریخ ولادت و وصال آنحضرت صلعم سے لیکر دس دن تک متواتر بڑے پیمانے پر میلاد شریف کی محفل منعقد ہوتی ہے جس میں اچھے واعظ اسلام کے متعلق تقریریں کرتے ہیں۔

اور ایک جشن بڑی دھوم دھام سے قیام پاکستان کے بعد سے منایا جا رہا ہے۔ وہ یوم آزادی کا موقع ہے۔ قائداعظمؒ آزادی پاکستان ان موضوع پر بہت سے گانے تصنیف ہو چکے ہیں۔ عام جلسے ہوتے ہیں۔ ان میں یہ گانے گائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر خاص طور پر گھوڑوں کی دوڑ، اور عام طور پر باچ (بازی) یعنی کشتی کی ریس، لاٹھی کے کھیل، سائیکل ریس۔ اور مختلف قسم کے اسپورٹ ہوتے ہیں۔ انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ چاہے چار آنے والے مڈل (تمغہ) ہی کیوں نہ ہوں مسلمان ہندو سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ بلکہ گانے کے معاملہ میں غیر مسلم ہی پیش پیش معاون ہوتے ہیں۔ رات بھر "کوبی گان" یعنی شاعروں کے گانے ہوتے ہیں۔ پیغمبروں کے سوانح اور کارنامے گائے جاتے ہیں عموماً مقابلہ دو شاعروں میں ہوتا ہے۔

برسات کے زمانے میں نو کا باچ یعنی کشتیوں کی بازی" ایک عجیب و غریب چیز ہوتی ہے۔ پتلی لانبی کشتیاں سجی سجائی پیتل کے چمکیلے ٹکڑوں سے مزین جمع ہوتی ہیں۔ ان کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تیز رفتاری کا اندازہ صرف دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ گانے بجانے میں بڑی افراط برتی جاتی ہے۔ ہارنے والا بھی گاتا ناچتا ہے اور جیتنے والے کا پوچھنا ہی نہیں، فی البدیہہ اشعار گائے جاتے ہیں، جنہیں گیت اور چھڑا بھی کہتے ہیں۔

"غازی" مجاہد کے گانے بہت ہی مقبول تھے۔ ہر موقع پر گائے جاتے تھے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے ان کا رواج آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ قبرپرستی کچھ زیادہ ہی تھی۔ لیکن اب مولویوں کا نظریہ

اس قدر بدل چکا ہے کہ اس کام کو "بے شعورا یعنی بے تہوع" تبادیا گیا ہے۔ پہلے تو قبریں دودھ سے دھوئی جاتی تھیں۔ مٹھائیاں چڑھتی تھیں۔ منتیں مانی جاتی تھیں۔ سجدے ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کا یہ بھی ایک ادنیٰ کرشمہ ہے کہ یہ بدعتیں آج قریب قریب مفقود ہیں۔ بزرگوں کی قبروں پر عُرس کا رواج اب تک ہے۔ لیکن اب ہوتا یہ ہے کہ سات دن تک اسم پڑھے جاتے ہیں، فاتحہ خوانی ہوتی ہے اور مُرشدی اور معرفتی قسم کے لوک سنگیت گائے جاتے ہیں۔

کھیت اور کھلیانوں میں کام کرتے، کشتیاں کھیتے غرض ہر موقع پر گانوں کا بے حد رواج ہے۔ بھٹیالی ساری جاری، بادل، مُرشدی، معرفتی وغیرہ لوک سنگت ہر شخص کو سیکڑوں زبانی یاد ہوتے ہیں اور جو گاتا ہے، جی کھول کر گاتا ہے۔ موسیقی ان کی گھٹی میں ہوتی ہے، بیاتی یعنی شاعر گویّے دیہات سے دیہات جاتے ہیں۔ نئے سے نئے گانے سات دن تک سناتے ہیں۔ وہاں چاول، پیسے جو مِل گیا سمیٹا، اور دوسرے گاؤں چل کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک مدّت تک موسیقی کا طوفان بپا رہتا ہے۔ جسے دیکھئے یہ نئے نئے گانے گاتا ہی رہتا ہے۔

گانا، بانسری بجانا، پان کھانا، تمباکو کے پتے چبانا، حُقّہ پینا، ہر بڑے بُوڑھے اور بچّے کی فطرت میں داخل ہے۔ پاٹ کی فصل میں ان تمام چیزوں میں مصروفیت اسراف کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

پرندوں کا شکار بھی ان کا خاص مشغلہ ہوتا ہے۔ فاختہ، کوڑہ (ایک خاص قسم کی چڑیا) خاص طور پر جاذبِ توجّہ ہیں۔ لاسہ لگا ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جنگلوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ کافی تعداد سانپ کے کاٹے جانبر نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی اُمنگوں کا ہیجان قائم رہتا ہے۔ چڑیوں کی بولیوں کی نقل اُتارنے میں عجیب مہارت ہوتی ہے۔ بیل گائے، ہرن، بندر سب کی بولیاں بڑی کامیابی کے ساتھ اصل کے بالکل مطابق بول لیتے ہیں۔

مچھلی مارنا تو ایک فرض ہے جو ہر چھوٹے بڑے پر عائد ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر شست، جال، ٹوکریوں، بانس کے پنجروں، وغیرہ سے شکار ہوتا ہے لیکن اجتماعی طور پر اکثر ایک خاص لُطف انگیز منظر قائم کیا جاتا ہے۔ ہاٹ میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں دن فلاں جھیل یا فلاں دریا میں مچھلی ماری جائیں گی۔ اب جسے دیکھئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ ایک بھیڑ ہو جاتی ہے، بڑے چھوٹے ہر طرح کے جال پڑ رہے ہیں۔ بعض جال تو اتنے بڑے ہوتے ہیں، کہ پچاس پچاس آدمیوں کے بغیر سمیٹے نہیں جاسکتے۔ سیماب پیکر مچھلیوں کا اُچھلنا بڑا دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔

روزمرّہ کا معمول یہ ہوتا ہے کہ "جمعہ گھر" (جامع مسجد) سے صبح کی اذان سُنائی دی۔ سب جاگ اُٹھتے ہیں۔ حوائج ضروری سے فراغت کی۔ مُنہ ہاتھ دُھویا، وضو کیا۔ بیشتر لوگ مسجد چلے گئے، ورنہ گھر ہی میں فجر کی نماز ادا کر لی۔ اس سے فارغ ہوئے تو جانوروں کی دیکھ بھال کی۔ ناشتہ کیا۔ چائے، مکھن، گوشت نہیں، "موڑھی" (بھُنے ہوئے چاول)، "چیڑہ" (چوڑہ) لیکن بیشتر لوگ پنتھا بھات کھاتے ہیں۔ یہ یا تو پانی میں بھیگا ہوا رات کا بھات ہوتا ہے یا پچھلے پہر پک جاتا ہے، اور پانی ڈال کر رکھ دیا جاتا ہے۔ نمک، مرچ، یا گُڑ کے ساتھ سیر ہو کر کھا لیا۔ اور جانوروں کو لے کر کھیتوں میں چلے گئے۔ دس بجے کے قریب لوٹے، غُسل کیا اور گیارہ بجے کے اندر اندر مچھلی، ترکاری، بھات کھا کر نکل پڑے۔ خود اپنے کھیت گئے یا پھر کسی کی مزدوری پر نکلے یا کسی کی مزدوری کا بدلہ اُتارنے کو چل پڑے۔ جانور صبح سے باہر ہی رہتے ہیں۔ مغرب سے کچھ پہلے اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر جانوروں کو لئے لوٹ آئے۔ گرمیوں کے دن

ہوئے تو پھر غسل کرلیا۔ کھانا کھایا۔ جی چاہا تو ملنے ملانے چلے گئے۔ نہیں تو بیٹھے بیٹھے گانا شروع کردیا۔ ایک بات یہاں بتانے کی ہے کہ کراسن تیل اور کہیں کہیں نمک بھی باہر سے منگانا پڑتا ہے ورنہ زندگی کی تمام ضروریات خود دیہات ہی میں پیدا یا تیار ہوجاتی ہیں۔

دیہات کی عورت مجسّم فرمانبردار ہوتی ہے، کبھی کبھی پٹتی بھی ہے، لیکن اُف تک زبان پر نہیں لاتی۔ جانتی ہے کہ اگر "سچار" بھی مانگا تو نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ پردہ جیسا ہونا چاہیئے ویسا ہی ہوتا ہے، باہر نکلتی ہیں لیکن گھونگھٹ پڑا ہوتا ہے، ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا معمول میں ہے۔ خاص طور سے عیادت بڑے خلوص سے ہوتی ہے۔ غمی خوشی میں ایک دوسرے کی ساتھی ہوتی ہیں، پکانا، ریندھنا، مانجھنا، گھِسنا، جھاڑو بہارو، یہاں تک کہ گائے کا دودھنا انہیں کے حصّے میں آتا ہے۔ گھر کے کام تو خیر اپنی جگہ پر ہیں۔ فصل میں کھیتوں میں بھی بڑی مُستعدی سے مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

مہمان نوازی تو عربوں کی سیکھائی ہوئی ہے جس کی مشق آج بھی جاری ہے۔ آپ پردیسی اجنبی مُسافر ہیں، ایک گھونٹ پانی آپ نے مانگا۔ کیا مجال پانی آپ کو مل جائے۔ دودھ نہ تو دودھ ضرور، اس کے ساتھ کچھ نہیں تو کم از کم "مُوا" (بھُنے ہوئے چاول کے میٹھے لڈو) یا پھر بتاشہ یا گڑ ہی سہی، آپ کو نوش فرمانا پڑے گا۔ جب جا کے پھر کہیں پانی ملے گا۔ آپ نے اگر اس ناشتے کی قیمت ادا کرنی چاہی تو وہ اسے اس حد تک اپنی توہین محسوس کریں گے کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں گے عورتیں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتیں۔ بہتر سے بہتر کھانا جو ممکن ہو سکا پکایا۔ پانی تمباکو حقّہ تو منٹ منٹ پر آپ کے لئے اندر سے آتا ہی رہے گا۔ کام کرتے کرتے عورتیں تنہا یا کئی ایک مل کر گاتی بھی رہتی ہیں اور فرصت کے اوقات میں تو گانا اُن کے لئے بیحد ضروری فریضہ ہے۔ اور ایک چیز جو یہاں کی عورتوں کے حصہ میں خاص طور سے آئی ہے وہ منقش کاڑھی ہوئی موٹی سوزنی کی تیاری ہوتی ہے۔ سوئی سے عجیب و غریب کام بناتی ہیں۔ نقش ونگار، پھول پتے، تاج محل، مسجد، کوئی سین گھر یا بازار کا۔ ایک سوزنی ایک عورت کی عمر بھر کا کام ہوتی ہے۔ اور بعض سوزنی تو کئی پُشتوں کی محنت سے مکمّل ہوتی ہے۔ بڑا صبر اور بے انتہا استقلال درکار ہوتا ہے لیکن یاد رکھیئے یہ مشرقی بنگالہ کی عورت ہی کا لطیف گُداز اور نازک دل ہے جو اس قسم کے جادو جگا سکتا ہے۔

موسیقی (بقیہ سلسلۂ صفحہ ۱۵)

اور دماغی صلاحیتوں میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا۔ پاکستان کے دوسرے بازو میں بسنے والے بھائیوں کی تمدّنی روایات پر بھی ان کی نظر پڑی۔ اور جذبات اخوت نے انہیں اپنانے پر یہاں کے عوام کو مائل کیا۔ موسیقی بھی اس عام تحریک سے علیحدہ نہ رہ سکی۔

یہاں کے عوام نے سب سے پہلے قوالی کو اپنانے کی طرف توجّہ دی۔ اور بنگلہ زبان میں اس صنف کا آغاز ہوا۔ بنگالی قوالی کی صفات بھی وہی ہیں جو اُردو یا فارسی قوالیوں کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد جس طرح ہماری اُمنگوں اور حوصلوں میں ایک نئی توانائی اور زندگی آئی ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کی موسیقی بھی ایک نیا رُوپ اختیار کر رہی ہے، اس رُوپ میں اسلامی تصوّرات، ہماری دیرینہ روایتوں اور روشن تمدّن کی جھلک موجود ہے۔

سلیم اللہ فہمی

موسیقی

مشرقی پاکستان کی فضا کو حسین سے حسین تر بنانے میں فطرت نے بڑی دریا دلی سے کام لیا ہے۔ اس سرے سے لے کر اُس سرے تک صوبے میں دریاؤں اور ندیوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ان کی موجودگی نے مشرقی پاکستان کا حُسن دوبالا کر دیا ہے۔ عجیب رُومانی مناظر ہیں اس سرزمین کے۔ بے شمار چھوٹے بڑے بل کھاتے ہوئے دریا، جن پر پاٹ کے بوجھ سے دبی ہوئی لانبی لانبی کشتیاں، آدھی پانی میں، آدھی پانی سے اوپر — یہاں کے گاؤں گاؤں کے اردگرد بہتی ہوئی ندیاں، ندیوں کے سینے پر سے گذرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی "نو کائیں" (کشتیاں) ٹیڑھے میڑھے گھاٹ پر ننگ دھڑنگ کالے اور گندمی رنگ کے بچے۔ پانی کے کپڑے، نیلے، پیلے، لال اور کالے کنارے کی ساریوں میں بدن چُرائے ہوئے دوشیزائیں، گھونگھٹ کی اوٹ میں بھی شرمائی اور لجائی ہوئی، بُوڑھے بُوڑھیاں جن کی زندگی میں بھاٹا آچکا ہے لیکن آنکھوں میں ندیوں کا خرام اب بھی باقی ہے۔ یہاں کی جنون خیز اور حُسن آفریں برکھا رُت، برسات میں ندی نالوں کا شور، جھینگر، مچھر اور مینڈک کا سُر اور تال سے بے نیاز نغمہ — کھیتوں میں بارش کی کثرت سے ڈوبی ہوئی دھان کی فصلیں۔

اِس نغمہ پرور ماحول کے علاوہ یہاں کی ہریالی چشم و نظر کے لئے دعوت نظارہ ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔ ہوا میں جھومتے ہوئے سُپاری، ناریل اور کیلے کے درخت، لہلہاتے ہوئے کھیت، تناور درخت کی شاخ سے یا جھاڑیوں کے کُنج سے یا دھان سے لدی ہوئی بالیوں کے جُھرمٹ سے بانسری کی دلدوز اور مسرت آگیں تانیں۔

دراصل اسی حسین ماحول اور اسی حُسن پرور آب و ہوا نے یہاں کے لوگوں کی طبیعتوں میں گُداز پیدا کر دیا ہے۔ اور اس سرزمین کو سحر و نغمہ کا دیار بنا دیا ہے جس طرح اِس سرزمین کی رگ رگ میں ندیاں سرایت کر گئی ہیں، اسی طرح یہاں کی طبیعتوں میں ان ہی گنگناتی اور گاتی ہوئی ندیوں کا نغمہ موجزن ہے۔

اِن ہی مناظر اور ماحول سے پیدا شدہ تاثرات اور احساسات کے ترجمان یہاں کے عوامی نغمے ہیں جو "لوک گیت" کہلاتے ہیں مشرقی پاکستان کی تمام تر خصوصیات اِن ہی گیتوں میں پنہاں ہیں۔ یہ گیت ان بے شمار سیدھے سادھے ان پڑھ گاؤں والوں کے جذبات اور احساسات کی سچّی تصویریں ہیں جنہیں تاریخ نے سہارا نہیں دیا۔ لیکن فضا میں اب بھی رقصاں ہیں۔

مشرقی پاکستان کے عوامی نغموں کی چند قسمیں یہ ہیں:- بھاٹیالی، بھُویا، جٹکا، گمبھیرا، ساری، زاری، مُرشدی، معرفتی اور باؤل۔ بھاٹیالی دراصل ملّاحوں کا گیت ہے، ملّاح کشتی دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیتا ہے یا اگر بھاٹا ہے اور ہوا موافق رہی تو بادبان کے سہارے۔ دونوں صورتوں میں اُسے چپّو چلانے کی کم ہی ضرورت پڑتی ہے فرصت کے اس لمحے میں وہ اطمینان سے کشتی میں بیٹھا اپنے دُکھ سُکھ کی کہانی نغمہ کے ذریعہ فضا میں بکھیر دیتا ہے۔

اِس گیت کا موضوع عشق و محبت ہے۔ عاشق اپنے محبوب سے دُور جا رہا ہے۔ پانی کی موجیں، دریا کا حسین منظر، اور اپنوں سے دور، نامعلوم منزل کی طرف سفر، اُسے اپنے محبوب کی یاد دلاتے ہیں۔ محبوب کی جُدائی کا احساس موجوں کی روانی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اِن ہی جذبات کا اظہار بھاٹیالی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اِس گیت میں سُر کا اُتار چڑھاؤ اور نغمہ کی دل گرفتگی، بچھڑے ہوئے عاشق کے قلبی واردات کی ترجمان ہوتی ہے۔ اِس گیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ گانے والا ایک خاص سُر کو بہت کھینچتا ہے۔ اور دیر تک اِس پر قائم رہتا ہے۔ گویا اس طرح اپنے غم و الم کی شدّت کا اِظہار کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے شمالی علاقوں کے عوام نسبتاً زیادہ غریب اور مفلس ہیں۔ وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار بازار میں لے جا کر بیچتے ہیں اور اس مختصر آمدنی سے زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ جب یہ سب سامان گاڑیوں پر لاد کر بازار کی طرف جاتے ہیں تو اُنہیں فطری طور پر اپنی غربت اور فلاکت کا احساس بُری طرح ستاتا ہے۔ اِس غم کو غلط کرنے کے لئے وہ موسیقی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔

ایسے موقع پر جو گیت گایا جاتا ہے وہ بھُوّیا کہلاتا ہے۔ بھُوّیا خالص مشرقی پاکستان کی پیداوار ہے۔ اِس کے سُر غمناک ہوتے ہیں۔ لیکن غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے گانے والا اپنی تسلّی کے بہلاوے بھی خود ہی تلاش کرتا ہے۔ یہ نغمہ اُسے زندہ رہنے اور اپنا دُکھ درد بھول جانے کے لئے سہارا بن جاتا ہے۔ غرض بھُوّیا غمناکی اور تسلّی آمیزی کا ایک نہایت خوشگوار امتزاج ہے۔ اِس گیت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سُر بیچ سے یک بیک ٹوٹ جاتا ہے۔ دھوکا یہ ہوتا ہے کہ جیسے گانے والا کچھ بھول گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر سُر توڑ دیتا ہے۔ غم کی شدّت میں بعض اوقات اُسے نہ الفاظ سہارا دیتے ہیں۔ اور نہ ترنم۔ پھر یکایک اُسے کچھ اُمید افزا باتیں یاد آ جاتی ہیں اور وہ اپنے اُکھڑے ہوئے بول کو اپنے اصلی سرگم میں لے آتا ہے۔ یہ گیت صرف دو تارے پر گایا جاتا ہے۔

چٹکا — چٹکا کے معنی آوازِ بازگشت کے ہیں شمال کے پہاڑی علاقے کے لوگ یہ گیت پہاڑیوں میں بیٹھ کر گاتے ہیں۔ گانے کی آواز گونجتی اور واپس آتی معلوم ہوتی ہے اسی لئے اِس گیت کو چٹکا کہتے ہیں۔ یہ گیت عام طور پر کئی لوگ مل کر گاتے ہیں۔ اس کا موضوع بھی عام طور پر درد و غم کا اِظہار اور تسلّی ہوتا ہے۔ بھُوّیا اور چٹکا میں بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ اس کا سُر بیچ سے نہیں ٹوٹتا اور دوسری چیز یہ کہ یہ گیت نہایت تیزی سے گایا جاتا ہے۔

گم بھیرا۔ یہ گیت رنگ پور اور مالدہ کے ضلعوں میں عام ہے۔ اس کے سُر میں خوشی کے تاثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ گیت عام طور سے ڈھول اور ڈھاک کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ قوالی کی طرح اس گیت کا پہلا بول ایک شخص شروع کرتا ہے۔ دوسرے اسی بول کو اُٹھاتے ہیں۔

ساری — جب کشتی چڑھاؤ کے رُخ جا رہی ہو تو ملّاح کو بڑی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ محنت کا بار ہلکا کرنے کے لئے فطرت اُسے موسیقی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ کشتی کے سارے ملّاح مل کر نغمہ بلند کرتے ہیں۔ یہی گیت ساری گان کہلاتا ہے۔ سخت محنت پر ملّاحوں کو تیار کرنے کے لئے ہمّت افزا باتوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ساری گان جوش سے لبریز ہے۔ اس کے بول اور اس کے سُر سراپا دعوتِ عمل ہیں۔ موضوع زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ گانے والے خود طوفان ہیں۔ پھر طوفان انہیں کیا ڈرا سکتا ہے۔ ایک ملّاح کی پُرعزم اور نڈر زندگی کا صحیح تصوّر اس گیت میں موجود ہے۔ کبھی کبھی ان گیتوں کے بول مزاحیہ بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان میں

ایسے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں جو سُننے میں ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ملاح اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے کبھی کبھی لچر باتوں پر اتر آتے ہیں۔

زاری[1]۔ فارسی میں یہ لفظ جس معنی استعمال ہوتا ہے بالکل اسی معنی میں بنگالی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ گیت خاص طور سے واقعہ کربلا سے متعلق ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اسلامی گیتوں کی ابتدا اسی طرز سے ہوتی ہے۔ اِن گیتوں میں اب زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مثلاً قیامِ پاکستان کے اقتصادی، تہذیبی اور دیگر حالات پر تبصرے ہوتے ہیں۔ اِن گیتوں میں عام طور سے ایک واقعہ کی تاریخ بتائی جاتی ہے۔ اور انجام پر تنقید ہوتی ہے۔

مُرشدی اور معرفتی۔ اولیاء اللہ اور مشائخین نے مشرقی پاکستان کے تمدّن اور تہذیب کی تعمیر میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ یہ بے غرض انسان خدا کا پیغام لے کر اس طرف پہنچے اپنے اعمال اور کردار سے اُنہوں نے یہاں کے عوام کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہ خوشی خوشی اس دین میں شامل ہونے لگے موسیقی یہاں کے عوام کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، مذہبی احساسات اور جذبات نے بھی موسیقی کا جامہ پہنا اور وہ گیت عالم وجود میں آئے جنہیں معرفتی اور مُرشدی کہا جاتا ہے۔

باؤل اِس گیت کے پیش رو دراصل مغربی بنگال میں ضلع ندیا کے ویشنب ہیں۔ لیکن جب یہ گیت مشرقی بنگال میں آیا تو اسے مُسلمانوں کی سرپرستی ملی اور اس پر اسلامی رنگ چڑھنے لگا۔ ندیا کے ویشنب مشرقی بنگال میں فقیر کہلانے گئے۔ یہاں کے عوام باؤل کو فقیری گانا کہتے ہیں۔ ان کی وہی اہمیت ہے جیسے شمالی ہند میں کبیر کے دوہوں کی۔ مُسلمان صوفیوں نے باؤل کے ذریعے محبّت رواداری اور اُخوّت کا پیغام عام کیا۔ باؤل میں پیروں اور اولیاء اللہ کی زندگی اور ان کی کرامتوں کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی باؤل کا احسان مند ہے۔ کیونکہ یہی چیز اچھے فن کاروں کے ہاتھ آکر نئی طرزوں کے بنگالی گانوں کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔

زندگی مُسلسل حرکت اور ارتقاء کا نام ہے۔ زندگی کے یہ تغیّرات ہر شعبۂ حیات کو متاثر کرتے ہیں۔ موسیقی بھی اس اٹل قانون سے مستثنیٰ نہیں رہی۔ اس میں نت نئی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی موسیقی بھی تغیّرات کی آماجگاہ رہی۔ اس میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر تبدیلی رابندر سنگیت کی دُھنوں کا رواج ہے۔

ٹیگور نے کثرت سے یہ گیت لکھے اور ہر گیت کی لَے بھی خود ہی متعین کی۔ اس طرح موسیقی کا وسیع میدان رابندر سنگیت کے نام سے کھُل گیا۔ ان نغموں کی لَے عام طور پر مشرق سے بچّے گانوں میں تھوڑی بہت تبدیلیوں سے بنائی گئی ہے۔ اور اس طرح راگ اور سُر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مغربی تمدّن نے جہاں ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ وہاں موسیقی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ مغربی موسیقی کے اثرات ہماری موسیقی نے بھی قبول کئے۔ اور جدید بنگالی نغموں کا آغاز ہوا جنہیں "آدھونک گان" یعنی جدید نغمے کہتے ہیں۔

یہ گیت گویا مشرقی اور مغربی موسیقی کا امتزاج ہیں۔ اور ان کی لَے عام طور پر ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ مگر ان نغموں میں جذبات و احساسات کی وہ گہرائی موجود نہیں، جو یہاں کے عوامی نغموں کا طُرّۂ امتیاز ہے۔

پاکستان کے قیام نے یہاں کے عوام کی فکری

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

[1] جاری تلفظ ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا اجرائے احکام کی ترجمانی اور پروپیگنڈا کے تحت واقع ہوئی۔

سلیم اللہ فہمی

کھیدا

اِس وقت غالبؔ کا ایک مصرعہ مسخ ہو کر میرے ذہن میں آیا ہے۔

ع :- بارے ہاتھی کا کچھ بیان ہو جائے

ہاتھی اور آموں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ یہ تو آپ جانیں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آخر مجھے کسی طرح اپنی بات تو شروع کرنی ہی تھی۔

اِس مضمون میں کھیدا یعنی ہاتھیوں کے پکڑنے کے مختلف مرحلے آپکی خدمت میں پیش کئے جائیں گے سب سے پہلے ہاتھیوں اور کھیدا کی تیاریوں کے بارے میں کچھ بتانا مناسب ہوگا۔

غول کی تلاش:- آپ کہیں گے کہ صاحب ہم نے بہت سے ہاتھی دیکھے ہیں۔ چڑیا گھر میں بھی اور جلوسوں میں بھی۔ یہ لفظ چڑیا گھر بھی خوب ہے! ذرا ہاتھی کو دیکھئے اور اس نازک سی ترکیب کو؟ جنگل کا ہاتھی پالتو ہاتھی سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ غلامی میں انسانوں کے ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ضمیر، عادات اور مزاج بدل جاتے ہیں۔ جنگل میں آزاد ہاتھیوں کے غول اپنی جسامت اور بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ اسی رفتار سے دوڑتے ہیں جیسے شہر کی سڑکوں پر گھوڑے۔ اور پہاڑوں پر چڑھنا انکے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔ ہاتھی انسانوں کی طرح اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے غول میں آٹھ سے لے کر پینتیس ۳۵ چالیس تک ہاتھی ہوتے ہیں۔ اور ہر غول کا ایک لیڈر ہوتا ہے۔ رہبری کا شرف غول کے سب سے مضبوط اور طاقتور ہاتھی کو حاصل ہوتا ہے۔ بڑھاپا انسانوں کی طرح ہاتھی کے لئے بھی مصیبت ہوتا ہے۔ بوڑھے لیڈر کو کوئی نوجوان اور زیادہ طاقتور ہاتھی معزول کر دیتا ہے۔ ان کی زندگی میں خاصی جماعتی تنظیم ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی کوئی نوعمر اور سرکش ہاتھی اپنے غول کے قوانین کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اور تنہا زندگی گذارنے لگتا ہے۔ اسے آپ غنڈہ ہاتھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کہیں یہ فصلوں کو تباہ کرتا ہے۔ کہیں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا ہے۔ اور کہیں اپنوں سے ٹکر لیتا ہے۔

مشرقی پاکستان، پٹ سن، کیلے، بانس اور انناس کی طرح ہاتھیوں کے معاملہ میں بہت خوش نصیب ہے۔ یہاں کے جنگلوں میں ہاتھیوں کی کمی نہیں۔ یہ ہاتھی مشرقی پاکستان کی سرحد سے برما چلے جاتے ہیں اور برما سے مشرقی پاکستان آجاتے ہیں۔ بھلا اِن کو پاسپورٹ اور ویزا کے تابع کون کر سکتا ہے؟

مشرقی پاکستان میں ہاتھیوں کی اس کثرت نے اسے شکاریوں اور شائقوں کی محبوب سرزمین بنا دیا ہے۔ بنگال میں ہاتھیوں کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ سنہ ۱۸۳۶ء سے پہلے ہی قائم ہو گیا تھا جس کا صدر مقام ڈھاکہ تھا۔ اب پاکستان کے مختلف حصّوں اور دُور دراز کے ملکوں سے شکاری کھیدا کے لئے مشرقی پاکستان آتے ہیں۔

ہاتھیوں کو کیوں پکڑا جاتا ہے؟ اس کا جواب شاید

مشکل نہیں۔ ایک طرف تو ہاتھیوں پر قابو پاکر انسان کو اپنی عظمت کا یقین آجاتا ہے اور دوسری طرف تربیت یافتہ ہاتھی بے شمار مفید کام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لٹھوں کو جن کا وزن پچاس ساٹھ من سے کم نہیں ہوتا، یہ ہاتھی جنگل سے دریا کے کنارے تک لاتے ہیں۔ بعض علاقوں میں زمین کو ہموار کرتے ہیں۔ چڑیا گھروں کی زینت بنتے ہیں، شکار کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہاتھی پکڑنے کی چار صورتیں دُنیا میں رائج ہیں۔

(۱) گڑھے کھود کر پتے اور ڈالیوں سے ڈھانک دیئے جاتے ہیں۔ اور ہاتھی ان میں گر پڑتا ہے۔ یہ طریقہ اب عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح گرنے والا ہاتھی زخمی ہوتا ہے اور بعض اوقات مر بھی جاتا ہے۔

(۲) سکھائی ہوئی ہتھنی یعنی کنکنی کے ذریعہ ہاتھی پکڑے جاتے ہیں۔

(۳) تیسرا طریقہ پھانسی شکار ہے۔ کسی ایک ہاتھی کا پیچھا کیا جاتا ہے اور کئی ہاتھی مل کر اُسے گھیر لیتے ہیں۔ اور مضبوط رسیّوں کا پھندا پیر میں ڈال دیا جاتا ہے۔

(۴) چوتھا طریقہ کھیدا ہے۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ہمارے اس مضمون کا محور ہنکالہ کا طریقہ ہوگا۔ جو سب سے دلچسپ ہوتا ہے۔ اس طریقے کے ذریعہ ہاتھیوں کے غول کے غول کو پکڑا جاسکتا ہے۔ کھیدا کا زمانہ عام طور سے دسمبر سے مارچ تک ہوتا ہے۔ ویسے اوائل سرما بھی اس کا زمانہ ہوسکتا ہے۔ کھیدا دلچسپ مشغلہ ہے۔ مگر اس پر خرچ کافی ہوتا ہے۔ اور اس کی تیاری کے لئے روپئے بہت سے آدمیوں اور تربیت یافتہ ہاتھیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کھیدا کے لئے سردی کا موسم مناسب ہوتا ہے کیونکہ اس زمانے میں ہاتھی گھنے جنگلوں سے نکل کر جنگل اور بستی کی سرحد پر آجاتے ہیں۔ کھیدا کے شائق کشتیوں کے ذریعہ جنگل کے قریب کسی منتخب شدہ گاؤں تک پہونچتے ہیں اور جہاں جنگل شروع ہوتا ہے وہاں خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہوجاتا ہے۔ کھیدا کے لئے دو چار سو آدمیوں سے لیکر دو تین ہزار آدمیوں تک کی جماعت ہوتی ہے۔ اس جماعت کی اہم ترین شخصیتیں دو ہوتی ہیں۔ ایک تو کھیدا کا مالک اور دوسرے مولوی صاحب جو نماز با جماعت کی امامت کرتے ہیں۔ اور اکثر خیموں کی بستی میں میلاد خوانی کرتے ہیں۔ اس جماعت کے تجربہ کار لوگ غول کی تلاش کا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی احتیاط سے آٹھ دس میل کا چُپکے چُپکے چکر لگاتے ہیں۔ اور پتہ چلاتے ہیں کہ اس حصّے میں کتنے ہاتھی گھوم رہے ہیں۔ اور پھر اس علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا جاتا ہے تاکہ کوئی ہاتھی حلقے سے باہر نہ جاسکے۔ غول کی تلاش کا کام بڑی مہارت چاہتا ہے۔ تلاش کرنے والے سب سے زیادہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تلاش کا اندازہ ہاتھیوں کو نہ ہوسکے۔ جانور خطرے کو محسوس کرنے کی جبلّت رکھتے ہیں۔ اس لئے احتیاط کا عنصر اور بڑھ جاتا ہے۔

تلاش کرنے والا گروہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ ہاتھیوں کے غول کے پنجرے تک درمیانی راستہ ایسا ہو جیسے ہاتھی آسانی کے ساتھ طے کرکے اُس تک پہونچ سکیں۔ بالفاظ دیگر ہاتھیوں کو پنجرے تک ہنکانے میں غیر معمولی دقت نہ ہو۔ ویسے یہ بات ظاہر ہے کہ ہاتھیوں کے غول کے گرد دائرہ تنگ کرنے اور اُن کو ہنکانے کا کام جان جوکھم کا ہے اور اس مہم میں مولوی صاحب کی موجودگی کے معنی یہی ہیں کہ اُنکی میلاد خوانی وعظ اور عبادات، بحالتِ مجبوری جنّت تک پہونچا سکیں۔ انسان بھی خوب ہے۔ مُہمات میں اسے خُدا یاد آتا ہے۔ شکار گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی کتنی تیاریاں

کرنی پڑتی ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں مزدوروں اور تجربہ کار آدمیوں کی فراہمی بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ پھر پنجرہ بنانے کے لئے سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ تختے، لکڑی کیلیں۔ رسّیاں وغیرہ کھیدا کا ایک ضروری جُزو ہے۔ شور مچانا اور بلند بانگ آوازیں پیدا کرنا بھی ہے۔ اس مقصد کے لئے ڈھول، خالی کنسٹر، اور ٹین بڑی تعداد میں جمع کئے جاتے ہیں، اور پھر اتنے عظیم الجُثّہ جانور کو پکڑنے والے خالی ہاتھ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس کے لئے رائفلیں، بندوقیں اور دستی بم مُہیّا کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کھیدا کے دوران بعض شکاریوں کو ہاتھیوں سے اپنی جان بچانے کے لئے رائفل چلانی پڑتی ہے۔ ہاتھی پر گولی اُسی وقت کارگر ہو سکتی ہے جب اسکی پیشانی کے اُبھرے ہوئے حصّے کو نشانہ بنایا جائے، یا اس کے کان میں گولی چلائی جائے۔

ہاتھی عام طور پر اپنے مقرّرہ راستے پر آگے بڑھتے ہیں، اور ہاتھیوں کی اس عادت کی وجہ سے اُنہیں کھیدا کے مقام تک لانا آسان ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی بعض ہاتھی اپنے غول سے بھٹک کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں، اور پھر اُنہیں سیدھی راہ پر لانا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔

آپ کبھی کھیدا کی تیّاریاں دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا جیسے کوئی جارحانہ عزائم رکھنے والا بڑا ملک کسی چھوٹے سے علاقے کے خلاف فوجی تیّاریوں میں مصروف ہے۔ مگر کھیدا والے ہاتھیوں کو مارنے کے لئے تیّاریاں نہیں کرتے بلکہ اِن کو پکڑنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔

شکارگاہ کا انتخاب:۔ کھیدے کے پنجرے کے بنانے کی تیّاریاں اوائل سرما سے شروع ہو جاتی ہیں۔ سردیوں میں ہاتھیوں کے غول جنگلوں کے اندرونی حصّوں سے نکل کر سرحدی دیہاتوں کے قریب آ جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کے نقلِ مکانی میں موسم کے اثرات کا بڑا دخل پڑتا ہے۔ مثلاً برسات کے زمانے میں ہاتھی جنگلوں کے گھنے اور اندرونی حصّے میں چلے جاتے ہیں تاکہ مکھیوں اور پسوؤں سے محفوظ رہیں۔ گرمیوں میں ہاتھیوں کے غول تالابوں اور دریاؤں میں پناہ لیتے ہیں تاکہ گرمی سے بچ سکیں۔

سردیوں میں بستیوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ غذا کی تلاش ہے۔ اس زمانے میں فصلوں کو ہاتھیوں سے کافی نقصان پہونچتا ہے۔ ان کے کھانے سے بھی اور روندنے سے بھی۔ بیچارے کسان سردیوں کی سخت راتوں میں ساری ساری رات چوکیداری کرتے ہیں۔ ہاتھیوں کے بھگانے کے لئے خالی کنسٹر اور ٹین بجاتے ہیں۔ بانسوں کے گرد روئی اور کپڑا لپیٹ کر مشعلیں روشن کرتے ہیں لیکن بعض غول اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ ان ساری تدبیروں کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کھیتوں کی پیداوار کا تو کیا ذکر، بعض ہاتھی تو کسانوں کے جھونپڑوں کے بیرونی حصّوں میں رکھا ہوا کھانے کا نمک اور آٹا وغیرہ صاف کر جاتے ہیں۔

اب یہ بات آپ پر واضح ہو گئی کہ سردیوں کا موسم کھیدا کے لئے کیوں چُنا جاتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اس زمانے میں ہاتھی انسانی بستی سے زیادہ دُور نہیں ہوتے بلکہ اکثر بستیوں کے چکّر لگاتے ہیں۔ علاوہ بریں سردیوں میں مشرقی پاکستان میں بارش کبھی نہیں ہوتی۔

ہاتھی مشرقی پاکستان کے محفوظ یعنی (Reserved) جنگلوں میں ہوتے ہیں۔ ان جنگلوں کی نگہداشت، نگرانی تحفّظ، محکمۂ جنگلات مشرقی پاکستان کی اہم ذمّہ داری کیونکہ شیروں اور ہاتھیوں کے شکار کی وجہ سے یہ خطّہ پاکستان اور دور و نزدیک کے مُلکوں کے شکاریوں کی جولاں گاہ ہے۔

محکمۂ جنگلات ہر سال کھیدا کے لئے ٹنڈر طلب

کرتا ہے اور کھیدا کے شوقین اپنے ٹنڈر پیش کرتے ہیں، جس میں وہ ہر پکڑے جانے والے ہاتھی کے لئے ایک متعین رقم پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کھیدا کا شوق رکھنے والے مختلف افراد اور جماعتوں کے درمیان تجارتی مقابلہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے ہر ہاتھی کے لئے پانچسو روپے کی پیشکش کی، اور آپ نے اپنے ٹنڈر میں فی ہاتھی سات سو روپے پیش کئے۔ ظاہر ہے کہ کھیدا کی اجازت آپ ہی کو ملے گی۔

لیجئے یہ مرحلہ طے ہو گیا اور ٹنڈر آپ کے حق میں نکل آیا۔ اب آپ اپنی شکاری ٹولی تیار کریں گے۔ اس ٹولی میں دو سو سے لے کر دو ہزار آدمی تک ہو سکتے ہیں۔ لیکن چالیس پچاس افراد ایسے ضرور ہونے چاہئیں، جو کھیدا کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ یہی تجربہ کار شکاری غول کو تلاش کرتے ہیں، شکارگاہ کا انتخاب کرتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

اب آپ کو شکارگاہ کا انتخاب کرنا ہے کھیدا کا مقام جنگل کے قریب ہی کسی گاؤں کا بیرونی حصہ ہوتا ہے، اس کے انتخاب کے وقت انسانی ضرورتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پینے کا پانی کہاں کہاں موجود ہے؟ ایندھن کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے؟ ضرورت کے وقت مزید آدمی کن قریبی دیہاتوں سے مل سکتے ہیں؟ پارٹی کے تجربہ کار افراد شکارگاہ کا انتخاب کرنے کے بعد آٹھ دس میل کے علاقے کو گھیر کر غول کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کے غول ہمیشہ بنے ہوئے اور متعین راستوں پر چلتے ہیں۔ اسی لئے شکارگاہ ایسے مقام کو بنایا جاتا ہے جہاں جنگل کے دو تین راستے آکر مل جاتے ہیں انہیں مقررہ راستوں پر چلتے ہوئے ہاتھیوں کے غول قریبی دیہاتوں کی طرف غذا کی تلاش میں آتے ہیں۔ ان راستوں کے دونوں طرف عام طور پر ہر قسم کی گھاس اور بانس کے درخت ہوتے ہیں۔ یہی چیزیں ہاتھیوں کی غذا کا کام دیتی ہیں۔ شکاری اپنے شکار کی نفسیات کے ماہر ہوتے ہیں، اور مقررہ راستوں پر ہاتھیوں کے چلنے کی اس عادت سے فائدہ اٹھا کر انہیں پنجرے تک لایا جاتا ہے اور پھر یہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہوتی ہے۔

پھر ستم یہ ہے کہ ایک ہاتھی کی گرفتاری کے بعد دوسرے ہاتھی بھاگتے نہیں۔ ہاتھیوں کی زندگی میں جماعتی تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غول کی رہبری غول کا لیڈر کرتا ہے۔ جب وہ کھیدے کا اسیر ہو جاتا ہے تو دوسرے ہاتھی بھی ایک ایک کر کے اپنے آپ کو حوالے کر دیتے ہیں۔

لیجئے شکارگاہ کا انتخاب ہو گیا اور کھیدے کے پنجرے کے بنانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہاں جنگل ختم ہوتا ہے۔ گاؤں کے اس سرے پر پنجرا بنایا جاتا ہے۔ لیکن پنجرا بنانے سے پہلے جنگل کے بعض حصوں کے درخت اور جھاڑیاں اس ترکیب سے کاٹی جاتی ہیں کہ راستہ بن جائے اور شکاریوں کو آنے جانے میں دقت نہ ہو۔

شکارگاہ کے انتخاب کے بعد شکاری اپنی بستی بسانے میں لگ جاتے ہیں، خیموں اور چھولداریوں کی ایک چھوٹی سی بستی دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے سینے پر ابھر آتی ہے۔

شکاریوں کی بستی:- سردی تھوڑی تھوڑی شروع ہو گئی ہے، جس مقام پر آبادی ختم ہوتی ہے اور جنگل شروع ہوتا ہے وہاں ایک ندی بہہ رہی ہے۔ مغرب کا وقت ہو گا کہ پچاس ساٹھ کشتیاں ایک ساتھ گاؤں کے قریب ندی کے کنارے سے آلگیں۔ طرح طرح کے لوگ ان کشتیوں سے اترنے لگے۔

یہ ان لوگوں کی کشتیاں ہیں جو کھیدے کے لئے آئے ہیں۔ کشتیوں سے سامان اترنے لگا۔ ان لوگوں میں

کھیدے کے مالک کی شخصیت اتنی ممتاز ہے کہ اُسے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ لوگ اس سے ہدایت لے رہے ہیں۔ اس کے حکم کے مطابق سامان اُتارا جا رہا ہے۔

سامان اُتر چکا، بہت سی بوریاں، لکڑی کے گٹھے، سامانِ خوردنی، بندوقیں اور رسّیاں وغیرہ ساتھ ہیں۔ اب یہ قافلہ جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیجئے تھوڑا سا راستہ طے ہو گیا اور یہ لوگ وہاں پہونچ گئے جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے۔ رات ہو گئی ہے، اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنڈے اور لالٹینیں روشن ہو گئیں، ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اور قافلے والے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

لپٹے ہوئے خیمے اور چھولداریاں کھول لی گئی ہیں۔ چابک دست مزدوروں اور اہلِ قافلے نے خیمے اور چھولداریاں لگانا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا ہے۔ اب لوگوں نے اپنے خیمے چُن لئے، سفری پلنگوں پر اور زمین پر بچھونے بچھا دیئے گئے۔ اِن قافلے والوں کے ساتھ صرف کھیدے والے ہی نہیں آتے بلکہ دُکاندار بھی آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کچھ دُکانیں بھی نظر آنے لگیں۔ پان، بیڑی، سگریٹ وغیرہ کی دُکانیں۔

اِن کاموں سے فرصت پا کر کھیدے والے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر کھانا کھانے لگے پہلی رات کے لئے عام طور پر لوگ کھانا اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں کیونکہ پہلے دن اتنا کام ہوتا ہے کہ کھانا پکانے کی فرصت نہیں ملتی۔

اِدھر کھانا ختم ہوا اور اُدھر مولانا صاحب نے اذان دی۔ لوگ کسی کھلی جگہ میں جمع ہو کر باجماعت نمازِ عشاء ادا کرنے لگے۔ نماز کے بعد مولانا نے ایک چھوٹا سا وعظ کہا اور قافلے والوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے ایک ایک لفظ کو سُنا۔

وعظ کے بعد سب لوگ اپنے اپنے خیمے میں چلے گئے اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئے۔

صبح ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے، چاروں طرف سے جنگل کو گھیر لیا گیا۔ کھیدے کے پنجرے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس مہم کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک پنجرے کے صحیح مقام کی تعمیر پر ہوتا ہے۔

اب اس پنجرے یا کٹھرے کا حال سنئے بڑے مضبوط تختوں سے ایک چھوٹا سا گھر بنتا ہے۔ گول گول تختے لگائے جاتے ہیں۔ اور باہر کی طرف موٹی موٹی کھونٹیاں اس طرح لگائی جاتی ہیں کہ دیواروں کی روک کا کام دیں۔ اندر سے جتنا زور پڑے اتنا ہی یہ آڑ میں رکھی ہوئی کھونٹیاں زمین میں دھنستی چلی جائیں۔ اس گول گھر کے تختوں کا قطر کوئی نو دس انچ ہوتا ہے اور ان کی لمبائی آٹھ سے بیس فٹ ہوتی ہے۔

اِس گول گھر میں اُوپر چاروں طرف مچان بنا دیا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑا اور بھاری پھاٹک بنایا جاتا ہے جو رسّیوں کی مدد سے اُوپر کھنچا ہوا رہتا ہے اور دروازہ کی صورت میں نیچے اُتار لیا جاتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے کبوتر کی کابک کا دروازہ۔ یہ دروازہ آٹھ دس فٹ چوڑا ہوتا ہے، اس دروازے کے دونوں طرف پینتیس ۳۵ چالیس فٹ لمبے لٹھے ہوتے ہیں جن پر یہ دروازہ لگایا جاتا ہے جسے رسّیوں کی مدد سے آسانی سے اُتارا جا سکتا ہے۔

اس پنجرے کی پچھلی جانب ہر طرف سے روک کے لئے درختوں کی صورت میں تختے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں اور یہ تختے ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مضبوطی سے رسّیوں سے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ سامنے کی جانب

دروازہ سے شروع ہوتا ہوا ایک راستہ بنایا جاتا ہے جو چوڑا ہوتا جاتا ہے، دونوں طرف مضبوط دیواریں کھڑی کردی جاتی ہیں۔ ڈیڑھ دو فرلانگ تک یہ فصیل دونوں طرف قائم کردی جاتی ہے۔

پنجرے کے بنانے میں آٹھ دس دن صرف ہوتے ہیں۔ پھر دونوں طرف ان دونوں فصیلوں کے مساوی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر سوکھی گھاس اور پتّوں کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں اور ان میں دستی بم چھپائے جاتے ہیں، ان ڈھیروں کی نگرانی دو تجربہ کار شکاری کرتے ہیں۔

پنجرا فصیل اور روک تھام۔ کہ تمام سامان پر درختوں کی شاخیں اور پتیاں اس طرح ڈالدی جاتی ہیں کہ ہر چیز جنگل کا ہی حصّہ معلوم ہوتی ہے اور یہ اندازہ کبھی نہیں ہوتا کہ حضرت انسان نے یہاں کیا کچھ کیا ہے، اس ہوشیاری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کو معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس جنگل میں کھیدے کا سامان کہاں چھُپا ہے اور وہ اپنی بربادی اور اسیری سے بے خبر ہوکر کٹھرے تک پہونچ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہاتھیوں کو بھیڑ بکری یا گائے بیل کی طرح نہیں ہانک سکتے۔ وہ اپنے مُقرّرہ راستے پر اپنی مرضی کے مطابق چلتے ہیں۔ ان کے غول کو ہوشیاری کے ساتھ کھیدے کی طرف موڑا جاسکتا ہے، قوّت کے بل بوتے پر نہیں۔

پنجرے کی تیّاری کے بعد ہوشیار شکاری ہاتھیوں کے غول کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہاتھیوں کے یہاں تک آنے میں دو تین مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔ اس عرصے میں شکاریوں کی بستی میں زندگی کی لہر اور سرگرمیاں جاری رہتی ہیں، ہر شخص کے ذمّے کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہے، کچھ لوگ پانی فراہم کرتے ہیں، کچھ کھانا پکانے میں، کچھ مہم کی تیّاریوں میں لگ جاتے ہیں، اور کچھ بستی کی چوکیداری کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ مولانا صاحب کے وعظوں اور میلاد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

کبھی کبھی کسی خیمے میں رات کو گانے کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ یا چند ساتھی جمع ہوکر کسی شہزادی یا شہزادے کی کہانی شروع کردیتے ہیں، لیکن یہ لوگ جب سوتے ہیں تو شاید خواب میں شہزادیوں کی جگہ ہاتھیوں کے غول ہی اُنہیں اپنی صورت دکھاتے ہوں۔

جنگل سے کٹھرے تک: ہاتھی جنگل سے کٹھرے تک کیسے پہونچتے ہیں؟ یہ کھیدا کی داستان کا سب سے دلچسپ اور دردناک حصّہ ہے۔ مُہم شروع کرنے سے پہلے اہم مقامات پر بہادر اور تجربہ کار شکاریوں کی ڈیوٹی مُقرّر کردی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ بہادر شکاری کو پنجرے کے ٹلنے والے دروازے پر مقرّر کیا جاتا ہے تاکہ جیسے ہی غول کٹھرے کے گول گھر میں داخل ہو وہ دروازے کی رسّی کاٹ دے۔

فصیل کے کنارے کنارے بعض شکاری درختوں پر بیٹھتے ہیں۔ کٹھرے کے دروازے سے ڈیڑھ دو فرلانگ تک تین چار لائنیں بنائی جاتی ہیں۔ ہر قطار پر زمین میں سوکھی پتیاں، خشک گھاس اور جلد بھڑک اُٹھنے والی چیزیں خطِ مُستقیم میں رکھی جاتی ہیں، گھاس کے انبار میں دستی بم چھپاکر رکھے جاتے ہیں۔

ایک فصیل سے دوسری فصیل تک آر پار ان لائنوں کے دونوں سروں پر بہادر شکاری مُستعد موجود رہتے ہیں۔ ان انتظامات کے بعد جب ہاتھیوں کے غول کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہیں تو تین چار سو افراد غول کے تین طرف سے شور وغل شروع کرتے ہیں یعنی اُن کے پیچھے اور دائیں بائیں سے یوں ہاتھیوں کے لئے یہی چارہ رہ جاتا ہے کہ وہ ایک ہی سمت یعنی کٹھرے کی

طرف بڑھیں۔ ہاتھی اپنی جماعتی تنظیم کے ساتھ اپنے لیڈر کی قیادت میں ہر خطرے سے بے خطر پنجرے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اور ہانکے والوں کے ڈھول، ٹین، کنستر، پٹاخوں کا شور جاری رہتا ہے۔ مُہم عام طور پر شام کو شروع ہوتی ہے اور صبح تک جاری رہتی ہے۔

وقت کے اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھی اندھیرے میں اپنے دشمن کو صاف دیکھ نہ سکیں۔ یہ لیجئے پندرہ بیس یا تیس ہاتھیوں کا ایک غول پنجرے کے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر آگیا۔ ہر شخص چوکنا ہوگیا۔ غول آگے بڑھ رہا ہے۔ قریب اور قریب۔ غول نے جیسے ہی پہلی لائن پار کی اس لائن کے مشتعد شکاریوں نے اُس پر آگ لگا دی۔ بندوق سے چند ہوائی فیر کئے گئے۔

یہ بڑی جوکھم کے کام ہیں، کیونکہ اگر یہ لائن پار کرنے سے پہلے ہاتھیوں کو کٹہرے کا اندازہ ہو جائے تو وہ ہرگز اور آگے نہ بڑھیں اور بھریوں سمجھئے کہ وہ قیامت برپا کر دیں۔ ہاتھیوں نے پہلی لائن پار کر لی۔ سوکھی گھاس پتیوں اور ٹہنیوں کی اس لائن میں آگ لگا دی گئی، شعلوں نے ایک مسلسل لکیر کھینچ دی۔ شکاریوں کے ہاتھوں میں کٹہرے کی جلتی ہوئی مشعلیں ہیں۔ اب ہاتھی پیچھے لوٹ نہیں سکتے۔ لپکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں، ڈھول تاشوں وغیرہ کی آواز اور شکاریوں کی چیخ پکار ہاتھیوں کو سراسیمہ کر دیتی ہے۔ گھبراہٹ میں وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اب دوسری لائن پار کرتے ہیں۔ دوسری لائن میں بھی آگ لگا دی جاتی ہے۔ گھاس کے انبار میں آگ لگتے ہی چھپے ہوئے دستی بموں کی آواز سے فضا لرز جاتی ہے اس طرح ہاتھی تمام لائنوں سے گذر جاتے ہیں۔ ہر لائن میں اسی طرح آگ لگا دی جاتی ہے مسلسل آوازوں اور آگ کے شعلوں سے ہاتھی سوچنا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں اور کٹہرے کے راستے پر آگے بڑھتے ہوئے اچانک پنجرے یا گول گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی پورے کا پورا غول کٹہرے کے اندر پہنچ جاتا ہے پھاٹک کا شکاری پھاٹک کی ڈوری بڑی تیزی کے ساتھ کاٹ دیتا ہے اور پھاٹک گر کر ہاتھیوں کے نکلنے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ ہاتھیوں کا پنجرے میں بند ہو جانا ایک عجیب و غریب منظر ہوتا ہے۔ جس کی یاد دیکھنے والا کبھی بھول نہیں سکتا۔ اپنی مجبوری اور نا اُمیدی پر ہاتھیوں کا چیخنا، سر پٹکنا، دیواروں کو توڑنے کی کوشش کرنا، عجیب دل دہلا دینے والا اور خوفناک منظر ہوتا ہے۔ ہاتھی اگر آگے کی جانب دھکا دینے کی بجائے تختوں کو اپنی جانب کھینچ لیں تو آناً فاناً سارے کا سارا کٹہرا زمین پر آ رہے۔ لیکن فطرت نے انہیں آگے کی طرف ہی دھکا دینا اور زور لگانا سکھایا ہے۔ چنانچہ وہ دیواروں کو دھکیلتے ہیں اور جتنا زور کرتے ہیں اُتنا ہی پنجرہ زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اس وقت شکاریوں کی ٹیم کا ہر فرد پنجرے کے چاروں طرف ہوتا ہے اور بیشتر کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے بھالے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہے جس کا کتنے دنوں سے انتظار تھا۔ اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اِن اسیروں کے غم و غصّہ کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اگر ان کا لیڈر کمزور ہوتا ہے تو غول مل کر اُسے ہلاک کر دیتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک اُنکا لیڈر ہی اِس بدنصیبی اور گرفتاری کے لئے ذمّہ دار ہے اور اگر لیڈر طاقتور ہوتا ہے تو وہ دوسرے ہاتھیوں پر حملہ کرتا ہے اُنہیں مارتا ہے اور سزا دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو شکاریوں کو لیڈر پر گولیوں سے حملہ کر کے اُسے ہلاک کر دینا پڑتا ہے تاکہ یہ ہنگامہ فرو ہو۔ پنجرے کے تحفّظ کے لئے یہ احتیاطی تدبیر ضروری ہوتی ہے۔

گرفتار شدہ ہاتھی پنجرے کے اندر اس طرح اُچھ

کودتے ہیں، اس طرح نکلنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے بچے قدموں تلے آکر کچل جاتے ہیں۔

ہاتھی کے اِن کم عمر بچوں کی موت کا نظارہ بڑا تکلیف دہ اور رُوح فرسا ہوتا ہے۔ آزادی صرف اِنسانوں ہی کو عزیز نہیں بلکہ جانور بھی آزادی کے لئے خود اپنی اور اپنے عزیزوں کی زندگی قربان کر دیتے ہیں۔

یہ ہنگامہ اور یہ آزادی کی کوششیں ایک دو دن جاری رہتی ہیں، اس کے بعد یہ اسیرانِ بلا بھوک سے نڈھال تھکے ماندے راضی برضا ہو جاتے ہیں۔

پالتو اور جنگلی ہاتھی کا مقابلہ:-

اب کھیدا کا سب سے زیادہ دلچسپ مرحلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے جنگلی ہاتھیوں سے مہاوت اور پالتو ہاتھیوں کا مقابلہ۔ ظاہر ہے کہ ہاتھی جیسے عظیم الجثہ مخلوق کی گرفتاری کے بعد اُسے پنجرے سے نکالنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

کھیدے کے پنجرے میں گرفتار ہونے کے بعد ہاتھی ایک دو دن قید سے نجات حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ غلامی سے مانوس ہونے لگتے ہیں۔ اس کے اسباب سخت جد و جہد کے بعد انکی تھکن اور بھوک ہیں۔ گرفتاری کے بعد ایک دو دن تو گرفتار ہاتھیوں کو کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس دوران کھیدا پارٹی کے کچھ لوگ پنجرے کی حفاظت کرتے ہیں اور بیشتر افراد کو آرام کے لئے وقت مل جاتا ہے۔

ہاتھیوں کی گرفتاری کے ایک دو دن بعد میلاد شریف کی خاص محفل منعقد ہوتی ہے، اس محفل میں رقت کا عجیب عالم ہوتا ہے، مولانا صاحب سیرت رسولِ اکرمؐ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِنسانی زندگی کی بے ثباتی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ موت کا ایک وقت معین ہے۔ موت اپنے وقت سے نہ ایک لمحہ پہلے آئے گی نہ بعد۔ اِس لئے سچے مُسلمان موت سے نہیں ڈرتے۔ میلاد کے بعد تجربہ کار مہاوت مچان پر سے مُصافحہ کرتے ہیں، آنسو بہہ رہے ہیں اور لوگ مہاوتوں کے گلے لگ رہے ہیں۔ پھر کہا سُنا معاف کراتے ہیں۔

سِکھائے ہوئے ہاتھی دروازے تک آتے ہیں۔ اِن سدھائے ہوئے ہاتھیوں میں جو سب سے بڑا اور دانت والا ہاتھی ہوتا ہے اُسے اِس مُہم کا لیڈر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس ہاتھی کو دانتال کہتے ہیں۔ اِس موقع پر بڑا مجمع ہوتا ہے، لوگ یہ دیکھنے کے مُشتاق ہوتے ہیں کہ مہاوتوں کی غیر معمولی ہوشیاری اور بہادری کی وجہ سے پالتو ہاتھیوں کی مدد سے جنگلی ہاتھی کس طرح قابو میں لائے جاتے ہیں۔

دروازے کے باہر ایک عارضی دائرہ بنایا جاتا ہے اور مُہم میں حصّہ لینے والے ہاتھیوں کو اِس دائرہ میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور پھر دانتال۔ کُنکی یعنی مادہ ہاتھی کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک اور بڑا ہاتھی بھی ساتھ ہی اندر داخل ہوتا ہے۔ اِن ہاتھیوں کے ساتھ مہاوت بھی ہوتے ہیں۔ ذرا اِن مہاوتوں کے فولادی اعصاب، جرأت اور بہادری کا اندازہ کیجئے۔

ہاتھی سے کتنا کھانا اور کیسے کہتے ہیں؟

اِن کے اندر داخل ہوتے ہی جنگلی ہاتھی چنگھاڑنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سدھائے ہوئے ہاتھی پُوری طاقت سے جنگلی ہاتھیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ عام طور پر فاقہ زدہ جنگلی ہاتھی خوف زدہ ہو کر اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں اور اپنی سونڈیں نیچی کئے ہوئے پنجرے کے کسی کونے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ

جنگلی ہاتھیوں کا قائد مقابلہ پر آمادہ ہوجاتا ہے اور پنجرے کے اندر ایک جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ یہ بڑا ہی نازک اور جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے۔ یوں جنگلی ہاتھیوں کی پسپائی اور اعتراف شکست میں خاصی دیر لگ جاتی ہے، مگر آخر کار سدھے ہوئے ہاتھی اور اُن کے تجربہ کار مہاوت اس معرکہ میں کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔ مہاوت باہر نکالنے کے لئے کسی ایک ہاتھی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اوران کے اشاروں پر جب دانتال سدھا ہوا ہاتھی اپنا دانت کسی مضبوط سے مضبوط جنگلی ہاتھی کے جسم پہ گاڑ دیتا ہے تو وہ کانپنے لگتا ہے۔ ایک طرف سے دانتال اور دوسری طرف سے کنگی جنگلی ہاتھی کو دباتے ہیں اور غریب بالکل چپاتی ہوجاتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ہوا میں لٹک جاتا ہے۔

اِس ناکام معرکہ آرائی کے بعد جنگلی ہاتھی ایک ایک کرکے پنجرے کے باہر بیرونی دائرہ یا حصّہ میں لائے جاتے ہیں جہاں سدھے ہوئے ہاتھیوں کی قطار موجود ہوتی ہے عام طور پر سب سے پہلے تو سدھائے ہوئے ہاتھی اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، اور اُس کے بعد مہاور نڈر شکاریوں کی باری آتی ہے۔

کوئی تجربہ کار شکاری اللہ کا نام لے کر مچان سے زمین پر اُتر آتا ہے اور بڑی مہارت اور پھُرتی سے ہاتھی کے پیروں میں زنجیریں یا موٹی موٹی رسیاں باندھ دیتا ہے اور اُسی وقت بہت برق رفتاری کے ساتھ ہاتھی کا گلہ رسیوں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ لیجئے یہ عظیم الجثہ حیوان اب انسانوں کے خدمت گاروں میں ایک اور غلام کا اضافہ کراتا ہے۔ رسیوں میں بندھے ہوئے اس ہاتھی کو دوسرے سدھے ہوئے ہاتھی اپنی نگرانی میں لے کر باہر نکلتے ہیں۔ بیچ میں قیدی ہے اور اُس کے دونوں طرف اُس کے ہم جنس نگران۔ یہ ہے غلامی کی برکت۔ غلامی میں اقبال کے الفاظ میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے اور ہاتھیوں کو ایک قوم سمجھنے میں شاید کوئی بات مانع نہیں تو یہ گرفتار ہاتھی بیرون حصّہ سے تقریباً ایک ہزار فٹ دُور ایک طے شدہ مقام کی طرف بھیجے جاتے ہیں جہاں درختوں اور زمین میں مضبوطی کے ساتھ گڑے ہوئے ستونوں اور درختوں سے اُن کے چاروں پیر الگ الگ باندھ دیئے جاتے ہیں۔

یوں ہی سارے ہاتھی ایک ایک کرکے باہر نکال دیئے جاتے ہیں اور طے شُدہ مقام تک پہنچائے جاتے ہیں۔

جنگلی ہاتھی کی سدھائی: جنگلی ہاتھی کو سدھانے سے پیشتر یہ بتا دینا بھی شاید مناسب ہو کہ ہاتھیوں کو سدھایا کیوں جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہاتھی جیسا بھاری بھرکم، ہوشیار، کہنا ماننے والا اور نرم مزاج کوئی اور جانور نہیں۔ ہاتھی کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے نرم مزاج کا لفظ شاید کچھ مناسب نہ معلوم ہو۔ مگر یہ حقیقت۔ ہاتھی انسانوں کے بڑے کام آتا رہا ہے۔ انسانی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ ٹینکوں اور سائنسی آلات جنگ سے پہلے ہاتھی دشمن کی فوجوں کو کچل دیتے تھے۔ شاہی جلوسوں اور تقریبوں کا تصوّر بھی ہاتھی کے بغیر نہیں کیا جاتا تھا۔ زمانہ کے انداز بدل گئے ہیں۔ انسانیت نے ارتقاء کی کتنی ہی منزلیں طے کرلی ہیں۔ لیکن ہاتھی کی افادیت آج بھی مسلّم ہے۔ مشرقی پاکستان، برما، اور دوسرے مُلکوں میں ہاتھی جنگلوں سے بڑے بڑے لٹھوں کو اُٹھاکر دریا کے کنارے پہنچاتے ہیں، پھر منزل مقصود پر لٹھوں کو دریا سے نکالتے اور شہروں اور منڈیوں تک پہنچاتے ہیں۔ جنگلوں سے دریا کے اور منڈیوں تک کے دشوار گزار راستوں کو ہاتھی بڑی آسانی کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ ہاتھی شکار میں کام آتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ

مشرقی پاکستان کے پہاڑی اور جنگلی دریائی علاقے میں ہاتھی اس مشینی دور میں بھی انسانوں کے لئے وہ کچھ کرتے ہیں جو مشینیں کر سکتی ہیں۔ دہاں کے راستے دشوار گزار ہیں۔ کہیں جنگل ہیں کہیں دلدل، کہیں چھوٹے چھوٹے دریا۔ ہاتھی ان میں سے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا ہے اس لئے ذرائع آمد و رفت اور وسائل حمل و نقل میں اس کی افادیت اور ضرورت مسلّم ہے۔ اس کے علاوہ انسانی تفریحات میں بھی ہاتھی حصہ لیتا ہے۔

ہاتھیوں کی سدھائی اور تربیت اُن کی گرفتاری کے مقام سے شروع ہو جاتی ہے۔ نوگرفتار ہاتھی کتنے دن تو سر ٹپکتے رہتے ہیں۔ چاروں پیر بندھے ہوتے ہیں اور جسمانی اذیت آزادی کے جذبے کو کچلتی رہتی ہے۔ بے چارے بے بس ہو کر پیٹھ کے بل زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کم عمر کے ہاتھی تو ایک ہفتہ ہی میں راضی بہ رضا ہو کر انسان کے اشاروں اور آوازوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن بڑی عمر کے ہاتھیوں کو رام ہونے اور اپنی وحشت کو خیرباد کہنے میں دو تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ ہاتھی اس مقام پر ایک دو مہینے رکھے جاتے ہیں۔ ان کی تربیت اور سدھائی سدھے ہوئے ہاتھیوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

جنگلی ہاتھی اپنے ہم جنسوں کو آدمی کے اشارے پر چلتے ہوتے اور اس کی بولی پر کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور خود بھی ویسا ہی کرنے لگتے ہیں۔ مہاوت بھی ہاتھیوں کی نفسیات کے ماہر ہوتے ہیں۔ ہاتھیوں کو سدھانے کے لئے انہوں نے کتنے ہی الفاظ گھڑ لئے ہیں، جنہیں اصطلاحات کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ کچھ اصطلاحیں اور اُن کے معنی سُنیئے :۔

بیت۔ بیٹھ۔ دو زانو ہو جاؤ۔
بھیر۔ بھیریا کھا۔ بازو کی طرف ہٹو۔
بَری۔ چھوڑ دو۔ گرا دو۔
یک کھول۔ پہلو بدلو۔
رِیک۔ دیکھ
ڈیک لمبا۔ آگے ہو جاؤ۔ پار ہو جاؤ۔
دَھت۔ رُک جاؤ۔
ڈُوب۔ پانی میں غوطہ لگاؤ۔
دَم۔ دَم رکھ۔ دُم مت ہلاؤ۔
جُگ۔ سامنے سے دھڑ نیچا کرو۔
جُوڑ۔ پیر ہلاؤ۔
کوئی بیٹ۔ پچھلے پیروں پہ دو زانو ہو جاؤ
مار۔ حملہ کرو۔
مار دوب ۔ توڑ کر ٹکڑے کر ڈالو۔
میل مُت۔ اُٹھ چل۔
رد پر ڈری۔ اوپر درخت کی شاخ توڑ ڈالو۔
سنے۔ گھوم جاؤ۔
سوپ۔ پانی پیو۔
سوپ ڈالی۔ پانی سونڈ میں لیکر پیٹھ پر چھڑکو۔
سم۔ پیروں کو چاروں طرف پھیلا کر کھڑے ہو جاؤ۔
سم بیٹ۔ اسی طرح بیٹھ جاؤ۔
بڑی۔ لیٹ جاؤ۔
بڑی بیٹ۔ ایک طرف جھک کر بیٹھ جاؤ۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ احکام اور اصطلاحیں کتنی وسیع ہیں، ان کے ذریعہ ہاتھی کو حسب مرضی چلایا، بٹھایا اور روکا جا سکتا ہے۔ مختلف کام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً شاخیں تڑوانا۔ حملہ کرانا۔ یہ تو چند اصطلاحیں ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سی اصطلاحیں اور بولیاں ہیں جنہیں ہاتھی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اُن پر عمل کرتے ہیں۔

ایک دو ماہ کی ابتدائی تربیت کے بعد ہاتھیوں کو سدھے ہوئے ہاتھیوں کی مدد سے انکی مختلف منڈیوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ ابتدائی تربیت ضروری ہے تاکہ نوگرفتار ہاتھی آسانی کے ساتھ اپنا یہ سفر طے کر سکیں اور

واپسی میں کوئی زحمت نہ ہو۔

شہروں اور ہاتھیوں کی منڈیوں میں سدھائی کا کام جاری رہتا ہے۔ ہاتھیوں کے مختلف تربیتی کیمپ قائم کئے جاتے ہیں۔ مہاوت انہیں حکم دیتے ہیں اور وہ تعمیل کرتے ہیں اور پھر منڈیوں میں ان ہاتھیوں کو بیچ دیا جاتا ہے۔ یہ تربیت چار سے چھ ماہ تک جاری رہتی ہے۔ کم عمر ہاتھی اس عرصے میں پوری طرح سدھ جاتے ہیں۔ لیکن سرکش اور بڑی عمر کے ہاتھی کی تربیت میں اس سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ یہ بات کوئی انوکھی اور عجیب نہیں ہے۔ بچے نئی چیز جلد سیکھ لیتے ہیں اور پختہ عمر کے لوگوں کے لئے نئی بات سیکھنا اور اپنی عادتوں کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے چھ مہینے کے عرصے میں ہاتھی اپنے ماضی کو بھول جاتے ہیں۔ جنگل میں اپنی آزاد زندگی کا شاید کوئی تصور اُن کے ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ سدھے ہوئے ہاتھیوں کی موجودگی ہوتی ہے۔ گزشتہ سطور میں ہاتھیوں کے اجتماعی حس اور تنظیم پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس اجتماعی حس کی وجہ سے نوگرفتار ہاتھی سدھے ہوئے ہاتھیوں کی تقلید کرتے ہیں اور اُنہیں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

آخر میں ایک بات اور ہاتھی کے بارے میں۔ ہاتھی نرم مزاج ہوتا ہے اور محبت کی مار تو برداشت کر لیتا ہے لیکن زیادتی، نفرت، یا غم کے اثرات اس کے ذہن پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ دو تین سال پہلے آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک ہاتھی نے چاٹگام ہل ٹریک کے ایک انگریز آفیسر کو بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ کیونکہ اُس کے دانت اسی افسر کے حکم سے نکالے گئے تھے؟

(مشرقی پاکستان میں اردو شاعری (جسیم الدین))

نظر کی وسعتوں پہ منحصر ہے لطفِ نظارہ
یہی نقشِ جہانِ فانی، یہی نقشِ جہانِ باقی

ہمیشہ آمادۂ ترکِ وطن ہیں ہجرت کے ایما پر
خراب آبادِ غربت میں بھی غیرت پاسباں ٹھہری

ان تمام روایتی اور ترقی پسندانہ رجحانات کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے دبستانِ شاعری کا طرۂ امتیاز بنگلہ نظموں کے اُردو تراجم ہیں۔ اس میدان میں احسن احمد اشک، یونس احمر، اور راقم الحروف نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کیا ہے، بالخصوص اشک اور یونس احمر نے نذر الاسلام، جسیم الدین اور دوسرے مشاہیرِ بنگلہ کے منظوم ترجموں سے پاکستان کی تہذیبی و فکری وحدت کی جدوجہد کو بہت آگے بڑھایا ہے۔

مقالہ میں ابو المکارم سلیم الدین فہمی نے شاید انکسار کی بنا پر اپنے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کیا ہے آپ گنتی کے ان دو ایک بزرگوں میں ہیں جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ اُردو بنگلہ اور انگریزی تینوں زبانوں میں یکساں طور پر قدرت رکھتے۔ کلاسیکی اور روایتی انداز میں نوک پلک سے درست، صاف ستھری غزلیں کہتے ہیں، مگر جدید رجحانات کے بڑے حامیوں میں ہیں۔ حافظہ بلا کا ہے۔ جہاں اُردو اور بنگالی اساتذہ کے سینکڑوں اشعار ازبر ہیں وہاں نوجوانوں کے بے شمار اچھے اشعار بھی ان کی نوک زبان پر ہیں۔

شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہو کہ آزادی کے بعد وحشت اور ناطق مرحوم کو کلکتہ سے مشرقی پاکستان بلانے میں سلیم اللہ فہمی کا ہاتھ تھا۔

سرکاری ملازمت کے دوران سلیم اللہ فہمی مشرقی پاکستان کے جس گوشے میں بھی گئے وہاں شعر و ادب کا چراغ روشن کیا۔ آپ ادھر تین سال سے کراچی میں مقیم ہیں۔ مگر یہاں کے پرانے نئے اور ابھرتے ہوئے ہر شاعر اور ادیب (خواہ وہ بنگالی زبان کا ہو یا اُردو زبان کا)، کی جدید ترین تخلیقات سے واقف ہیں۔

(ادارہ)

پُرانا قلعہ۔ ڈھاکہ

یوں تو دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ڈھاکہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے بسایا گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو مگر اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ یہ شہر ساتویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ گپت عہد کے ملا دٹ والے سونے کے سکے اس امر کی شہادت دیتے ہیں، اور اس حقیقت سے تو کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں کے زمانۂ عروج میں یہ شہر ابھرا تھا اور پھر ۱۶۰۸ء میں جب بنگال مُغلوں کے زیر حکومت تھا یہ اس صوبہ کا پایۂ تخت بنا دیا گیا۔

جہاں ڈھاکہ کی وجہ تسمیہ اور بھی بہتیری بتائی جاتی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ڈھکّا پر اس کا نام پڑا، ڈھکّا کے معنی ہیں ایسی جگہ جہاں سے پہرہ دیا جاسکے، بالفاظ دیگر اسے "چوکی" کہیئے، ڈاکٹر ڈی سی سرکار نے "بھارتیہ ودّیا" میں یہ تاویل کی ہے۔ اُنہوں نے اوریل اشٹین کی تصنیف "راج ترنگنی" کا حوالہ بھی دیا ہے، بات اس طرح سمجھائی ہے کہ چونکہ یہ شہر بلندی پر واقع ہے اس لئے ہندو راج کے دو پایۂ تخت یعنی بکرم پورا اور سونار گاؤں کے لئے یہ ڈھکّا پاسبان کے فرائض انجام دیتا تھا، پراکرت زبان کی ایک شاخ ڈھکّا بھاشا بھی ہے مُصنّف کا کہنا یہ ہے کہ یہ زبان ڈھاکہ کے قرب و جوار میں عرصے سے بولی جاتی تھی۔ ڈھکیّا پراکرت کا تذکرہ جوتیندرا موہن رائے کی کتاب "ڈھاکا را اتہاس" میں بھی ملتا ہے اور یہ کتاب بہت پہلے کی تصنیف ہے۔

ڈھاکہ کی حفاظت کیلئے متعدد قلعے تھے اور یہ اس مقصد کیلئے تعمیر کیے گئے تھے کہ پُرتگیز اور مگھ بحری ڈاکوؤں کے حملوں کی مدافعت میں کام آئیں۔ شہاب الدین ناشن کی تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بحری قزاق دریاؤں اور نالوں کی راہ سے لوٹ مار اور اغوا کی نیت سے ڈھاکہ آتے تھے۔ یہ آبی راہ برہم پترا سے خضر پور اور خضر پور سے ڈھاکہ تک تھی۔ عموماً برسات ختم ہوتے ہی اور پورے جاڑے بھر یہ خطرہ رہتا تھا۔ ڈھاکے کے ناظم اس مدّت بھر خضر پور میں فوج سمیت پڑاؤ ڈالے پڑے رہتے تھے۔ کئی سال بعد جب ڈھاکہ والا نالہ سوکھ گیا اور برہم پترا بھی کئی جگہ سے پایاب ہوگیا تو اس آبی راہ کی جانب سے خطرہ جاتا رہا، لیکن اب بھی جاترا پور اور وکرم پور کی طرف راہ کھلی تھی اس لئے اب اس جانب مدافعت کے سامان کرنا پڑے اور ادھر سے ڈھاکہ آنے والی بحری راہ کے ہر موڑ پر قلعے بننا شروع ہوگئے۔

اِن میں سے ایک وہ قلعہ تھا جو پہلے "پُرانے قلعے" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ اُس مقام پر واقع تھا جہاں اب ڈھاکہ سنٹرل جیل ہے۔ اس قلعے کے متعلق تحقیق نہ ہو سکی کہ کس زمانے میں کس نے بنا ڈالی اور کب اور کس کی کوشش سے تعمیر کی تکمیل ہوئی۔

ڈھاکہ اور اُس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے قلعے بے شمار تھے اور میر جملہ نے ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کیا۔ بیگ مراد خاں کے دو قلعے ڈیمرا کے قریب تھے۔ رینیل کے نقشے میں ہمیں دو قلعے فتح اللہ کے دو جانب

نظر آتے ہیں، ان میں مشرق والا قلعہ آبی بھی قلعہ دھوبا (دھوبی) کہلاتا ہے۔ دولائی کھال کے دہانے پر خضر پور کا قلعہ تھا، اور یہاں سے ایک میل آگے دریائے لکھا کے کنارے قلعہ سونا کاندا تھا، یہ آج بھی بڑی اچھی حالت میں محفوظ ہے۔ اس کے ٹھیک جنوبی خطِ مستقیم پر اچھامتی دریا کے جنوبی کنارے اوراک پور کا قلعہ تھا، اب یہ منشی گنج کا علاقہ ہے۔ میرزا ناتھن نے ایک پرانے شکستہ قلعہ کا ذکر کیا ہے جس کو پہلے مگھ راجہ نے بنایا تھا اور بعد کو جس کی مرمت موسیٰ خاں کے زمانے میں ہوئی۔ یہ قلعہ تاریخی حیثیت سے اسی لئے اہم ہے کہ یہ مغلوں کے حملے کے خلاف مدافعت میں بہت مفید ثابت ہوا تھا، یہ وہی قلعہ ہے جو آج ہمیں سونا کاندا میں نظر آتا ہے۔ یہ مقام موجودہ ریل اور اسٹیمر اسٹیشن نرائن گنج کی دوسری جانب ہے۔ ڈھاکہ کا قلعہ بھی اصل میں اسی طرح کی ایک چوکی مغلوں کے زمانے میں رہی ہوگی اور یہ چوکی یقینی اسلام خاں کے زمانے سے پہلے موجود تھی۔

قلعوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا ناتھن لکھتے ہیں:۔

گوڑ اب نگر عرف راج محل، گھوڑا گھاٹ، ڈھاکے اور چند ہی ایسے مقامات کے علاوہ بنگالہ میں کوئی پرانے قلعے نہیں تھے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جوں ہی ایک قلعہ کی ضرورت پیش آگئی کشتی بانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلعہ بناکر کھڑا کر دیا، اور یہ قلعہ ایسا ہوتا تھا کہ تعمیر قلعہ کے ماہر فن مہینوں کیا برسوں میں ایسا تیار نہ کر سکتے تھے، مرزا نے یہ باتیں اُس وقت لکھی تھیں جبکہ مغل فوجیں ڈھاکے تک نہیں آئی تھیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام خاں کے آنے سے پہلے ہی ڈھاکے میں یہ قلعہ موجود تھا، ابراہیم خاں نے اس قلعے کے اندر ایک عالیشان محل بنوایا تھا، اس محل کا ذکر اور اُسکی تعریف مرزا ناتھن نے شاہزادہ خرم (جو بعد کو شاہجہاں ہوا) کے آنے کے سلسلے میں کی ہے۔ شاہزادہ خرم نے ابراہیم خاں کو شکست دی اُسے تہ تیغ کیا اور صوبہ بنگالہ کو مغلوں کی ملک بنالیا۔

ڈھاکے کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کم از کم پانچ مغل شہزادے یہاں تشریف لائے اور ہر ایک نے کوئی نہ کوئی عمارت یا نیا قلعہ اپنی یادباقی رکھنے کے لئے یہاں چھوڑا، ان تاریخی عمارتوں کا ذکر اختصار کے ساتھ حکیم حبیب الرحمٰن، منشی سلطان علی طپش اور جناب طیفور نے اور تفصیل کے ساتھ جناب احمد حسن دانی نے اپنی اپنی تصنیفات میں کیا ہے اور اس باب میں اب یہی تذکرے ہمارے لئے رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں جن میں سے آخر الذکر سب سے اہم اور سیر حاصل ہے۔

قلعہ اورنگ آباد جسے عرف عام میں لال باغ کا قلعہ کہتے ہیں اور اب متفقہ طور پر ڈھاکے کا پرانا قلعہ سمجھتے ہیں، خصوصی توجہ اور تفصیل چاہتا ہے، یہ قلعہ ۱۶۷۸ء میں اورنگ زیب کے تیسرے لڑکے شہزادہ محمد اعظم کے ایما پر بننا شروع ہوا تھا، شہزادہ اعظم ان دنوں یہاں صوبہ دار تھے، لیکن اس قلعے کی تکمیل سے پہلے شہنشاہ اورنگ زیب نے شہزادہ محمد اعظم کو دلی واپس بلا لیا، اس لئے کہ اُس زمانے میں مرہٹوں سے جنگ چھڑی ہوئی تھی اور محاذ پر شہزادہ محمد اعظم کی ضرورت سمجھی گئی، اس کے بعد امیرالامرا نواب شائستہ خاں یہاں کے صوبے دار متعین ہوئے، لیکن انہوں نے اپنی بیٹی بی بی پری کے اچانک انتقال کے سبب جو شہزادے محمد اعظم کی زوجہ تھی، اس قلعے کی تعمیر کو منحوس جان کر اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس طرح قلعہ نامکمل رہ گیا، اورنگ زیب نے اس قلعے کو نواب شائستہ خاں کی جاگیر میں مرحمت

کر دیا، جس کے مالک اس کے ورثا ٹھہرے، لیکن سنہ ۱۸۵۰ء میں ان کے ورثا نے قلعۂ مذکور حکومت کو قائمی بندوبست میں دیدیا اور اس کے عوض ساٹھ روپے سالانہ پاتے رہے، اب یہ قلعہ گورنمنٹ کے تصرف میں ہے، قلعہ کی موجودہ ہیئت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کبھی مکمّل نہ ہوا تھا، پُرانی اسناد سے یہ بھی معلوم کیا گیا ہے کہ لال باغ نہ صرف نواب کی جائے اقامت تھی بلکہ اسے ایک قید خانے کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا تھا، جس میں کچھ انگریز نظر بند رہتے تھے، بہرحال اس قلعہ کی تعمیر کا مقصد وہی تھا جو شاہی محلوں سے منسلک قلعوں کا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی دفاعی یا دماغی حیثیت نہ تھی۔

قلعے کے جو آثار آج ہمارے سامنے ہیں، اُن میں شمالی اور جنوبی دروازے اور دو ہزار فٹ لانبی دیوار خاص طور سے نمایاں ہیں، دونوں بلند دروازوں کے درمیان آٹھ سو فٹ کا فاصلہ ہے، جنوبی دروازے سے جنوبی مغربی گوشے تک اور قریب قریب پُورے مغربی حصّے میں بُرجوں کے سلسلے میں اس طرح شمالی دروازے اور شمالی مغربی گوشے کے درمیان ایک چھوٹا دروازہ اور ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس حصّے میں کوئی دیوار تعمیر ہوئی ہے، جنوبی مغربی گوشے سے آگے شہر کے دروازے کے کھنڈر نظر آتے ہیں، کبھی زمانے میں عمارت کا یہ حصّہ دریائے بوڑھی گنگا سے وابستہ تھا، لیکن اب دریا کا ساحل دُور ہٹ گیا ہے اور اس چھوٹی ہوئی جگہ کو سبزہ اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں نے پُر کر دیا ہے۔

قلعے کے پُشتوں کے اُوپر چھجہ دار دیواریں ہیں جن میں مُستطیل دریچے بنے ہوئے ہیں، جنوبی مشرقی گوشے کے مشرق میں جو کھنڈر پڑے ہیں اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مزید مضبوطی کے خیال سے اینٹوں کی دیواروں کے پیچھے مٹی کے پُشتوں کی تعمیر بھی زیرِ غور تھی، اس لئے کہ اس حصّے میں کہیں کہیں کچے پُشتے اب بھی نظر آتے ہیں، اس کچے پُشتے میں ایک تہ خانہ بھی ہے۔ جس میں داخلہ کے لئے ایک محراب دار دروازہ اب بھی موجود ہے، اس پُشتے کے مشرقی جانب ایک اینٹوں کی عمارت ہے جو جنوبی دروازے تک چلی گئی ہے۔

اِس عمارت اور جنوبی مشرقی گوشے کے درمیان پانچ ہشت پہل بُرج ہیں، جن میں فصیلوں کی سطح تک مٹی بھری ہوئی ہے، دروازے سے ملحق بُرج، غیر معمولی حجم کا ہے جس سے توپ رکھنے کا ایک چبوترہ بھی وابستہ ہے۔ اس چبوترے کا عرض تیرہ فٹ ہے، جنوبی مشرقی گوشے کے مینار سے بھی ایک چبوترہ وابستہ ہے، لیکن اس کا عرض صرف پونے پانچ فٹ ہے، یہ تمام پُشتے اور دیواریں، پچی کاری کے خوبصورت کام سے آراستہ ہیں جو فنِ تعمیر کے نادر نمونے فراہم کرتا ہے، لیکن حال ہی میں جنوبی دروازے اور ملحقہ بُرج کے درمیان حکومت پاکستان کی طرف سے محکمہ آرکیولاجی کے لئے ایک عمارت تعمیر کرا دی گئی ہے جس نے پُورے قلعے کے قدیمی حُسن اور تاریخی عظمت کو اپنے دامن میں چھُپا لیا ہے اور مشرقی پاکستان کی ایک یادگار تعمیر کے وقار کو بڑا صدمہ پہنچایا۔

فنی اعتبار سے لال باغ قلعہ کا جنوبی دروازہ نامکمل ہونے کے باوجود حسن و تقدس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، یہ ایک سہ منزلہ تعمیر ہے جس کی پیشانی پر شبّا مناروں کی ایک خوبصورت جھالر ہے، دروازے بالائی حصّہ نامکمل ہے، لیکن باقی عمارت اپنی خوبصو

اور دلکشی میں قدیم فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے جس کی محرابیں، دریچے، دیواریں اور گنبد اپنی تمام توسیعات اور تفصیلات کے ساتھ آج بھی اس عہد کے عظیم معماروں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

شمالی اور جنوبی دروازوں کے درمیان دو سو بتیس مربع فٹ ایک خوبصورت "تخت الآب" ہے جو شکستہ حالت میں ہونے کے باوجود اب بھی اپنے اندر ایک جاذبیت رکھتا ہے۔ اس تالاب کے مشرقی جانب تقریباً ایک سو بیس فٹ کے فاصلے پر ایک دو منزلہ عمارت اور ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں شہزادے جلوس فرمایا کرتے تھے۔ شاید اس کا بالائی حصہ کبھی اس مصرف میں بھی آتا رہا ہو لیکن موجودہ صورت میں جب کہ عمارت میں خاصی قطع برید ہو چکی ہے اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ اس دربار و جلوس سے متعلق کسی ایک خاص کام کا ذکر بھی اکثر سننے میں آیا ہے لیکن اب اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ مقبرے کی جانب تقریباً تین سو فٹ اور آگے چل کر ہمیں بی بی پری کا مقبرہ ملتا ہے اور اس مقبرے سے بھی ایک سو بیس فٹ دور مغربی جانب ایک چھوٹی سی سہ گنبدی مسجد ہے۔ روایات کے مطابق یہ مسجد بھی شہزادہ محمد اعظم کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی ــــ یہ مسجد ایک اونچے چبوترے کی پشت پر واقع ہے، اور اپنے طول میں پھیلی ہوئی ہے۔ مسجد کا طول ۶۵ فٹ اور عرض ساڑھے تیس فٹ ہے۔ جس کے چاروں گوشوں پر مینار ہیں۔ جن کے سروں پر پلاستر کے تاج نما چھوٹے چھوٹے خوبصورت گنبد ہیں، مشرق کی جانب داخلے کے لئے تین دروازے ہیں۔ درمیان کا بڑا اور جانبین کے نسبتاً چھوٹے، ہر دروازے کے چاروں گوشوں پر سنگ اور چینی مینا سے بنے ہوئے ہیں اور دروازوں کی چھتوں کے زیریں حصے چھوٹی چھوٹی منقش محرابوں سے آراستہ ہیں۔

مسجد کی خاص چھت پر تین خوبصورت گنبد ہیں، جن میں درمیانی گنبد، باقی دو گنبدوں سے بڑا ہے، ان گنبدوں کے اندرونی حصے یعنی مسجد کے اندر بیل بوٹوں کا نہایت خوبصورت اور رنگین کام ہے، درمیانی گنبد مسجد کے پورے عرض کو گھیر لیتا ہے۔ قلعہ لال باغ کے سلسلے میں بی بی پری کے مقبرے کا ذکر بھی ضروری ہے اس لئے کہ یہ مقبرہ اس قدیم عمارت کا اہم جزو ہے جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، بی بی پری نواب شائستہ کی دختر نیک اختر تھیں جو شاہزادہ محمد اعظم سے منسوب تھیں۔ بی بی پری کو ایرانہ دخت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۶۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے اپنی چہیتی بیٹی کی یاد میں یہ مقبرہ بڑے اہتمام اور تکلف سے تعمیر کرایا تھا، چنانچہ تصدیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس عمارت کی تعمیر کے لئے ضروری سامان تعمیر شمالی ہند سے منگایا گیا تھا، حتیٰ کہ مختلف قسم کے جو پتھر اس مقبرے کی تعمیر میں استعمال ہوئے ہیں وہ راج محل، چنار اور جے پور سے خصوصیت کے ساتھ اسی مقصد سے لائے گئے تھے۔ قلعہ لال باغ کی چہار دیواری میں یہی ایک تاریخی عمارت ایسی ہے جو ہر حیثیت سے مکمل کہی جا سکتی ہے، یہ مقبرہ ایک پتھر کے چبوترے پر قائم ہے، خارجی طور پر اس کا رقبہ ۶۰ مربع فٹ ہے جس کے چاروں گوشوں پر ہشت پہل گنبدوں والے چار مینار ہیں اس مقبرے کے تین دروازے ہیں۔ درمیانی دروازہ حسن کے اعتبار سے بہت پر تمکنت ہے اور باقی دو دروازے نسبتاً چھوٹے اور سادہ ہیں۔ چھت کے اوپر تانبے کا ایک گنبد ہے جس کی قلعی کبھی طلائی تھی۔ مقبرہ کا اندرونی حصہ

نو حصّوں پر منقسم ہے۔ بالکل بیچ میں تقریباً چار سو مربع فٹ کا ایک بڑا کمرہ ہے جس میں بی بی پری کی قبر ہے۔ چاروں گوشوں پر چار چھوٹے کمرے ہیں جن میں سے ہر ایک سوا دس فٹ لانبا اور اسی قدر چوڑا ہے۔ باقی حصّوں میں چار مُستطیل غلام گردشیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک تقریباً پچیس ۲۵ فٹ لانبی اور گیارہ فٹ چوڑی ہے۔ قبر والے کمرے میں چار دروازے ہیں۔ جن میں سے تین سنگ مرمر کی جالیوں سے بند کر دئے گئے ہیں۔ اور مغربی دروازہ آمد و رفت کے کُھلا رکھا گیا ہے۔ جس میں صندل کی لکڑی کا منقش کواڑ لگا ہوا ہے، اس پر کچھ چینی نقش بنے ہوئے ہیں۔ کمرہ کی دیواریں اور فرش سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے درمیان سیاہ خطوط ہیں۔ فرش کے بالکل وسط میں قبر ہے جس کی وضع چاروں طرف سے ایسی ہے جیسے تین زینے والی سیڑھیوں والے زینے کی، ان سیڑھیوں پر پھول پتیوں کا رنگین کام ہے۔ لیکن اس کمرے کی چھت میں ہندو فنِ تعمیر کی جھلک ہے جس کی شکل مخروطہ منارہ یعنی پیرامیڈ کی سی ہے۔ گویا چھت کو اس تانبے کے گنبد کا خلا سمجھنا چاہیئے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ غلام گردشوں کی دیواریں بھی ایک محدود سطح تک سنگ مرمر کی بنی ہوئی جبکہ گوشوں والے کمرے چمکدار پتھر کے بنے ہوتے تھے، لیکن ان میں اس پتھر کا کہیں پتہ نہیں۔ دیواروں پر صرف چُونے کی سفیدی ہے۔ ان کمروں کی چھتوں کا بھی وہی نمونہ ہے جو قبر والے کمرے کا جنوبی مشرقی کمرے میں بی بی پری کی کسی قریبی عزیز شمشاد بیگم کی قبر ہے اور چبوترے کے جنوبی حصّے پر شریفہ بی بی کی قبر ہے۔ جو سائستہ خاں کے پوتے خدا بندے خاں کی نسل سے تھیں۔ اس مقبرے کی تعمیر میں یقیناً تاج محل اور مقبرہ ہمایوں کے نمونوں سے اکتساب کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس حیثیت سے مشرقی پاکستان میں اس مقبرہ کو ایک نادر الوجود تاریخی عمارت سمجھنا چاہیئے۔ تاکہ لال باغ کی کسی عمارت کا ذکر باقی نہ رہ جائے۔ اس سلسلے میں فرخ سیری مسجد کا ذکر بھی ضروری ہے جو جنوبی دروازے کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ مسجد شہنشاہ فرخ سیر کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ بات ۱۷۰۳ء کی ہے جب وہ شہنشاہ نہ تھے بلکہ شہزادہ فرخ سیر تھے اور اپنے والد شہزادہ عظیم الشان کے قائم مقام کی حیثیت سے ڈھاکہ میں قیام پذیر تھے۔ یہ مسجد کافی وسیع و عریض ہے جسکا طول ۱۴۲ فٹ اور عرض ۴۵ فٹ ہے اور اس میں ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس حیثیت سے یہ مسجد ڈھاکے کی سب سے بڑی مسجدوں میں سے ایک ہے۔ ابتداً اس کی چھت لکڑی کی تھی لیکن جب امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں شکستہ ہوگئی۔ ڈھاکے کے نواب سر عبدالغنی نے آج سے تقریباً اسّی برس پہلے از سر نو اس کی مرمت کرائی تھی۔ اس سلسلے میں منارۂ اذان کا بھی اضافہ کیا گیا تھا اس قسم کے مینار ڈھاکہ کی مسجدوں کے طرۂ امتیاز ہیں اور یہاں کی بیشتر مسجدوں میں موجود ہے۔

مختصر یہ کہ لال باغ کا قلعہ جو صرف ایک تاریخی عمارت نہیں۔ بلکہ کئی تاریخی عمارتوں کا مجموعہ ہے۔ اپنی نامکمل شکل میں بھی مُغلیہ دورِ حکومت کی ایک قیمتی یادگار ہے اور اُس زمانے کے فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کے باقیات کا تحفظ پاکستان کی دوسری تاریخی عمارتوں کے تحفظ کی طرح گویا اسلامی کلچر اور اسکی عظمتِ رفتہ کا تحفظ ہے۔

سلیم اللہ فہمی

ڈھاکہ کی پرانی مسجدیں!

(۱) بنگالہ کا دارالسلطنت گوڑ تھا۔ نصیر الدین محمد شاہ کی حکومت تھی۔ ڈھاکہ ابھی آباد نہیں ہوا تھا۔ تھوڑے سے مسلمان نرائنڈ پل کے اتر جانب آ بسے اور وہیں ایک گنبد کی چھوٹی سی مسجد بنائی، جو آج تک موجود ہے۔ نام بینت بی بی کی مسجد ہے کتبہ میں لکھا ہے ؎

شد مزین بہ بانگ اہل فلاح
مسجد ایں غریب لیل و صباح
مسماۃ بخت بینت، دختر مرحمت ۸۶۱ھ ہجری۔
یہ مسجد گویا ۱۴۵۶ء عیسوی کی تعمیر ہے۔

(۲) مسجد کوچۂ ناسوالا، محلہ گردقلعہ ۸۶۳ھ مطابق ۱۴۵۸ء سلطان ناصر الدین ابو المظفر محمود شاہ کے زمانے میں یہ مسجد بنی، ۴ فٹ چوڑی دیواریں ہیں۔ اندر کا حصہ ۲۷ فٹ لانبا اور ۱۶ فٹ چوڑا ہے۔ ۱۸۹۷ء کے زلزلے میں اس کا گنبد جو پہلے سے ٹوٹ چکا تھا گر پڑا۔ عربی میں اس کا کتبہ ہے اس سے تعمیر کی تاریخ شعبان ۸۶۳ھ نکلتی ہے۔

(۳) اسلام خاں نے ڈھاکہ شہر آباد کرنے کے بعد اپنے رہنے کے لئے مکان بنوایا۔ اس کا اب نشان بھی نہیں، لیکن وہ محلہ اسلام پور کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے وہیں عاشق جمعدار لین میں ایک مسجد بنوائی تین گنبد والی پرانی وضع کی، لیکن شائستہ خاں کی بنائی ہوئی دوسری عمارتوں سے مختلف۔ تعمیر ۱۶۰۸ء کی ہے۔

(۴) ڈھاکے کی عیدگاہ بھی بہت پرانی ہے، میر ابو القاسم نے اسے ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء شاہ شجاع کی صوبہ داری کے زمانے میں بنوائی۔ شعر کا ایک کتبہ اس کا ثبوت دیتا ہے۔

(۵) چوک کے پچھم پاؤ میل پر محلہ چوڑی ہٹہ میں ایک مضبوط مسجد ہے۔ ۵ فٹ چوڑی دیواریں۔ اندر کی جگہ ۳۰ فٹ لانبی اور ۱۴ فٹ چوڑی ہے کہا جاتا ہے کہ ایک ہندو آفیسر نے جس کے ذمہ مسجد کی تعمیر تھی اسے مندر بنا ڈالا۔ سلطان شجاع نے جو اس وقت یہاں صوبہ دار تھا اسے مسجد کی شکل دی۔ کتبہ عربی نثر میں ہے اور آخر میں یہ فارسی اشعار درج ہیں ؎

یافت در عہد شاہ زادہ شجاع
کفر ز اسلام مستقیم شکست
عامہ اکنون کہ بردستاد قضا
نقش ایں مسجد شریف بہ بست
از خرد سالِ ایں بنا جستم
گفت فی الفور آں خدائے پرست
کاف کفر او ز کفر دور کنی
می بر آید ز لفظ کفر شکست

اس سے تاریخ ۱۰۲۰ھ یعنی ۱۶۴۹ء نکلتی ہے۔

(۶) نرائنڈ پل کے دکن حیات بیوپاری کی بنائی ہوئی ایک مسجد ہے اس کا سنہ تعمیر ۱۰۷۴ھ مطابق ۱۶۶۴ء ہے۔ ۱۰۰ بیگھے کی جاگیر اس مسجد کے لئے وقف تھی۔

(۷) ۱۶۶۴ء میں بوڑھی گنگا کے کنارے بابو بازار میں شائستہ خاں نے اپنے مکان کے ساتھ ایک مسجد بنوائی

یہ تین گنبد کی بڑی مضبوط عمارت ہے۔ شائستہ خاں کے محل کا پتہ نہیں لیکن مسجد اب بھی موجود ہے۔ مسجد کا کتبہ آگ لگ جانے کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے اور حروف مٹ گئے ہیں۔

(۸) چوک کی مشہور اور بہت آباد مسجد شائستہ خاں کی بنوائی ہوئی ہے ۱۶۷۶ء میں تیار ہوئی۔ کافی عظیم الشان ہے۔ تین گنبد ہیں۔ طول مع چبوترہ اور صحن ۹۴ فٹ عرض اسی فٹ۔ بلندی ۱۰ فٹ۔ صرف نماز ادا کرنے والے حصے کا طول ۵۰ فٹ اور عرض ۲۵ فٹ ہے۔ نائب ناظمان ڈھاکہ عیدین کی نماز یہاں پڑھتے تھے۔ بڑا کمرہ اور حوض حاجی فقیر محمد صاحب نے بنوایا ہے۔ کتبہ سنئے:-

شائستہ باحق امیر الامراء
از صدق بساخت مسجدے بہر خدا
طالب ز خود چوں جست تاریخ بنا
گفتم کہ شد از لطف خدا فرض ادا

(۹) شہر کے اُتر اور رامنہ میدان کے دکھن کاشمیری سوداگر حاجی شاہ باز خاں نے شاہزادہ محمد اعظم کے عہد صوبیداری میں یہ مسجد تعمیر کرائی ۱۰۸۹ھ مطابق ۱۶۷۹ء سہ گنبدی بہت بڑی ۶۸ فٹ طول ۲۶ فٹ عرض۔ تین دروازے پورب کی طرف اور ایک ایک اُتر اور دکھن۔ منبر اور چوکھٹیں پتھر کی ہیں:-

ساخت حاجی خواجہ شہباز ایں بنائے پاک را
آنکہ در رفعت بعرش اعظم انباز آمدہ
بر زبان عقل کل تاریخ ایں بنیاد پاک
مسجد زیبا ز حاجی خواجہ شہباز آمدہ

(۱۰) ڈھاکہ کے [illegible] میونسپل حدود سے ۲ میل دور کرانی گنج میں جو پہلے جعفر آباد کہلاتا تھا۔ ایک عالی شان تین گنبد والی مسجد ہے۔ گنبد تین ہیں لیکن چار کونوں پر چار ہشت [illegible]

سے مشہور ہے۔ مسجد اونچی جگہ پر ہے اور اس کے بعد دور تک نشیب ہے۔ پہلے یہ مسجد عین دریا کے کنارے تھی۔ اب دریا ایک میل ہٹ گیا ہے۔ نماز کا صحن بہت بڑا ہے ۸۵ فٹ (لانبا) ۲۷ فٹ (چوڑا) کتبہ اس کا نہ معلوم کیا ہوا لیکن روایت سے کہا جاتا ہے شائستہ خاں نے خود اسے بنوایا۔ مسجد کے پورب ۱۰۰ گز پر نواب شائستہ خاں کی دو بیٹیوں کی قبریں ہیں۔

(۱۱) [illegible] روڈ ریلوے کراسنگ کے ٹھیک اُتر خواجہ عنبر کی مسجد ہے اورنگ زیب کے زمانے میں نواب شائستہ کے خواجہ سرا عنبر نے اسے بنوایا ۱۰۹۰ھ مطابق ۱۶۸۰ء تین گنبد والی مسجد مضبوط اور خوبصورت ہے۔ منبر اور چوکھٹیں پتھر کی ہیں۔ کتبہ:-

بدور اورنگ زیب آں شہنشہ
کہ افروز رونق دین پیمبر
باقبال او یافت چوں زیب و زینت
ز شائستہ خاں ملک بنگالہ یکسر
بہر و پل و باغ و مسجد بنا کہ
مرتب شد از عنبر نیک اختر
چوں شد ساختہ کار در فکر سالش
فرو شد بہ بحر دعا نکتہ پرور
سر وحی بگفتہ [illegible] یارب
بدنیا پل و مسجد خواجہ عنبر

(۱۲) بیگم بازار کی مسجد بہت مشہور ہے۔ پرانی ہے اور آباد ہے ۱۷۰۱ء کے لگ بھگ نواب کارطلب خاں نے یہ پانچ گنبدوں والی دو منزلہ مسجد بنوائی۔ نیچے دکانیں ہیں مسجد اوپر کی منزل میں ہے مسجد کے پورب باؤلی دار بہت گہرا کنواں ہے۔ نواب کارطلب خاں کا اصلی نام محمد ہادی تھا۔ حاجی شفیع اصفہانی نے اس برہمن زادہ کو تعلیم دلائی [illegible]

کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ مرشد آباد میں جا کر اس کا نام مرشد قلی خاں ہو گیا اور بعد کو نواب جعفر کے نام سے مشہور ہوا۔

(۱۴۳) ڈھاکہ کی سب سے بڑی مسجد، وہ شاہی مسجد ہے جو لال باغ قلعے کی جنوبی دیوار سے بالکل قریب ہے۔ اپنی شاہزادگی کے زمانے میں فرخ سیر نے اسے ۱۷۰۳ء میں بنوایا۔ وہ اس وقت بنگالہ کا صوبہ دار تھا۔ ڈیڑھ ہزار آدمی آسانی سے یہاں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ۱۶۴ فٹ لانبی اور ۵۴ فٹ چوڑی ہے۔ بڑی شاندار ہے اور اسلامی عظمت کی یاد دلوں میں تازہ کرتی ہے۔ اسی کے قریب قلعہ سے پائیں اتر پچھم آتش خانہ میں خان محمد مردھا کی مسجد ہے۔ ۱۷۰۶ء کی بنائی ہوئی دو منزلہ تین گنبد والی مسجد ہے۔ چبوترہ جس پر مسجد اور صحن قائم ہے ۱۲۵ فٹ لانبا، ۱۰۰ فٹ چوڑا اور ۱۷ فٹ اونچا ہے۔ اورنگ زیب کی حکومت کا زمانہ تھا۔ مرشد قلی خاں صوبیدار تھے۔ قاضی عباداللہ قاضی شہر ڈھاکہ کی مرضی سے یہاں کے ایک عہدیدار خان محمد مردھا نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ "کتبہ":-

بعہد شاہ اہل ہمت و داد
کہ دادا نقیاد شرع و دین باد

زہے شاہے کہ باشد زیب اورنگ
شہے باشد کہ مہرش گشتہ منقاد

دل صدق آشنائے حامی شرع
عباداللہ قاضی کرد ارشاد

کہ از بہر عبادت خاں محمد
کند مسجد بصدق خویش بنیاد

بفکر سال تاریخش چو رفتم
ندائے ہاتف از غیب در داد

سر کفر از بنائش رفتہ برباد
زطاعت خانہ اش تاریخ ایجاد

(۱۴۴) اعظم پورہ (عظیم پورہ) کی دو منزلہ ایک گنبد والی مسجد ۱۱۶۰ء میں فیض اللہ نے بنوائی۔ "کتبہ"

عارف حق شناس فیض اللہ
ساختہ مسجدے بوجہہ الحق

یاد بہر حصول عین یقین
عابدان را ز سیلہ رونق

مسکن ذاکران صاحب تزن
مثل قصر بہشت پُر رونق

پے تاریخ آں عبادت گاہ
درد لم ریخت سعی الیق

اِنَّہٗ مَا مِنْ کَبِیَتُہٗ اللہ
مَعْبَدٌ جَامِعٌ لِاَہْلِ الْحَق ۱۱۶۰ء

سلیم اللہ فہمی

مشرقی پاکستان میں اُردو شاعری کے تیرہ سال

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک

اُردو مشرقی پاکستان کے لئے اجنبی نہ تھی، نہ ہے۔ بنگال کے مسلمانوں کا حصہ برصغیر کی اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل و تعمیر میں کسی سے کم نہیں ہے۔ حالی کی مسدس اور اقبال کے شکوہ نے یہاں بھی قلوب کو گرمایا ہے۔ میلاد کی محفلوں کو ظفر علی خاں کی نعتوں نے تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے۔ اس سرزمین پر کتنے ہی ایسے مشاعرے منعقد ہوئے ہیں جن کی یاد تہذیب و تمدن کے ایک باب کی یاد ہے — اُردو کے اخبار و رسائل یہاں تقسیم سے پہلے بھی نکلتے تھے اور اب بھی کئی اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ یہاں کے کتب خانوں میں اُردو کی نادر اور بہت اہم کتابیں موجود ہیں۔ ڈھاکہ جو مشرقی پاکستان کا دل ہے مدتوں سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سرزمین میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے پہلی بار اُردو میں تقریر کی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں اُردو کے کئی اہم اساتذہ و شعراء موجود تھے جن میں سے کچھ کی شہرت برصغیر کے دور دراز گوشوں میں پھیل چکی تھی، اور بعض اتنے مشہور تو نہ تھے لیکن شہرت ادبی مرتبہ کا واحد معیار نہیں ہے۔ ایسے شعراء میں جن کے نام سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں، سید اشرف الحسینی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مرزا فقیر محمد، خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل اور ظہور الباری کے ہیں۔

اشرف الحسینی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، بڑے کہنہ مشق اور صاحبِ علم شاعر تھے۔ انہوں نے اُردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ غزل میں اسلوب قدیم کے قائل تھے اور فن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ لیکن ان کا حقیقی میدان قصیدہ گوئی تھا۔ وہ ہر سال شہید کربلا کی شان میں قصیدہ لکھتے اور ۱۰ محرم کو منبر سے خود سناتے۔ آخری عمر میں یہ مشغلہ ان کے لئے عبادت بن گیا تھا۔ سید محمد آزاد کے بھانجے تھے اور انہیں کے گھر تعلیم و تربیت پائی تھی۔ پہلا مجموعہ کلام "گلستان شرف" کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے مجموعہ "دبستان شرف" کی ترتیب مرحوم مکمل کر چکے تھے، مگر وہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی شہرت بہت وسیع ہے۔ تنقید کی دنیا میں وہ ایک بت شکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور شاعری میں اپنے شدید رومانی تغزل کے لئے معروف ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "نشاطِ رفتہ" کے نام سے قیام پاکستان کے بعد شائع ہوا ہے۔ شادانی کی شاعری میں روایتی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ قلبی واردات و احوال و کوائف کے شاکر ہیں اور معاملاتِ دل کو نفسیاتی رنگ کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس وجہ سے ان کی شاعری میں محض جوانی کا جوش اور ابال نہیں بلکہ عشقیہ شاعری کی ادائیں اور جلوہ مند رنگ پیدا ہو گیا ہے ؎

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کب ہوا
دیکھو! کنول سی آنکھوں میں شبنم چھلک نہ جائے

خواجہ محمد عادل اور ظہور الباری کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ رکھتے ہیں۔ اچھا کہتے ہیں اور زیادہ کہتے ہیں۔ عادل پہلے علامہ وحشت سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اب مولانا تمنا عمادی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہیں۔ ظہور الباری، ڈاکٹر شادانی کے شاگرد ہیں اور ان کے رنگ سے اس درجہ متاثر ہیں کہ اپنی انفرادیت کو ابھرنے نہیں دیتے۔ خالد بنگالی مرحوم کے شاگردوں میں محمود بنگالی، مسعود الحق خضر اور حبیب الٰہی، کشور گنج کے مقامی شعراء میں ممتاز ہیں۔ جو اسی سرزمین سے تعلق

رکھتے ہیں۔ خالد بنگالی کی غزلوں میں زبان کی وہ لطافتیں ملتی ہیں۔ جن کو کچھ لوگ آج بھی صرف "اہل زبان" کا حصہ سمجھتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ ایک طرف مغربی پاکستان کی فضائیں مہاجرین کے لئے آغوش وا کئے ہوئے تھیں اور دوسری طرف مشرقی پاکستان کے کھیت اور دریا نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد علامہ رضا علی وحشت، حکیم ناطق لکھنوی، فضل احمد کریم فضلی، اسود رضوی، تمنا عمادی، کیفی چریاکوٹی، ماہر فریدی، رحمت اللہ شہاب، آصف بنارسی، اقبال عظیم، احسن احمد اشک، فطرت واسطی، شمس الحسن شیدائی، جمشید مرزا، قربان علی عصری، واحسن بنارسی (مرحوم) اور عارف بلگرامی، ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے۔ اسی قافلے میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ یوں ۱۹۴۷ء کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو شعر و سخن کا نیا دور شروع ہوا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے کہ آج ڈھاکہ پاکستان میں اردو ادب کے اہم مراکز میں سے ایک ہے۔ نئے آنے والوں میں ایسے شعراء بھی شامل تھے جن کی ادبی حیثیت تسلیم کی جا چکی تھی۔ مثلاً وحشت، ناطق، حیدر دہلوی، فضلی، کیفی اور فطرت اور ایسے شاعر بھی تھے جو ابھرتے ہوئے ادبی سورج کی درخشاں کرنوں کی طرح نت نئے امکانات کے حامل تھے۔ جیسے اشک اور اقبال عظیم وغیرہ۔۔۔ وہ شعراء جو مستقبل کی نوید ہیں۔

حکیم ناطق لکھنوی ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے لکھنؤ کی غزل گوئی کی تجدید کی۔ وہ لکھنؤ کے "سبعہ سیارہ" میں شامل تھے۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام "دیوان ناطق" سید اقبال عظیم اور سید رشید احمد نے مرتب کر کے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ یہ شعری مجموعہ ایک بڑے شاعر کی یادگار ہے۔ حیدر دہلوی اور کیفی چریاکوٹی کی خدمات علیحدہ مطالعے کی مستحق ہیں۔ ان بزرگ شعراء میں حضرت وحشت کے حصہ میں مشرقی پاکستان کی نئی بزم سخن کی صدر نشینی آئی۔ ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ اس مقالہ کے حدود میں شامل نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطان المتغزلین مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر، وحشت کے شعری مرتبہ کا استادیزی ثبوت ہے ؎

خوبیٔ اشعارِ وحشت کا نہ پوچھو کچھ مزا!
میر و مرزا کا زمانِ شاعری یاد آ گیا

چھ سال تک جناب وحشت کی شخصیت شمع محفل کی طرح مشرقی پاکستان کی ادبی فضا کو جگمگاتی رہی، ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "ترانۂ وحشت" ان کی زندگی ہی میں مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہو گیا تھا تیسرا مجموعہ "نقوش و آثار" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ وحشت کے رنگ تغزل نے مشرقی پاکستان میں نیا رخ اختیار کیا۔ ان کی آخری غزلوں میں ترک وطن کی تلخی نئے وطن کی کشش اور بہتر مستقبل کی حسرت ہر جگہ ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جدید اسلوب سخن کے ساتھ ایک ادبی مصالحت کی کوشش بھی۔ وحشت ان شعراء میں سے تھے جن کا ارتقا جاری رہتا ہے اور جو اپنے آپ کو دہراتے نہیں۔ ان کی زندگی اور خدمات پر اس سے بہتر اور کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے ؎

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے (وحشتؔ)

فضلی، غزل گوئی میں ایک مخصوص رنگ کے مالک ہیں۔ زبان اور روزمرہ ان کی شاعری کا غالب عنصر ہیں۔ وہ شعروں میں باتیں کرتے ہیں اور سہل ممتنع میں خاص مشق بہم پہنچائی ہے۔ فن شعر، استادانہ قابو رکھتے ہیں۔ غزل ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان کی سادگی بے رنگ نہیں بلکہ اس میں گہرے جذبہ، خلوص اور تغزل کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران فضلی نے قومی شاعری کی طرف بھی توجہ کی اور وہاں کے تجربات ان کے ناول "خون جگر ہونے تک" بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب ہوئے ہیں۔ فضلی کے دوسرے مجموعۂ کلام "چشم غزال" کی قریب قریب تمام غزلیں مشرقی پاکستان کے عہد قیام میں لکھی گئیں۔

مولانا تمنا عمادی عالم متبحر ہیں اور ان کی علمی شخصیت بجا طور پہ کہہ سکتی ہے۔ ؎

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مولانا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فن شعر، عروض اور معانی و بیان پر انھیں جو قدرت حاصل ہے اس کی مثال ہمارے دور میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ مولانا تمنا عمادی ملی اور قومی واقعات اور تحریکات سے بھی گہرا اثر قبول کرتے ہیں اور انھیں اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔

ماہر فریدی، جاں نثار اختر کے استاد ہیں۔ سید پور میں ان کی ذات شعر و ادب کا ایک جیتا جاگتا مرکز ہے۔ پرانے اسلوب تغزل کے ترجمان ہیں بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ رحمت اللہ شہاب، مختصر غزلیں کہتے ہیں زبان کا لطف ان کی شاعری میں نمایاں ہے انہوں نے اساتذۂ اردو کی خلاقانہ

پیروی کی ہے۔ ان کی انگریزی کتاب ART IN URDU POETRY ان کے فنی ادب اور نقاشی کا حسین مرقع ہے اور آصف بنارسی، وحشت مرحوم کے بزرگ ترین شاگرد ہیں۔ استاد کا رنگ ان کی انفرادیت سے ہم آہنگ ہو کر دو آتشہ بن گیا ہے۔ اردو کا کلاسیکی تغزل ان کی ہر غزل میں بڑے حسین انداز میں موجود ہے لیکن وحشت مرحوم کی طرح وہ نئے ادبی و شعری تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔ زبان دانی استادانہ ورثہ میں ملی ہے وحشت مرحوم کی زندہ یادگار ہیں۔

نطاق [illegible] بہت اور کہنہ مشق شعراء میں ہیں۔ ایک زمانہ میں ان کا شہرت ملک گیر تھی۔ مدت ہوئی ان کا مجموعۂ کلام "حدیث حسن" شائع ہوا تھا۔ ان کی رومانی نظموں میں بڑا حسن ہے حسن نظر بھی اور حسن بیان بھی۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بہت کم کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے اس کا رنگ مختلف ہے یعنی اسلامی اور قومی۔

ان بزرگ شعراء کے تذکرے کے بعد ہم نئے شعراء تک آگئے ہیں زندہ اور نوجوان شاعروں کے تذکرہ میں تقدیم و تاخیر کا سوال بہت مشکل ہے۔ اسی لئے میں ان کے ذکر میں اس روایت کی پابندی نہ کروں گا۔ جو نام میرے ذہن میں آتے جائیں گے ان کے بارے میں اظہار رائے کرتا چلا جاؤں گا۔ نمونۂ کلام سے میں نے دانستہ اور طوالت کے خوف سے اب تک دامن کشی کی ہے۔ لیکن مناسب مقامات پر مضمون کو دلچسپ بنانے کے لئے چند نمونے بھی کہیں کہیں پیش کروں گا۔

اقبال عظیم، نئے اندازِ غزل کے علمبرداروں میں سے ہیں۔ اردو زبان اور ادب کے استاد ہیں۔ ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لئے ان کے نئے پن میں بھی ہماری بہترین روایات شعری موجود ہیں۔ اقبال عظیم کی شاعری میں ایک گہری "درد مندی" ہے۔ لیکن ان کی درد مندی میں بھی شاعرانہ شگفتگی ہے۔ اقبال عظیم کا اسلوب ان کے موضوعات سے ہمیشہ ہم آہنگ رہتا ہے۔ نت نئی ترکیبیں محض سامان آرائش نہیں۔ بلکہ نئی اپروچ (APPROACH) اور نئے زاویۂ نگاہ کا اظہار کرتی ہیں۔

غربت میں تیرا دامن جب یاد آگیا ہے
ظلمت سے تا بہ منزل جادے چمک گئے ہیں

ٹوٹے ہوئے تاروں کو ابھی جوڑ رہا تھا!
ہاتھوں سے مرے چھین لیا ساز کسی نے

احسن احمد اشک نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کا مجموعۂ کلام "برق و باراں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عنوان کتاب ان کے کلام کی تفسیر ہے۔ جوش کے الفاظ میں۔ ع

اس انجمن گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی

بڑی بات یہ ہے کہ اگر اشک کی رومانی نظموں میں شدت احساس ہے تو انقلابی اور باغیانہ نظموں میں خلوص اور وسعت نظر کا احساس ہوتا ہے۔ اشک [illegible] شاعری کا بھی خوب سلیقہ رکھتے ہیں۔ ٹیگور کے بنگالی نظموں کے بہت اچھے ترجمے کئے ہیں۔ ان کی غزلوں [illegible] مضامین "جانِ تغزل" بن کر ابھرتے ہیں۔ [illegible] نظم اور غزل دونوں میں اشک سلامتی ذوق، علمیت اور شگفتہ گوئی کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں [illegible] نظم کے میدان میں زیادہ کامیاب [illegible] غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

[illegible]
[illegible]

جو فرق ہے نور و ظلمت میں وہ [illegible]
میں آئینہ گر ہوں دونوں کو آئینہ دکھاتا جاتا ہوں

وہ موج حسن ہے، اک سیل بن کے گزرے گی
ندی کے خشک کنارو! کچھ انتظار کرو

امیر الاسلام شرقی، بڑے پرانے کہنے والے ہیں۔ علم عروض پر اتنا قابو ہے کہ نئی نئی بحریں خود ایجاد کرتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں انہیں بڑا ملکہ ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہ فن انہیں کے دم سے زندہ ہے۔ افسر ماہ پوری بھی تجربہ کار شاعر ہیں۔ صاف سادہ اور سلجھی ہوئی غزل کہتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کا ذکر عام گفتگو میں زبان پر نہیں لاتے لیکن شعروں میں تلخیٔ روزگار کا شکوہ صاف جھلکتا ہے۔

جمشید مرزا اور عارف بلگرامی، ایشورڈی اور سلہٹ میں اردو شعر و ادب کی روشنی اور فیضان کو عام کر رہے ہیں۔ دونوں فن پر قدرت رکھتے ہیں۔ علامہ وحشت کے ایک ممتاز شاگرد قربان علی عصری کا قیام کھلنا میں تھا اور وہیں انتقال ہوا۔

مشرقی پاکستان میں شعر و ادب کا چرچا صرف ڈھاکہ تک محدود نہیں جیسا کہ سطور گزشتہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ڈھاکہ، چاٹگام، سید پور، کھلنا، راجشاہی، سلہٹ اور نرائن گنج میں اُردو کے شعراء اپنے فکر و فن سے ماحول کو روشن بنا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اُردو کے قابل ذکر شعراء کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان میں اُن شاعروں کو بھی شریک کر لیا جائے جو اب مغربی پاکستان میں ہیں، لیکن جنہوں نے مشرقی پاکستان میں اُردو شعر و سخن کی محفل آرائی میں بڑا حصہ لیا ہے۔

جن شاعروں کا تذکرہ ہو چکا ہے اُن کے علاوہ مشرقی پاکستان کے شاعروں میں قمر صدیقی مرحوم، اے، ڈی، اظہر۔ محمود اکبر آبادی، محمود طرزی، عابد داناپوری، اسد رضا جعفری، عرش لکھنوی، عطاء الرحمن جمیل، صادق القادری مرحوم، سرور بارہ بنکوی، وفا راہی، عطا آسفی، اختر پیامی، افضل پھلواری، حنیف مونگیری، ہدیل ناطق، ادیب سہیل، حسن عظیم آبادی، حنیف فوق، مقبول نقش، یوسف علی لائق، محبوب خزاں، جبار تلیغی، اصغر گرد گھپوری، شیریں کرشمہ، شہناز عذرا، اظہر قادری، ہلال صدیقی، تبسم بارہ بنکوی، قدوس صدیقی، صوفی فیضی، اختر لشاد، وحید قیصر ندوی، نظیر صدیقی، ارشد کاکوی، ناختر لکھنوی، اے، ڈی، محسن، رشن لکھنوی، کلیم سہسرامی، صلاح الدین محمد، شاعر صدیقی، ظفر عمر پیام، رئیس باقی، شفیع اقبال، حبیب بارہ بنکوی، اعجاز اعجاز، انور فرہاد، ممتاز ذکی ــــ عبدالرحمٰن بجود وغیرہ شامل ہیں۔

ممکن ہے شعراء کی یہ فہرست طویل بعض احباب کے نزدیک ہنوز نامکمل ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان ناموں سے مشرقی پاکستان کی نمائندگی بڑی حد تک ہو جاتی ہے۔ ان میں سے نئی پود کے بعض شعراء پر ابھی لکھنا قبل از وقت ہوگا۔ انھیں ابھی اپنی تاب و توانائی اور شعری صلاحیتوں کا ثبوت دینا ہے۔ بہرحال ان میں ایسے بہت سے شاعر ہیں جو تفصیلی تذکرہ کے مستحق ہیں اور جن کے نمونۂ کلام کی بھی ضرورت ہے لیکن یہ سب کچھ اس مقالہ میں سمویا نہیں جا سکتا۔ اسی لئے چند شعراء کا سرسری تعارف پیش کرتا ہوں۔

اے، ڈی، اظہر اور سید مسعود رضا نے چاٹگام کے ادبی فضا کو استوار کرنے کی پُر خلوص کوشش کی ہے۔ اے، ڈی، اظہر کا خاص رنگ پیروڈی اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں کھلتا ہے۔ سید مسعود رضا خاص لکھنوی انداز کی غزلیں کہتے ہیں۔ بیگم لقمان حیدر، جو عرصہ ہوا مغربی پاکستان جا چکی ہیں ڈھاکہ کے لئے وہی حیثیت رکھتی تھیں جو اظہر اور مسعود رضا چاٹگام کے لئے۔ صرف غزل کہتی ہیں اور صاف ستھری باوقار غزل

محمود اکبر آبادی ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے اُردو پروگراموں کے نگراں رہے ہیں ان کا سیلان طبع نظم گوئی کی طرف ہے۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو شاعرانہ لطافت اور بڑی حُسن کاری کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ چودھری نذیر مومن اور سید رشید احمد، یہ دو نوں صاحبان اب مغربی پاکستان میں ہیں لیکن مشرقی پاکستان کی شاعری کے تذکرہ کے ساتھ ہی ان کا نام ذہن میں آ جاتا ہے۔ مومن کی غزلوں اور نظموں میں جدید رجحانات کی جھلک نمایاں ہے۔ سید رشید احمد۔ حکیم ناطق لکھنوی کے صاحبزادے ہیں۔ معیاری غزل کہتے ہیں۔

عابد داناپوری، کی شاعری کا رجائی پہلو قابلِ مطالعہ ہے۔ جہاں گہری فکر، اُن کی غزل سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ عابد کی شاعری حقیقی شاعری کی حدود کو چھو لیتی ہے ؎

میں اپنی منزل کا آپ مالک، میں اپنے جادہ کا آپ سالک
ہمارے رستے میں آ کے دیکھو، کسی کا نقش قدم نہیں ہے

سرور بارہ بنکوی، ایک غزل گو کی حیثیت سے ہم عمروں میں بہت آگے ہیں۔ رومانیت ان کی غزلوں میں خون کی طرح گردش کرتی ہے۔ جگر کے رنگ سخن سے بیحد متاثر ہیں۔ اب رومانیت کے علاوہ زندگی کی حقیقتوں کو بھی اپنی شعری گرفت میں لے آتے ہیں ؎

زندگی عارض و کاکل کی گزرگاہوں سے
رفتہ رفتہ سر دارِ تک آ پہنچی ہے

جب تلک روشنیٔ فکر و نظر باقی ہے
تیرگی لاکھ ہو، امکانِ سحر باقی ہے

کیپٹن قمر صدیقی مرحوم علامہ وحشت کے عزیز شاگردوں میں سے تھے استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ لیکن لب و لہجہ غزل کے زیادہ دلدادہ تھے۔

عطاء الرحمن جمیل، اختر پیامی، صلاح الدین محمد محمت مند رجحانات کے شاعر ہیں اور سب کے سب ذہین اور پڑھے لکھے ہیں۔ بہیئت کی جدت اور تخیل کی برق آسا کیفیت ان کے یہاں ہے۔

عطاء الرحمٰن جمیل اپنی ایک الگ نمایاں شخصیت رکھتے ہیں ان کی جدت پسندی جارحانہ اور محدود نہیں۔ روایات کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کا شمار ان نوجوان شعراء میں ہے جن کے کندھوں پر مستقبل کا بار اعتماد کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے ؎

اتنا نہ ہنسو صاحب ادراک بہت ہیں
آہستہ چلو لوگ تہہ خاک بہت ہیں

اس تیرگی میں جانے کہاں کون چھوٹ جائے
مجھ سے نہ دور جاؤ، قیامت کی رات ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے
کہیں چھپتے پھرو، آخر زمانہ ڈھونڈھ ہی لے گا

اظہر قادری اور حنیف فوق مشرقی پاکستان کے ان نوجوان شعراء میں سے ہیں جن کی شہرت اردو کی ادبی دنیا تک پہنچ چکی ہے۔ دونوں اچھے نقاد بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی۔ اردو شاعری کا وسیع مطالعہ کیا ہے اسی لئے شاعرانہ اسالیب بیان سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور ان کے استعمال پر قادر ہیں۔ نظم اور غزل، دونوں کو موضوعات کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

حسن عظیم آبادی اور وفا براہی دونوں صاحب دیوان ہیں۔ ہلال صدیقی کو نظم سے زیادہ شغف ہے۔ ان کی کتاب "خون گل" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

ارشد کاکوی اور نقیر صدیقی، خالص پاکستانی شاعر ہیں کیونکہ ان کی شاعری قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں نے بڑی گرم رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے۔ ارشد رومانی غزلیں لکھتے ہیں۔ خطیب شادانی کے شاگرد ہیں اور معنوی طور پر بھی ان کے خلف۔ نقیر صدیقی کے اشعار میں پختگی ملتی ہے۔ زندگی کی تلخی اور اس پر نکتہ چینی۔ ان کے خاص موضوعات شاعری ہیں۔ روزنہ اور زبان کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے کسی بھی انتخاب میں نقیر کے بہت سے شعر جگہ پا سکتے ہیں۔ خواہ اس انتخاب کا معیار کتنا ہی سخت ہو ؎

ہوس کی پیاس بجھی دل کی تشنگی ہے وہی
سکونِ جاں سے تہی میری زندگی ہے وہی

محبوب خزاں، مشرقی پاکستان میں بہت بعد میں آئے۔ لیکن آتے ہی فضا پر چھاگئے۔ آج وہ مشرقی پاکستان کے ممتاز شعراء میں سے ایک ہیں۔ کبھی کبھی گہری اور چونکا دینے والی بات ایسے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے ؎

جنوں سے کھیلتے ہیں آگہی سے کھیلتے ہیں
یہاں تو اہل سخن، آدمی سے کھیلتے ہیں

چاہی تھی دل نے تجھ سے وفا کم بہت ہی کم
شاید اسی لئے ہے گلہ کم بہت ہی کم

کتنے ہی اور شاعروں کا کلام احماب انتخاب کے لئے بجا طور پر متقاضی ہے مگر ان سب کا سمیٹنا مشکل ہے، بہت مشکل۔ مثلاً اسد رضا جعفری ذرا اس ندرت اور پختگی کو دیکھئے ؎

مانا کہ دھوپ تیز ہے رخسار یار کی
لیکن کبھی کبھی سرِ مژگاں بھی دیکھئے

لفظوں کی گھٹا جو کھل گئی ہے
معنی کے چراغ جل رہے ہیں

دلیل ناطقی جن کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ آج اردو کے مطلع کے مزاج داں ہیں، شیریں کرشمہ اور شہناز عذرا۔ جو شاعرات اردو کی تاریخ کے آخری باب میں اپنا نام جلی حرفوں سے لکھ چکی ہیں اور تو اور یہ راقم الحروف، تکلف برطرف، ع

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میر بھی کیا قیامت ہوں

لیکن اس کا کیا علاج کہ لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں اور کچھ نہ سہی تو چلتے چلتے اپنے دو تین شعر سنا تا ہی چلوں ؎

احساس جرم، خوف سزا، شرم ارتکاب
اتنے عذاب ایک گنہگار کے لئے

(بقیہ صفحہ ۲۱۰ پر)

وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان
(تاریخ کے آئینے میں)

پندرھویں صدی عیسوی میں حسین شاہ کے عہد حکومت کے ساتھ ساتھ بنگال کی تاریخ میں ایک زریں دور کا آغاز ہوتا ہے ہمیشہ سے اس خطے کی آب و ہوا بہت اچھی رہی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی افراط اور ارزانی بہت تھی۔ اس کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھتے رہے مذکورہ صدی میں ترقی اس وجہ سے ہوئی کہ ملک میں آزاد حکومت قائم تھی اور اس کے ساتھ ہی چین اور پرتگال وغیرہ ملکوں کے لوگوں سے یہاں تجارت کی ابتدا ہوئی اور اسے خوب ترقی نصیب ہوئی۔ ملک میں خوش حالی کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ حکومت نے سونے کے سکے بہ کثرت جاری کئے اور جنگ کے زمانہ میں بھی جبکہ عموماً ممالک اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ سکوں میں گھٹیا اور کم قدر دھاتیں استعمال کریں یہاں سونے کے سکے ہی رائج رہے اور ملک میں عمارتیں بھی خوب تعمیر ہوئیں۔

اس خطے میں باہر سے آنے والوں نے جس بات کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے اور جس سے وہ بہت خوش ہوئے وہ یہی تھی کہ یہاں پر کھانے پینے کی چیزیں اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری اشیاء بہت سستی تھیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ گرانی کے زمانے میں بھی یہاں چاول ایک روپیہ کے ساڑھے سات من مل جایا کرتے تھے اور یوں سستے دنوں میں تو پندرہ من ملا کرتے تھے۔ ایک اور سیاح کا کہنا ہے کہ گوشت کی قیمتوں کا یہ حال تھا کہ ایک پوری گائے ایک روپیہ اور ایک ہی روپیہ میں چار اچھی خاصی بھیڑیں مل جایا کرتی تھیں اور مرغیوں کا تو یہ حال تھا کہ ایک روپیہ میں ایک درجن مل جایا کرتی تھیں اور اس پر بھی ان کا کہنا تھا کہ باہر کے ہونے کی وجہ سے انہیں یہ قیمتیں دینی پڑیں۔ انہیں کاروباری لوگوں نے ٹھگ لیا اور دوگنی قیمتیں دینی پڑیں۔ یہی حال دودھ اور مکھن وغیرہ کا تھا۔ پھر یہی نہیں کہ یہ چیزیں سستی بہت تھیں بلکہ عوام میں استعمال بہت کی جاتی تھیں۔

اس زمانے میں لوگوں کی معاشی ترقی کا ثبوت یہی نہیں تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں بہت سستی اور بہت عام تھیں۔ بلکہ عام طور پر لوگوں کے رہن سہن سے بھی ان کی خوش حالی کا اندازہ ہوتا ہے وہ لوگ دوسروں سے ملنے جلنے میں ان کی جتنی خاطر داری کرتے اور قوم کے خاص لوگ جس شاندار طریقے سے رہتے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ چینیوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ سونے چاندی کی برتن بہت رکھتے تھے چنانچہ چینی سفیر کو سنہری طشت، سونے کی لگامیں، سونے کی صراحیاں اور سونے کے پیالے پیش کئے اور نائب سفیر کو یہی چیزیں چاندی کی پیش کیں سفارت خانے کے دوسرے عہدیداروں کو سونے کی گھنٹیاں اور بہترین سفید ریشم کے لبادے دیئے اور معمولی سپاہیوں کو چاندی کے سکے عطا کئے۔ اگر یہ لوگ اتنے خوش حال نہ ہوتے تو اتنی فیاضی کیسے کر سکتے تھے۔

ملک کے معزز لوگ ہی نہیں بلکہ باہر سے آنے والے لوگ بھی بہت شان و شوکت سے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ پرتگالی سردار بھی گھوڑوں کے ساز نہایت قیمتی استعمال کرتے تھے۔ یہ ساز بھی کشیدہ کاری کئے ہوئے ریشم سے بنا تھا اس پر سونے چاندی کا اور موتیوں کا کام کیا ہوتا۔ چاندی کی گھنٹیاں لگی ہوتیں۔ لگام قیمتی پتھروں سے مرصع ہوتی اور چاندی کی رکابیں ہوتیں گھوڑے کے سامان کے ساتھ نہایت بہتر کشیدہ کاری کیا ہوا سرخ مخمل کا غلاف ہوتا جسے وہ گھوڑے پر اس وقت ڈال دیتا جبکہ مالک گھوڑے سے اترا ہوتا۔ اس طرح شان و شوکت کا رہن سہن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ملک میں سب خوش حال تھے اور معاشی ترقی انتہا پر تھی۔

اگرچہ یہاں کھانے پینے کی چیزیں بہت سستی اور با افراط تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں لوگ محض کاشتکار اور چرواہے ہوتے

تھے اور دستکاریوں یا صنعتوں کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ البتہ باہر سے آنے والوں نے یہاں تجارت کو فروغ دیا لیکن اس سے پہلے بھی یہاں کے مقامی لوگوں نے کم دستکاری اور صنعتیں قائم نہیں کیں۔ اس زمانے میں سفید اور عمدہ قسم کا کاغذ یہاں تیار ہوتا تھا۔ یہ کاغذ بیر کی چھال وغیرہ سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑے یہاں نہایت بہتر تیار ہوتے تھے۔ سوتی اور سلک کے کپڑوں کے علاوہ سوتی کپڑے بھی بہت مشہور تھے۔ چینی سیاح ہوان تسانگ نے لکھا ہے کہ یہاں چھ طرح کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے ایک تو معمولی بافت کا ہوتا تھا۔ دوسرا کپڑا چھینٹ ہوتا اور تیسرا چھپا ہوا سا بنا ہوا نیلا کپڑا اکثر ہوتا۔ چوتھا کپڑا چادر کا ہوتا۔ پانچواں کپڑا دستار کا ہوتا اور چھٹا کپڑا ململ ہوتا۔ ان کپڑوں میں ڈھاکہ کی ململ سب سے زیادہ مشہور کپڑا تھا۔ اس کی شہرت دور دور تھی اور روم جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی یہ ململ جاتی۔ اور وہاں کی معزز خواتین بہ شوق اسے استعمال کرتی تھیں۔ خاص طور پر سنار گاؤں کی ململ عمدہ ہوتی تھی کیونکہ وہاں ایک حوض تھا جس کے پانی سے دھونے کے بعد کپڑے میں عجیب سفیدی اور چمک آجاتی۔ ململ کی صنعت یہاں نہایت کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اس کے سوت اتنے باریک ہوتے کہ یوں آنکھوں سے دیکھنا بھی آسان نہ تھا۔ بننے والوں کی آنکھوں پر اتنا زور پڑتا تھا کہ وہی لوگ کام کرپاتے جن کی عمر سولہ سال سے کم نہ ہو اور تیس سال سے زیادہ نہ ہو۔ کپڑا اتنا باریک اور چکنا ہوتا کہ انگلی کی انگوٹھی میں سے ساٹھ ہاتھ کپڑا آجاتا۔ اس ململ کی قدر شناسی دہلی دربار سے بھی ہوئی اور دوسرے ملکوں سے بھی۔ دہلی کے صوبے دار کوشاں ہوتے اسے دربار میں بھجوائیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے خریدنے کے لئے کوٹھی کھول رکھی۔ کپڑے کے علاوہ یہاں نمک بھی خوب بنتا تھا۔ اس سلسلے میں سندیپ کی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ ہر سال دو سو جہاز بھر کر نمک یہاں سے بھیجا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ پورے خطے کو نمک یہیں سے ملا کرتا تھا۔

اندرونی تجارت میں نمک کی تجارت کے علاوہ پانوں کی تجارت بھی بہت بڑے پیمانے پر تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ صرف پانوں کی تجارت کے ذریعہ سے ڈھاکہ کے گورنر کو چار لاکھ روپیہ سالانہ کی مالیت کے ٹیکس وصول ہوتے۔ اسی طرح آلو کی تجارت بھی بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی۔

اندرونی تجارت کے علاوہ دستکاریوں میں جہازوں کی مرمت وغیرہ بھی بہتر ہوا کرتی تھی اور جہاز سازی کے لئے ضروری چیزیں بھی بہ آسانی اور سستی مل جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ سلطنت عثمانیہ سے جہاز بننے کے لئے یہاں آیا کرتے۔ کیونکہ یہاں اچھے اور سستے جہاز بن سکتے۔

بنگال میں ماضی کے ساحلی اور تجارتی مراکز چاٹگام اور سنار گاؤں تھے چاٹگام سب سے بڑا اور اہم ساحل ہے۔ پرتگال سے تجارت کرنے والے سب سے پہلے یہیں آئے اور طرح طرح کی چیزیں وہاں سے لوگ لائے اور لے بھی گئے۔ یہاں انہیں نصرت خاں کی طرف سے کارخانہ قائم کرنے کی اجازت ملی اور تجارتی چوکی قائم کرنے کی پیش کش بھی کی گئی اور ایک پرتگالی افسر کو اس کا انچارج بنایا گیا۔

سنار گاؤں بھی کپڑے وغیرہ کی اچھی منڈی تھی۔ یہ ڈھاکہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جاوا وغیرہ سے جو جہاز آتے وہ چاٹگام ہوکر براہ راست سنار گاؤں تک بھی آیا کرتے۔

بنگال سے بیرونی تجارت کے سلسلے میں پرتگالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ عموماً بارش سے پہلے آجایا کرتے اور بارش کے بعد واپس جاتے۔ ابتداءً یہ لوگ چاٹگام کے ساحل پر آتے تھے۔ یہ لوگ آتے وقت چین سے ریشمی کپڑے جکٹ کے بنے ہوئے پلنگ، میزیں اور دوسری گھریلو چیزیں لاتے اس کے علاوہ کچھ قیمتی موتی اور جواہرات لایا کرتے۔ ملایا سے یہ لوگ لونگیں، جائفل، جاوتری لاتے تھے۔ پورنیو سے کافور مالابار سے سیاہ مرچیں اور لنکا سے دار چینی وغیرہ لاتے۔ یہ لوگ بنگال سے بھی بہت سی چیزیں برآمد کرکے لے جاتے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً سو جہاز ہر سال اس طرح پر یہاں سے چاول، مکھن، تیل اور موم لے جاتے تھے اس کے علاوہ مقامی دستکاری کی بہت سی چیزیں لے جاتے سوتی اور ریشمی کپڑے یہاں سے لے جاتے تھے اور کشیدہ کاری اور بناوٹ کے ایسے عمدہ نمونے یہاں سے لے جاتے کہ ان کی نظیر ملنی مشکل ہوتی۔

اس دور کی تجارت میں پرتگالیوں ہی کا خاص حصہ رہا ہے اور انہوں نے اس طرح کی پابندیاں لگادی تھیں کہ بغیر ان کی اجازت کے کوئی اور یہاں تجارتی جہاز نہیں لا سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے جہاز بہتر اور مضبوط ہوتے تھے ان پرتگالیوں نے بنگال میں تجارت کرکے بے انتہا نفع حاصل کیا یہاں سے وہ نہ معلوم کتنی چاندی اور نقدی لے جاتے اور پوری طرح مالامال ہو جاتے۔ بقول ایک مورخ کے اگر کچھ دنوں

کارخانوں میں بھی لوہے کے بجائے سونے کا استعمال ہوتا۔ الغرض بنگال کا یہ دور ہی ایسا تھا کہ یہاں کی رعایا کیساتھ یہاں آکر تجارت کرنے والے بھی مالامال ہوتے۔

وحید قیصر ندوی

مسلمان اور بنگالی صحافت

اسلام پرچارک

اسلام پرچارک بنگلہ زبان کا ماہوار جریدہ تھا جس کے ایڈیٹر مشہور مسلمان صحافی منشی ریاض الدین مرحوم تھے یہ رسالہ ریاض الاسلام پریس میں چھپتا تھا لیکن یہ پرچہ کبھی وقت کی پابندی سے شائع نہ ہوا۔ اکثر و بیشتر مشترکہ شمارہ نکلا کرتا تھا۔ اس وقت بنگلہ ماہناموں کو پابندی وقت کے ساتھ نکالنا تو دور کی بات ہے زندہ رکھنا ہی بہت بڑی بات تھی مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلم جریدوں کے پڑھنے والے بہت تھوڑے تھے

یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں بنگال میں اردو فارسی جاننے والوں کی تعداد کم نہیں تھی، لہٰذا ان کے زیر مطالعہ اردو کے یہ اخبارات رہتے تھے، ہمدم (لکھنؤ)، الہلال (کلکتہ) وطن، پیسہ اخبار اور زمیندار (لاہور) اسلام پرچارک کی اشاعت کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد سید امداد علی نے کلکتے سے ایک ماہنامہ نکالا۔ اس کا نام رکھا گیا "نو نور" (نئی روشنی) یہ خالص ادبی ماہنامہ تھا۔ اس کے قلمی معاونین میں مسلمان ادبا و شعراء کے علاوہ ہندوؤں کی بھی ایک جماعت تھی۔ یہ سارے ادیب و شاعر اس ادبی رسالے میں اپنے شہپارے اشاعت کے لئے بھیجتے تھے۔ ادب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مذہب کی تبلیغ اور سماجی بہبود کی تحریک وہ بھی شروع ہو گئی تھی اور یہ کام "اسلام پرچارک" انجام دے رہا تھا۔ جس زمانے میں بنگال کے مسلم ادیب ایشور، اوتار، اوپاسنا، اشنان وغیرہ الفاظ کی جگہ اللہ، رسول، نماز، روزہ، وضو، غسل جیسے عربی الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کر رہے تھے وہ زمانہ تھا اسلام پرچارک کا۔ اس سلسلے میں اس ماہنامہ کی خدمات کو کسی حال میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

منشی ریاض الدین مرحوم تادم مرگ ادب کے پرستار رہے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے آہنی ارادے اور حوصلے ہمیشہ جوان رہے ان کے جذبۂ عمل کو کبھی پسپائی نہیں ہوئی۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی نہ کوئی ڈگری تھی اور نہ ڈپلومہ محض ذاتی کوشش و محنت اور جستجو کی وجہ سے علم و تہذیب کے میدان میں یگانۂ روزگار بنے

"...ء میں منشی ریاض الدین احمد بریسال میں پیدا ہوئے ان کے آباؤ اجداد ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔ مختلف اسباب کی بنا پر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ صرف ذاتی کوشش اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے گھر پر ہی انہوں نے اپنی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا۔ اوائل عمر میں ترپی پورہ گئے اور وہاں کے ایک اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ان ہی دنوں مختلف پرچوں میں مضامین بھی لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے ایشور چند ودیا ساگر کی کتاب "بودھودے" میں ایک غلطی کی تصحیح کی جس کے شکریہ میں ودیا ساگر نے انہیں ایک خط لکھا اور اس طرح وہ ان سے متعارف ہوئے"

اس کے بعد ادب و صحافت سے دلی لگاؤ اور فطری ذوق کے باعث وہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ پہنچے جہاں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۹ء کی مدت بنگلہ مسلم سماج میں یادگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اسی دوران میں چند نوجوان، بنگالی مسلمان ادیبوں نے کلکتے میں متحد ہو کر مسلم سماج کی ترقی و ترویج کے لئے کوشش کی۔ ان میں منشی ریاض الدین۔ شیخ عبدالرحیم اور معراج الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ منشی ریاض الدین نے تحفۃ المسلمین اسلام تتو (دو جلدوں میں) کرشنک بندھو، گریک ترشک بدھ، زلیخا، شکستار جیون، رسالۂ حق نصیحت وغیرہ کتابیں تصنیف کیں۔

۱۸۸۹ء میں منشی ریاض الدین، شیخ عبدالرحیم اور کئی احباب نے مل کر "سدھاکر" نامی اخبار نکالا۔ بنگالی مسلم سماج کا نہ صرف پہلا قومی اخبار تھا بلکہ منشی ریاض الدین اور شیخ عبدالرحیم بعد کی حیثیت سے اولیت کا درجہ بھی رکھتے ہیں اس کے بعد منشی ریاض الدین نے "مسلمان" اور "نو سدھاکر" کے نام سے دو اور اخبارات نکالے ۱۸۹۹ء میں انہوں نے اسلام پرچارک کے نام سے ایک ماہانہ جریدہ بھی شائع کیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۳ء میں وہ اس دنیا سے سدھار گئے"

بنگالی ادب از بینظیر احمد

اسلام پرچارک میں جتنے مضامین شائع

اس سلسلے میں بینظیر احمد اپنی کتاب "بنگال ادب میں" میں منشی

(رسالہ [illegible] احمد کے بارے میں لکھتے ہیں):

ہوتے تھے ان میں تصنیف منشی ریاض الدین خود اپنے قلم سے لکھ کر مختلف ناموں سے شائع کرتے تھے "ممتاز" کے عنوان سے مسلسل وار سماجی ناول چھپنا شروع ہوا تھا۔ اس کے مصنف کا نام ابن معاذ تھا، حالانکہ زبان کی سلاست، برجستگی اور بے تکلفی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں ریاض الدین صاحب کا ہاتھ ہے۔ اس کے علاوہ "اسلام پرچارک" میں ـــــ "اکادرشنگشا جیون وا سلامیر جیونتوریکھا" نام کا جو ناول شائع ہوتا تھا اس میں بھی غالباً مصنف کا نام نورالاسلام لکھا ہوتا تھا۔ اس کتاب میں بنگالی مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور اقتصادی زوال، حالی کی تصویر پیش کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ترقی کی منزلوں پر کیسے گامزن ہو سکتے ہیں۔ روزانہ "نوایگ" بند ہو جانے کے بعد ۱۹۲۱ء میں اس کا ہفتہ وار ایڈیشن شائع کیا گیا۔ ان دنوں منشی ریاض الدین احمد راجی میں مقیم تھے، اور ساگ سبزی کی دوکان چلا رہے تھے مولوی ابوالقاسم فضل حق مرحوم (جن کا انتقال ۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوا) نے انہیں کسی طرح راجی سے بلا لیا۔ اور ہفتہ وار نوایگ کی ادارت ان کو سونپی۔ یہ جریدہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد بند ہو گیا۔

۱۹۲۶ء میں فضل حق سل برس نے "المسلم" کے نام سے بنگلہ زبان میں ایک ہفتہ وار جریدہ نکالا۔ اول اول یہ ۶۷/۱ بنیا پوکھر روڈ اور پھر ۴ رپن اسٹریٹ سے شائع ہوتا رہا۔ منشی صاحب اس ہفتہ وار جریدے میں برابر لکھتے رہے۔ لکھنا لکھانا ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ ادب اور صحافت کی دنیا میں وہ ہمیشہ بے لوث خادم کی طرح کام کرتے رہے۔ منشی صاحب کی تحریر میں طنز اور مزاح کا پہلو بھی ہوتا تھا۔ غالباً ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تھی۔ ان کی اس تحریک میں بہت سارے لوگ شریک تھے لیکن روزانہ وہ تین میل سے آگے پیدل مارچ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں منشی صاحب نے "المسلم" میں ایک طنزیہ نظم لکھی جس کا صرف ایک شعر بہت مشہور رہے جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"تین دن کا سفر جب تین مہینے میں ختم ہو تو درشنا
پہنچنے میں کتنی مدت لگے گی؟"

نوبونور

۱۹۰۳ء میں سید امداد علی نے کلکتہ سے ایک ماہنامہ "نوبونور" یعنی نئی روشنی نکالا۔

اس رسالہ کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں میں مستعمل بنگالی زبان کی ترویج و اشاعت کی جائے۔ اس رسالہ کے پہلے شمارے میں بنگالی مسلمانوں کی بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے سید امداد علی نے لکھا کہ آپ یہ بات پوچھ سکتے ہیں کہ اس بنگال کی سرزمین پر جہاں "اسلام پرچارک"، "حافظ"، "مہیر" اور دوسرے زبردست اخبارات و رسائل موت کے گھاٹ اتر گئے۔ "اسلام پرچارک" کو اس وقت کے زبردست عالی دماغ مدیرین زندہ نہ رکھ سکے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ماحول میں "نبونور" کیوں جنم لے رہا ہے اس کا جواب ہمارے پاس صرف اس قدر ہے کہ ہم صرف مادری زبان کو زندہ رکھنے اور اس کی طرف رجحانات مائل کرنے کے جذبات لے کر میدانِ صحافت میں آئے ہیں۔ اور ہمارا یہی خیال ہے کہ ہم زبان و ادب کو عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے اگرچہ اس وقت کے عوام پر انتہائی جمود اور غفلت طاری ہے۔ لیکن یہ رسالہ ان کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی انتھک جدوجہد کرے گا۔

ادب ہی وہ کامیاب اور کارگر ذریعۂ تبلیغ ہے جو بنگالی مسلمانوں کو صحیح راہِ عمل بتا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہے کہ ان میں ادبی رجحانات پیدا کئے جائیں اور یہی لائحہ عمل ان کو منزل کی طرف لے جا سکتا ہے ہماری نظر میں اس وقت کوئی بھی ایسا رسالہ موجود نہیں جو وقت کے اس اہم تقاضے کو پورا کر سکے یہی وہ چیز ہے جس نے ہمیں "نبونور" نکالنے پر مجبور کیا ہم نے یہ اچھا کام کیا ہے یا برا؟ اس کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ابھی ہم محسوس نہیں کرتے۔ ہاں اگر ہم نے اس طرح بنگالی مسلمانوں کو دیکھا کہ ان کے میلانات ادب کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ رسالے کا جاری رکھنا واقعی بہت ضروری ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "نوبونور" زندہ رہے گا۔

"نوبونور" کے اجراء کا اصل مقصد تو بنگالی مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا لیکن ساتھ ہی اس کے ذریعہ زبان اور ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بنگالی مسلمانوں کی ادبی حیثیت بہت پست تھی۔ گہرے غاروں میں گرے ہوئے ان بنگالی مسلمانوں کو کھینچ کر نکالنا صرف نوجوانوں ہی کے بس کا کام تھا چنانچہ "نوبونور" کے دوسرے سال کے پہلے شمارے میں ایڈیٹر نے اسی طرف اشارہ کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ بنگالی مسلمانوں کی حالت کو سنوارنے کے لئے ضرورت ہے کہ نوجوان بنگالی مسلمان اس طرف متوجہ ہوں اور اس اہم کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں اور نوجوان طبقے کے بغیر اس زبردست مہم کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانا انتہائی مشکل امر ہے۔ "بنگیو مسلمان شاہتیہ سمیلن" (یعنی بنگالی سلمانوں کا ادبی اجلاس) کا جو اجلاس ۱۹۴۲ء میں کلکتہ میں ہوا، اس میں سید امداد علی ایڈیٹر نو بو نور نے بھی شرکت کی تھی، اجلاس کے ساتویں دن انہوں نے اپنی تقریر میں "نو بو نور" کے اجرا پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس رسالے کا مقصد نہ تو حصول زر تھا اور نہ نام و نمود کی طلب "نو بو نور" اس سستی اور جھوٹی شہرت کی نمائش سے بہت بلند و بالا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک "نو بو نور" جاری رہا اس کے کسی لکھنے والے کو ایک پیسہ نہیں دیا گیا۔ اور نہ میں نے بحیثیت ایک ایڈیٹر ایک پیسہ لیا۔ اس رسالے میں کام کرنے والے تمام حضرات نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کی تھیں اور آخر تک وہ اسی پر کاربند رہے کیونکہ اس رسالے کا واحد مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھا اور یہ ایک ایسا اہم فریضہ تھا جسے ادا کرنے سے کس کو احتراز ہو سکتا تھا۔ "نو بو نور" تجارت کی طرف مائل نہیں ہوا۔

سید امداد علی نے یہ بھی بتایا کہ "نو بو نور" کے پبلشر اور مالک محمد اسد علی صاحب تھے جو کلکتہ کے محلہ کرٹے کے رہنے والے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں کی جدوجہد اور مسلسل کوششوں نے اس رسالے کو زندہ رکھا۔

محمد اسد علی صاحب کے متعلق انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ نہ تو مالدار تھے اور نہ ان کا شمار صاحب اقتدار لوگوں میں تھا۔ یہ سب محض ان کا خلوص اور للہیت تھی، ان کے عزائم بہت راسخ اور آہنی ارادوں کے مالک تھے۔ شب و روز کام کرنے والے اور پھر بھی نہ تھکنے والے انسان تھے۔

محمد اسد علی جن جذبات کو لے کر اٹھے تھے انہوں نے تین اور نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا، ان میں عمل پیہم نیز مسلسل جدوجہد کی ایک ایسی روح پھونکی کہ یہ تینوں بھی ایک جنوں کے تحت اس اہم کام کی تکمیل کے لئے ان کو اپنا میر کارواں بنا کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ حضرات ہیں: سید امداد علی، قاضی امداد الحق اور محمد ہدایت اللہ یہی مختصر جماعت "نو بو نور" کی سربراہ تھی اور سید امداد علی اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی۔ بالکل نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس عمر میں اتنا اہم بوجھ ان کے دوش پر ڈال دیا گیا، چنانچہ عام سمجھدار طبقے کا یہی خیال تھا کہ اس بارِ عظیم کو یہ بچہ ہرگز نہ اٹھا سکے گا۔ لیکن ایک سال کے بعد جب "نو بو نور" کا شمار ملک کے ادبی رسالوں کی صف اول میں ہونے لگا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں کہ یہ چند نوجوانوں کی جماعت جس سے امید وابستہ کرنا ایک مہمل خیال سمجھا جاتا تھا، آج اسی جماعت کے ایک ۲۵ سالہ نوجوان نے اپنی کوشش اور صلاحیت سے اس رسالے کو بنگالی رسائل کی صف اول میں لا کھڑا کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نو بو نور نے بنگالی مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں ادبی ذوق پیدا کیا اور انہیں بنگالی میں لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کیا اور اپنی زبان و ادب سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔

چنانچہ آج بنگلہ زبان میں مسلمان ادیبوں کے لکھے ہوئے ناول۔ افسانے، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، نقد و تبصرہ، غزلوں، نظموں اور مقالات پر جو بے شمار کتابیں نظر آ رہی ہیں وہ سب نو بو نور اور اس میں لکھنے والوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اس رسالے کے ذریعہ جن لوگوں نے ادب میں خاص مقام حاصل کیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ کوی کیقباد، شیخ فضل الکریم، قاضی امداد الحق، محمد ہدایت اللہ، مطیع الرحمٰن، عبد الکریم، اسمٰعیل حسین شیرازی، عثمان علی، شیخ جمیل الدین، ریاض الدین احمد، عزیز النسار، مسز آر، الیس حسین، اگرچہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ "نو بو نور" نے ہر قسم کا ادبی لٹریچر مہیا کیا ہے لیکن یہ کہنا قطعی غلط نہیں کہ جو لٹریچر آج ہمارے سامنے ہے وہ سب کا سب "نو بو نور" ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

انگریزوں نے اپنے قدم جمانے کے بعد آہستہ آہستہ مسلمانوں کو ہر طرح سے مٹانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد ایک سو سال کے عرصہ میں انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی طور سے بالکل بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تھا۔ سیاسی اور اقتصادی بدحالی کے بعد انگریزوں کے پادریوں نے مسلمانوں کے دین و مذہب پر بھی منظم طریقہ سے حملہ کیا چنانچہ انگریز مبلغ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے انگریزوں کی اس منظم سازش کے خلاف سب سے پہلے اخبار سدھاکر کے متعلق اخبار نویسوں نے آواز بلند کی۔ اس سے پہلے شیخ عبد الرحیم، محمد ریاض الدین احمد، پنڈت ریاض الدین مشہدی، منشی مہر اللہ اور منشی ضمیر الدین نے انگریز پادریوں کے جوابات دینے شروع کئے اور ان سے

قلمی اور زبانی مقابلے شروع کئے لیکن اس کام کے لئے کوئی منظم ادارہ نہیں تھا۔ یہ سب کے سب اپنے طور سے پادریوں کی طرف سے اسلام پر کئے اعتراضات کا جواب دیتے اور ان سے مناظرے میں لگے ہوئے تھے۔

مرزا محمد یوسف علی اور ان کے صاحبزادے مرزا محمد یعقوب علی کی کوششوں سے ایک انجمن راجشاہی میں ۱۹۰۵ء میں قائم ہوئی اس انجمن کا نام "نور الایمان" رکھا گیا۔ جس طرح سے کہ ہندوؤں نے بے شمار ادارے بنا رکھے تھے اور انجمنیں قائم کر رکھی تھیں مسلمانوں نے اتنی انجمنیں یا ادارے قائم نہیں کئے تھے، ہندوؤں کے مشہور سماجی اور تبلیغی ادارے "رام کرشنا مشن" اور برہمو سماج وغیرہ دن رات کام میں مصروف تھے غیر مسلموں کی مذہبی سرگرمیوں کے پیش نظر مسلمانوں کو بھی زیادہ سے زیادہ اداروں اور انجمنوں کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد اکرم خاں اور منیر الزماں اسلام آبادی نے کلکتہ میں ایک انجمن "انجمن علماء" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے اسلام کی تبلیغ کی جائے اور اسلام پر کئے جانے والے حملوں کا جواب دیا جائے۔

اس انجمن کے پہلے سکریٹری جناب مولانا اکرم خاں مقرر کئے گئے اور جناب منیر الزماں اسلام آبادی کو اس انجمن کا جوائنٹ سکریٹری چنا گیا۔

اس ادارے کے لئے ایک اخبار کی ضرورت محسوس ہوئی جو اسی انجمن کا ترجمان ہو۔ چنانچہ بیساکھ سنہ ۱۳۲۲ بنگلہ میں کلکتہ سے ماہانہ رسالہ "الاسلام" کے نام سے جاری کیا گیا۔ رسالہ کی قیمت فی کاپی چار آنے اور سالانہ قیمت ۲ روپے چھ آنے تھی۔

اس اخبار کا پہلا ایڈیٹر مولانا اکرم خاں کو مقرر کیا گیا۔ مولانا اکرم خاں کے بعد ادارے کی ذمہ داری مولانا منیر الزماں اسلام آبادی کو سونپی گئی۔ ۱۳۲۶ء بنگلہ میں رسالہ الاسلام بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے پہلے شمارے میں الاسلام کے اجرا کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی۔ "مذہب، دیش، قوم، وطن کی خدمت کے ساتھ ساتھ مادری زبان کی خدمت کے لئے یہ رسالہ الاسلام جاری کیا گیا ہے۔

اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ سینا کے پہاڑ پھوٹنے والے نور اسلام سے ساری دنیا کو منور کر دے اور وہ چراغ جو جلتا رہا ہے اس کی ضیا پاشیوں سے دنیا دوبارہ روشن ہو جائے اس رسالے کے مقاصد بیان کرتے ہوئے اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ یہ رسالہ ادب کی خدمت کے لئے نہیں نکالا گیا ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے یہ رسالہ انجمن علماء اسلام کا ترجمان ہے رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے مزید کہا گیا تھا اگرچہ یہ رسالہ اسلام [illegible] کے آرگن "کوہ نور"، "نو بو نور" اور "پاشونا" نامی رسالے جتنی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت نہیں کر سکتا مگر پھر بھی ہم اس کی پوری کوشش کریں گے کہ یہ ان رسالوں سے بہر حال کسی طرح سے بھی پیچھے نہیں ہوگا۔

"الاسلام" کے پہلے شمارے میں ادارے کے علاوہ شیرازی اور محمد مزمل حق، شیخ حبیب الرحمٰن کا بنگلہ کلام اور مولانا اکرم کے دو مضامین، مولانا عبداللہ الباقی، محمد شہید اللہ، محمد منیر الزماں، عبدالمالک چودھری، شری محمد مظفر الدین اور ایک گمنام شخص کے مضامین شامل تھے۔ آخری نام "شری محمد مظفر الدین" کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے نام کے آگے "شری" کا استعمال ہوتا تھا۔ اس رسالہ کے دوسرے شمارے سے شری کا لفظ نکال دیا گیا۔ اس کے بعد پھر عام طور سے مسلمانوں نے اپنے نام کے آگے شری کا لفظ لکھنا بند کر دیا اس کے بعد کے شماروں میں "نور اسلام" کے عنوان سے عبداللطیف کیقباد، احمد علی، عبدالغفور صدیقی، شاہی پوری، مزمل حق، معین الدین حسین، محمد واجد علی، محمد کے چاند، محمد یعقوب علی چودھری، محمد لطیف الرحمٰن، عبدالکریم ساہتیہ وشارد، کوئی غلام مصطفیٰ، ابوالکلام محمد شمس الدین، فضل الحق، شیل برشی، شیخ محمد ادریس علی وغیرہ نے لکھنا شروع کیا۔

"الاسلام" میں صرف مسلمان ہی لکھتے تھے ایسا نہیں تھا بلکہ اس میں ہندو بھی بڑے شوق سے لکھتے تھے۔ چنانچہ الاسلام کے غیر مسلم لکھنے والوں میں، جوتیندر موہن باگچی، چنڈی چرن مترا، کالی داس رائے، چارو چندر مترا، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ "پربھاشک" نامی ہندو رسالہ سے بھی بعض مضامین اس رسالہ میں نقل کئے گئے۔ مضمون نگاروں میں رابندر ناتھ ٹیگور، پرفلا چندر رائے، شنیتی کمار چودھری وغیرہ کے نام کافی مشہور ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پربھاشک سے رابندر ناتھ ٹیگور کا کلام نقل تو کیا گیا تھا۔ مگر رابندر ناتھ ٹیگور کا نام شائع نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس زمانہ میں نوبل پرائز پانے کے بعد ٹیگور کا نام ساری دنیا میں مشہور ہو چکا تھا۔ یہ ۱۳۲۶ء بنگلہ کی بات ہے۔

جو کچھ اب تک آپ کو بتایا گیا اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ رسالہ الاسلام کے تین خاص مقاصد تھے (۱) اسلام کی تبلیغ اور اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے جوابات (۲) اسلامی معاشرے کی مذمت (۳) بنگلہ زبان کی ترقی۔

الاسلام کے ذریعہ عیسائی پادریوں کے جوابات دیئے جاتے اسلام کی تبلیغ کی جا رہی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کئے جا رہے تھے اس رسالہ میں مولانا اکرم خاں صاحب نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس رسالہ کی کوششوں سے بنگال میں اسلام کو ایک نئی روشنی ملی۔ "الاسلام" کے ایک شمارے میں محمد شہید اللہ کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "اسلام کی تعلیم اور ہماری امیدیں" اس مضمون میں محمد شہید اللہ نے نئے انداز سے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے بنگال والوں کو روشناس کرایا تھا۔ اس طرح سے شیرازی نے اپنے زور قلم سے بنگلا ادب میں چار چاند لگا دیئے تھے ان کا ایک مضمون "اسلام کے لئے قربانی" بہت پسند کیا گیا تھا۔

الاسلام کے مضامین میں خاص طور سے اس پر زور دیا جاتا تھا کہ اسلام دنیا کی عام زندگی میں کہاں تک ساتھ دیتا ہے ان مضامین میں یہ بتایا جاتا تھا کہ اسلام ایک زندہ جاوید مذہب ہے اس کا اصول حیات ہمیشہ باقی رہنے والا ہے ان مضامین کے ساتھ ساتھ اس میں تاریخی، معاشی، معاشرتی اور سماجی مضامین بھی کثرت سے شائع ہوتے تھے۔

تاریخی مضامین میں زیادہ تر مسلمانوں کی تاریخ اور شاندار ماضی سے بحث کی جاتی تھی۔

شیخ حبیب الرحمٰن نے "عالمگیر" کے نام سے اس رسالہ میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا بعد میں یہ مضامین ایک کتابی شکل میں شائع ہوئے تو یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

الاسلام میں خواتین کے عام مسائل، تعلیم نسواں، بچوں کی تربیت، کاشتکاروں کے مسائل وغیرہ کے متعلق بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ "الاسلام" کے پانچویں سال کے چھٹے اور پانچویں شمارے میں مولانا منیر الزماں نے ایک بہت ہی اہم مضمون لکھا جس کا تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنے اس مضمون میں نقلی پیروں، کنیا دان، شادی بیاہ میں فضول خرچی اور سود خوری کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے اپنے اسی مضمون میں نابالغ بچے بچیوں کی شادی کے خلاف بھی زبردست آواز بلند کی۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔

اگرچہ اس رسالے کے نکالنے والے بار بار اس کا اعلان کر رہے تھے کہ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد محض اسلام کی خدمت ہے۔ ہم ادب یا لٹریچر کی خدمت کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ غیر شعوری طور سے "الاسلام" نے بنگلا ادب کی بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

شہید اللہ صاحب کی شاعری اور شیرازی کی کتاب "مہا شکھیا کیتو" قسط وار پہلے اس رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔

اس رسالہ میں افسانے شائع نہیں ہوتے تھے، لیکن ادبی مضامین پابندی سے شائع ہوتے تھے، ادبی مضامین میں غیر مسلم مضمون نگاروں کے بھی نام ملتے ہیں، جن میں بنکم چندر کا نام قابل ذکر ہے۔

کلکتہ سے "بھارت درش" نامی اخبار اور "الاسلام" سے بہت دنوں تک مختلف مسائل پر مناظرے بھی ہوتے رہے۔

چونکہ مسلمانوں کی بنگلہ زبان میں عربی اور فارسی کے اثرات نمایاں تھے اور ہندوؤں کے بنگلہ سنسکرت سے بہت متاثر تھی۔ اس لئے بھی ہندوؤں نے مسلمانی بنگلہ کے خلاف آواز بلند کی مگر الاسلام نے اپنا مشن جاری رکھا۔

انیسویں صدی میں یہ بحث بھی چل رہی تھی کہ آیا بنگلہ مسلمانوں کی زبان ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ لیکن پچاس برس تک مسلمانوں نے جدوجہد کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بنگلا مسلمانوں کی بھی زبان ہے۔

الاسلام نے بلاشبہ اسلام اور اسلامی معاشرہ کی خدمات بمقابلہ بنگلا صحافت اور ادب کے زیادہ کی ہے۔ الاسلام کے ذریعہ اسلام کو عام لوگوں کے سامنے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا تھا اور عام طور سے اختلافی مسائل وغیرہ سے بچ کر اسلام کے اعلیٰ اور بنیادی اصولوں ہی کو بڑے سائنٹیفک طریقے سے پیش کیا تھا بنگالی مسلمانوں میں اسلام پر مکمل اعتقاد، اللہ کی ذات پر بھروسہ اور اپنی ہمت پر یقین کا جذبہ پیدا کرنے میں "الاسلام" نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے اس لئے ہم رسالہ "الاسلام" کو کبھی نہیں بھول سکتے

اور اس رسالہ کا نام ہمارے درمیان ہمیشہ باقی رہے گا۔

سدھاکر اور مہیر

ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایک کتاب تاریخ "بنگال ادب" کے نام سے شائع ہوئی جس میں شیخ عبدالرحیم اور ان کے قلمی معاونین کو "شدھاکر پارٹی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس مقام پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ "سدھاکر" سے پہلے ۱۸۳۱ء میں شیخ علیم اللہ کی ادارت میں بھی ایک ہفتہ وار اخبار فارسی اور بنگالی دو زبانوں میں شائع ہوا، اس کا نام تھا "ہفتہ وار سماچار سبھا راجندر" یہ سب سے پہلا بنگالی اخبار ہے جو دو زبانوں میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے کسی اخبار کی اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس اخبار کے بعد بھی اور دوسرے حضرات نے مختلف ناموں سے اخبارات شائع کئے ان میں "ہفتہ وار جگر دیپک بھاسکر" جو ۱۸۴۶ء میں مولوی عالی کے زیر ادارت شائع ہوا یہ خاص طور پر قابل ذکر اس لئے ہے کہ یہ اخبار بنگالی، اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی پانچ زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔

۱۸۷۴ء میں میر مشرف نے ایک ماہنامہ "عزیز النہار" کے نام سے جاری کیا اور اسی سن کے لگ بھگ انیس احمد نے بھی ایک پندرہ روزہ اخبار موضع پاریل ضلع ڈھاکہ سے "پاریل باتا بہو" نام سے جاری کیا۔ ۱۸۷۶ء میں ٹنگائل سے ایک اور پندرہ روزہ رسالہ شائع ہوا۔ جس کا نام "احمدی" تھا۔ یہ رسالہ عبدالحمید خاں احمدی کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں منشی غلام قادر نے بھی ایک ماہنامہ جاری کیا، جس کا نام ——— "ہندو مسلمان شملین" تھا۔ لیکن ان تمام ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار رسالوں کی زندگی بہت مختصر رہی، ان میں سے بعض دو چار اشاعت اور بعض ۱۰، ۱۲، اشاعت تک زندہ رہے اور ان کا اثر بھی کوئی خاص نہ ہوا جس مقصد کے تحت یہ اخبارات اور رسائل شائع کئے گئے وہ مفید کار ثابت نہ ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام اخبارات اور رسائل میں صرف "شدھاکار" ہی وہ واحد ہفتہ وار اخبار ہے جس کا نام اس سلسلے میں لینا ضروری ہے، اس اخبار کی پہلی اشاعت ۸ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی اس کے سرورق پر چاند تارا، اور اس کے نیچے عربی کی کوئی عبارت تھی۔

"شدھاکار" سیتانام گھوش اسٹریٹ میں "ملن جنتر" پریس میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا، اس رسالے کی ہر اشاعت میں مولانا ابوطاہر کے ملفوظات کو ازراہِ تبرک ضرور شامل کیا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا اپنے وقت کے زبردست صوفی منش اور جید عالموں میں شمار ہوتے تھے اور ہر طبقہ کے افراد مولانا کا احترام کرتے تھے، اس اخبار کو نواب بہادر سراج الاسلام بی، ایل کی خاص اعانت اور مدد حاصل تھی، جب اخبار کی اشاعت بڑھ گئی اور عملہ زیادہ ہو گیا تو اس کے دفتر کو پرانے بیٹھک خانہ روڈ پر منتقل کر دیا گیا۔

شدھاکار کے خاص لکھنے والوں میں ریاض الدین احمد مشہدی، پروفیسر معراج الدین، مزمل حق، منشی مہر اللہ اور منشی منیر الدین تھے۔ اس سلسلے میں ایک خاص واقعہ دہرانا ضروری ہے، جس وقت شدھاکار کی اشاعت زوروں پر تھی اسی اثنا میں کسی عیسائی مبلغ کے فریب میں آکر منشی ضمیر الدین عیسائی ہوگئے اور ان کا نام ——— جان ضمیر الدین ہو گیا، انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کے معنی ہیں "اصلی قرآن کہاں؟" یہ مضمون عیسائی مشنریوں کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا جواب "شدھاکار" کی مسلسل چار اشاعتوں میں شائع ہوا اس کے لکھنے والے تھے منشی مہر اللہ مضمون کا عنوان تھا "اصل قرآن ہر جگہ موجود ہے" اس مضمون نے جان ضمیر الدین کے قلب کو عیسائیت سے برگشتہ کر دیا وہ پھر مسلمان ہو گئے اور اسلام کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس مضمون کو جو شدھاکار کی چار اشاعتوں میں مسلسل شائع ہوا تھا۔ بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

آخر شدھاکار کے متعلق اس قدر جاننا ضروری ہے کہ درحقیقت بنگالی مسلمانوں کا یہی پہلا اخبار ہے جس نے مسلمانوں کو ان کی تاریخ، روایات اور اسلام کے بنیادی مسائل سے روشناس کیا اور بنگالی نوجوانوں میں ادبی لگاؤ پیدا کیا۔

بنگال ادب کا دوسرا زبردست ادبی شہ پارہ ہے ماہنامہ "مہیر" جو یکم جنوری ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ آسمانِ صحافت پر جلوہ گر ہوا اس کے مدیر شیخ عبدالرحیم تھے۔ رسالہ کی قیمت اس وقت ۶ آنے تھی۔ یہ رسالہ خالص ادبی تھا۔

اس رسالے کے دو مضامین کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان دونوں مضامین نے رسالے کو اور رسالے نے ان مضامین کے لکھنے والوں کو حیات جاوید بخشی۔ ایک مضمون ہے "سمدیہ دبے" یعنی فتوح الشام" مضمون نگار تھے پنڈت ریاض الدین

یہ مضمون مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوتا رہا اور بعد میں شیخ عبدالرحیم نے اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا۔

دوسرا مضمون "شاہنامہ" اس کے لکھنے والے مزمل حق۔ یہ مضمون بھی مسلسل اشاعتوں میں شائع ہونے کے بعد کتابی شکل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کتاب فردوسی کی کہانی سے ماخوذ ہے لیکن یہ مضمون "مہیر" میں مکمل نہ ہو سکا۔ کیونکہ مہیر کچھ دنوں بعد بند ہو گیا۔ بقیہ مضمون بعد میں ماہنامہ "حافظ" میں شائع ہوا۔ جس کے ایڈیٹر بھی شیخ عبدالرحیم تھے

اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ سماج اور سوسائٹی میں اسلامی روح پھونکنے والا اگر کوئی بنگالی اخبار تھا تو وہ "سدھاکار" ہی تھا۔ بنگالی نوجوانوں میں جس رسالے نے سب سے پہلے نئے ادبی رجحانات پیدا کئے وہ ماہنامہ "مہیر" ہی تھا۔ یہ دونوں اخبار اور رسالے ایک ساتھ برابر ۱۹۰۲ء تک شائع ہوتے رہے۔

لیکن شیخ عبدالرحیم کے لئے ایک ساتھ دونوں کا جاری رکھنا ممکن نہیں تھا اس لئے انہوں نے ایک دوسری راہ اختیار کی اور "مہیر و سدھاکار" نام سے ایک تیسرا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

اگرچہ آج "مہیر" اور "سدھاکار" موجود نہیں ہیں لیکن ان دونوں اخبارات نے جو کارنامے بنگالی مسلمانوں کے مستقبل کو شاندار بنانے کے سلسلے میں انجام دیئے ہیں، اسے بنگالی مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

بنگو مسلمان ساہتیہ سمیتی پتریکا بنگال کے مسلمانوں کا ادبی اخبار جو ہر تین مہینہ کے بعد ایک مرتبہ نکلتا تھا۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ بیساکھ ۱۳۵۲ بنگلہ سال میں نکلا۔ اس کا دفتر پہلے ۱۴ مرزا پور اسٹریٹ کلکتہ میں تھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد مسلم ایسوسی ایشن کے دفتر واقع ۳۲ کالج اسٹریٹ میں منتقل ہو گیا۔

میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا اور میرے ساتھ میرے معاون مدیر بھولا سب ڈویژن ضلع باقر گنج کے شاعر مولوی مزمل حق تھے۔

یہ رسالہ بنگال کے مسلمانوں کی ادبی انجمن کا ترجمان تھا اس ادبی انجمن کے بارے میں بھی چند باتیں بیان کرنی ضروری ہیں ۱۹۱۰ء میں میں نے بی اے پاس کیا، اسی زمانہ میں میری ملاقات کو ملا کے بعض ذہین اور ادب دوست نوجوانوں سے ہوئی ان نوجوانوں میں محمد مزمل حق، محمد یعقوب علی چودھری — معین الدین حسین، مولوی احمد علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام نوجوانوں میں محمد مزمل حق زیادہ ذہین اور ابھرتے ہوئے نوجوان تھے۔ ان دنوں ہم دونوں بنگالی کی ادبی مجلس کے ممبر بھی تھے اس مجلس کے ممبروں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے مگر مسلمانوں کا ادبی سرمایہ بہت ہی کم تھا اور کمزور، اسی لئے ہم اس انجمن میں ایسے لگتے تھے جیسے کوئی غریب شخص اپنے کسی بڑے رئیس رشتہ دار کے ہاں جا کر سوائے چپ چاپ بیٹھنے کے اور کیا کر سکتا ہے، لہذا ہم نے یہ محسوس کیا کہ اس بڑی ادبی انجمن سے تعلق باقی رکھتے ہوئے بھی ہم مسلمانوں کو ایک الگ ادبی انجمن قائم کرنا چاہیئے اس خیال کے تحت ۴ ستمبر ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالرحمٰن خاں کے مکان ۹ انٹونی بگان کلکتہ میں ایک جلسہ بلایا گیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس جلسہ میں مولانا محمد اکرم خاں، مولانا محمد مزمل حق مرحوم، مولوی محمد منیر الزماں اسلام آبادی مرحوم، محمد یعقوب علی چودھری مرحوم، منشی حاتم علی خاں مرحوم، منشی شیخ عبدالرحیم مرحوم، منشی محمد ریاض الدین مرحوم، روشن علی چودھری مرحوم، مولوی معین الدین حسین "دی مسلمان" کے ایڈیٹر مرحوم مولوی مجیب الرحمٰن، مولوی احمد علی اور ڈاکٹر عبدالغفور صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ ان کا شمار اس وقت کے بڑے ادیبوں اور صحافیوں میں ہوتا تھا۔

میں سب سے پہلے اس انجمن کا بلا مقابلہ سکریٹری مقرر ہوا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مرحوم مولوی عبدالکریم ریٹائرڈ ڈویژنل انسپکٹر آف اسکول اس انجمن کے صدر چنے گئے میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۲ء میں اس انجمن کا پہلا سالانہ جلسہ اور اسی کے ساتھ بنگال کے مسلمانوں کی ادبی مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

دیناج پور کے مولوی یقین الدین احمد نے اس جلسہ کی صدارت کی جو بلی انسٹی ٹیوٹ ۲۹ مرزا پور اسٹریٹ کلکتہ میں یہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے ابتدائی سال میں میں نے وکالت میں کامیابی حاصل کی جس کے بعد میں چاٹگام کے سیتاکنڈ ہائی انگلش اسکول میں ٹیچر مقرر کیا گیا ——

مولوی منیرالزماں نے مجھے یہ جگہ دلوائی تھی۔ میں نے اسکول کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد کلکتہ کی ادبی انجمن کے سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا۔ میرے استعفے کے بعد ایک طرح سے ادبی انجمن کا کام رک گیا۔ اس کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں خان بہادر احسن اللہ کی

صدارت میں مسلم ایسوسی ایشن کا ایک عام جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں میرا استعفا منظور کیا گیا۔ اور اس کے بعد مولوی مزمل حق بی اے کو اس انجمن کا سیکرٹری چنا گیا۔

۲۷ر ستمبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں بنگال کے مسلمانوں کی ادبی انجمن کا دوسرا عام جلسہ منعقد ہوا۔ میں اس کا صدر تھا۔ بنگیہ مسلمان ساہتیہ پتریکا کے پہلے شمارے میں میرا خطبۂ صدارت چھپا۔

آنجہانی سریش چندر سماج پتی نے اپنے ایک ماہانہ رسالہ میں میرے خطبہ پر بہت ہمت افزا تنقید کی۔ اس اجلاس میں بنگالی زبان کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا جن میں راما نند چیٹرجی، چارو چندر بنرجی، جلدھر سین اور ستندر ناتھ دتا وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جنوری ۱۹۱۸ء میں ۳۲/۱ مرزا پور اسٹریٹ میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ جس میں ایک دار المطالعہ اور ایک لائبریری قائم کی گئی اس سے پہلے ایسوسی ایشن کا باضابطہ کوئی دفتر نہ تھا اسی سال دسمبر کے مہینہ میں چاٹگام میں بنگال کے مسلمانوں کی ادبی مجلس کا تیسرا عام جلسہ بلایا گیا۔

یہ جلسہ نہایت ہی اہم جلسہ تھا۔ مولانا محمد اکرم خاں اس جلسہ کے صدر اور مرحوم منشی عبدالکریم ساہتیہ بشارد اس مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے۔

اس جلسہ کی کارروائی اور خطبہ صدارت وغیرہ بنگیہ مسلمان ساہتیہ پتریکا کے پہلے سال کے چوتھے شمارے میں شائع کیا گیا۔ میں نے بھی اس جلسہ میں حصہ لیا تھا اور چاٹگام کے مسلمان طالب علموں کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اس اجلاس کا خطبۂ صدارت رسالہ "الاسلام" میں شائع ہوا۔

فروری ۱۹۱۹ء میں ۳۲ کالج اسٹریٹ کے اوپر کا حصہ ۴۳ روپیہ ماہانہ کرایہ پر لیا گیا۔ اس میں ایسوسی ایشن کا دفتر دوبارہ منتقل کیا گیا۔ اس وقت مولوی اے۔ کے فضل الحق ـــ سید نسیم علی، مولوی امین الرحمٰن وغیرہ جیسے سیاسی لیڈر اس انجمن میں شریک ہو گئے۔ اسی سال جون کے مہینے میں وکالت چھوڑ کر کلکتہ یونیورسٹی میں ملازم ہو گیا میرے کلکتہ آنے کے کچھ دنوں کے بعد شاعر نذر الاسلام فوج کی ملازمت کے بعد کلکتہ آ کر اس انجمن کے دفتر میں قیام پذیر ہو گئے۔

نذر الاسلام نے خود لکھا ہے کہ اس انجمن نے مجھے اپنے چھوٹے سے آشیانے میں جگہ دی تھی۔ اگر مجھے وہاں جگہ نہ ملتی تو میں دنیا کے سمندر میں غرق ہو جاتا۔ یہ ادبی انجمن میری زندگی کی خوش گوار یاد دلانے سے سرسبز ہے میں اس انجمن کا بہت احسان مند ہوں۔

جون ۱۹۲۱ء میں، میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے لکچرر کی حیثیت سے ڈھاکہ آ گیا اور مجھے کلکتہ چھوڑنا پڑا۔ میرے چلے آنے کے بعد پھر ادبی انجمن کے کام میں رکاوٹ پڑ گئی۔ اسی لئے کافی دنوں کے بعد یعنی ۸، ۹ر اپریل ۱۹۲۸ء میں مولانا منیر الزماں اسلام آبادی کی صدارت میں بشیر ہاٹ میں ادبی مجلس کا چوتھا عام سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے استقبالیہ کمیٹی کا صدر جناب سید مکرم علی کو مقرر کیا گیا۔

۱۹۳۲ء کے دسمبر کے مہینے میں انجمن کا پانچواں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس کے صدر کوی کیقباد تھے۔ شاعر نذر الاسلام نے اس اجلاس کا افتتاح کیا۔ اس اجلاس میں مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا محمد اکرم خاں تھے۔ مگر وہ وقت پر تشریف نہ لا سکے تو اس کی صدارت سید امجد علی نے کی۔

اس اجلاس میں، تاریخ، ادب، سائنس اور فلسفہ پر الگ الگ جلسہ ہوئے۔

ڈاکٹر قدرتِ خدا، پروفیسر ظہور الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالودود اور پروفیسر کاظم الدین نے صدارت کی۔

اس اجلاس کے سات سال کے بعد کلکتہ میں مئی ۱۹۳۹ء میں انجمن کا چھٹا سالانہ جلسہ ہوا، اس وقت کے بنگال کے وزیر اعظم جناب مولوی فضل الحق نے اس انجمن کے چھٹے اجلاس کا افتتاح کیا۔

اس جلسہ کے صدر منشی عبدالکریم ساہتیہ بشارد تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر خان بہادر سید عزیز الحق تھے یہ اجلاس چھ حصوں میں بٹا ہوا تھا (۱) ادبی (۲) ثقافتی (۳) شاعری (۴) ناول (۵) فلسفہ اور (۶) بزم خواتین۔

اس اجلاس میں علی الترتیب حسب ذیل افراد نے صدارت کی مسٹر ایس واحد علی، مولانا محمد اکرم خاں شاعر شہادت حسین، خانصاحب ہدایت اللہ، قاضی منظر حسین اور بیگم شمس النہار محمود۔

۵ر اور ۶ر اپریل ۱۹۴۱ء میں ادبی مجلس کی ۲۵ سالہ سلور جوبلی منائی گئی۔ اس کا افتتاح مولوی فضل الحق نے کیا قاضی نذر الاسلام اس اجلاس کے صدر اور حبیب اللہ بہار اس کی مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے اس انجمن کے خاص خاص مقاصد یہ تھے۔

(۱) بنگالی ادب کا اہتمام بنگالی مسلمانوں میں۔

(۲) بنگال کے ادبی سرمایہ کی ترقی میں بنگالی مسلمانوں کا حصہ

(۳) عربی، فارسی اُردو میں لکھی ہوئی ادبی، اسلامی اور تاریخی چیزوں

کو بنگالی زبان میں منتقل کرنا۔

(۴) قدیم بنگالی مسلمان ادیبوں کی تحریروں اور تصنیفات کو جمع کرنا اور اسے محفوظ کرنا۔

(۵) بنگال کے ولیوں اور پیروں کی زندگیوں کے حالات کو جمع کرنا اور اسے شائع کرنا۔

(۶) بنگال کے قدیم مسلمان خاندانوں کی تاریخ جمع کرنا اور اسے شائع کرنا۔

(۷) قومی تاریخ کے لئے مواد کی تلاش۔

(۸) مسلمانوں کے نکالے ہوئے اخبار اور رسالوں کو مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانا۔

(۹) مسلمان مصنفوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی اشاعت اور مصنفوں کی ہمت افزائی۔

(۱۰) ہندوؤں اور مسلمانوں میں ادبی اتحاد پیدا کرنا۔

اگرچہ یہ سارے مقاصد پورے نہیں ہوئے مگر پھر بھی مشترکہ مساعی ضائع نہیں گئیں۔ اور مسلمان ادیبوں اور شاعروں کو ابھرنے کا کافی موقع ملا۔

۱۳۲۵ء بنگلہ سال میں نکلنے والا سہ ماہی رسالہ بنگو مسلمان شاہیتہ پتریکا ۵ ½ سال تک پابندی سے نکلتا رہا اور مذکورہ بالا خیالات کی اشاعت کرتا رہا۔ اس رسالہ کے پہلے سال کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ مل جائے گا۔ کہ اس رسالے نے مسلمانوں کے بنگالی ادب کی کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔

(۱) ہمارے مقاصد (اداریہ) محمد مزمل حق
(۲) خوش آمدید۔ محمد شہید اللہ
(۳) خطبۂ صدارت، شہید اللہ
(۴) عرب زمانہ جاہلیت میں۔ مولوی فضل الرحیم چودھری۔
(۵) سماج۔ محمد یعقوب علی چودھری
(۶) شاعر اور سائنسداں۔ کوی غلام مصطفےٰ
(۷) آخری بارش . . مولوی فضل الکریم
(۸) خطاط (مصر) بی بی سارہ طیفور
(۹) بہشت کی روشنی ـــ قاضی امداد الحق
(۱۰) خوابوں کی دنیا . . . . ابو لوہانی وغیرہ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے قابل ذکر لکھنے والے ہیں جن میں مولانا اکرم خاں، سید امداد علی، اکرام الدین، منظر احمد، کیقباد، محمد وامد علی، عبدالکریم شاہتیہ بشارد، کالی داس رائے، کوی شیکھر شہادت حسین، ابو الہاشم اور عطار الحکیم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

پٹ سن اور اس کی مصنوعات (سلسلہ ص ۴۹)

اپنی مصنوعات برآمد کرنے لگے۔ اس حوصلہ افزا نتائج کے بعد بھی حکومت پاکستان کی یہ کوشش جاری رہی کہ خام پٹ سن کو کسی طرح ضائع نہ ہونے دیا جائے یا غیر ممالک میں خام پٹ سن فروخت بھی کیا جائے تو ان ممالک کو ایسا موقع نہ دیا جائے کہ وہ اپنی منہ مانگی شرح پر پٹ سن خریدیں۔

ایک طرف تو حکومت کی یہ کوشش جاری رہی کہ پٹ سن کی غیر ملکی منڈیوں میں حالات پاکستان کے حق میں رہیں اور دوسری طرف ملک کے چند اور صنعت کاروں نے پٹ سن کی صنعت کی طرف توجہ دی اور اس طرح ۱۹۵۶ء کے آخر تک سات ہزار سات سو دو تانتیں (۷۷۰۲) لگ گئیں جن سے اس صنعت کی اشیاء کی تیاری میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ملک کے اندر بننے والی دوسری مصنوعات کے ساتھ ساتھ غیر ممالک میں پٹ سن کی مصنوعات کی مانگ روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس صورت حال میں ہم ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد سالانہ ایک لاکھ ٹن فاضل اشیاء بنانے لگے۔ اس وقت پٹ سن کے کارخانوں کی تعداد میں برابر اضافہ جاری ہے۔ ۱۹۶۱ء تک بارہ ہزار تانتوں پر مشتمل پٹ سن کے کل کارخانے قائم کئے جا چکے ہیں۔

سید وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اردو جریدہ

۱۹۰۶ء میں جب مسلمانان بنگالہ کی کوششوں سے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلمانوں کا ایک صوبہ بنایا گیا تو یہاں کے مسلمانوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کا ایک ایسا اخبار یا رسالہ ہونا چاہیئے جو پورے صوبے کے مسلمانوں کے لئے ایک رابطہ اور وحدت خیال کا ذریعہ بن سکے صوبہ جدید مشرقی بنگال و آسام کے بانیوں کا خیال یہ تھا کہ وحدت خیال اور وحدت قوم کے لئے وحدت زبان نہایت ضروری ہے۔ اردو کو پورے ہندوستان کے مسلمان اپنی قومی زبان تسلیم کر چکے تھے اسی لئے یہ طے کیا گیا کہ جدید صوبہ سے نکلنے والا پہلا رسالہ یا اخبار اردو زبان کا ہونا چاہیئے چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں متحدہ بنگال کے نامور ادیب و شاعر اور قومی کارکن جناب حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں احسن کی زیر ادارت ڈھاکہ سے ماہانہ جریدہ "المشرق" کا اجراء عمل میں آیا اس سے پہلے مشرقی بنگال یا آسام سے مسلمانوں کا کسی زبان کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں نکلا تھا۔ اس رسالہ کے سر ورق پر حافظ شیرازی کا یہ شعر معمولی رد و بدل کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ ز بنگالہ می رود

اس جریدے کے اغراض و مقاصد یہ بتلائے گئے تھے ــــ

"المشرق" کی اشاعت سے غرض بنگالے میں مسلمانوں کی قومی زبان اور لنگوا فرنیکا اردو کی توسیع و اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی تدبیر بتلانا اور رعایا اور گورنمنٹ کے تعلقات میں غلط فہمیوں کے انسداد کی کوشش کرنا اور ہندوستانی برادران مذہب سے تبادلۂ خیالات کر کے ذریعۂ رابطہ و اتحاد اور تعلقات اخوت کو مضبوطی سے قائم کرنا جو بلا اردو کے ناممکن ہے (" المشرق " جلد ۱ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء)

" المشرق " کے پہلے پرچے کو ملک کے سامنے پیش کرتے ہوئے جناب حکیم حبیب الرحمٰن نے عرض حال کے نام سے حسب ذیل معروضات کی ہیں:۔

" معزز مخدومو! عزیز دوستو! مدت کی آرزو اور دیرینہ تمنا یا بقول بعض پرانا خبط جو پچتے پچتے جنون تک پہنچ گیا ہے، اس کا اثر " المشرق " کی صورت میں آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے ہندوستانی بھائیو! بنگال نژاد ہوں۔ یہ جیسی روکھی پھیکی جھلی بھلی ہے قبول کیجئے۔"

حکیم صاحب مرحوم اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" بنگالی ہم وطنو! یہ اپنے دور افتادہ مگر تم سے زیادہ تم پر مہربان بھائیوں سے رابطۂ اتحاد مضبوط رکھنے اور ان کے مفید خیالات سے واقف ہونے کا زبردست ذریعہ ہے امید ہے کہ تمہاری سہل انگاری اس کو ضائع نہ کریگی اور تم دونوں مل کر اس چھوٹے بچے کو جو ابھی پاؤں چلتا ہے اپنے سہارے سے کھڑا کر دیگے۔ خدا کی رحمت اور عنایت سے کیا بعید ہے کہ آہستہ آہستہ بڑا ہو۔ جوان ہو اور پھل پھول کر تمہیں کو اپنی کامیاب زندگی سے کوئی نفع پہنچا سکے۔ سلام علے من اتبع الہدیٰ، آلودہ محن احسن۔ پہلے نمبر میں سوائے دو کے سارے مضامین حکیم صاحب کے لکھے ہوئے تھے۔ ایک مضمون تحلو تو اردوئے لکھنو کے مشہور نامہ نگار حضرت سید محمد آزاد اور دوسرے حضرت نسیم عظیم آبادی ہیں۔ اس شمارہ میں حضرت آزاد کی سات رباعیاں شائع کی گئی ہیں حضرت نسیم عظیم آبادی کی ایک نظم " پولیٹیکل نظم " کے عنوان سے شریک اشاعت ہے۔ مضامین کی ترتیب اس طرح ہے۔ مسلمانوں کی پولیٹیکل خودکشی، علماء اسلام اور جغرافیہ، آقا احمد علی احمد کیا تقسیم نہیں رہے گی؟ لوکل خبریں اور نوٹ رباعیات حضرت آزاد اور پولیٹیکل نظم جناب نسیم عظیم آبادی۔ اپنے مضمون پولیٹیکل خودکشی میں حکیم صاحب نے تقسیم بنگالہ کو باقی رکھنے کلکتہ کے ہندو بنگالی اخبار کی مدیرہ دہنی اور لیڈروں کی خاموشی پر بڑے پُر درد لہجہ میں خامہ فرسائی کی ہے۔ ذیل میں اس مضمون کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

"۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کیسی مبارک تاریخ تھی جس دن ہم کو اپنے آپ کا ذرا ذرا احساس پیدا ہوا اور ۱۶ اگست ۱۹۰۶ء بھی اگر غور سے دیکھئے تو کیسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو اپنی زندگی اور موت اور مرض و صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے ـــ"

"مسلمانوں کے لئے اب کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرگنائزیشن قائم کریں۔ اور اپنے آپ کو اتحاد کے زبردست بند میں جکڑ ڈالیں۔ اپنے آرگنائزیشن کے ذریعہ اپنے دعاوی گورنمنٹ تک پہنچائیں ورنہ یاد رکھیں کہ اب شخصی وجاہت کا زمانہ گذر چکا ہے۔ ذاتی عزت قوم کی عزت نہیں ہے اے قوم کے ذی عزت بزرگو! اگر تم نے اپنی عزت کی طرف خیال کیا، ذاتی فائدے کی طرف جھکے تو یاد رکھو کہ تمہاری عزت، تمہاری وجاہت بھی بہت تھوڑے دنوں کے لئے تمہارے پاس مستعار ہے اور جہاں تمہاری قوم کی عزت گئی وہیں تمہاری عزت بھی تشریف لے گئی۔

"مسلمانوں کو خاموش دیکھنے کے آرزومند دوستو! کیا تمہارے پہلو میں دل ہے اگر ہے تو ذرا ایمان سے کہنا کہ اس میں ناسور تو نہیں ہو گیا ہے، آبلہ تو نہیں پڑ گیا ہے؟ اگر اس دل میں کبھی حس تھا تو ناممکن ہے کہ تمہاری بری حالت نہ ہو۔"

"بنگالی اخباروں کی طرز تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کلیجہ منہ تک آگیا ہے اور ہم کچھ نہیں جانتے ہیں کہ آخر ہماری حالت کیا ہوگی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق وہ کون سی غلط پھبتی ہے جو روزانہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں برے ہیں اس لئے کہ وہ بہت سا ذاتی نقصان برداشت کرکے صرف اس لئے پارٹیشن کے مؤید ہوئے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ وہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدرد ہونے کے تمام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن کے استرداد کے لئے ایک آلہ ہے شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم گھاٹے میں رہتی۔"

تقسیم کے ہوتے ہی اس خطہ کے ہندو اخبارات نے احتجاجی مضامین لکھ لکھ کر تمام ہندوؤں کو مشتعل ملا۔ تھا۔ ہندو نوجوانوں نے تشدد اور غنڈہ گردی شروع کر دی تھی۔ ہر طرف بم پھینکے جا رہے تھے، فساد اور ہنگامے کئے جا رہے تھے۔ تمام ہندو لیڈر گلے پھاڑ پھاڑ کر تقسیم کو منسوخ کرانے کے لئے بنگال کے گوشہ گوشہ میں تقریریں کرتے پھر رہے تھے۔ ہندوؤں کی اس قسم کی سرگرمیوں پر حکیم صاحب نے "کیا تقسیم پھر جائے گی؟" کے عنوان سے ایک با اثر مقالہ لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں ـــ

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اب ہماری عزت اور آبرو ہماری قومی زندگی اور دولت سب اس پارٹیشن کے ساتھ وابستہ ہیں مگر اس سوال سے چند اور سوال پیدا ہوتے ہیں کیا گورنمنٹ ایسی کمزور اور بودی ہے جس کو آبادی کے صرف تہائی حصے نے اپنے ایجی ٹیشن سے پریشان کر دیا ہے اور بے چاری گورنمنٹ کا ضعیف دماغ چندھیا گیا ہے کیا یہ سچ ہے؟ کیا گورنمنٹ درحقیقت ان دریدہ دہن اور شوخ گروہ سے خوش ہے کیا گورنمنٹ آبادی کے دو ثلث مسلمانوں کی اس آواز پر کہ ہم پارٹیشن سے راضی ہیں اور تقسیم بنگال ہمارے لئے مفید ہے اس لئے کان نہیں دھرتی کہ ہم باغیانہ سروں سے واقف نہیں؟ کیا یہ سچ ہے؟ اگر یہ باتیں سچ ہیں تو کیا منظور تھا کہ مسلمانوں کو ایک سنہری موقع دے کر ان سے چھین لیا جائے اور جب وہ ایک خوش گوار فائدہ سے واقف ہو چکے ہوں ان کو محروم کرکے زبردستی جوش دلایا جائے۔ اگر گورنمنٹ کی ایسی کمزور پالیسی ہی غیر متوقع ہے تو شوق سے کل کے بدلے آج تقسیم پلٹ جائے۔ مسلمانوں کو فدا پروا نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر یہ بھی کبھی بیدار ہوئے تو انھیں ذرائع سے جس کو گورنمنٹ اپنے پسند کا سرٹیفکیٹ دیگی اپنے برادران وطن کے قدم بقدم چل کر پھر اپنا واجبی حق حاصل کر لیں گے۔ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔"

"مجھے المشرق کے جتنے پرچے ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جریدہ اکتوبر ۱۹۰۶ء سے کر ستمبر ۱۹۰۸ء تک پابندی سے ایک سال سے زیادہ تک چلتا رہا۔ جناب سید اقبال عظیم نے اپنی تصنیف "مشرقی بنگال میں اردو" میں حکیم حبیب الرحمن صاحب کے تذکرہ میں ان کی صحافتی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

"ایک صحافی کی حیثیت سے بھی حکیم صاحب ہماری شکر گزاری کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ڈھاکہ میں صحافت کی پہل کی اور "المشرق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا یہ بات ۱۹۰۶ء کی ہے افسوس کہ المشرق کا صرف ایک شمارہ نکلا اور بعد میں کچھ دنوں تک ہفتہ وار اخبار کی شکل میں زندہ رہ کر ختم ہو گیا ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں اردو اخبار کے پڑھنے والے ڈھاکے میں کہاں سے آتے جو اس کے اخراجات کے کفیل ہو سکتے۔"

(مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۱۴ تذکرہ حکیم حبیب الرحمن مرحوم)

اقبال عظیم صاحب کے بیان کے مطابق المشرق کا صرف ایک پرچہ ماہانہ کی صورت میں نکلا اور بعد میں یہ ہفتہ وار اخبار کی شکل میں نکلا اور پھر بند ہو گیا۔ غالباً اقبال عظیم صاحب نے اس سلسلہ میں تحقیق کرنا ضروری نہ سمجھا ورنہ وہ ایسی عظیم غلطی نہ کرتے۔ جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ یہ رسالہ جب تک نکلا ماہانہ جریدہ کی شکل ہی میں نکلا۔ میرے پاس ماہانہ المشرق کی ایک سال کی تقریباً مکمل جلد موجود ہے۔ اس قسم کی غلطی کلیم اللہ صاحب نے اپنے مضمون "خالد بنگالی" میں کی تھی جہاں انہوں نے ضمناً المشرق کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ہفتہ وار اخبار بتایا تھا۔

شاید اقبال عظیم صاحب کو المشرق کے ہفتہ وار ہونے کا خیال یوں ہوا کہ المشرق کے چھٹے شمارہ مارچ ۱۹۰۷ء میں حکیم صاحب نے "مسلمانوں کی خدمت میں ایک ضروری عرض"، کے عنوان سے ایک گذارش کی تھی جس میں حکیم صاحب کہتے ہیں:—

"المشرق" کا یہ چھٹواں نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے باوجود قلت حجم و کمی اشاعت اس قلیل عرصہ میں اس نے جیسی کچھ خدمت اپنی قوم اور ملک کی کی ہے اس کو گنانا اس وقت مقصود نہیں ہے ہم لوگوں کو جیسی ضرورتیں درپیش ہیں اور ایک ہفتہ وار پرچہ کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسا نقصان عظیم ہو رہا ہے ہر شخص جسے خداوند پاک نے صحیح دل و دماغ عطا کیا ہے اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ایک ہفتہ وار پرچہ شائع کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر ہر ایک خریدار متوجہ ہو کر صرف دو دو خریدار پیدا کر دیں تو تین روپیہ سالانہ میں بھی المشرق ہفتہ وار حاضر خدمت ہو سکتا ہے۔ مسلمانو! خدا کے لئے متوجہ ہو اور اپنے ہمسایہ اقوام کی حالت پر نظر کرو، دیکھو تم کس قدر قعر مذلت میں گرے ہوئے ہو اور تمہاری حریف قوم کیسے اوج ترقی پر ہے۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہم آپ کی توجہ سے بفضلہ المشرق ہفتہ وار کر سکیں گے۔"

حکیم صاحب کے اس اعلان سے اقبال عظیم صاحب کی یہ بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ڈھاکے میں المشرق اس لئے بند ہو گیا کہ اسے خریدار نہ مل سکے یا اس زمانے میں ڈھاکے میں اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی کمی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ المشرق کو تمام رؤسائے شہر خصوصاً نواب سر سلیم اللہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ پھر نواب صاحب کی قابل قدر امداد سے حکیم صاحب المشرق کے لئے اپنا مطبع قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

حکیم صاحب کی اس اپیل پر بہت سے لوگوں نے نئے خریدار بنائے لیکن اتنے خریدار نہ بن سکے کہ وہ اسے ہفتہ وار کر دیتے چنانچہ ۵ اپریل کے شمارے میں لکھتے ہیں:—

"المشرق" سات مہینے سے حاضر خدمت ہوتا ہے گو آپ حضرات میں بعض مربیان المشرق نے بے انتہا ہمدردی کی اور اس کی توسیع و اشاعت میں مدد کی لیکن ابھی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے کہ المشرق کی کافی اشاعت ہو تاکہ اس کے اجراء سے جو مقصود ہے وہ بر آئے۔ عاجز نے پہلے اعلان کیا تھا اور اب بھی کرتا ہے کہ اگر معاونین المشرق پورے طور پر متوجہ ہو کر زیادہ نہیں ہر شخص صرف دو دو خریدار پیدا کر دیں تو تین روپیہ سالانہ میں المشرق ہفتہ وار کر دیا جا سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے ادھر توجہ کی اگر آپ حضرات کی بے اعتنائیوں کی یہی صورت رہی تو آئندہ خدا حافظ کہنا چاہتے۔"

المشرق اپریل ۱۹۰۷ء شمارہ ۷ جلد ۲

حکیم صاحب کے اس اعلان کے بعد ستمبر تک کسی پرچہ میں ہفتہ وار کے اعلان کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہفتہ وار المشرق کا خیال چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ مئی سے لے کر ستمبر تک کسی نہ کسی پرچہ میں ضرور ہفتہ وار المشرق کا اشتہار دیتے پورے سال کے بارہ پرچوں کا تعارف کرانا تو مشکل ہے البتہ میں اس رسالہ کے چند خاص خاص مضامین اور مضمون نگاروں کا تذکرہ ضرور کروں گا۔ اس جریدے کے دوسرے شمارے میں مضمون نگاروں میں ابوالفیض عبدالعلی صاحب ایم اے، جناب شرف الدین شرف حسینی، محمد قاسم اور قاری محمد ارشد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس شمارے میں اخبارات عالم اور لوکل خبریں' میں حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ:—

"نہایت مسرت کی خبر ہے کہ پایونیر جو اس وقت نیم سرکاری اخبار کہلاتا ہے نہایت اچھے اور حوصلہ افزا خیالات میں المشرق پر ریویو کرتا ہے اور معزز اسلامی ہم عصر البشیر بھی داد دیتا ہے۔ ہم آئندہ کل اخبار و رسائل کے ریویو شائع کریں گے۔"

۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء المشرق جلد ۱ شمارہ ۱

پایونیر لکھنؤ کا مشہور انگریزی روزنامہ ہے۔ اسی طرح البشیر

اٹاوہ سے خان بہادر بشیر الدین کی ادارت میں نکلتا تھا۔

۱۹۰۶ء میں کسی اردو رسالہ پر انگریزی اخبار میں ریویو واقعی بہت تعجب خیز ہے۔ المشرق کا پہلا اور دوسرا شمارہ حکیم صاحب نے کلکتہ میں جا کر رضوان پریس کلکتہ میں چھپوایا تھا، اور ڈھاکے سے شائع کیا تھا۔ چونکہ کلکتہ جا کر پرچہ چھپوانے میں بڑی دقتیں پیش آتی تھیں اس لئے حکیم صاحب ڈھاکہ ہی میں ایک لیتھو پریس لگانے کی کوششوں میں لگ گئے حکیم صاحب کے دوست نواب سر سلیم اللہ نے ان کی اس سلسلے میں کافی مدد کی اور انہوں نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مطبع "مطبع سلیمی" کے نام سے رحمت گنج میں قائم کر دیا۔ ڈھاکے میں یہ پہلا لیتھو پریس تھا جو حکیم صاحب نے قائم کیا۔ اس چھاپہ خانہ میں انھوں نے المشرق کا تیسرا اور چوتھا مشترک شمارہ یعنی دسمبر ۱۹۰۶ء اور جنوری ۱۹۰۷ء ڈھاکے میں چھاپا، المشرق کے آخری صفحہ پر حکیم صاحب نے اپنے پریس کا اشتہار اس طرح دیا ہے

مطبع سلیمی ڈھاکہ

الحمد للہ کہ اب ڈھاکے کے [illegible] بہت بڑا الزام دفع ہوا اور اب ایک باقاعدہ لیتھو پریس جاری کر دیا گیا ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ عربی و فارسی اردو اور بنگالی [illegible] ہر قسم [illegible] نہایت باقاعدہ طور پر اور کفایت کے ساتھ ہو [illegible] جن [illegible] کو کوئی کتاب اشتہار یا رقعہ وغیرہ طبع کرانا منظور ہو [illegible] تشریف لائیں یا ایڈیٹر المشرق سے خط و کتابت کریں [illegible] مضمون نگاروں کو اضافہ ہوا [illegible] مصنف تاریخ ڈھاکا شاہ محمد اکبر اور مرزا فقیر محمد [illegible] صاحب کے نام قابل ذکر ہیں [illegible] شمارہ [illegible] ایک ادبی انجمن "انجمن اشاعت اردو" [illegible] دلچسپ انداز میں شائع ہوا [illegible] شریک تھے [illegible] آنریبل نواب سر [illegible] اللہ خان بہادر [illegible] نے فرمائی تھی۔ حکیم صاحب نے [illegible] انجمن کے قیام [illegible] بیان کیا ہے [illegible] جنوری شب، احسن منزل میں شہر اور مضافات کے شرفاء [illegible] کہ ایک انجمن کا [illegible] جس کا نام اشاعت اردو [illegible] بجے آنریبل نواب [illegible] اللہ خان بہادر [illegible] تشریف لائے جلسہ کا پروگرام چھپا ہوا [illegible] تقسیم کر دیا گیا تھا۔ قاضی ظہیر الحق بی اے نے تحریک کی کہ نواب صاحب اس جلسہ کے صدر انجمن ہوں اور مولوی غلام قدوس صاحب نے اس کی تائید کی۔ جناب پریسیڈنٹ نے اس انجمن کے اغراض و مقاصد کے متعلق ایک نہایت جامع و مدلل مختصر اسپیچ فرمائی جو اقتباساً درج ذیل ہے:-

حضرات آج جس انجمن کی بنا ڈالی جاتی ہے اور جس لئے آپ حضرات اکٹھے ہوئے ہیں یہ ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے اردو ہم لوگوں کی زبان ہے اور سب سے پہلے ہم اپنے گھر میں اردو سیکھتے ہیں۔ اردو آج سے نہیں بلکہ جب سے ڈھاکہ دار الصدر تھا اس وقت سے ڈھاکہ مشرقی بنگال میں اردو کا مادی ہے۔ گو کل شرفاء اب بھی اردو استعمال کرتے ہیں لیکن میری رائے ہے کہ بلا ایک باضابطہ انجمن کے اردو کی ایسی اشاعت نہیں ہو سکتی جس سے عام فائدہ ہو، ہم کو اردو کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ہم اس زبان سے اپنے کل برادران وطن کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پر جوش بھائیوں نے اس کی بنا ڈالی ہے خدا کرے یہ پھلے پھولے اور لوگوں کو خوش کام کرے۔

المشرق کے ایڈیٹر حکیم حبیب الرحمٰن صاحب صدر کی اجازت سے کہا کہ وہ اس انجمن کے اغراض و مقاصد کے متعلق کچھ کہنے والے تھے لیکن وقت کی قلت نے مجبور کر دیا اور علاوہ ازیں پریسیڈنٹ کی اسپیچ سے آپ حضرات پر اس کے مقاصد و اغراض روشن ہو گئے لہٰذا اس کے متعلق پھر کبھی بیان ہو گا۔

دیوان عبد العلیم صاحب نے تحریک کی اور مولوی ابو الخیرات صاحب نے تائید کی کہ اس انجمن کے وائس پریسیڈنٹ حضرات ذیل منتخب کئے جائیں۔

آنریبل خواجہ محمد اصغر، خان بہادر سید اولاد حسین۔ جناب خواجہ عبد العلیم صاحب، جناب قاضی عبد العلیم صاحب، جناب قاضی علاء الدین صاحب بی۔ اے۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے تحریک کی اور مسٹر امیر الدین ایم بی اے نے تائید کی کہ مولوی قاضی رضی الدین احمد صاحب اس انجمن کے سیکرٹری اور مولوی ابو الخیرات صاحب نے تحریک کی اور قاضی واحد بخش صاحب نے تائید کی کہ حکیم حبیب الرحمٰن احسن اس انجمن کے جوائنٹ سکریٹری ہوں پھر مسٹر امیر الدین بی، اے نے چند لوگوں کے نام ایگزیکیٹو کمیٹی کے لئے پیش کئے اور مولوی فخر الدین احمد صدیقی نے تائید کی جو بالاتفاق منظور ہوئی

وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان میں کاغذ کے کارخانے

آزادی کے وقت پاکستان میں کاغذ بنانے کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا حالانکہ مشرقی پاکستان سے ہر سال بڑی مقدار میں بانس خام مال کے طور پر کلکتہ کے نزدیک ٹیٹا گڑھ کے کارخانوں کو کاغذ بنانے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا، چنانچہ حکومت نے دیگر صنعتوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی ترقیاتی کارپوریشن کو کاغذ بنانے کے کارخانے قائم کرنے کا کام بھی سپرد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارپوریشن نے جہاں ملک میں اور بہت سارے صنعتی پروگرام بنائے، وہاں اس اہم صنعت پر بھی فوری توجہ دی اور اعلیٰ و ادنیٰ قسم کے کاغذ بنانے کی اسکیمیں حکومت کو پیش کیں۔ اس سلسلے میں اولیت بانس سے کاغذ بنانے کے کارخانے کو حاصل رہی۔

کرنافلی پیپر ملز کی اسکیم کی تیاری کا کام ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ جس کے لئے حکومت نے کاغذ کے ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ٹیکنیکل اور تعمیراتی تفصیلات کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد مشینری خریدی گئی، دریائے کرنافلی کے کنارے چندرگھونا میں کارخانہ قائم کرنا قرار پایا۔ پاکستانی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے قیام کے بعد اس کارخانے کی تکمیل اس کے سپرد کی گئی۔ کارخانے کی تعمیر اور مشینوں کو بٹھانے کا کام ۱۹۵۲ء میں تیزی سے شروع کیا گیا اور دو سال کے عرصہ میں اس اسکیم نے عملی صورت اختیار کر لی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو پہلی مرتبہ پاکستان میں کامیابی کے ساتھ کاغذ بنایا گیا۔

کاغذ بنانے کے لئے بانس بطور خام مال استعمال ہوتا ہے چٹاگانگ ہل ٹریکٹس میں عمدہ قسم کے بانس کے بڑے بڑے جنگلات پائے جاتے ہیں جنہیں آسانی سے اعلیٰ قسم کے کاغذ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، دریائے کرنافلی اور اس کی معاون ندیوں کے ذریعہ بانس کو پانی میں بہا کر کارخانے تک لایا جاتا ہے، جہاں اسے دریا سے اٹھا کر چلنے والی کرین کے ذریعہ ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور ضرورت کے مطابق مشینوں کے ذریعہ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کرنافلی پیپر ملز سالانہ ۳۰۰۰۰ ٹن لکھنے اور چھپائی کا رنگین یا سفید کاغذ تیار کر سکتا ہے۔ بانڈ، بینک، کریم لیڈ، آزر لیڈ، ڈرائنگ پیپر، پوسٹر پیپر، ریپنگ پیپر وغیرہ سب یہاں تیار کئے جاتے ہیں۔ ملک کی ضروریات اس کارخانے کی پیداوار سے پوری ہو رہی ہیں۔

ملازمین کارخانہ اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے جو انتظامات یہاں کئے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، اکثر کارکنوں کو مکان مہیا کئے گئے ہیں جو نہ صرف ہوادار ہیں بلکہ صفائی کے اعتبار سے بھی بہت اچھے ہیں۔ سینیر اور جونیر عہدیداروں کے لئے مناسب گنجائش کے خوبصورت مکانات چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بنائے گئے ہیں جہاں سے بل کھاتی ہوئی دریائے کرنافلی اور کارخانے کے نظارے بڑے دلفریب ہوتے ہیں، ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک ہائی سکنڈری اسکول بھی قائم کیا گیا ہے جس کی عمارت پر کارخانہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ملازمین کو ہر قسم کی طبی سہولتیں حاصل ہیں نئے نئے آلات سے آراستہ ایک شاندار دواخانہ تعمیر کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر اور نرسیں خدمت کے لئے مقرر کی گئی ہیں، کالونی میں ایک مارکیٹ بھی بنائی گئی ہے، جہاں خرید و فروخت کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔ ایک مسجد اور کلب گھر بنایا جا رہا ہے، مختصر یہ کہ کارخانہ اپنی افادیت اور ملازمین کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے میں بے مثال ہے۔

نیوز پرنٹ

کرنافلی پیپر ملز بننے کے بعد حکومت نے اخباری کاغذ بنانے کی طرف توجہ دی، جسے غیر ملک سے درآمد کرنے پر کافی زر مبادلہ خرچ ہوتا تھا۔ خلیج بنگال کے ساحلی علاقے پر پھیلا ہوا سندر بن جو اب تک یا تو اپنی قدرتی رعنائیوں اور دلکش مناظر کے لئے مشہور ہے یا کبھی کبھی شکار کے شوقین لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی نظر کے سامنے آیا۔ ضروری تجربات کے بعد اس جنگل میں پائی جانے والی ایک خاص قسم کی لکڑی گیوا اخباری کاغذ کے لئے موزوں ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ اس سے اخباری کا

(باقی صفحہ ... پر)

وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان میں جہاز کے کارخانے

تقسیم سے قبل عملی طور سے تمام آبی رسل و رسائل پر تین غیر ملکی کمپنیوں کی اجارہ داری تھی۔ ان تمام کمپنیوں کا صدر دفتر کلکتہ میں تھا۔ اور وہیں مرمت اور جہاز سازی کا مرکز بھی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے آبی رسل و رسائل کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ کوئی ایسا کارخانہ نہیں تھا جہاں بڑے جہازوں کی دیکھ بھال یا مرمت کی جاسکے۔

نرائن گنج میں حکومت کے پاس ایک معمولی اور انتہائی خستہ حالت میں چھوٹا سا ڈاکیارڈ تھا۔ اس میں حکومت کے اپنے لانچ اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کی مرمت ہوتی تھی۔ لیکن دوسری جہاز راں کمپنیوں کو اس کی آسانی نہیں تھی۔ کہ وہ اپنے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال بھی کرا سکیں چنانچہ زیادہ مرمت طلب جہازوں کو غیر ممالک کے شپ یارڈ میں مرمت کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مشرقی بنگال ریلوے جس کے پاس ایک بڑا بحری بیڑہ ہے وہ بھی اپنے جہازوں کو مرمت کے لئے برما اور بھارت بھیجنے پر مجبور تھی۔

غیر ممالک میں پاکستانی جہازوں کی مرمت پر نہ صرف یہ کہ کثیر زرِ مبادلہ صرف ہوتا تھا بلکہ مرمت میں کافی وقت لگتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ دریائی نقل و حمل کا کام غیر نفع بخش اور ناقابل اطمینان طور پر چلتا تھا اس کے علاوہ چونکہ ہمارے یہاں جہاز سازی کا کوئی کارخانہ نہیں تھا اس لئے پرانے جہازوں کی جگہ نئے جہازوں کا لانا بھی سخت مشکل تھا۔ انہیں زبردست مشکلات کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں اندرونی ذریعہ آمد و رفت کی ترقی میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسی بنا پر مشرقی پاکستان کی تجارتی اور صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے۔

ان تمام مشکلات پر قابو پانے کے لئے "پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن" نے جرات مندانہ قدم اٹھایا اور کھلنا میں ایک شپ یارڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت سے ضروری اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے بطور فنی مشیر کے ایک جرمن جہاز ساز کمپنی کی خدمات حاصل کیں اور اس شپ یارڈ کی تعمیر کا کام ایک دوسری بین الاقوامی شہرت یافتہ کمپنی کے سپرد کیا۔

کھلنا شپ یارڈ کی تعمیر کا کام اکتوبر ۱۹۵۴ء میں شروع ہوا ۱۹۵۷ء کے نومبر میں اس کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ ملک کے اس حصہ میں جہاز سازی کی اس صنعت کو مکمل طور پر منظم کرنے کے لئے پی آئی ڈی سی نے حکومت سے نرائن گنج کے پرانے ڈاکیارڈ کو خرید لیا۔

کھلنا شپ یارڈ کو جدید ترین مشینوں سے آراستہ کیا گیا اور اس میں سات سو ٹن تک کے جہازوں کی تعمیر و مرمت کا کام بہ آسانی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کارخانے کے پروگرام میں مال بردار جہاز، بارج، ٹگ اور ہر قسم کے موٹر لانچ تیار کرنا شامل ہے۔

کھلنا شپ یارڈ کی امتیازی خصوصیات میں یہ چیزیں شامل ہیں ایسے گھاٹوں کی تیاری جہاں جہاز کنارے سے لگ سکیں۔ مرمت کے کارخانے، جہاز سازی، ویلڈنگ، جہازوں کی جانچ پڑتال کرنے والے مرکز کا قیام، فونڈری پاور اسٹیشن، آکسیجن پلانٹ، ایسی ٹیلین پلانٹ کا قیام، ٹمبر سیزننگ پلانٹ اور ساتھ ہی ساتھ کارخانے میں کام کرنے والوں کے لئے اقامتی رہائش گاہوں کی تعمیر۔ ان کے علاوہ ایک مکمل فلوٹنگ ورکشاپ (یعنی تیرتا ہوا مرمت کا کارخانہ) بھی زیر تعمیر ہے۔ یہ تیرتا ہوا ورکشاپ جدید قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہوگا۔ اور بوقت ضرورت مشرقی پاکستان میں ہر جگہ پانی میں کھڑے ہوئے جہازوں کی مرمت کے لئے پہنچ سکے گا۔

اب یہ بھی فیصلہ ہو چکا ہے کہ تیرتے ہوئے ورکشاپ کی طرح ایک فلوٹنگ ڈاک (یعنی تیرتی ہوئی گودی) بھی تیار کی جائے جس میں تین ہزار ٹن اور تین سو فٹ تک لمبے ہر قسم کے جہازوں کی مرمت ممکن ہو سکے نرائن گنج ڈاکیارڈ اب جدید ترین مشینوں سے آراستہ ہونے کے

لہذا اس قابل ہوگیا ہے کہ اس میں ۵۰۰ ٹن تک وزن کے جہاز بنائے جاسکیں اور اس قسم کے جہازوں کی مرمت بھی کی جاسکے۔ اس کارخانے میں بجز ٹمبر سیزننگ پلانٹ آکسیجن، ایسی ٹیلین پلانٹ اور لوہے کی ڈھلائی کے اور وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو کھلنا شپ یارڈ میں ہیں۔

اگرچہ نرائن گنج ڈاکیارڈ کا سب سے بڑا کام حکومت اور ریلوے کے بحری بیڑوں کی مرمت کرنا ہے یہ کارخانہ جہاز سازی کے کام میں بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔

جہاں تک مرمت کا تعلق ہے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں جوائنٹ اسٹیمر کمپنیوں کے بے شمار جہازوں کے علاوہ تین سو ڈیزل سے چلنے والے جہاز اور تقریباً چھ سو فلیٹ بارجز وغیرہ موجود ہیں جو پبلک اور پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت ہیں، ریلوے کے پاس ایک بڑا بحری بیڑہ موجود ہے، جس میں ٹگ بارجز، لانچز، فلیٹ اور مسافر بردار جہاز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ حکومت مشرقی پاکستان کے پاس بڑی تعداد میں لانچز، ہاؤس بوٹ، پیٹرول بوٹ اور موٹر بوٹ وغیرہ موجود ہیں، پھر چاٹگام اور چالنا کے بندرگاہوں کے پاس ان کے اپنے جہاز موجود ہیں، چاٹگام کے بندرگاہ کے پاس ایک چھوٹا سا "بوٹ سلپ" موجود ہے مگر چالنا کے بندرگاہ کو جہازوں کی مرمت کی یہ آسانیاں بھی حاصل نہیں۔

حالات کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جہازوں کی مرمت کا کام اس قدر زیادہ ہے کہ کھلنا اور نرائن گنج کے کارخانوں کو کئی سال تک صرف اسی کام میں مصروف رہنا پڑے گا۔

ان جہاز سازی کے کارخانوں کے قیام سے ملک کو جو فائدے حاصل ہو رہے ہیں یا ہوں گے انہیں تفصیل سے گنوانا مشکل ہے البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اب مشرقی پاکستان کے آبی آمد و رفت کے ذریعہ میں غیر معمولی ترقی اور تیز رفتاری پیدا ہو جائے گی اور یہاں کی حالت دن بدن سدھرتی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری غیر ملکی مرمت کے کارخانوں کی محتاجی ختم ہو جائے گی جس سے زرمبادلہ کی ایک کثیر رقم بچ جائے گی۔

اس کے علاوہ ہمارے آبی وسائل آمد و رفت میں ہمہ گیر توسیع و ترقی ایک نفع بخش اور قابل عمل چیز بن چکی ہے اس نئی صنعت کی دفاعی اہمیت کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہاں جغرافیائی حالات کے پیش نظر ہماری فوج مجبور ہے کہ بحری راستوں پر زیادہ سے زیادہ تکیہ کرے لہذا مشرقی پاکستان کے آبی وسائل آمد و رفت میں جو بھی ترقی ہے یا ہوگی اس سے ہماری فوج کو بھی اسی رفتار سے نقل و حرکت میں مدد ملے گی۔

بحری بیڑے کی ترقی سے کسٹم کے افسران کو بھی بھارت اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اسمگلنگ کی روک تھام میں مدد ملے گی۔ پچھلے دنوں سرحد پار بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کا جو سلسلہ تھا اس سے پاکستان کو شدید نقصانات پہنچے ان کی تلافی بڑی حد تک اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔

جہاز سازی کی صنعت کے قیام سے ایک براہ راست فائدہ یہ ہوگا کہ دوسری مصنوعات کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ مثلاً رسّی بنانے کا کام، نٹ بولٹ اور دوسری بہت سی چیزیں تیار کرنے والوں کو اپنے مال کی کھپت میں آسانی ہوگی۔ ان سے اگر ایک طرف پی۔ آئی۔ ڈی سی کے جہاز سازی کے کارخانے کی ضروریات پوری ہونگی تو دوسری طرف ملک کے عام لوگوں کو بھی سہولتیں میسر ہونگی۔

اب مچھلیاں پکڑنے والے جہاز خود پاکستان ہی میں تیار ہوئے ہیں اس سے ملک کی ماہی گیری میں غیر معمولی ترقی ہوگی اور ہم اس قابل ہو رہے ہیں کہ غیر ممالک کو مچھلیاں برآمد کر سکیں۔

بڑے جہازوں کی تیاری کے ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی کشتیوں اور ڈینگیوں کے بھی نئے نئے نمونے سامنے آئینگے اور اس میں بھی خاصی ترقی ہوگی۔

جہاز سازی کی صنعت ہمارے ملک میں ابھی ابتدائی دور سے گزر رہی ہے۔ جہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ٹیکنیکل اسٹاف اور تربیت یافتہ کاریگروں اور مزدوروں کی کمی کے علاوہ ہمارے یہاں چھوٹی چھوٹی معاون صنعتیں نہ ہونے کی وجہ سے بعض مرتبہ ایک چھوٹا سا پرزہ کراچی یا لندن سے منگانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ہم تمام مشکلات پر قابو پالیں گے۔

وحید قیصر ندوی

راجشاہی کی گھریلو مصنوعات

راجشاہی کی گھریلو صنعتوں میں سب سے مشہور ریشمی کپڑے کی صنعت ہے۔ تقسیم ہند کے قبل لوگ مرشد آباد کی سلک کی شہرت سے واقف تھے لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اسی قسم کا ریشمی کپڑا راجشاہی کے ضلع میں بھی تیار ہوتا ہے، راجشاہی کے بنائے ہوئے ریشمی کپڑے سے بہترین قسم کی ساڑیاں، قمیص، لنگی، بنتی ہے اور معقول قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، ریشم کی صنعت کا سب سے بڑا مرکز نواب گنج محلے میں واقع ہے، شیب گنج، ہری نگر، بھولاہاٹ کے تھانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بھولاہاٹ میں ریشم کے کیڑوں کے لئے شہتوت کی کاشت کی جاتی ہے حکومت نے بھی راجشاہی شہر سے کوئی دس میل دور کے فاصلے پر میر گنج میں ریشم کے کیڑوں کی نشو ونما کے لئے ایک فارم کھول رکھا ہے یہاں سے ریشم کے کاریگر ریشم کے کیڑوں کے خول جنہیں انگریزی میں COCOON کہتے ہیں خرید کر لے جاتے ہیں اور پھر اس سے ریشم کا دھاگہ تیار کرتے ہیں حکومت نے راجشاہی شہر میں ایک Silk Emporium کھول رکھا ہے جہاں ریشمی کپڑے ہاتھ کے چرخوں سے بُنے جاتے ہیں اور یہیں سے فروخت ہوتے ہیں یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ راجشاہی میں آج کل بہترین قسم کا بنارسی وضع کا ریشم کا کام ہوتا ہے اس کے کاریگر وہ لوگ ہیں جنہوں نے تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے

راجشاہی کی دوسری قابل ذکر صنعت پیتل کی چیزوں کی ساخت ہے، نواب گنج اور نوڑے محلوں میں یہ کام اچھا ہوتا ہے۔ پیتل کی مختلف اشیاء بڑی خوبصورت بنتی ہیں لیکن جائے افسوس ہے کہ پیتل دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ صنعت اب مفقود ہوتی جا رہی ہے۔

مٹی کے برتن بنانے کا کام بھی راجشاہی میں بہت اچھا ہوتا ہے روزمرہ کے استعمال کے لئے جو برتن بنتے ہیں ان کے علاوہ ایسے برتن بھی بنتے ہیں جو صنعتی اعتبار سے بہت اعلیٰ ہوتے ہیں اور DRAWING ROOM کی تزئین کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں، صراحی، گھڑا، مٹکا وغیرہ نہایت حسین بنتے ہیں، ان پر کمہار طرح طرح کے نقش و نگار کے ذریعہ اپنی کاریگری کا کمال دکھاتے ہیں۔ مٹی کے کھلونے بھی بڑے اچھے بنتے ہیں، میلوں میں ان کی بہت مانگ ہوتی ہے۔

راجشاہی میں چٹائیاں بھی بڑی عمدہ تیار ہوتی ہیں۔ چٹائیوں کے لئے نوگاؤں خاص طور پر مشہور ہے۔ نوگاؤں، رانی نگر اور راترائی اور تھلنا اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، چٹائی کے بنانے میں رسی اور ایک خاص قسم کی گھاس جسے چاٹی کہتے ہیں استعمال کی جاتی ہے یہ گھاس ان علاقوں کے دلدلی خطوں میں بافراط پائی جاتی ہے۔ چاٹی گھاس کو پہلے سکھا لیتے ہیں اس گھاس سے چٹائی کے علاوہ برتن اور دوسرے ظروف بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

راجشاہی میں پٹ سن سے بھی بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں جیسے جانماز وغیرہ بہت اچھے بنتے ہیں یہ کام سکھانے کے لئے حکومت کی طرف سے اسکول بھی کھلے ہوئے ہیں۔

پٹ سن کے علاوہ راجشاہی میں بید کی چیزوں کا بھی اچھا کام ہوتا ہے، بید کے فرنیچر، ٹوکریاں اور اس قسم کی اور چیزیں بڑی نفیس بنتی ہیں، بید راجشاہی کے جنگلات میں بافراط پائی جاتی ہے۔ گرچہ یہاں کی بنی ہوئی بید کی چیزیں سلہٹ کی چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، لیکن پھر بھی ان میں ایک خاص نفاست ہوتی ہے۔

راجشاہی کی گھریلو صنعتوں کی تفصیل بغیر یہاں کے لحاف اور گدڑیوں کے کام کا ذکر کئے نامکمل رہ جاتی ہے گرچہ اس کام کو صنعت مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس لئے قابل ذکر ہے کہ ان گدڑیوں کے بنائے ہوئے لحاف کا استعمال امیر و غریب دونوں کرتے ہیں اور بازاری کمبلوں کے محتاج نہیں ہیں۔ ان لحافوں کو کانتھا اور سوزنی کہتے ہیں انکے بنانے میں عورتیں بڑی جانفشانی سے کام لیتی ہیں اور اس کوشش میں رہتی ہیں کہ ان کی بنائی ہوئی چیز سب سے بڑھ چڑھ کر رہے۔

وحید قیصر ندوی

سلہٹ کی مشہور گھریلو صنعت

مشرقی پاکستان کے تمام ضلعوں میں بید کے کچھ نہ کچھ سامان گھریلو صنعت کی شکل میں تیار ہوتے ہیں۔ سلہٹ، چاٹگام، چاٹگام کے پہاڑی علاقے، کوملا، پبنا، رنگ پور، میمن سنگھ، راجشاہی وغیرہ کے ضلعوں میں یہ صنعت عام ہے۔ کاکس بازار اور رانگامانی میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ مگر مشرقی پاکستان کا کوئی ضلع بید کی مصنوعات میں سلہٹ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

سلہٹ میں بید کثرت سے پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ پڑوس کے ضلع کا چھار کی بیدوں کی درآمد بھی سلہٹ میں کافی ہوتی ہے اسی لئے یہاں کے ہزاروں افراد اسی گھریلو صنعت سے وابستہ ہیں۔ سلہٹ میں اگرچہ بید کافی پیدا ہوتی ہے مگر اس کو پکانے اور بہتر بنانے کا اب تک معقول انتظام نہیں یہی وجہ ہے کہ ملایا اور کاچھار کی بید سے بنی ہوئی چیزوں کی قیمت نسبتاً سلہٹ کے سامان سے زیادہ ہوتی ہے۔

مشرقی پاکستان میں بید کا کام سب سے زیادہ سلہٹ میں ہوتا ہے۔ اس کام نے جتنی مقبولیت اور جتنی شہرت سلہٹ میں حاصل کی ہے کسی اور جگہ اسے نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں کے کاریگر بہت محنتی ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد تو انہوں نے دور دور اپنی شاخیں کھول دی ہیں۔ اور بید کا سامان بیچ کر کافی روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔ ڈھاکہ اور چاٹگام کے علاوہ کراچی تک ان کا مال جاتا ہے اور کافی قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ ان کاریگروں کے بچے بھی اس کام میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اور کاموں سے جب فرصت مل جاتی ہے تو گھر کے سارے مرد، عورتیں، بچے اور بچیاں بید کا کام کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح کنبہ کا ہر چھوٹا بڑا اس کام میں ہاتھ بٹاتا ہے اور اس ملی جلی محنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے طرح طرح کی چیزیں تیار ہو جاتی ہیں۔ جس مستعدی اور تیزی سے بید کی بہترین چیزیں عورتیں اور بچے تیار کرتے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہے جو میزیں کرسیاں اور دوسرے قسم کے فرنیچر کی چیزیں ان کے ہاتھوں تیار ہوتی ہیں وہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے گھروں کی زینت بن سکتی ہیں۔ گول کمروں کے سیٹ چائے، چائے کی میزیں، تاش کھیلنے کی میزیں، دعوتوں اور گارڈن پارٹی کے سامان، کرسیاں، دستی بیگ، پھل اور پھول کی ٹوکریاں، بچوں کے ہنڈولے اور جھولے، سلائی کے صندوقچے، ہوائی سفر کے سامان، ناشتہ دان، شربت دان، غرض کہ تمام ضروری سامان سلہٹ میں بید سے بنایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کے بنانے میں "موتی" اور "رولو" دو قسم کے بانسوں سے مدد لی جاتی ہے ان بانسوں کے پائے، پشتے اور سیٹوں کے فریم بنائے جاتے ہیں اور باقی تمام کام بید کا ہوتا ہے۔ یہ خاص قسم کے بانس بھی سلہٹ کے جنگلوں میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ موٹی بیدوں کا سامان سستے داموں بکتا ہے اور مہین اور باریک بید کی چیزوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ نقش ونگار اور پھول پتے بنے ہوئے سامان کی قیمت تو اور زیادہ ہوتی ہے۔

ایک اور خوبصورت اور کارآمد چیز بید سے بنتی ہے جو سلہٹ کی گھریلو صنعتوں میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ سلہٹ کی چٹائیاں جنہیں سیتل پاٹی کہتے ہیں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں لوگ بڑے بڑے دولتمند اپنے بچھونوں پر بچھا کر آرام پاتے ہیں۔ یہ چٹائیاں دبیز اور موٹی بھی بنتی ہیں اور نہایت مہین اور چکنی بھی۔ بعضوں میں تو بہترین نقش ونگار، تاج محل کے نقشے مشہور عمارتوں کی تصویریں اور مشہور آدمیوں کے مقولے تک کاڑھے ہوئے ہوتے ہیں یہ بھی بید کی گھریلو صنعت کا ایک حصہ ہے۔ سیتل پاٹی کے لئے جو بید استعمال ہوتی ہے وہ فرنیچر کی بید سے عمدہ ہوتی ہے اس بید کو عام زبان میں مورتا کہتے ہیں۔ مورتا زیادہ تر نشیب اور مرطوب زمینوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مٹی کے برتنوں کی صنعت

(۱)

[illegible] مشہور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ [illegible] بنگال [illegible] [illegible] [illegible] ایک خاص قسم کی [illegible] [illegible] جاتی ہیں [illegible] تجارت سے [illegible] [illegible] اس شہر میں کمہاروں کی ایک جماعت [illegible] سے آکر یہاں بس [illegible] یہ لوگ حقہ کی چلم بنانے میں خاص شہرت [illegible] [illegible] جو ترین مٹی سے بنتی [illegible] یہ لوگ [illegible] بازار کے پچھم جانب بستے ہیں۔ شہر کے [illegible] بازار اور اس کے قریب قریب مٹی کے برتنوں کی [illegible] جگہیں [illegible] [illegible] پتیلے، [illegible] اور [illegible] [illegible] رنگ کی ہوتی ہے اس کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بنائے جاتے ہیں۔ پھر اسے [illegible] کے [illegible] [illegible] کے [illegible] کی طرح [illegible] [illegible] [illegible] کی حفاظت [illegible] کرتی ہے [illegible] یہ تقریباً دو برس چلتی ہے کڑھائی جتنی پرانی ہوتی [illegible] مضبوط اور [illegible] ہوتا ہے کیونکہ تیل [illegible] [illegible] چاول، دال، سالن، دوپیازہ، بھاجی وغیرہ چیزیں اس [illegible] بہت اچھی پکتی ہیں۔ پلاؤ، قورمہ کے قسم کے کھانے [illegible] [illegible] چیزیں مثلاً بالائی، کھویا وغیرہ اس میں بہت اچھی تیار [illegible] [illegible] [illegible] کے بنے ہوئے پتیلے کی پہچان یہ ہے کہ اس کی اندر کی [illegible] چمکدار اور چکنی ہوتی ہے۔ عام طور سے یہ ہے کہ مٹی کے برتنوں اور

لکڑی کے [illegible] سے پکے ہوئے کھانے [illegible] [illegible] [illegible] اور صحت بخش ہیں۔

[illegible] کے دکھن جانب نواب گنج [illegible] [illegible] [illegible] پٹکیاں اور گملے وغیرہ بنتے ہیں جو ہمارے روزمرہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تک تیل سمجھا جاتا ہے۔

نواب گنج [illegible] بڑے گملے اور [illegible] [illegible] ہمارے روزمرہ کام کی چیزیں [illegible] یہاں کی زبان [illegible] [illegible] کے زمانے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] قسم [illegible] سوا [illegible] آس پاس کے گاؤں [illegible] [illegible] [illegible] بہت سے کام [illegible] ایک قسم [illegible] [illegible] یہ چھوٹے بڑے (SIZE) ناپ کے ہوتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] گاؤں کے لوگ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بہت مضبوط [illegible] [illegible] [illegible] کثرت سے استعمال [illegible] [illegible] بغیر کسی [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کے برتن [illegible] [illegible] کے ہر [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] استعمال کے تمام [illegible] [illegible] وغیرہ [illegible] [illegible] [illegible] کمہاروں [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] کی [illegible] وغیرہ [illegible] [illegible] یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری [illegible] [illegible] [illegible] بنانے کے لئے بھی بہت مشہور [illegible] اور [illegible] یہاں کے آرٹسٹ بہت کمال رکھتے ہیں۔

وحید قیصر ندوی

سونے چاندی کا کام

سونے چاندی کے کام کے سلسلے میں ڈھاکا ہمیشہ سے مشہور رہا ہے مغلوں کے دور میں سونے چاندی کے زیورات اور نقاشی کی صنعت میں ڈھاکے کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ مغل حکمرانوں نے سناروں کی بڑی سرپرستی کی مسلمان اور ہندو دونوں قوموں نے سونے چاندی کے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کی۔ مسلمان اور ہندو سناروں میں آپس میں کاریگری اور فنکاری کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔

ہندوستانی اپنے کام میں بڑے ہوشیار تھے اور سال میں دو بار جنم اشٹمی کے موقع پر اپنے فن کی چلتی پھرتی نمائش کیا کرتے تھے۔ یہ نمائش کا خاص موقع ہوتا تھا جس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے نمائش میں آنے والوں کے لئے خاص اسٹیمر اور ریلیں چلتی تھیں۔ لاکھوں آدمی [illegible] کشتیوں اور گاڑیوں کے ذریعے نمائش دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ہندو سناروں کی اس نمائش سے بڑا فائدہ ہوتا [illegible] پر صرف [illegible] نہیں کرسکتے تھے۔ [illegible] خاص خاص چیزوں کو خرید کرلے جاتے تھے۔

[illegible] سناروں کے فن کا نمونہ [illegible] کی تشریح اور [illegible] اب بھی [illegible] سونے چاندی کے [illegible] پر نقش و نگار کے ساتھ [illegible] کی عبارتیں اور تصویریں خط [illegible] میں کھینچے ہوئے ہیں۔ یہ خاص ڈھاکے کے [illegible] سناروں کی [illegible] ہے۔ اسلامی سلطنت میں ڈھاکے میں [illegible] کلابتو اور بادلے کا کام بھی بہت آگے بڑھ گیا تھا اور [illegible] کارخانے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے اور یہ سارا کام مسلمان سنار کرتے تھے۔ [illegible] کلابتو کے کام میں یہ کاریگر اتنی نزاکت دکھاتے تھے کہ ململ جیسے مہین کپڑے کا ایک دھاگا سوت کا اور ایک دھاگا [illegible] کے تار کا ملا کر پورا تھان تیار کرتے تھے۔ یہ پورا تھان جو بیس گز کا ہوتا تھا اس میں سے جو بادشاہوں کے لئے بطور پیشکش بھیجا جاتا تھا اس کا وزن تقریباً دو پونڈ ہوتا تھا خیال تو کیجئے کہ کتنی نزاکت اور [illegible] سے بنا ہوتا تھا۔ اس کام کی بگڑی ہوئی شکل آج کل کا ٹشو کلاتھ (TISSUE CLOTH) ہے۔ ڈھاکے کی [illegible] زردوزی [illegible]

ایک [illegible] ڈھاکے کی [illegible] تھان جس پر سونے کا کام ہوتا تھا اور ہیرے جڑے ہوئے تھے اور گلدوزی [illegible] جانتے تھے اور یہ تو ذرا سبھی کو معلوم ہے کہ ۱۸۴۲ء میں ملکہ وکٹوریہ کے لئے زردوزی کے بنے ہوئے کپڑے ڈھاکے سے بھیجے گئے تھے۔ ڈھاکے کے سناروں میں خاص بات یہ ہے کہ وہ [illegible] چاندی اور سونے سے ایسے زیور بنا دیتے ہیں کہ یقین نہیں [illegible] سونے یا چاندی سے بنائے گئے ہیں۔ یہ بات صرف یہیں کے کاریگروں پر ختم ہے۔ FILIGREE WORKS یعنی تار کا کام جو کٹک کے نام سے مشہور ہے [illegible] سے شروع ہوا ہے۔ کٹک کے کاریگروں [illegible] کے نام سے مشہور ہو گیا لیکن آج بھی کٹک [illegible] میں یہاں کے کاریگروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے [illegible] گلاب پاش اور پان کی کشتیاں وغیرہ اب بھی [illegible]

ذیل کے ایک تاریخی واقعے سے ڈھاکے [illegible] کاریگری کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایران کے شہنشاہ مظفر الدین شاہ قاچار نے نواب [illegible] ایک خط لکھا کہ ڈھاکے [illegible] دالان [illegible] نواب صاحب نے خاص سنار کو [illegible] دیا کہ وہ [illegible] دالان [illegible] ایک ماڈل تیار کرے۔ یہ ماڈل جب شہنشاہ کی خدمت میں [illegible] اور چینی [illegible] پر فارسی میں تعریفی اشعار بھی لکھے تھے نواب بہادر کو تحفے کے طور پر بھیجے [illegible] دالان اور


RELAX ON MASTERPILLO
LATEX FOAM RUBBER MATTRESSES, PILLOWS AND CUSHIONS
The last word in sheer COMFORT
Light and cool because it is POROUS
ECONOMICAL will last for many years
HYGIENIC Damp proof Moth proof
MASTER RUBBER & TYRE CO. LTD.
KARACHI · LAHORE · RAWALPINDI · DACCA · CHITTAGONG
SPOTLIT



وحید قیصر ندوی

چٹائی کی صنعت

چٹائی بافی مشرقی پاکستان کی ایک نہایت ہی اہم صنعت ہے۔ یہاں کے تقریباً ہر ضلع میں اس کا رواج ہے۔ اس صنعت کا زیادہ رواج سلہٹ، چاٹگام اور کھلنا میں ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے اور دوسرے اضلاع میں بھی کافی تعداد میں چٹائیاں بنتی ہیں۔ ڈھاکہ میں بھی چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ کھجور کے پتوں اور ہوگلے پتوں کی ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں کی چٹائیاں زیادہ مشہور نہیں۔

سلہٹ چٹائیوں کے لئے بہت مشہور ہے۔ یہاں چٹائیاں اس طرح بنتی ہیں کہ بید سے ٹوکریاں، کرسیاں اور سوٹ کیس بناتے وقت چھال الگ کر لیتے ہیں۔ پھر اسی پتیاں کو نیم کر کے اس سے چٹائیاں بنتے ہیں۔ یہ چٹائیاں مضبوط اور بہت عمدہ قسم کی ہوتی ہیں۔ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سالانہ لاکھوں کی تعداد میں چٹائیاں بنتی ہیں اور ہزاروں لوگ اس پیشے سے روزی کماتے ہیں۔ کسی زمانے میں لسٹ میں ہاتھی دانت کی بھی چٹائی بنتی تھی۔ صدر سب ڈویژن کے پانچ تھانہ کے علاقہ میں بھی ایسی چٹائیاں بنتی تھیں۔ اب تک امیروں کے گھروں میں ہاتھی دانت کی چٹائیاں پائی جاتی ہیں۔ مقامی لوگوں سے معلوم ہوا کہ ایسی چٹائیاں بننے والوں کی نسل کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔

فریدپور میں بھی چٹائیاں بنی جاتی ہیں۔ یہاں چٹائیاں سیتل پاٹی کے نام سے مشہور ہیں، یہ اگرچہ بہت اچھی قسم کی تو نہیں ہوتیں پھر بھی روزانہ اور مقامی استعمال کے لئے خوب ہیں۔ یہاں چٹائی بننے کا پیشہ ترقی نہیں کر رہا ہے۔ اگر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو اس چیز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

پبنہ بھی چٹائی بافی کی صنعت میں بہت مشہور ہے یہاں بید کی چھال سے بھی چٹائیاں بنتی ہیں اور ایک قسم کا پودا ہوتا ہے جسے یہاں موتھک (MORTAK) کہتے ہیں اس سے بھی چٹائیاں بنتی ہیں یہاں چٹائیاں کثرت سے بنی جاتی ہیں۔ بہت لوگوں کے روزگار کا یہی ذریعہ ہے۔ یہاں کی عورتوں کا بھی مشغلہ یہی ہے۔ روزانہ گھریلو کاموں سے چھٹی پا کر اس کام میں لگ جاتی ہیں اور دو تین دنوں میں باقاعدہ ایک چٹائی تیار کر لیتی ہیں۔ یہاں بانس کی بھی چٹائی بنتی ہے جسے کھلپا کہتے ہیں، یہ لاکھوں کی تعداد میں بنتی ہیں اسے اس طرح بناتے ہیں کہ بانس کے چھلکے کو الگ کر لیا اور پھر اس چھیل سے پٹیاں، ٹوکریاں بنائیں اب جو بیچ کا حصہ رہ گیا اس سے ایک انچ چوڑی تیلیاں تراش لیں، پھر ان سے نہایت عمدہ کھلپے تیار کر لیتے ہیں۔ کھلپے بہت طرح سے مصرف میں آتے ہیں ٹٹیاں ان سے بنائی جاتی ہیں، صحن پر کبھی وہ بچھائی جاتی ہیں اور پھر کچے مکانوں کی چھت میں بھی لگائے جاتے ہیں۔

بوگرا میں آدم دگھی ایک علاقہ ہے وہاں چٹائیاں اچھی قسم کی اور بہت زیادہ تعداد میں بنتی ہیں۔ اس صنعت میں وہاں کے کاریگر لگے ہوئے ہیں یہ چٹائیاں بہت کام میں آتی ہیں۔

راجشاہی میں بھی چٹائیاں بنتی ہیں۔ یہاں چٹائیاں زیادہ تر ہوگلے پتوں اور کھجور کے پتوں سے بنتی ہیں۔ یہ مقامی استعمال کے لئے کافی ہیں۔

جیسور کے ماگورا سب ڈویژن میں چٹائیاں خاص تعداد میں بنتی ہیں۔ یہاں ایک قسم کا پودا ہوتا ہے جسے نلمٹ کہتے ہیں، اسی سے چٹائیاں تیار ہوتی ہیں۔

چاٹگام چٹائی بننے کے فن میں اوّل درجہ رکھتا ہے۔ یہاں کی چٹائیاں بہت مشہور اور خوبصورت ہوتی ہیں سالانہ لاکھوں چٹائیاں بنتی ہیں اور ہزاروں لوگ اسی سے روزی کماتے ہیں۔ یہاں موتھک پودے سے تو چٹائیاں بنتی ہی ہیں مگر اب دوسرے قسم کے پودے سے بھی بنتی ہیں۔ اس پودے کو پیترا (PAITRA) کہتے ہیں۔ مرطوب

سید وحید قیصر ندوی

پٹ سن کی گھریلو مصنوعات

مشرقی پاکستان کے جس گاؤں میں بھی آپ جائیں تالابوں کے کنارے آپ کو پاٹ دھونے اور صاف کرنے کی خاص آوازیں سنائی دیں گی۔ یہ آوازیں جو سارے صوبے میں گونجتی رہتی ہیں۔ غریب کھیتی باڑی کرنے والوں کی محنت آرزوؤں اور امیدوں کی تاریخ آپ کو سناتی ہیں۔ ایک سال کی لگاتار محنت کے بعد پاٹ کی فصل تیار ہوتی ہے جس کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان کے کارخانوں میں چلا جاتا ہے، یا باہر کے ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تھوڑا بہت پاٹ مقامی دستکاروں کے کام آتا ہے جس سے وہ ایسی سبک، نازک اور خوبصورت چیزیں تیار کرتے ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی مشرقی پاکستان میں کتنے بڑے بڑے کاریگر اور ہنرمند پڑے ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ مشینوں کا زمانہ ضرور ہے مگر مشینوں اور پاٹ کی ملوں سے ہٹ کر ایک نظر صوبے کے دیہاتوں پر ڈالیے یہاں آپ کو پاٹ نہ ملے گا مگر مشین اور ملیں نظر نہیں آئیں گی ان کی جگہ پاٹ کی گھریلو صنعتیں آپ کو ملیں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ کسان دن بھر کھیتوں میں کام کرنے کے بعد اپنے گھروں میں آکر چرخے سے پاٹ کا دھاگا بناتے ہیں، پھر اس دھاگے سے رسیاں بنائی جاتی ہیں جو جانور باندھنے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ کچھ ضرورت سے زیادہ رسیاں بازاروں میں بیچی جاتی ہیں جہاں وہ کسی نہ کسی طرح بک جاتی ہیں۔

ہمارے صوبہ میں نرائن گنج سب ڈویژن منگائیل کے کولانہ سرائیں اور منشی گنج سب ڈویژن کے کسپالی قبیلے پاٹ کے بورے بناتے ہیں۔ یہ لوگ ہاتھ ہی سے دھاگے بننے اور بورے تیار کرتے ہیں۔ مانک گنج کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں بھی پاٹ کے بورے بنائے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ ضلع کے باہر میمن سنگھ وغیرہ کے اکثر دیہاتوں میں پاٹ کی گھریلو صنعتیں عام ہیں۔ یہاں پاٹ کی رسی بہت تیار ہوتی ہے ناریل کی رسیاں آنے کے بعد سے اس کی مانگ کم ضرور ہوگئی ہے لیکن اب بھی میگھنا کے کنارے مثلاً سعادت پور، کھالا باڑا وغیرہ میں کشتیاں چلانے کے لئے یہی رسی استعمال ہوتی ہے۔

ٹنگائل سب ڈویژن میں ان رسیوں سے پاٹ بیلنے کا کام لیا جاتا ہے۔ دو آدمی ایک دن میں آسانی سے ۲۰۰ گز رسی بنا لیتے ہیں اور یہ لوگ رسیاں بنا کر کافی پیسہ کما لیتے ہیں۔ چھوٹے بچے بھی اس کام میں بڑوں کا ہاتھ بٹا کر کچھ نہ کچھ کما لیتے ہیں گوپال گنج اور مدار ی پور سب ڈویژن میں بھی پاٹ کی رسی اور دوسری چیزیں بہت تیار ہوتی ہیں۔ چاٹگام کے علاقے میں اکبر آباد میں چند خاندان پاٹ کا باریک دھاگہ بناتے ہیں۔ عورتیں بھی یہ کام کر لیتی ہیں۔ ایسا ہر خاندان ۲۰۰ سے ۲۵۰ روپئے تک ماہانہ کما لیتا ہے۔ زمین میں بانس کی کھونٹیاں گاڑ کر چرخے کی مدد سے یہ دھاگہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دھاگہ جہازوں وغیرہ میں بہت استعمال ہوتا ہے۔

تپرا ضلع کے کسپالی بھی پاٹ کی مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں نواکھالی میں پاٹ کے بورے بنائے جاتے ہیں۔ شمالی بنگال میں دیناج پور ضلع کی اکثر عورتیں پاٹ کا کپڑا بناتی ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے کرگھے پر جسے سنی پوری کرگھا کہتے ہیں، تیار ہوتا ہے۔ یہ کپڑا پوجا گنج، الوا، اور لہری ہاٹ کے بازاروں میں بہت بکتا ہے۔ دیناج پور میں پاٹ کے بوروں کا بیوپار بھی لاکھوں روپے کا ہوتا ہے۔ پہلے یہ سب چیزیں کلکتے بھیج دی جاتی تھیں۔ دیناج پور کے اکثر دیہاتوں میں پاٹ کا باریک دھاگہ بھی تیار ہوتا ہے جس سے نفیس کپڑا بنا جاتا ہے۔ یہ کپڑا آرام کرسیوں اور صوفوں وغیرہ میں

(بقیہ صفحہ ۳۱۳ پر)

کام آتا ہے۔ باہر بھی اس کی مانگ ہے۔ رنگپور ضلع اور خاص طور پر لفا ماری سب ڈویزن میں معمولی مشینوں سے پاٹ کا کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ یہ مشین بہت ہلکے پھلکے اور سادہ قسم کے ہوتے ہیں، یہ کپڑا فرش اور پیکنگ وغیرہ کے کام آتا ہے۔ پورا گاری اور شاقھی باری وغیرہ بازاروں میں ہزاروں روپے کا بیوپار اس کپڑے کا ہوتا ہے۔ بوگرہ، پبنا اور راجشاہی کے دیہاتوں میں بھی پاٹ کا دھاگہ، رسیاں اور کپڑے وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ گو کہ اب تک پاٹ کی ملیں نہیں بنیں مگر کاشتکاروں اور دیہی کاریگروں کی بدولت اس کی گھریلو صنعتیں بہت آگے بڑھ چکی ہیں۔ پاٹ کی ہاتھ سے بنی ہوئی چیزیں مضبوط اور پائدار ضرور ہوتی ہیں مگر دام میں یہ مشین سے بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ان گھریلو صنعتوں کو گھاٹا رہا۔ پاٹ اگانے والوں اور کاریگروں، دیانت دار آڑھت داروں اور مہاجنوں کے نہ ملنے، سرمائے، کرگھوں اور دوسرے سامان کی کمی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھانا پڑا مگر ہمارے کاشتکار اور کاریگر برابر اس کاروبار کو چلا رہے ہیں۔

کاغذ کے کارخانے (بسلسلہ صفحہ ۵۵)

تیار کرنے کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ اندازہ کے مطابق ۱۵۰۰۰۰ ایکڑ کے علاقے میں پھیلے ہوئے سندربن کا تہائی حصہ سندری کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ خام مال کی فراوانی اور دوسری ضروری سہولتوں کی وجہ سے کاغذ کے ایک دوسرے کارخانے کی بنیاد دکھلنا میں ڈالی گئی۔ کارخانے میں سالانہ ۳۸۵۰۰ ٹن اخباری کاغذ سستے چھپائی کے کاغذ بنانے کی گنجائش رکھی گئی ہے ۱۹۵۶ء میں اس کارخانے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ نئی نئی مشینوں سے لیس اس کارخانے نے باقاعدہ بنیادوں پر اگست ۱۹۵۹ء میں اخباری کاغذ کی پہلی کھیپ نکالی اور دسمبر ۱۹۵۹ء میں سستا چھپائی کا کاغذ بھی بغرض کاروبار تیار ہونے لگا، اس طرح دونوں پیپر مشین اوسطاً ۸۵ ٹن سے زائد روزانہ کاغذ تیار کر رہی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب یہاں ۱۱۰-۱۱۵ ٹن کاغذ روزانہ تیار ہونے لگے گا۔

کارخانہ میں اخباری کاغذ بنانے کی ایک سو چھیالیس انچ چوڑی دو پیپر مشین لگائی گئی ہیں۔ ان مشینوں سے علی الترتیب ۳۰۰، ۲۵ اور ۲۰۰، ۱۴ ٹن اخباری کاغذ اور سستا چھپائی کا کاغذ تیار کیا جا سکتا ہے۔ بنے ہوئے کاغذ کے بڑے بڑے ریل (REEL) مشینوں کے ذریعہ کاٹ کر چھوٹی ریلوں میں تبدیل کئے جاتے ہیں۔ جن میں بڑی مقدار کو کاٹ کر تختوں (SHEETS) کی شکل میں بدل دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تختوں کی شکل میں کاغذ کی مانگ بہ نسبت ریلوں کے بہت زیادہ ہے ان اقسام کے دونوں کاغذ کی تیاری اتنی ہوگی جو پاکستان کی ضروریات کو بھی پورا کر کے بھی برآمد کی جا سکے گی۔ کارخانے نے پہلی دفعہ یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو سو ٹن اخباری کاغذ سنگاپور روانہ کیا ہے۔ برآمد کو مزید بڑھانے کی مختلف تجویزوں پر غور ہو رہا ہے ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ اس کارخانے کا تیار کیا ہوا اخباری کاغذ دوسرے ملک میں بنے ہوئے اخباری کاغذ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

پاکستانی کاغذ کی ساخت اور عمدگی غیر ممالک میں تیار ہونے والے کاغذ کے مقابلہ میں کمتر بتائی جاتی ہے۔ اس کی کئی وجہ ہے، بعض ایسی ہیں جو ہمارے احاطۂ اختیار سے باہر ہیں، مثال کے طور پر خام مال یعنی بانس یا لکڑی کی قدرتی خصوصیات، صنوبر اور چیڑ کی لکڑی سے تیار ہونے والا گودا بانس اور گیوا کے گودے سے بہتر ہوتا ہے دوسری وجہ ملک کے ٹکنیکل اور مادی وسائل، کسی صنعت کی عمر ۶-۷ سال کی مدت ترقی اور فنی تکمیل کے لئے کچھ بھی نہیں۔ اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ فنی تجربہ، تحقیقی کوششیں اور فن شناسی، ملک میں تیار ہونے والے کاغذ کی خصوصیات کو بہتر بنانے میں نمایاں حصہ لیں گے۔

وحید قیصر ندوی

پٹ سن اور اس کی مصنوعات

پٹ سن ایک قسم کا ریشہ ہے جو مشرقی پاکستان میں کاشت کیا جاتا ہے۔ [illegible] زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ پودا اس خطے کا ایک خودرو پودا ہے اور یہاں اس کی زیادہ کاشت ہوتی ہے۔ پٹ سن کا پودا سات سے آٹھ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اسے دریا کے کنارے کنارے نیچی زمینوں میں بوتے ہیں جہاں پانی زیادہ ہوتا ہے۔ پٹ سن کی کاشت کے لئے زمین کی زرخیزی، پانی کی فراوانی اور خاص قسم کی آب و ہوا ہونا لازمی ہے اور یہ ساری خصوصیات مشرقی پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قدرت نے دنیا کے صرف اسی خطہ کو وہ تمام خصوصیات بخشی ہیں جو پٹ سن کی کاشت کے لئے موزوں ہیں اس خطے کے باشندے زمانہ دراز سے اس نعمت گراں بہا سے خود فیض یاب ہو رہے ہیں اور دنیا کے دوسرے خطوں کے باشندوں کو پٹ سن اور اس کی مصنوعات نہایت ہی سستے داموں میں برآمد کرتے ہیں۔ اسے سنہرا ریشہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے دیگر زراعتی ریشوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور کپاس کے بعد اس کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ پٹ سن پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان کے لئے خدا کی ودیعت کی ہوئی ایک ایسی دولت ہے جس کا اثر یہاں کی معاشیات پر پوری طرح چھایا ہوا ہے اور اسی کی پیداوار میں اس علاقہ کے باشندوں کی خوشحالی کا راز پوشیدہ ہے۔ پٹ سن اگر ایک طرف غیر ملکی زر مبادلہ حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف کاشتکاروں کے لئے کاشت کی شکل میں ایک نقدی ہے جسے وہ جب چاہتے ہیں بازار میں فروخت کرکے حاصل کر لیتے ہیں پھر یہی پٹ سن کھیتوں سے نکل کر بازاروں سے ہوتا ہوا بڑی بڑی منڈیوں میں پہنچتا ہے۔ ان منڈیوں میں پہنچ کر پٹ سن کے کارخانوں کی [illegible]

[illegible] بارگی شکل میں پایا۔ پٹ سن [illegible] کپڑوں اور [illegible] کی [illegible] دنیا کے ہر حصے میں [illegible] اس طرح [illegible] السالہ [illegible] ہورہا [illegible]

پاکستان دنیا کا سب سے [illegible] ملک ہے جو پٹ سن کی کاشت کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کو [illegible] پٹ سن پیدا ہوتا ہے [illegible] مشرقی سرحدی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کے حصہ میں جو علاقے آئے، ان میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا، صرف خام پٹ سن کی زیر کاشت زمین ہی پاکستان کو ملی۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستان کے لئے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ یہی تھا کہ خام پٹ سن کہاں فروخت کیا جائے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اول تو خام پٹ سن خریدنے والے نہیں تھے اور جو ممالک خریدتے بھی تھے وہ اپنی منہ مانگی شرح پر خریدتے تھے اور پھر اپنے کارخانوں میں پاکستان سے خریدی ہوئی پٹ سن سے مصنوعات بنا کر ہم پاکستانیوں کے ہاتھوں گراں قیمتوں میں فروخت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ جب پاکستان نے دوسرے ممالک سے خوراک خریدی تو اس خوراک کو ضرورت مند علاقوں تک [illegible] پایا جاسکا [illegible] پاکستان کے پاس نہیں تھے اور پاکستان [illegible] ممالک سے [illegible] پٹ سن [illegible] کرنے کے معاہدے کئے تھے [illegible] پاس نہیں کیا اور جب غلہ [illegible] خراب [illegible] ہو رہے اور [illegible]

پاکستان کو سپلائی کئے۔ صرف یہی نہیں بعض غیر ممالک نے پاکستان کے قومی اقتصادی نظام کو بھی درہم برہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں [illegible] وسائل کے تمام ذرائع فرسودہ اور پرانے تھے یہاں کوئی بندرگاہ نہ تھی یہاں سے خام اشیاء آسانی سے [illegible] ان غیر ممالک میں بھیجی جاتی تھیں جہاں ان کی کھپت تھی اس لئے پاکستان کو ہر طرح سے مجبور کر دیا گیا کہ وہ دوسروں کا دست نگر رہے چنانچہ بعض غیر ممالک اور پاکستان کی خام اشیاء پاکستان سے حاصل کر کے دوسرے ممالک میں فروخت کرنے لگے اور ایک ایسا بھی وقت آیا جبکہ ہمارے خام پٹ سن کی فروخت مطلق بند ہو گئی۔ ایسی نازک صورت میں پاکستان کو مجبور ہو کر پٹ سن کی کاشت کم کرنی پڑی، پٹ سن کی کاشت اس لئے کم کر دی گئی کہ کاشت کار خون پسینہ ایک کر کے پٹ سن پیدا کرتے تھے لیکن ان کو اس کاشت سے اتنا بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنی لاگت ہی نکال سکیں چنانچہ ۱۹۵۲ء میں پٹ سن کی کاشت نصف کر دی گئی تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر پاکستان کو یہ سوچنا پڑا کہ کس طرح خام اشیاء کے معاملات میں ملک کو خود کفیل بنایا جائے۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا [illegible] ملک کی صنعتی ترقی [illegible] کارپوریشن [illegible] کا کام یہ تھا کہ [illegible] کر دیا اور [illegible] جلد از جلد [illegible] اندر خام پٹ سن کی کھپت کے [illegible] مقامات پر [illegible] تانتوں پر مشتمل [illegible] پٹ سن کا کپڑا [illegible] کی چھوٹائی اور بڑائی کا اندازہ تانتوں [illegible] چنانچہ اس فیصلے کے بعد پاکستان [illegible] کی طرف سے [illegible] مسلمانوں [illegible] پٹ سن [illegible] صنعت کار [illegible]

اور یہ طے پایا گیا کہ آدم جی جوٹ ملز کے نام سے ایک کارخانہ تین ہزار تانتوں پر مشتمل بنایا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد کارخانے کے واسطے موزوں جگہ تلاش کرنے کے لئے پورے صوبہ مشرقی پاکستان کے ہر علاقے کی چھان بین کی گئی اور اس چھان بین کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ سدھیر گنج، نرائن گنج ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں دنیا کا سب سے بڑا پٹ سن کا کارخانہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کارخانے کے لئے جگہ منتخب ہونے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ کارخانے کے لئے غیر ممالک سے مشنری کی خریداری بھی شروع کر دی گئی اس طرح ۱۹۵۱ء کے آخر تک پاکستان میں پٹ سن کے تین کارخانے تیار ہو گئے اور جہاں پٹ سن کی مختلف اشیاء تیار ہونے لگیں۔ ان کارخانوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) بادا جوٹ ملز (نرائن گنج) اپریل ۱۹۵۱ء
(۲) وکٹری جوٹ ملز (پہاڑتلی چاٹگام) نومبر ۱۹۵۱ء
(۳) آدم جی جوٹ ملز (نرائن گنج) دسمبر ۱۹۵۱ء

ان کارخانوں کے علاوہ ۱۹۵۱ء کے وسط میں دو اور کارخانوں کا [illegible] رکھا گیا جو آدم جی جوٹ ملز ۲ اور ۳ کے نام سے [illegible] ان کارخانوں کے تیار ہونے سے یہ ہوا کہ اسی اثنا میں ان کارخانوں نے ملک کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ [illegible] پٹ سن سے بنی ہوئی مصنوعات بھی برآمد کیں جن کا [illegible] ۱۹۵۲-۱۹۵۱ء میں ایک لاکھ چوالیس ہزار [illegible] پٹ سن کی مصنوعات برآمد کیں۔ اسی طرح ۱۹۵۱ء کے آخر [illegible] صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے مزید تین ہزار تانتوں کا [illegible] غیر ممالک میں آرڈر دیا اور انہیں کارخانوں میں تقسیم کر دیا۔ تانتوں کی اس تقسیم کے بعد کارخانوں کی تعمیر کا کام تیزی سے [illegible] ۱۹۵۴ء میں پاکستان [illegible] پٹ سن [illegible] مصنوعات تیار کرنے لگا۔ [illegible] پچاس ہزار ٹن کی کھپت [illegible] پٹ سن کی مصنوعات [illegible] ممالک میں [illegible] مصنوعات [illegible] کے بعد بھی

(باقی صفحہ [illegible])

وحید قیصر زبروی

مرکزی سائنسی تحقیقاتی ادارہ (ریجنل لیبارٹری)

مشرقی پاکستان میں معدنی، حیوانی اور زرعی وسائل کثرت سے ہیں ان میں سے بعض جیسے سوئی گیس اور تابکار مادے (یعنی ریڈیو ایکٹو میٹیریلز) کے ذخیرے اب تک چھپے پڑے تھے۔ ان پوشیدہ ذخائر کو تحقیقات کی مدد ہی سے کام میں لایا جاسکتا اور ان سے صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کی جا رہی ہے۔ ایسی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۴۷ء میں یعنی پاکستان بنتے ہی ملک میں سائنسی اور صنعتی تحقیق کا ایک محکمہ قائم کرنے کی تجویز پر غور ہونے لگا ۱۹۵۱ء میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور کراچی میں پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ جب یہ محسوس کیا گیا کہ ملک کے مختلف علاقوں کے وسائل کی تحقیق اور دریافت کا کام انہی علاقوں میں زیادہ مناسب ہوگا۔ تو مرکزی تجربہ گاہ کے ساتھ ساتھ تین اور تجربہ گاہیں مختلف علاقوں میں قائم کی گئیں، مشرقی پاکستان میں تحقیقاتی ادارہ قائم کرنے کی کوشش ۱۹۵۲ء ہی میں شروع ہو چکی تھیں۔ مگر تحقیقاتی ادارے کا باقاعدہ قیام جگہ اور عمارت کے نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۵۵ء سے پہلے عمل میں نہ آسکا۔ یہ لیبارٹری تیج گاؤں میں قائم کی گئی ہے۔ اور اب لیبارٹری کے لئے بیس ایکڑ زمین پر دھان منڈی میں ایک عظیم الشان عمارت بن چکی ہے اور اسی کے پاس ہی دوسری عمارت زیر تعمیر ہے امید ہے کہ اس سال کے آخر میں لیبارٹری اپنی عمارت میں منتقل ہو جائے گی۔

مشرقی پاکستان میں قدرتی وسائل کی کثرت ہے جنگلوں کی پیداوار زرعی پیداوار، اور آبی جانوروں کی کمی نہیں ایسا علاقہ جو قدرتی وسائل کے اعتبار سے بہت دولت مند ہے بہت سی صنعتوں کا مرکز بن سکتا ہے اور اسی امکان کے پیش نظر یہاں تحقیقاتی ادارہ قائم کیا گیا ہے۔

اس تجربہ گاہ کو مختلف شعبوں میں بانٹ دیا گیا ہے ہر شعبہ الگ الگ چیزوں پر تحقیقاتی کام کر رہا ہے اس کے مختلف شعبے ہیں:۔

(۱) قدرتی پیداواروں کی تحقیق۔

(۲) غذائی اجناس

(۳) پٹسن

(۴) شیشے اور چینی کی صنعت

(۵) چمڑے کی صنعت

مختلف شعبوں کی اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس تجربہ گاہ میں اُن سارے چیزوں پر تحقیق ہوگی جو صوبے میں پائی جاتی ہیں۔ ان تحقیقات کے نتیجوں کی مدد سے ہم نئی نئی صنعتوں کے قیام اور موجود صنعتوں کی امداد کی توقع کر سکتے ہیں۔ عارضی طور پر تیج گاؤں میں پولی ٹکنک انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں تجربہ خانے قائم کئے جا چکے ہیں۔ اور ان میں تن دہی سے کام ہو رہا ہے۔

یہاں بیڑی کے پتے کا بدل دریافت کرنے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ اس کو باہر سے منگوانے میں ہمارے بیرونی سکے کی بڑی مقدار خرچ ہو جاتی ہے۔ اب ہم اس تجربہ گاہ کی وجہ سے بیڑی کے پتے کا بدل دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی مالیت کا بیرونی سکہ بچایا جا سکے گا۔ یہ کثیر زرمبادلہ دوسری زیادہ ضروری چیزیں منگوانے میں کام آسکے گا۔

چائے ہماری بیرونی تجارت کی ایک اہم چیز ہے، چائے تیار کرتے وقت اُس کی پتی سے کافی مقدار میں ایک خاص قسم کا مادّہ حاصل ہوتا ہے جو ضائع کر دیا جاتا ہے، یہ ضائع کر دئیے جانے والا مادّہ ہر سال کوئی ۳۹۰۰۰۰ پونڈ پیدا ہوتا ہے، اس مادّے کو کام میں لانے کے جو تجربے اب تک ہوئے ہیں اُن سے

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سے کوئی چھ ہزار پونڈ "کیفین" حاصل ہو سکتی ہے۔ جو ایک کارآمد اور نہایت قیمتی دوا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی ہمارے صناع اس طرف توجہ کریں گے۔ اور ہمارے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر "کیفین" کی تیاری کا کام شروع کر دیں گے جس سے ملک کی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی اور باہر بھی یہ دوا بھیجی جا سکے گی۔

پٹ سن کے بیج اور اس کی لکڑی یا ڈنٹھل پر تحقیقات کی ضرورت ہے، پاٹ کی لکڑی آج کل جلا دی جاتی ہے۔ اگر ہم اس کا کوئی دوسرا استعمال معلوم کر سکیں تو یہ چیز زیادہ مفید ثابت ہو گی اور اس طرح پاٹ کی پیداوار کا خرچ گھٹ جائے گا۔ مختلف دوائیوں کے استعمال سے ہم پاٹ کے ریشے کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ اس پاٹ کو بھی جو ملوں میں ضائع ہو جاتا ہے کام میں لا سکتے ہیں۔ اس کام میں بھی اس لیبارٹری کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مشرقی پاکستان میں جڑی بوٹیاں بھی کثرت سے ملتی ہیں ایک جنگلی بوٹی ہے جو یہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا طبی نام RAWOL FIER SERPEMTINE ہے ایک نہایت اہم دوائی تیار کی جا رہی ہے۔ اب اس بوٹی کو منظم طور پر اور بڑی مقدار میں اگانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اس کے علاوہ بے شمار جڑی بوٹیاں یہاں پیدا ہوتی ہیں جن کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی ان میں سے بہت سی یونانی اور ایورویدک دوائیوں کی تیاری میں استعمال ہوتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی اس تجربہ گاہ میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس قسم کی زیادہ سے زیادہ جڑی بوٹیوں پر تحقیق کی جائے اور ان کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے۔

ہمارے مذبح خانوں میں جانوروں کا خون ضائع ہو جاتا ہے حالانکہ اس سے بہت سی قیمتی دوائیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اب ڈھاکہ کے اس تجربہ گاہ میں اس طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔

مشرقی پاکستان میں ایندھن کی بہت کمی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لکڑی کا زیادہ حصہ جلانے کے کام میں لایا جاتا ہے، مگر لکڑی اس سے زیادہ مفید کاموں میں لائی جا سکتی ہے مشرقی پاکستان کی ان پیداواروں کو بہتر طریقے پر استعمال کرنے کے تجربے برابر کئے جا رہے ہیں چنانچہ ان سے چمڑا رنگنے کی بہت سی قیمتی دوائیں حاصل کی گئی ہیں اور ان تجربوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوبے کی چمڑے کی صنعت کے لئے کافی سامان جنگلوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو قریب قریب سارے کا سارا باہر سے منگوایا جا رہا ہے۔ گوزان لکڑی کی چھال اور دوسری لکڑیوں سے رنگ حاصل کر کے چمڑہ رنگنے کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے اور امید ہے کہ یہ تجربے چمڑے کی صنعت میں بہت مفید ثابت ہوں گے۔

دوسرے درختوں کے تنے سے بھی دوائیاں وغیرہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی تجربے ہو رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہماری ناریل کی پیداوار کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، ہم اس کے ریشے کی کافی مقدار باہر سے منگواتے ہیں اگر ہم مقامی طور پر اس کو تیار کرنے کا موزوں طریقہ معلوم کر لیں تو اس سے بھی بیرونی سکہ کافی بچایا جا سکتا ہے۔

ہمیں پاٹ کے ڈنٹھل اور دوسری لکڑی کو جلانے کی بجائے دوسرے کاموں میں لگانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی صورت میں ہمیں ایندھن کی کمی کا مسئلہ بھی حل کرنا ہوگا، پاکستان کے معدنی وسائل کے تحقیقاتی ادارے نے فرید پور اور سلہٹ کے ضلعوں میں دلدلی کوئلہ کے بڑے بڑے ذخیرے دریافت کئے ہیں اور ان پر ابتدائی کام بھی کیا جا چکا ہے امید ہے کہ یہ ذخیرے ایندھن کا بدل ثابت ہوں گے۔

اس صوبے میں پھل بھی کئی قسم کے بکثرت پیدا ہوتے ہیں خاص طور پر اناناس اور کٹھل ذکر کے قابل ہیں، ہم مغربی پاکستان سے بعض پھل یہاں منگواتے ہیں مگر اناناس اور کٹھل جیسے خوش ذائقہ پھل سے مغربی پاکستان کے لوگ اب تک محروم تھے مگر اب یہ خوشی کی بات ہے کہ اناناس کو ڈبوں میں بند کرنے اور جام جیلی بنانے کا کارخانہ یہاں قائم ہو چکا ہے، البتہ ابھی تک کٹھل کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ امید ہے کہ اس کے لئے یہ تجربہ کوئی معقول صورت نکالے گا۔

برسات کے موسم میں ہلسا مچھلی یہاں اس کثرت سے ہوتی۔ کہ کوڑیوں کے مول فروخت ہوتی ہے۔

اسی طرح سے جھینگڑی اور دوسری مچھلی بھی یہاں کثرت۔

(بقیہ ص ۳ پر)

وحید قیصر ندوی

احسن اللہ انجینئرنگ یونیورسٹی

احسن اللہ انجینئرنگ یونیورسٹی کی ابتدا ایک انجینئرنگ اسکول کی حیثیت سے ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کو ایک کالج میں تبدیل کر دیا گیا اور اب یہ اپنی جدید حیثیت میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں پانچ شعبوں یعنی سول، الیکٹریکل، میکانیکل، کیمیکل، اور میٹالرجیکل انجینئرنگ میں ڈگری کورس تک تعلیم ہوتی ہے۔ تعلیم کی مدت چار سال ہے۔ سارے پاکستان میں سوائے یہاں کے اور کسی ایک کالج میں کیمیکل، میٹالرجیکل اور ٹیلی کمیونیکیشن انجینئرنگ کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

سیول انجینئرنگ میں سڑکوں کی تعمیر، مختلف عمارتیں بنانا، پل، ریلوے لائن وغیرہ کی تعمیر، آب رسانی کے ذخیروں اور دریاؤں وغیرہ پر بند باندھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ الیکٹریکل انجینئرنگ پڑھنے والے برقی طاقت پیدا کرنے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے، برقی قوت پیدا کرنے والی مشینوں [illegible] چلنے والی اور طاقت کو تبدیل کرنے والی مشینوں [illegible] ساخت، نیز گرانی کے اصول اور کام، ٹیلیفون اور ریڈیو کے سامان کی ساخت وغیرہ کا کام سیکھتے ہیں۔

میکانیکل انجینئرنگ کی تعلیم، بھاپ سے چلنے والی مشینوں کی ساخت ریلوے انجن، تیل سے چلنے والی مشینوں، موٹر گاڑیوں اور کارخانے کی مشینوں کے اوزار وغیرہ کی ساخت کی تعلیم پر مشتمل ہوتی ہے۔ صابون، شکر، کاغذ، رنگ اور دواؤں کی تیاری، پٹرول اور ایندھن کے استعمال کے اصول کیمیکل انجینئرنگ کے موضوع ہیں۔ میٹالرجیکل انجینئرنگ میں لوہے، فولاد، کانسے، پیتل اور دوسری دھاتوں کی تیاری، انھیں تاب دینے، مضبوط بنانے اور ڈھالنے کا کام سکھایا جاتا ہے۔

احسن انجینئرنگ کالج اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ استادوں اور سازوسامان کے لحاظ سے [illegible] فنی تعلیم کا ایک [illegible] ادارہ ہے۔ [illegible] تعمیری [illegible] کی جانچ کا تجربہ خانہ [illegible] ہے جس کی وجہ سے یہاں اینٹ، کنکر، سیمنٹ، فولاد اور دوسرے تعمیری سامان کی بہتر طریقے پر جانچ ممکن ہے، اسی طرح [illegible] soil mechanics کے تجربے خانے میں سڑکیں بنانے کے سامان کی اچھی طرح جانچ ہو سکتی ہے۔ کالج کے میکانیکل شعبے میں ایک بہت ہی اچھا ورکشاپ موجود ہے۔ یہاں [illegible] قسم کی مشینیں لگائی گئی ہیں۔ کالج کا برقی طاقت پیدا کرنے والا ایک پلانٹ بھی موجود ہے۔ جو دو سو پچاس کیلو واٹ بجلی پیدا کرتا ہے یہ بجلی کالج ہی کی ضرورتوں کے لئے کام آتی ہے، بھاپ سے چلنے والی مشینوں کا ایک تجربہ خانہ بھی کالج میں موجود ہے، جو ہر قسم کے بائلر، بھاپ کے انجنوں، موٹر انجنوں اور ریفریجریٹنگ مشینوں سے آراستہ ہے۔ کالج کے میکانیکل شعبے میں HYDROLIC LABORATORY بھی موجود ہے۔ الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم پانے والوں کے لئے اے، سی اور ڈی، سی کرنٹ کے تجربے کرنے اور اعلیٰ برقی طاقت کی تبدیلی کے مشینوں وغیرہ سے لیس ایک تجربہ خانہ بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پیمائش اور جانچ کا تجربہ خانہ، روشنی کا تجربہ خانہ، صنعتی برقی تجربہ خانہ اور ریڈیو اور پیام رسانی کا تجربہ خانہ بھی کالج سے ملحق ہے جس میں آخر الذکر تجربہ خانہ اپنے سازوسامان کی وجہ سے ایک خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔

کیمیکل شعبہ کے کشید لینے کے [illegible]

[illegible] کے آلات، حرارت منتقل کرنے والے آلات، ایندھن کی جانچ کے سامان اور ایسی ہی دوسری ضروری چیزوں سے مزین ہے اور میٹالرجیکل شعبے کے تجربے خانے میں ڈھلائی کا کارخانہ ایسی بھٹیاں جن کی حرارت پر قابو رکھنے کے آلات موجود ہیں اور دھات کی ساخت دیکھنے والی خوردبینیں وغیرہ موجود ہیں۔

انجینئرنگ کالج کے ان تجربہ خانوں سے صرف یہاں تعلیم پانے والے ہی نہیں، بلکہ سرکاری محکمے اور صنعتیں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کالج کے ورکشاپ میں ٹکنیکل کاموں کی ٹریننگ دینے کا بھی انتظام موجود ہے، ٹریننگ کی مدت تین سال ہوتی ہے، ۳ سال کی ٹریننگ کے بعد ڈپلوما دیا جاتا ہے۔

احسن اللہ انجینئرنگ کالج میں تعلیم پانے والوں کے لئے کھیل کود اور تفریح کے سامان کا بھی پورا اہتمام ہے۔ فٹ بال ہاکی اور کرکٹ کے لئے کالج کے اپنے میدان موجود ہیں — ٹینس کے لئے لان بھی بنایا گیا ہے، اس کے علاوہ — [illegible] Games کے لئے بھی انتظامات ہیں۔

کالج کے پانچ ہوسٹل ہیں جس میں کل پانچ سو لڑکوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اسی سال ایک نیا ہوسٹل بنا ہوا ہے جس میں ایک سو اسی لڑکے رہ سکیں گے۔

کالج کی لائبریری کی بھی حال ہی میں توسیع ہوئی ہے۔ اس وقت کوئی دس ہزار کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ انجینئرنگ کے مختلف پرانے رسالوں کی جلدیں فراہم کرنے کی بھی کوشش جاری ہے تاکہ حوالے کی ایک اچھی لائبریری تیار ہو جائے۔

احسن اللہ انجینئرنگ کالج میں ضرورت کے مطابق اسٹاف کی بھرتی کا کام ہنوز جاری ہے، یہاں کے اسٹاف میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جنھوں نے برطانیہ یا امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ یہاں کے اکثر طالب علم بھی ڈگری حاصل کرکے اسٹاف میں شامل ہوگئے ہیں، ان کے لئے اعلیٰ تعلیم کے موقعے فراہم کرنے کی کوشش جاری ہے۔ کالج کی کامیابی کا دار و مدار اسٹاف کی اعلیٰ صلاحیتوں اور محنت پر ہے امید ہے کہ تنخواہوں وغیرہ کے اضافہ کی وجہ سے قابل اور محنتی طالب علم یہاں کی ملازمت کو ترجیح دینے لگیں گے۔ انجینئری کا پیشہ سخت محنت چاہتا ہے، تعلیم کے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ طالب علموں میں سخت محنت کی عادت پیدا ہو سکے۔ انجینئرنگ کے طالب علم کو نسبتاً کم وقت میں بہت کچھ سیکھنا اور کرنا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مضمون کی مکمل تعلیم کسی قدر مشکل ہو جاتی ہے نصاب بھی جو بنایا جاتا ہے اس میں ان ساری باتوں کا لحاظ رکھنا مشکل ہوتا ہے، امید ہے کہ ثانوی تعلیم کو ترقی دینے سے طالب علموں کے لئے اس شعبے کی مشکلات پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔ موجودہ صورت میں ہمارے پاس ایسے طالب علم بہت کم ہیں جو خاص دلچسپی اور مناسبت کی بنا پر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ ابتدائی اور ثانوی درجوں میں فنی قسم کی تعلیم کو رواج دیا جائے۔ اسکولوں میں صنعتی تعلیم ڈرائنگ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم زیادہ کی جائے تاکہ طالب علموں کو انجینئرنگ سے دلچسپی پیدا ہو اور وہ اس طرف زیادہ توجہ دے سکیں۔

مرکزی سائنسی تحقیقاتی ادارہ (بسلسلہ صفحہ ۷۱)

ملتی ہے، اگر مچھلیوں کو ڈبوں میں محفوظ کرنے کی صورتیں کی گئیں تو سال بھر ملک کے دولوں بازوں کو سستی اور اچھی مچھلی مل سکے گی تحقیقاتی ادارے نے اس اہم کام کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے۔

مشرقی پاکستان میں شیشے کی صنعت شروع ہو چکی ہے۔ صنعت قیام پاکستان سے پہلے بھی یہاں موجود تھی۔ مرکزی سائنسی تحقیقاتی ادارہ اور شیشے اور چینی کی صنعت کا تحقیقاتی شعبہ شیشے کی نئی قسمیں تیار کرنے اور صوبے میں چینی کے برتنوں کی صنعت فروغ دینے میں کافی مدد دے رہا ہے۔ اور اس طرح ملک میں اس صنعت کے فروغ کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ آج کل یہ ادارہ اپنی قیمتی رائے اور تحقیقات سے ہر ادارے کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ اس ادارے کی خدمات کوئی شخص بھی جب چاہے حاصل کرسکتا ہے۔ اس تجربہ گاہ کے قیام کا مقصد صنعت کی ترقی ہے اور ہمارے صناع ان سے پورا فائدہ اٹھا سکے

وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان کے چند مشہور قبائل

چاکما

اگر آپ چاٹگام کی سرحد پر کھڑے ہو جائیں تو آپ کو سامنے دریائے کرنافلی بہتا نظر آئے گا۔ جدھر سے اس دریا کا بہاؤ شروع ہوتا ہے اُدھر نظر ڈالئے تو دور دور تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اور بیچ بیچ میں ہری بھری پہاڑیاں۔ یہی علاقہ چاٹگام کا پہاڑی علاقہ کہلاتا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں پر رہنے والے قبیلے مانگتھا اور دریائے کرنافلی کے کنارے رہنے والے قبیلے کانگتھا کہلاتے ہیں۔ ان میں کانگتھا قبیلے زیادہ خوشحال اور مہذب ہیں۔

کانگتھا قبیلوں میں بھی چاکما اور ماگھ دو بڑے قبیلے ہیں۔ چاکما قبیلے کے لوگ چانگی، شیلانگ، ماٹنی، کاچالانگ اور رانگا اٹی کے علاقوں میں زیادہ رہتے ہیں۔

شروع میں اس قبیلے کا حال کیا تھا اس کا پورا پتہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چاکما ملایا سے آئے اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ اُن مغل فوجوں کی اولاد ہیں جنھیں اراکان کے بادشاہ نے لڑائی میں ہرایا تھا۔ کیپٹن LAIM کا بھی یہی کہنا ہے کہ چاکما مغل فوجوں کی اولاد میں سے ہیں۔ مگر خود چاکما قبیلے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم اُس شاتریا قبیلے کی اولاد ہیں جو ہمالیہ کے دامن میں چامپا علاقے میں رہتے تھے۔ چامپا کے ایک حاکم بجوگیری نے چاٹگام کے اُتر میں ایک ڈانگ سے ٹیکناٹ تک کا علاقہ فتح کر لیا اور پھر وہ اور اُس کے سپاہی یہیں رہ پڑے۔ چاکما اسی راجہ اور اُس کے سپاہیوں کی اولاد ہیں۔

اس کے بعد ایک زمانے تک ماگھ قبیلوں اور اراکان کے راجاؤں کے درمیان سخت لڑائیاں ہوتی رہیں۔ پھر مسلمانوں کا زمانہ آیا۔ چاکما قبیلے والوں نے مسلمانوں سے بڑا اثر لیا۔ اثر اتنا بڑھا کہ اُن کے اکثر سرداروں نے مسلمانوں کے نام پر اپنے نام رکھے ہیں۔ چاکما قبیلوں کے ایک سردار جَبّل خاں کے زمانے میں بنگال کے نوابوں سے بھی ان کی ایک بڑی لڑائی ہوئی۔ ۱۷۶۳ء میں مسٹر ہنری VERCLEST نے ایک اعلان کے ذریعے بتایا کہ سانگو، فینی اور کوکی ریا کے علاقے چاکما قبیلوں کی ریاست ہیں۔ جام بخش کی سرداری کے زمانے میں انگریزوں سے بھی اس قبیلے کی جنگ ہوئی اور ۱۷۸۷ء میں ایک سمجھوتہ ہو گیا جس میں جام بخش نے انگریزوں کو ہر سال پانچسو من روئی دینے کا وعدہ کیا۔

۱۸۱۲ء میں دھرم بخش خاں اس قبیلے کا سردار ہوا۔ دھرم بخش خاں اور اس کے بعد کالی ندی رانی نے اچھی حکومت کی اور اپنے قبیلے کو بہت ترقی دی۔ کالی ندی رانی کے بعد اُس کا پوتا ہریش چندر حاکم ہوا اس نے کلکتہ کے کیشب چندر سین کی پوتی بنیتو رائے سے شادی کی۔

چاکما قبیلے کی ایک اور شاخ آن جونگ کہلاتی ہے۔ یہ ۱۸۱۹ء میں اراکان سے چاٹگام تک آئے۔ ۷۰، ۸۰ سال پہلے تک یہ اراکانی زبان ہی بولتے تھے۔

چاکما قبیلے کی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں جیسی حالت ہوتی ہے کہ آج یہاں، کل کہیں اور۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں کھیتی کرتے ہیں۔ ان کے کھیتی کرنے کا طریقہ جھوم کہلاتا ہے اور کھیتی کرنے والے جھومیا کہلاتے ہیں۔ ان کی گزر بسر کا بڑا ذریعہ یہی کھیتی باڑی یا جھوم ہے۔ جاڑا گزرنے پر یہ لوگ درخت اور بانس کاٹتے ہیں اور جب گرمیوں میں یہ درخت اور بانس سوکھ جاتے ہیں تو ان سے طرح طرح کے کام نکالتے ہیں۔ گرمیاں ختم ہونے کے

بعد سے پھر کھیتی باڑی کی تیاری شروع ہوتی ہے کھیتوں میں دھان، روئی اور سبزیوں کے بیج بوتے ہیں۔

ایک جگہ دو تین سال کھیتی کرنے کے بعد جب زمین میں غلّہ اُگانے کی قوت کم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اور کھیتی شروع کر دیتے ہیں۔

چاکما قبیلوں کو باہر سے کوئی چیز منگوانے کی کم ہی ضرورت پڑتی ہے۔ کھانے کے لئے دھان اور ترکاریاں اور کپڑا بُننے کے لئے روئی وہ خود اُگا لیتے ہیں۔ بانس اور درختوں کی لکڑی سے یہ اپنے گھر بنا لیتے ہیں معمولی قسم کا فرنیچر یہ خود ہی بنا لیتے ہیں۔ لکڑی کاٹنے، فصل کاٹنے اور ایسے ہی کاموں کے لئے وہ ایک درانتی استعمال کرتے ہیں جسے وہ خود بناتے ہیں جسے داؤ کہا جاتا ہے۔

چاکما عورتیں بھی بہت محنتی ہوتی ہیں۔ کام سے بالکل نہیں گھبراتیں۔ گھر کا پورا کام کاج خود ہی سنبھالتی ہیں اور کھیتوں میں بھی مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ گھر پر یہ کپڑا بھی بُن لیتی ہیں۔

چاکما لوگوں کا کھانا پینا بھی بہت سادہ ہوتا ہے، زیادہ تر چاول کھاتے ہیں، جانوروں کا گوشت بھی کھا لیتے ہیں۔ تمباکو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جسے دیکھئے تمباکو پی رہا ہے، اس میں بچے بوڑھے اور عورتیں سب ہی ہیں۔ چاکما قبیلے بچپن کی شادی کو پسند نہیں کرتے لڑکے کا باپ دُلہن کو چُنتا ہے، شادی کی بات چیت طے کرنے کے لئے لڑکے کا باپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شراب وغیرہ لے کر دُلہن کے گھر جاتا ہے، وہاں خوشی کے جلسے منائے جاتے ہیں اور وہیں بات چیت طے کی جاتی ہے، شادی کے دن دولہا کے گھر کے بچے اور بچیاں دلہن کے گھر جاتے اور اُسے اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں۔

یہ لوگ بدھ مت کے ماننے والے ہیں، جہاں عبادت کرتے ہیں وہ جگہ KEYAUG کہلاتی ہے، اسی عبادت گاہ میں چاکما بچوں کی مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ چودھویں رات کو یہ لوگ بڑے دھوم دھام سے جشن مناتے ہیں۔ خاص کر چیت کی چودھویں رات تو بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ چاکما اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ مگر ہیضہ، چیچک اور ایسی ہی وبائی بیماری سے مرنے والوں کو گاڑ دیا جاتا ہے۔

چوری، ڈکیتی ان قبیلوں میں بہت کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدالت اور فوجداری کی نوبت یہاں بہت کم آتی ہے۔ قبیلے کے مُکھیا گاؤں گاؤں گھوم کر آپس کے جھگڑے خود ہی چکا دیتے ہیں۔

ان کی زبان بنگلہ اور برمی زبانوں سے مل کر بنی ہے چاکما عورتوں کا لباس بہت خوبصورت ہوتا ہے آج کل اُن میں بنگالی عورتوں کا پہناوا بھی رواج پا رہا ہے۔

رانگا ماٹی میں ایک سرکاری اسکول چاکما بچوں کے لئے بنایا گیا ہے چاکما قبیلے میں ابھی زیادہ پڑھے لکھوں کی گنتی کم ہی ہے۔

میمن سنگھ کے دو مشہور قبائل

میمن سنگھ کے شمالی سرحدی علاقے میں بھارت کی سرحد سے بالکل متصل درگاپور، ہلدا گھاٹ سری بورڈی کا لماکندی اور نالیتا باڑی نام کے چند گاؤں ہیں ان گاؤں میں بہت سے چھوٹے بڑے ٹیلے ہیں۔ انہی ٹیلوں پر مشرقی پاکستان کے دو مشہور قبیلے گارو اور ہجنگ آباد ہیں۔ ان دونوں قبیلوں کی تاریخ ٹھیک ٹھیک طور پر نہیں معلوم، کیونکہ سینکڑوں برس سے ان قبیلوں کے لوگ خانہ بدوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج یہاں اکل وہاں کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی سُوشانگ اور شیرپور کے زمینداران کے حاکم تھے۔ مغلوں کے زمانے میں یہ زمیندار حکومت کو لگان کے طور پر ہاتھی اور لکڑی دیا کرتے تھے ہاتھی پکڑنے کے لئے وہ اس کاشتکار یعنی کھیدا کرنے والوں کو اپنے پاس رکھتے تھے۔ مغلوں کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد ہاتھی پکڑنے کی ضرورت نہ رہی۔ ہاتھی پکڑنے کے لئے جو جگہ مقرر تھی وہاں کھیتی باڑی شروع ہو گئی۔ کھیتوں میں جو کچھ پیدا ہوتا اس کا ایک حصّہ زمیندار کو دیا جانے لگا۔ زمینداروں کو پیداوار کا حصہ دینے کا یہ طریقہ "ٹانکو" کہلاتا ہے۔ ٹانکو کا طریقہ اب تک چلا آ رہا تھا مگر اب یہ طریقہ حکومت نے ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ ملک سے زمینداری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس پورے علاقے میں اڑتیس ہزار گارو ۵ ہزار

ہیجنگ اور دس ہزار دوسرے قبیلے بستے ہیں اس طرح اس علاقے میں ان کی کل گنتی تراسی ۸۳ ہزار ہے۔

گارو دیکھنے میں چینیوں کی طرح ہوتے ہیں، ہاتھ پاؤں کے مضبوط اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ ان کی زندگی آرام وعیش کی بجائے محنت و مشقت میں کٹتی ہے۔ گارو کا قد عام طور پر ساڑھے باسٹھ انچ یعنی پانچ فٹ ڈھائی انچ ہوتا ہے۔ ہیجنگ بھی بڑی مضبوط قوم ہے۔ ہر تکلیف کا نہایت ہمت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ وحشی معلوم ہوتے ہیں مگر دل کے بہت نیک ہوتے ہیں۔ صورت شکل میں یہ بھی گارو سے ملتے جلتے ہیں مگر گارو سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ صفائی میں بھی یہ گارو سے بڑھے ہوئے ہیں۔ دونوں قبیلے ایک ہی قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ مگر ہیجنگ لڑکیوں کا لباس ذرا بدلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اپنے سینوں پر ایک کپڑا لپیٹ لیتی ہیں۔ مگر گارو لڑکیاں کمر پر کپڑا لپیٹتی ہیں اور ان کا اوپر کا سارا جسم ایک قسم کے بلاؤز میں چھپا رہتا ہے۔ آج کل ہیجنگ اور گارو لڑکیاں ساری بھی پہننے لگی ہیں۔ مگر یہ چیز کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

گارو کو چھوڑ کر ہیجنگ اور دوسرے قبیلوں کو مذہب کے لحاظ سے ہم ہندو کہہ سکتے ہیں ہیجنگ کھتری نسل سے ہیں۔ یہ تمام الکھشا دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ ہیجنگ، گائے، مرغی اور سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ ان میں بھی چھوت چھات اور ذات پات کے طریقے موجود ہیں۔ ان کے گھر نہایت صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ دولتمند خاندان مذہبی رسمیں ادا کرنے کے لئے برہمن پنڈتوں کو بلایا کرتے ہیں۔ مگر یہ برہمن ان سے دور دور رہتے اور اپنے کو چھونے نہیں دیتے۔

ہیجنگ کا پیشہ کھیتی باڑی ہے، اس کے سوا ان کو کسی کام سے کام نہیں۔ لکھنے پڑھنے کا ان میں رواج نہیں، ان کی زبان آسامی زبان سے نکلی ہے۔ اکثر بنگلہ بھی بول لیتے ہیں۔ ان کی مالی حالت اچھی ہے۔ اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

گارو اصل میں پہاڑی قبیلہ کے فرد ہیں۔ اب بھی گارو کے پہاڑی علاقوں میں بہت سے گارو بستے ہیں پہاڑی علاقوں اور میدانی علاقوں میں رہنے والے گارو کا رہن سہن ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ بھوت پریت کو یہ بہت مانتے ہیں اور یہ "چورا بودی" "سوسیٹم" "سانجاگ" اور "گاڈرا" کی پوجا کرتے ہیں۔

البتہ وہ لوگ جو عیسائی ہو چکے ہیں وہ ان کی پوجا نہیں کرتے۔ گارو اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی روح کو بھی پوجتے ہیں قبائلی لوگوں میں صرف چند گارو عیسائی ہوئے ہیں۔

اس وقت ایک تہائی گارو عیسائی ہیں۔ پرانے زمانے میں ان کا پیشہ لکڑی جمع کرنا تھا۔ سور ان کے پالتو جانور ہیں۔ آج کل یہ کھیتی باڑی بھی کرنے لگے ہیں۔ اپنے کھیتوں میں یہ اناناس اور کبھی کبھی دھان اگاتے ہیں۔ پہاڑیوں کے ڈھلانوں پر دھان بویا جاتا ہے۔ کھیتی کے اس طریقے کو "جھوم" کہتے ہیں۔ میمن سنگھ کے میدانی علاقوں میں رہنے والے گارو اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے مرد عام طور پر کسی قدر کاہل ہوتے ہیں۔ سور، گائے، مرغیاں وغیرہ شوق سے کھاتے ہیں۔ چاول کی دیسی شراب پیتے ہیں۔ اسے "پوجائی" یا "چو" کہتے ہیں۔ شادی اور خوشی کے موقعوں پر یہ شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے۔ تمام قبیلوں میں گارو کے ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ جائداد کی مالک عورت ہوتی ہے۔ شادی کے بعد گارو لڑکے بھی سسرال ہی آجاتے ہیں۔ اس طرح گھر دامادی کا طریقہ ان میں عام ہے۔ داماد جائداد کی دیکھ بھال کا کام کرتا ہے۔ مگر مالک اس کی بیوی رہتی ہے۔

شادی کے بعد شوہر جو کچھ کمائے گا وہ بھی بیوی کا حصہ ہے۔ گارو مرد شاید اسی رواج کی وجہ سے اتنا کاہل ہو جاتا ہے اور کام کاج میں دلچسپی نہیں لیتا۔ عورت ہی گھر اور باہر کا سارا کام کرتی ہے۔ زمین کی دیکھ بھال بھی اسی کے سر ہے۔

بعض طریقے اس قبیلے کے لئے خاص ہیں۔ جیسے گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی کا شوہر جائداد کا انتظام سنبھالتا ہے۔ ایسے شوہر کو "نوکما" کہتے ہیں۔ اگر لڑکی مر جائے تو اس کے شوہر کو اسی گھرانے کی کسی لڑکی سے شادی کرنا پڑتی ہے۔

اگر "نوکما" اپنی بیوی سے پہلے مرجائے تو اُس کی بیوی کا بھانجا جائداد کا کام سنبھالتا ہے۔ اس کو "نوکرم" کہتے ہیں۔ یہ طریقہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ جائداد کی دیکھ بھال کا کام کسی اور خاندان کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ "نوکرم" کو اپنی خالہ زاد یا ماموں زاد بہن سے شادی کرنا پڑتی ہے اور اگر ماموں مرچکا ہے تو اُس کی بیوی سے بھی شادی کرسکتا ہے۔

گارو زرخیز زمینوں کی تلاش میں پہاڑیوں سے نکل کر میدانوں میں پھیل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ گارو میں یہ رسم تھی کہ جب قبیلے کا سردار مرجائے تو ایک یا ایک سے زیادہ غلاموں کی قربانی دی جاتی ہے۔ اس لئے اپنی جانیں بچانے کی خاطر وہ میدانوں میں نکل آئے۔ ایک اور وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ طاقتور قبیلوں کے ظلم سے بچنے کے لئے وہ اپنا گھر بار چھوڑ نکلے تھے۔

میمن سنگھ کے گارو قبیلے کے کئی فرقے ہیں۔ زیادہ تر تین فرقوں "آبنگ" "آچ چھک" اور "آتنگ" کے لوگ ہیں پاکستانی علاقوں میں رہنے والے گارو "لامدانی" یا میدانی کہلاتے ہیں۔ ان کی زبان میں بنگلہ کے بہت سے لفظ ملے ہوئے ہیں تمام گارو مرد بنگلہ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔

یہ اپنے کو "ماندی" یعنی "آدمی" یا "آچ چھک" یعنی پہاڑی آدمی کہتے ہیں۔ گارو اپنے خاندان میں شادی نہیں کرتے مگر عیسائی گارو اپنے ہی خاندان میں شادیاں کرتے ہیں۔ اپنے ہی خاندان میں شادی کرنے کا طریقہ "مارونگ" کہلاتا ہے۔

اس طریقے پر عمل کرنے والے کو برادری سے نکال باہر کیا جاتا اور انھیں جائداد وغیرہ سے بے دخل کردیا جاتا ہے۔

مورنگ

مورنگ قبیلے کی تلاش بڑا مشکل کام ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں پر گھنے جنگلوں میں ان کا بسیرا ہے۔ ان تک پہنچنے کے لئے نہ پکی سڑکیں ہیں اور نہ اچھے راستے۔ پھر ان کی گنتی بھی بہت کم ہے۔ مشکل سے ایک ہزار ہوں گے، اتنی بڑی آبادی میں ایک ہزار مورنگ کا پتا چلانا گویا گھاس کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنا ہے۔ چاٹگام کے پہاڑی کا آخری حصہ ان کا گھر ہے۔ اس طرف جنگل ایسے گھنے ہیں کہ آنا جانا قریب قریب ناممکن ہے پھر ان جنگلوں میں ہاتھی، شیر اور دوسرے جنگلی جانور ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ایسے جنگل میں جانے کی کون ہمت کرے گا۔ انہی جنگلوں میں پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر آپ کو مورنگ قبیلے کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ملیں گی۔ اس مشینی دور میں یہ مورنگ سیکڑوں برس پرانی تہذیب کی زندگی گذارتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے کی غیر مہذب دنیا میں انسانوں کی زندگی کتنی سیدھی سادی تھی۔

مورنگ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کے بہت پرانے باشندوں میں ہیں۔ آج ان کی زندگی میں آپ کو اس زمانے کی جھلکیاں نظر آسکیں گی۔ جبکہ انسان جنگلوں میں زندگی گزارتا تھا۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ اپنے سردار کے حکم اور برادری کے بنائے ہوئے قاعدوں کی یہ بڑی پابندی کرتے ہیں تعلیم اور تہذیب سے یہ بہت دور رہے اور شاید اسی وجہ سے بہت سی سماجی خرابیاں بھی ان میں نہ پھیل سکیں۔ جھوٹ وہ کبھی نہیں بولیں گے۔ اینچ پینچ کی باتیں کرنا انھیں نہیں آتیں۔ ان کی باتوں اور حرکتوں میں بچوں کی سی معصومیت آپ کو نظر آئے گی۔ اس خیال سے بڑا رنج ہوتا ہے کہ مورنگ قبیلے کی گنتی رفتہ رفتہ گھٹتی جارہی ہے بعض وقت یہ خیال بڑا ستاتا ہے کہ کیا یہ قبیلہ دنیا سے یونہی مٹ جائے گا۔

مورنگ مرد اور عورتیں عام طور پر کپڑے زیادہ نہیں پہنتے اور جو کپڑے ان کے بدن پر ہوتے بھی ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہی ہیں۔ سیکڑوں برس سے ایسی زندگی گذار کر اب وہ اس کے بالکل عادی ہوچکے ہیں۔ اب انھیں جسم ڈھکا نہ رہنے سے کوئی جھجک بھی نہیں ہوتی۔ ہاں پوجا پاٹ اور تہوار کے موقعوں پر یہ بہت بن سنور کر نکلتے ہیں۔ مورنگ مرد اور عورتیں اپنے سروں پر لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ بال سنوارنے کے لئے

بانس کے بنے ہوئے کنگھے استعمال کرتے ہیں۔ جاڑوں میں یہ کبھی غسل نہیں کرتے۔ ہاں گرمیوں میں روزانہ نہاتے ہیں غسل کے لئے انھیں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے۔ سوچئے تو سہی۔ روزانہ ہزار ہزار فٹ اونچائی پر سے اترنا اور واپس جانا ہمارے لئے ممکن بھی ہوگا۔

بعض لوگ سوچتے ہوں گے کہ جاہل اور غیر مہذب انسان عقل اور سمجھ سے بھی دور ہیں مگر پہاڑی جنگلوں میں رہنے کے لئے جس قسم کی سوجھ بوجھ ضروری ہے وہ ان میں سولہوں آنے موجود ہے۔ ان کا سلیقہ اور ہوشیاری دیکھ کر شاید آپ بھی تعجب کریں۔ کسی مورنگ کے گھر پر نظر ڈالئے اس میں کی کوئی چیز اس نے خریدی نہیں ہے۔ تین ہاتھ اونچی مٹی کی چار دیواری اور اس پر ایک مچان۔ اس کے لئے پیسے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے بنانے کے لئے کچھ بانس، بانس کے بڑے بڑے پتے اور کچھ بیلیں درکار ہیں۔ جنگل میں ان چیزوں کی کمی نہیں۔ ان چیزوں کو جمع کر کے گھر بنانے میں وقت بھی کیا لگے گا۔ مچان پر مورنگ رہتے ہیں اور نیچے چار دیواری میں چھاگل وغیرہ جیسا سامان اور پالتو جانور جیسے گائے، کتا، سور وغیرہ۔ لیجئے پورے خاندان کا انتظام ہوگیا۔ اب گھر کا ضروری سامان بالٹی، ہانڈی، کلسی، برتن، شیشے، بوتلیں، توا وغیرہ ———— ان سامانوں کا بھی حال سنئے۔ موٹے بانس کو کاٹ کر بالٹی، ہانڈیاں وغیرہ بنالیں۔ پتلے بانس سے بوتلیں وغیرہ بن گئیں برتنوں کا کام بڑے بڑے پتوں سے پورا ہوگیا۔ کھیتی باڑی کے لئے اچھی زمین ڈھونڈنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے بھی انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ غیر ضروری چیزوں کو وہیں پھینکا اور ضروری چیزیں اپنے سروں پر لادلیں اور دیکھتے دیکھتے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بسے۔ شکار کی تلاش میں انھیں بہت گھومنا ہوتا ہے زیادہ گھومنے سے پیاس لگنا ضروری ہے۔ پہاڑوں پر پانی ملنا بڑا مشکل، مگر مورنگ کے لئے یہاں بھی کوئی مشکل نہیں۔ انھیں ایک ایسی بیل کا پتہ معلوم ہے جو پہاڑوں پر ہر جگہ مل جاتی ہے۔ بیل کو کاٹنے پر کم سے کم دو لوٹے پانی ضرور نکل آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شکار کے لئے نکلتے وقت انھیں ساتھ پانی وغیرہ رکھنے کا اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ گانے بجانے سے بھی انہیں بڑی دلچسپی ہے ان کے اکثر ساز بانس ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، بانسری کا رواج زیادہ ہے اور اسے یہ بجاتے بھی خوب ہیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں بھی مورنگ کسی کے محتاج نہیں دوسرے ملکوں سے کھانے پینے کا سامان منگوانے کی بات شاید انھوں نے کبھی سنی بھی نہ ہوگی۔ جنگل جو مل جائے اور ان کے کھیتوں میں جو اُگ جائے وہی اُن کے لئے بہت ہے۔ پہاڑوں پر قسم قسم کے جانوروں اور طرح طرح کی سبزیوں اور پھلوں کی بھی کمی نہیں۔ جانوروں اور خاص طور پر ہاتھی سور اور ہرن کا شکار یہ بڑی چالاکی سے کرتے ہیں۔

نشہ یہ لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ حقہ بچے بڑے سب ہی پیتے ہیں۔ بعض بانس کے بنے ہوئے پائپ یا چرٹ بھی پیتے ہیں۔ چرٹ پینے کا طریقہ بھی انوکھا ہے یعنی چرٹ کا جلتا ہوا حصہ منہ میں لے کر کش لگاتے ہیں۔

بھوت پریت وغیرہ سے مورنگ بہت ڈرتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرنے والے ہی ان کے ڈاکٹر بھی ہیں اور گرو بھی۔

ان میں ایک عجیب و غریب رسم ہے ان کے یہاں ایک قصہ مشہور ہے کہ اس قبیلے کے کسی بزرگ نے بھگوان سے پوچھا تھا کہ مرنے کے بعد جنت کا راستہ کیسے ڈھونڈھا جائے۔ بھگوان نے بتایا کہ جب تم میں سے کوئی مرجائے تو ایک کتے کی قربانی دی جائے۔ کتے کی آتما سونگھتے سونگھتے جنت کا راستہ ڈھونڈلے گی۔ اور مرے ہوئے مورنگ کی روح بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچ سکے گی۔ اسی زمانے سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب کوئی مورنگ مرتا ہے تو اس کے کتے کو بھی جسے اس نے زندگی بھر بڑے چاؤ سے پالا تھا، ماردیا جاتا ہے تاکہ کتا اپنے آقا کی روح کو جنت کا راستہ بتا سکے۔

سید وحید قیصر ندوی

شہادت حسین

کوی شہادت حسین ۱۸۹۳ء میں مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گاؤں کا نام پنڈت پول تھا۔ سات سال کی عمر تک شہادت حسین ایک مکتب میں پڑھتے رہے جو اُن کے گھر ہی میں تھا۔ اس کے بعد اُنھیں ایک انگریزی مڈل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جو اُن کے گاؤں سے دو میل دور تھا۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر نظم بہت اچھی پڑھتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہمیشہ مدھوسودھن مائیکل کی نظموں کی ایک کتاب رہتی جس میں سے وہ اکثر پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتے۔ ان نظموں کو سُن سُن کر شہادت حسین کو شاعری سے دلچسپی ہوگئی اور خود وہ بھی نظم پڑھنے میں بڑے مشاق ہو گئے۔ اسکول میں یہ ہمیشہ بنگلا اور انگریزی میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتے گئے۔ مگر حساب ان کے بس کا روگ نہ تھا، اس کے علاوہ انھیں اسکول کی پابندیاں پسند نہ تھیں اور نہ تعلیم کا رسمی طریقہ۔ نتیجہ یہ کہ وہ جلد جلد اسکول بدلتے رہے۔ آخر کار چلتے پھرتے وہ ہگلی کالیجیٹ اسکول میں پہنچ گئے۔ یہاں بھی وہ اسکول کی کتابوں سے زیادہ نظمیں لکھنے اور پڑھنے میں وقت گزارتے، ہگلی میں وہ ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے جو گنگا کے کنارے تھا۔ رات کے وقت بورڈنگ ہاؤس کی سیڑھیوں پر گنگا کی طرف مُنہ کر کے بیٹھنا اور نظمیں پڑھنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ اب وہ خود بھی نظمیں لکھنے لگے تھے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں دو کاپیاں اُن کی نظموں سے بھر چکی تھیں، یہ زمانہ رابندرناتھ ٹیگور اور مدھوسودھن کی شہرت کا تھا، ہر طرف ان ہی کا طوطی بول رہا تھا۔ ایسے وقت میں ایک نئے شاعر کا آگے بڑھنا بڑا مشکل کام تھا مگر شہادت حسین کی ہمت نہ ٹوٹی وہ برابر شعر کہتے رہے اور [illegible]

کا لوہا منوا لیا۔

اسکول چھوڑنے کے بعد شہادت حسین صحافت کی طرف متوجہ ہوئے اس زمانے میں بنگلہ کے ہفتہ وار اخباروں اور ماہوار رسالوں میں اُنھوں نے جائنٹ اڈیٹر اور اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ مولانا اکرم خاں کے ماہانہ رسالہ "محمدی" کے لئے بھی اُنھوں نے بہت سارے مضامین لکھے اور اپنی نظمیں شائع کرائیں۔ اس طرح اُنھیں ایک طرف اخباروں کے کام کا بڑا تجربہ حاصل ہوا تو دوسری طرف ادب سے بھی اُن کا لگاؤ بہت بڑھ گیا۔

شہادت حسین ایک بہت بڑے ڈرامہ نگار ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی نظموں میں ہمیں ڈرامائی عنصر بہت ملتا ہے۔ اُن کی شاعری کی اہم خصوصیت الفاظ اور بیان کا زور ہے، یہاں بتلا دینا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے تیس چالیس سال میں بنگلا ادب اور شاعری پر ٹیگور کا اثر پڑا۔ ہر ادیب اور شاعر اس رنگ پر چلنے کو کمال سمجھتا تھا۔ مگر شہادت حسین اس عام رفتار سے بالکل الگ تھلگ رہے، وہ خوشنما اور حسین لفظوں کی خاطر، اپنے بیان کے زور کو کبھی قربان نہیں کرتے، نظم ہو یا نثر وہ ہمیشہ زوردار اثر کرنے والے لفظوں کو پسند کرتے ہیں۔

شہادت حسین کی نظم کی کتابوں میں "کلپا لیکھا" "مردنگ" "چترایت" اور "روپک چندر" بہت مشہور ہیں۔ آخری کتاب اُن کی نظموں کا آخری مجموعہ ہے۔

ناولوں میں خاص طور پر ذکر کے قابل "جوگیر دابی" "دریتا" [illegible]

پہلے کہا جا چکا ہے کہ شہادت حسین ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بہت اونچا مقام رکھتے ہیں اور پہلے مسلمان ادیب ہیں جنھوں نے بنگلہ میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ شہادت حسین خود ایک بہترین ایکٹر ہیں کلکتہ میں ایک زمانے تک وہ اسٹیج پر بھی نظر آتے رہے۔ اداکاری سے اُن کے اس خاص لگاؤ نے بھی اُنھیں اچھا ڈرامہ نگار بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ اُنھوں نے زیادہ تر تاریخی ڈرامے لکھے اور قوم کو ڈراموں کی صورت میں اُس کے بزرگوں کا حال سُنا کر نیا جوش اور ولولہ بخشا۔ ایک ایسے دور میں جبکہ مسلمان بڑی زبردست کشمکش سے دو چار تھے اُن کے لئے ایسے ڈراموں کی اہمیت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تاریخی ڈراموں کے ذریعے اُنھوں نے ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کیا۔

شہادت حسین کے مشہور ڈرامے یہ ہیں "مستدرموبا"، "ادھی جن" اور سلطان شجاع۔

بچوں کے لئے بھی شہادت حسین نے نظمیں، قصّے اور ڈرامے لکھے ہیں اُن میں ذکر کے قابل "چھیلے دیر گو لیو"، "بوہی کا جیرن"، زیب النساء اور گلبدن وغیرہ ہیں۔

ذیل میں شہادت حسین کی مشہور نظم شاہجہاں کے دو بند کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

"مجھے معلوم ہے کہ آنے والی نسلیں محبّت کی اس مقدس یادگار میں اپنی عقیدت کے آنسوؤں کا تحفہ پیش کریں گی۔ یہ عمارت صرف تمھاری ماں کی یادگار نہیں ہے بلکہ ان تمام محبّت کرنے والوں کی یادگار ہے جو گزر چکے ہیں یا آنے والے ہیں۔ تمام چاہنے والوں کی یادیں میرے دل کی آوازوں میں اپنا نغمہ پائیں گے، محبّت کی یہ زندہ یادگار وہ ہے اے جہاں آرا، یہ مرمر کے پتھر میں ترشی ہوئی ایک نظم ہے، آنسوؤں کا تحفہ ہے ایک انمٹ کہانی" ایک اور جگہ شاہجہاں اپنی بیٹی جہاں آرا سے اس کی ماں کا ذکر کرتا ہے۔

ان شعروں کا ترجمہ سُنئے:۔

سُنو! میں نے ابھی ابھی اسے خواب میں دیکھا ہے تمھاری ماں ایک تخت پر بیٹھی آسمان سے اُتری جس میں ہیرے جڑے تھے، اس کے ہونٹ لاکھے سے چمک رہے تھے، اُس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا، اُس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح چمک رہی تھیں اور ایک دوسری پُرسکوت دنیا کے خوابوں سے مخمور۔

بنگالی زبان کے اس مشہور شاعر اور مایۂ ناز شاعر نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو کلکتہ میں غریب الوطنی کی حالت میں وفات پائی۔

۱۹۴۷ء میں وہ کلکتہ سے مہاجرین بنکر ڈھاکہ آکر ریڈیو میں ملازم ہوگئے تھے اور پاکستانی شہریت اختیار کر لی تھی وہ دسمبر میں اپنے بعض دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ افسوس کہ کلکتہ کا سفر ان کا سفر آخر ثابت ہوا۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے کہ آہستہ آہستہ بنگالی ادب کے پرستار اتنے بڑے شاعر اور ادیب کو بھولتے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ چھوٹے چھوٹے ادیبوں اور شاعروں کو اُچھالا جا رہا ہے۔ ایسے وقت میں ایک بڑے شاعر اور ادیب سے بے اعتنائی بڑی عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس وقت شہادت حسین سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے مگر وہ دن دور نہیں جب لوگ شہادت حسین کی قدر پہچانیں گے۔

وحید قیصر ندوی

قاضی نذر السلام

دکھی میاں نام تو کچھ عجیب سا ضرور ہے مگر یہ بنگال کا آتش نوا باغی نذر السلام کا گھریلو نام ہے۔ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے چار بھائی مر چکے تھے۔ اسی لئے ماں نے دیہاتی رسم و رواج کے تحت ان کو نظر بد سے بچانے کے لئے ان کا نام دکھی میاں رکھا تھا۔

دکھی میاں آج سے ساٹھ سال پہلے مغربی بنگال کے ضلع آسن سول کے ایک گاؤں چورولیا میں ۲۳ مئی ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔

۸ برس کی عمر میں ان کو گاؤں کے مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ دو ہی برس کے بعد یہ اپنے ساتھیوں کے استاد بن گئے۔ ان کا یہ تعلیمی سلسلہ تقریباً دس برس تک چلا چونکہ والدین غریب تھے اس لئے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا دس برس کی عمر ہی سے ان کو فکر معاش سے واسطہ پڑا۔ چنانچہ اپنے ہی گاؤں کے ایک مکتب میں ملاجی بن گئے۔

شعر و نغمہ کا شوق بچپنے سے تھا گلا بہت اچھا پایا تھا اس لئے دیہاتی شاعروں اور ان شاعروں کا کلام بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ جو چھوٹی چھوٹی کتابوں کو گاؤں میں گا گا کر بیچا کرتے تھے۔

ایک سال تک ملاگیری کرتے رہے اس کے بعد اس کام سے جی اچاٹ ہو گیا تو چپکے سے دیہات سے آسن سول شہر چلے آئے۔ یہاں ایک نانبائی کے ہاں پانچ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے یہاں انہیں دوکان پر روٹیاں بیچنے کے علاوہ بازاروں میں گھوم پھر کر بھی روٹیاں فروخت کرنی پڑتی تھیں۔

مشرقی پاکستان کے مردم خیز ضلع میمن سنگھ کا ایک داروغہ اتفاقاً ایک دن ان کی دوکان پر آنکلا وہ دکھی میاں کی ذہانت و ذکاوت سے بہت متاثر ہوا اور انہیں اپنے ساتھ میمن سنگھ لے آیا اور انہیں اسکول میں داخل کر دیا ابھی یہ دسویں جماعت ہی میں تھے کہ ایک دن میمن سنگھ میں ان کی ملاقات فوج بھرتی کرنیوالی ایک جماعت سے ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر چپکے سے اسکول سے بھاگ کر انچاسویں بنگال رجمنٹ میں بھرتی ہو گئے۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے جب پہلی جنگ عظیم بڑے زوروں پر تھی۔ دکھی میاں یا قاضی نذر السلام کی عمر اس وقت مشکل سے سترہ برس تھی۔

ان کے میمن سنگھ کے ساتھیوں نے ان کی بڑی کمی محسوس کی کیونکہ اسکول میں وہ اپنے ساتھیوں کو ہر روز اپنی شاعری سنایا کرتے تھے اور ڈرامے اور قصے کہانیاں لکھ لکھ کر ان سے داد حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کے استاد اور ان کے دوست ان کی ڈرامہ نگاری، شاعری اور ادبی صلاحیتوں کا لوہا ماننے لگے تھے۔ ان کے اسکول میں یا ان کے شہر میں اس قسم کا ذہین اور تیز لڑکا اب تک داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ اسکول سے بھاگ جانے پر ان کے دوستوں اور ان کے استادوں نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک جوہر قابل جنگ کے میدان میں کسی نامعلوم مقام مارا جائے گا اور بنگلہ زبان ایک اچھے شاعر، اچھے ڈرامہ نگار اور ایک اچھے فنکار سے محروم ہو جائے گی، نذر السلام کو خود اس کا احساس تھا، چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مجھے کائنات نے اپنے مطالعے کے لیے مدرسے کی محدود فضا سے باہر بلا لیا۔ مجھے ابتدائی عمر میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ زمین ایک پنجرہ ہے جس میں ایک پرندہ کی طرح قید ہوں۔

انچاسویں رجمنٹ کراچی پہنچی، قاضی نذر السلام بھی اس رجمنٹ کے ساتھ تھے۔ یہ رجمنٹ مشرق وسطےٰ بھیجی جا رہی تھی انہیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ بہت جلد فلسطین، بغداد، شام اور دوسرے اسلامی ممالک کی سیاحت کر سکیں گے، اسلامی دنیا کی سیر و سیاحت کا شوق ہی تھا جو انہیں نغموں کے دیس میمن سنگھ سے میدان جنگ تک لے آیا تھا۔

ان کی رجمنٹ کا پڑاؤ کراچی میں اپنی سینیا لائن میں ہوا۔ یہاں سے ان کی رجمنٹ کوئٹہ گئی۔ کوئٹہ میں ان کی رجمنٹ کا قیام کافی دنوں تک

رہا۔ یہ جہاں بھی رہے اپنی نظموں سے اپنے ساتھیوں کا دل بہلاتے رہے ان کی رجمنٹ میں کوئی سپاہی اتنا مقبول نہیں تھا جتنے یہ تھے ان کی مقبولیت کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ بنگال کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی نقل میں انھوں نے بھی اپنے سر کے بال بڑھا رکھے تھے۔

اسی زمانہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری سے متاثر ہونے والے عام طور پر رابندر ناتھ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے سر کے بالوں کو تراشنا پسند نہیں کرتے تھے قاضی نذر الاسلام اپنی نوجوانی کے زمانے میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری سے بے حد متاثر تھے اسی لئے وہ ان کی ہر ممکن نقل کرنے ہی کو اپنی بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے سر کے بال بھی ان کی رابندر ناتھ ٹھاکر سے عقیدت کا ایک ہلکا سا اظہار تھا۔

فوجی آئین کے مطابق کوئی سپاہی بال نہیں رکھ سکتا تھا لیکن انچاسویں بنگال رجمنٹ کے تمام سپاہیوں اور افسروں نے انکی پرزور سفارش کی چنانچہ انھیں بال نہ منڈوانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

اپنے فرائض کی بجاآوری میں دکھی میاں ثمرے پکے تھے اسی لئے انہیں جلدی حوالدار بنا دیا گیا۔ جنگ کے دوران ان کی ممالک اسلامیہ کی سیر کی تمنا پوری ہو گئی۔ دکھی میاں نے دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے کنارے بیٹھ کر بے شمار نظمیں کہیں ان کی نظم شط العرب کا شہرہ ان کی کلکتہ واپسی سے پہلے ہی پہونچ گیا تھا۔

۱۹۱۹ء میں انچاسویں بنگال رجمنٹ کے ساتھ کراچی واپس آئے رجمنٹ کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ کلکتہ پہونچے، یہاں انھوں نے بنگلہ اخبارات میں "آوارہ گرد کی آپ بیتی" کے عنوان سے متعدد مضامین لکھے اس زمانے میں ان کی مشہور نظم "شط العرب" مکمل طور پر شائع ہوئی" اس نظم نے بنگلہ زبان کی شاعری کو بالکل ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔

قاضی صاحب کی ابتدائی نظموں میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے اس نظم میں انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا ہے کہ وہ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہیں۔ نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

شط العرب

شط العرب! اے شط العرب\
تیرا کنارہ ہر زمانہ میں مقدس رہا ہے۔\
جہاں عرب کے بہادروں نے شہید ہو کر دلیری کے ساتھ اپنا خون\
بہایا۔\
یہاں ترکی فوج لڑ رہی ہے۔\
یونانی، مصری، عربی اور کنعانی بھی۔\
یہاں آزاد بدوؤں کے ننگے سرزمین پر لوٹے ہیں۔\
میں نے یہاں بہادر عورت کی صورت دیکھی ہے۔\
جسکے ہاتھ میں تلوار تھی اور آنکھ میں آنسو۔\
ترت الکمرہ کا لہو بھر کر دجلہ خون کا دریا لایا ہے۔\
اے شط العرب، کہیں دجلہ اپنا خون اگل کر\
دیوانوں کی طرح ناچ رہا ہے۔\
جونی فرات، حسن کا پانی تیز روہے گرج گرج کہتا ہے۔\
میری گستاخی کی سزا لے۔\
شط العرب، اے شط العرب، اے دجلہ اور فرات کو ساتھ لے کر بہنے والے\
شط العرب!\
ہر زمانہ میں تیرا کنارہ مقدس رہا ہے۔

تو نے اپنی سرزمین سمندر کے خون سے لالہ زار بنا کر عراق و عجم کی قسمت\
چمکا دی۔\
یہ وہ ملک ہے جہاں بہادر پیدا ہوتے ہیں اور بہادروں کی موت مر کر\
قابل تعریف ہوتے ہیں۔\
بہادر آدمی ریگستان میں بے دم ہو کر مر جاتا ہے۔\
مگر کسی قانون کی زنجیر نہیں پہنتا۔\
شط العرب، اے شط العرب\
تیرا کنارہ ہر زمانے میں مقدس رہا ہے۔

دشمن کا خون تیری لہروں میں حسد سے چمک رہا ہے۔\
تو دشمن کا سیلا خون پی کر ہر موڑ پر بھنور پیدا کرتا ہے۔\
اے زندہ پہلوان!\
آج تک حضرت علی کی ذوالفقار اور حیدری گرج نے تیرے کنارے کو\
زندہ رکھا ہے۔\
اے شط العرب!\
تیرا کنارا ہر زمانے میں مقدس رہا ہے۔\
تیری پیشانی پر ایک چمک دار نشان ہے۔

بصرہ کے گلاب کی آگ سے
گویا بصرہ کے گلاب کی کلی کے سرخ خون سے تیار کیا ہوا خنجر والے کے
خنجر سے کھجور کی طرح لاکھوں وطن کے جانبازوں کے سر یہاں کٹ کر گرے۔
شط العرب اے شط العرب
تیرا کنارہ ہر زمانے میں مقدس رہا ہے۔

اے عراقی فوج یہ تو ایک کہانی ہے۔
کس کو معلوم تھا کہ ایک بنگالی فوج بھی تجھے دیکھ کر مادر وطن کو یاد کر کے
پکارے گی۔
تیرے دکھ میں گرم آنسو گویا کہ سرخ دودھ بہائے گی تو اوروں کی غلام ہے۔
ایک عقیدت مند بہادر جو اسی غم میں مبتلا ہے، تیرے غم میں دو قطرے
آنسو گرا رہا ہے۔
شہیدوں کے ملک، الوداع!
الوداع، یہ بدنصیب آج سر جھکاتا ہے
شط العرب، اے شط العرب!!
ہر زمانے میں تیرا کنارا مقدس رہا ہے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے اپنی دوسری نظم لکھی لکھی جس نے ادبی اور سیاسی دونوں حلقوں میں کھلبلی اور بے چینی پیدا کر دی۔

ابھی تک بنگلہ شاعری ایک ہلکے سروں میں گنگناتی ہوئی ندی کی طرح تھی لیکن وکھی میاں کی شاعری زلزلہ، طوفان، گھن گرج شیر کی ڈکار اور ہاتھی کی چنگھاڑ اپنے جلوہ میں لئے ہوئی تھی کلکتہ میں یہ مسلمانوں کی ایک انجمن کے دفتر میں مقیم ہوئے تھے اور اس انجمن کے بنگلہ ہفت روزہ مسلم بھارت میں انہوں نے اپنی نظموں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔

قاضی نذر السلام کی مشہور نظم "کمال پاشا" پہلی مرتبہ "مسلم بھارت" ہی میں شائع ہوئی۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "اگنی بینا" یا "آتشین بانسری" میں یہ نظم شامل ہے "کمال پاشا"، اصل میں طویل منظوم ڈرامہ ہے۔ اس نظم میں کثرت سے عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس نظم کا پس منظر قاضی نذر السلام نے یوں بیان کیا ہے۔

"یونانیوں اور ترکوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ یونانی بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان ترکوں کے ہاتھ رہا۔ اگرچہ بہت سے سپاہی شہید ہوئے مگر پھر بھی اپنی کامیابی پر ترک سپاہی بہت خوش ہیں۔ شام نے فتح اپنی مٹھیوں پر لاد کر زخمی سپاہیوں کو خیمہ کی طرف لا رہے ہیں اور اس وقت رجز کے طور پر قدم سے قدم ملا کر لفٹ رائٹ کرتے ہوئے گاتے ہوئے بڑھ رہے ہیں، آج کی جنگ کا ہیرو کمال پاشا ہے۔ سپاہی اسے کندھوں پر بٹھا کر چل رہے ہیں۔

راستے میں ایک جگہ شہیدوں کی لاشیں ملتی ہیں تو مجاہدوں کی زبان پر یہ نغمہ جاری ہو جاتا ہے:۔

دس ہزار نوجوان سپاہی شہید ہوئے مگر ان کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے۔

میدان جنگ کی خندقوں میں لاشیں گل سڑ کر مٹی بن گئیں۔
بہادری کی موت پر ان کی ماؤں بہنوں اور عزیزوں نے مبارک باد دی۔

آہ! ایک سپاہی کا ہمدرد اس دنیا میں کوئی نہیں۔
سپاہی تو نے دیکھا؟
تیری دلہن خون آلود شفق کا جوڑا پہن کر آئی۔
تیرا ٹھکانہ اب قبر کے اندھیارے میں ہے۔
لیکن ان شہیدوں نے موت پر فتح حاصل کر لی ہے
ان کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔

خود زہر کا پیالہ پی کر ان لوگوں نے آب حیات کا پتہ لگایا ہے۔
کون مر گیا ہے؟ کس کے لئے ماتم کرتے ہو۔
جو کچھ بھی ہوا بہت اچھا ہوا۔
یہ سب وطن کی آزادی کے لئے موت سے بغل گیر ہو گئے
یہ شہید ہیں۔ ہاں یہ شہید ہیں۔
انہوں نے اپنی جانیں بہادروں کی طرح دی ہیں۔

کمال پاشا کے بعد انکی دوسری نظم "محرم" ہے، جس نے ان کی شاعری کو مسلمانوں کے لئے باعث فخر بنا دیا اس نظم نے ان کو شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

نیلا سیاہ آسمان، لال لال دنیا۔
اماں! خونی نے تیرے لال کا خون کر دیا۔

ماتم دمشق سے ساری دنیا میں پھیل گیا ہے۔
زین العابدین کو کس نے خونیں لباس پہنا دیا۔
ہائے ہائے حسینا! کی آوازیں گونج رہی ہیں۔
یزید کے ہاتھوں کی تلوار بھی اس گونج سے کانپنے لگی۔
دُلدُل دیوانہ ہو کر مدینے کی گلیوں میں بھاگا پھرتا ہے علی کے فرزند حسین کی تلاش میں۔
فاطمہ آسمانوں پر کھلے بالوں کے ساتھ رو رہی ہیں۔
بیٹوں کی لاشیں اور سفید لباس میں ملبوس بیوہ بہو ان کے ساتھ ہیں۔
قاسم دولہا بننے کے دو گھڑی بعد ہی جنگ کے میدان کی طرف جاتے ہیں۔
مہندی کا رنگ چھٹنے سے پہلے اڑ گیا۔
مشرق اور جنوب کی طرف سے چلنے والی ہوائیں بھی ماتم کناں ہیں۔
سکینہ کے ہاتھوں سے کنگن بھی نکال دیے۔
ریگستان کی گرم لو سے کلیجہ تک بھن رہا ہے۔
کربلا کی زمین آگ بن گئی نہ پانی ہے نہ کھجور۔
ماؤں کا دودھ سوکھ گیا بچے دودھ سے بلکتے ہیں۔
کیا زبان چوس چوس کر بچے جی سکتے ہیں
کربلا کا سورج سروں کو جھلسائے دیتا ہے' بانو روتی ہیں کہ اصغر کو پانی پلاؤ' وہ پیاس سے مرنے کو ہے۔

کئی مرتبہ محرم کا مہینہ آیا اور گذر گیا۔
مگر شہیدوں کے لال لال خون کی یاد مٹ نہ سکی
مسلمانو! تمہارے دن بھی زین العابدین کی طرح واحسینا کرتے گذر ینگے۔
آج پھر محرم کا مہینہ آگیا۔
یہ قربانی چاہتا ہے! ماتم اور آہ وزاری نہیں' قرآن کا حکم ہے! ہاتھ میں عربی تلوار لو۔ دنیا میں مسلمانوں کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا بس ذرا غور سے سنو! کس طرف سے طبل جنگ کی آواز آتی ہے' ہاتھوں میں تلوار لو سروں سے کفن باندھ لو۔ طبل جنگ بج رہا ہے' نقیب نعرہ بلند کرتا ہے۔ ہوشیار! اسلام کا سورج ڈوب رہا ہے۔ مسلمانو! جاگ پڑو! حیدری نعرہ بلند کرو کربلا کے میدان کی طرح پھر سے اس سرزمین کو لال لال کردو بیاہ کا جوڑا پہن لو! اپنی آستینوں کو خون سے رنگ لو میدان جنگ میں جان دینے کا آج ہی دن ہے۔!

حسن کی طرح زہر کا پیالہ پیو۔
حسین کی طرح سینے پر خنجر کے زخم کھاؤ۔
اصغر کی طرح معصوم بچوں کو قربان کردو۔
ظالم سے ظلم کا بدلہ لینے کے لئے آج اپنی جان بھی دے دو۔
اپنی ماں اور بیٹیوں کو سکینہ کی طرح بیوگی کا لباس بھی پہنانا ہوگا۔
قاسم کی طرح ظلم کے خلاف جنگ کرتے ہوئے اپنی جان دیدو۔
دیکھو کربلا کی ریت پر بہا ہوا خون۔
سورج کی تاب سے سوکھ نہ جائے۔

کمال پاشا' قربانی' انور پاشا جیسی انقلابی نظموں نے پورے بنگال میں ایک روح پھونک دی اور اسی زمانہ میں ان کی ایک معرکتہ الآرا نظم ودروہی یا باغی شائع ہوئی جس نے نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان میں تہلکہ مچادیا اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:۔

کہدے اے جواں مرد کہدے کہ میں سربلند ہوں' اتنا بلند کہ ہمالہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے۔

کہدے اے بہادر کہدے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سورج اور ستاروں کو توڑ کر جنت ودوزخ کو ہلاکر اور عرش سے ٹکرا کر میں اس دنیا کے لئے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں۔

کہدے اے نوجوان کہدے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا میں سرکش سنگدل اور آتش زبان ہوں میں قیامت کا ندیم ہوں' طوفان ہوں' تباہی ہوں' دہشت ہوں' میں دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ہوں۔ ہر چیز کو چکنا چور کردیتا ہوں' سدا باری ہوں' اصول شکن ہوں' قانون قاعدوں اور پابندیوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا ہوں' میں بربادی کا دیوتا ہوں۔ موسم ہو یا نہ ہو موسلا دھار برکھا میں دیتا ہوں۔

کہدے اے نوجوان مرد کہدے میں ہمیشہ سربلند رہوں گا' میں باغی ہوں۔ دھرتی کی سرکش اولاد (پیام شباب)

قاضی نذرالاسلام اسی نظم میں آگے چل کر کہتے ہیں:۔

میری مٹھی میں چاند ہے اور پیشانی پر سورج چمکتا ہے ایک ہاتھ میں سریلی بانسری ہے اور دوسرے میں لڑائی کا بگل' میں وہ بہادر ہوں

جس نے سمندر کو کھنگال کر زہر ہلاہل نکالا اور اسے خود ہی پی لیا میں وہ مہا دیو ہوں جس نے گنگا کو اپنی زلفوں میں قید کر رکھا ہے۔ اپنی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔

میں کوندے کی لپک اور بجلی کی چمک ہوں۔ میں صور اسرافیل کی صدائے بازگشت ہوں قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبرئیل کا لکھا ہوں۔
کسی غم رسیدہ کا دل بے قرار ہوں۔
کسی بیوہ کے دل کی آہ ہوں۔

پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں کسی چنچل چت چور کا عشق ہوں اور اسکی چوڑی کی میٹھی جھنکار ہوں۔
کہدے اے نوجوان مرد کہدے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔ (پیام شباب)

اپنی اس معرکۃ الآرا طویل نظم کے آخر میں قاضی صاحب کہتے ہیں ــــ میں نے خود کو پہچان لیا ہے میرے سب بندھن کھل گئے ہیں پرشورام کی سنگدل کلہاڑی ہوں۔ دنیا کو خونریزیوں سے پاک کردوں گا۔ یہاں میں ہی امن و امان قائم کردوں گا۔ میں تحت الثری کا بے رونس ہوں جہاں آگ شور و غوغا مچاتی ہوئی دہاڑا کرتی ہے۔

میں بگلی پر بیٹھا کلبلیں کرتا ہوا کبھی یہاں اور کبھی وہاں دوڑا پھرتا ہوں میں زلزلہ پیدا کر کے دنیا کو لرزہ براندام کر دیتا ہوں۔ کنس کی کلغی اور جبرئیل کے نورانی عصا کو میں نے چھین لیا ہے میں مضطرب ہوں گستاخ ہوں، مادر عالم کا آنچل اپنے دانتوں سے تار تار کر ڈالتا ہوں۔ میں شیام کے ہاتھوں کی بنسری ہوں۔ میری جادو بھری تان سے متوالا ہو کر سمندر گرج گرج کر آتا ہے اور سہمی ہوئی دنیا کو بوسہ دیکر رلا دیتا ہے۔ جب میں بگڑ اٹھتا ہوں تو آسمان کو ہلا دیتا ہوں، دوزخ بھی تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔ میں ساون کے مہینے کی امڈتی ہوئی ندی ہوں۔ کبھی زمین کو شاداب کر دیتا ہوں تو کبھی برباد۔ شہاب ثاقب ہوں۔ مریخ ہوں، دم دار ستارہ ہوں، زہریلے سانپ کا پھن ہوں۔

کہدے! اے جواں مرد کہدے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔ میں باغیوں کا سردار ہوں۔ خونخواری سے میرا جی بھر گیا ہے میں اس دن سے مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ پہنچ جائے گی۔ جب میدان جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے، یہ باغی جو جنگ و جدل سے نالاں ہو اس روز خاموش ہوگا، میں وہ باغی بھرگو ہوں جس نے بھگوان کے سینے پر اپنا نقش قدم ثبت کر دیا تھا۔ جو خیالی قسمت سارے ظلم کی جڑ ہے، اسکی بوند بوند پی جاؤں گا میں وہ باغی ہوں جو قسمت کے طلسم کو توڑ سکتا ہوں، میں ابدی ازلی اور غیر فانی باغی ہوں دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر کھڑا ہوا ہوں۔ کہدے اے جواں مرد کہدے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔ (پیام شباب)

مشرق وسطیٰ میں جنگ کی ہلاکت خیزیاں توپوں کی گھن گرج بموں کا شور اور مرنے اور مارنے والوں کی چیخ پکار دکھی میاں نے اپنے کانوں سے سنی اور یہ سارے دہشت ناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کی نظم ودروہی یا باغی میں اسی پس منظر کا بھرپور عکس ہے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء تک ان کی زندگی سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے دوچار رہی۔ انہوں نے بدحالی، مفلسی، تنگدستی، فقر و فاقہ، مایوسی، انتشار اور احساس شکست خوردگی کو آزادی کا اصل دشمن قرار دیا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں یہ پیغام دیا کہ اگر ہم اپنے دشمنوں کو زیر کریں گے تو پھر انگریز ایک دن بھی ہندوستان میں راج نہیں کر سکتا ہے۔

اسی زمانہ میں ان کی دوستی شیر بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق سے ہوگئی۔ انہوں نے دکھی میاں کو اپنے اخبار نوا جگ یا نیا زمانہ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔ اسی اخبار کے دفتر میں ان کا قیام بھی ہوگیا۔ اس وقت ان کی شہرت نصف النہار پر پہنچ چکی تھی۔ اب لوگ ان کا اصل نام دکھی میاں بھول گئے اور اب نذر السلام یا نذرل کے نام سے پکارے جانے لگے تھے۔

نظم کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کا بھی بڑا شہرہ ہوا۔ انہوں نے ایک دن اپنے اخبار میں انگریزوں کے بارے میں یہ سرخی جمائی تھی، "کہ یا تو تم ہمارے ملک کو خود چھوڑ دو گے ورنہ ہم خود تمہیں سمندر میں دھکیل دیں گے" ان کی اس سرخی نے پورے ملک میں ہلچل ڈالدی اس قسم کی باغیانہ سرخی جمانے کی جو سزا ہو سکتی ہے وہ انہیں ملی یعنی انہیں اخبار کی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

۱۹۲۲ء میں انہوں نے کلکتہ سے ایک بنگالی ہفتہ وار "دھومکیتو" یعنی دم دار ستارہ نکالا اس میں انہوں نے اپنی نظمیں چھاپنی شروع کیں اور انگریزوں کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس اخبار کو حکومت نے ضبط کر لیا اور انہیں ایک سال قید با مشقت کی سزا دیدی گئی۔ جیل خانے پہنچکر بھی یہ چین سے نہ بیٹھے وہاں بھی اپنے باغیانہ خیالات کا پرچار شروع کر دیا وہاں وہ باغیانہ نظمیں لکھ لکھ کر قیدیوں کو سناتے اور انہیں بغاوت پر اکساتے جیل کے افسر سخت پریشان تھے وہ انہیں سزاؤں پر سزائیں دیتے مگر وہ

اپنے خیالات سے بالکل باز نہ آئے۔ افسروں کی سختیاں بھی بڑھتی گئیں اور ان کی نظموں میں بھی تیزی آتی گئی۔ آخرکار جیل خانے کے افسران کی سختیوں اور ظلم سے تنگ آکر انہوں نے بھوک ہڑتال کردی جس پر ملک میں بہت ہنگامہ ہوا۔ آخر ملک بھر کی درخواست پر انہوں نے اپنی بھوک ہڑتال ختم کردی اس وقت ان کی شاعری کی شہرت بنگال کے کونے کونے میں پہونچ چکی تھی بنگال کا ہر شاعر قاضی نذرالسلام کی نقل کرنے کو اپنی شاعری کی معراج سمجھنے لگا تھا حد یہ کو بین الاقوامی شہرت کے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے مشہور ڈرامے بسنت یعنی بہار کو بڑے فخر کے ساتھ قاضی نذرالسلام کے نام سے معنون کیا قید و بند کے زمانے میں انہوں نے ایک نظم "ٹوٹی ہوئی بیڑیوں کا گیت" ان کی یہ نظم جیل کی چہاردیواری سے باہر آکر ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی اس نظم میں ایک جگہ قاضی نذرالسلام کہتے ہیں

جیل کے آہنی دروازوں کو توڑ دو۔ توڑ دو۔ لوٹ لو۔
ظالموں کی پرستش گاہ میں ہر طرف خون جما ہوا ہے۔
میرے طوفانی نوجوانو! تباہی کا بگل بجا دو۔
جیل خانوں کی دیواریں توڑ کر تباہی کا پرچم لہرا دو۔

———

اے بے ہوش دیوانے! بربادی کے جھولے کو اور پینگ دے۔
آہنی سلاخوں کو پوری قوت سے جھٹکا دیکر پینگ بڑھا۔
لاٹھی سے مار کر تالا توڑ دے۔
جیل خانوں کو آگ لگا دو۔ آگ لگا دو۔ انہیں بنیاد سے اکھیڑ دو۔

———

بیساکھ کا خوفناک طوفان ناچ رہا ہے
تمہیں اس طوفان کے سامنے ڈٹ جانا ہوگا۔
جاؤ میں تمہیں جیل خانوں کی بنیادیں اکھیڑتے دیکھوں گا۔
نعرہ بلند کرو! حیدری نعرہ! اٹھا لو اپنے شانوں طبل جنگ
بلاؤ! بلاؤ۔ موت کو بلاؤ۔ زندگی پانے۔

———

جیل سے باہر آنے کے بعد نذرالسلام نے اور زیادہ باغیانہ اور آتشیں نظمیں لکھیں جس نے ملک کے گوشے گوشے میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی اس وقت تک ان کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ جن میں اگنی بینا یعنی رباب آتشیں، سندھو ہنڈول (طوفانی سمندر) خنجر (زنجیر) شاربوہار (مفلس)

ملیہ بانشی (زہریلی بانسری) حونی تانوشا (خار دار بیل) بہت مشہور ہیں اس زمانے میں ان کی طویل بے کاری نے انہیں کافی پریشان کر رکھا تھا بیکاری بڑھتے بڑھتے فقر و فاقہ تک پہونچ گئی اسی زمانہ میں انہوں نے بھوک اور افلاس پر متعدد نظمیں لکھیں۔ اپنی افلاس میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:۔

افلاس میرے آئین میں صرف ایک سزا ہے تباہی اور بس تہذیب و تمدن کو پیروں تلے روندتا ہے، شرم و حیا کے نام سے بھی تو واقف نہیں نفس عریاں تیرا کھڑب شعلہ ہے جو بھی سربلند ہوا تیرے ایک اشارے پر فنا ہوگیا بت سے دیوانے تیرا ارشاد بجالا کر ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں، بھوک کے ایندھن سے موت کی آگ کو سلگا کر تو کتنا مسرور ہوتا ہے دولت کی دیوی کے تاج کو کس بے باکی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ ہر ادا من کوئی زمین کے آنچل سے باندھ رہا ہے شاید یہ میری ننھی بچی ہے میری لخت جگر آہ میری بچی جاگ اٹھی اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے، اسے دودھ کی دو بوند بھی نہیں دے سکتا، مجھے خوش ہونے کا کیا حق ہے۔ گویا غربت اسی بچی کی صورت میں میرے گھر میں پیدا ہوئی ہے اور مجھے افلاس کا نوحہ سنانے پر مجبور کر رہی ہے

میرے نصیب میں نہ حسن و عشق ہے اور نہ مے و ساغر مجھے پینے کو زہر ملتا ہے اور کھانے کو غم و یاس۔ آج تک تنہائی درد بھرے سر دل میں گایا کرتی ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ (پیام شباب)

۱۹۲۴ء میں دکھی میاں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کرلی۔ جس کے بعد انہیں بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ایک بڑے قدر دان آنجہانی سی آر داس کا انتقال ہوگیا، کافی تنگ دو کے بعد انہوں نے روزی کا ایک ذریعہ نکال ہی لیا۔ یعنی انہوں نے ایک گراموفون کمپنی میں نوکری کرلی اس کمپنی کے لئے گانے لکھتے اور خود ہی دھنیں تیار کرتے پھر کسی اچھے فنکار کو مشق کرانے اور اپنی ہی نگرانی میں ریکارڈ تیار کراتے۔

اس ملازمت کا سلسلہ بہت دنوں تک رہا، جس سے ان کو بفراغت روٹی مل جایا کرتی تھی، ان کے تقریباً تین ہزار گیتوں اور غزلوں کے ریکارڈ بھرے جا چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کا کوئی بھی شاعر اس معاملہ میں قاضی نذرالسلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ (میزان الرحمٰن)

قاضی نذرالسلام پہلے بنگالی شاعر ہیں جنھوں نے عربی اور فارسی قافیوں کے الفاظ زیادتی سے استعمال کئے اور بعض نظموں میں تو شروع سے آخر تک عربی اور فارسی قافیوں کی پابندی برتی ہے بقول وفا راشدی مصنف "بنگال میں اردو ادب" نذرالسلام بنگالی ادب کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے

اردو فارسی کی طرح بنگالی زبان میں صنف غزل گوئی کی طرح ڈالی۔ ان کی شاعری اُردو فارسی کی حسین و دلکش ترکیبوں اور استعاروں سے مالا مال ہے۔ آج جن بنگالی زبان کے شعراء کے کلام میں اُردو فارسی کے الفاظ اور غزلوں کا سرمایہ ملتا ہے یہ محض نذرالسلام کی اردو نوازی کی مرہون منت ہے۔ نذرالسلام نے عم پارہ کا بنگلہ نظم میں مکمل ترجمہ کیا۔ ان کی ساری تصانیف پڑھ جائیے اور دیکھئے کہ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش جاری رکھی کہ بنگالی سے سنسکرت کے ثقیل اور نامانوس الفاظ ترک کر کے عام فہم اور آسان استعمال کیے جائیں اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں عجیب کھلبلی مچ گئی تھی۔ اخبارات و رسائل ان کے خلاف مضامین شائع کرنے لگے کہ نذرالسلام اُردو فارسی الفاظ کے بے جا استعمال سے بنگالی زبان کو مٹانا چاہتا ہے لیکن مخالفت جوں جوں بڑھتی گئی بنگالی ادب میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ نذرالسلام کی بیشتر نظمیں یا گیت ایسے ہیں جن کا پورا پورا شعر اردو اور فارسی سے بھرا پڑا ہے جیسے مطالعہ سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہیں نہ صرف اُردو شاعری بلکہ اس کے ردیف قافیہ اور عروض و دیگر اصول پر بھی مکمل طور حاصل ہے مثال کے طور پر ان کے ایک بنگالی گیت کے دو بند پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنگالی زبان کا یہ آتش نوا شاعر اردو ہندی اور فارسی زبانوں پر بھی کس قدر حاوی ہے:۔ واضح رہے کہ یہ گیت کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ بنگالی رسم الخط سے اردو حروف میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

نرگس باگ میں + بہار کی آگ میں
(باغ) + آؤ آؤ پیارے

بھرے دل داگ میں + کہاں میرے پیارے
(داغ)
درد دل زور + رنگیلا کوثور
(کوثر)

شرابا طہورا، لاؤ ساقی بھر پیالہ تو بھر دے
مستانہ کر دے، آؤ آؤ پیارے، آؤ آؤ پیارے

(بنگالی میں اردو)

حافظ شیرازی کی منتخب غزلوں کا ترجمہ کر کے نذرالسلام نے اپنے اہتمام سے شائع کرایا تھا۔ اس کے علاوہ عمر خیام کی کئی رباعیوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

نذرالسلام نے پہلے پہل بنگلہ میں اردو فارسی اور عربی کے الفاظ خوبی اور سلیقہ سے استعمال کئے اور آج خدا، آسمان، عرش، زنجیر، ساقی، کمال، تلوار، طمانچہ، قلعہ، نشان، گل و بلبل جیسے الفاظ اور اصطلاحیں بنگلہ ادب میں نامانوس نہیں ہیں۔ قاضی نذرالسلام نے کثرت سے ادبی سیاسی علمی اور تاریخی مضامین لکھے ہیں، ناول ڈرامے اور افسانوں کی متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں، ناولوں میں پہلا ناول "باندھن ہارا" (بندھنوں سے آزاد) اور دوسرا ناول "مرتوکھودا" (موت کی بھوک) اور تیسرا ناول "کوہے سیکا" (کہاسہ یا کہر) کافی مشہور ہیں پہلا ناول ۱۹۲۰ء میں اور دوسرا اور تیسرا ناول علی الترتیب ۲۷ء اور ۲۹ء میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے ان کے افسانوں کے تین مجموعے ببھاردان (تحفہ غم) سیونی مالا (سنگھار کی مالا) اور رکتیر بیدن (مفلس کا درد) اب تک چھپ چکے ہیں۔

اگرچہ قاضی نذرالسلام کی شاعری سراپا آگ، خون، طوفان، بغاوت، ہنگامہ، اور آتش فشاں پہاڑ ہے لیکن اس کے ساتھ ان کی شاعری کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کا تعلق دل کی دھڑکنوں سے ہے۔ اس نے شاعر شباب کی حیثیت سے بھی جو کچھ کہا ہے اسکی مثال بنگلا زبان کا کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکتا اگر رابندر ناتھ ٹیگور کا بنگلا شاعری میں ایک خاص مقام ہے لیکن بہت سی صنف سخن میں تو رابندر ناتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قاضی نذرالسلام نے بنگلا شاعری میں اُردو فارسی غزلوں کا انداز داخل کر کے اپنے لئے ایک جگہ بنائی ہے۔ عشق و سرمستی کی شاعری کے لئے انہوں نے اُردو اور فارسی کی غزلوں کا طرز اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔

میں قاضی نذرالسلام اور رابندر ناتھ ٹیگور کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا مگر یہاں پر ایک بات بیان کرنا ضروری ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کا تعلق آسمانوں سے ہے اور نذرالسلام زمین کا شاعر ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے ماحول ہی سے متاثر ہوتا ہے۔ زیادہ اونچا اڑ کر وہ زندگی کی مسرتوں کو محض خیالی پیکر نہیں بنانا چاہتا۔

اس کا محبوب اسی دنیا کا جیتا جاگتا پیکر ہے۔ اسکی عشقیہ شاعری کا انداز سمجھنے کے لئے ذیل میں اسکی ایک مشہور نظم "ناری" یعنی عورت کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ناری

مرد اور عورت میری نظر میں برابر ہیں
دنیا میں جو کچھ بھی مقدس، مفید اور کار آمد ہے۔
وہ نصف عورت اور نصف مرد کی بدولت ہے۔
دکھ درد مصیبت گناہ اور آنسو . . . دنیا کا یہ سرمایہ نصف مرد اور نصف عورت کا لایا ہوا ہے۔
اے عورت بھلا تجھے دوزخ کہہ کر، تجھ سے کون نفرت کرتا ہے۔

اسے جواب دے کہ گناہ کی بنیاد عورت نہیں بلکہ ابلیس ہے، جو مرد ہے۔
دنیا میں جتنے پھول کھل رہے ہیں، جتنے میوے پھل رہے ہیں۔
عورت ہی نے انہیں روپ رنگ، نکہت اور شیرینی بخشی۔
تاج محل کے پتھروں کو تو تم نے دیکھا ہے مگر اسکی روح کو بھی کبھی دیکھنے کی کوشش کی ہے؟
اندر ممتاز محو خواب ہے، اور باہر شاہجہاں سراپا انتظار ہے
مرد سورج کی کڑی دھوپ کی تپش لے کر آیا۔
عورت سکوت نیم شبی اور نسیم صبح گاہی لے کر آئی۔
دن کو محنت اور امید بنی اور رات کو دلہن سجی۔
مرد صحرا کی پیاس لیکر آیا اور عورت نے شہد کا انتظام کیا۔
مرد نے چٹیل میدانوں کو اپنی طاقت اور محنت سے مسطح کیا
عورت نے سرسوں بو کر انہیں سرسبز و شاداب بنایا۔
مرد نے ہل چلایا، عورت نے آبپاشی کی
مٹی اور پانی نے مل کر پودوں کو اگایا اور دھان کی سیس نے سنہرا روپ لیا۔
عورت کی جدائی، عورت کے وصال میں مرد نے شاعر کا دل پایا۔
اسکی باتیں شاعری بنیں اور اس کے الفاظ گیت بنے۔
مرد دیوتا ہے۔ باپ کے حکم پر بیٹا ماں کو قتل کر رہا ہے۔
اب وہ زمانہ گیا، جس میں مرد آزاد تھے اور عورتیں لونڈیاں۔ موجودہ دور ہمدردی کا دور ہے۔ انسانیت اور آزادی کا دور ہے آج ہر طرف ڈنکے کی آواز گونج رہی ہے، کوئی کسی کی قید میں نہیں رہے گا، اے عورت تجھے سونے اور چاندی کے زیورات کے قیدخانے میں کس نے بند رکھا ہے۔ آج تو اس قدر بزدل ہو گئی ہے کہ پردے کی آڑ سے گفتگو کر رہی ہے۔

تیرے ہاتھ میں کنگن کی ہتھکڑی اور پاؤں میں پازیب کی زنجیر ہے۔ اپنے چہرے کے نقاب کو نوچ کر پھینک دے اسی نے تجھے بزدل بنا دیا، غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈال، لونڈی بننے کی یہ نشانی زیورات، انہیں نوچ کر پھینک دے۔

قید کی دیواریں توڑ کر ناگن کی طرح نکل۔ تاریکی میں تیری ٹوٹی ہوئی، چوڑیاں تجھے راستہ دکھائیں گی۔ جن ہاتھوں سے تو نے اب تک امرت کا جام پلایا ہے آج ان ہی ہاتھوں سے زہر ہلاہل کا گھونٹ پلانا ہوگا۔

(ترجمہ از احسن احمد اشک)

(دور جدید کلکتہ)

لیچو چور

قاضی صاحب نے بچوں کے لئے بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں، بچوں کی ان نظموں میں قاضی صاحب کا انداز بڑا شوخ و شنگ ہے، قاضی صاحب کی بچوں کی نظم پڑھنے کے بعد یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ بدری یعنی باغی، محرم ماری اور شط العرب جیسی آتشیں نظمیں لکھنے والا شاعر اس قدر ہلکی پھلکی اور مزاحیہ نظمیں بھی لکھ سکتا ہے۔ ان کی بچوں کی نظموں میں "کاٹھ بلاری" یعنی گلہری، بلاسی یعنی بلی اور "لیچو چور" یعنی لیچی کا چور بہت مشہور ہیں۔ ذیل میں ان کی نظم "لیچو چور" کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

محلے کے بابو جی کے تالاب کے قریب
بھو کے بلڈاگ نے مجھے خوب دوڑایا
مگر جانتے ہو دوڑایا کیوں؟
بھیا ذرا ٹھہرو تو ابھی سناتا ہوں
تو ہوا یہ کہ تالاب کے پاس لیچی کا جو درخت ہے نا؟
اس کے قریب میں ایک بڑا سا بانس لے کر پہنچا۔
بانس سے لیچی نہ ٹوٹ سکی تو میں آہستہ آہستہ لیچی کے درخت پر چڑھ گیا۔
لیچی توڑنے کے لئے ایک چھوٹی سی ڈالی اپنی طرف کھینچی ڈالی کمزور تھی وہ ٹوٹ گئی۔
اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔
اور جانتے ہو گرا بھی تو کہاں گرا؟
ٹھیک مالی کی گردن پر جو درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔
وہ کم بخت بڑا بدتمیز اور نالائق تھا۔
اس نے مجھے بڑے گھونسے اور چپتیں لگائیں۔
لیکن میں کسی نہ کسی طرح سے اس کے شکنجے سے نکل ہی آیا۔
تیزی سے دیوار پھاند کر دوسری طرف آ گیا
لیکن دیوار کے پاس ایک شیر کھڑا ہوا تھا۔
ارے بھئی وہ شیر نہیں بلکہ بابو جی کا بلڈاگ تھا۔
اسے دیکھتے ہی تو میرے ہوش اڑ گئے
بلڈاگ مجھے دوڑانے لگا۔
میں ڈرا کہ آج یہ کتا میرا خاتمہ کر دے گا۔
میں باپ رے باپ کرتا ہوا ایک نالی میں گھس گیا۔
تب کہیں میری جان میں جان آئی
بھیا اب کبھی لیچی چرانے نہیں جاؤں گا۔
میں اب کان پکڑتا ہوں
اب ایسا کروں تو میرا نام بدل دینا

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر)


بہترین تعمیر کے لئے
بہترین فولاد
• راؤنڈ بارز
(سیدھے اور موڑے ہوئے)
• اینگلز
• چینلز
• جوائسٹس
• ٹیز
• فلیٹس
• اسکوائرز
• بیلنگ ہوپس
(ہاٹ اینڈ کولڈ رولڈ)
• گیلونائیزوائر
• بلیک وائر انیلڈ
• ہارڈڈران برائٹ اسٹیل
نیل وائر
• خاردار تار
STEEL SALES LTD
STEEL CORPORATION OF PAKISTAN LTD
اسٹیل سیلز لمیٹڈ
جوبلی انشورنس ہاؤس
میکلوڈ روڈ - کراچی
فون :- ۸/۳۱۶۴۱
زرین پیلیس، بینک اسکوائر
مال روڈ — لاہور
فون :- ۲۸۷۷
واحد تقسیم کنندگان برائے
اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ
SSP—۸

وحید قیصر ندوی

بیگم صوفیہ کمال

بنگالی زبان و ادب کی خدمت میں مسلمان عورتوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش زبان و ادب کی خدمت کرتی رہی ہیں۔ ابتدائی دور میں اگرچہ خواتین کی تعداد کم نظر آتی ہے لیکن بعد میں بہت سی ایسی خواتین کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں اور ادبی و سماجی کوششوں سے بنگلہ زبان و ادب میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان خواتین میں سے ایک صوفیہ کمال بھی ہیں۔

بیگم صوفیہ کمال ۲۰ جون ۱۹۰۷ء میں باریسال کے ایک گاؤں شائستہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ یہ علاقہ بنگال کے نامور گورنر شائستہ خان کا بسایا ہوا تھا۔ بیگم صوفیہ کمال کے نانا نواب معظم شائستہ آباد کے تعلقدار تھے۔ بیگم صوفیہ کمال کے والد کا نام سید عبدالباری تھا۔ یہ اپنے وقت کے بڑے نامور وکیل تھے۔ کومیلا ٹپرہ، میمن سنگھ، باقر گنج اور ڈھاکہ میں یہ اپنی وکالت کے سلسلہ میں دورے کیا کرتے تھے۔

بیگم صوفیہ کمال کے والد سیلاڈو ضلع کومیلا کے رہنے والے تھے لیکن اپنی سسرال ہی میں بس گئے تھے۔ صوفیہ ابھی بچی ہی تھی کہ اُن کے والد کو اچانک درویشی سے دلچسپی پیدا ہو گئی چنانچہ ایک دن بغیر گھر میں کسی کو بتائے وکیل صاحب خدا جانے کہاں غائب ہو گئے۔ آج تک ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ مولوی عبدالباری آٹھ زبانوں کے ماہر تھے۔ ان زبانوں میں ہر زبان پر اُن کو ماہرانہ قدرت تھی۔ اُن کے گھر میں بنگالی زبان کا رواج بہت کم تھا۔ بیگم صوفیہ کمال کے گھر والوں کی اور خود ان کی مادری زبان اُردو تھی۔ ابتدا میں شریف گھرانوں کے اصول کے مطابق ان کو اُردو فارسی کی تعلیم دی گئی۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو صرف قرآن شریف، اردو فارسی کی بعض ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں چنانچہ انہیں بھی خاندانی دستور کے مطابق قرآن پاک اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھائی گئیں اگرچہ وہ اور زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں مگر وہ اپنے خاندانی رسم و رواج سے مجبور تھیں۔ نو برس کی عمر سے اُن کو پردے میں بٹھا دیا گیا۔ اگرچہ وہ خود پردے کی قائل نہیں تھیں مگر خاندانی رواج سے مجبور تھیں۔

ان کا گاؤں شائستہ آباد اصل میں ایک چار جزیرہ تھا "چار" اس زمین کو کہتے ہیں جو دریا کے رُخ بدل دینے سے اچانک دریا سے اُوپر کو ابھر آتی ہے۔ ایسی زمین نہایت اچھی اور پر فضا ہوتی ہے۔ اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ اصل میں "چار" چھوٹا سا جزیرہ ہوتا ہے۔ شائستہ آباد کو نواب معظم حسین نے بڑی خوبصورتی سے آباد کیا تھا۔ ان کو کشتی رانی کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ وہ بڑی بڑی کشتیوں میں اکثر گھر کے بچے اور بچیوں کو لے کر دور دور تک دریا کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ بیگم صوفیہ کمال بھی اپنے نانا کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ان کی اور ان کے بھائی نوابزادہ ولی الاسلام کی بڑی خاطر مدارات ہوا کرتی تھی۔ دریا کی سیر کے وقت ان کے کانوں کو مانجھیوں کے گانے بڑے اچھے لگتے جاری گان ساری گان، بھٹیالی اور بھویا جیسے نغمے ان کو بیخود بنا دیتے۔ اگرچہ وہ ان گانوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھیں لیکن مانجھیوں کے نغمے ان کے دل میں انجانا سا درد پیدا کر دیتے تھے۔

ابھی تک ان کو بنگلہ زبان سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ اپنے

آس پاس لے کر چلا کرتے تھے لوٹی پھوٹی بنگلہ میں بات کر لیں لیکن اس زمانے میں ان کی والدہ کو بنگالی زبان کی پوتھیاں سن سن کر اس کا شوق ہوا کہ وہ اپنی بچی کو بنگلہ پڑھائیں چنانچہ صوفیہ کو پڑھانے کے لئے بنگلہ استاد ملازم رکھے گئے۔

صوفیہ کی والدہ نواب معظم حسین کے خاندان کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے باضابطہ بنگلہ زبان سیکھی تھی۔ والدہ کے شوق دلانے پر انھوں نے بنگلہ پڑھنا شروع کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے کافی بنگلہ پڑھ لی۔ پڑھتے پڑھتے ان کو لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ایک کہانی لکھی جسے باریسال سے نکلنے والے ایک ماہانہ رسالے "ترون" میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر تیو کما ردت تھے۔ بیگم صوفیہ کمال کی کہانی کا عنوان تھا "سینک بدھو" یعنی سپاہی کی بیوی۔ "ترون" کے ایڈیٹر کو یہ کہانی بہت پسند آئی اور انھوں نے اسے چھاپ دیا۔ اس کے بعد تو بیگم صوفیہ کمال نے باضابطہ کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اپنے خاندان میں یہ پہلی خاتون تھیں جن کا افسانہ رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اُن کے خاندان کے بزرگوں نے ان کی اس جرأت پر ان کی سخت سرزنش کی مگر ان کی والدہ، بڑے بھائی اور ان کے نانا ان کی طرف سے خاندان والوں کے اعتراضات کے لئے ڈھال بن گئے۔

اس وقت ان کی عمر مشکل سے بارہ برس کی تھی، چونکہ اُن کے والد کا کوئی پتہ نہ تھا اس لئے ان کے نانا نے بہت ہی کم عمری میں یعنی صرف بارہ برس کی عمر میں اپنے ہی خاندان کے ایک رئیس زادے سید نہال الدین سے اُن کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد نہال الدین انھیں ڈھاکہ لے آئے، ان کے شوہر نے ان کے تعلیمی شوق کو بہت سراہا اور ان کو برابر لکھنے پڑھنے پر اُکساتے رہے۔ شادی کے بعد انھوں نے شاعری کی طرف توجہ بھی دی۔ اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد انھوں نے بجائے نثر نگاری کے نظم نگاری کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دی۔ اس زمانے میں رابندرناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بیگم صوفیہ کمال ہی نہیں بلکہ بنگلہ زبان کا ہر ادیب و شاعر ان دونوں شاعروں سے متاثر تھا۔ بیگم صوفیہ کمال خاص طور پر قاضی نذرالاسلام سے بہت متاثر تھیں، وہ اُنھیں کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس زمانے میں قاضی نذرالاسلام ڈھاکہ آئے ہوئے تھے بیگم صوفیہ کمال کے شوہر سید نہال الدین صاحب نے قاضی نذرالاسلام کو صوفیہ کا کلام دکھایا اور انھوں نے کہا کہ کیا کوئی مسلمان عورت ایسی پختہ شاعری بھی کر سکتی ہے۔ نہال الدین صاحب نے قاضی نذرالاسلام کو اپنی بیوی صوفیہ سے ملایا۔ قاضی صاحب نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی۔ اور انھیں ہر قسم کا ادبی مشورہ دینے کا وعدہ کیا۔ قاضی نذرالاسلام کے کلکتہ واپس چلے جانے کے بعد بیگم صوفیہ برابر اپنا کلام نذرالاسلام کے پاس بھیجتی رہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک قاضی نذرالاسلام اپنے ہوش و حواس میں رہے۔

بیگم صوفیہ کے شوہر نہال الدین صاحب قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ گئے۔ یہاں بیگم صوفیہ کو قاضی نذرالاسلام سے استفادہ کا کافی موقع ملا۔ اس زمانے میں اُن کی شاعری کا کافی چرچا ہو چکا تھا۔ ان کا کلام ملک کے تمام بنگلہ روزناموں ماہانہ رسالوں اور ہفتہ وار اخباروں میں چھپنے لگا تھا۔ مولانا اکرم خان کے روزنامہ "آزاد" اور ماہنامہ "محمدی" میں پابندی سے ان کا کلام چھپنے لگا۔ اسی دوران میں اچانک ان کے شوہر نہال الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ نہال الدین صاحب کی موت کا انھیں بےحد صدمہ ہوا۔ اُن کی شاعری بجھ کر رہ گئی۔ پہلے ان کی شاعری گلاب کے پھولوں کی طرح تھی لیکن شوہر کے انتقال کے صدمے کی یہ تاب نہ لا سکیں۔ دماغی اور ذہنی طور سے یہ ماؤف ہو کر رہ گئیں لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے اپنے غموں کو دور کرنے کے لئے شاعری کا سہارا لیا۔ پہلے اُن کی شاعری گل و بلبل اور بہار کی شاعری تھی لیکن اب ان کی شاعری سراپا تصویر درد بن کر رہ گئی انھوں نے کچھ دنوں تک اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں ہی شعر کہنا شروع کئے۔ اس موضوع پر انھوں نے اتنی نظمیں کہہ ڈالیں کہ ان کا ایک پورا مجموعۂ کلام تیار ہو گیا۔ شوہر سے اُن کو بےپناہ محبت تھی۔ اس لئے انھوں نے ان نظموں کو "شانجھیر مایا" کے نام سے خود ہی بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اس مجموعۂ کلام میں لیا تو ہر نظم بڑی اچھی ہے لیکن ان کی نظم "اُن کی یاد" میں بڑا گیرا تاثر ہے۔ ذیل میں اُن کی اس نظم کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے

اے شاعرہ پھاگن کا مہینہ آ گیا۔

کیا بہار کو خوش آمدید نہیں کہوگی؟
یادوں کے دیس میں گم ہو جانے والی شاعرہ نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔ کیا دکھن دروازہ کھل گیا؟ کیا آم میں بور آگئے۔ کیا بہار اپنا رنگین پیام لے کر آگئی۔؟
ہاں شاعرہ دکھن کی مست ہوا کے جلو میں
پھولوں کا جوڑا پہن کر بہار آگئی ہے۔۔ کیا تم نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا شاعرہ۔ شاعرہ نے اپنا سر اٹھایا۔ آنکھیں کھولیں اور یوں بولی۔

کیا میرے محبوب کی رنگین کشتی آگئی۔؟
انہوں نے مجھے یاد تو نہیں کیا ہے؟
میں نے کہا مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے
مگر شاعرہ تم بہار کے نغمے لکھو۔
شاعرہ نے کہا۔ تم ابھی مجھے شاعری سے معاف رکھو:
میرے محبوب کی رنگین کشتی کو آلینے دو۔
پھر میں رنگین نغموں سے فضا کو بھر دوں گی
میں نے سنا ہے کہ بہار آگئی ہے۔
لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ بہار میرے محبوب کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔
لیکن تم میرے سامنے بہار کا تذکرہ چھیڑ کر میرے زخموں پر نمک پاشی مت کرو۔
بہار کا کہیں وجود نہیں ہر طرف خزاں کا راج ہے
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بہار ہی کا دن تھا جب میرا محبوب مجھ سے روٹھ کر کہیں دور چلا گیا تھا۔
میں نے اپنے محبوب کے ساتھ ساتھ بہار کو بھی جاتے دیکھا تھا۔
میں اپنے محبوب اور بہار دونوں کے انتظار میں بیٹھی ہوں اور اس وقت تک بیٹھی رہوں گی جب تک میرا محبوب بسنت یعنی بہار کے جلو میں لوٹ کر نہ آجائے۔

۱۹۳۷ء میں ان کا کلام آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے نشر ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد آزادی کے وقت تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۳۹ء میں بیگم صوفیہ مسلمانوں کے بنگلہ روزنامہ "اتحاد" کے حصۂ خواتین کی مدیرہ مقرر ہوئیں۔ اسی زمانے میں نصیر الدین صاحب کے ہفتہ وار اخبار "سوغات" میں ان کی نظمیں چھپنا شروع ہوئیں۔ ۱۹۳۹ء میں ایک پڑھے لکھے ادیب اور اعلیٰ سرکاری ملازم جناب کمال الدین احمد خان سے اُن کی شادی ہوئی۔ اُن کے نام میں کمال کا اشارہ ان کے دوسرے شوہر کی طرف ہے آزادی کے وقت ان کے شوہر کمال صاحب کلکتہ سے ڈھاکہ آگئے۔ یہاں بیگم صوفیہ کمال نے نور جہاں مرشد کے ساتھ مل کر عورتوں کا ایک ماہانہ رسالہ "سلطانہ" نکالا اس کے بعد انہوں نے ڈھاکے سے ایک اور ماہانہ رسالہ "خواتین" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ہفتہ وار "بیگم" میں اُن کی نظم اور نثر پابندی سے شائع ہوتی ہے۔ بیگم صوفیہ کمال نے عبدالقادر صاحب کے بنگلہ ماہانہ "دلربا" کی ادارت بھی بڑی کامیابی سے انجام دی ہے۔ ڈھاکہ آنے کے بعد انہوں نے قومی نظمیں بھی لکھنا شروع کیں اُن کی قومی نظموں میں نظم "امار دیش" یا ہمارا وطن بہت مشہور ہے اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

سورج کی شعاعوں کے سیلاب میں رنگ رنگ کے پھول مسکراتے ہیں۔
دھان کی فصل جب تیار ہو جاتی ہے تو آسمان ایک خنک چادر ہمارے سروں پر تان دیتا ہے
مجھے وطن کی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ وطن کی نیلی فضاؤں میں اترے ہوئے پرندے مسافروں کو دور سے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ قریب ہی پرامن جزیرہ ہے۔ جہاں مختلف رنگ و نسل کے لوگ مسرت اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
زندگی کے مختلف موڑ پر نئے سورج کی نت نئی کرنیں ہمارے دلوں کو گرمی پہنچا رہی ہیں۔ حا
چاندنی اور دھوپ دونوں چاندی اور سونے برسا کر وطن کی سرزمین کو زرخیز بنا رہی ہے۔
اور اس کی زرخیزی میرے دلوں کو تسکین بخش رہی ہے۔

میرا دل و دماغ شاندار مستقبل کی امید میں سرشار ہو رہا ہے
مجھے وطن ۔ اور وطن میں بولی جانے والی تمام زبانیں
پیاری ہیں۔
میرے وطن میں مختلف ثقافتیں اور تہذیبیں ایک
دوسرے سے شیر و شکر ہوتی رہتی ہیں
جس طرح ایک بڑے دریا میں مختلف چھوٹی چھوٹی ندیاں
آ کر مل جاتی ہیں ۔
اور دریا ان سبھوں کو سینے میں سمیٹ کر سمندر سے
جا کر مل جاتا ہے ۔

ان کی قومی نظموں میں "بیداری اور پاک وطن" بھی کافی مشہور ہیں ۔ اس وقت تک ان کی نظموں کے تین مجموعے "سانجھیر مایا" "مایا کاجل" اور "من دجیبن" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔ "پیار کانٹا" ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے ۔

بیگم صوفیہ کمال اس وقت ڈھاکے کی تمام معاشرتی اور سماجی انجمنوں کی جان ہیں ۔ اس وقت وہ "وادی مہیلا سمیتی" کی صدر ہیں ۔ اور بھی دوسری انجمنوں سے ان کا قریبی تعلق ہے ۔

ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ پابندی سے جاری ہے ۔ "بنگالی ماہ نو" بنگالی ماہنامہ "محمدی" ہفتہ وار "بیگم"، "سوغات" اور مقامی روزناموں میں ان کا کلام پابندی سے چھپ رہا ہے ۔ وہ تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتی چلی جا رہی ہیں ۔ بیگم صوفیہ کمال نے بنگالی ادب میں جو مقام حاصل کر لیا ہے وہ انھیں ادبی دنیا میں زندہ رکھنے کے لئے کافی سے زائد ہے ۔

بیگم صوفیہ کمال کا ایمان ہے کہ محنت کوشش اور ایمانداری کو مضبوطی سے پکڑنے والا ایک نہ ایک دن منزل تک ضرور پہنچ جاتا ہے ۔

نذرالاسلام (بسلسلہ صفحہ ۵۵)

ہوں تم کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا ؟
ارے بھئی میں کتے کا بھونکنا اور مالی کی مار بھول سکتا ہوں !
اگلے تقاضے ؟ نہیں نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔
میں ناک رگڑ کر توبہ کرتا ہوں ۔

ڈراموں کا ایک مجموعہ "جھل ملی" (چمک دمک) بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے ۴۲ء میں ان کی صحت بگڑنا شروع ہوئی اور باوجود ہر طرح کے علاج معالجہ کے کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ اسی دوران میں اچانک ان پر فالج گرا جس نے ان کی زبان میں بھی تالہ لگا دیا ۔ پتہ نہیں وہ کیا حالات تھے جنھوں نے اتنے بڑے شاعر کا دماغ ماؤف کر دیا ۔ دوستوں نے اور ان کے قدردانوں نے ان کے علاج کی ہر ممکن کوشش کی مگر افسوس مرض بڑھتا ہی گیا ۔

تقسیم کے بعد انہیں کئی بار کلکتہ سے ڈھاکہ لانے کی کوشش کی گئی مگر ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا ہے اس وقت مشرقی پاکستان اور حکومت مغربی بنگال کے وظیفوں کی رقم پر ان کا گزارہ ہے ۔ ۵۳ء میں رانچی کے پاگل خانے میں ان کو علاج کے لئے داخل کر دیا گیا مگر وہاں بھی انہیں کوئی افاقہ نہیں ہوا ۔ اب ان دنوں وہ کلکتہ کے ایک فلیٹ میں اپنی بے کیف زندگی گذار رہے ہیں انہیں علاج کے لئے لندن بھیجنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اگر لندن میں ان کا خاطر خواہ علاج ہوا اور پھر سے وہ اپنے ہوش میں آ گئے تو بنگلہ زبان نہ جانے کن کن شاہپاروں سے مالا مال ہو جائے گی ۔ اگر ان کے دماغ کا سوتا پھر سے پھوٹ نکلا تو اپنے ساتھ جانے کتنے زر و جواہر ساتھ لائے ۔

خدا کرے کہ نذرالسلام کا نطق پھر سے واپس آ جائے
ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

وحید قیصر ندوی

لالن شاہ

مشرقی پاکستان کی پچاس فی صدی آبادی دیہاتوں میں بستی ہے۔ جو نہایت ہی مخلص و محنتی، جفاکش، ایمان دار اور مذہبی افراد پر مشتمل ہے۔ ان کے وسائل بڑے محدود ہیں یہ اپنے کھیتوں، دریاؤں اور سمندروں میں بڑے مگن ہیں۔ شعر و شاعری اور موسیقی سے انھیں دلی لگاؤ ہے ان دیہاتوں میں رہنے والے شاعروں اور فنکاروں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ جب کبھی کوئی عوامی شاعر کسی بھی دیہاتی علاقہ میں جا نکلتا ہے تو لوگ اس کے کلام کو سننے کے لئے پروانہ وار جمع ہو جاتے ہیں۔ یوں تو یہاں کے دیہاتوں میں ہر عوامی شاعر کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن خاص طور پر صوفی شعراء کی تو وہ قدر و منزلت ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دیہات کے جس گوشے میں بھی یہ صوفی شاعر نکل جاتے ہیں۔ ہزاروں دیہاتی ان کو اپنے سروں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کی شاعری سننے کے لئے بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔ ساری ساری رات شاعر بھی بڑے دل سے اپنا کلام سناتا رہتا ہے۔ ان اجتماعات میں مقامی موسیقار قدیم صوفی شاعروں کا کلام بھی درد بھرے انداز میں پیش کر کے مجمع کو بے اختیار داد دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان اجتماعات میں خاص طور سے جن قدیم صوفی شاعروں کا کلام گایا جاتا ہے "ان میں ستولن شاہ" "لالن شاہ" اور شیخ مدن باؤل کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان صوفی شاعروں میں لالن شاہ کو خاص مقام حاصل ہے لالن شاہ اور دوسرے عوامی شاعروں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں ان کا کلام زیادہ دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے صوفی شاعروں میں لالن شاہ کو خاص مقام حاصل ہے۔ لالن شاہ اور دوسرے عوامی صوفی کے ہاں جو شعریت، موسیقی اور اعلیٰ تخیلات پائے جاتے ہیں وہ کسی اور صوفی شاعر کے ہاں نہیں پائے جاتے

لالن شاہ کی شاعری سے نہ صرف عوام متاثر ہوئے بلکہ ان کے کلام سے بنگالی زبان کے بڑے سے بڑے شاعر نے بھی تاثرات قبول کئے۔ لالن شاہ کی بڑائی کے لئے یہی بہت کافی ہے کہ بنگلہ زبان کے سب سے بڑے شاعر کوی رابندر ناتھ ٹیگور نے جرمنی میں بنگالی ادب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے مشرقی بنگال کے دو عوامی صوفی شاعروں لالن شاہ اور حسن رضا کے صوفیانہ کلام سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور ایک ٹیگور ہی پر کیا موقوف ہے۔ لالن شاہ کی شاعری سے مشرقی پاکستان کے بڑے سے بڑے شاعروں نے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ کئی ایک بڑے شاعروں نے تو لالن شاہ کی پوری پوری تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ شاعر لالن شاہ کی تقلید میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ لالن شاہ نے بنگلا شاعری پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں

لالن شاہ کی ابتدائی شاعری کسی کو نہیں معلوم کیونکہ وہ شروع ہی سے ایسے درویش صفت آدمی تھے جنہیں نام و نمود اور شہرت سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی تاریخ اور تذکرے کی کتابیں خاموش ہیں مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ ان کا زمانہ انیسویں صدی کا ہے

اور یہ کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کشتیا کے ایک گاؤں میں گزرا جہاں آج تک ایک خانقاہ ان کے نام سے موسوم ہے۔ لالن شاہ کی شاعری کی ایک خاص صنف "باؤل" ہے جس کا موجد لالن شاہ کو سمجھنا چاہئے کیونکہ لالن شاہ سے پہلے کسی عوامی شاعر نے باؤل نام کی کوئی چیز پیش نہیں کی۔

"باؤل" کے معنی کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ پرانے زمانے میں یہ لفظ بنگلہ زبان میں اولیاء کے ہم معنی استعمال ہوتا تھا اور اس سے مراد وہ شاعری ہوتی تھی جس میں شعراء اولیاء اللہ کی کرامات وغیرہ بیان کیا کرتے تھے۔ اور ایک طبقے کا خیال ہے کہ "باؤل" کے معنی پاگل یا باؤلے کے ہیں۔ چونکہ صوفی شعراء عشق حقیقی کی وجہ سے فنا فی اللہ ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے آپ کو باؤلا کہلانا پسند کرتے ہیں۔ بہر حال، باؤل کے معنی جو کچھ بھی ہوں مگر چونکہ باؤل میں عام طور سے دنیا کی بے ثباتی اور فلسفۂ روح کے بارے میں تفصیلات ہوتی ہیں۔ باؤل گانے والے جہاں اپنی شاعری میں سب سے منفرد ہوتے ہیں، وہیں ان کا لباس اور وضع قطع بھی سب سے منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ باؤل گانے والوں کے ہاتھ میں اکتارہ اور اُن کا گیروا لباس دیکھ کر دور ہی سے یہ جان لیا جاتا ہے کہ یہ شاعر "باؤل" صنف کا علمبردار ہے۔ شیخ مدن، سنتوش شاہ اور بگلا کنائی کے یہاں جس قسم کے تخیلات پائے جاتے ہیں وہ اسلامی اصولوں اور اسلامی روایات کے منافی ہیں مگر لالن شاہ کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ وہ باوجود باؤل گانے کے موجد ہونے کے کسی مقام پر بھی اسلام سے انحراف نہیں کرتا۔ لالن شاہ کی شاعری کا موضوع زندگی، موت، حیات بعد الموت، خدا رسولؐ اور اسلامی اخلاق و تصوف ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ بھی عام صوفیوں کی طرح عالمگیر اسلامی برادری کے علمبردار ہیں۔ وہ بھی رنگ و نسل کی خلیج میں پڑ کر انسانی قدروں کی پامالی نہیں دیکھ سکتے۔

لالن کی شاعری کا فلسفہ یہ ہے کہ سارے انسانوں کا مقصد حیات ایک ہے۔ انسان کی ذات خود حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو حقیقت کی تلاش کے لئے خود اپنی تلاش کرنا چاہئے۔ لالن شاہ کے خیال میں روح کی تربیت ہی سے انسانیت بلند ہو سکتی ہے اور اس کے لئے ایک اچھے اور کامل رہبر کی بہت ضرورت ہے۔ اچھے اور کامل رہبر کی تلاش کے سلسلے میں لالن شاہ نے اپنے خیالات کو اپنے ان نغموں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:۔

اے میرے ہادی و رہبر۔ تم کہاں ہو
یہ دنیا میرے لئے بڑی اندھیری ہے
ان اندھیروں میں راستے کا کہیں پتہ ہی نہیں چلتا
اگر ایسے میں تم میری دستگیری نہیں کرو گے تو میں
راستہ بھول جاؤں گا۔

لیکن رہبر کا پانا آسان کام تو نہیں
اس کے لئے تو برسوں کی ریاضت چاہئے
صبر و شکر کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت جھیلنی پڑے گی
اگر ان منزلوں سے کامیاب گزر گئے۔
تو پھر رہبر کے مل جانے کی پوری امید ہے
رہبر تو ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔

لالن شاہ ایک اور جگہ اچھے اور کامل رہبر کی تلاش کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں۔

اے رہبر کی تلاش کرنے والو۔ میری سنو۔
اگر تمہیں رہبر کی تلاش ہے تو
پہلے اپنے آپ کو پہچانو
جسے تم تلاش کر رہے ہو وہ تمہارے اندر ہی موجود ہے
اپنے آپ کو جانے اور پہچانے بغیر
وہ دیس دیس مارے مارے پھرنے سے بھی نہیں
ملے گا۔

جسم اور روح کے نازک رشتے کو لالن شاہ نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

میرے گھر کے پاس شیشے کا ایک گھر ہے
اس میں میرا ایک پڑوسی رہتا ہے۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

وحید قیصر ندوی

شرف الحسینی شرفؔ اور انکی شاعری

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب میں مشرقی پاکستان کے پہلے سہ روزہ اُردو اخبار "مشرقی پاکستان" کا ایڈیٹر تھا۔ اس اخبار کا دفتر مشرقی پاکستان کے نامور اور سیاسی لیڈر مسلم حبیب الرحمٰن خان اخون زادہ کے نام سے موسوم حکیم حبیب الرحمٰن روڈ پر حکیم صاحب مرحوم کے مکان میں تھا۔ اخبار مشرقی پاکستان کے نگراں اعلیٰ ڈاکٹر عندلیب شادانی تھے ڈاکٹر صاحب نے ایک دن باتوں باتوں میں ایک بزرگ سید ابوالفتح شرف الدین شرفؔ حسینی کا تذکرہ کیا "ہن ماشما" ڈھاکے کے بڑے شرفا اور ملک کے اچھے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شرفؔ صاحب کے کئی اچھے شعر بھی سنائے۔ شرف صاحب کے اشعار میں اس قدر دلکشی تھی کہ میرا دل بے اختیار ان سے ملنے کو چاہا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ شرف صاحب حکیم حبیب الرحمٰن روڈ سے بہت قریب بیگم بازار روڈ پر رہتے ہیں مگر ان سے ملنے کے لئے پہلے سے وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ اور اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ ملاقات کا وقت دو بجے سے پانچ بجے تک ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے شرف الحسینی صاحب کے بارے میں اس قدر تفصیلی باتیں بتائیں کہ میں دفتر سے سیدھا شرف صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ان کا گھر دفتر کے بالکل پاس ہی واقع تھا۔ محلہ میں لوگ انہیں "صدو میاں" کے نام سے پکارتے تھے یہ ان کا عرف تھا۔ یہ آج تک نہ پتہ چل سکا کہ آخر انہیں صدو میاں کیوں کہا جاتا تھا۔ شرف صاحب کو پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا اس لئے کچھ تکلف سا محسوس ہوا۔ مگر اخبار نویس جو ٹھہرا اس لئے بے دھڑک ٹھیک دو بجے ان کے گھر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بزرگ تشریف لائے۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹکے مگر پھر انہوں نے بڑی نرمی سے آمد کی وجہ پوچھی میں نے انہیں بتایا کہ شعر و شاعری سے دلچسپی اور مقامی سہ روزہ اخبار "مشرقی پاکستان" کا ایڈیٹر ہوں۔ ڈاکٹر شادانی اور دوسرے لوگوں سے آپکی شہرت اور وضع داری کا تذکرہ سن کر ملنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میری بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے اندر ایک پرانی وضع کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

میں نے حسینی صاحب سے ملاقات سے پہلے اپنے دل میں یہ سوچا تھا کہ آج حسینی صاحب سے اپنے اخبار مشرقی پاکستان کے لئے ایک انٹرویو لوں گا اور پھر اسے اپنے اخبار میں چھاپوں گا مگر میں شرف الحسینی شرفؔ صاحب کی دلچسپ باتوں میں اب کھو گیا۔ اصل مقصد زبان پر لانے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس ملاقات کے بعد ان سے اتنی ملاقاتیں ہوئیں کہ پھر تو رفتہ رفتہ میں ان کے گھر کا ایک فرد بن کر رہ گیا۔ اتفاقاً میرا قیام بھی ان کے گھر کے پاس ہی تھا۔ ان سے ملنے ملانے کے لئے مواقع اکثر و بیشتر ملتے رہتے تھے۔ انھوں نے عام طور سے مشاعروں میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا البتہ بعض خاص احباب کے اصرار پر وہ کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت کر لیا کرتے تھے۔ میری موجودگی میں انھوں نے سب سے پہلے جس مشاعرے میں شرکت کی وہ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی کے دولتکدے پر دائرۂ ادب کے زیر اہتمام ہونے والا مشاعرہ تھا اس طرح سے انہوں نے ڈھاکہ کے جس آخری مشاعرے میں شرکت کی تھی وہ حافظ ظہور الحق المبارکی کے نئے مکان واقع بخشی بازار روڈ میں دائرۂ ادب ہی کے زیر اہتمام ہونے والا مشاعرہ تھا۔ یہ مشاعرہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کو رات کے آٹھ بجے منعقد ہوا تھا۔

اس مشاعرے میں حضرت علامہ امین احمد عباسی، خلف الرشید حضرت مولانا فاروق چڑیاکوٹی سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈھاکا یونیورسٹی، حضرت مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی، حضرت مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی، ڈاکٹر محمود حسن سابق وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی، حضرت مولانا شیخ حجۃ اللہ انصاری فرنگی جناب محمود حسن ممبر بورڈ آف ریونیو۔ جناب محمد یاسین خاں صاحب وغیرہ جیسے مسلم دوست اور ادب نواز حضرات شریک تھے۔ شعراء کرام حضرت شرف الحسینی صدر مشاعرہ، حضرت عندلیب شادانی جناب صبغۃ اللہ شہید، جناب امین احمد عباسی،

جانشین حضرات علامہ وحشت، حضرت علامہ آصف بنارسی، پروفیسر سید اقبال عظیم، مولانا عبدالباقی ندوی، ضیا الرحمن تمیل، افسر ماہ پوری، حافظ ظہور الحسن حسان، سید اقبال عظیم، مولانا عبدالباقی ندوی، دوبارہ منگوی، عطاء الرحمن جمیل، افسر ماہ پوری، حافظ ظہور المبارکی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں

اس مشاعرے کے موقع پر حضرت شرف نے مجھ سے بڑے رقت آمیز لہجے میں فرمایا کہ "ندوی صاحب شاید میں اب کسی اور مشاعرے میں شرکت نہ کرسکوں، غالباً مشاعرے میں میری یہ آخری شرکت ہے" میں نے عرض کیا کہ آپ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں اللہ پاک آپ جیسے بزرگوں کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ "اب میں اپنے نفس کو کہاں تک دھوکے میں رکھوں"۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس مشاعرے کے ایک ہفتے بعد اچانک مجھے معلوم ہوا کہ شرف صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں آکسیجن دی جا رہی ہے۔ میں ان سے ملنے کا قصد کر رہا تھا۔ عید الفطر کے دوسرے دن مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء کو شام کے کوئی سات بجے بزمِ ڈھاکا کی یہ شمع ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔ میں شرف صاحب سے ملنے کے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں مجھے سید اقبال عظیم صاحب ملے، انہوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ میں عرض کیا شرف صاحب کی عیادت کے لئے۔ اقبال صاحب نے کہا اب ان کی عیادت کی ضرورت نہیں البتہ اگر ابھی فوراً جاؤ تو ان کی قبر پر مٹی ڈال سکتے ہو۔ میں سکتے کے عالم میں چپ چاپ بیگم بازار پنچکمان کے خاندانی قبرستان میں پہنچا، یہ قبرستان ان کے خاندانی مکان کے ایک گوشہ میں واقع ہے، ان کے اعزا انہیں قبر میں لٹا چکے تھے اور قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی میں نے بھی قبر پر مٹی ڈال دی اور دعائیں وغیرہ پڑھ کر واپس چلا آیا۔ واپسی پر ان کی باتیں یاد آتی رہیں۔

اگرچہ شرف صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے مگر وہ یہاں کے ادبی حلقے پر وہ گہرے اور امٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں جن کی بنا پر ہمیشہ ان کا نام اچھے لفظوں میں لیا جائے گا۔ خواجہ حافظ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

پیدائش

سید ابوالفتح شرف الدین شرف ۳۱ محرم الحرام ۱۲۹۳ھ میں ڈھاکے میں پیدا ہوئے، والد کا نام سید نقیب الدین حسین تھا۔ ان کے خاندان کا شمار قدیم شریف گھرانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد سادات حسینی اور مدنی تھے۔ ان کا خاندان شاہ جہانگیر کے دور میں پہلے دلی، پھر کلکتہ اور پھر ڈھاکے میں آکر مقیم ہوا۔ ان کا تاریخی نام بنگال کے نامور اردو کے تذکرہ نگار اور مسلم الثبوت شاعر عبدالغفور نساخ نے ابوالفتح محمد شرف الدین رکھا۔

تعلیم و تربیت

ان کی والدہ محترمہ نے ان کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد نقیب الدین سے حاصل کی جو عربی فارسی کے بڑے عالم تھے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد وہ اپنی والدہ کے خالہ زاد بھائی نواب سید محمد خاں بہادر آزاد عرف ننھے صاحب کے پاس مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے پٹنہ چلے گئے۔ خاں بہادر سید محمد آزاد کا شمار ملک کے نامور انشا پردازوں میں ہوتا ہے، وہ لکھنؤ کے مشہور مزاحیہ اخبار اودھ پنچ کے مشہور نامہ نگار تھے۔ خیالات آزاد اور بعض دوسری کتابیں ان کی یادگار ہیں سید محمد آزاد کی صحبت نے شرف میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا کیا ان دنوں عظیم آباد علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حضرت شاد عظیم آبادی، نواب نصیر حسین خیال، نواب امداد امام اثر عظیم آبادی، سید عبدالغفور شہباز اور دوسرے جلیل القدر شعراء اور ادیبوں سے شرف کی دن رات ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں

اس علمی اور شاعرانہ ماحول نے انہیں بھی شعر گوئی پر مائل کیا چنانچہ انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کیا، شروع میں انہوں نے اپنا کلام سید محمد آزاد کو دکھایا، بعد میں شاعری میں باضابطہ انہوں نے سید عبدالغفور شہباز مصنف حیات نظیر وغیرہ کی شاگردگی اختیار کی۔ وہ اکثر دہلی، آگرہ، اور لکھنؤ تشریف لے جایا کرتے تھے، چنانچہ معاصرین میں خواجہ الطاف حسین حالی، نواب سائل دہلوی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، بیخود دہلوی وغیرہ سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

قیامِ کلکتہ

کلکتہ میں بھی ان کا بہت قیام رہا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی زندگی کا آدھا سے زیادہ حصہ کلکتہ میں محلہ بنیا پوکھر لین میں بسر ہوا اس محلے میں ان کا ایک بڑا آبائی مکان تھا جس کے بارے میں انہوں نے ایک طویل نظم

"نبیا پوکھر لین کی یاد" کے نام سے لکھی تھی - اس نظم میں ایک جگہ شرف صاحب فرماتے ہیں ؎

مجھے یاد میری نہیں نبیا پوکھر — کہ رہتا تھا میں بھی یہیں نبیا پوکھر
مکان تو وہی ہے مکیں وہ نہیں ہے — نہ ویسی فضا ہے نہ ویسی زمین ہے
مکانات چوگرد اس کے بنے ہیں — نشانِ قدیم اس کے سب مٹ گئے ہیں
یہ وسعت کہ بازار اس میں بسا ہے — جو تالاب تھا چشمِ نرگس گیا ہے
مکاں خاص رہنے کا اک رہ گیا ہے — تغیر نہیں اس میں کوئی ہوا ہے
نئے سارے گھر سے کو پہچانتے ہیں — مگر جس میں اماں وہ ہم جانتے ہیں
یہیں مریم آپا کی شادی ہوئی ہے — خوشی کی اسی گھر میں نوبت بجی ہے
ہوئی ہے یہیں آپا بیگم کی رحلت — اسی جا ہوئی ہیں وہ دنیا سے رخصت
یہیں خالہ اماں کی شادی رچی تھی — یہیں دھوم کیا کیا نہ اس کی مچی تھی
یہی باغ دنیا نہ دیا چمن ہے — مگر مجھ میں اب تک بھی بوئے وطن ہے
پلا ہوں یہیں اک عمر گود دوں میں تیری — کٹی ہیں یہاں ساعتیں تیری کی،
رئیسوں کے جمگھٹ طوائف کے نخرے — اسی گھاٹ پر روز ہوتے تھے جلسے
وہ یاروں کا مجمع وہ ہر روز دعوت — کہاں وہ امارت کہاں وہ ریاست
مرے منتظر لوگ رہتے تھے در پر — سواری جو آتی تھی میری پلٹ کر
مجھے آج حسرت سے میں تک رہا ہوں — مگر اب کہاں مجھ کو بک رہا ہوں
پرانا یہ قصہ مجھے کس نے سنایا! — کسی نے نہ پوچھا کہ یہ کون آیا

قدم آگے رکھنے کی طاقت نہیں ہے
کہ اس کی بھی مجھ کو اجازت نہیں ہے

اس نظم میں انہوں نے جہاں اپنے بچپنے کے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں انہوں نے اپنی دولت و امارت اور شان و شوکت کا تذکرہ بھی کیا ہے سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے جس شان و شوکت اور دبدبے سے زندگی گزاری ہے وہ شان و شوکت اور دبدبہ بڑے بڑے رئیسوں اور نوابوں کو مشکل ہی سے حاصل ہوتا ہے - ڈھاکہ میں جب ان کے اچھے دن تھے تو ان کے دروازے پر ہر وقت مہمانوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا - ان کے دروازے سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا - زندگی کے آخری دور میں شان و دیت نہ گئی - کیونکہ مرتے دم تک وہ وضع داری نبھاتے رہے -

پہلا مجموعۂ کلام ان کا پہلا مجموعہ کلام "گلستانِ شرف" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں ستارہ ہند پریس محلہ نبیا پوکھر لین کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا - اس میں ستاسی غزلیں، ۶ قصیدے، ایک مسدس، ۶ سہرے، ۲ رباعیاں، ۶ سلام، ۲ مثنویاں، ۵ نوحے، چند تاریخی قطعے، تین نظمیں شامل ہیں - اس دیوان میں ایک فارسی نظم "سیر کلکتہ" بھی شامل ہے - پورا دیوان ردیف وار ہے اس دیوان کے شروع میں سید اختر حسن ایم - اے (علیگ) کا لکھا ہوا مقدمہ اور خود شرف مرحوم کا ایک فارسی مقدمہ شامل ہے - دیوان کے آخر میں نواب سائل دہلوی، آرزو لکھنوی، بیخود دہلوی وغیرہ کی تقریظات ہیں ان تمام کاملین فن نے شرف صاحب مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا ہے اور ان کے کلام کی پختگی اور دلنشینی کے معترف ہیں

نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کا ارشاد ہے کہ "ایک ربع صدی کے قریب لیل و نہار گزرے جب میں سر علی امام مرحوم کے دولت کدہ پر بمقام پٹنہ بہمراہی جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور گیا تھا وہاں سید شرف الدین صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا وہ چند گھڑیوں کی ملاقات ایسی دلچسپ تھی جسے امتداد زمانہ میرے دل سے ہنوز محو نہیں کر سکا - میں نے خود ان کے منہ سے ان کا کلام سنا انکی خوش فکری و سلیم المذاقی حیرت انگیز ہے - باوجود اس کے کہ آپ متوطن ڈھاکہ بنگال کے ہیں - اور اکثر اوقات میں آپ کی عمر صرف ہوئی وہاں کے لب و لہجے بول چال دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے بہت غیر ہیں - لیکن سید صاحب کے کلام میں کوئی شائبہ ادھر کی زبانوں کا نہیں پایا جاتا - ان کا ادب شاعری بالکل جہان آبادی ہے جس کا شاہد عمل ان کا دیوان ہے ..... جس قدر اصناف سخن پران کے خامہ نے جنبش کی ہے ان میں سے کسی صنف میں یہ کمزور نہیں ثابت ہوئے - ان کی مشق سخن نے ان کو کاملین ادب کے گوشۂ مسند تک پہونچا دیا ہے - الخ -

حضرت شرف مرحوم کے متعلق حضرت علامہ آرزو لکھنوی فرماتے ہیں -

"دیوان شرف میں غزلوں کے ترتیبی مجموعہ کے ساتھ ساتھ قصیدے، قطعے، مثنویاں، رباعیاں، سہرے، سلام، نوحے، تاریخیں غرضکہ سبھی کچھ موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی طبیعت میں ہر صنف سخن سے مناسبت اور ہر رنگ میں ڈوبنے کی کافی صلاحیت موجود ہے - کل کلام کے مطالعہ سے دو خوبیاں اور بھی مترشح ہوتی ہیں —

(۱) ادبی انقلابوں کے ساتھ ساتھ مصنف کی تبدیلیٔ مذاق گلستان شرف میں ابتدا ہی سے لے کر زمانۂ حال تک کے سبھی رنگ موجود ہیں —

(۲) کلام کے فرق تواذن سے مدت کی ترقی بھی اچھی طرح نمایاں ہو رہی ہے ایسے اشعار بھی ہیں جو مصنف کی ابتدائی حالت اور اس زمانہ کے مذاق کو واضح کرتے ہیں اور ایسے اشعار بھی ہیں جو موجودہ مذاق کے ساتھ انتہائے مشق کو بھی نمایاں کرتے ہیں، غرض کہ دیوان مصنف کی ادبی قابلیت اور فطری مناسبت کا

بلکہ پورا آئینہ دار ہے۔ ایسا شاعر بحیثیت زبان غنیمات سے ہے۔"

طوطیٔ بنگالہ علامہ رضا علی وحشت شرف الحسینی کے متعلق فرماتے ہیں کہ "باوجود اس کے کہ خاک بنگالہ سے ایک ایسا شاعر پیدا ہوا جو لکھنؤ پہنچ کر بادشاہ غازی الدین حیدر کے دربار کا ملک الشعراء بنا (میرا اشارہ قاضی صادق خاں اختر کی طرف ہے) لوگوں کا اب تک خیال ہے کہ بنگالہ کو زبان اردو سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے ناسخ اور سید محمد آزاد اور نواب سید محمد مرحوم کے احسانات کو جو زبان اردو پر انہوں نے کئے بھلا دیا ہے۔ اس سید محمد آزاد کے خانوادے کی ایک قابل قدر یادگار کا دیوان پیش نظر ہے۔ سید شرف الدین صاحب شرف الحسینی ڈھاکہ کے روساء میں سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان اردو سے انہیں خاندانی دلچسپی ہے اور شعر و سخن میں اپنے خالِ مکرم آزاد سید محمود کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اس اتباع میں نمایاں طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ زبان کی صفائی کے ساتھ لفظوں کی بندش اور ترکیبوں کی چستی کا خیال رکھتے ہیں اور چونکہ دل والے ہیں اس لئے کلام میں تاثیر بھی ہے۔ لفاظی سے انہیں پرہیز ہے نہایت ہی پرلطف انداز میں اپنے رنگین خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی ذات با برکات بنگالہ میں غنیمات سے ہے۔"

حضرت وحشت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ڈھاکے کے آخری دورِ حیات میں حضرت شرف الحسینی مرحوم کے بارے میں یہ قطعہ برجستہ فرمایا تھا۔

شرف کا شرقی بنگال پر احسان ہے وحشت
نمایاں خدمتیں ہیں انکی اردو کی اشاعت میں
ہے قدرت ان کی اصناف سخن پر قابل تحسین
مسلّم ہے کلام ان کا فصاحت میں بلاغت میں

شرف الحسینی مرحوم کو قیام عظیم آباد کے موقع پر میر انیس اور مرزا دبیر کے منہ سے ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا۔ محرم کے موقع پر میر انیس پٹنہ کے رئیس اعظم ولایت علی خاں کے ہاں اور نواب امام باندی بیگم کے ہاں مرزا دبیر مرثیہ پڑھنے تشریف لایا کرتے تھے ــــــ شرف مرحوم ان مجالس میں پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے ان کے پڑھنے کا انداز میر انیس سے ملتا جلتا تھا، وہ خود بھی اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ وہ بنگال میں میر انیس کے پڑھنے کے طرز کے واحد یادگار ہیں۔

نیا دیوان — جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کا پہلا مجموعہ کلام "گلستان شرف" ان کی زندگی ہی میں چھپ چکا تھا۔ ان کا دوسرا دیوان "دلستان شرف" کے نام سے مکمل ہو چکا تھا۔ مرحوم نے اپنے ہاتھ سے پورا دیوان مرتب کیا تھا اور بعد میں کتابی شکل میں اسے ایک اچھے کاتب سے نقل کرایا تھا۔ اس دیوان کا مقدمہ مشرقی پاکستان کے نامور سیاست داں مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب نے لکھا ہے۔

اس مقدمے کے آخر میں مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب لکھتے ہیں کہ "گلستان شرف" مطبوعہ دیوان ہے دوسرا دیوان "دلستان شرف" مرتب ہے۔ نثر میں بھی چند کتابیں مرتب ہیں۔ میں اتنا کہنے میں اپنی زبان قلم کو بند نہیں کر سکتا کہ شرف اخلاق اور طرز معاشرت میں بہت ممتاز ہیں۔ عہد و پیماں اور وضع داری میں بے نظیر ہیں۔ غیرت اور خود داری میں بے بدل۔ میرے ساتھ تو شرف نے ساٹھ برس سے زیادہ دوستی یکساں نباہ دی۔"

شرف مرحوم کا عکس دیوان اور مقدمہ میری نظر سے گذر چکا ہے امید ہے کہ مرحوم کا دوسرا دیوان پاکستان رائٹرز گلڈ شائع کرے گی کیونکہ مرحوم زندگی کے آخری دور میں رائٹرز گلڈ کے ممبر بن گئے تھے۔

شاعری — مرحوم نے شروع شروع میں عام روش کے مطابق صرف زبان کے شعر کہنے کی کوشش کی جس میں لفظی صنائع بدائع ہوتا تھا۔ چونکہ ابتدائی دور میں انہیں مرزا دبیر اور میر انیس وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی تھی اس لئے ان کی شاعری لکھنؤ سکول سے متاثر نظر آتی ہے۔ ذیل کے اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان پر لکھنؤ اسکول کا بڑا اثر تھا۔

ندامت کا یہ مزا حشر کے دن رنگ لائے گا
رہا طغیاں اگر ایسا ہی اشک چشم پرنم کا

دردسن لے جو مرا، درد ہو پیدا دل میں
کوئی بے درد سنے گا نہ فسانہ دل کا

یوں سرمہ تو آنکھوں میں لگانا نہیں اچھا
ہر وقت یہ جادو کا جگانا نہیں اچھا

دل سے اغیار کو تو نے جو نکالا ہوتا
گھر میں بے شمع اندھیرے سے اجالا ہوتا

فراق میں کسی وحشیٔ غزال کے اے دل
ہوا ہے سر دہرن دن فغار کا پنجا

ابتدائی دور میں اس قسم کے اشعار بہت سارے ہیں جن میں معانی سے زیادہ الفاظ کے آرائش و زیبائش اور رعایتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ بعد میں شرف صاحب پر امیر مینائی اور داغ مرحوم کا اثر پڑا جس کا ثبوت ذیل کے اشعار سے ملے گا ؎

کسی کی شوخیِ طرزِ حیا نے مار لیا
نگاہِ ناز نے بانکی ادا نے مار لیا

کب کچھ پتہ نئی روزِ قیامت نہیں ہوئی
کب حشر تیرے کوچہ میں بپا نہیں ہوا

آنکھ جھپکی تھی کہ دل غائب ہمارا ہوگیا
اے نگاہِ ناز یہ کیا اشارہ ہوگیا

میں نے بھی چھاتی پر اپنی ایک پتھر رکھ لیا
ان کا دل جب سخت ہو کر سنگِ خارا ہوگیا

صاف یہ کوچۂ جاناں سے صدا آتی ہے
وہی آتا ہے یہاں جس کی قضا آتی ہے

اب ان اشعار میں داغ اور میر مرحوم کی شوخی اور رنگینی صاف جھلک رہی ہے۔ لکھنؤ کی رعایت لفظی اور امیر اور داغ کی شوخ بیانی اور رنگین بیانی میں شرف یا جی نہ لگا۔ اس لئے انہوں نے غالب مرحوم کا تتبع اختیار کیا اور اس رنگ کو نباہنے کی ساری عمر کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے غالب کی تمام مشہور غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ذیل میں شرف کی دو مکمل غزلیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ وہ غالب کی پیروی میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ دونوں غزلیں غالب کی مشہور غزلوں "مدعی دنیا عشق کے قابل نہیں رہا" اور "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے" کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔

سینے کا چاک کیوں سئیں جب دل نہیں رہا
اب رخنہ بندیوں کے یہ قابل نہیں رہا

داغوں سے پھل رہا ہے تو زخموں سے ہے نگار
اک دل تھا وہ بھی نذر کے قابل نہیں رہا

دونوں ہیں شوقِ قتل میں بیتاب و بیقرار
کچھ امتیاز بسمل و قاتل نہیں رہا

اٹھی نقاب شرم کا پردہ اٹھا گئے
ہم بھی کہیں کہ ہاں کوئی حائل نہیں رہا

دولت پہ ہے گھمنڈ شرافت سے ننگ و عار
حالِ زمانہ کہنے کے قابل نہیں رہا

سچ ہے کہ ہر کمال کو آخر زوال ہے
اک حال پر کبھی مہ کامل نہیں رہا

داد سخن شناس کا دلدادہ ہے شرف
تحسین ناشناس کا قائل نہیں رہا

مدت ہوئی نثار دل و جاں کیے ہوئے
بیٹھے گے اب یہ بال پریشاں کیے ہوئے

حسرت کا سوگ اُمید کا ماتم کس کو روئیے
بیٹھے ہیں دل کو گنجِ شہیداں کیے ہوئے

داغوں سے دل کے فرصتِ نظارہ اب کہاں
عرصہ ہوا ہے سیرِ گلستاں کیے ہوئے

رکھا نہ دل میں کچھ بھی تری یاد کے سوا
آباد گھر کو بیٹھا ہوں ویراں کیے ہوئے

بیٹھا ہے انتظار میں لذتِ کشِ فراق
بستر پہ جمع خارِ مغیلاں کیے ہوئے

اٹھیں گے حشر میں شانِ جنوں کے ساتھ
ہم ہیں کفن کا چاک گریباں کیے ہوئے

حاصل ہے یہ غلامیٔ آزاد کا شرف
روشن جو تو ہے بزم سخنداں کیے ہوئے

زندگی کے آخری دور میں شرف صاحب کے کلام میں بڑی پختگی آگئی تھی، حافظ ظہیر الحق صاحب المبارکی کے دولتکدے پر انہوں نے دائرۂ ادب کے مشاعرے کی صدارت فرماتے ہوئے ازراہِ عنایت دو غزلیں سنائی تھیں ان سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آپکی شاعری کا رنگ برابر نکھرتا گیا۔ ذیل میں ان کی دونوں غزلیں درج کی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں غزلیں ان کی زندگی کی آخری غزلیں ہیں اسلئے ان کی حیثیت تبرک کی بھی ہے۔

اس نے سہواً بھی اگر میری طرف دیکھ لیا
میں نے صد معجزۂ ذوقِ نظر دیکھ لیا

جستجو جس کی سرِ طور سرِ دار رہی
ہم نے وہ جلوہ سرِ راہگذر دیکھ لیا

میکدے جھوم اٹھے شیشہ و ساغر چھلکے
نگہِ مہر سے ساقی نے جدھر دیکھ لیا

تاب نظارہ ان آنکھوں میں کہاں تھی لیکن
یہ کرم تھا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لیا

ہم نے اسکو غم ایام کا حاصل سمجھا
بے ارادہ بھی اگر تم نے ادھر دیکھ لیا

دشمن جاں تھے پہ آئی نہ شکایت لب پہ
وقت نے وقت کے ماروں کا جگر دیکھ لیا

اس ضعیفی میں بھی باقی ہے شرف ذوق سخن
دیکھنے والوں نے اعجاز ہنر دیکھ لیا

ع۔۲

زیر خنجر ہے گلا اور شکر ہوتا ہے ادا
اللہ اللہ یہ شہید ناز کس منزل میں ہے

ایک تنکے کا سہارا ساری دنیا میں نہ تھا
جو مجھے گرنے نہ دیگا وہ سہارا دل میں ہے

جا کے جب حد نظر تک رہ گئی تاب نظر
دیکھنے والا یہ بولا چھپنے والا دل میں ہے

اب فغان دشت پیمائی سے مطلب ہے جنوں
ایک دریا آنکھ میں ہے ایک صحرا دل میں ہے

کوئی کس کی شکل آسانی کو آئے کیا کہے
جس سے کہیے وہ یہ کہتا ہے بڑی مشکل میں ہے

کیوں کرے داد سخن کی بھی تمنا اب کوئی
جب نہیں فرق وتوازن ناقص و کامل میں ہے

حضرت شرف الحسینی شرف کی وفات سے مشرقی پاکستان میں وہ خلا پیدا ہو گیا جس کا پر ہونا مشکل ہے۔ چند برسوں پہلے تک حضرت علامہ وحشت کی ذات مرجع خلائق تھی۔ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد بنگال کے قدیم شعراء میں حضرت شرف کی ذات با غنیمت تھی۔ افسوس ہے کہ اب وہ بھی ہم میں نہیں ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

لالن شاہ (بسلسلہ ص ۹۴)

جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔
میرے اور اس کے درمیان ایک گہرا دریا حائل ہے
میرے پاس اس دریا کو پار کرنے کا کوئی وسیلہ موجود نہیں ہے۔
کاش وہ چلتا ہوا خود میرے پاس آجائے
تاکہ میری زندگی کے رنج والم دور ہو جائیں

اپنی ایک چھوٹی سی صوفیانہ نظم میں لالن شاہ یوں نغمہ سرائی کرتے ہیں۔

جس جوان جسم میں ناپاکی نظر نہ آئے
اس پاک جسم کو مضبوطی سے پکڑ لو
پاک جسم کو مضبوطی سے پکڑنے ہی سے تو پارسا بننے لگے گا۔
تیرا خدا تجھ سے اسی صورت میں راضی ہو سکے گا
کہ تو پاک جسم سے پاک تعلق پیدا کر لے
انسانی جسم کے اندر آدھا کعبہ بند ہے
یعنی انسان کی روح اصل میں آدھا کعبہ ہے
اس لئے اگر تو اس آدھے کعبے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے
تو سب سے پہلے اپنے دل کو قابو میں کر لے۔

لالن شاہ کے یہاں اس قسم کے بے شمار نغمے ہیں جن میں سیدھے سادے اور دلنشیں انداز میں روح، جسم، حیات، موت اور عالم آخرت وغیرہ کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ لالن کو گزرے ہوئے ایک سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر آج تک اس کے نغمے مشرقی پاکستان کی گلی گلی میں گونج رہے ہیں۔ اور ہمیشہ گونجتے رہیں گے۔

وحید قیصر ندوی

اقبال اور بنگالی ادیب

علامہ اقبال مرحوم کی شاعری میں جو پھیلاؤ اور آفاقیت ہے اس کالازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پاک بر اعظم میں جہاں سینکڑوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں شاید ہی کوئی زندہ زبان ایسی ہو جو ان کے کلام اور تعلیمات سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ یہ تاثر یا تو براہ راست ان کی اردو فارسی تصنیفات سے قبول کیا گیا یا ان ترجموں سے جو دنیا کی زندہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔
اہل بنگالہ کو علامہ اقبال سے باقاعدہ روشناس کرانے والے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر اسیا چکرورتی ہیں۔ ان کو علامہ مرحوم سے بڑی محبت تھی اسی لئے وہ بہت دنوں تک لاہور جا کر ان کی صحبت میں رہے اور ان سے فیض اٹھایا، انہوں نے کلکتے کے انگریزی اور بنگلا اخبارات و رسائل میں علامہ اقبال پر مضامین لکھے اور ان کی کئی مشہور فارسی اور اردو نظموں کا بنگلا میں ترجمہ کیا۔ اردو نظموں میں "ہمالہ" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر چکرورتی کے متعلق بنگال کے مسلمان ادیبوں کے ایک طبقے کا کہنا ہے کہ انہوں نے علامہ کی انہی نظموں کا ترجمہ کیا جن میں اقبال ایک سچے محب وطن ہی نہیں بلکہ وطن پرست نظر آتے ہیں لیکن ان کے اس کلام کو چھوا بھی نہیں جس میں وہ سچے اور پکے مسلمان نظر آتے ہیں۔ انہوں نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترجمہ تو کیا ہے۔ مگر "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کا ترجمہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم ان کا یہ احسان اہل بنگالہ کبھی بھلا نہیں سکتے۔ کہ انہوں نے علامہ اقبال پر متعدد مضامین لکھے اور ان کی نظموں کا ترجمہ کر کے بنگال کے مسلمان ادیبوں کو چونکا دیا اور ان میں علامہ کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کر دیا۔

اشرف علی خاں مرحوم

ڈاکٹر چکرورتی کے بعد سب سے پہلے جس شخص نے علامہ اقبال کو اپنا موضوع بنایا وہ کلکتہ کے ایک بنگالی روزنامہ "سلطان" کے اڈیٹر اشرف علی خاں مرحوم تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے "شکوہ" کا بنگلا میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب بنگال کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چلی تھی اور وہ منزل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ "شکوہ" میں مسلمانوں کی منزل کی نشاندہی کی جھلک موجود تھی، شاندار ماضی کا تذکرہ تھا، مسلمانوں کی مذہب سے بیگانگی اور دوری پر ماتم تھا اسلاف کے کارناموں کو یاد دلایا گیا تھا اور ان کو اچھی طرح جھنجھوڑا گیا تھا۔ اشرف علی خاں نے "شکوہ" کا ایک ایک حرف خود بار بار پڑھا۔ اس میں ان کو بنگال کے مسلم عوام کے دکھ درد کا مداوا نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے "شکوہ" کا منظوم ترجمہ کیا۔ انہوں نے ترجمہ کرتے وقت لفظی پابندی کا خیال نہیں کیا۔ بلکہ اصل کے خیالات کو اپنے الفاظ میں خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے مترجم نے اپنے دیباچہ میں علامہ اقبال کو اہل بنگالہ سے روشناس کیا ہے افسوس ہے کہ اس فاضل شخص کو انتہائی تنگدستی کے سبب خودکشی کرنا پڑی اگر وہ کچھ دیر اور زندہ رہتے تو شاید آج علامہ اقبال کی ساری تصنیفات کا بنگلا میں بہت پہلے ترجمہ ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ اشرف علی خاں مرحوم بنگالی کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی کے عالم بھی تھے۔ ان کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ترجمے کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔

پروفیسر قاضی اکرم حسین

اشرف علی خاں کے بعد ایک اور ادیب قاضی اکرم حسین نے علامہ کی "بانگ درا" کی چند نظموں "نیا شوالہ" "ہمالہ" اور "ایک آرزو" وغیرہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان کے منظوم ترجمے "پوھیر باتشی" یعنی راستے کی بانسری کے نام سے چھپ گئے ہیں۔ ان کے ترجمے کچھ ایسے کامیاب نہیں پھر بھی ان کی کوشش قابل تعریف ہے۔

رسالہ محمدی

علامہ اقبال کی وفات کے بعد بنگال میں ان کی شاعری اور تعلیمات کا بہت چرچا ہوا۔ بنگلا کے متعدد رسالوں اور اخبارات نے "اقبال نمبر" نکالے اور ان رسائل و جرائد میں مولانا محمد اکرم خاں کا بنگالی ماہانہ "محمدی" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کے خاص نمبر میں علامہ کے حالات زندگی ان کے فلسفہ حیات اور تعلیمات پر متعدد اہل قلم نے بہت کچھ لکھا۔

پروفیسر امین الدین

رسالہ "محمدی" کے اس خاص نمبر میں ڈھاکہ اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج کے بنگلا کے پروفیسر امین الدین احمد کا "شکوہ اور جواب شکوہ" کا منظوم ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ترجمہ بالکل لفظی ہے پھر بھی قاضی اکرم حسین کے ترجمے سے بہتر ہے۔ اس رسالہ میں "بانگ درا" "ضرب کلیم" "بال جبریل" اور "پیام مشرق" وغیرہ کے متعدد نظموں کے نظم و نثر میں ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

میزان الرحمٰن

بنگلا کے نامور ادیب میزان الرحمٰن کو اردو سے خاص لگاؤ ہے تقسیم سے پہلے دو انجمن ترقی اردو بنگالہ کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں کلکتہ میں اردو کی ترویج و اشاعت میں ان کا خاص حصہ ہے۔ انہوں نے "پوتھیر پیغام" یعنی "راستے کا پیغام" کے نام سے علامہ کی متعدد نظموں کا منظوم بنگالی ترجمہ شائع کیا ہے جس میں بال جبریل اور ضرب کلیم وغیرہ کی متعدد نظموں کے علاوہ "شکوہ اور جواب شکوہ" کا ترجمہ بھی ہے۔ ترجمہ علمی حیثیت سے تو بہت کامیاب رہے لیکن انہیں عوام میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اردو فارسی کے اصل الفاظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ بنا بریں خواص تو ان سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں مگر عوام کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے ان میں زیادہ کشش نہیں پاتے۔ چونکہ گذشتہ دو تین برس سے بنگلا میں اردو فارسی عربی کے الفاظ کثرت استعمال ہونے لگے ہیں اس لئے ان فارسی و عربی آمیز ترجموں کی وقعت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

میزان الرحمٰن علامہ اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں جس کا اظہار ان کی تصنیف "پوتھیر پیغام" کے ہر لفظ سے ہوتا ہے اس کے دیباچے میں انہوں نے اقبال کی تعلیمات اور فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے اور اہل بنگالہ کو ان کی تصنیفات سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلائی ہے۔

ڈاکٹر محمد شہید اللہ

کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ انہیں اردو اور فارسی اور انگریزی کے علاوہ سنسکرت اور فرانسیسی وغیرہ پر عبور ہے انہیں بھی علامہ اقبال سے بڑی عقیدت اور محبت ہے۔ انہوں نے اقبال پر متعدد مضامین لکھے ہیں اور برابر لکھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب شاعر نہیں ہیں مگر انہوں نے بھی "شکوہ اور جواب شکوہ" کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو اہل نظر کی نگاہ میں چنداں قابل اعتنا تو نہیں مگر قابل داد ضرور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے فلسفہ اور تعلیمات پر جو مضمون لکھے ہیں وہ بڑے قابل قدر ہیں۔ موصوف نے ان سب کو ایک مجموعہ کی شکل میں "اقبال" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

محمد سلطان

کلکتہ مدرسہ کے ایک استاد محمد سلطان نے علامہ کی کئی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان ترجموں میں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے جس کے متعلق بنگلا ادب کے نقادوں اور اہل علم کا کہنا ہے کہ یہ دوسرے تمام ترجموں سے بہتر ہے۔

کوی فرخ احمد

مشرقی پاکستان کے جواں سال شاعر فرخ احمد نے بھی جنہیں علامہ اقبال سے بے انتہا محبت ہے۔ "جواب شکوہ" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو بنگلا ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ فرخ احمد آج کل فارسی کلام کا ترجمہ کرنے میں مشغول ہیں امید ہے کہ وہ بہت ہی جلد اپنی متعدد قابل قدر چیزیں ملک کے سامنے پیش کر سکے گا۔

ابوالکلام مصطفیٰ

ابھی تین چار مہینے ہوئے ایک غیر معروف ادیب ابوالکلام مصطفیٰ نے علامہ اقبال کے "شکوہ اور جواب شکوہ" کے انداز میں ایک "شکوہ اور جواب شکوہ" لکھا ہے جس میں خیالات تو سارے اقبال کے ہیں مگر محاکات اور منظر کشی میں بنگال کا ماحول سامنے رکھا گیا ہے۔ دیباچہ میں لکھا گیا ہے کہ یہ جدت اس لئے کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کو اہل بنگالہ بہت قریب سے دیکھ سکیں اور اچھی طرح سمجھ سکیں ساتھ ہی ان کو کسی قسم کی بیگانگی یا غیریت محسوس نہ ہو۔ ابوالکلام مصطفیٰ اپنے اس مقصد میں بہت کامیاب رہا ہے۔

سید عبد المنان

باریسال کے رہنے والے سید عبد المنان پہلے شخص ہیں جنہوں نے علامہ مرحوم کی "اسرار خودی" کا نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ دوسرا مصنف کی نظر ثانی کے بعد

حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اور بڑی تیزی کے ساتھ فروخت ہو رہا ہے۔

پروفیسر سید علی احسن "پوربا پاکستانیر ساہتیہ بھومیکا" یعنی مشرقی پاکستان کا ادبی سرمایہ اور "نذر الاسلام پر ایک نظر" کے مصنف اور مشرقی پاکستان کے نامور مسلمان نقاد اور شاعر پروفیسر سید علی احسن بھی علامہ اقبال سے بے انتہا متاثر ہیں جس کی جھلک ان کی تمام تصنیفات میں نمایاں ہے۔ انہوں نے "اسرار خودی" کا نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جو مولانا محمد اکرم خاں کے بنگالی ماہنامہ "محمدی" میں لگاتار کئی مہینے چھپتا رہا اور بنگالی ادیبوں اور شاعروں میں بہت مقبول ہوا۔ مشہور بنگالی نقاد مسٹر شودھا چکرورتی نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ مولانا اکرم خاں کو بھی یہ ترجمہ بہت پسند تھا۔ چنانچہ اسی لئے وہ ہمیشہ اسے اپنے رسالے کے پہلے صفحے پر چھاپتے تھے۔ یہ ترجمہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔

پروفیسر آدم الدین احمد علامہ کی فارسی تصنیف "رموزِ بے خودی" کا ترجمہ شانتی نکیتن کے پروفیسر آدم الدین احمد نے کیا ہے یہ ترجمہ بھی رسالہ "محمدی" میں بالاقساط چھپتا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائیگا۔ اگرچہ یہ ترجمہ کچھ بے جان سا ہے، پھر بھی کوئی اور ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے غنیمت ہے۔

پاکستان کی تحریک کے وجود میں آتے ہی علامہ اقبال کا نام ہر شخص کی زبان پر آنے لگا تھا اور ان کی شخصیت ادبی محلفوں سے زیادہ سیاسی محفلوں میں موضوع بحث بن گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد علامہ مرحوم پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سیاسی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے اور بنگالی ادیبوں نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں سیاسی پہلو غالب ہے۔

اس سلسلہ میں مشرقی بنگال کے وزیر صحت جناب حبیب اللہ بہار کا نام سرفہرست ہے۔

آنریبل حبیب اللہ بہار جنہوں نے اپنی کتاب "کوی اقبال" یعنی شاعر اقبال" میں اسی پہلو پر زور دیا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اسکو چھپے ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔ مگر آج تک اسکی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

منور الدین چودھری یہ آسام کے سابق وزیر تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی تصنیفات میں "نو جلوہ" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے اقبال کی شخصیت اور ارشادات کے سیاسی پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس وقت مشرقی بنگال میں نوجوان لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کا موضوع علامہ اقبال کا فلسفہ اور تعلیم ہے۔ ان میں محمد واجد علی، سید علی احسن، درخ احمد اور ابو نعیم بذل الرشید وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابو نعیم بذل الرشید ابو نعیم بذل الرشید نے حال ہی میں ایک کتاب "مہاکوی اقبال" یعنی شاعر اعظم اقبال لکھی ہے جس میں علامہ کے ارشادات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا دیباچہ پروفیسر سید علی احسن نے لکھا ہے۔

تعلیم یافتہ خواتین کو بھی حضرت علامہ مرحوم سے کچھ کم عقیدت نہیں چنانچہ متعدد خواتین نے ان پر زنانہ اور دوسرے رسالوں میں کثرت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان ہی میں مشہور شاعرہ بیگم صوفیہ کمال، بیگم شمس النہار محمود، بیگم حبیب اللہ بہار، انورہ خاتون، رقیہ انوار اور بیگم فضل الرحمن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مشرقی پاکستان کے محکمۂ تعلیم نے علامہ اقبال کے کلام کا کافی حصہ کورس میں داخل کر دیا ہے۔ بنگالی ادبی انجمنیں مثلاً "نندن"، "کلیس" وغیرہ یوم اقبال بڑے پیمانے پر منانے لگی ہیں۔ ان کے جلسوں میں علامہ مرحوم پر بنگالی میں تقریریں ہوتی ہیں۔ مقالے پڑھے جاتے ہیں اور نظمیں سنائی جاتی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ علامہ مرحوم کی مقبولیت اور بھی بڑھ جائے گی اور مشرقی پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شخص ان کا کلام اپنی کی زبان میں پڑھ سکے گا۔

وحید قیصر ندوی

نیا ڈھاکا

آزادی کے وقت ڈھاکے کی آبادی کُل دو لاکھ تھی مگر اب اس کی آبادی چھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ تقسیم کے بعد جب ڈھاکا مشرقی پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا تو اس کی اہمیت اچانک بڑھ گئی۔ یہاں ہر قسم کے افراد کی کثیر تعداد میں آمد شروع ہو گئی۔ یہ چھوٹا سا شہر تیزی سے صنعتی اور تجارتی شہر بننے لگا۔

جس وقت ڈھاکے کو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا اس وقت یہاں چند عمارتوں کے سوا ایسی کوئی عمارت نہیں تھی جسے واقعی عمارت کہا جا سکے۔ چنانچہ سرکاری دفاتر کے قیام میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، خوش قسمتی سے طالبات کے ایک کالج ایڈن گرلس کالج کی نئی اور بڑی عمارت ڈھاکے میں تھی جس میں صوبائی حکومت کا سکریٹریٹ قائم کیا گیا۔ خود کالج کو ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

اس طرح سے مرکزی حکومت کے دفاتر کے لئے بھی کوئی موزوں جگہ ڈھاکے میں موجود نہیں تھی۔ ایک طرف سرکاری دفاتر کی ضروریات بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور دوسری طرف تجارت اور صنعت آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر حکومت نے فوری طور پر تین اسکیمیں منظور کیں۔ ان میں سے ایک اسکیم دھان منڈی ٹاؤن پلاننگ اسکیم دوسری موتی جھیل تجارتی علاقہ کی توسیع اور تیسری تیج گاؤں میں چھوٹے پیمانے پر صنعتی علاقے کی ترقی۔

ان تینوں اسکیموں پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دھان منڈی کے علاقہ میں نئی رہائشی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہو گیا اسی طرح سے موتی جھیل کے علاقے میں بہت سی تجارتی فرموں نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کر کے اپنے دفاتر کھول لئے اور تیج گاؤں کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا صنعتی شہر وجود میں آ گیا۔ لیکن ڈھاکے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر یہ تینوں اسکیمیں کافی نہیں سمجھی گئیں۔ اور حکومت نے ڈھاکے کی توسیع اور اسے خوبصورت اور صاف ستھرا شہر بنانے کے لیے ڈھاکا امپروومنٹ ٹرسٹ کے قیام پر غور و فکر شروع کی۔ آخرکار حکومت نے ۱۹۵۶ء میں ایک خاص قانون کے ذریعہ ڈھاکا امپروومنٹ ٹرسٹ کے قیام کی منظوری دی اس کے لئے شروع میں ایک کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ۱۹۵۷ء میں ڈھاکا امپروومنٹ ٹرسٹ کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ یہ عمارت چھ منزلہ ہے اور آخری منزل کے اوپر ایک چار منزلہ کلاک ٹاور بنایا گیا ہے یہ عمارت اس وقت ڈھاکے میں سب سے اونچی عمارت ہے۔ اس کی تعمیر پر حکومت کے تیرہ لاکھ روپے صرف ہوئے، اس وقت اس عمارت میں ڈھاکا امپروومنٹ ٹرسٹ کے دفاتر اور بعض دوسری بہت بڑی بڑی کمپنیوں اور مشرقی پاکستان کے پانی اور بجلی کے دفاتر واقع ہیں۔ اس عمارت سے امپروومنٹ ٹرسٹ کو پونے دو لاکھ روپے ماہانہ کرایہ وصول ہوتا ہے سب سے پہلے یہاں کی سڑکوں، فٹ پاتھ اور عام راستوں کی توسیع کا پروگرام بنایا، ابتدا میں کام تیزی سے آگے بڑھا مگر کچھ دنوں کے بعد ترقی کے راستے میں ایسی رکاوٹیں پیش آ گئیں کہ کام کی رفتار سست پڑ گئی، پھر جوں جوں کام بڑھتا گیا، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ جو کچھ بھی کیا جائے وہ کسی خاص پلان اور نقشہ کے ماتحت ہو۔ اس لئے امپروومنٹ ٹرسٹ نے ایک ماسٹر پلان کی ضرورت محسوس کی کیونکہ بغیر ماسٹر پلان کے کام میں وہ خوبی، تنظیم اور تیزی نہیں پیدا ہو سکتی ہے جو ماسٹر پلان کے بن جانے اور اس پر عمل کرنے سے ہو سکتی ہے۔

اس وقت اپنے ملک میں ٹاؤن پلان بنانے والوں کی بڑی کمی تھی چنانچہ کولمبو منصوبہ کے تحت انگلستان سے ٹاؤن پلانر بلائے گئے۔ ٹاؤن پلاننگ کا کام نہایت ہی محنت اور وقت طلب ہے اس میں کافی وقت صرف ہوتا ہے لیکن ان پلان بنانے والوں نے ڈیڑھ سال کے

عرصے میں ڈھاکا اور اس کے آس پاس کے علاقہ کے لئے ایک بہت ہی اعلیٰ ماسٹر پلان تیار کیا۔

ڈھاکا چونکہ ایک جزیرہ کی طرح ہے اس لئے اسکی پلاننگ میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈھاکہ کی جنوب میں دریائے بوڑھی گنگا، مشرق میں ستیہ لکھا، مغرب میں دریائے تراک اور شمال میں دریائے ٹونگی واقع ہے ڈھاکا ان چاروں دریاؤں کے وسط میں واقع ہے۔ اس شہر کا زیادہ علاقہ نشیبی ہے جو چھ مہینے تک پانی میں ڈوبا رہتا ہے اس نشیبی علاقہ میں صرف دھان کی کاشت ہو سکتی ہے۔

ماسٹر پلان بننے کے بعد معلوم ہوا کہ ڈھاکا اور اس کے آس پاس کی وہ زمین جس کی توسیع ہو سکتی ہے وہ صرف سات ہزار ایکڑ ہے، اس سات ہزار ایکڑ کا بیشتر حصہ حکومت نے حاصل کرلیا ہے۔ اس سات ہزار ایکڑ میں سے ایک ہزار زمین فیض آباد کے مقام پر ڈھاکا یونیورسٹی کی نئی عمارت کے لئے مخصوص کردی گئی ہے۔ ٹونگی کے مقام پر چھ سو ایکڑ صنعتی علاقہ کے لئے رکھی گئی ہیں جہاں اب بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کئے جا سکیں گے اس علاقہ میں کئی ٹیکسٹائل اور جوٹ ملیں قائم ہو چکی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ــــ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے ایک انگریزی دواساز کارخانہ کے تعاون سے دواسازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا ہے، ٹونگی کے قریب ہی ایک ہزار ایکڑ زمین رہائشی ضرورتوں کے لئے استعمال کی جائے گی۔

اسی طرح سے حکومت نے شاہ علی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے متصل کو میرپور کے مقام پر پندرہ سو ایکڑ زمین حاصل کی ہے جس میں ایک نواحی شہر آباد کیا جائے گا اس شہر میں پانچ ہزار کے قریب مہاجروں کے خاندان کو مکانات اور زمین دیے جائیں گے۔ اور بقیہ زمینوں پر جو پانچ کٹھہ دس کٹھہ اور ایک بیگھہ کے پلاٹوں پر مشتمل ہو گی کسی بھی ضرورت مند کے ہاتھ حکومت مناسب قیمت پر فروخت کرے گی۔

اسی طرح سے حکومت ڈھاکے سے قریب بھولا کے مقام پر ایک اور نواحی شہر گلشن تعمیر کرے گی۔ ڈھاکا امپرومنٹ ٹرسٹ بھولا کی ترقی اور توسیع کی طرف خصوصی توجہ دے رہا ہے۔ ڈھاکا شہر اور اس کے آس پاس کے لوگوں کے لئے موجودہ ریلوے لائن بڑی مصیبتوں کا باعث بنی ہوئی ہے روزانہ شہر کے رہنے والوں کا کافی سے زائد قیمتی وقت ریلوے کراسنگ کے پاس کھڑے کھڑے گزر جاتا ہے، کافی عرصہ سے ڈھاکا ریلوے اسٹیشن کو موجودہ مقام سے منتقلی کی اسکیمیں زیر غور تھیں اب خدا خدا کرکے ڈھاکا امپرومنٹ ٹرسٹ نے اس اہم کام کے سلسلے میں بھی مکمل اسکیم تیار کرلی ہے اور اس پر عمل بھی شروع کردیا گیا ہے۔ کملاپور کے مقام پر نئے اسٹیشن کی عمارات اور ریلوے کے دفاتر کی جگہ منتخب کرلی گئی ہے وہ دن بہت جلد آجائے گا جب ڈھاکا کی پندرہ بیس level crossing ہمیشہ کے لئے کھول دیے جائیں گے۔

موجودہ ڈھاکا ریلوے اسٹیشن کو ایک خوبصورت بازار میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ریلوے لائن شہر کے باہر تیج گاؤں کی طرف چلی جائے گی۔ ریلوے لائن کے لئے جو زمین حاصل کی گئی ہے اس پر جو لوگ پہلے سے آباد ہیں انکی مناسب آبادکاری کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

ایک تیسرا بڑا نواحی شہر دھان منڈی کے رہائشی علاقہ کے بالکل متصل تیزی سے تکمیل پذیر ہے یہ بڑا نواحی شہر محمد پور ہاؤسنگ اسٹیٹ ہے یہاں کم اور متوسط آمدنی کے مہاجروں کو کم دام پر مکانات اور زمین دی گئی ہے۔ یہاں پر تقریباً پندرہ سو خاندان مکانوں میں آباد ہو چکے ہیں مکانوں کا الاٹمنٹ ہو چکا ہے، البتہ زمینوں کے الاٹمنٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس علاقہ کو بڑی خوبصورتی سے ترقی دی گئی ہے اس کی سڑکیں وغیرہ بڑی ہی صاف ستھری اور لمبی چوڑی بنائی گئی ہیں۔ اس علاقہ میں بجلی پہونچ چکی ہے۔ پانی بھی تمام گھروں میں پہونچایا جا چکا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ کم کرایہ کے پندرہ سو تین فلیٹ بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ فلیٹ بھی پورے طور سے آباد ہو چکے ہیں۔ پرانے شہر میں تقریباً ہر سال سیلاب کا پانی گھس آتا تھا، سیلاب کے پانی کی روک تھام کے لئے دولائی کھال کے وسط میں اندرون زمین پختہ نالا تیزی سے تعمیر کیا جا رہا ہے نالے کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد اس نالے کے اوپر ایک سو فٹ چوڑی سڑکیں بنائی جائیں گی، سڑکوں کی دونوں جانب نئی نئی دکانیں تعمیر کی جائیں گی۔ شروع میں نواب پور روڈ کی توسیع کا پروگرام تیزی سے مکمل ہو رہا تھا۔ لیکن اس علاقہ میں عمارتوں اور زمین کی قیمتوں کی ادائگی کا تناسب اس قدر زیادہ ہے کہ امپرومنٹ ٹرسٹ نے فوری طور پر اس قدر کثیر رقم خرچ کرنا مناسب نہ سمجھا اور سر دست اس اسکیم کو آئندہ کے لئے ملتوی کرکے دولائی کھال کے وسط میں اندرون زمین نالا اور اس کے اوپر سڑکوں کی تعمیر کے کام کی طرف توجہ دی ہے جب یہ کام مکمل ہو جائے گا تو پرانے ڈھاکا میں یہ بھی ایک دیکھنے کی چیز ہو گی۔

ڈھاکا اسٹیڈیم کے قریب یہاں کی بہت بڑی جامع مسجد کی

تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔ جہاں پر مسجد تعمیر کی جا رہی ہے وہاں پہلے ایک بڑا تالاب تھا۔ جسے امپروومنٹ ٹرسٹ نے بہت تھوڑے عرصے میں بھر دیا۔ اور اب مسجد کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اس مسجد کے بن جانے کے بعد جناح ایوینیو اور اس کے آس پاس کا علاقہ اور بھی خوبصورت ہو جائے گا۔

انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرس کے قریب ڈھاکے کا سب سے بڑا پارک رمنا گرین مکمل ہو چکا ہے یہ پارک آئندہ ایک بڑا زوالوجیکل گارڈن میں تبدیل ہو جائے گا اسکی قدرتی جھیل کے پاس پارک میں ٹہلنے والوں کے لیے بڑی اچھی نشست گاہیں بنائی گئی ہیں۔

ریس کورس سے لیکر تیج گاؤں کے علاقہ تک سڑک چوڑی کی جا رہی ہے میرپور روڈ کی توسیع تیزی سے جاری ہے۔ ڈھاکا امپروومنٹ ٹرسٹ کے سامنے بھی ایک عظیم الشان پارک کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔

پانچ سالہ منصوبے کے سلسلہ میں تعمیراتی کام شروع ہو چکا ہے ضمنی (؟) الحکومت کی تعمیر کا کام بھی جلد شروع ہو جائے گا غرض کہ جو ڈھاکا کل تک ایک معمولی سا شہر تھا اب تیزی سے پاکستان کا سب سے بڑا شہر بنتا جا رہا ہے جس تیزی سے کام ہو رہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے یہ پیشنگوئی آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ ڈھاکا کے عظیم الشان شہر بننے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔

محمد پور کالونی مکمل ہو چکی ہے اس کا ٹاؤن ہال ابھی حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے۔ محمد پور کالونی کا سنگ بنیاد جنرل اعظم خاں نے رکھا تھا اور پچھلے سال صدر نے کالونی کا افتتاح فرمایا تھا۔ ڈھاکے میں ایڈن گرلس کالج کی نئی شاندار عمارت اور ہوسٹل تیار ہونے کے قریب ہیں۔ ڈھاکا کالج کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ شاہ باغ ہوٹل کے قریب سڑک چوڑی کی جا چکی ہے۔
شاہ باغ کے قریب ایک خوبصورت فوارہ بنایا گیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے غرض کہ ڈھاکا واقعی ڈھاکا بنتا جا رہا ہے۔ اگر یہ تمام اسکیمیں روبہ تکمیل آ گئیں تو پھر اس شہر کا حلیہ ہی بدل جائے گا۔ شہر کی بہتری اور توسیع وغیرہ کے سلسلے میں عوام کے تعاون کی بے حد ضرورت ہے۔

یہ نہایت ہی خوشی کی بات ہے کہ اب "گلشن" کا باضابطہ سنگ بنیاد صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۲۴ جولائی کو اپنے دست مبارک سے رکھا ہے۔ گلشن کے اندرونی حصہ میں چوڑی چوڑی کئی سڑکیں مکمل ہو چکی ہیں۔ الیکٹرک کے کھمبے بھی نصب کیے جا چکے ہیں۔ اور اب وہاں باضابطہ بجلی بھی پہنچائی جا چکی ہے۔ گلشن کو تیج گاؤں صنعتی علاقہ کی طرف سے اور مہاکھالی کی طرف سے نئی اور چوڑی سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔
گلشن کے رہائشی اور صنعتی پلاٹوں کے لیے درخواستیں منظور کی جا چکی ہیں گلشن میں جدید ترین وضع کی عمارتیں بننا شروع ہو گئی ہیں جب گلشن کی تعمیر مکمل ہو جائے گی تو بلاشبہ اسے نوجی حکومت کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا۔

چٹائی کی صنعت (بسلسلہ صفحہ ...)

جگہوں میں اگایا جاتا ہے۔ اس پودے سے وہ نفیس پتلی اور خوبصورت چٹائی بنتی ہے جو سیتل پاٹی (SITAL PATI) کے نام سے مشہور ہے یہ پودے سات کنیا نرائن ہاٹ، لیمر ہاٹ، اوزن اور نیلا نامی تھانوں کے علاقوں میں اگتے ہیں۔

کھلنا سات کھیرا اور صدر سب ڈویژن، میں کثرت سے چٹائیاں بُنی جاتی ہیں تقریباً پچیس ہزار ۲۵۰۰۰ کاریگر ہیں جو اس سے روزی کماتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں تیار ہونے والی چٹائیوں کی تعداد ۳۳ لاکھ ہے۔ یہاں ایک قسم کا پودا اگایا جاتا ہے۔ جسے مالیا (MALIA) کہتے ہیں۔ یہ پودے بڑی احتیاط سے رکھے جاتے ہیں تاکہ دیمک کا شکار نہ بن جائیں، یہ پودے، اساسونی، دمور با، سات کھیرا، پیکا چھی اور دیباب تھانوں کے علاقوں میں اگائے جاتے ہیں۔ یہ ایسی جگہوں میں اگتے ہیں جہاں کا پانی میٹھا اور کھارا دونوں ہو۔

کھلنا کی چٹائیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں یہ حصیر کہلاتی ہیں۔ یہ سنگاپور کی چٹائیوں کے ٹکر کی ہوتی ہیں۔

وحید قیصر ندوی

طوفانوں کی سرزمین

نواکھالی

عرب جہازراں اور مسلمان سیاح پندرھویں اور سولھویں صدی میں اسلام آباد (چاٹگام) کی بندرگاہوں تک تجارتی غرض سے برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ بہت سے عرب تاجر چاٹگام کے اندرونی علاقہ تک کاروبار کے سلسلہ میں پہنچ جایا کرتے تھے بعض عرب تاجر اور عرب سیاحوں نے اس علاقہ کی سرسبزی اور شادابی سے متاثر ہو کر یہیں رہنے بسنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ آج چاٹگام اور اس سے متصل نواکھالی میں بےشمار افراد عرب تاجروں اور عرب سیاحوں کے خاندان سے ہیں نواکھالی اور چاٹگام کے رہنے والوں پر عربوں نے اس قدر گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کی زبان کلچر، رہن سہن طور طریق عربوں سے آج تک ملتے جلتے ہیں اور پھر سب سے بڑی ترکی اسلام سے محبت، دینی حمیت و غیرت اور بہادری ہیں یہ دونوں علاقے اپنی آپ مثال ہیں۔ یہ بہادری نہیں تو کیا ہے کہ ہر سال ان علاقوں کے رہنے والے زبردست طوفانوں اور سیلابوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔

تاریخی حیثیت سے نواکھالی کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے مگر یہ بات اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ ہندوؤں کے دیوتا رام جی اور سیتا جی نے اپنے بن باس کا ایک بڑا حصہ اس علاقہ میں گذارا ہے اس علاقے میں زیادہ سادھوؤں نے ڈیرے ڈالے ہیں چونکہ یہ علاقہ سرسبز اور دریا اور سمندر سے گھرا ہوا ہے اس لئے نہایت ہی خوش منظر اور دل فریب ہے۔ اس علاقہ کا قدرتی حسن صاحب نظر اور صاحب دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتا ہے۔

سادھوؤں کے قیام پذیر ہونے اور رام جی اور سیتا جی کے طویل قیام کی وجہ سے اس علاقے کو ہندو نہایت متبرک اور تاریخی سمجھتے ہیں۔ اس لئے پہلے پہل اس علاقہ میں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد آباد ہو گئی۔

سب سے پہلے یہاں محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ساتھ آنے والے عرب سپاہیوں کی ایک مختصر تعداد کسی نہ کسی طرح اس طرف رہ گئی اسکے مشہور سیاح ابن بطوطہ اس طرف آنکلا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں نواکھالی کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے نواکھالی کے ایک مسلمان گھرانے میں شادی بھی کی۔

ابن بطوطہ کی اس تحریر سے یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ ابن بطوطہ سے پہلے یہاں مسلمانوں کے قدم پہنچ چکے تھے۔

بنگال کی تاریخ کے صفحات اس بارے میں خاموش ہیں لیکن اب آہستہ آہستہ یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ٹپرا موجودہ کومیلا کے راجہ نے جب نواکھالی پر حملہ کر کے اس علاقہ کو ٹپرا میں شامل کرنے کی کوشش کی تو نواکھالی کے راجہ نے دہلی کے شہنشاہ محمد تغلق سے مدد چاہی تھی، چنانچہ شہنشاہ تغلق کی فوجیں نواکھالی کے راجہ کی مدد کو آئیں اور اس فوج نے ٹپرا کے راجہ کو بھاری شکست دی۔

یہ واقعہ ۱۳۷۹ء کا ہے۔ اس کے بعد پھر ٹپرا کے راجہ نے سرکشی کی اور وہ اس مرتبہ سنارگاؤں کی طرف بڑھا مگر سنارگاؤں (موجودہ ڈھاکا کا ضلع) کے گورنر الیاس شاہ عرف شمس الدین نے اسکو صرف زبردست شکست ہی نہیں دی بلکہ اس نے ۱۳۴۷ء میں ٹپرا پر قبضہ بھی کر لیا۔ اسی زمانہ میں چاٹگام پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح چاٹگام سے کر سنارگاؤں تک خالص مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

مسلمانوں کے دور حکومت میں اولیاء اللہ، صوفیا اور مبلغین کو اسلام کی تبلیغ کا کافی موقع ملا جس کی وجہ سے اس علاقہ میں بڑی تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس علاقہ میں ہر طرف اسلام کی شمع روشن ہو گئی اس علاقہ کی سرسبزی و شادابی اور خوشحالی کی داستانیں سارے دنیا میں پھیل گئیں۔ ہر طرف سے سیاحوں اور تاجروں کا تانتا بندھ گیا۔

انگلستان کے ایک سیاح نے اس علاقہ کا دورہ کرنے کے بعد اپنے سفرنامہ میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کے اس علاقہ کی سرسبزی اور شادابی کا کوئی جواب نہیں۔ نواکھالی کا علاقہ مشرقی پاکستان کا سب سے زرخیز

اور مالدار علاقہ ہے۔ اس علاقہ کے پاس بڑی تربیت یافتہ فوج ہے۔

سولہویں صدی میں پرتگالی ڈاکوؤں نے اس علاقہ کو مسلمانوں سے چھین لیا مگر پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس علاقہ کے گورنر فتح خاں نے پرتگالی ڈاکوؤں کو مار بھگایا اور یہ علاقہ دوبارہ آزاد کرا لیا۔ اور پھر اس علاقہ پر اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ سترھویں صدی میں پرتگالیوں نے دھوکے سے دوبارہ اس علاقہ پر قبضہ کر لیا لیکن چند ہی مہینے کے بعد دوبارہ مسلمانوں نے سندیپ پر قبضہ کر لیا اور پرتگالیوں کو بھگا دیا۔ اس مرتبہ مسلمانوں نے کافی دور تک پرتگالیوں کا پیچھا کیا اور انہیں اتنا نقصان پہنچایا کہ دوبارہ انہیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

سترھویں صدی کے آخری دور میں اس علاقہ میں پھر کچھ بغاوتیں ہوتی رہیں مگر اورنگزیب عالمگیر کے سپہ سالار شائستہ خاں نے اپنی بہادری شجاعت اور حسن تدبیر سے تمام بغاوتوں کو فرو کر دیا۔ ۱۷۳۲ء میں دہلی کی مغل حکومت نے نواکھالی اور اس کے آس پاس کے جزیروں کو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کے گورنر کے ماتحت کر دیا۔ جس کے بعد اس علاقہ میں رنگی ترقیوں کا دور شروع ہوا لیکن ۱۷۶۵ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کی تو اس علاقہ کی ترقی رک گئی اور رفتہ رفتہ علاقہ افلاس اور ادبار کا شکار ہو گیا۔ یہاں نمک سازی کی صنعت عروج پر تھی مگر انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بنا پر یہاں کی اس قدیم صنعت کو تباہ و برباد کر دیا اسی طرح اس علاقہ میں تیل کی صنعت بھی کامیابی سے چل رہی تھی مگر رفتہ رفتہ اس صنعت نے بھی دم توڑ دیا۔ ۱۸۲۰ء تک سندیپ، مطلب دیا، مسجدی بیگم بازار ہاٹ وغیرہ الگ الگ تھے مگر انگریزوں نے اپنی مصلحت اور انتظامی ضروریات کے پیش نظر ان تمام علاقوں کو ملا کر ایک کر دیا۔

تقسیم سے کچھ پہلے مطلب دیا کو چاٹگام کے ماتحت کر دیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں فسادات کے دوران جب نواکھالی میں معمولی سا جھگڑا ہوا تو کانگریس کے رہنما گاندھی اور ہندو پریس نے یہاں کے فسادات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

۱۹۴۶ء میں گاندھی جی نواکھالی [illegible] کی آمد کی وجہ سے ایک بار پھر نواکھالی کا نام ہر طرف [illegible] ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہاں [illegible] اسلامی جھنڈا بڑی آن بان سے لہرانے لگا۔ یہاں کے نوجوان جوق در جوق پاکستان کی بحری فوج میں بھرتی ہونے کے لئے کراچی پہنچنے لگے۔

پاکستان بننے کے بعد نواکھالی، سلہٹ اور چاٹگام کے علاقے ہی ایسے ہیں جہاں سے بے شمار نوجوانوں نے بے کھٹکے پاکستان کی بحری فوج کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ان علاقوں کے جیالے ملاحوں نے دنیا بھر کے لوگوں سے اپنی برتری تسلیم کرائی۔

سیلاب، طوفان، سائیکلون اور آندھی، نواکھالی والوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہر سال طوفان آتے رہتے ہیں جو زبردست تباہ کاریاں مچاتے ہیں مگر یہاں کے رہنے والے سیلابوں، طوفانوں اور سائیکلوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں جو زبردست سائیکلون آیا تھا اور جس میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے اس کے بعد بھی یہاں کے رہنے والوں نے ہمت نہیں ہاری اور بدستور اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر کسی اور علاقے کے رہنے والے ہوتے تو شاید ایسے طوفانی علاقے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو جاتے مگر نواکھالی کے بہادر اور جیالے لوگ کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ہر سال سیلابوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ نواکھالی کے سیلاب کی تاریخ پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے ۱۷۹۷ء میں ایک زبردست سائیکلون اور طوفان آیا ہے کہا جاتا ہے کہ اس سے بڑا اور تباہ کن سیلاب اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

اس سیلاب میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ اس سیلاب کے تقریباً ۵۰ سال بعد ۱۸۲۳ء میں بھی ایک زبردست سیلاب آیا جو بہت سے علاقوں کو بہا لے گیا اس کے بعد ۱۸۲۵ء میں دوبارہ ایک زبردست سیلاب آیا جس نے نواکھالی کے علاقے ہتیا، سندیپ، رام گاتی وغیرہ کو ایک طرح سے بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔

۱۸۲۵ء کے بعد ۱۸۴۸ء میں ایک سیلاب آیا جس کی تباہ کاری کی مثال مشکل سے ملے گی مگر ۱۸۶۷ء میں جو سیلاب اور سائیکلون آیا اس نے پچھلی تمام تباہکاریوں کو پیچھے چھوڑ دیا اس سائیکلون اور سیلاب میں سمندر کا پانی ہتیا میں گھس گیا اور یہ پورا علاقہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں بھی ایک زبردست سائیکلون نے نواکھالی کے ایک حصے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، یہ سائیکلون جو ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۶ء کو آیا اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں یوں لکھی ہوئی ہے کہ دو دنوں تک آسمان پر اندھیرا چھایا رہا۔ ہر طرف گرج چمک اور تیز آندھی کے ساتھ بارش ہوتی رہی۔ ۳۱ اکتوبر کی شام کو زبردست آواز کے ساتھ سمندر کی موجیں نواکھالی کے علاقوں

پڑھ رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی زبردست سائیکلون کا سلسلہ شروع ہوا۔ نواکھالی کا تمام علاقہ زیرِ آب آگیا، تمام درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ سوائے نواکھالی کے ڈپٹی کلکٹر کے گھر کے ہر شخص کا گھر زمین بوس ہوگیا۔ اور ایسے سمندر کی طوفانی موجیں اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ ہتھیا کے اور سندیپ کے جزیروں کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ ان جزیروں کے رہنے والے خلیج بنگال سے اٹھنے والی سمندری لہروں میں ایسے گھر گئے کہ ان کا خاتمہ ہی ہوگیا۔ ان طوفانی لہروں میں ہلاک ہونے والوں کی کم سے کم تعداد ایک لاکھ تھی۔ طوفان کے ختم جانے کے بعد پورے نواکھالی میں زبردست ہیضہ اور چیچک اور دوسری وبائی بیماریاں پھیل گئیں جن میں مرنے والوں کی تعداد ۴۹ ہزار تھی۔

اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں اور ۱۸۹۴ء و ۱۸۹۵ء میں بھی طوفان اور سائیکلون نے زبردست تباہکاری مچائی۔ ان طوفانوں اور سائیکلون میں انسانی جانیں تو کم تلف ہوئیں مگر ان کے بعد یہاں کے چھالیہ کے درخت، کیلے، اور ناریل کے درختوں میں ایسی بیماری پیدا ہوئی کہ پورے علاقے کے تمام درخت سوکھ گئے۔

اس علاقہ میں چھالیہ، کیلے، ناریل، سبزیاں اور مچھلیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ مرغیاں، بھیڑیں، بکریاں اور گائیں پالنے کا عام رواج ہے اس علاقہ میں دودھ، دہی اور گھی کثیر مقدار میں ہوتا ہے۔

یہاں کے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا عام رواج ہے۔ یہاں کے رہنے والے دنیا بھر میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ عام لوگوں میں ملاحی اور ماہی گیری کا پیشہ بہت مقبول ہے۔ مچھلیوں کے کاروبار میں یہ علاقہ بہت سے علاقوں سے آگے ہے یہاں کے رہنے والے لوگ بہت ہی جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں، مذہب سے یہاں کے رہنے والوں کو خاص لگاؤ ہے، ہاتھ کے کپڑے بننے، اونی کمبل تیار کرنے اور چٹائی بانی میں یہ علاقہ دور دور تک مشہور ہے۔

پاکستان کی نئی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ یہاں کا رقبہ ایک ہزار پانچسو ۹۸ مربع میل ہے۔ فی میل آبادی کا اوسط پندرہ سو افراد ہے، جو غالباً دنیا بھر میں بہت زیادہ ہے۔

عام طور سے دریا کے راستے سب کاروبار انجام پاتا ہے۔ آمدورفت اور تجارتی کاموں کیلئے دریا، ندیاں اور سمندر استعمال کیا جاتا ہے۔ سارا علاقہ دریاؤں اور سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ زیادہ حصہ خلیج بنگال کے دہانے پر واقع ہے اس لئے سڑکیں وغیرہ بہت کم ہیں۔ اس کے باوجود کوئی ۲۰ میل پختہ سڑکیں اور چار ہزار میل کچی سڑکیں ہیں۔ ڈھاکہ سے ریل سے رابطہ قائم ہے۔ خود نواکھالی میں ریل کی ۶۰ میل لمبی پٹری ہے۔ ڈھاکہ کے علاوہ چاندپور اور چاٹگام سے بھی ریلوے کا سلسلہ قائم ہے۔

۱۹۶۱ء کے طوفانی سیلاب اور سمندری لہروں نے نواکھالی کو زبردست نقصانات پہنچائے تھے۔ ان نقصانات کی تفصیلات سب کو معلوم ہیں اس لئے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ سیلاب اور طوفان اسقدر زبردست تھا اور اسکی تباہ کاریاں اتنی عظیم تھیں کہ اسکی مثال نواکھالی کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی۔

لیکن یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس سیلاب اور طوفان پر جس تیزی سے قابو پایا گیا ہے اسکی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی ہے۔ اتنے زبردست سیلاب کے بعد وبائی بیماریاں پھیلنا یقینی تھا مگر موجودہ حکومت نے اس تیزی سے طبی امداد بھیجی اور امدادی کام اس تیزی سے ہوا کہ سیلاب و طوفان کا زخم فوراً ہی مندمل ہوگیا۔ اب پھر سے نواکھالی کے رہنے والے ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے ہیں۔ وہ سیلاب و سائیکلون سے بے پرواہ ہو کر ملک کو خوشحال اور مضبوط بنانے کے لئے آگے آگئے ہیں۔ ملک کے تمام شعبوں میں یہاں کے لوگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ صحافت، سیاست، تجارت اور صنعت و حرفت میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ملک کی دفاعی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بھی یہاں کے لوگ کافی حصہ لے رہے ہیں۔ غرضکہ یہ پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی میں آگے آگئے ہیں۔

نواکھالی اگرچہ مشرقی پاکستان کا بہت ہی چھوٹا ضلع ہے مگر یہ قیمت میں بہت بڑا ہے۔ اس کا مستقبل شاندار ہی نہیں بلکہ شاندار تر ہے۔

سید وحید قیصر ندوی

مشرقی پاکستان کے لوک سنگیت

مشرقی بنگال جہاں کی سر زمین سونے کے بار اگاتی ہے، جہاں کے حسین قدرتی مناظر آنکھوں کے لئے بہشت جہاں کی سرسبزی و شادابی دل کو موہ لینے والی، جہاں دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت آئینوں کی طرح صاف شفاف و بل کھاتی ہوئی ندیاں، گھٹاؤں کو شرما دینے والی زلفیں اور رس بھری آوازیں اپنے اندر اس قدر رنگینی و رعنائی اور دلفریبی رکھتی ہیں کہ کس کا جی نہ چاہے گا کہ ان حسین نظاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے، اور فطرت نے شاید اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی طبیعتیں بے حد رومانی بنائی ہیں۔ جسکو دیکھئے موسیقی کا رسیا جس طرف نکل جایئے نغمہ و رباب کا چرچا۔ موسیقی کی اس عام مقبولیت میں یہاں کی رومانی آب و ہوا اور قدرتی حالات کا بہت دخل ہے۔ سال کے آٹھ مہینوں میں بارش سبزہ اور ہریالی ہمیشہ اپنے شباب پر بل کھاتی ہوئی ندیاں اور شور کرتے ہوئے دریا یہ سب مل کر فضا کو ترآلود بنا دیتے ہیں اور ہر شخص گویا نظر آنے لگتا ہے اور بے اختیاری میں نغمے الاپنے لگتا ہے۔ یوں گانے کے لئے ہر شخص کچھ نہ کچھ گا لیتا ہے مگر یہاں کے ماہی گیروں، مانجھیوں اور دریائی ملاحوں کے گانے میں کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے۔ یہ مانجھی مشرقی پاکستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ہیں، تو عام طور سے مچھلیوں کا کاروبار کرتے ہیں، چاندنی راتوں کی تنہائی اور دن میں مچھلیوں کے شکار کے لئے جب یہ مانجھی پرسکوں دریا کے سینے کو چیرتے ہوئے اپنی کشتی کھیتا ہے اس وقت کا خاموش اور پر سکون ماحول اسے نغمہ چھیڑنے پر اکساتا ہے وہ دوتارہ اٹھا لیتا ہے اور نغمہ چھیڑ دیتا ہے، یہ نغمے مختلف راگوں اور مختلف جذبات کے مطابق الگ الگ ہوتے ہیں جن میں ان مانجھیوں کے دکھ درد اور خوشی و مسرت کی عکاسی ہوتی ہے، اسی لئے یہاں لوک گیت، لوک سنگیت یا عوامی نغمے کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں باؤل، معرفتی، مرشدی، بھٹیالی، جھومر، ٹپا، جاری گان، ساری گان اور جھومر بہت مشہور ہیں۔ میں انہی مشہور لوک گیتوں کا مختصر تعارف کراتا ہوں۔

باؤل | یہ مشرقی بنگال کا سب سے پرانا گانا ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ لوک سنگیتوں میں سب سے پہلے باؤل ہی وجود میں آیا، باؤل کی وجہ تسمیہ کے متعلق ڈاکٹر محمد شہید اللہ کا خیال یہ ہے کہ باؤل "آؤل" سے ماخوذ ہے اور آؤل عربی کے اولیاء سے نکلا ہے جو بنگالی زبان میں کثرت استعمال سے باؤل ہو گیا ہے۔ باؤل سے پہلے صرف ہندوؤں کے کچھ بھجن ملتے ہیں جن کا رواج زیادہ تر مغربی بنگال میں تھا اور آج تک ہے اس گانے میں عام طور سے صوفیا اور بزرگان دین کے خیالات اور واردات کو نظم کیا گیا ہے، خودی اور عرفان خودی اس کا خاص موضوع ہے جس کا اندازہ ذیل کے ترجمے سے ہوگا "ہم اپنے کو کہاں تلاش کریں؟ ہماری خودی لاپتہ ہے، ہم بہت دنوں سے اپنی تلاش میں سرگرداں ہیں، بہت تلاش کے بعد ہمیں اپنا دل ملا مگر دل کے اندر بسنے والی ہستی نہیں ملی، ہم خود دل میں ہیں مگر ہم نے اپنے کو نہیں پہچانا۔"

معرفتی | اس گانے میں عام طور سے تصوف کے مسائل اور معاملات سے بحث ہوتی ہے لوک سنگیتوں میں یہ بہت ہی مقبول گیت ہے۔ صوفیا، فقرا اور مذہبی لوگوں میں بہت ذوق و شوق سے گایا جاتا ہے اس گانے میں عام طور سے جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ اکثر عام مذہبی خیالات کے خلاف ہوتے ہیں مگر چونکہ یہاں مذہبیت حد سے زیادہ ہے اور علم کم اس لئے خدا اور رسول کا نام آ جانے کے بعد یہاں کے سادہ دل دیہاتی ہر ایک چیز کو قبول کر لیتے ہیں، ان گانوں کی زیادہ مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ بہت سے فقیر اور شاہ صاحبان اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے عجیب عجیب خیالات کو مذہبی رنگ میں پیش کرنے اور روپے بٹورتے تھے، چنانچہ آج بھی معرفتی اور مرشدی جیسے کفر آمیز خیالات کے گانے یہاں کے دیہاتوں میں بہت عام ہیں لیکن جہاں اس قسم کے گانے ملتے ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس خیالات ہیں وہیں ایسے گانے بھی ملتے ہیں جو قابل اعتراض نہیں مثلاً "تم خدا کے نام کی مالا جپو اور اپنے گلے میں خدا کے نام کی مالا پہن لو تمہارا دکھ درد دور ہو جائے

تمہاری زندگی کی تاریکیاں روشنی سے بدل جائیں گی، لاالہ الااللہ کہو اور آنکھیں کھول کر اجالا کر دو اور ہاں دیکھو دنیا کے ہنگاموں میں محمد رسول اللہ کو نہ بھولو اور فنا فی اللہ ہو جاؤ۔"

مرشدی

یہ گانا معرفتی سے بہت ملتا جلتا ہے، فرق اتنا ہے کہ معرفتی میں براہ راست خدا کی تلاش کی جاتی ہے اور مرشدی میں یہ کام مرشد کے حوالے کر دیا جاتا ہے آج کل مرشدی گانیوالے مرشد ہی کو حاجت روا سمجھنے لگے ہیں بجائے خدا کے حاجت روائی کے لئے مرشد ہی کو پکارتے ہیں، معرفتی اور مرشدی کے مصنف عام طور سے لالن شاہ، شتولن شاہ اور فقیر چاند وغیرہ ہیں جو عام طور سے ان پڑھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نغموں میں جا بجا سخت قابل اعتراض خیالات ملتے ہیں، مرشدی میں تو کفر آمیز خیالات اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں مرشدی کا ایک دوسرا نام ماج بھنڈاری بھی ہے، مرشدی کا سب سے مشہور مصنف درگاہی فقیر ہے جو باریسال کا رہنے والا تھا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"دنیا میں سوائے مرشد کے میرا اور کوئی نہیں، مرشد ہی میں خدا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا بہت سی شکلوں میں متشکل ہو کر آتا ہے اسی نے خدا مرشد میں ہے۔" (نعوذ باللہ)

دیہو تتو

یہ گانا بھی معرفتی اور مرشدی سے ملتا جلتا ہے اس میں بجائے خدا یا مرشد کے خودی اور عرفان خودی کی تلاش کی جاتی ہے یہ اصل میں باؤل کی ترقی یافتہ شکل ہے، اس گانے میں انسان کے بدن کو ایک گھر مانتے ہیں جس کی دیواریں بدن کا چمڑہ، ہڈیاں کھمبے، آنکھیں کھڑکیاں اور منہ پھاٹک ہے اور اس گھر کے اندر ایک پرندہ قید ہے جسکو دل کہتے ہیں۔ یہ پرندہ یعنی دل قید خانے سے بھاگنا چاہتا ہے اور بھاگ کر خدا یا شیطان کے حضور میں سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے اگر اس گھر کا ایک مالک یعنی انسان کا نفس نفس امارہ نہیں ہے تو دل خدا کے حضور میں پہنچ جائیگا ورنہ شیطان کے دربار میں چلا جائیگا۔ اس گانے کے مصنف بھی عام طور سے فقیر اور شاہ صاحبان ہی ہیں۔

بھویا

یہ جنوبی بنگال والوں کا خاص گانا ہے مشرقی پاکستان میں جتنے روایتی گانے رائج ہیں ان میں سب سے زیادہ سوز اور درد بھویا میں پایا جاتا ہے یہ گانے عام طور سے تیستا ندی کے کنارے کنارے بسنے والے گاتے ہیں یوں تو مرد اسکو بڑے شوق سے گاتے ہیں مگر یہ گانا خاص عورتوں کا ہے، جب کسی عورت کا شوہر یا محبوب تلاش رزق میں پردیس چلا جاتا ہے تو وہ تیستا ندی کے کنارے کنارے جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں واقع ہیں ان پر بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے محبوب کے فراق میں بڑے ہی درد بھرے انداز میں نغمے چھیڑتی ہے اسی نغمے کا نام بھویا ہے جو شخص بھی اس گانے کو سنتا ہے اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے اس گانے کا سر اکثر بیچ سے ٹوٹ جاتا ہے جو اس گانے کی خصوصیت ہے جو شخص بھویا سے ناواقف ہے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گانے والی کچھ بھول گئی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ سر کا ٹوٹ جانا ہی اس گانے کی خاص خصوصیت ہے اس گانے کے اچھے گانے والوں میں لیلیٰ ارجمند بانو، الوکا چیٹرجی، اور بھبو بھونک کے نام قابل ذکر ہیں، بھویا گانے میں عورت کی زبان سے کچھ اس طرح کے جذبات ادا ہوتے ہیں "میرے محبوب تیستا ندی کے اس پار نہ جاؤ نہ چڑھاؤ پر ہے میں جانتی ہوں کہ تو بہت اچھا پیراک ہے، تو کشتی چلانے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن میں اس کو کیا کروں کہ میرا دل نہیں مانتا، تم کو نہانے کا شوق ہے آؤ میں اس پہاڑی چشمے سے تم کو خود نہلاؤں اور خود ہی گھڑے بھر بھر کے دوں اگر تم کو چشمے تک چل کر آنے میں تکلیف ہو تو میں گاؤں کے کنویں سے پانی بھر بھر کے نہلانے کے لیے تیار ہوں تم ایک کے بجائے دو گھڑوں سے نہا لینا، میری سکھیاں میرے پانی بھرنے پر ہنسیں گی مگر مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، میرے محبوب واپس آ جاؤ، میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں اور دل میں اٹھنے والی ہوک کی قسم تم واپس آ جاؤ۔"

بھٹیالی

بھٹیالی مشرقی پاکستان کا محبوب ترین گانا ہے اس سے زیادہ کوئی اور دوسرا گانا نہیں گایا جاتا، چونکہ اس میں عشق و محبت کی باتیں ہوتی ہیں اس لئے ہر مجلس اور ہر محفل میں اس کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ رہتا ہے، یہ گانا عورتیں بھی گاتی ہیں اور مرد بھی اس گانے کے لئے کوئی خاص وقت یا موسم نہ کار نہیں ہے جس وقت موج آئی ماجھی دوبارہ سنبھال لیتا ہے اور بھٹیالی گانے لگتا ہے۔ عام طور سے اس گانے کو کھیت کے کام کرنیوالے اور پیشہ ور ماجھی زیادہ گاتے ہیں، جب دن بھر کے کام کے بعد کسی جگہ بیٹھتے ہیں تو اپنی تھکن مٹانے کے لئے ان میں سے کوئی اچھا گانے والا دوتارہ سنبھال لیتا ہے اور بھٹیالی دھن چھیڑ دیتا ہے، بھٹیالی گانے میں اس وقت خاص مزا آتا ہے جب کشتی ہوا کے رخ پر بادبانوں کے سہارے تیزی سے جاری ہوتی ہے اور ماجھی اور کشتی کے دوسرے لوگ بے فکر کشتی میں بیٹھے ہوں ایسے وقت میں دل بہلانے کے لئے ماجھی بھٹیالی گانے لگتا ہے اس وقت بھٹیالی کا لطف دوگنا ہو جاتا ہے، بھٹیالی بھاٹ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اتار کے اور چونکہ ماجھی اس گانے کو اس وقت گاتا ہے جب کشتی آپ سے آپ بہاؤ کے رخ پر جاری ہوتی ہے اس لئے اس گانے کا نام بھٹیالی پڑ گیا، بھٹیالی

خاص مشرقی پاکستان کا گانا ہے اس کے گانے والے بھی مشرقی پاکستان ہی میں پائے جاتے ہیں فرید پور میمن سنگھ اور باریسال والوں کا محبوب ترین گانا بھٹیالی ہے۔

عباس الدین احمد نے بھٹیالی گانوں میں خاص شہرت حاصل کی ہے شہر والوں کو عباس الدین ہی نے بھٹیالی گانوں سے پہلی مرتبہ روشناس کرایا ورنہ شہر والے مشرقی پاکستان کے اس مقبول ترین گانے سے ناواقف تھے، کلکتہ کی گراموفون کمپنیوں نے جب عباس الدین احمد کے گائے ہوئے بھٹیالی گانوں کے ریکارڈ تیار کر دائے تب شہر والوں کو اس دلچسپ گانے کا علم ہوا اور اب تو یہ حال ہے کہ لوک گیت سے دلچسپی رکھنے والے شہری زیادہ تر بھٹیالی ہی پر جان دیتے ہیں ---

عباس الدین احمد کے علاوہ اٹھارہ برس کے ایک نوجوان ممتاز علی خاں نے بھی بھٹیالی گانوں میں خاص شہرت حاصل کی ہے عباس الدین اس وقت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس لئے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ممتاز علی خاں سے اچھا بھٹیالی گانے والا کوئی اور نہیں۔ بھٹیالی کے علاوہ ممتاز علی خاں اور دوسرے گانوں میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کے دل میں جو درد ہے اور گلے میں جو سوز ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے، ممتاز علی خاں کے علاوہ میمن سنگھ کی الوکا چیٹر جی مرشد آباد کا عبدالحلیم چودھری اور ڈھاکہ کے بیدار الدین احمد وغیرہ بھی بھٹیالی گانوں کے لئے مشہور ہیں شاعر جسیم الدین جو لوک سنگیتوں کے لئے بہت مشہور ہیں ان کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بھٹیالی گانوں کو تراش خراش کر اس قابل بنا دیا کہ شہر والے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں ورنہ بھٹیالی گانے اپنی اصل شکل میں اس قدر مشکل تھے کہ تمام لوگوں کے لئے اس کا مفہوم اور مطالب کا سمجھنا نہایت دشوار تھا بلکہ بعض گانوں کی تو ادائیگی بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔

بھٹیالی میں عام طور سے عشق و محبت کی باتیں بیان ہوتی ہیں اور کبھی کبھی دریا کے مناظر کا بھی تذکرہ ہوتا ہے، بھٹیالی گانے کی خصوصیت یہ ہے کہ گانے والا ایک خاص سُر کو بہت کھینچتا ہے اور دیر تک اس پر قائم رہتا ہے جو شخص سُر کو زیادہ سے زیادہ کھینچ سکے وہ اتنا ہی اچھا گانے والا سمجھا جاتا ہے سُر کھینچنے میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ زیر، زبر اور پیش پر الگ الگ زور دیا جائے مثلاً ”اُو رے اُو رنگیلا نائیہ مانجھی“ بھٹیالی گانے کا ایک مصرعہ ہے اس میں او کے پیش پر رنگیلا کے زبر پر اور مانجھی کے زبر پر زور دیتے، غرض کہ بھٹیالی مشرقی پاکستان کا ایسا لوک گیت ہے جو سب سے زیادہ مقبول ہے۔ دو بھٹیالی گانوں کے ترجمے ملاحظہ ہوں:-

”او رنگین کشتی کے مانجھی تو اپنی کشتی کو اس گھاٹ پر لے آ اور آ کے دل کی باتیں سنا دے، میں سنوں گی تیرے گیت کے ساتھ ساتھ دریا کا پانی بھی نالہ و فریاد کر رہا ہے، اور فریاد و نالہ کی وجہ سے جو موجیں پیدا ہوتی ہیں وہ میری گگری کو بہائے لیے جاتی ہیں، مانجھی کیا تیرا دل کسی نے چرا لیا ہے“۔

”بادبانی کشتی کھینے والے اور دریا کے اس پار جانے والے مانجھی کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس دریا کی انتہا بھی ہے یا نہیں؟ آخر یہ دریا کتنی دور تک بہتا چلا گیا ہے؟

جس کنارے سے ندی مل کر بہتی ہے وہ کنارہ آہستہ آہستہ ٹوٹ جاتا ہے مگر یہ ٹوٹا ہوا کنارہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سو رہا ہے۔ اب اس ٹوٹے کنارے پر میری ناؤ بہہ کر آ پہنچ جائے گی تب شاید میں اپنے محبوب کا دیدار کر سکوں میں نے سنا ہے کہ اس ندی کا پانی سمندر میں مل جاتا ہے، مانجھی میری آنکھوں کا پانی کس دریا میں تلاش کرے گا؟ اسی نامعلوم کنارے کے لئے میرا نغمہ فریاد کر رہا ہے۔

چٹکا بھٹیالی کی طرح یہ گانا بھی خاص جنوبی بنگال والوں کا ہے چٹکا کے معنی ہیں صدائے بازگشت چونکہ یہ گانا ہمیشہ بہت سے لوگ مل کر گاتے ہیں اور ان کی آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی ہے اسی لئے اس گانے کا نام چٹکا پڑ گیا ہے یہ گانا اس وقت گایا جاتا ہے جب بیل گاڑی والے مانجھی اور کشتی بانی کرنے والے ایک قافلہ کی شکل میں گاؤں کی بنی ہوئی چیزیں اور غلہ وغیرہ لے کر فروخت کرنے کے لئے بیل گاڑیوں پر شہر کی جانب روانہ ہوتے ہیں — اس گانے کے گانے کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ہے جب ساری بیل گاڑیاں ایک لمبی قطار میں روانہ ہو چکی ہیں اس وقت سب سے آگے گاڑی لے جانے والا ایک مصرع چھیڑتا ہے دوسری گاڑی والا اس کی اتباع کرتا ہے پھر اسی مصرعہ کو تیسری گاڑی والا دہراتا ہے اور اسی طرح شروع سے لے کر آخر تک کے گاڑی والے ایک ایک مصرعہ کو دہراتے ہیں چنانچہ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی آوازوں میں کم آہنگی پیدا ہوتی جاتی ہے جب گانا شروع ہو جاتا ہے تو آس پاس کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی کیونکہ پورا قافلہ جو سینکڑوں آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے گانے میں مشغول ہوتا ہے، دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت

جھومنے لگتے ہیں، آس پاس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ان گانوں کی آواز ٹکرا ٹکرا کر واپس آتی ہے اور عجیب سماں پیدا کرتی ہے۔ اس گانے کا موضوع عام طور سے گاؤں کی رہنے والیاں ہوتی ہیں جنھیں یہ قافلے والے پیچھے چھوڑ آئے ہیں، ایک گانے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ بھویا کی طرح اس میں بھی سوز و گداز ہوتا ہے۔

"اے ہماری اندھیری راتوں کو روشن بنانے والی! اے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک تم پیچھے کیوں رہ گئیں؟ تمہارے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس گئیں ہیں ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے لئے گھر میں تڑپ رہی ہوگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا گھر ندی کے اس پار ہے ندی میں پانی بھی زیادہ ہے اور راستہ بھی دشوار گذار ہے ہمیں اس کا بھی پتہ ہے کہ تم کو ہمارا انتظار ہے، ہمارے دلوں میں بھی ہلچل مچی ہوئی ہے، ہماری آنکھوں سے بھی ساون بھادوں جیسی جھڑی جاری ہے جو تمہارے گھر کے پاس بہنے والی ندی میں بہہ کر پہنچ جائے گی۔

جاری گان

یہ اصل میں زاری گان ہے جو بنگلہ میں "ج" ہو گیا ہے دیہاتوں کا بہت مقبول گانا ہے اسے بنگلہ زبان کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں عام طور سے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات بڑے درد انگیز انداز میں بیان ہوتے ہیں اس گانے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص پہلے ایک بند تحت اللفظ پڑھتا ہے اس کے بعد اسکے ساتھی مل کر کسی خاص مصرعہ کو کئی بار دہراتے ہیں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات کے علاوہ حضرت نوحؑ کا طوفان، کلثوم کی مہمانداری، رستم و سہراب کی جنگ وغیرہ کے قصے کو بھی نظم کر لیا ہے اور اسے بہت مزے لے لے کر گاتے ہیں۔ اس گانے کے پس منظر میں آہستہ آہستہ دوتارہ، دف اور سندرا برابر بجتا رہتا ہے۔ جب سب مل کر کوئی مصرعہ اٹھاتے ہیں تو ساز بھی زور سے بجنے لگتا ہے۔ جاری گان اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے اس کے تحت ہر قسم کی بنگلہ نظم آسکتی ہے۔

ساری گان

ساری کے معنی ہیں سب اور چونکہ ساری جماعت اسے مل کر گاتی ہے اس لئے اسکو ساری گان کہتے ہیں۔ یہ گانا اس وقت گایا جاتا ہے جب کشتی دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت میں جارہی ہو اور مانجھیوں کو کشتی کھینے میں سخت مشقت پیش آرہی ہو اس وقت اس مشقت کو کم اور سہل بنانے کے لئے سب کے سب مل کر گانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح سرکش لہروں کا سر کچلتے ہوئے اور دریا کا سینا چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہی جاتے ہیں اور آخر کار پہنچ جاتے ہیں۔ یہ گانا اس وقت بھی گایا جاتا ہے جب کشتیوں کی دوڑ ہوتی ہے اس گانے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ دریا میں اٹھنے والی موجوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اس گانے کا سُر بدل جاتا ہے۔ دریا کی موج جسقدر زور کی ہوگی اس قدر اس گانے میں زور ہوگا جس طرح موج اوپر کو اور پھر تیزی سے نیچے کو چلی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ گانا بہت زور سے اٹھایا جاتا ہے اور تیزی سے نیچے کو گرا دیا جاتا ہے۔

جھومر

مشرقی بنگال کے بعض حصوں خاص کر چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں گایا جاتا ہے مگر یہ خاص مغربی بنگال کے سنتھالوں کا محبوب ترین گانا ہے۔

بقیہ:- بنگالی شعر و شاعری (سلسلہ صفحہ ۱۰۵)

اچھے اور نامور شعراء موجود ہیں جنکے ناموں کے بغیر فہرست مکمل نہیں ہو سکتی لیکن طوالت کے خوف سے اس مضمون کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

دوسرے بنگالی شاعر مثلاً حبیب الرحمٰن، مسطور الاسلام، مفخر الاسلام، عبدالرشید خاں، اشرف صدیقی، حسن حفیظ الرحمٰن، تعلیم حسین، سکندر ابو جعفر، عبدالحی مشرقی، چودھری عثمان، نور النہار، عبدالرشید الحق پوری، صدر الدین، اور ہندو شاعروں میں۔ نیل رتن داس، من موہن برمن، پرابھیش کمار رائے، اور سبودھ کمار رائے، وغیرہ میں بعضوں کو تو پہلے ہی سے کافی شہرت حاصل ہے اور ان میں بعض نوجوانوں کا انداز بتاتا ہے کہ جب انہیں فن پر عبور حاصل ہو جائے گا تو اس وقت ان کے اصلی جوہر کھلیں گے۔

روشن یزدانی

روشن یزدانی کو ۱۹۶۱ء میں خاتم النبیین کی تصنیف پر آدم جی کا ادبی انعام (۵ ہزار روپے) ملا ہے۔ اس کتاب میں روشن یزدانی نے حیات نبوی نظم کی ہے۔ روشن یزدانی کی شاعری ایک حد تک جسیم الدین سے متاثر نظر آتی ہے۔ عہد حاضر میں قدیم لوک گیتوں کی تجدید ایک تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شمس الرحمٰن، شنار الحق، اور ابو جعفر عبیداللہ، شنار الحق کی ندی اور انسان کی شاعری اور عبیداللہ کی ست لڑی ہار سخت گیر ناقدین سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

گنجینۂ گوہر

شاہد احمد دہلوی

کے قلم سے مندرجہ ذیل شخصیتوں پر بے حد دلچسپ خاکے

- مولوی نذیر احمد دہلوی
- استاد بچو دہلوی
- بشیر الدین احمد دہلوی
- مرزا عظیم بیگ چغتائی
- سعادت حسن منٹو
- حکیم ہاشم جان کیف
- استاد بندو خاں
- جوش ملیح آبادی
- میر ناصر علی
- خواجہ حسن نظامی
- مولانا عنایت اللہ
- میرا جی
- جگر مراد آبادی
- پروفیسر مرزا محمد سعید
- ایم اسلم
- جمیل جالبی
- شاہد احمد دہلوی

اعلیٰ کتابت و طباعت مجلد اور گرد پوش سے آراستہ۔

قیمت:- چھ روپے

جانورستان

جارج آرول کا مشہور ناول

ترجمہ: جمیل جالبی۔

قیمت:- ۳/-

حاجی بغلول

منشی سجاد حسین کا مشہور مزاحیہ ناول

مرتبہ مع مقدمہ و فرہنگ: جمیل جالبی

قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

غزلیں دوہے گیت

جمیل الدین عالی کا مجموعہ کلام

قیمت ۴ روپے

ایلیٹ کے مضامین

ترجمہ:- جمیل جالبی

قیمت ۳ روپے ۲۵ پیسے

شاہد احمد دہلوی کی دیگر تصانیف اور متراجم

• دلی کی بپتا	(رپورتاژ)	قیمت ۱/۵۰
• عثمان بطور	(تذکرہ)	" ۴/۵۰
• دھان کا گیت	(ناول)	" ۴/-
• حیرت ناک کہانیاں	(کہانیاں)	" ۴/-
• انوکھی کہانیاں	(")	" ۵/-
• کامیاب باپ	(نفسیات)	" ۱/۵۰
• انتخاب معاش	(")	" ۱/۵۰
• والدین اور معلمین	(")	" ۱/۵۰
• آپ کے بچے کے کھیل	(")	" ۱/۵۰
• آپ کے بچے کی صحت	(")	" ۱/۵۰
• آپ کے بچے کی وراثت	(")	" ۱/۵۰
• معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی	(")	" ۱/۵۰
• بچوں میں جذبہ عداوت	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کے جذباتی مسائل	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی سیکھنے کی قابلیت	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی معاشرتی زندگی	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی خودشناسی	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی دلچسپیاں	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی جنسی تعلیم	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی بدتمیزیاں	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کی اخلاقی تدریس	(")	" ۱/۵۰
• بچوں کے خوف	(")	" ۱/۵۰
• نرگس جمال	(ڈرامہ)	نیا ایڈیشن زیر طبع
• پہلوئے ثریا	(")	" " "
• سرگذشت عروس	(ناول)	" " "
• پھانسی	(")	" " "
• ناؤ سٹ	(")	" " "
• اجڑا دیار	(مضامین)	" " "

اچھی کتابوں کے انتخاب کیلئے فہرست کتب بلا قیمت طلب فرمائیے۔

مشتاق بک ڈپو: شلٹن روڈ کراچی ۱

[illegible]

مشرقی پاکستان کی داستان

مشرقی پاکستان ۵۴۰۰۰ مربع میل رقبہ کا ایک مثلث نما دریائی علاقہ ہے۔ گنگا، پدما، برہمپترا، کرنافلی اور سنگو ندی وغیرہ اس صوبہ کے اہم دریا ہیں۔ صوبہ کے جنوب مغرب میں سندربن کا گھنا جنگل ہے۔ مشرقی پاکستان میں بیشمار دریا اور ان کی شاخوں کی وجہ سے یہاں کا دریائی سفر بہت وسیع اور کم خرچ ہے۔ یہاں کے لاکھوں ماہیگیروں کی روزی کا انحصار مچھلیوں کی اس دولت پر ہے جو ان دریاؤں میں بکھری ہوئی ہیں۔

گھنے جنگلوں کی کثرت اور راہ رسل کی دشواریوں کی وجہ سے یہاں کی قدیم تاریخ منتشر اور نسبتاً بے ربط ہے۔ قدیم ترین کتبے اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ تین صدی قبل از مسیح یہ خطہ موریہ حکومت کا ایک حصہ تھا۔

چینی سیاح ہیونٹ سانگ ۶۳۵ء عیسوی کے لگ بھگ یہاں آیا تھا۔ اُس نے اس دیار کی بیشمار بدھ عبادتگاہوں اور خانقاہوں کا ذکر کیا ہے۔

برمن اور سین خاندانوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دسویں صدی میں ان حکمرانوں نے دوبارہ برہمن اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عرب تاجر چاٹگام آنا شروع ہو چکے تھے اور اُن میں سے بہتوں نے یہاں سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔ مسلمان بزرگان دین اور مبلغین اندرون ملک میں جا کر تبلیغی کام شروع کر چکے تھے اور مقامی لوگ جوق جوق نئے دین میں شامل ہو رہے تھے۔ اس طرح بتدریج اسلام پھیلنے کی وجہ سے سیاسی اقتدار ایک سے دوسرے کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔

۱۱۹۹ء عیسوی کی ایک صبح اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی گھوڑے کی پشت پر سولہ سواروں کے ساتھ راجہ لچھمن سین کی راجدھانی ندیا (یہ علاقہ مغربی بنگال میں ہے) میں داخل ہوا۔ اختیار الدین خلجی قطب الدین ایبک کا جنرل تھا۔ اس غیر متوقع حملے نے ہر مدافعت کو کچل کر رکھ دیا اور مشرقی پاکستان سلطنت اسلامیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ ۵۵۰ سال تک اس خطہ پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ کھلی اور عام تجارت ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان مسلم قلمرو کا ایک بڑا ہی خوشحال علاقہ تھا۔

شہنشاہ چین (یانگ لو) کا ایلچی ماہون پندرھویں صدی میں لکھتا ہے کہ:۔

> "یہ ایک وسیع ملک ہے۔ یہاں کی پیداوار بے شمار ہیں۔ آبادی بہت بڑی ہے۔ ان کا مذہب اسلام ہے۔ یہاں لوگ کاروبار میں فراخ دل اور راستباز ہیں قیمتی بنے ہوئے جہازوں کے ذریعہ غیر قوموں کے ساتھ سوداگری کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ زراعت میں مشغول ہیں۔ کچھ لوگ صنعتی کاموں میں منہمک ہیں۔ کچھ لوگ پانچ یا چھ قسم کی سوتی ریشمی ململ تیار کرتے ہیں۔ رومال اور ٹوپی بناتے ہیں جن پر سنہرا کام ہوتا ہے۔ رنگین لگن پیالے۔ بندوق۔ چھری اور قینچی وغیرہ وہاں دستیاب ہیں۔ وہاں کے لوگ درخت کی چھال سے ایک قسم کا سفید کاغذ بھی تیار کرتے ہیں جو ہرن کی کھال کی طرح چکنا اور چمکیلا ہوتا ہے۔"

اقتصادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی رہی۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بے تعلقی ختم ہو گئی۔ دیگر مسلم ممالک کے ساتھ یہاں کے لوگوں کا اقتصادی۔ معاشرتی اور ثقافتی رابطہ قائم ہوا جس کی وجہ سے تمدنی بیداری آئی اخوت و برادری کے رشتے مضبوط سے مضبوط تر

ہوتے۔

مقامی بنگالی زبان کو مسلم حکمرانوں نے بول چال کی حیثیت سے قبول کیا اور بہترین ادبی معیار تک پہنچایا۔ انہیں کی سرپرستی میں عربی، فارسی اور سنسکرت کتابیں بنگالی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ ادب، مصوری، موسیقی اور فنِ تعمیرات کی ان کی ہمت افزائی کے سبب فروغ ہوا۔

۱۷۵۷ء عیسوی میں پلاسی کی لڑائی نے اس منظر کو بدل کر تباہ کر دیا۔ سیاسی اقتدار غیروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ۱۷۵۷ء کے بعد بنگال کی تاریخ کا شیرازہ بکھر جانے کی وجہ سے یہ صوبہ انتشار کا شکار ہو گیا مگر ساتھ ہی ساتھ لڑائی اور آزادی کی جدوجہد جاری رہی۔

سنہ ۱۸۵۷ء کا دور انتہائی دردناک رہا ہے۔ مغرب کا بیان تھا۔ بنگال سول سروس کا ایک افسر مسٹر ہنٹر نے اس وقت لکھا تھا کہ اگر کوئی سیاستداں پارلیمنٹ میں ہیجان پیدا کرنا چاہے تو بنگال کے کسی ایک مسلمان خاندان کی داستان بیان کر دینا ہی کافی ہو گا۔

مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں میں یہاں کی سیادت تھی انہیں اٹھارہویں صدی کے اختتام کے ساتھ ساتھ با اثر عہدوں سے الگ کر کے بالکل نچلے منصب اور بے بسی تک پہنچا دیا گیا۔ مسلم ہندوستان کی دیگر اقوام کو ترک کیا گیا ان کے ایجنٹ کی بادشاہی میں یہاں کے لوگ بہت عاجز تھے۔ اور ان کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی اور مذہبی تعصب اور کینہ پروری کی بنا پر حد سے زیادہ جبر و تشدد ڈھائے جانے لگے تھے۔ آخر کار یہی جبر و ستم (سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک) مجاہد اور فرائضی تحریک کا باعث ہوئے۔ ان تحریکوں کا مقصد سماجی، مذہبی اصلاحات نیز بیرونی غلامی سے ملک کو نجات دلانا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہاں کے لوگوں نے بھی شمالی مغربی پاکستان میں سکھوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی خاطر اپنے مسلم بھائیوں کو جانی اور مالی مدد بہم پہنچائی۔ یہ تحریکیں انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مکمل طور پر کچل دی گئیں۔

بہرحال اس وقت برطانوی امور مملکت کے حکام بالا نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے سلوک اور نرمی برتنے کی تاکید کی۔ اس زمانے میں مسٹر جے۔ سی۔ بیلی جو حکومت ہند کے ہوم سکریٹری تھے وہ لکھتے ہیں کہ۔

تعلیم یافتہ مسلمان بھی اپنی قدیم تربیت معاشرت اور روایات پر اعتماد ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ عملی طور پر ملکی اختیارات میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے دماغ میں یہ احساس بھی ہے کہ اگرچہ انہیں اس میں مذہبی اذیت نہیں دی جا رہی ہے مگر بھی ان کے ساتھ بے توجہی کا سلوک مذہبی عقائد کی وجہ سے روا ہے۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور پر مسلمانوں کے مستقبل کو کچھ اچھا بنانے کی امید میں مشرقی بنگال اور آسام کا ایک علاحدہ صوبہ بنایا تھا۔

یہی ڈھاکہ شہر ہے جہاں سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانان ہند کے سیاسی مفاد کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ بنائی گئی تھی۔ رمنہ ڈھاکہ کے علاقوں میں جو بہت ساری عمدہ عمارتیں ہیں وہ اس وقت نئے صوبے کے دارالحکومت کی ضروریات کے لئے تعمیر کی گئی تھیں۔

۱۹۱۱ء میں اُس مخصوص سیاسی مفاد کے پیش نظر جس کا محور کلکتہ تھا۔ اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ لارڈ کرزن کے فیصلہ کو کالعدم کرنا پڑا اور مشرقی پاکستان کلکتہ کا ایک ضمنی اندرونی علاقہ بن کر رہ گیا۔

۱۹۴۰ء میں جب اس ذیلی براعظم کے مسلمانوں نے جداگانہ آزاد وطن کا مطالبہ کیا تو مشرقی پاکستان پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے رہنما قائداعظم محمد علی جناح کے دوش بدوش رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء عیسوی میں پاکستان قائم ہو گیا۔

ڈھاکہ جو ایک چھوٹے سے ضلع کا صدر مقام تھا اور جس کے ذرائع بہت ہی محدود تھے اُسے صوبائی حکومت کا مرکز بنانا بڑا کٹھن مسئلہ تھا۔ تجربہ کار افراد کی کمی، ذرائع مختصر اور ناکافی سامان ہونے کی وجہ سے بے شمار دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس وقت سے اب تک حالات پر قابو پانے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کی مسلسل جدوجہد صبر و استقلال کے ساتھ جاری رہی ہے۔

جدید تنظیم میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہاں کے شہر اور بستیاں اپنی ضروریات میں خود کفیل ہوں۔ بڑے بڑے صنعتی ادارے مثلاً کرنافلی کاغذ کا کارخانہ۔ کھلنا نیوز پرنٹ مل۔

آدم جی جوٹ مل وغیرہ کے قیام کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت کلی طور پر بدل چکی ہے ۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مشرقی پاکستان کاغذ، نیوز پرنٹ ۔ مشینی تیل ۔ پلائی وڈ ۔ خوشبودار تیل ۔ پٹسن کی بنی ہوئی اشیاء اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری چیزیں تیار کر رہا ہے ۔

۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان کے اندر صنعتی اداروں کی تعداد ۷۷۶ تھی لیکن آج ان کی تعداد دوگنا یعنی ۱۶۵۰ ہے ۔ ان میں ۱۰۰ بڑے بڑے ادارے ہیں ۔

مختلف شعبوں میں ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز تر کرنے کی غرض سے حکومت نے خود مختار ادارے اور کارپوریشن قائم کرنے کی ہمت افزائی کی ہے۔

اس سلسلے میں پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن واٹر اینڈ پاور ڈیولاپمنٹ اتھارٹی ۔ انلینڈ واٹر ٹرانسپورٹ ۔

پاکستان انڈسٹریل ڈیولاپمنٹ بینک ۔ ہاؤس بلڈنگ فائنینس کارپوریشن ۔ فارسٹ انڈسٹریز ڈیولاپمنٹ کارپوریشن ۔ فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن ۔

ایگریکلچرل ڈیولاپمنٹ بینک ۔ پاکستان انڈسٹریل کریڈیٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن ۔ اور اسی طرح کے بے شمار مالی امداد اور قرضہ دینے والی سوسائٹیاں اور بینک کا قیام عمل میں آیا ۔

موسم مشرقی پاکستان میں تین اصل موسم ہیں ۔ گرمی، برسات اور سردی ۔ سردی کا موسم تقریباً ڈھائی مہینے (دسمبر سے نصف فروری تک) رہتا ہے ۔ اور یہی یہاں کا سب سے خوشگوار موسم ہے ۔ چمکتی دھوپ آسمان صاف اور ہوا خشک رہتی ہے ۔

گرمی کا موسم اپریل کے مہینہ میں پورے آب و تاب کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے ۔ پارہ عموماً سو سے اوپر رہتا جب حرارت ۸۵ ڈگری سے تجاوز کرتی ہے تو گرمی تکلیف دہ ہوتی ہے ۔ لیکن اس موسم میں اکثر پچھم سے زور دار ہوا اور باد و باراں کے آجانے سے کچھ سکون ملتا ہے ۔

نصف جون سے برسات کے موسم کا آغاز ہوتا ہے اور ستمبر کے مہینے تک برسات رہتی ہے ۔ تخمینہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں ہر سال اوسطاً ۱۰۰ انچ بارش ہوتی ہے ۔ مشرقی خطِ استوا پر ایک ۱۵۰ سو انچ کاکس بازار میں دو ۲۵۰ سو انچ سے بھی زیادہ بارش ہوتی ہے پورے مشرقی پاکستان میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۶۰ انچ سے کم ہو ۔

یہاں چار کروڑ ۲۰ لاکھ نفوس ۵۴ ہزار مربع میل زمین پر آباد ہیں (اس گنجان آبادی کا تناسب ۷۷۷ نفوس فی مربع میل ہے) چاٹگام ہل ٹریکٹ اور جنوب میں سندر بن کے گھنے جنگلات کی وجہ سے آبادی کم گنجان ہے ۔ یہاں مردوں اور عورتوں کی آبادی کے تناسب میں تھوڑا فرق ہے ۔ ہر ۲۲ مرد کے مقابلے میں ۲۰ عورت آتی ہے ۔

آبادی کا ۹۵٪ سے زیادہ حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور یہاں ۸۵ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے ۔ باقی ہندو، بدھ اور عیسائی ہیں ۔

آزادی کے بعد سے شہروں میں مہاجرین اور پناہ گزین کی کثیر آبادی اردو بولنے والوں کی ہے ۔ انگریزی کا استعمال اور اس کی تعلیم عام ہے ۱۹۵۱ء میں یہاں تعلیم صرف ۱۸ فیصد تھی ۔

مشرقی پاکستان فی الواقع ایک زراعتی خطہ ہے ۔ یہاں کی اصل پیداوار جوٹ (۵۵ لاکھ گانٹھیں) چاول (دو لاکھ ۶۰ ہزار ٹن) چائے (۵۷۰۰۰۰۰۰ پاؤنڈ) گنا (۷۳ لاکھ ٹن) ۔ مرچ (۴۷ ہزار ٹن) اور تمباکو (۹۳۰۰۰۰۰ پاؤنڈ) ہے ۔

یہاں کی ۸۷ فیصد زمین قابل کاشت ہے جس میں ۶۳ فیصد زمین پر کھیتی ہو رہی ہے ۔

یہاں کی زراعت کا ۹۷ فیصد انحصار بارش پر ہے ایک کاشتکار کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے ٹھیک وقت پر مناسب مقدار میں پانی ملے ۔ ورنہ اسے سیلاب اور خشک سالی سے دو چار ہونا پڑے گا ۔ سیلاب پر قابو پانے کے لئے آبپاشی کے عظیم منصوبے زیر عمل آچکے ہیں ۔

زراعتی پیداوار بڑھانے کی غرض سے عمدہ بیج ۔ کھاد اس کی مقدار میں اضافہ دُہری کاشتکاری ۔ پودوں کی حفاظت ۔ اصولِ زراعت میں ترقی ۔ زیادہ کھاد کا استعمال ۔ اور زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے اقدام کئے جا چکے ہیں ۔

مچھلی مچھلی مشرقی پاکستان کی اصل غذا ہے ۔ مچھلی کے انڈے اور بچوں کی پیداوار بڑھانے کا عملی مظاہرہ کرنے اور اس کی تقسیم کے مرکز تقریباً ہر ضلع میں کام کر رہے ہیں ۔ ماہیگیروں کو مالی اور صنعتی امداد دی جا رہی ہے اور ان کی مناسب رہنمائی کی جاتی ہے ۔ جدید طرز پر گہرے سمندر کی مچھلی پکڑنے کا کام بھی شروع ہو گیا

ہے۔ مچھلیوں کو ٹھنڈے گوداموں میں رکھنے کی سہولتیں وسیع کی جارہی ہیں۔

جنگلات مشرقی پاکستان کی ۱۴ فیصد (۸ ہزار مربع میل) زمین پہ جنگلات اُگے ہوتے ہیں۔ جو طرح طرح کے حیوانات و نباتات سے معمور ہیں۔ بڑے جانوروں کے شکاریوں کے لئے ان جنگلوں میں بنگال رائل ٹائیگر کا گہوارہ ہے۔ چاٹگام ہل ٹریکٹ پر کھیدا کے ذریعہ ہاتھیوں کے غول کے غول پکڑے جاتے ہیں۔ جنگل کی دولت میں سب سے اہم شے چاٹگام کی ٹیک لکڑی ہے جو فرنیچر اور گھر وغیرہ بنانے کے کام آتی ہے۔ بانس وسیع پیمانے پہ پیدا ہوتا ہے۔ لکڑی کی مقامی مانگ تقریباً ۴ لاکھ ٹن ہے اور بانس کی تقریباً دس لاکھ ٹن۔ پاکستانی کاغذ سو فیصد اسی بانس سے بنتا ہے۔

نئی صنعتیں آزادی سے پہلے چھوٹی چھوٹی بہت سی صنعتیں مشرقی پاکستان میں تھیں لیکن اب آٹھ ہزار جوٹ کے کرگھے (۱۵ ملیں ہیں جنکی پیداوار ۳۶۰۰۰ ہے)۔ کاغذ ۳۰۰۰۰ ٹن سے زیادہ۔ نیوز پرنٹ ۳۵۰۰۰ ٹن۔ تامچینی ۳ لاکھ پونڈ۔ فولاد کا سامان ۴۴۰۰۰ ٹن (۳ ملیں)۔ پلائی وڈ ۶۰۰۰۰ چائے کے بکس (۴ کارخانے)۔ ۲۵۰ لاکھ چمڑے پکائے جاتے ہیں (چمڑے پکانے کے ۵۰ کارخانے)۔ نہانے دھونے کے صابن ۷۰۰ ٹن۔ بناسپتی روغن ۳۰۰۰ ٹن۔ سگریٹ ۱۸۲۰۰۰۰۰ اور پنسل ۲۴۰۰۰ گرس تیار کی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا کے علاوہ دوسری صنعتوں میں جہاز سازی۔ پلاسٹک۔ چینی مٹی کے ظروف۔ تامچینی کے سامان۔ متحرک فلمیں۔ روشنائی۔ المونیم کے سامان۔ بجلی کے لوازمات۔ ریڈیو۔ رفریجیریٹر۔ دوا سازی۔ باورچیخانے کے جدید سامان۔ رنگ اور سلہٹ میں کھاد کا بڑا کارخانہ (جسمیں قدرتی گیس خام اشیا کے طور پر استعمال ہوگا۔ شامل ہے۔

کاٹن مل سوت کی تکلی میں ۳۵۰ فیصد اضافہ ہوا۔ دیا سلائی کے کارخانے ۲۵ گونا زیادہ ہو گئے۔ شکر کی پیداوار ۱۲۵ گونا بڑھی اور سیمنٹ میں سو فیصدی سے زیادہ ترقی ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے مقابلے میں آج برقی قوت کا استعمال آٹھ گونا سے بھی زیادہ ہے۔ ڈیزل برقی قوت پیدا کرنے والے اصلی انجن ڈھاکہ۔ چاٹگام اور کھلنا کے صنعتی علاقوں میں ہیں۔ اور ان کے علاوہ کرنا فلی کا ہائیڈرو الیکٹرک پروجکٹ ۴۰ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے۔ فرید پور اور کھلنا میں دلدلی کوئلہ بھی دریافت ہوچکا ہے۔ سلہٹ میں قدرتی گیس نکل رہا ہے۔

تجارت اور کاروبار ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران ۱۰۸۰۰۰۰۰۰ روپے کے سامان مشرقی پاکستان سے برآمد کئے گئے جن میں جوٹ اور جوٹ کے سامان (۸۰ فیصد سے زیادہ)۔ چائے۔ چمڑے۔ کھال۔ لال مرچ۔ اور مچھلیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ برآمدی اشیاء کی فہرست میں نیوز پرنٹ اور دیا سلائی کا بھی اضافہ ہوا اور اسی دوران ۶۵۵۰۰۰۰۰۰ روپے کے سامان برآمد کئے گئے۔ جن میں مشین۔ ضروری سامان۔ دوا دارو۔ صنعتی خام اشیاء۔ فولاد۔ کوئلہ۔ تیل۔ اسپرٹ۔ کپڑے اور کاغذ (گیہوں اور چاول) وغیرہ شامل ہیں۔

دس سال کے اندر بندرگاہوں میں درآمد برآمد اور آمد و رفت ۴۰ گونا زیادہ ہوگئی۔

تعلیم فی الحال پرائمری اسکول ۲۹ ہزار سے گھٹ کر ۲۶ ہزار ہوگئے ہیں۔ مگر ۴۸-۱۹۴۷ء کے مقابلے میں طلبا کی تعداد ۲۵ لاکھ سے بڑھ کر ۳۲ لاکھ ۶۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ مزید ۵۰۰ نئے اسکولوں کا اضافہ ہوا۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۸۰۵ ہے۔ ان اسکولوں میں ۲۶ ہزار طلبا کا اضافہ ہوا جنکی مجموعی تعداد ۳۳۱۰۰۰ سے کم نہیں ہے۔

کالج اور صنعتی درسگاہوں کی تعداد ۵۵ سے بڑھکر ۹۸ ہوگئی ہے۔ اور طلبا میں ۱۲۰ فیصد کا اضافہ ہوا جس کی وجہ سے تعداد ۴۴۰۰۰ سے بھی تجاوز کرچکی ہے۔

اس صوبہ میں دو یونیورسٹیاں ہیں، ایک ڈھاکہ میں اور دوسری راجشاہی میں۔ راجشاہی یونیورسٹی ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی۔ ان دو یونیورسٹیوں کے علاوہ ابھی تقریباً دو سال ہوئے کہ ایک زراعتی یونیورسٹی میمن سنگھ میں قائم کی گئی ہے۔

نئے تعلیمی سکیم میں ثانوی تعلیم کے آغاز ہی سے فنی اور صنعتی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ جس میں اقتصادی بہبود کو سامنے رکھتے ہوئے

پیشہ کی تعلیم اور مقامی صنعتی ضروریات کے مطابق عملی اور جسمانی کاموں پر زور دیا گیا ہے۔ نصاب تعلیم کی مختلف اقسام ہیں اور یہ تمام نصاب کو اختیاری قرار دیا گیا ہے۔ اس کا انتخاب طلبا کی مرضی پر ہے۔

سائنس اور فلاح عامہ کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور دینیات کی تعلیم کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔

ادب، مصوری اور موسیقی

فنون لطیفہ کا بہت بڑا علاقائی سرمایہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ورثہ میں ملا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی میں بنگالی زبان اور بنگالی ادب نے بڑی ترقی کی۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب میں راماین اور مہابھارت (جو پہلے لوگوں کے لئے ناقابل فہم تھیں) کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ چند مشہور عربی اور فارسی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔

مشرقی پاکستان کے دور حاضر کا صاحب فہم اپنی قدیم روایات کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ادب کے تمام صنف پر لکھنے کے علاوہ تاریخ۔ اخلاقیات۔ فلسفہ۔ سیاسیات اور سائنس وغیرہ کے موضوعات میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔

بنگالی اکاڈیمی

یہ اکاڈیمی لسانی اور علمی حیثیت سے بنگالی زبان کو ملک کی دوسری قومی زبانوں کے معیار تک ترقی دینے کی سعی میں ہے۔ پنتھی (پوتھی) ادب کے مسودات مطبوعات نیز لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کو جمع کر کے انہیں محفوظ رکھنے کی طرف خاص طور پر توجہ دی جا رہی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے اچھے بنگالی ادب کی تخلیقات کے لئے بنگالی ادیبوں اور لکھنے والوں کو ضروری سہولتیں مہیا کی ہیں۔

موسیقی کے میدان میں ریڈیو کی خدمات کو بڑی اہمیت ہے۔ یہاں کی موسیقی میں یہاں کے لوک گیتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ان گیتوں کے نغمات کی مختلف قسمیں ہیں جو نہایت حسین اور خوش آہنگ پیرائے میں مرتب کئے جاتے ہیں۔

لوک گیتوں کے نغمات بنانے والے بےشمار لوگ تھے لالن شاہ اور بنگلا گنائی وہ دو ہستیاں ہیں جن کو مرے ہوئے صدیاں گذر گئیں مگر آج بھی ان کے نام یہاں کے ہر گھر میں پوری طرح زندہ اور باقی ہیں۔

یہاں مختلف قسم کے لوک گیتوں میں بھٹیالی، بھوآلی، پوہاٹیا، مرشدی، معرفتی، زاری اور ساری وغیرہ کثرت سے رائج ہیں۔ یہ لوک گیت گرچہ بالکل سیدھے سادے ہوتے ہیں لیکن ان میں جذبات و احساسات کی گہرائی ہوتی ہے۔ عقیدت ہوتی ہے۔ تصوف کے عناصر ہوتے ہیں جو سوز و گداز کی چاشنی میں لذت پیدا کرتے ہیں۔

فن موسیقی کو بھی ریڈیو پاکستان سے ترقی کی سہولتیں مل رہی ہیں۔ ڈھاکہ میں فنون لطیفہ کا ادارہ بلبل اکاڈیمی رقص و سرود کی ترقی اور اس کی روایات کو قائم رکھنے میں پیش پیش ہے۔

انجمن ترقی اردو ڈھاکہ

اس انجمن کا دفتر نواب پور روڈ پر واقع ہے۔ دفتر سے ملحق ایک مختصر سا کتب خانہ بھی ہے جس کے ساتھ ہی مطالعہ کا کمرہ ہے جہاں پڑھنے کے لئے کافی تعداد میں اخبارات اور رسائل موجود ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ میں انجمن کی اپنی عمارت بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے مگر مالی مشکلات کی وجہ سے تعمیر کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اردو کے اچھے اچھے ادیب و شعرا تقریباً ہر علاقے میں موجود ہیں جن کے فن کی زندگی و سلامتی دی صرف ان کے اپنے خلوص اور اپنے حوصلہ پر قائم ہے۔ ان کے ذوق کی بقا کے لئے اگر کوئی پشت پناہ ہے تو وہ خود ان کی ہمت اور ان کا استقلال ہے۔

دستکاری

مشرقی پاکستان کے دستکاروں اور ماہروں کو اپنی نازک اور باریک حرفت کے لئے صدیوں سے امتیاز حاصل ہے۔ ڈھاکہ کے مسلمانوں کو لطیف اور عمدہ نمونے اور ڈیزائن بنانے کا خاص شعور ہے۔ یہ ہنر نسلاً بعد نسلاً انہیں ورثہ کے طور پر آج تک ملتا آ رہا ہے۔ مثلاً یہاں کی جامدانی کی ساریاں اور دوسرے سوتی پارچوں کی حرفت و صنعت پوری طرح موجود ہے۔

مصوری

یہاں کے نئے مصوروں کی ایک جماعت ادارہ مصوری (انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ) میں سرگرم کار ہے بمصوروں

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

عابد دانا پوری

سُندربن

مشرقی پاکستان کے جنگلات

پورے پاکستان کی تقریباً چار فیصد اور مشرقی پاکستان کی سولہ فیصد زمین پر جنگلات اُگے ہوئے ہیں۔ ساگوان اور دوسری لکڑیوں کی جس قدر ملک کو ضرورت ہے اس لحاظ سے جنگلات کا موجودہ تناسب بہت ہی کم ہے صرف یہی نہیں بلکہ آج مشرقی پاکستان صنعتی میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ چھوٹے بڑے ہر پیمانے کے صنعتی ادارے مثلاً کاغذ کے مل نیوز پرنٹ (اخباری کاغذ) اور دیا سلائی کے کارخانے قائم ہو رہے ہیں ان تمام صنعتوں کی بقا اور زندگی کے لئے ضروری ہے کہ جنگل میں پیدا ہونے والی وہ تمام خام اشیاء ان اداروں کو ملتی رہیں جن کی ان اداروں میں مانگ اور ضرورت ہو۔ ان جنگلات کی رکھوالی اور انتظامات کے لئے تمام ذرائع بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ میمن سنگھ میں جنگلات اُگانے کے دو مرکز بنائے گئے ہیں۔ چاٹگام ہل ٹریکٹ کے علاقوں میں جدید سائنٹیفک اصولوں سے ساگوان اگانے کی تدبیر زیر عمل ہے تاکہ جنگل کی یہ دولت تعمیری کاموں میں لگائی جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جو جنگلات برباد ہوئے ہیں وہاں دوبارہ جنگل آباد کرنے کی اسکیم عمل میں آئی ہے۔ جنگل کے اندر راستے۔ قیام گاہیں اور پانی کی فراہمی کے ذرائع کو جدید اصولوں کے تحت ترقی دی جا رہی ہے۔

جنگلاتی اداروں کے تحقیقاتی عمل سے پتہ چلا ہے کہ بڑی کام آنے والی لکڑیاں مثلاً ٹیک لکڑی ڈھاکہ میں گمہاری لکڑی میمن سنگھ میں اور ساگوان چاٹگام کے جنگلوں میں بکثرت پیدا ہوتی ہیں سندربن کی سندری لکڑی ایندھن کی ہماری مشکل بڑی حد تک حل کرتی ہے۔ سندربن کی گیوا لکڑی نرم ہونے کی وجہ سے دیا سلائی اور نیوز پرنٹ کے کاغذ کے مصرف کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی ہے۔

چندر گونا جہاں آجکل ایک مکمل شاندار تجارتی شہر آباد ہے وہاں پر چاٹگام سے دریائے کرنافلی تک ہاتھی۔ شیر۔ چیتے اور دوسرے وحشی درندوں سے بھرا ہوا خطرناک جنگل تھا۔ اسی جنگل کے بانس پر کرنافلی کے کاغذ مل کی زندگی ہے۔ اس جنگل کے بانس کاغذ سازی کے لئے دنیا بھر کی بہترین اشیاء میں شمار ہوتے ہیں۔

پاکستان کے تمام جنگلوں میں سُندربن کی شہرت، اہمیت خصوصیات اور اس کی نوعیت عجیب وغریب اور بالکل مختلف ہے۔ سُندربن (حسین جنگل) کو حقیقت میں قدرت نے بڑی دلکشی بخشی ہے۔ اگر کوئی سیاح مشرقی پاکستان دیکھنے کی غرض سے آئے اور سُندربن دیکھے بغیر چلا جائے تو گویا اس کی سیاحت نامکمل رہی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ قدرتی مناظر کے لحاظ سے سُندربن دُنیا کے اچھے باغات سے بھی زیادہ دلفریب ہے۔ اس کی دلچسپیوں کی صحیح تعریف اُن سے پوچھئے جنہیں کبھی اس جنگل میں شکار کھیلنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس جنگل میں فطرت تمام رعنائیوں کے ساتھ اپنی قلم کاریوں میں مشغول نظر آتی ہے۔ اس جنگل میں غول در غول ہرن ہر طرف چوکڑیاں بھرتے گھاس چرتے اور بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح گھڑیال کی بھی اس جنگل میں کثرت ہے۔ کہیں بندر درختوں پر سے ہرن اور چیتل کے غولوں کے کھانے کے لئے جنگلی پھل توڑ توڑ کر گراتے رہتے ہیں۔ اگر وہاں کسی شکاری کے آنے کا یا اور کسی قسم کے خطرے کا شبہ بھی محسوس کرتے ہیں تو یہ بندر فوراً اسے اُس خطرے سے دوسرے جنگلی جانوروں کو ہوشیار اور چوکنا کر دیتے ہیں۔

سُندربن چیتے اور دوسرے خونخوار شیروں (بنگال رائل ٹائیگر) سے بھرا ہوا ہے۔ مگر ان کا شکار کرنا آسان نہیں۔ سُندربن اتنا گھنا جنگل ہے کہ شیر وہاں آسانی سے نظر نہیں آتے۔ نیز گلے کا

بکریاں وغیرہ چرنے کے طور پر باندھی جاتی ہیں اُن کی طرف بنگال رائل ٹائیگر راغب نہیں ہوتے۔ دوئم یہ کہ بنگال رائل ٹائیگر تک پہنچنے کے لئے نوکیلی جڑوں اور دلدلی زمین پہ پاپیادہ چلنا تقریباً محال ہے کیونکہ ان پر گھنی اور خار دار جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں۔

اگر اتفاق سے کہیں پر سوکھی زمین ہو تو کشتی یا موٹر بوٹ کے تختوں کی مدد سے اُتر کر ان مقامات تک انسان کسی طرح زندہ سلامت شاید پہنچ جائے۔ جنگل کے اندرونی حصے میں جہاں رائل ٹائیگر رہتے ہیں وہاں شاید و باید ہی انسان پہنچتے ہیں۔

ایک شکاری سُندربن میں اپنے پہنچنے کی داستان مضمون میں یوں بیان کرتا ہے کہ اس گھنے جنگل کے اندر ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ کر تھوڑے فاصلے سے اس جنگل کے مناظر اُس کا بھیانک سکوت اور مرغزاروں میں ہونے والے قدرت کے کھیلوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بنگال رائل ٹائیگر کے آنے سے کس طرح ہرن بھاگتے ہیں۔ اس نے چیتل کے غول کو گھاس چرتے اور آہستہ آہستہ اپنے قریب آتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور دیکھا کہ ادھر اُدھر سے چیتل آتے ہیں اور غول میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یکایک جنگل کی اس زندگی میں ایک پُرہول مُردنی چھا گئی۔ چند منٹ کے بعد جنگل کا بادشاہ پُرجلال انداز سے گذرا۔ لیکن جس درخت پر شکاری بیٹھا ہوا تھا وہاں پر جنگل اس قدر گھنا تھا کہ وہاں سے بندوق چلانا قطعی ناممکن تھا۔ شیر کے وہاں سے گذر جانے کے بعد پورے علاقے پہ عجیب دہشت چھا گئی تھی۔ وہ منظر اب تک یاد ہے۔ سندربن کے شیر کی ایک جھلک بھی دیکھنے سے بدن میں ایسی کپکپی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے اور دل میں ایسا ہیجان پیدا ہوتا ہے جسے آدمی زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔

سہلٹ کی کھاسی پہاڑیوں کے چیتے سندربن کے شیروں سے جسامت میں بڑے ہوتے ہیں مگر سُندربن کے شیر چھوٹے ہونے کے باوجود خونخواری اور مکاری کے لحاظ سے بڑے خطرناک سمجھے جاتے ہیں اور ان کا شکار کرنا نہایت دشوار اور بڑا کٹھن کام ہے خاص کر وہ شیر جو مردم خور ہو جاتے ہیں ان کا شکار۔ پُرانے اور ماہر شکاریوں کا کام ہے بھری بندوقیں ڈوری سے باندھ کر شیر کے راستوں پر رکھ دی جاتی ہیں۔ جب شیر اس مقام پہ پہنچتا ہے تو بندوق کی لبلبی خود بخود دب جاتی ہے اور شیر گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔

سُندربن میں کتنے انسانوں کو شیر ہلاک کرتا ہے اور انسانوں کے ہاتھوں کتنے شیر زخمی ہوتے ہیں یا مارے جاتے ہیں اس کا پورا ریکارڈ محکمۂ جنگلات میں رکھا جاتا ہے۔ حالیہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں سُندربن میں کم و بیش ساڑھے نو سو شیر ہیں۔

اگلے زمانے میں سُندربن کے اندر بہنے والی ندیوں میں گھڑیال وغیرہ بھی کثرت سے بھرے ہوئے تھے لیکن آزادی سے پہلے کلکتے کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بے تحاشا پکڑے جانے لگے جس کی وجہ سے گھڑیالوں کی تعداد میں کمی آ گئی ہے۔ مگر آج بھی پاسر ندی میں جگہ جگہ گھڑیال نظر آتے ہیں اگر انہیں کشتی پہ سے گولی ماری جائے اور گولی پوری طرح ان کی گردن پر پڑے تب بھی یہ گھڑیال پانی میں غوطے لگا دیتے ہیں۔

بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ بڑے بڑے گھڑے جب خشکی پر پڑے رہتے ہیں تو عجیب قابلِ دید منظر ہوتا ہے ان میں بعض گھڑے تو موٹر کار کے برابر ہوتے ہیں اکثر ان کا آدھا دھڑ خشکی پہ ہوتا ہے اور آدھا پانی میں۔ ان کے شکار کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھ پر گولی ماری جائے اس سے ان کا چھوٹا سا بھیجا پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

سُندربن کے گھڑیال ساحل پر کام کرنے والے مزدوروں، لکڑ ہاروں اور شہد جمع کرنے والوں کو گھسیٹ کر پانی میں لے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ہرن بے پروائی سے پانی پینے کے لئے دریا پہ آتا ہے تو گھڑیال اسے بھی پکڑ لیتا ہے۔ مردم خور گھڑیال کے شکار کا طریقہ یہ ہے کہ اسے بلّم اور برچھی سے زخمی کر کے رسّی سے باندھ لیا جائے۔

پہلے ضلع کھلنا کے ان ساحلی علاقوں پر شہر آباد تھے انسانوں کی کثیر آبادی تھی لیکن سولہویں صدی عیسوی میں پرتگالی بحری قزاق ان ساحلی علاقوں میں آ کر کثرت سے غارتگری اور لوٹ مار مچانے لگے بڑی تعداد میں انسانوں کو قید کر کے لے جاتے تھے اور غیر ملک میں فروخت کر دیتے تھے۔ قزاقوں سے تنگ آ کر لوگ ساحلی علاقوں سے ہٹ گئے۔ نقل آبادی کی وجہ سے وہاں درخت گھاس اور خودرو پودے اُگنا شروع ہوئے جو بڑھتے بڑھتے خوفناک جنگل ہو گئے جسے سُندربن کہتے ہیں۔ سُندربن خلیج بنگال کے دہانے پر واقع ہے۔ مشرقی پاکستان

میں اس کا بڑا حصہ ضلع کھلنا کے جنوب میں اور تھوڑا حصہ ضلع باقرگنج میں پڑتا ہے۔ اور مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ تک خلیج بنگال کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔

پینے کے پانی کی قلت کی وجہ سے اس جنگل میں زندگی دشوار ہے۔ محکمہ جنگلات نے خاص خاص مقامات پر کشتیوں کے ذریعے پانی سے بھرے ہوئے ڈرام پہنچانے کے انتظامات کئے ہیں۔ جنگل کے محفوظ مقامات پر بندوق سے شکار کھیلنے کے لئے محکمہ جنگلات سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ شیروں کے کم ہو جانے کی وجہ سے گلدار اور... رنگین ہرن وغیرہ کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس جنگل میں بھونکنے یا شور مچانے والے ہرن کی ایک انوکھی قسم بھی پائی جاتی ہے۔ گینڈوں کی تعداد پہلے ہی سے بہت مختصر اور کمیاب ہے سندربن میں بندر بھی کثرت سے ہیں جو جنگل کو سخت نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔

اس جنگل کے لوگوں کا خیال ہے کہ شیر کی ہڈی۔ چربی۔ دانت۔ زبان۔ پنجہ اور ناخن وغیرہ انسانوں اور مویشیوں کے بہت سے امراض کے لئے تریاق ہیں۔ شیر کی چربی کی مانگ تو مغربی پاکستان میں بھی کافی ہے۔ یہاں کے لوگ شیر کا پنجہ اور ناخن کو آسیب اور اسی قسم کی دوسری بلاؤں سے بچنے کے لئے پہنتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سندربن کے شیر مسلمان بزرگوں اور مجاہدوں کے تابع تھے۔ نیز وہ لوگ شیروں پر سواری بھی کرتے تھے۔ سندربن کے اندر بہنے والی ندیوں اور نالوں میں کثرت سے مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ ان مچھلیوں پر نمک ملنے کے بعد سکھا کر رکھتے ہیں۔

سندربن کے اندر شکار کھیلنے والوں کے لئے طرح طرح کی دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ سیاحوں کے لئے بھی فطرت کے عجیب و غریب حسین مناظر ہیں۔

ملک کی آمدنی کے لئے ہر قسم کی منفعت بخش صنعتی اور تجارتی اشیاء کی فراوانی ہے۔ مختصر یہ کہ سندربن پاکستان کے لئے قدرت کا ایک دلکش اور قیمتی عطیہ ہے۔

مشرقی پاکستان کی داستان (بقیہ صفحہ ۱۱۹)

کی یہ نئی جماعت اپنی روایات سے کسب فیض کرتی ہے اور مشرقی پاکستان کے ماضی کی عظمتوں کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید تخلیقات میں اپنے ہمعصروں کے دوش بدوش چل رہی ہے۔ ان میں ایک مصور کی شہرت گوشہ گوشہ تک پہنچ چکی ہے۔

نظام حکومت اس صوبہ کی حکومت کا سربراہ ایک گورنر ہوتا ہے جسے صدرِ مملکت پاکستان مقرر کرتے ہیں۔ اور گورنر اپنے وزیروں کے مشورہ سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایک اسمبلی ہے جس میں صوبہ کے منتخب ممبر ہوتے ہیں۔ صوبائی وزراء اسمبلی میں ممبروں کے سامنے سرکاری کاموں کے جوابدہ ہیں۔

صوبائی نظم و نسق مختلف محکموں اور شعبوں میں تقسیم ہے۔ یہ محکمے حکومت کی پالیسی اور پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ محکموں کا کام انجام دینے کے لئے تنخواہ دار ملازمین ہوتے ہیں۔

مشرقی پاکستان چار ڈویژن میں بٹا ہوا ہے۔ ہر ڈویژن ایک ڈویژنل کمشنر کے ماتحت ہے۔ اس صوبہ میں ۱۶ اضلاع ہیں جو ۵۴ سب ڈویژن میں تقسیم ہیں۔

بقیہ: مشرقی پاکستان کے نیم وحشی قبائل۔ بسلسلہ صفحہ ۱۲

اس جوڑے کو جائداد کے تمام حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور عموماً گاؤں سے نکال بھی دیتے ہیں۔

(نوٹ)

یہ صرف ان قبائل کا حال ہے جو ضلع میمن سنگھ کے سرحدی حاشئے پر بستے ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں اور بھی کئی اہم قبائل ہیں مثلاً مونگ اور چکما وغیرہ جو چاٹگام ہل ٹریکٹ اور کاکس بازار وغیرہ میں بستے ہیں۔

عابد داناپوری

مینامتی

مشرقی پاکستان میں بدھ کی یادگار

مینامتی کے مقام پر کھدائی کا کام زور و شور سے ہو رہا ہے۔ اس کھدائی سے مشرقی پاکستان کے قیمتی گم گشتہ تاریخی سرمایہ کا انکشاف ہوا ہے۔ آٹھویں صدی سے بارھویں صدی عیسوی تک مینامتی میں بدھ مذہب والوں کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ کھنڈرات سے عبادتگاہ کی عظمت و شوکت کا پتہ چلتا ہے۔ کھدائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں مشرقی پاکستان کے جنوبی مشرقی علاقوں میں دیوا خاندان کی خود مختار حکومت تھی۔ اس کھدائی سے چندرا خاندان کے سلسلہ کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے جنہوں نے سمتتا پر حکومت کی ہے۔

مینامتی کومیلا شہر سے پانچ میل پچھم کی جانب واقع ہے۔ مینامتی دراصل نیچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ جو گیارہ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مقامی لوگ اسے مینامتی لال مائی کہتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کے فوجی دستے جوان پہاڑیوں کے ڈھلان میں اپنے خیمے نصب کر رہے تھے کہ اتفاقاً انہیں بدھ مذہب والوں کی یادگاریں نظر آئیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے ان مقامات پر تحقیقات کا کام شروع کیا۔ جستجو اور چھان بین سے بے شمار تاریخی مقامات کا پتہ چلا۔ ان میں کم و بیش بیس جگہوں کی نگہداشت محکمہ آثار قدیمہ کر رہا ہے۔ مینامتی کے تمام ٹیلوں کو آثار قدیمہ کے کاموں کے لئے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ مینامتی میں کھدائی کا کام تین مختلف صورتوں سے کیا جا رہا ہے۔

تقریباً چھبیس مقامات پر کھدائی کر کے آثار قدیمہ اور تاریخی یادگاروں کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ کھدائی کا کام اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مٹی کے نیچے دبی ہوئی یادگاروں کو نکال کر گمشدہ تاریخی شیرازہ منضبط نہ ہو جائے۔

سلبنا و بہارا | اس مقام کو مقامی لوگ سلبنا راجہ کا محل کہتے ہیں۔ یہ مقام مینامتی کے ٹیلوں کے وسط میں واقع ہے۔ کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقام پر بدھ مذہب کی عظیم الشان عبادتگاہ تھی۔ اس قیمتی یادگار کے مرکزی کھنڈرات چار مختلف ادوار کا انکشاف کرتے ہیں۔

اس عبادت گاہ کے پھاٹک تک اینٹوں کی ایک پختہ سڑک بنی ہوئی ہے جس کی لمبائی ۱۷۴ فٹ اور چوڑائی تین فٹ ہے۔ عبادت گاہ کے ملحق جو چبوترہ ہے اس کی چوڑائی ۷۴ فٹ ہے داخلے کا کمرہ (ڈیوڑھی) ۲۲ × ۳۳ فٹ ہے جس کی دونوں جانب دربانوں کے کمرے ہیں۔ عبادت گاہ کے صحن تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں سے اُتر کر کوٹھریاں ہیں۔ سامنے ½ ۸ فٹ چوڑا ایک لمبا سا برآمدہ ہے۔ ستون پر بنا ہوا ایک ہال بھی ہے جس کے ساتھ ملے ہوئے دو کمرے ہیں۔ یہ ہال شاید کھانے کا کمرہ ہوگا۔

عبادت گاہ کی لمبائی ۱۶۸ فٹ اور چوڑائی ۱۱۰ فٹ ہے۔ بدھ مذہب کی جتنی یادگاریں اب تک مشرقی پاکستان میں دریافت ہوئی ہیں ان سب میں اس عبادتگاہ کی عمارت سب سے بڑی ہے۔ یہ عبادت گاہ دیوا خاندان کے راجہ بھادیو دیوانے بنوائی تھی۔ اس کی راجدھانی دیوا رتنا میں تھی۔ ڈھلے ہوئے چاندی کے سکے اور تانبے کے برتنوں پر کندہ عبارتیں (جو کھنڈروں سے دستیاب ہوئی ہیں) اس کا ثبوت دیتے ہیں۔

عبادت گاہ پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے جو حصے زمین سے برآمد ہوئے ہیں وہ سب اچھی حالت میں ہیں۔ جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری عمارت میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ ہوتا رہا ہے۔

عبادت گاہ کی دیواروں کی چوڑائی ۱۶ فٹ ہے اور آج بھی موجودہ حالت میں ان کی اونچائی کہیں ۴ فٹ اور کہیں ۶ فٹ باقی ہے۔

عبادت گاہ کے چاروں طرف ۱۱۵ کوٹھریاں ہیں جن میں تقریباً تین سو طلبا اور مونگ (مذہبی خدام) آرام سے قیام کر سکتے ہیں۔ یہ عبادت گاہ مشرقی پاکستان میں قدیم مذہبی تعمیرات کی ایک عجوبہ یادگار ہے۔

عبادت گاہ کی کوٹھریوں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں وہ تاریخی اعتبار سے نہایت قیمتی ہیں۔ کوٹھریوں کی اندرونی بناوٹ اور خصوصیات بھی کم دلچسپ نہیں۔ ان کوٹھریوں میں مورتی ساخت کے طاق اور طاقچے بنے ہوئے ہیں جن میں مونگ وغیرہ بدھ کی مورتی رکھتے تھے اور تیل کے چراغ جلاتے تھے۔ ہر کوٹھری میں چولھا۔ کھانا پکانے کے برتن۔ پانی کے ناند۔ گھڑے۔ تاب۔ رکابیاں۔ پیالے۔ غلہ رکھنے کے مٹکے اور مٹی کے چراغ پائے گئے ہیں۔

ان کوٹھریوں سے الزمنہ قدیم کی بنی ہوئی جو چیزیں ملی ہیں وہ آثار قدیمہ کی بیش بہا یادگاریں ہیں۔ ان میں کانسے کا بنا ہوا جواہرات رکھنے کا صندوق بھی ہے۔ تانبے کی دو رکابیاں ہیں۔ ایک رکابی کے دونوں طرف کھدائی کا کام بنا ہوا ہے ایک سونے کا اور بارہ چاندی کے سکے ملے ہیں۔ پدماپتی کی ایک کانسے کی بنی ہوئی مورتی ملی ہے۔ پکی ہوئی مٹی کی بے شمار تختیاں ملی ہیں جو دیکھنے میں خوبصورت ہیں۔ مٹی کے برتن ہیں جن میں بہت سے سادے ہیں اور بہتوں پر کنول کے پھول اور دوسرے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔

بدھ۔ بدھیستا اور تارہ کی مورتیاں بھی ملی ہیں جو کانسے کی بنی ہوئی ہیں۔ بنانے والے نے مورتیاں بناتے وقت خد و خال کے تناسب کا پورا پورا خیال رکھا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مورتیاں سنگ تراشی کے فن کا بہترین نمونہ ہیں۔

سونے کے سکے جو ملے ہیں وہ چندر گپت کے زمانے کے سکوں کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے دوران مشرقی پاکستان میں یہ سکے بکثرت رائج تھے۔

چاندی کا ایک سکہ خستہ اور شکستہ حال میں ملا ہے۔ جو تاریخی طور پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے دونوں جانب عربی حروف کندہ ہیں۔ یہ سکہ عہد عباسی کا معلوم ہوتا ہے اور اس دور کی یاد تازہ کرتا ہے جو بنگال اور عراق کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔

بھاری مقدار میں سرخی مائل پکی ہوئی مٹی بھی مختلف کوٹھریوں میں ملی ہے جس سے اس عبادت گاہ کی دیواروں کا بیرونی حصہ رنگا جاتا تھا۔ مقامی صنعتکاروں نے چکنی مٹی کو پکا کر ایسا سامان تیار کر لیا تھا جو دیکھنے میں سنگ مرمر کی صنعتکاری کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ان چیزوں کا مطالعہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ ان چیزوں سے نہ صرف اس زمانے کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے بلکہ ان مقامات کی تاریخ۔ مذہب اور رسم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ پکی ہوئی مٹی فنکاری اور صنعتکاری نقطۂ نظر سے بڑی مکمل ہے۔

یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں رقاصوں اور سپاہیوں کو دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ جانوروں میں شیر ببر۔ جنگلی سور۔ بھینس اور گھوڑے بڑی وضاحت سے پیش کئے گئے ہیں۔ پھولوں میں کنول کی مقبولیت بہت عام نظر آتی ہے۔

مینامتی کی کھدائی سے ایک اور عبادت گاہ کا انکشاف ہوا ہے۔ دوسرے مقام پر ایک اور نہایت اہم تاریخی عمارت کا پتہ چلا ہے جو بھورے رنگ کے نرم پتھر سے تعمیر کی گئی ہے۔

۹۰۰ء سے ۱۰۵۰ء عیسوی تک شمالی مشرقی بنگال میں ایک نئے خاندان کی حکومت رہی جس حکومت کی راجدھانی ودھیتاگیر میں تھی۔ غالباً یہ مقام مینامتی کے ٹیلوں کے جنوبی سرحد پر واقع تھا۔ ٹیلوں کے شمالی کناروں کو میناامتی کہتے ہیں۔ اسی نئے خاندان کے ایک حکمران منیکاچندرا کی رانی کا نام میناامتی تھا۔ شاید میناامتی جا بھی اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس خاندان کے راجاؤں کا مذہب بدھ اور ہندو دھرم کے ملے جلے عقائد کا مرکب تھا۔

مشہور چینی سیاح ہائن سانگ نے ۶۳۵ء عیسوی میں جنوب مشرقی بنگال کی سیاحت کی تھی۔ اس نے تیس بدھ خانقاہوں کا ذکر کیا ہے۔ غالباً موجودہ کھدائی سے انہی خانقاہوں کا پتہ چل رہا ہے۔

عابد دانا پوری

مشرقی پاکستان کے نیم وحشی قبائل

پیش نظر مضمون میں مشرقی پاکستان کے ہاجونگ اور گارو نامی قبائل کا ذکر ہے۔ ان قدیم قبائل کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مقامات کی کچھ الگ سی جغرافیائی حالت معلوم ہو جائے جہاں یہ بستے ہیں۔

کلما کنڈو، درگاپور، حلواگھاٹ، نلیتا باڑی، سربردی، اور دیوانگنج کھلنے میمن سنگھ کے شمال میں واقع ہیں اور انہیں علاقوں کا سلسلہ مشرقی پاکستان کی سرحد بھی ہے۔ اس علاقہ کو علاقہ جات غیر متعلقہ (EXCLNDED) بھی کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا سرحدوں کے بیرونی حاشے پر وحشی گارو پہاڑیاں ہیں جن کا نظم صوبہ آسام کے حدودِ اختیارات میں ہے۔

مشرقی پاکستان کی زمینیں اکثر و بیشتر ہموار میدانی علاقے ہیں جن کی یک رنگی اور جغرافیائی حالت عام طور پر تقریباً ایک ہی جیسی ہے۔ اس کے برعکس پتوں سے ڈھکے ہوئے گارو پہاڑی چٹان اور ٹیلے بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ اور یہی پتوں سے ڈھکا ہوا ناہموار پہاڑی سلسلہ، ہاجونگ، گارو، کوچی، ہادی، اور ڈالو وغیرہ نامی قدیم پس ماندہ اور قدیم قبائل کا مسکن ہے۔

یہی اونچی نیچی اور بالکل ناہموار پہاڑیاں وہ جغرافیائی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان قبائل کے افراد جسمانی اور ذہنی طور پر اس صوبہ کی دوسری تمام آبادی سے قطعی جدا اور مختلف ہیں۔

ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ گرد و نواح کے پڑوسی قبائل کی قدیم پچھلی تاریخ بالکل غیر معتبر اور اس قدر مبہم ہے کہ ان کی بکھری ہوئی منتشر زندگی کے شیرازے کو مربوط طریقہ سے ملا کر اصلیت کا پتہ چلانے کی جتنی کوششیں کی گئیں اور جتنے اقدامات ہوئے ان سب کو الجھا اور چکر میں پھنس کر ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ قبائل صدیوں سے اپنے ماضی اور گذشتہ قسمت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اسی لئے اپنے متعلق کسی قسم کی مستقل یا ٹھوس تاریخی نشاندہی سے قاصر ہیں۔ زبان کی ہم رنگی اور یکسانی کو خصوصاً اور دوسری مختلف مطابقت رکھنے والی مشترک علامتوں اور علتوں کو ملا کر بڑی محنت اور مشکل سے چھان بین کے بعد ان قبائل کی ابتدائی تاریخ کا کچھ پتہ چلا ہے۔

مورخوں کا خیال ہے کہ یہ قدیم ادیباسی قبائل لود و بھاشہ بولنے والے قدیم زمانے کے ان قبیلوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو گارو کی پہاڑیوں پر بستے ہیں۔

ہاجونگ اور اسی قسم کے دوسرے قبائل چند در چند وجوہ کی بنا پر بالائی برہمپتر کی وادیوں سے جہاں ان کے قدیمی اور روایتی گھر تھے نکل پڑے اور گارو کی پہاڑیوں سے متصل میدانی علاقوں میں ڈیرے ڈال دیئے اور میمن سنگھ کے سرحدی حاشئے پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ گارو قبیلہ بھی اسی طرح گارو پہاڑیوں کو چھوڑ کر جو درحقیقت ان کا اصلی آبائی گھر تھا اسی میدانی علاقے میں آ پڑے۔ نئی زمین اور نئے ماحول میں نئے طریقہ سے زندگی شروع کی۔

شوسانگ اور شیرپور کے زمیندار گارو اور ہاجونگ قبائل کے اصلی آقا تھے۔ شوسانگ کے زمینداروں نے مغلیہ حکومت کی طرف سے لگان وصول کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی تھی لگان میں اگر کی لکڑیاں اور ہاتھی بھی لئے جاتے تھے۔ ہاتھی کا شکار کھیدا[1] کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ہاجونگ قبیلہ کے لوگ کھیدا میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اور

---

[1] کھیدا۔ یہاں ہاتھی پکڑنے کی ایک نہایت دلچسپ اور خاص قسم کی ترکیب کا نام ہے۔

وہی اُس سخت اور دشوار کام میں لگائے جاتے تھے اُنہیں اس مشکل کام کے عوض ذاتی استعمال اور زراعت کے لئے زمین دی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ کھیدا کی اہمیت بہت کم ہو گئی تب بھی ان قبائلیوں کو ان کی زمینوں پر کاشتکاری جاری رکھنے کی اجازت دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی پیداوار کا ایک حصہ خراج کے طور پر زمینداروں کو دیتے رہیں۔ لگان کی وصولی کا یہ طریقہ رفتہ رفتہ اذیت دہ اور جابرانہ صورت اختیار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نہایت اشتعال انگیز قاعدہ بن گیا جسے (ٹنکا) لگان کہتے ہیں۔ اس مصیبت سے نجات دلانے کے علاوہ ان غیر متمدن قدیم قبائل کی پرانی شکایت کے پیش نظر حکومت مشرقی پاکستان نے ٹنکا لگان کے سخت اور جبری قاعدہ کو کالعدم کر دیا۔

گارو قبیلے کے لوگ پستہ قد ہوتے ہیں مگر ان کے قوا اور اعضا کی بناوٹ مضبوط ہوتی ہے۔ قامت کے لحاظ سے تبت کے باشندوں کے ساتھ بڑی مشابہت اور مماثلت رکھتے ہیں۔ ایک گارو کے قد کا اوسط عموماً پانچ فٹ ڈھائی انچ ہوتا ہے۔ ان کی جفاکشی اور چستی کو دیکھتے ہوئے گارو قبیلے کے افراد کو مجموعی طور پر کاہل اور کام چور نہیں کہا جا سکتا۔

ہاجونگ قبیلے کے لوگ بالکل سیدھے سادے ہوتے ہیں یہی سادگی ان کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ ان کی جسمانی ساخت بالکل گارو جیسی ہے مگر ان میں طاقت گارو سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہاجونگ کے لوگ گارو والوں کے برعکس صفائی اور نفاست پسند ہوتے ہیں۔

گارو اور ہاجونگ مرد کے لباس میں کسی قسم کا واضح فرق نہیں ہوتا۔ دونوں قبائل کے مرد گھر کے بُنے ہوئے کپڑے کا ایک بالکل ناکافی ٹکڑا یا مختصر لنگوٹی کمر پر باندھتے ہیں مگر گارو اور ہاجونگ عورتوں کی پوشاک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ گارو عورت گھر کے بنے ہوئے رنگین کپڑے کے دو ٹکڑے استعمال کرتی ہیں ایک ٹکڑا چھاتی پر اور دوسرا کمر کے گرد باندھتی ہے۔ لیکن ہاجونگ عورت کپڑے کا ایک ہی ٹکڑا پہننا پسند کرتی ہے۔ وہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا ہے جو جسم کے مرکوزہ بالا دونوں حصوں کو چھپانے کے لئے کافی ہو۔ لیکن میں رفتہ رفتہ کچھ روشن خیال قبائلی عورتیں اپنے بھونڈے وضع کے قدیم لباس پر ساڑی کو ترجیح دینے لگیں مردوں کے پہناوے اور پوشاک میں بھی تبدیلی آ گئی۔

مذہبی حیثیت سے ہاجونگ قبیلہ کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندوؤں کے کشتری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں آسام کی کمکشیا مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت سی مذہبی رسومات بھی انجام دیتے ہیں۔

ہاجونگ سور۔ گائے اور مرغیاں کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ انتہائی خلوص کے ساتھ مذہبی رسم و رواج کے پابند ہیں۔ انہیں طبقاتی اور سماجی فرق پسند ہے۔ اور اب تک ایام جہالت کے پرانے باطل عقیدے اور اوہام پرستی میں مگن ہیں۔

گارو قبیلے کے لوگوں نے سب تو نہیں مگر کچھ قدیم پہاڑی رسم و رواج کو امانت کے طور پر اب تک باقی رکھا ہے۔ یہ لوگ سور۔ گائے مرغیاں اور دوسری تمام چیزیں بلا روک ٹوک کھاتے ہیں۔ اپنے پیشواؤں یا پُروہتوں کی ہدایت کے مطابق اپنے گھریلو معبودوں یا دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کرتے ہیں جسے (بیدھان) کہتے ہیں۔ اس نذرانہ میں عموماً مرغیاں ہوتی ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو شادی بیاہ اور موت کی تقریبات کے موقع پر شرادھ کی رسم ادا کرتے ہیں۔

ہاجونگ اور گارو، بنگلہ اور بنگالی دونوں زبانیں بول سکتے ہیں۔ مگر پہاڑی زبان مشکل ہی سے سمجھتے ہیں۔

گارو کا اصل پیشہ زراعت ہے۔ دوسرے پیشوں سے انہیں دلچسپی نہیں۔ کسی قسم کی تجارت تو ان کے لئے اور بھی زیادہ غیر سودمند ہے۔ اوّل اوّل تو یہ لوگ لکڑیاں چن کر یا کاٹ کر اپنی روزی کماتے تھے۔ سور کی پیداوار اور نسل کشی ان کا ضمنی مشغلہ ہے۔ مگر آج کل یہ لوگ کاشتکاری میں بہت زیادہ گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ روئی۔ اناس اور دھان ان کی اصل پیداوار ہے۔ ان لوگوں کے دھان اُگانے کے طریقہ کو عموماً "جھم" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پہاڑیوں کے ڈھلوان یا نشیب میں کھیتی کرتے ہیں۔ انہیں نیچے اُتر کر زرخیز اور ہموار زمینوں پر کھیتی شروع کئے بہت دن نہیں ہوئے ہیں پورے خلوص اور انتہائی محنت کے باوجود یہ لوگ بہت ہشیار اور تجربہ کار کاشتکار نہیں ہیں۔ ان کی اس ناتجربہ کاری کا اصل سبب ان کی خانہ بدوش قسم کی رہائش اور زندگی قرار دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اپنی سابق پہاڑی زندگی کو چھوڑ کر یکایک اس نئی زندگی۔ ماحول اور آب و ہوا میں اب تک خود کو پوری طرح منطبق اور منضبط نہیں کر سکتے ہیں۔

تعلیم کے میدان میں یہ قبائلی لوگ بہت پیچھے رہے۔ باوجود اس کے کہ حکومت نے ان پسماندہ قبائل کو تعلیم دینے کی جدوجہد

کی غرض سے عیسائی مشنریوں کی سرپرستی کی۔ لیکن کوئی نمایاں نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تمام تعلیمی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ پڑھنے لکھنے کو غیر ضروری سمجھ کر اس طرف تام کو بھی ان قبائلیوں نے توجہ نہیں نہیں دی۔

ہاجونگ کی زبان آسامی بولی سے ملتی جلتی ہے۔ ہاجونگ بنگلہ بھی بول سکتے ہیں۔ ان کی لکھائی کا طریقہ الگ ہے۔ تحریر میں بنگلہ حرف استعمال کرتے ہیں۔

ہاجونگ اپنی روزی محنت اور عرق ریزی سے حاصل کرتے ہیں اس لئے پیسے کی مشکلات اور تنگی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ بلاشبہ مالی نکتہ نظر سے گرچہ امیر تو نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں غربت اور افلاس بہت کم ہے۔

گارو حقیقت میں اصل پہاڑی قبیلہ ہے۔ ان کے کنبے اور ان کے بھائی بند اب تک آسام کے گارو پہاڑی اضلاع میں بستے ہیں۔ گارو قبیلہ کے لوگوں کو اگر ہندو کہا جاتا ہے تو چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور ہندو کہا جانا پسند نہیں کرتے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہندوؤں کے لباس۔ تہذیب اور سماجی رسم و رواج کی تقلید کرتے ہیں۔ بھوت پریت اور ارواح خبیثہ کی پوجا کرتے ہیں۔ آج بھی وہ گارو جو عیسائی نہیں ہوئے ہیں چھوراپودسی، سوسان، سلجنگ، گیویا، اور دوسری خباثت کے علاوہ اپنے آباو اجداد کی روحوں کی پرستش بھی کرتے ہیں۔ قدیم گارو کی آبادی میں ایک مخصوص تعداد نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔

گارو قبیلے کے لوگ لاپروا۔ آزاد منش۔ لاابالی۔ موجی اور بے فکرے ہونے کی وجہ سے کفایت شعاری اور فضول خرچی کا مرکب ہوتے ہیں۔ مادل[1] بجنے یا پہاڑی رقاصوں کے جھومر کی آواز سنتے ہیں تو مست ہو کر خوشی کے سمندر میں غرق ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان قبائلی لوگوں کے رقص دوسرے گہرا لگاؤ ہے۔

تقریبات کے موقعوں پر رنگین اور بھڑکیلے کپڑوں میں مرد اور عورتیں ساتھ ملکر مردنگ ڈنکا۔ ڈھول، سانگ اور سنگھا وغیرہ نامی سازوں کے تال پر ناچتے ہیں۔ یہ باجے گارو کے مقامی اور دیسی ساز ہیں۔ اُبنگ یا مچھ ناچ۔ ڈرو، کھاڈکا۔ اُتنگ۔ دُوآل گرکا وغیرہ ایسے ناچ ہیں جو تقریبات اور تہوار کے موقعوں کے لئے مقبول اور مشہور ہیں۔ پاہن تالا عموماً کھیتوں میں فصل کاٹنے کے زمانے میں ناچتے ہیں۔ ان تمام ناچ اور رقص کی تفصیل اس مضمون میں ناممکن ہے۔

گارو قبیلہ کے مرد عورتوں کی بہ نسبت بے حد کاہل ہوتے ہیں۔ پوچائی (ایک قسم کی دیسی شراب) بڑے ہی شوق سے پیتے ہیں۔ ان کی ہر تقریب اور تہوار میں اس کا ہونا لازمی ہے۔

گارو کے رسم و رواج کے مطابق تمام جائداد عورتوں کے رشتے آتی ہے (دوسرے ان تمام سماجوں میں بھی یہی قاعدہ ہے جہاں ماں یا عورت کی سرداری ہوتی ہے) اس رواج کے مطابق سب سے چھوٹی لڑکی کا شوہر زندگی جائداد کا مختار ہوگا اور لڑکی تمام جائداد کی قانونی اور اصلی مالک رہے گی۔ ایسے شوہر کو نوکما کہتے ہیں۔ اگر بیوی مرجائے تو نوکما اسی مرنے والی کی نانیہالی لڑکی سے شادی کرتا ہے جسے مچنگ کہتے ہیں۔ اگر نوکما اپنی بیوی سے پہلے مرجائے تو دوسرا نوکما یا منیجر جائداد کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جسے (نوکرام) کہتے ہیں۔ نوکرام کا انتخاب کرتے وقت مرنے والے شوہر کی بہن کے لڑکے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ خاندانی جائداد کا قبضہ مرنے والے نوکما کے خاندان سے نکل نہ جائے۔ اور اس طرح جو نوکرام مقرر کیا جاتا ہے وہ اپنے ماموں کی لڑکی اور بیوہ سے بھی شادی رچاتا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ درحقیقت ہموار زرخیز زمین کی کشش نے گارو قبیلہ کے لوگوں کو ان کے اپنے قدیم آبائی پہاڑی گھروں اور بستیوں کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن یہ گارو اپنے ترک وطن کے اسباب اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں بتلاتے ہیں۔

گارو قبیلہ میں مختلف ریاتیں اور بولیاں رائج ہونے کی وجہ سے الگ الگ طبقہ اور گروہ بندی ہے۔ جن میں اُبھنگ، اُتھنگ اور اٹنگ بڑے گروہ ہیں۔ دوآل، چیبک، مچھی، بکھم، ابری، باآل اور برک وغیرہ چھوٹے چھوٹے بے شمار گروہ ہیں۔ ہموار زمین پر بسنے والے منڈلی گارو دو جماعتوں میں تقسیم ہیں جنہیں سنگما اور مرک کہتے ہیں۔

ان قبائلیوں کے یہاں اپنے نانیہال میں شادی جائز نہیں اگر کسی نے اس پابندی کو توڑ کر شادی کر لی تو اُسے بدنگ کہتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

---

[1] مادل:- ایک قسم کا ڈھول ہے جس کے دونوں کنارے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور بیچ کا درمیانی حصہ بہت موٹا ہوتا ہے۔

عابد دانا پوری

کھیدا

مشرقی پاکستان میں ہاتھی کا شکار

یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام جنگلی جانوروں میں ہاتھی سب سے بڑا الیم و جسیم جانور ہے۔ قد و قامت کے لحاظ سے بھی اتنا بڑا اور اتنا اونچا ہوتا ہے کہ جب نظر پڑتی ہے تو انسان اسے تکتا ہی رہ جاتا ہے۔ جسامت کے علاوہ عادات۔ حرکات اور ذہانت کے اعتبار سے بھی ہاتھی دوسرے جانوروں سے نرالا اور بالکل مختلف ہے۔

مگر اس قدر بھاری بھرکم۔ خطرناک اور ذہین ہونے کے باوجود بھی ہاتھی انسانی عقل و تدابیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھنے جنگلوں کے اندر جا کر انسان اسے پکڑ لاتے ہیں۔ پھر سدھاتے ہیں اور تربیت دیتے ہیں۔ سدھر جانے کے بعد یہی ہاتھی دوسرے گھریلو اور پالتو جانوروں سے زیادہ مختلف اقسام کے کام انجام دیتا ہے۔ ہاتھی کب سے انسانوں کے تصرف میں آیا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ انسانوں کی ماقبل تاریخ کی کہانیوں میں بھی ہاتھی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

قدیم زمانے میں راجاؤں اور بادشاہوں کے یہاں ہاتھی بڑی ہوشیاری سے سدھائے جاتے تھے۔ ان سے باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔ شکار میں کام آتے تھے۔ زراعت میں مدد ملتی تھی اور ازمنۂ قدیم کی جنگوں اور لڑائیوں میں ہاتھیوں کی جو اہمیت تھی وہ بھی ظاہر ہے۔

آج بھی ہاتھیوں سے مختلف قسم کے سخت اور کٹھن کام لئے جاتے ہیں۔ گھنے جنگلوں کے اندر جب درخت وغیرہ کاٹے جاتے ہیں تو ان کی شاخوں۔ تنوں اور شہتیروں کو یہی ہاتھی کھینچ کر جنگل سے باہر لاتے ہیں۔ اب بھی دشوار گذار اور پُرخطر مقامات میں ہاتھیوں کی ہی مدد سے شکار کھیلا جاتا ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں دوسری سواری نہیں پہونچ سکتی وہاں ہاتھی بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔

اس قدر مہیب اور وحشتناک جانور کو گھنے جنگلوں کے اندر سے پکڑ لانے کی ترکیب بھی کم دلچسپ نہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہاتھی پکڑنے کی ترکیبوں میں دو طریقے عام ہیں۔

۱۔ میلا شکار ۔ ۲۔ کھیدا ۔ میلا شکار میں کسی طرح ایک آدھ ہاتھی کو گھیر گھار کر زنجیر سے باندھ لیتے ہیں۔ مگر کھیدا کے ذریعہ ہاتھیوں کا غول کا غول پکڑا جاتا ہے۔

ہاتھی ممنوعہ اور محفوظ گھنے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہاتھیوں والے جنگلات کی نگہداشت اور رکھوالی وغیرہ محکمۂ جنگلات کے زیر انتظام ہے۔ مشرقی پاکستان میں کھیدا اور دوسرے قسم کے شکار وغیرہ محکمۂ جنگلات ہی کی ہدایت کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ چاٹگام۔ چاٹگام ہل ٹریکٹ اور سلہٹ کے سوا پاکستان میں اور کہیں ہاتھی نہیں پائے جاتے۔

جب یہ طے پا جاتا ہے کہ اب کھیدا سے ہاتھی پکڑنا چاہیئے تو متعلقہ حکام اعلانات کے ذریعہ ٹنڈر طلب کرتے ہیں۔ جن کے ٹنڈر منظور ہو جاتے ہیں انہیں عام طور پر فی ہاتھی ۷۵۰ روپے محکمہ کے حوالے کرنا پڑتے ہیں۔

کھیدا زیادہ تر موسم سرما میں اس لئے ہوتا ہے کہ دسمبر اور جنوری میں جنگلات خشک رہتے ہیں۔ بارش نہیں ہوتی۔ اور کھیدا کے انتظامات میں نسبتاً دشواریاں کم ہوتی ہیں۔

محکمہ جنگلات کے تمام مروجہ قوانین کی رسمی خانہ پُری کے بعد کھیدا کے ماہرین اور مزدوروں کی جماعت کے ساتھ کھیدا کے منظور شدہ ٹھیکہ دار آتے ہیں۔ یہ جماعت سو سے لیکر ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس جماعت میں چالیس یا پچاس ایسے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے جو کھیدا شکار کا خاصہ تجربہ اور اچھی مہارت رکھتے ہوں۔ یہ ماہرین نئے اور ناتجربہ کار مزدوروں کو کھیدا بنانے

کی ہدایت دیتے ہیں اور ان کے کاموں کی نگرانی کرتے ہیں۔

سب سے پہلے کھیدا گھر کے لئے مناسب علاقہ اور جگہ کا انتخاب ضروری ہے یہ مسئلہ اہم اس لئے ہے کہ کھیدا کی کامیابی کا انحصار اسی انتخاب پر ہوتا ہے۔

عموماً ہاتھیوں کا غول کا غول چارہ کی تلاش میں نکلتا ہے ہاتھی کی غذا عام طور پر مختلف قسم کی گھاس۔ بانس کے پتے اور کونپل وغیرہ ہے۔ ایک معین راہ یا پگڈنڈی پر چلنا ہاتھیوں کی فطرت اور خصلت ہے۔

کھیدا شکار کے آٹھ یا دس پرانے ماہرین کی جماعت جنگلوں میں گھوم پھر کر کھیدا کے لئے مناسب جگہ انتخاب کرتے ہیں۔ ہاتھیوں کی دو یا اس سے زیادہ پگڈنڈیاں (گزرگاہ) کسی نقطہ پر آکر ایک ہوں تو کھیدا گھر بنانے کے لئے وہی مقام بہترین سمجھا جاتا ہے اگر ایسی کوئی پگڈنڈی دو قریب قریب پہاڑیوں کی وادی میں پائی جائے تو کھیدا کیلئے وہ سب سے اچھی جگہ سمجھی جائے گی۔

پھر اس بات پر نظر رکھنے کے لئے آدمی مقرر کئے جاتے ہیں کہ ہاتھیوں کے غول جو کھیدا گھر کے جوانب میں رہتے ہیں وہ کھیدا گھر کی تعمیر مکمل ہونے تک دُور دراز علاقوں کی طرف نہ نکل جائیں۔

جگہ منتخب ہونے کے بعد کھیدا گھر بنانے کا اصل کام شروع ہوتا ہے۔ ۲۵ یا ۳۰ فٹ قطر کا گھیرا ڈالتے ہیں۔ اس گھیرے میں جانے کے لئے ہاتھیوں کی اصل راہ (پگڈنڈی) پر دس فٹ چوڑا گیٹ بناتے ہیں۔ یہ گیٹ جنگل کے اندر ہاتھیوں کی چراگاہ کے سامنے بنایا جاتا ہے پھر اٹھارہ یا بیس فٹ لمبے لمبے کھمبوں کا کم از کم چار فٹ حصہ مضبوطی کے ساتھ زمین کے اندر گاڑتے ہیں کھمبوں کا قطر دس انچ تک موٹا ہوتا ہے۔ کھیدا گھر کے اندر اسی طرح کے تین مستحکم گھیرے (کھمبوں کی دیواریں) بنائے جاتے ہیں۔ یہ گھیرے گول دائرے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ دائرہ کی تین دیواروں کا فاصلہ ایک دوسرے سے دس بارہ انچ ہوتا ہے کھمبے کے بالائی یا اوپری حصے کو ناریل یا جوٹ کی رسی سے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے باندھتے ہیں۔ کھیدا گھر کی ان دیواروں میں دس فٹ جگہ گیٹ کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔

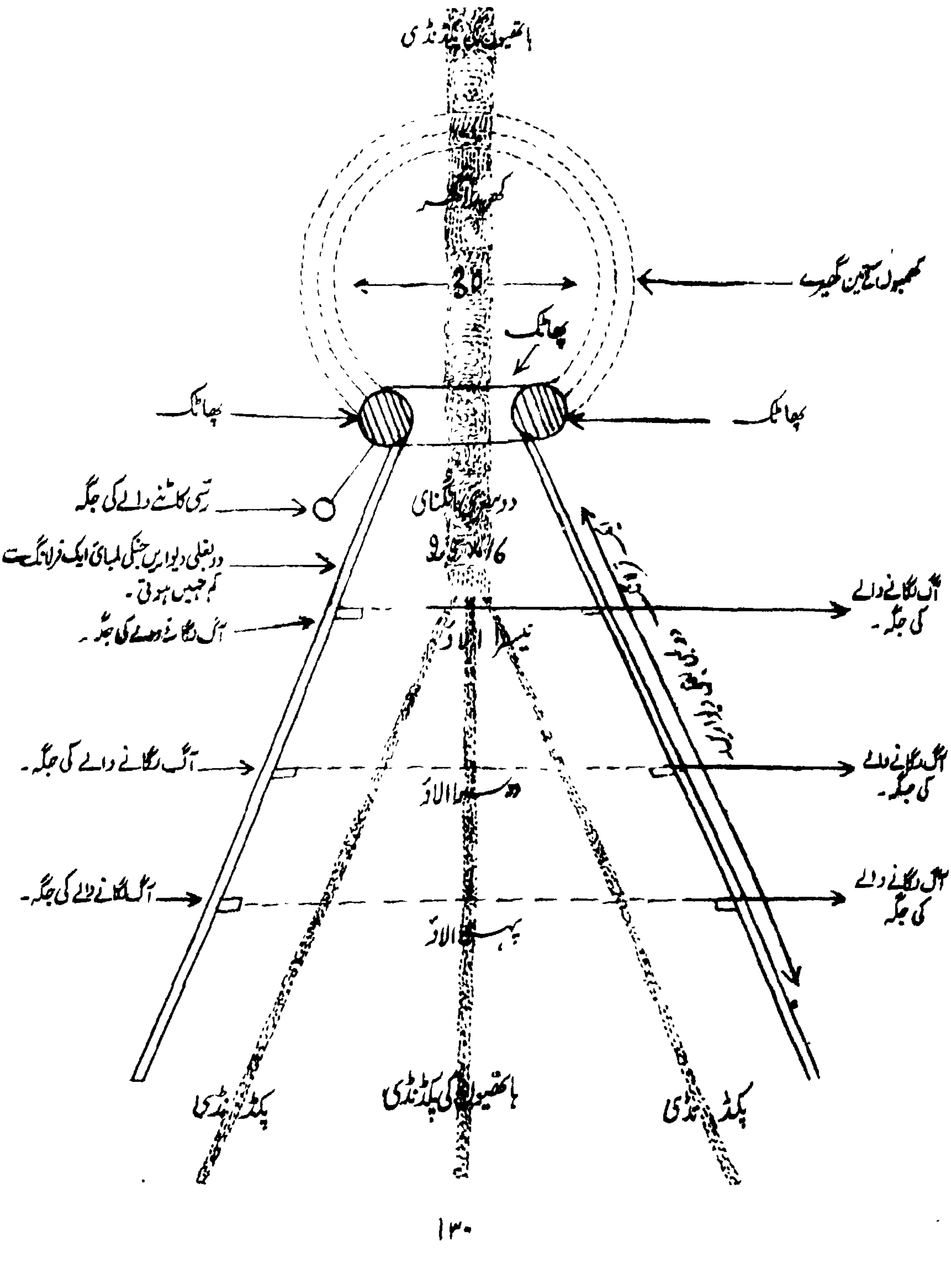
کھیدا گھر کی دیوار مکمل ہو جانے کے بعد خاص ترکیب سے ایک پھاٹک بناتے ہیں۔ تقریباً چالیس چالیس فٹ اونچے دو کھمبے گیٹ کے دونوں جانب گاڑتے ہیں ان کھمبوں کا چھ فٹ حصہ زمین کے اندر پیوست ہوتا ہے، انہیں کھمبوں پر لمبی رسی باندھ کر پھاٹک لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس رسی کا دوسرا سرا کہیں دور پر مضبوط کھونٹے سے اس طرح باندھ رکھتے ہیں کہ جس وقت کھونٹے کے پاس رسی کاٹی جائے تو کھیدا گھر پر لٹکا ہوا پھاٹک آسانی سے زمین پر گرے اور گیٹ بند ہو جائے۔

گیٹ کی دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کھمبے گاڑ کے بغلی دیواریں بناتے ہیں۔ دونوں بغلی دیواریں گیٹ سے شروع ہوتی ہیں اور ایک فرلانگ تک چوڑی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دونوں بغلی دیواروں کے بیچ میں پچاس گز کے فاصلے پر آگ جلانے کو پتلے پتلے الاؤ بناتے ہیں۔ یہ الاؤ سوکھی جھاڑیوں اور تنکوں کے ہوتے ہیں انہیں دھماکہ پیدا کرنے کے لئے دستی بم وغیرہ رکھ دیتے ہیں ہر الاؤ (کے دونوں سرے پر آگ لگانے والے ہوشیار آدمی متعین کئے جاتے ہیں۔

سب کام مکمل ہو جانے کے بعد پورے کھیدا گھر کو درختوں کی شاخوں اور پتوں سے اس طرح ڈھانک دیتے ہیں کہ کسی جانور کو یہ شبہ تک نہ ہونے پائے کہ یہاں کوئی چیز نقلی یا جعلی بنائی گئی ہے۔ سب کام مکمل ہو جانے کے بعد پورا کھیدا گھر ایک پرسکون اور قدرتی جنگل معلوم ہوتا ہے یہ تمام کام آٹھ دس دن کے اندر اندر مکمل کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ جنگلی ہاتھی کوئی پالتو مویشی تو نہیں ہیں کہ انہیں آسانی سے ہانک کر منزلِ مقصود تک لایا جائے نہ ان ہاتھیوں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی جا سکتی ہے۔ ہاتھی اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے اپنے راستوں اور اپنی مخصوص پگڈنڈیوں پر چلتے ہیں۔ کھیدا گھر تک وحشی ہاتھیوں کو ہانک کر لانا کھیل نہیں۔ اس کے لئے بڑی بڑی ترکیبیں کی جاتی ہیں اور بڑی احتیاط ہاتھیوں کو دھوکہ دیا جاتا ہے۔ جب ہاتھی چارے کی تلاش میں نکلتے ہیں تو اس وقت بڑی ہوشیاری سے ہنکوا یا ہنکائی کا کام شروع کیا جاتا ہے۔ اور لامحالہ یہ ہاتھی کھیدا گھر میں قید ہونے سے پہلے ہنکوا اور ہنکائی کے فریب میں پھنس جاتے ہیں ہنکائی سے پہلے چند بڑی ہمت والے ہوشیار اور تجربہ کار افراد

کھیدا گھر کا نقشہ



جنگل میں مختلف جگہوں پر تعینات کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کا کھیدا گھر کے پھاٹک کی رسّی کے پاس ہونا ضروری ہے جس رسّی سے پھاٹک اُوپر کو لٹکا رہتا ہے۔ اور جوں ہی ہاتھی کا غول کھیدا میں داخل ہوتا ہے یہ شخص انتہائی پھرتی اور چابکدستی کے ساتھ رسّی کو کاٹ دیتا ہے۔ پھاٹک تیزی سے نیچے گرتا ہے اور گیٹ بند ہو جاتا ہے۔

اسی لئے کاٹنے والے شخص پر کھیدا کی کامیابی کا سب سے بڑا انحصار ہے۔ اور اسی شخص کو سب سے زیادہ معاوضہ اور مزدوری ملتی ہے۔

چھ آدمی تینوں الاؤ (   ) پر آگ لگانے کے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر الاؤ کے دونوں سروں پر ایک ایک آدمی ہوتا ہے۔ جونہی ہاتھی کا غول الاؤ پار کرکے آگے بڑھتا ہے پیچھے سے الاؤ میں آگ لگاتے جاتے ہیں۔ ضروری سامان کے علاوہ زائد اور فالتو مشعل۔ داؤ۔ بلم۔ رسّی اور دوسری کارآمد چیزیں کھیدا گھر سے کچھ فاصلے پر چھپا کر تیار رکھی جاتی ہیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

ستّو یا ایک سو بیس آدمی جو ہاتھیوں کو ہنکانے یا ہنکوا کیلئے جنگل میں جاتے ہیں وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہاتھیوں سے اتنے فاصلے پر چھپے رہتے ہیں کہ ہاتھی انہیں دیکھ نہ سکیں۔ جب یہ تمام لوازمات مکمل ہو جاتے ہیں تو ہنکائی کا کام شروع ہوتا ہے جنگوا کرنے والی جماعت کے لوگ پہلے تو ہلکی ہلکی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہاتھیوں کا غول جب تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے ہر تین طرف دُور سے آتی ہوئی آوازیں سنتا ہے تو آہستہ آہستہ اُس سمت بڑھنا شروع کر دیتا ہے جدھر سے آواز نہیں آتی۔ اور غول رفتہ رفتہ اپنی مخصوص پگڈنڈی کا رُخ کرتا ہے۔

ہاتھیوں کی فطرت تو معلوم ہے۔ وہ غول کی شکل میں چلتے ہیں۔ جب یہ غول کھیدا گھر کے راستے پر آجاتا ہے تو ہنکوا کرنے والے بھی آہستہ آہستہ غول کے پیچھے پیچھے بڑھتے ہیں اور مختلف طرح کی آوازیں پیدا کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ڈنڈے کی کھٹ کھٹ کی آواز کبھی بانس کی سرسراہٹ۔ کبھی آہستہ آہستہ تالی بجاتے ہیں کبھی منہ سے آوازیں نکالتے ہیں۔ غریب ہاتھی انسانوں کی اس پُر فریب چال سے ناواقف اور بے خبر ہوتے ہیں۔ اور عقب سے آنے والی آوازیں سُن کر آگے کھیدا گھر کی طرف دھیرے دھیرے بڑھتے جاتے ہیں بے چارے ہاتھیوں کو کیا خبر کہ اصلی خطرہ پیچھے نہیں بلکہ آگے ہے۔

ہنکائی کا کام شام سے صبح کے وقت تک ہوتا ہے دن کو ہنکائی کرنے میں ڈر ہے کہ کہیں ہاتھی دیکھ نہ لیں کہ شکاری انہیں پیچھے سے ہنکا رہے ہیں۔

بغلی دیواروں تک پہنچتے پہنچتے ہاتھیوں کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے اور جونہی ہاتھیوں کا غول بغلی دیواروں (   ) کے درمیان داخل ہوتا ہے۔ پیچھے سے دو تین بار ہوائی بندوقیں داغ دیتے ہیں۔

اب یہاں سے شکاریوں کے لئے نہایت نازک مرحلے شروع ہوتے ہیں اور انہیں حفظِ ماتقدم کے ساتھ پوری طرح چوکس اور بیدار رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر ذرا بھی ہاتھیوں کے غول میں انتشار پیدا ہوا اور کھلبلی مچی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان پر قابو نہیں پا سکتی۔

جونہی ہاتھیوں کا غول پہلے الاؤ کو پار کرکے آگے بڑھتا ہے۔ تو ہوشیار لوگ جو الاؤ پر متعین ہوتے ہیں وہ بڑی پھرتی اور تیزی سے الاؤ میں دونوں جانب سے آگ لگا دیتے ہیں۔ دستی بم اور آگ کے شعلوں سے دہشت زدہ ہو کر غول تیزی سے آگے بڑھتا ہے اسی طرح غول جب دوسرے اور تیسرے الاؤ کو پار کرکے بڑھتا جاتا ہے۔ تو شکاری بھی پیچھے سے سلسلہ وار دوسرے اور تیسرے الاؤ میں بھی آگ لگاتے جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کی حیرت اور خوف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پورا غول بدحواسی اور سراسیگی کے عالم میں آنکھ بند کرکے پگڈنڈی پر تیزی سے قدم بڑھاتے کھیدا گھر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ تمام کام آناً فاناً انجام پاتے ہیں۔ ہاتھیوں کے بغلی دیواروں میں داخل ہونے سے لیکر کھیدا گھر کا پھاٹک بند ہونے تک کا وقفہ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

جیسے ہی پورا غول کھیدا گھر میں داخل ہوتا ہے۔ ایک آدمی کھٹ سے رسّی کاٹ دیتا ہے۔ پھاٹک تیزی سے گرتا ہے۔ گیٹ بند ہو جاتا ہے اور ہاتھیوں کا غول پنجرے میں پھنس جاتا ہے۔ کھیدا کے شکار کا یہی منظر سب سے زیادہ اضطراب انگیز اور ہیجان خیز ہوتا ہے۔ پوری جماعت میں ہلچل مچ جاتی ہے ہر طرف سے شکاری شور و غل مچاتے ہوئے کھیدا گھر کو گھیر لیتے ہیں۔ اُس وقت اس کھیدا گھر میں دنیا کے مضبوط ترین جانور کا غول قید ہوتا ہے۔ شکاری کھیدا گھر کے تمام کھمبے اور بندھن کی مضبوطی کو جانچ کر ہوشیاری

کے ساتھ نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اور دیکھتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی کمزوری نہ رہ گئی ہو۔

اب اپنے غول کے سرداروں کو چاہے وہ نر ہو یا مادہ سب ہاتھی مل کر مارنا شروع کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دام میں پھنسنے کا الزام سردار پر ہوتا ہے۔ اور اسے موت کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اگر سردار ہاتھی اپنے غول میں سب سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے تو وہ دوسرے ہاتھیوں کو مارنا شروع کرتا ہے۔ اس وقت قیدی ہاتھی وہ طوفان برپا کرتے ہیں کہ کھیدا گھر کی سلامتی اور حفاظت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور آخر کار مجبور ہو کر سردار ہاتھی کو گولی مار دی جاتی ہے۔ ہاتھیوں کے اس مار دھاڑ اور ہنگامہ خیز لڑائی میں بچہ ہاتھیوں کی موت کا منظر بڑا ہی دلخراش ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ہاتھیوں میں ہولناک لڑائی کے دوران وہ بھگدڑ۔ اور اچھل کود، کھٹیلا ٹھالی اور دھکا پیل ہوتی ہے کہ بچے بُری طرح پس کر مر جاتے ہیں۔

قیدی ہاتھیوں کو کمزور کرنے کی غرض سے ۲۴ گھنٹے تک کھانا پانی کچھ نہیں دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر ڈھیلے اور نحیف ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کھیدا گھر پر ہوشیاری کے ساتھ کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ہاتھی برابر کھیدا گھر سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پھر انہیں ایک ایک کرکے کھیدا گھر سے باہر لایا جاتا ہے۔

کھیدا گھر کے سامنے ایک اور دوسری انگنائی بنائی جاتی ہے۔ اس دوسری انگنائی میں بھی مضبوط پھاٹک بنایا جاتا ہے۔ اس انگنائی میں دو تربیت یافتہ ہاتھی لائے جاتے ہیں (یہ دوسری انگنائی کھیدا گھر سے ملی ہوئی بغلی دیواروں کے درمیان ہی میں ہوتی ہے) تربیت یافتہ ہاتھیوں کا لیڈر ہمیشہ بڑا قوی ہیکل۔ تندرست ہوشیار اور بڑے بڑے دانتوں والا ہاتھی ہوتا ہے جو پھاٹک کو بآسانی اپنی سونڈ سے اوپر اٹھا کر اور اپنی گردن پر ہوشیار مہاوت کو لیکر کھیدا گھر میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے پیچھے دو تربیت یافتہ ہتھنیاں بھی مہاوت کے ساتھ کھیدا گھر میں گھستی ہیں۔ گرفتار ہاتھیوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ اسے سب سے پہلے باندھا جائے۔ جب یہ منتخب ہاتھی لڑائی میں پسپا ہونے کے بعد تھک کر ٹھنڈا اور ڈھیلا پڑ جاتا ہے تو اسے دونوں تربیت یافتہ ہتھنیاں دونوں طرف سے دباتی ہیں۔ اس دوران میں ایک نہایت تجربہ کار اور پھرتیلا آدمی مضبوط رسی سے جنگلی ہاتھی کے دونوں پچھلے پاؤں باندھ دیتا ہے اور اس کی گردن میں رسی ڈال کر اسے باہر نکالتے ہیں۔ اس ہاتھی کے باہر نکلتے ہی کھیدا گھر کا پھاٹک دوبارہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر وہ پالتو ہاتھیوں کا لیڈر برابر کھڑا اندر رہ لے دوسرے ہاتھیوں پر نظر رکھتا ہے اور دربانی کے فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔

بھوک پیاس کی شدّت اور لڑائی میں چوٹ کھانے کی تکلیف سے قیدی ہاتھی جب بہت کمزور اور بیدم ہو جاتے ہیں تو انہیں رفتہ رفتہ چارہ دینا شروع کیا جاتا ہے۔ کھانا پانی کے ساتھ ان قیدی ہاتھیوں کو تربیت دینے کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ یہ تمام کام ہوشیار تجربہ کار مہاوت اور تربیت یافتہ ہاتھیوں کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ ایک وحشی ہاتھی کی مکمل تربیت میں چھ ماہ لگتے ہیں۔

عابد داناپوری

بنگالی شعر و شاعر

بھرت چند اٹھارویں صدی کے قادر الکلام اور باکمال بنگالی شاعروں میں ممتاز شخصیت کا مالک تھا جسے عربی اور فارسی زبانوں پر بھی خاصی دسترس تھی اس کی رزمیہ نظموں میں مسلم رجحانات واضح طور پر جھلکتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے بغیر۔

نہ تو وجدانی کیفیت پیدا ہوگی
اور نہ لذت ملے گی۔
کیا قدیم اساتذہ اور ماہرینِ زبان نے
یہ نہیں کہا کہ
خیالات کے اظہار کا ذریعہ
چاہے کچھ بھی ہو
مگر توجہ کیفیتِ شعری کی طرف زیادہ
ہونی چاہیئے۔
لہٰذا میں نے بھی نوجوانوں کی زبان اپنے طرزِ بیان
میں شامل کی ہے۔

ایک طرف تو بھرت چند نے سترھویں صدی کے سب سے نامور شاعر سید آلاول کی منجھی ہوئی زبان اور لطیف اوزان اور نغموں کو اپنی شاعری کے لئے انتخاب کیا جسے مدھوسودن دت اور رابندرا ناتھ ٹیگور نے کمال عروج تک پہنچایا۔ دوسری طرف اس نے اپنے مزاحیہ اور ظریفانہ ادب کو مقامی اور بیرونی زبانوں کے منتخب ادب (دوبلی جُلی زبانیں جسے پوتھی ادب بھی کہتے ہیں) کے معاصرین شاہ غریب اللہ اور سید حمزہ کے کلام و بیان میں پائے جاتے ہیں۔ صوبہ بنگال میں برطانوی نظام کا قیام اس صوبہ کے مسلمانوں کی تہذیب تمدن اور ان کے نظم و نسق کے حق میں بڑا ہی پُر آشوب انقلاب تھا۔ ابتدا میں مسلمانانِ بنگالہ نے مغربی تعلیم سے دامن بچایا۔ مسلمانوں کا علمی سرمایہ اور ادبی تخلیقات پنتھی ادب تک محدود رہا۔ لیکن کیقباد کی غنائیہ نظم اسروالا (آنسوؤں کی مالا) اور مہاشمشان۔ (مقتلِ عظیم۔ اس نظم میں پانی پت کی تیسری لڑائی کا ذکر ہے) نے بنگال کے ذہین طبقہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ مثنوی کیقباد نے کمالِ فراست اور پختگی کے ساتھ سنسکرتی بنگلہ کے بڑے اُستادانہ رنگ میں لکھی ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے متغیر دور میں مائیکل مدھوسودن دت کو اولیت حاصل ہے۔ اسی شاعر نے واضح اور نمایاں طور پر بنگلہ زبان کا اسلوب بدلا۔ اور اسی کے ساتھ ہیم چندر بنرجی اور نوبین چندر سین کی نگارشات نے بنگلہ شاعری اور ادب کو نیا انداز بخشا اور بنگلہ مسلم ادب کو دورِ جدید کی نئی بلندی تک پہنچایا اور وقت کے معیاری تقاضوں کو پورا کیا۔

کیقباد عمر میں ٹیگور سے بڑے تھے اور قیام پاکستان کے بعد تک زندہ رہے۔ اس ضعیف العمری میں بھی کیقباد نے متعدد نظمیں لکھیں جن میں اسرو پوھار (آنسوؤں کا تحفہ) اور ایتی آزادی (یہ آزادی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سید امداد علی | مسلمانانِ بنگالہ کا پہلا اُردو جریدہ نبا نور (نئی روشنی) ایک ماہنامہ رسالہ تھا جس کے ایڈیٹر امداد علی ہی تھے۔ ان کی تحریر و نگارشات بنگلہ بنگلہ ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی اورنگ زیب عالمگیر کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی تھی وہ مسلمانانِ بنگالہ کی تہذیب و روایات کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نظمیں قائد اعظم شرنے (قائد اعظم کی یاد میں) اور امرا مسلمان (ہم مسلمان) میں اسی قسم کے جذبات کارفرما ہیں۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

غلام مصطفیٰ | بنگلہ کے پہلے مسلمان شاعر ہیں جنہیں ہندو عوام

میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی انہوں نے ترانۂ پاکستان کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ گولی مصطفےٰ کے کلام کا مجموعہ بلبلستان ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں پاکستان سے پہلے کی بھی نظمیں شامل ہیں۔ ان کی تصنیفات میں مرو دولال (محبوب صحرا) بلاشبہ ان کی سب سے اچھی کتاب ہے۔ دراصل یہ نعت ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بنی آدم" بھی طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی جس طرح "بشو نبی" (ہادیٔ عالم) بنگلہ نثر میں ان کی غیر فانی کتاب ہے اسی طرح "بنی آدم" بھی بنگلہ شاعری میں سنگ میل ہے۔ گولی مصطفےٰ ان لوگوں میں ہیں جو مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات میں اسلامی رنگ چاہتے ہیں۔ انکی تمام تحریروں و نگارشات میں اسی قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں —— شاہ محمد صغیر اور سید سلطان سے لیکر آج کے فرخ احمد اور تعلیم حسین جیسے جدید شاعروں کے کلام میں وہی جذبہ وہی کیفیت اور وہی روح کار فرما ہے۔

شہادت حسین

شہادت حسین کا آبائی وطن مغربی بنگال کے ضلع ۲۴ پرگنہ کے ایک گاؤں میں تھا۔ وہ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان آگئے تھے۔ ان کا اسلوب بیان ان کے کلام کی ساحری اور الفاظ کی جادوگری۔ صنعت اور فنکاری بنگلہ کے نوجوان شاعروں کے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہے گی۔ شہادت حسین کا پلّہ بہت گراں تھا انکی انفرادیت مسلم تھی۔ کم شاعر ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ شہادت حسین مرحوم کی متعدد مشہور تصنیفات ہیں۔ ٹیگور۔ نذرل اور شہادت کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

قاضی اکرم حسین

انکی نظم امرا بنگالی (ہم بنگالی ہیں) نے انہیں کافی شہرت بخشی قیام پاکستان کے بعد اکرم حسین نے مثنوی رومی اور کلام سعدی کا بنگلہ میں پیش کیا مگر خود اپنی ذاتی کوئی تخلیق نہ پیش کر سکے۔ کم و بیش یہی حال میزان الرحمٰن کا ہے۔ ابو الہاشم کی نئی نظمیں اقبال اور اقرا وغیرہ کافی جاندار ہیں۔

جسیم الدین

جسیم الدین کو مشرقی پاکستان کے بنگالی شاعروں میں عالمگیر شہرت حاصل ہے اس کی مشہور تصنیفات میں نقش کا نتھار ماٹ (منقوش سوزنی)۔ رنگیلا نا ئیر مانجھی اور سجن بدیا گھاٹ ہیں۔ ان کے علاوہ ماٹیر کانا (دھرتی کی فریاد) قیام پاکستان کے بعد شائع ہوئی۔ اس مجموعہ میں جتنی بھی نظمیں ہیں وہ انسانی احساسات سے بھرپور ہیں حال ہی میں اس کتاب کا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا ہے۔

ایک جگہ جسیم الدین کہتا ہے کہ۔

"کیا تم دھرتی کی آہ و زاری نہیں سنتے؟"

پڑھنے والے یا سننے والے کے قلب میں اس کا یہ سوال تیزی کے ساتھ نشتر کی طرح اتر جاتا ہے۔ اسی طرح جسیم الدین کی نظمیں امینہ۔ ہسپتال اور کھورتی پورن (تلافی مافات) وغیرہ صف اوّل کی نظمیں ہیں۔ جسیم الدین کے لوک گیت مشرقی پاکستان کی عوامی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

بیگم صوفیہ کمال

ان کی نظم سانجھیر مایا (فریب شام) قیام پاکستان سے پہلے چھپی تھی۔ صوفیہ کمال آج بھی مشرقی پاکستان میں سب سے اچھا کہنے والی مسلم خواتین میں ہیں اور وہی قدیم نغمات اور اندازِ بیان ان کے دوسرے مجموعۂ کلام مایا کاجل (حسین کاجل) میں اسی پہلے جیسے پُر اثر انداز کے ساتھ موجود ہیں ان کا شاعرانہ دل و دماغ ہمیشہ کی طرح آج بھی تر و تازہ ہے۔ عمر کے لحاظ سے بوڑھی ہو چکی ہیں لیکن انکا ذہن اب بھی تصورات و تخیلات کی سبز و شاداب راہوں پر چلنے سے نہیں تھکتا ہے۔

محمودہ خاتون صدیقہ

ان کی نظموں کا مجموعہ پشاریتی (بھیری والا) کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بنگال کی ایک مسلم خاتون کے ذہن سے تخلیق ہونے والی اپنے رنگ کی پہلی چیز ہے۔ محمودہ صدیقہ نے شاعری چھوڑی تو نہیں ہے لیکن اب اپنا زیادہ وقت گدیا کبیتا (آزاد شاعری) پر صرف کرتی ہیں۔

خان معین الدین فن شاعری میں پورے خلوص سے لکھتے ہیں۔ ان کی نئی تخلیق ہائے مانوش (ہائے انسان) بہت مقبول ہوئی۔ افسوس کی بات ہے کہ ان کی بہترین نظموں کا مجموعہ اب تک شائع نہ ہو سکا ہے۔

بندے علی میاں

ایک زمانہ تھا کہ بندے علی نے الوساگ کشش اور موٹینا ماتیر پہر (موٹینا ماتی کا ٹیلہ) جیسی نظمیں لکھ کر پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالدیا تھا۔ ان کی عمر کافی ہو چلی ہے۔ ضعیفی آگئی مگر ان کا شاعرانہ جذبہ اور شعری کیفیت پوری طرح سبز و شاداب ہے۔ آج بھی ان کا رومانی کلام بنگلہ رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ جنکا انداز بیان مختلف ہے۔ بندے علی دیہاتی زندگی اور مناظر کی تصویر پیش کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی حالیہ نظمیں — ماچھو دھارا (ماہیگیری) اور روپ کہانیر دلیش (حسن کی کہانیوں کا دیس) بہترین تخلیقات ہیں۔

قاضی قادر نواز

ان کی نظم مارل (ہنس) پندرہ بیس سال قبل شائع ہوئی تھی۔ مگر ان کے بہترین کلام وہ ہیں جو قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے۔ انہیں ستندر ناتھ دت کی طرح آسان زبان میں ــــ نشتر کی طرح تیز نظمیں لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ غنچہ اُمید اور سہرہ با پاکستان ان کی اچھی نظمیں ہیں۔

بے نظیر اور معین الدین

بے نظیر عمر میں معین الدین سے بڑے تو ہیں لیکن دُنیائے شعر و ادب میں ان کے بعد قدم رکھا ان کی نظمیں بندیہ بنسی (اہل قفس کی بانسری) اور بیساکھی آزادی سے پہلے شائع ہوئی تھیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد سے ان لوگوں نے کوئی قابل ذکر تخلیق پیش نہیں کی۔

صوفی مطاہر حسین

ایک زمانے میں صوفی مطاہر حسین کی نظمیں سپنا گھٹا (فسانہ خواب)۔ مایا مریچکا (سراب آہو) اور بیساکھی جاہر راتی (بیساکھ کی طوفانی رات) وغیرہ بڑی دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ اور اب تک مطاہر حسین اسی پرانے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

اظہر الاسلام

یہ قدیم کلاسک رنگ کے لکھنے والے ہیں اور جذباتی طور سے اسی پرانی روش پر چل رہے ہیں۔ ان کی نظمیں فاتحہ یازدہم اور مدینہ پاتھک (مدینہ کا راہی) وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی شاعری کا رشتہ قدیم مسلم شعرا کے ساتھ منسلک ہے اور ان کے ہمعصر شمشیر علی، عبد الودود، اسد، حید عالم وغیرہ بھی اپنے فن پر استواری کے ساتھ قائم ہیں۔

بذل الرشید

ان کا کلام پنتھا بینا (مسافر کا بین یا بانسری) تقسیم سے پہلے چھپ چکا تھا ان کی نئی نظموں میں نیا اندازِ بیان اور لطیف احساسات ملتے ہیں ان کی نئی تخلیقات ان کے ماضی کے کلام سے بہتر ہیں۔

احسن حبیب

ان کی نظم راتری سیش (رات ختم ہوئی) بڑی ہمت افزا ہے۔ احسن حبیب کی نظم پریم سے انکی شاعرانہ صلاحیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اپنی طنزیہ نظموں میں احسن حبیب نے بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے اور ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ حق نامہ، دھنا باد، اقرار نامہ اور سندھی پترا (صلح نامہ) جیسی نظموں کی وجہ سے ان کا نام آنے والی نسلوں میں باقی رہے گا۔

ابو الحسین

ابو الحسین کی منظوم نثر بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ انکی نظم نیا بسنت (نئی بسنت) کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی قیام پاکستان کے بعد سے اب تک انہوں نے اقبال کی ۲۵ نظموں کا بنگلہ میں ترجمہ کیا ہے اس وقت تک بنگلہ زبان میں اقبالیات کے جتنے بھی ترجمے ہوئے ہیں ان میں بلا شبہ ابو الحسین کا ترجمہ بہترین سمجھا جاتا ہے۔ انکی آزاد نظمیں مہدیر جانئے (مہدی کے لئے)۔ مدھو پراچہ (مشرق وسطیٰ) اور امر شونار دیش (ہمارا سنہرا دیس) وغیرہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی ضامن ہیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں سماجی زندگی پر طنز کرنے کا انہیں اچھا سلیقہ ہے۔ ابو الحسن کا رجحان آزاد شاعری کی تکنک کی طرف زیادہ ہے۔ ابو الحسین دوسرے اکثر شاعروں کے برعکس بہت صاف ستھرا رہنے والے آدمی ہیں۔ ان کی گفتگو میں سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے۔ با اخلاق آدمی ہیں۔ اور اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

فرخ احمد

بنگلہ شعر و ادب کی دنیا میں فرخ احمد پورے شد و مد کے ساتھ نئے نئے تجربات کر رہا ہے۔ فرخ بنگلہ شاعری کے جس اوج پر ہے وہاں تک اوروں کی رسائی کم ہے۔ بنگلہ زبان کے مسلم شعراء میں صرف نذرل کو الگ کر کے دیکھا جائے تو فرخ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ابھی فرخ کو بنگال سے باہر وہ شہرت نہیں ملی ہے جو بعض دوسرے بنگالی شعراء کو سن و سال یا اور کسی وجہ سے مل چکی ہے۔

فرخ کی نظم سات ساگر و مانجھی (سات سمندر کا مانجھی) قیام پاکستان سے پہلے چھپ چکی تھی۔ سراج المنیرا گرچہ آزادی کے بعد چھپی مگر یہ بھی فرخ نے پہلے ہی لکھی تھی اتو سر ہیسر گا (یہ بنگلہ زبان کے دو حروف علت ہیں جس طرح اردو میں زیر و زبر ہوتے ہیں) کے بعد فرخ نے نشاط نامہ اور تصویر نامہ لکھیں۔ اس نے اپنی نظم حاتم طائی خاص قسم کی مسلم بنگلہ کا تجربہ کیا ہے فرخ کی شاعری میں منتقی (ریوکھی) ادب کا رجحان کثرت سے ملتا ہے۔ وہ بنگلہ میں اقبالیات کی اشاعت کی طرف راغب ہے۔

سید علی احسن

بعض دیگر بنگالی شاعروں کی طرح یہ بھی مختلف قسم کے تجربات میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے نثر کے انداز میں شاعری کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علی احسن کا یہ رنگ ایک طرح کی ادبی گراوٹ ہے لیکن ان کی چہار دروش، مکہ کا راہی، زہرہ و مشتری اور دوسری نظمیں اُمید افزا ہیں۔

وہ تمام شاعر جن کا اوپر ذکر ہوا ہے وہی سب کچھ نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بنگلہ کے دوسرے اور بہت سے

(بقیہ صـ۱۳ پر)

عابد دانا پوری

مشرقی پاکستان کے گیت

مشرقی پاکستان کے شمال میں ہمالیہ کی بلند چوٹیاں ہیں جنوب میں خلیج بنگلہ ۔ مغرب میں گنگا کی ترائی کا ہندوستانی وسیع میدانی علاقہ اور مشرق میں برما کے ناقابل تسخیر گھنے جنگلات اور تریپورہ کی اور آسام کی اونچی پہاڑیاں ہیں ۔ یہ ہی وہ جغرافیائی اسباب ہیں جن کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں بے شمار نہریں ، چشمے ، ندی ، نالوں کا جال بچھا ہوا ہے ۔ ان میں پدما ، جمنا ، میگھنا ، کرنافلی اور اسی طرح کے دوسرے پرشور اور غضبناک دریا بھی شامل ہیں ۔ سرپہ دھواندھار بادلوں کا نہ ختم ہونے والا اور نیچے سبز و سنہری زمین ہے ۔ جسے زرخیز بنانے میں قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے ۔ یہاں کے باشندے فطرتاً رومان پسند طبیعت اور شاعرانہ احساسات لیکر پیدا ہوتے ہیں ۔

دُنیا کے دیگر ممالک کی طرح مشرقی پاکستان کے عوامی اور دیہاتی گیت کے دور کا آغاز بھی اسی قدیم زمانے میں ہوا ۔ جب سماج میں خارجی اختلاط اور بیرونی اثرات گہرے نہ تھے ۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے ذاتی تجربات اور اپنی طبیعت کی اُپج ہے ۔

دُنیا کے مشرقی ممالک میں دیہاتی اور عوامی گیت ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر خطہ کی فطرت اور ماحول جدا ہیں ۔ بعض ممالک میں صرف پہاڑ یا بے برگ و گیاہ ریگستان ہے ۔ لیکن مشرقی پاکستان میں دریا ہی دریا ہیں جو ہر علاقہ سے گزرتے ہیں ۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیت اور نغمے یہیں کے لوگوں کے دل و دماغ کی کیفیت کے صحیح ترجمان ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کو متغیر موسم اور اوقات سے گزرنا پڑتا ہے ۔ لہٰذا ان کے اندازِ بیان اور انکے گیت کے بھی اقسام ہیں ۔ اب مشرقی پاکستان کے عوامی شاعر ناخواندہ اور جاہل نہیں ہوتے آج کے عوامی گیت میں لطیف فنکاری ہوتی ہے ۔

مشرقی پاکستان کے عوامی گیت کی متعدد قسمیں ہیں جن کے نام بھی مختلف ہیں ۔

رودھیکا ویشنوی | یہ پیارا سا نام جس دوشیزہ کا تھا وہ خود بھی کم دلکش اور حسین نہ تھی ۔ گرچہ اس کا رنگ سانولا تھا مگر اس کا شباب بھی قیامت خیز تھا ۔ اس کی دونوں آنکھوں میں سمندر کی گہرائی تھی ۔ ویشنوی ایک بھکارن لڑکی تھی ۔ یہ بھکارن ۔ اکتارہ (باجا) لیکر کرتن گایا کرتی تھی ۔ یہ کرتن آج بھی مشرقی پاکستان کے مشہور گیتوں میں شمار ہوتا ہے ۔

اب بھی اس بھکارن لڑکی کی یاد میرے ذہن میں اس طرح موجود ہے گویا اسے میں نے کل ہی دیکھا ہے ۔ آج بھی کہیں موسیقی یا نغموں کی بات چھڑتی ہے تو معاً رودھیکا ویشنوی کا تصور میری نظروں کے سامنے ہوتا ہے جو کیسے کیسے پیارے گیت سنایا کرتی تھی ۔ رودھیکا کی طرح ہزارہا ویشنو بھکاری اس ملک میں تھے اور انہیں عام طور پر بیراگی کہا جاتا تھا ۔ ان بیراگیوں میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے ۔ یہ بیراگی لوگ کسی جگہ ڈیرا ڈال کر رہا کرتے تھے ۔ جس مقام پر بیراگیوں کے ڈیرے ہوتے تھے اسے اکھاڑا کہا جاتا تھا ۔ یہ بیراگی دروازے دروازے جاکر گیت سُنا کر بھیک مانگتے تھے ۔ دیہاتی عورتیں ان بیراگی عورتوں سے بڑی دلچسپی لیتی تھیں ۔ آج بھی بیراگیوں کے اکھاڑے صوبہ کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں ۔ گرچہ یہ واقعہ ہے کہ آزادی کے بعد دوسروں کے بہکانے سے بیراگیوں کی بھاری تعداد پاکستان سے چلی گئی ہے ۔ لیکن بیراگیوں نے یہاں کی دیہاتی زندگی میں اپنا دیرپا اور گہرا نقش قائم کر دیا ہے ۔ آج تک ان کے کرتن گیت مشرقی پاکستان میں بڑی دلچسپی سے گائے جاتے ہیں ۔

باؤل باؤل دوسری قسم کے خانہ بدوش فقیروں کا گروہ ہے ان کی کیفیت ازمنہ قدیم کے فرانسیسی مذہبی شاعروں کی سی ہوتی ہے یہ باؤل بھکاری گاؤں گاؤں جاکر مذہبی گیت سناتے ہیں یہ گیت مشرقی پاکستان میں معرفتی اور مرشدی کے نام سے مشہور ہیں۔ باؤل فقیر کسی مسلمان صوفی کے ساتھ خود کو منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمان کاشتکاروں میں اُن کی بڑی مقبولیت ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر اکتارہ۔ دوتارہ اور سارنگی پر گاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی دیہاتی کے گھر میں ساری ساری رات باؤل کی محفل جمی رہتی ہے۔ دیہاتی بھاری تعداد میں جمع رہتے ہیں۔ اور حقہ کا شغل جاری رہتا ہے۔ اس وقت یہ باؤل فقیر وہ گیت گاتے ہیں جس میں کہا جاتا ہے کہ یہ دُنیا بالکل عارضی اور ناپائیدار ہے۔ اے مسافر آخرت کے سفر کے لئے زاد راہ فراہم کر۔ وقت کم ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔ غافل نہ رہ۔

تمام معرفتی اور مرشدی گیتوں میں کم و بیش اسی قسم کے خیالات متفرق طریقے سے پیش کئے جاتے ہیں۔

دیہتواگان دیہتواگان بھی انہیں گیتوں کی ایک قسم ہے جس میں روحانیات کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ روح ایک حقیقت ہے اور دوسرے اعضاء دشمن ہیں جو ہمیشہ سے گمراہ کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ دیہاتوں کے مسلمان کاشتکار ایسے گیت بہت پسند کرتے ہیں۔ اکثر علاقوں میں ان باؤل فقیروں کی مقبولیت بہت زیادہ ہے۔

ملاحوں کے گیت ملاحوں کے بھٹیالی اور ساری گیت بھی مشرقی پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ خصوصاً مشرقی اور جنوبی اطراف کے دریائی اور ساحلی اضلاع میں بھٹیالی گیت عام ہے۔

رکھالی رکھالی جسے گوالوں کا گیت کہتے ہیں وہ بھی یہاں کے دیہاتی گیتوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بارہ ماسی دیہاتی گیتوں میں بارہ ماسی بھی بہت کثرت سے اور ہر علاقہ میں رائج ہے۔

بھاوایا یہ شمالی اضلاع کے گاؤں میں بیل گاڑی ہنکانے والوں کے گیت گانے کے اصل طریقہ کا نام ہے۔

اس صوبہ کے تقریباً ہر گاؤں میں کچھ لوگ ملیں گے جنہوں نے دیہاتی گیت گانے میں شہرت پائی ہے یہ گانے والے پیشہ ور گویئے نہیں ہوتے بلکہ شوقیہ گاتے ہیں اور چاندنی راتوں میں کسی کے آنگن میں دوستوں اور پڑوسیوں کے تقاضہ پر تفریحاً مجلس جمتی ہے۔ ان موقعوں پر زیادہ تر دوتارہ بجاتے ہیں اور گاتے ہیں۔

بھٹیالی، رکھالی اور بارہ ماسی گیتوں میں کسی دوشیزہ اور مانجھی کی محبت کی داستان ہوتی ہے۔ بھٹیالی گیتوں کا ہیرو اکثر و بیشتر ملاح ہوتا ہے۔

ساری گیت کشتی چلانے والے سب ملکر ایک ساتھ گاتے ہیں۔ موسم باراں میں جب یہاں کے چھوٹے بڑے تمام دریا لبریز ہوتے ہیں اس زمانے میں تقریباً یہاں کے ہر علاقہ میں بوٹ دلیس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر ناؤں کے چپّو چلانے والے ملکر گاتے ہیں اس نوعیت کے تمام گیت ایک خاص جذباتی لَے میں گاتے ہیں۔ اس لَے کا یہاں کے دیہاتی بڑا اثر لیتے ہیں اور بے حد پسند کرتے ہیں۔

پالاگان یہ بھی یہاں کے عوامی گیتوں کی ایک نہایت اہم قسم ہے پالاگان میں ایسی کہانی یا محبت کی کوئی داستان بیان کی جاتی ہے جس کا انجام ہمیشہ ٹریجڈی اور المناک ہوتا ہے۔

پالاگان گیت گانے والے ماہرین بھی تقریباً ہر علاقے میں ہیں۔ اس کی بڑی مانگ ہے۔ فصل کی کٹائی کے بعد جب کاشتکار ذرا آزاد ہوتا ہے تو وہی چاندنی راتوں میں گاؤں کے کسی بہتر مقام پر رزمیہ گیتوں کی مجلسیں جمتی ہیں۔ جن میں خاصہ اجتماع ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پالاگیت گانے والے بھی پیشہ ور گویئے نہیں ہوتے بالکل شوقیہ گاتے ہیں۔ حال ہی میں ایک نئی قسم کا رزمیہ گیت بھی بنگلہ میں رائج ہوا ہے۔ یہ نئے گیت صرف گائے نہیں جاتے بلکہ ڈرامہ کی صورت میں اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں چند منظوم ڈراموں کے نام، گیاتی بی بی، زرینہ سندری، روپ بانو، اور آسمن سنگھ ہیں۔ اس قسم کے منظوم گیت گاؤں میں دھوپ جاترا کے نام سے مشہور اور بے حد مقبول ہیں۔

زاری گان یہ زاری گیت مشرقی پاکستان کے تمام قصباتی علاقوں میں رائج ہے۔ بعض علاقوں میں زاری گیت کو ——

غازی گیت بھی کہتے ہیں۔ دوسرے جنگلہ رزمیہ گیتوں کی طرح اس میں بھی کوئی کہانی یا داستان ہوتی ہے مگر اس داستان کا تعلق کربلا کے کسی مظلوم کے خون سے ہوتا ہے۔ زاری گیتوں کی مجلس ماہ محرم میں منعقد ہوا کرتی ہے۔ اور پوری پوری جماعت مل کر گاتی ہے۔ یہ رزمیہ گیت بڑے طویل ہوتے ہیں۔ حلقہ باندھ کر گاتے ہیں اور گانے کے دوران حلقہ گھومتا رہتا ہے اور گاتے گاتے جب جوش میں آتے ہیں تو پورا حلقہ اس تیزی سے گھومنے لگتا ہے کہ دیکھنے والوں کو مغربی پاکستان کے خٹک رقص کا گمان ہو۔

سام کرتن مسلمان زاری گانے والوں کی طرح ہندوؤں کی بستی میں بھی سام کرتن گانے والی جماعت ہوتی ہے۔ سام کرتن ایک مذہبی رنگ کا عقیدتمندانہ عوامی گیت ہے جسے پوری جماعت ملکر گاتی ہے سام کرتن گاتے وقت ایک خاص قسم کا ڈھول بجاتے ہیں۔ یہ ڈھول یہاں کھول کہا جاتا ہے (کھول غالباً خول ہے) اور کھول کے ساتھ جھانجھ بھی بجاتے ہیں۔ یہ پیتل کی دو گھنٹیوں کی قسم کی چیز ہوتی ہے جسے ٹن ٹن بجاتے رہتے ہیں ان کی زبان میں اسے کرتل کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ہندو زیادہ تر وشنو اعقیدہ کے پرستار ہیں اسلئے ان میں سام کرتن گیت ہر جگہ کثرت سے رائج ہے۔

گھاٹو گان یہ دراصل ناچنے والے لونڈوں کا گیت ہے ایک زمانہ تھا کہ اس صوبے کے بعض علاقوں میں خصوصاً سلہٹ ٹپرا۔ ڈھاکہ اور میمن سنگھ وغیرہ میں اس کا بے حد رواج تھا۔ ہر فرقے کے نچلے اور پست طبقہ کے لوگ ایسی مجلسوں میں حصہ لیتے تھے اس قسم کے گانوں کی محفل اکثر ساری ساری رات رہا کرتی تھی لیکن تعلیم پھیلنے کی وجہ سے اور کچھ روشن خیالی آجانے کے سبب آج کل گھاٹو گان متروک ہو گیا ہے۔ اور ناچنے والے لونڈے جنہیں گھاٹو کہا جاتا تھا کمیاب بلکہ اب ناپید ہیں۔

مشرقی پاکستان میں خانہ بدوش قسم کی ایک بہت بڑی آبادی ہے جن کا گھر بار سب ناؤ پر رہتا ہے۔ وہ کسی ایک جگہ پر مستقل قیام نہیں کرتے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ سانپ بھی رکھتے ہیں۔ اور سانپ کا تماشہ دکھانا ان کا پیشہ ہے۔ ان خانہ بدوش سپیروں کو عموماً بھدیا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا دوسرا نام سپوریا بھی ہے۔ بھدیا عورتیں اپنے مردوں سے زیادہ تیز و طرار ہوتی ہیں۔ صبح سویرے بانس کی بند ٹوکریوں میں سانپ لے کر اپنی کشتیوں سے نکل پڑتی ہیں اور گاؤں گاؤں سانپ کا تماشہ دکھاتی پھرتی ہیں۔ تماشہ دکھاتے وقت گیت بھی گاتی جاتی ہیں۔ جسے سپوریا گان (سپیرا گیت) کہتے ہیں۔ ان گیتوں میں بھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک سپیرا گیت میں لکھن دار اور بیہولا کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے چاند سوداگر کے بیٹے لکھندار کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا اس کی جوان بیوی بیہولا شوہر کی لاش کو ایک بیڑے پر رکھ کر دریا در دریا چلی یہاں تک کہ موت کے بھگوان یام راجہ کے دیش پہنچ گئی اور یام راجہ کے سامنے رقص کرنے لگی اسکے ناچ سے یام راجہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کے شوہر کی زندگی واپس دے دی۔ سپیرن یہ گیت کچھ ایسے گاتی ہے کہ سننے والے خصوصاً عورتیں جذبات میں ڈوب جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سپیرن ہر گھر میں خوشی خوشی بلائی جاتی ہے۔ تماشہ کے لئے کم اور گیت کے لئے زیادہ۔

دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی عورتوں کے مخصوص گیت ہیں جنہیں صرف عورتیں ہی گاتی ہیں اور جو قطعی طور پر صرف عورتوں ہی کے لئے بنتے ہیں۔ یہ گیت شادی بیاہ یا اسی قسم کی دوسری تقریبات اور ولادت وغیرہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ یہ زنانہ گیت بہت سی عورتیں ملکر گاتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی ہر شادی۔ ولادت یا اسی قسم کی دوسری تقریب کے موقعوں پر گیت ہونا ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ مشرقی پاکستان کی شادابی میں قدرت نے کوٹ کوٹ کر موسیقیت بھر دی ہے۔

عابد داناپوری

مشرقی پاکستان کے چار گیت

مشرقی پاکستان میں ندی نالے ۔ دریا اور سمندر سب ہی کچھ ہیں۔ یہاں کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا شہر نہیں جسکے پورب پچھم یا اُتر دکھن ایک دو دریا نہ بہہ رہا ہو بلکہ کوئی ایسا گاؤں بھی نہیں جہاں ایک دو تالاب نہ ہو۔ اسقدر کثرت سے پانی ہونے کے جغرافیائی اسباب یہ ہیں کہ مشرقی پاکستان کے پورب میں آسام کی اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں ۔ اُتر جانب ہمالہ کی ترائی ہے پچھم میں ہندوستانی علاقے ہیں۔ اور یہ سب کے سب مشرقی پاکستان سے بلندی پر واقع ہیں۔ دکھن میں خلیج بنگالہ ہے ۔ سمندر کی سطح بھی مشرقی پاکستان سے زیادہ نیچی نہیں ۔ لہذا ہر جانب کے دریا اور پہاڑی ندیاں اسی علاقے سے ہو کر بہتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود مشرقی پاکستان میں سو انچ سالانہ بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہاں کی زمین نرم ہے۔ ہر طرف ہرے بھرے کھیت ۔ خودرو پودے ۔ گنجان جھاڑیاں ۔ گھنے جنگل اور اشجار کی فراوانی ہے ۔ مختصر یہ کہ ہر طرف ہریالی اور سبزہ زار ہیں ۔ اور قدرتی طور پر یہاں لوگ نرم دل ہونے کے علاوہ رومان پسند طبیعت اور شاعرانہ فطرت لیکر پیدا ہوتے ہیں اور موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے ہر گاؤں اور اکثر گھروں میں موسیقی کا چرچا ضرور ملے گا ۔ یہاں کے لوک گیتوں میں پہلے زیادہ تر صرف داخلی احساسات ہوا کرتے ہیں ۔ اگلے زمانہ میں وسائل کی کمی کی وجہ سے خارجی احساسات برائے نام تھے ۔ مذہبی عقائد کو عموماً ان گیتوں میں خاصہ دخل ہوا کرتا تھا ۔ تغیراتِ زمانہ اور وقت کی تیز رفتار کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوک گیتوں میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ گیتوں کی لے اور ان کی ساخت کے علاوہ اندازِ بیان میں بھی واضح طور پر ترمیم و تجدید ہوئی ۔ ارباب ادب کو یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ لوک گیت اب صرف سینہ بہ سینہ نہیں رہے ۔ بلکہ بنگالی ادب میں آج کے لوک گیتوں کو ایک مقام حاصل ہو چکا ہے ۔ آج کے لوک گیتوں میں مقصدیت بھی ہوتی ہے ۔ اور وہ ڈرامائی انداز میں لکھے جاتے ہیں۔

ان گیتوں کی ترکیبیں آسان اور بول صحیح ہیں۔ لیکن اوزان اور قافیئے پوری طرح مکمل نہیں ہوتے ۔ جدید لوک گیت بھی قدیم آہنگ اور پرانی موسیقی کے سُروں پر کہے جاتے ہیں۔ ماضی قریب میں ان گیتوں پر علمی اور ادبی نغمات و ترنم کے اثرات پڑے تھے ۔ لیکن دوبارہ ان ہی قدیم اندازِ بیان اور اسی نغمہ آہنگ کو اپنانا پڑا جس سے گاؤں کے لوک گیت گانے والے ماہرین پوری طرح آشنا تھے اور جسے یہاں کے باشندوں میں مقبولیت حاصل تھی ۔ گانے والے پسندیدہ فنکاری کی تھوڑی بہت تبدیلیاں جو ہمیشہ ہر جگہ ہوتی رہیں ۔ مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کے الگ الگ نام ہیں اور ان کی مختلف قسمیں ہیں ۔ ان تمام اقسام کو تفصیلی طور پر ایک مضمون میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن ان میں چند بہت مشہور اور عام پسند ہیں مثلاً بھٹیالی ۔ ملاحوں کے گیت ۔ زاری ۔ بوباٹیا ۔ مرشدی ۔ معرفتی ، بارہ ماسی ۔ دیہتوا ۔ بادل اور کرتن وغیرہ یہ تمام متفرق قسم کے سازوں پر گائے جاتے ہیں مثلاً یکتارہ ، دوتارہ ، بنسی ، مریدنگا ۔ کھنجاتی ۔ ڈگی ۔ طبلہ ۔ ڈھول اور کرتل ۔

مشرقی پاکستان کے بھٹیالی گیت کے لئے یا سُر بالکل اس ندیا کی فطری پیداوار ہے ۔ اس گیت کے سُر کی تان بڑی لمبی ہوتی ہے ۔ جس سے گانے والے کے جذباتی دل و دماغ کا سیدھا سادا انداز ظاہر ہوتا ہے ۔

دن بھر کی مشقت کے بعد ایک تھکا ماندہ مانجھی گھر آیا ہے ۔

خاموش دریا سکون کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ اُوپر نیلا آسمان ہے۔ یہ مناظر اس کے تصور کو بلندیوں کی طرف لے اُڑتے ہیں اور وہ یوں گانا شروع کرتا ہے۔

(۱) اور میرے مانجھی تو کیوں اس تھوڑی گہری ندی میں
ناؤ چلا رہا ہے۔
او ملّاح تو کس کی دلجوئی کر رہے ہو
کیا یہ محبت (جسے دیس کی آنکھوں کا جل کہتے ہیں)
ندی کے بہاؤ کے لئے
میرا دل کہتا ہے
او چکیلے بادل کے پیچھے رہنے والے
اپنے پریمی کو بلالے
میں کیا جانوں
کہ اس دریا کے دوسرے ساحل
پچھم والے گاؤں میں
میرا ساجن رہتا ہے
ابھی کیلے کے درختوں کے جھنڈ سے
ہوائیں چل رہی ہیں
زلفیں اُلٹ اُلٹ دیتی ہیں
کاش اُسے کوئی
میرے درد دل کی خبر کر دے
کہ ایک دکھیاری
زار زار روتی ہے
آنکھوں سے آنسو جاری ہیں

کبھی مانجھی کا تصور اسے اُس دل دوساز کا حسین خواب دکھاتا ہے جہاں کبھی اُسے محبوب کی تجلّی نظر آئی تھی۔ مگر معاً آسمان پر ہر طرف کالے بادل چھا جاتے ہیں۔ آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ مانجھی خطرات میں گھر جاتا ہے۔ طوفان کی غارتگری سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈتا ہے اور وہ گاتا ہے۔

(۲) دریا کا نہ اُور ہے کوئی
دریا کا نہ کور

کس پار سے مجھ کو
جانا ہے کس پار
میں کس سے پوچھوں ہائے
وہ دیکھو تو اس پار
گہرے بادل اور وہ بھی کالے
ہوتے جاتے ہیں۔ بجلی بھی گرج رہی ہے
دریا کا بہاؤ ہے غضب کا
ہاں ٹھیک وہیں — وہیں پہ
دیکھا تھا سنہرے سپنے (محبوب مراد ہے)
کی جھلک سی ایک میں نے
اک آن میں وہ جلوہ
میری نظر سے لیکن
بس ہو گیا تھا اوجھل

پُرشور ندی کی موجوں
میں یہ ٹوٹی ناؤ اپنی
میں چلائے جا رہا ہوں
مرے دل کی آرزوئیں
مری اُمید کو سہارا
دیئے جا رہی ہیں پیہم
شاید کہ میری نیا
ساجن کے دیس پہنچے

پُرشور ندی کی ہولناکی بڑھتی جاتی ہے۔ طوفان کی گرج سے ملاحوں کے ہوش اُڑنے لگتے ہیں مانجھی اور اس کے ساتھیوں کو مہیب اور اُونچی نیچی موجوں سے اُلجھنا پڑتا ہے۔ حیات و موت میں کش مکش ہوتی ہے اس جدوجہد میں ان کی ہمت شکست نہیں کھاتی۔ اس وقت وہ ساری گیت اس طرح گاتے ہیں۔

(۳) مانجھی رہے ہوشیار

اس موسم سے ہوشیار رہے مانجھی
ٹکراتی ہے جو ناؤ سے تیری

موجوں سے ہاں خوف نہ کھانا
جیون تیرا کٹتا ہے
پدما کی چھاتی پر
برق و باراں مانجھی کے
جیون ساتھی ہوتے ہیں

شارک مچھلی اور گھڑیال
مانجھی پڑوسی ہوتے ہیں
ضرب سے چپو کی تیرے
کالی کالی جھاگ اگلنے والی
بپھری ہوئی سرکش موجوں کے
سر بھی نگوں ہو جاتے ہیں

دل رقصِ مسرت کرتا ہے
طوفان کے اٹھتے منظر پہ
پانی کا بہاؤ رک جائے
مانجھی اپنا تان کے سینہ
تو بھی گرج طوفان کی طرح

ناچ رہی ہے بادل میں
اک وحشی لڑکی شعلوں پہ
روشن سی لکیریں بنتی ہیں
جو راہ کو پہچانیں گی
فتح و ظفر کی منزل تک
طوفاں کا غضب بڑھ جاتا ہے
آکاش تھپیڑیں کھاتا ہے
اس دنیا میں ہم لوگ مگر
طوفان پہ قابو پائیں گے

یہاں کے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں ہر اس مقام کو بڑی اہمیت ہے جہاں پانی ہو خصوصاً دریا کی اہمیت ناگزیر ہے اور قدرت بھی یہاں طرح طرح کے مسائل پیدا کرتی رہتی ہے اس دیار میں بوندا باراں بھی عجیب چیز ہے یہاں کے لوگ دعائیں مانگتے ہیں اور اسوقت ایک خاص قسم کا گیت گاتے ہیں جسے زاری کہا جاتا ہے۔ زاری کے گانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مخصوص فرد یا اصل گانے والا شخص تقریر کہانی کے طور پر کچھ گاتا ہے اور پھر مجمع اس کے ساتھ راگ ملاتا ہے وہ گاتا ہے۔

(۴) وقت ہے دوپہر کا
غبار اڑتا ہے آسمان پر
لگی ہے سورج سے آگ دل میں
پیاس بے تاب کر رہی ہے
اللہ بدلی دے بارش دے اور رحم کر

شق ہے چہرۂ بریں کا سینہ
زمیں شعلے اگل رہی ہے
اور بادلوں کے حاکم
کو نیند غفلت کی آگئی ہے
نہ جانے کیسے اب ہوگی بارش
کسان روتا ہے بے بسی سے
پڑے ہیں بیکار ہل بھی اس کے
اور بیل اس کے
عورتیں بھی گھروں کے اندر
بلک رہی ہیں کلپ رہی ہیں
پکانے بیٹھی ہیں اور رکھا چاول
آموں کی ڈالیوں پر

(باقی صفحہ ۱۵۲ پر)

عابد دانا پوری

قاضی نذرالاسلام کا بچپن

نذرالاسلام ہند و پاکستان کی ممتاز ترین ادبی شخصیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ذات اور نگارشات کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی شاعری اُجاگر ہونے کے بعد سے آج تک بیشمار اہل ذوق برابر اور نذرالاسلام کے متعلق معمولی سے معمولی تفصیل کا بھی مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ نذرالاسلام کے ایام طفلی کے حالات سے واقف ہیں۔ لوگوں کو صرف وہی باتیں معلوم ہو سکی ہیں جنکا ذکر نذرل کے دوستوں اور جلیسوں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ ان اطلاعات و نگارشات سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ نذرل ایک محض معمولی لڑکا تھا مگر ان تحریروں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس معمولی انسان کو اتنی عظمت کیسے حاصل ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم سے ذرا پہلے کے بعد جب نذرل نے دوبارہ شہری زندگی اختیار کی تو اُسے کم و بیش بیس سال تک نوجوانوں میں ہیرو کی سی حیثیت حاصل تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ خود اس کے اپنے گاؤں میں جسے اُسنے ۱۹۱۷ء میں چھوڑا تھا وہاں اُس کے ساتھی اُسے اپنا لیڈر تسلیم کرنے کے روادار نہ تھے۔

اپنے لڑکپن میں نذرل نے اکثر شعر کہے جسکے عوض اُسے عطیے اور انعامات ملے۔ بچپن کی یہ نگارشات بھدی بھی ہوں مگر وہ ادب ضرور تھیں۔ بچپن ہی کے زمانے سے نذرالاسلام کو موسیقی کا چسکا ڈھنگ اور خاصہ علم تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی حیثیت ایک کوچہ گرد گانے والے لڑکے سے زیادہ نہ تھی اور نہ وہ اس وقت ایک عظیم موسیقار بن سکا تھا۔

آج سے تقریباً ۶۳ سال پہلے ضلع بردوان (مغربی بنگال) کے چورلیا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے آباد اجداد پٹنہ (بہار) کے رہنے والے تھے۔ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ نذرل کے سر سے اٹھ گیا۔ باپ کی وفات نے اس کے پورے کنبے کو بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے نذرل کو بڑی کشمکش اور جد و جہد کرنی پڑی۔ بہرحال دو سال بعد گاؤں کے مکتب سے اُس نے لوئر پرائمری امتحان پاس کیا اور اُسی مکتب میں مدرس بنگیا۔ دوسرے سال سے اُس نے مقامی ناظرہ گاؤں کی مسجد کے امام کی خدمت کرکے اپنی حقیر آمدنی میں قدرے اضافہ کیا۔ یہ ہی وہ زمانہ تھا جبکہ نذرل نے قلم سنبھالا اور لکھنا شروع کیا۔ اس اطراف میں بہت سی علاقائی اور محلہ وار پارٹیاں تھیں جو لیٹو ٹروپ کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ جماعتیں ناچ گانوں کے ساتھ ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ لیٹو ٹروپ کے لئے نذرل نے متعدد ڈرامے اور گانے لکھے۔ ان پارٹیوں نے منظور شدہ ڈراموں کے لئے نذرل کو معاوضے بھی دیئے۔ لیٹو نگار کی حیثیت سے اس نے اسقدر شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی ایکٹر وغیرہ اُستاد کی طرح اس کی عزت کرتے تھے۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود اُسے مالی آسودگی نصیب نہ تھی۔ اس کی تنگدستی اور فلاکت میں کمی نہ آئی۔ کیونکہ اس کے خاندان میں افراد کی کثرت تھی۔ اور نذرل ابھی کمسن تھا۔ آمدنی کافی نہ تھی اور نہ اتنے تجربات تھے کہ وہ اتنے بڑے کنبے کی نگہداشت کرسکتا۔ وہ بڑی الجھن میں تھا۔ آخر کار عاجز آکر مکتب سے فرار ہوگیا اور اچھی ملازمت کی تلاش میں آسنسول پہنچا۔ کمسنی اور تعلیمی سند کی عدم موجودگی میں اُس دیہاتی بچے کو ایک نانبائی کی چھوٹی سی دکان میں نوکری ملی جہاں اس کی تنخواہ پانچ روپے ماہانہ تھی۔

اُسی دوران میں نذرل کی ملاقات ایک رحم دل انسان ــــ قاضی رفیع الدین سے ہوئی۔ قاضی رفیع الدین آسنسول میں پولیس انسپکٹر

تھے۔ فنِ موسیقی میں نذرل کے تجربات سے بہت متاثر ہوئے اور نذرل کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے۔ چار سال بعد جب قاضی صاحب اپنے وطن (میمن سنگھ کے ایک گاؤں میں) لوٹے تو اس ہونہار نوجوان کو اپنے ساتھ لیتے گئے اور اُسے اطراف کے ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا جہاں اطمینان کے ساتھ نذرل اپنی تعلیم میں لگ گیا۔

یہ اطمینان کے لمحات بھی زیادہ دنوں تک نذرل کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس کی شورہ بختی نے ایک اور چال چلی۔ نذرل کو اسکول میں فری اسٹوڈنٹ شپ ملی تھی۔ جس ہیڈ ماسٹر کی عنایتوں سے نذرل کو یہ رعایت ملی تھی۔ ایک ہی سال بعد اس استادِ مشفق کا تبادلہ ہو گیا۔ اس کی جگہ پر جو دوسرا ہیڈ ہیڈماسٹر آیا اس نے نذرل کو دی ہوئی تمام رعایتوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ سخت گیری غریب نذرل کے لئے بھاری دھچکا ثابت ہوئی اور وہ یہاں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

لیکن علم کی بے پناہ محبت اس کے اندر پیدا ہو چلی تھی۔ اس نے مستقل مزاجی کے ساتھ فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم نہیں کرے گا۔ میمن سنگھ میں اسے جو تعلیمی سہولتیں اور رعایتیں ملی تھیں اس کو قائم رکھنے کے لئے نذرل کو روزانہ دس میل پیدل جانا پڑتا تھا

میمن سنگھ سے نذرل بحالتِ مجبوری رخصت ہوا اور رانی گنج (رانی گنج نذرل کے اپنے ضلع بردوان کا ایک شہر ہے) پہنچ گیا۔ لیکن وہ بالکل قلاش ہو رہا تھا۔ اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور نہ کوئی اس کا یار و مددگار تھا۔ صرف اپنے شوق اپنی لگن اور اپنے بے پایاں جذبے کے بل بوتے پر اُس نے رانی گنج ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور پورے تین سال تک یہاں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ لیکن اب تک یہ پیچیدہ راز ہے کہ رانی گنج میں نذرل نے کس طرح اپنے مصارف اور اخراجات پورے کئے۔ اُس کے عزیز اور دوستوں کو حیرت تھی اور سوچتے تھے کہ کیا اتنے دنوں تک اس نے خیرات وغیرہ پر زندگی بسر کی؟۔

رانی گنج سیرسول راج اسٹیٹ ہائی اسکول میں نذرل کی تین سالہ زندگی بھی ایک عجیب یادگار دور ہے۔ مکتب کی ابتدائی تعلیم کا دور اُسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب نذرل اپنے گاؤں سے رخصت ہوا۔ اور رانی گنج میں داخلہ لینے سے پہلے تک گھر والوں کو اپنے متعلق کوئی خبر نہ دی۔

اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسکی بڑی سرپرستی کی۔ نذرل بھی اس ہیڈ ماسٹر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سیلاجنند مکرجی بنگالی زبان کا مشہور ناول نگار گزرا ہے وہ نذرل کا کلاس ٹیچر تھا۔ ہیڈ ماسٹر اور دوسرے دوستوں کی ہمت افزائی سے نذرل نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اس دفعہ وہ شاعر کی حیثیت سے آگے بڑھا۔ اُس کی چند ابتدائی نظمیں اسی دور کی تخلیق ہیں۔ اُس کی ایک نظم "طائرِ خزاں رسیدہ" کی وجہ سے اُسی ایام طفولیت میں اس کی شہرت اس شہر میں کافی ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر رانی گنج کے اس راج اسکول کے نقوش گہرے تھے۔ اس نے جب کہانیاں لکھنا شروع کیں تو ایک افسانے میں اس اسکول کا بھی ذکر کیا ہے۔

"ایک آوارہ گرد کی سرگزشت" ہی نذرل کی وہ تحریر ہے جو سب سے پہلے چھپی۔

اس کہانی میں جس آوارہ گرد کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ خود نذرل کی اپنی ذات ہے۔ گرچہ میمن سنگھ اور رانی گنج کے اسکولوں میں نذرل پابندی کے ساتھ اپنی کلاس میں حاضری دیتا رہا۔ مگر اس کے اندر ایک عظیم شخصیت بننے کی دلکش علامتیں اسی وقت سے پرورش پا رہی تھیں جنکے اظہار کے لئے نذرل کو مناسب وقت اور صحیح موقع کی تلاش تھی بالآخر وہ وقت آ ہی گیا اور ۱۹۱۷ء میں اُس نے قطعی طور پر اپنی تعلیم کو خیرباد کہکے ۴۹ ویں بنگال رجمنٹ میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔

اس نوکری کے ساتھ ساتھ اس کی بچپن کی زندگی کا دور ختم ہوا اور جب وہ جنگِ عظیم سے واپس آیا تو وہ بالکل بدلا ہوا پورا صاحبِ قلم جوان نذرالاسلام تھا جو بنگالی زبان کے آسمانِ ادب پہ آفتاب بن کر چمکا۔

عابد داناپوری

قاضی نذر الاسلام ڈرامہ نگار کی حیثیت سے

قاضی نذر الاسلام کی شہرت دُنیائے شعر و ادب میں باغی شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن نذرل کے دوسرے ہمعصر شعراء حسن و عشق کی اُسی روایتی اور قدیم ڈگر پر گامزن رہے۔ اہل وطن کے دلوں میں جو امنگیں اٹھ رہی تھیں اور جو جذبات موجزن تھے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ بنگالی زبان کے دوسرے شعراء متغیر حالات سے بےخبر ہیں۔ ٹھیک اسی وقت نذرل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں بانسری لئے ہوئے نمودار ہوا۔

روایتی حسن و عشق کو جدید قومی جذبات اور تیغ و سناں کے ہنگامو سے ہم آہنگ بنا کر بنگالی شعر و شاعری کو ایک اسٹیج پر لانے والا سب سے پہلا شخص نذرل ہے۔

مگر یہ دونوں مختلف نوعیت کے رجحانات خود نذرل کی نگارشات میں بھی بہت زیادہ دنوں تک یکجاہ نہ رہ سکے۔ اس کی نظموں سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ نذرل نے صدیوں کی پرانی روایات کو توڑ کر بنگالی شعر و شاعری میں نئے انداز، نئے رنگ اور نئے اسلوب کی بنا ڈالی۔ اور یہی نیا انداز اس کی نثر میں بھی کارفرما ہے جو خصوصیت کے ساتھ نذرل کے ادبی اور سیاسی مضامین سے صاف عیاں ہیں۔ اس کے متعدد گیتوں اور تقریباً تمام ڈراموں کا لب و لہجہ بیک وقت رومان آمیز بھی ہے اور باغیانہ بھی۔

نذرل کے مرتب کئے ہوئے بہت سے نغمات و آہنگ کے متعلق ناقدوں میں مباحث کا طویل سلسلہ رہا ہے۔ نذرل کے وہ ڈرامے خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں جو ایک زمانے میں بےحد مقبول تھے۔ اور آج بھی ان کی کم تعریف نہیں ہو رہی ہے۔ نذرل نے تین مکمل ڈرامے اور چار ڈرامے ایک ایک ایکٹ کے لکھے۔ ان کے علاوہ متعدد برجستہ اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے ٹکڑوں کی شکل میں ملتے ہیں مگر یہ اس قدر مختصر ہیں کہ انہیں ڈرامہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دراصل کم عمر بچوں کے لئے ڈرامائی منظوم بول ہیں۔ ڈراموں اور مکالموں میں ایک مشترکہ عنصر ہوتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ بنگالی ادب میں تمثیلی ڈراموں کی بنا ٹیگور نے ڈالی اور بلاشبہ نذرل کے ڈراموں پر ٹیگور کے اثرات بہت کافی ہیں اور امکان بھر نذرل نے ٹیگور کی تکنیک کی تقلید کی۔ یہی وجہ ہے کہ نذرل کے تمثیلی ڈراموں کی نثر کے حصے میں ٹیگور کا غنائیہ انداز جھلکتا ہے۔ لیکن حقیقی عمل تک نذرل کی رسائی اور پہنچ ٹیگور سے کہیں زیادہ جرأتمندانہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ٹیگور کی توجہ عموماً تخیلات و تصورات پر مرکوز رہی۔ اور جب اس زاویہ نگاہ سے تجزیہ کیا جاتا ہے تو صاف اور واضح طور پر اس جسارت کی وجہ سے نذرل کی خصوصیت اور انفرادیت ٹیگور سے بالکل الگ اور مختلف نظر آتی ہے۔

نذرل نے موسیقی کے متعدد نغمات و آہنگ کی تشکیل کی لیکن گیتوں سے زیادہ اس کی توجہ نثری مکالموں کی طرف رہی جس کی وجہ سے کبھی کبھی مرکزی اور مطلوبہ مقاصد کے اثر پذیر ہونے کا اندیشہ بھی لگا رہا۔

بہرحال بعد کی تخلیق مدھومالا کی تکنیک میں نذرل نے تبدیلیاں کیں۔ مدھومالا نذرل کی طویل ترین منظوم ڈرامائی تخلیق ہے جسے نذرل نے چالیس سال سے زیادہ عمر ہو جانے کے بعد قلمبند کیا۔ اس کے برعکس اس کا سب سے پہلا ڈرامہ جو تینتیس سال کی عمر میں لکھا گیا تھا وہ غیر منظوم ہے۔

اس سے پہلے ایک ڈرامہ پتول بیئے (گڑیا کا بیاہ) میں بھی گیت نظمیں اور نغمے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ ڈرامہ غیر تمثیلی ہونے کے علاوہ نثر میں ہے۔ نذرل کی تمثیلی تخلیقات میں ایک ایک ایکٹ کے چار ڈرامے

ہیں جھلکی[1]، سیتو بند (پل)[2] بھوتر بھایا (بھوت بھگاوڑ)[3] اور عید[4]۔

سیتو بند اور بھوتر بھایا، کو چھوڑ کر نذرل کے تمام ڈراموں کا اصل کردار یہ ہے کہ محبت اور اخوت کا جذبہ دنیا کی تمام برائیوں اور بے اعتدالیوں کا واحد علاج ہے۔

سیتو بند میں نذرل نے مشینی ایجادات کو فطرت کی بخششوں اور نعمتوں پر ایک غاصبانہ حملہ کہا تھا۔ لیکن بعد کو مشین کی ایجاد اور اس کی طاقتوں کو ناگزیر تسلیم کر لیا۔ اس ڈرامے میں نذرل کے دل کی آواز حسن و الفت کے احساسات کا اظہار بڑے لطیف اور نازک انداز میں کرتی ہے۔

بھوتر بھایا میں نذرل کا فلسفۂ محبت، اخوت اور میل ملاپ نے نیا روپ اختیار کیا ہے۔ اس ڈرامے میں اہل وطن کی محبت نذرل کے دل سے سامراجیوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ بنکر نمودار ہوتی ہے۔

الایا میں نذرل نے محبت، حب الوطنی اور باہمی اخوت کا فلسفہ بیان کرنے کے لئے راست اور موثر انداز اختیار کیا ہے۔ اس ڈرامے کا مردانہ کردار تین متفرق قسم کی محبت کی نمائندگی کرتا ہے۔ حسن کی چاہت، قربانی کا جذبہ اور قوت کی طلب۔

زنانہ کردار کی اصل یہ ہے کہ ایک دل جس میں محبت کی خلش اور آرزوئیں تو ہیں مگر محبت میں ناکام رہا ایک دل جو محبت کرنے کی طاقت حاصل کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ایک دماغ جو پورے شباب پر ہونے کے باوجود محبت سے ناواقف ہے۔ ان ڈراموں کے کرداروں میں جو جذبات ہیں وہ نہایت چابکدستی اور ذہانت کے ساتھ اسٹیج ڈراموں کے مناظر میں بتدریج پیش کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کے جذبات غیر شعوری طور پر غم و اندوہ سے مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ آہیں بھرنے لگتا ہے۔ مگر فوراً ہی اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ محبت کرنے والے کا جوان دماغ دوسری تمام طاقتوں پر غالب آگیا ہے۔

جھلکی میں نذرل نے محبت کے مارے ہوئے ایسے مرد اور عورت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن کی آرزوئیں اور تمنائیں قدامت پسند قوتوں کے ہاتھوں مجروح ہوتی رہی ہیں۔

نذرل نے محبت بھرے مرد اور عورتوں کو ابدی اور غیر فانی بتایا ہے اور یہ کہہ کر پردہ گرا دیتا ہے کہ سچی محبت خود ایک ناقابلِ تسخیر قوت ہے۔ جس میں خلوص اور تقدس ہو وہ محبت تمام رکاوٹوں اور بندشوں کو منہدم کر دے گی۔

مدھو مالا، میں مختلف انداز سے اسی قسم کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ اس ڈرامے کی نسل بھی کچھ تجدید و تخفیف اور رد و بدل کے ساتھ لوک کہانیوں سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کے ہیرو اور ہیروئن ایک شاہزادہ اور شاہزادی ہیں۔ جو کسی دور دراز دیس کے رہنے والے ہیں۔ شاہزادہ اور شاہزادی میں پہلی بار ملاقات ہوتی ہے۔ پہلی ہی نظر میں خواب و خیال کی پریوں کی جادوگری دونوں کو ایک دوسرے پر فریفتہ کر دیتی ہے۔ مگر چند ہی لمحہ بعد پریاں دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہیں۔ لیکن اس جدائی سے ان کی محبت زیادہ گہری اور استوار ہو جاتی ہے۔ وہ راہ سے تمام رکاوٹوں اور چٹانوں کو ہٹا کر دائمی رفاقت حاصل کرنے کا عزم کر لیتے ہیں۔ ڈرامے کے آخری مناظر میں دکھایا گیا ہے کہ دونوں (خصوصاً شاہزادہ) نے محبت میں سچائی اور خلوص کی قوت سے ہر طرح کی ناہنجاری اور دشواریوں کو مغلوب کر لیا ہے۔

نذرل کی دوسری نگارشات میں بھی محبت ہی کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں جن سے انسانی اخوت اور عالمگیر برادرانہ تصورات کے مناظر سامنے آتے ہیں۔

پتلیبیئے (گڑیا کا بیاہ) میں بھی ایسی ہی ہمہ گیر برادری کی بنیاد پر عالمگیر اخوت کی تعمیر و تشکیل کی تلقین کی گئی ہے جس میں ذات پات، فرقہ داریت، مقامیت اور منافرت کا جذبہ آلودہ نہ ہو۔ انہی عالمگیر برادرانہ خیالات نے نذرل کی عظمت کو بین الاقوامی بلندیوں تک پہنچایا۔

اب سوال ہے کہ مذکورہ مقاصد کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کی کیا صورت ہے؟ نذرل کے ایک سین کا ڈرامہ سپلی میں اس کا جواب موجود ہے۔ اس شہپارے میں پر مغز بصیرت کے ساتھ جامع طور پر نذرل کہتا ہے کہ صرف محبت اور احساس محبت ہی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محبت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اسمیں عملی صداقت بھی ہو۔ انسانوں کے تفکرات، دکھ سکھ اور ان کی خوشحالی و بدحالی کا راز معلوم کیا جائے۔ اگر محبت کے پرستاروں کو دوسروں کے رنج و غم کی خبر نہ ہو تو محبت بھرا نازک اور انمول دل ایک گھٹیا قسم کی چیز بن کر رہ جائیگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ محبت کرنے والوں کے احساسات حقیقی بھی ہوں اور عملی بھی ——— یہ باتیں اس ڈرامہ نگار کی صرف لفاظی نہیں ہے بلکہ یہی فلسفۂ محبت و اخوت نذرل کی پوری زندگی پر حاوی ہے نذرل کی

عابد دانا پوری

چاٹگام کے پہاڑی قبائل

مشرقی پاکستان سب سے بڑی اکثریت والا صوبہ ہونے کے باوجود اس خطے میں متعدد مذاہب اور قبائل موجود ہیں۔ زیر نظر مضمون میں صرف دو بڑے قبائل کا ذکر ہے۔ ان قبائل کے افراد اپنے انوکھے رسم و رواج کی وجہ سے چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کی دلچسپی اور دلکشی کا سبب ہیں۔ یہ قبائل چاٹگام ہل ٹریکٹ کے وسطی علاقوں میں ضلع رانگامائی سے لیکر پاکستان کی آخری شمال مشرقی سرحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مذہباً یہ لوگ بدھ ہیں سوائے ان چند دیہاتوں کے جہاں کے لوگوں نے عیسائی مذہب یا ہندو دھرم اختیار کرلیا ہے۔

چکما قبیلے کے لوگ دراصل ہیں تو پہاڑی باشندے مگر پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر بسنے سے گریز کرتے ہیں۔ دریا کے کنارے یا اس کے نزدیک گاؤں بناکر رہتے ہیں۔ فصل کے زمانے میں پوری پہاڑی سرسبز و شاداب رہتی ہے۔

چکما قبیلہ والوں کی پوشاک بڑی رنگین ہوتی ہے۔ اُن کی عورتیں گہرے نیلے رنگ کا لہنگا یا اسی قسم کا سایہ پہنتی ہیں۔ اس لہنگے میں دو چوڑی دھاریاں ہوتی ہیں۔ جنھیں دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ چکما قبیلے کی عورت ہے۔ چھاتی پر سرخ رنگ کا چمکیلا اور بھڑکیلا مختصر سا کپڑا یا بالکل عریاں قسم کا بلاؤز بھی پہنتی ہیں۔ یہ کپڑے ہاتھ یا کرگھے کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ زیبائش کے لئے چاندی کی ایرنگ کان میں۔ ناک میں نتھ۔ ہاتھوں میں چوڑیاں اور گلے میں ہار وغیرہ بھی پہنتی ہیں۔ سردی کے موسم میں رنگین شال چادر اوڑھتی ہیں۔ ان کے سر ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ غالباً چکما عورتوں میں سر چھپانے کا رواج ہی نہیں ہے۔

چکما قبیلے کے مرد جنگلوں یا کھیتوں میں کام کرتے وقت بالکل مختصر سی لنگوٹی یا انگوچھا باندھ لیتے ہیں جس سے ستر پوشی نہیں ہوتی۔ لیکن جب بازار جاتے ہیں یا خاص خاص تقریبوں کے موقعوں پر قمیص اور دھوتی پہنتے ہیں۔

چاٹگام ہل ٹریکٹ سے لیکر شمال مشرقی سرحد تک چکما کے علاوہ اور بھی کئی مشہور قبائل ہیں۔ جن کی اکثریت غالباً منگولین نسل سے ہے۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ ان میں بعض قبائل ڈراوڈین اور ادیباسی ہیں جو مسلمانوں اور آریاؤں سے پہلے یہاں موجود تھے۔ چاٹگام ہل ٹریکٹ کے منگول قبائل میں چکما والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہل ٹریکٹ پر آباد ہونے سے قبل یہ لوگ برما کے صوبہ اراکان میں بستے تھے۔ اور پہلے پہلے وہیں سے ضلع چاٹگام کے جنوبی علاقوں میں داخل ہوئے اور ہل ٹریکٹ پہنچے۔ تقریباً سارا ہل ٹریکٹ چکما علاقہ ہے۔ اور ضلع چاٹگام کا پورا جنوبی حصہ برمی تبتی قبیلے کے لوگوں کا مسکن ہے اس قبیلے کا نام ماگھ ہے۔ ماگھ قبیلہ فی الحقیقت منگولین نسل سے ہے۔

چکما قبیلے کے لوگ چاٹگام میں داخل ہونے کے بعد مقامی لوگوں کے ساتھ بلا روک ٹوک شادی بیاہ کرنے لگے شاہان مغلیہ کے دور میں جب صوبۂ بنگال مغلیہ مملکت میں شامل ہوا تو فاتح سپاہیوں نے لاتعداد قبائلی عورتوں سے شادیاں کیں تو ان قبائل میں بکثرت مغل خون کی علامتیں ملنے لگیں

سترہویں صدی کے ایک حکمران شیر دولت کے زمانے میں تمام چکما سرداروں کے خالص اسلامی نام ہوا کرتے تھے

اور ہر نام کے آخر میں خان کا لفظ ہوتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے اوائل میں رانی کلمندی نے ہندو دھرم اختیار کر لیا۔ جس کی وجہ سے قبائل میں تبدیلیاں ہوئیں۔

رانی کلمندی نے برہمنوں کی مدد سے ان قبائلیوں کی اصلیت اور ابتدا کے متعلق ایک بالکل من گھڑت اور راد ہامی کہانی وضع کی وہ کہانی یہ ہے :-

ازمنہ قدیم میں
انگا دیش کی راجدھانی چمپا نگر میں ایک طاقتور
راجہ تھا۔ یہ راجہ سورج کی نسل سے تھا۔ اس راجہ
کے دو بیٹے تھے۔ بجے گری اور سماگری

دوسرے دیشوں کو فتح کرنے کی آرزو میں بجے گری بہت بڑی فوج لے کر پورب کی طرف بڑھا۔ دریائے مگھنا پار کرنے کے بعد اراکان کے حکمران کو شکست دی۔ اور اس کے راج پر قابض ہوگیا۔ مگر فاتح بجے گری نے وہیں بسنے کا فیصلہ کیا اس لئے اراکان کے راجہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور دریائے ناف کے نزدیک جنوبی چاٹگام میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے ہمراہیوں نے اراکانیوں کے ساتھ شادی بیاہ کئے اور رفتہ رفتہ بدھ مذہب اختیار کرتے گئے۔ بعد کو یہ لوگ ماتا مہری کی وادی میں منتقل ہوگئے۔ جہاں آج تک ان کے قدیم بود و باش کے آثار پائے جاتے ہیں۔

اس خاندان کا سب سے طاقتور حکمران شیر دولت تھا۔ اس کے اندر غیر معمولی اور مافوق الفطرت کرشمات تھے۔ وہ اپنی انتڑیاں پیٹ سے نکال کر دھویا کرتا تھا۔ اور گناہوں سے پاک کر کے پھر اپنی جگہ رکھ دیتا تھا۔ اس کام کو شیر دولت نہایت رازداری اور پوشیدہ طور پر انجام دیا کرتا تھا۔

ایک روز شیر دولت نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے اسے انتڑیاں دھوتے دیکھ لیا ہے شیر دولت بہت برہم ہوا۔ اور طیش میں آکر اپنے خاندان کے کل افراد کو قتل کر دیا ہے لیکن جب اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ اور اس کی ماتمگری ناقابل برداشت ہوگئی تو اس کے ساتھیوں نے اسے بھی قتل کر دیا۔ شیر دولت کے قتل کے بعد لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا ہوئی کہ راجہ کے قتل سے نہ جانے کیا کیا واقعات پیش آئیں۔ لہٰذا پورا قبیلہ مزید شمال کی جانب بڑھ گیا۔ اور رانگونیا کے علاقہ میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سے اتر پورب کی طرف پھیلتے رہے۔ اور آخرکار اس علاقے تک پھیل گئے جہاں ان کی موجودہ سکونت ہے۔"

یہ کہانی دلچسپ تو ہے مگر ایک مورخ کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس کہانی میں تدریجی طور پر صرف اتنی صداقت ہے کہ شیر دولت ایک طاقتور حکمران تھا۔ اور وہ خود اپنے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کہانی بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے بدھ مذہب اختیار کر لیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ چکما قبیلہ کا دھرم بدھمت امینمتھ اور ہندو دھرم کا ملا جلا مرکب ہے۔ بہرحال ان کے عقائد کچھ بھی ہوں مگر چکما قبیلے کے افراد ایماندار سچے اور قانون کے پابند ہوتے ہیں۔

چکما والوں کا اصلی پیشہ زراعت ہے۔ ان کا کھیتی کرنے کا طریقہ نرالا اور بہت قدیم ہے۔ جسے "جھم" کہتے ہیں۔ اس قسم کی کاشتکاری پہاڑی کے بالائی دامن میں ہوتی ہے۔ جنوری یا فروری کے مہینوں میں پہاڑی کے دامن سے جنگلات کو کاٹ کر دو ماہ سوکھنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اپریل کے مہینے میں ان سوکھے ہوئے جنگلات میں آگ لگا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے درخت بھی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو جلی ہوئی لکڑیاں، پتیاں اور زرخیز مٹی راکھ وغیرہ خود بخود پہاڑی ڈھلوان سے بہہ کر نیچے چلے جاتے ہیں اور باقی ماندہ چیزیں قدرتی کھاد کے کام آتی ہیں۔ پھر ضرورت کے مطابق صفائی کے بعد غلہ بونے کے لئے زمین ہموار کر لیتے ہیں۔ ہل یا کدال چلانے کے لائق بنانے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ جونہی بارش ہوتی ہے

دہ فوراً مختلف قسم کے بیج بونا شروع کردیتے ہیں۔ مثلاً دھان، مکئی، روئی، کدو اور دوسری مقامی سبز پھل کے بیج وغیرہ۔

پکیسا (جھوم) کاشتکار اپنے ہاتھوں میں صرف داب (داؤ) لیکر جاتے ہیں۔ جس سے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ کھودتے ہیں اور متفرق قسم کے بیج ملاکر مٹھی بھر بیج ہر سوراخ میں ڈال دیتے ہیں۔ مکئی جون میں تیار ہوجاتی ہے۔ دھان اور بعض سبزیوں کا موسم ستمبر اور اکتوبر کے مہینے ہیں۔ روئی نومبر اور دسمبر میں ہوتی ہے۔ جنگلی جانوروں سے حفاظت کرنے کے سوا ان کاشتکاروں کو اور کسی قسم کی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ ان کی اوسط پیداوار کا تخمینہ ایک من تین سے تیس من دھان ہے۔ یہ بھی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کے سینے پر کھدے ہوئے اسی ہر ایک سوراخ سے طرح طرح کے غلے اور رنگ رنگ کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن سے اس پہاڑی کے دامن اور آغوش میں دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور خاموشی کے ساتھ بسنے والے لوگوں کو غذا ملتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان آبادیوں کی زندگی تہذیب و تمدن کی گرم بازاریوں پر کڑی تنقید ہے۔

مجموعی طور پر چکما قبیلے کے لوگ بہت نفاست اور صفائی پسند ہوتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں ہوتی تو ہیں وہی بانس سے بنی ہوئی اسی قدیم رنگ کی، مگر انھیں بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔

عام طور پر ان کی پوشاک بہت ہی مختصر کپڑا ہوتا ہے مگر بہت صاف۔ گھروں میں یہ عورتیں صرف ایک [illegible] پہنتی ہیں اس سے ان کے جسم کا بالائی حصہ عریاں رہتا ہے۔ کبھی کبھی کمر پر کا بنا ہوا ایک کپڑا چھاتی پر لپیٹ لیتی ہیں۔ لیکن جب بازار یا کسی کنبہ والے کے گھر یا دوسرے گاؤں جاتی ہیں تو مختلف قسم کے کپڑے پہنتی ہیں۔ اور [illegible] [illegible] ہیں۔

زیورات پہننے کا شوق چکما عورتوں میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر متعدد قسم کے گہنوں سے جسم کے مختلف حصوں کو آراستہ کرتی ہیں۔ یہ گہنے چاندی [illegible] پیتل اور کانسوں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جہاں یہ گہنے میسر نہیں ہوتے وہاں یہ عورتیں اپنے بناؤ سنگھار میں جنگلی گل بوٹے استعمال کرتی ہیں۔

تمام منگولین نسل والوں کی طرح ان کی ناک بھی چوڑی چپٹی اور آنکھیں تیکھی چھوٹی ہوتی ہیں۔ مگر ان کے قوا اور جسم مضبوط ہوتے ہیں۔ اور ان کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔

چکما کے بعد دوسرا سب سے بڑا قبیلہ ماگھ ہے۔ ماگھ والوں کا مذہب بودھ ہے۔ یہ چاٹگام کے جنوبی علاقوں میں کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی کچھ آبادی چاٹگام ہل ٹریکٹ کے بندربان سب ڈویژن میں بھی ہے۔ ماگھ قبیلے والوں کی بستیاں [illegible] باقر گنج کے جنوبی نواح میں آباد ہیں۔ یہ لوگ اندرون بندربان [illegible] اتر پچھم [illegible] حد تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ماگھ قبیلے کے لوگ بھی چکما والوں کی طرح دریا کے کنارے [illegible] کے آس پاس اپنے گاؤں بساتے ہیں اور خاص خاص موسم میں [illegible] اور [illegible] وغیرہ کے لئے پہاڑیوں پر جاتے ہیں۔

گھروں کے اندر ماگھ والوں کی پوشاک اور پہناوے چکما [illegible] [illegible] ہوتی ہے۔ مگر بازار وغیرہ جانے وقت یا [illegible] [illegible] رنگین لنگی اور آستین والی برمی صدری پہنتے ہیں۔ ماگھ قبیلے کی عورتیں اور مرد دونوں بے حد سگار پیتے [illegible] [illegible] تمباکو کا سا ہوا ہوتا ہے۔ اسی تمباکو کو چاندی [illegible] [illegible] بھی کثرت سے پیتے ہیں۔

ماگھ قبیلہ تین واضح گروہ میں بٹا ہوا ہے (۱) جھمیا ماگھ [illegible] رواتگ [illegible] [illegible] ماگھ (۳) بروا ماگھ۔

جھمیا ماگھ جھوم کھیتی کرتے ہیں۔ رواتگ یا کھینگ ماگھ [illegible] [illegible] [illegible] کے آخیر [illegible] [illegible] [illegible] فیصلہ کرلیا تھا تو بھاگ کر چاٹگام چلے آئے تھے۔ ان سب میں بھی زیادہ برمی ہیں اور یہ برمی زبان [illegible] [illegible] بروا ماگھ والے بنگالی باپ اور برمی ماں یا برمی باپ اور بنگالی ماں کے اختلاط سے ہیں۔ یہ لوگ ہموار زمین پر [illegible] ہیں۔ اور مقامی لوگوں کی طرح کھیتی باڑی سے روزی [illegible] ہیں۔

ماگھ والے بالکل برمی پوشاک پہنتے ہیں۔ ان کی عورتیں نہایت رنگین اور [illegible] کپڑے پہنتی ہیں۔ یہ لوگ قدرتی طور پر خوبصورت ہیں اور ان میں اپنا ایک خاص معیار حسن بھی ہے۔

ماگھ والوں کے بعد جو سب سے بڑا قبیلہ سامنے آتا ہے وہ ٹیپرا یا تریپورہ قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کی بہت ساری باتیں

(بقیہ صفحہ ۱۵۱ پر)

عابد دانا پوری

جوٹ کی کہانی

جوٹ جسے دنیا والے سنہری ریشہ کہتے ہیں وہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی اور اصل دولت ہے جوٹ ہی وہ شے ہے جس سے پاکستان کو سب سے زیادہ بیرونی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد پاکستان کو جوٹ سے متعلق کتنے قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا وہ کچھ کم دلچسپ کہانی نہیں ہے۔

تقسیم سے پہلے متحدہ بنگال میں ۲۱۹۰۰۰ ایکڑ زمین جوٹ کی کاشت کے لئے مخصوص تھی جس میں سے ۴۷۲۵۰۰۰ ایکڑ پاکستان کے حصہ میں آئی مگر دقت یہ ہوئی کہ جوٹ کے ۱۰۸۴۰۰ کارخانوں میں سے ایک بھی پاکستان کے حصہ میں نہ آیا جس کی وجہ سے لازمی طور پر یہ تمام جوٹ پاکستان میں برآمد کے لئے بیچ جایا کرتے تھے۔ اور برآمد کرنے کی سہولت تو صفر تھی۔ کیونکہ جوٹ کا مرکز نہ ہونے کے باوجود بھی جوٹ کا کاروبار کلکتہ ہی سے ہوا کرتا تھا۔ اس لئے مزید مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان تمام دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بیرونی ممالک سے خریداروں سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کے بعد زیادہ تر چاٹگام سے برآمد کرنے کے انتظامات کئے گئے۔

پریشان کن دشواریاں اور بدانتظامیاں جو جوٹ کے کاروبار کے اندر چلی آرہی تھیں۔ اس لئے وقتی ضرورت کے مطابق جوٹ کی تجارت کے سلسلہ میں نئے قوانین نافذ کئے گئے۔ اور ہر طرح کی بدعنوانیوں کو غیر قانونی اور قابل سزا قرار دیا گیا۔ اور تاجروں کے ساتھ جوٹ کی تجارت کا بندوبست کیا گیا۔ جوٹ کی پیداوار اور مقدار معلوم کرنے کے انتظامات کئے گئے۔ جوٹ کا ایک شعبہ باختیار حکام کی نگرانی میں قائم ہوا تاکہ جوٹ کی قیمت وغیرہ میں بدعنوانی اور دھاندلی نہ کی جا سکے لیکا اور کیا جوٹ کی بیلنگ مشین کے کارخانہ داروں۔ گوداموں اور کاروباریوں سے جوٹ کے قانون کے تحت رجسٹری کرانا لازمی قرار دیا گیا۔ اور جوٹ کے کاروبار کے ذریعہ زرمبادلہ کی دھاندلی کو تقریباً ختم کر دیا گیا۔

بیلنگ پریس

یہ تو اوپر بتایا جا چکا ہے کہ یہاں گنتی کے چند بیلنگ پریس تھے جن سے کام شروع کیا گیا۔ کاروباریوں کو مزید بیلنگ مشین لگانے کی ترغیب دی گئی۔ کچھ بیلنگ پریس سرکاری سرمایہ سے بھی درآمد ہوئے۔ آج پاکستان میں پکا بیلنگ مشین کی تعداد ۸۰ سے کم نہیں ہے۔

کثیر پیداوار کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے جوٹ کا بازار آزادی سے پہلے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں جن ممالک میں سکوں کی قیمت گر گئی تھی ان میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ اس لئے ہندوستان نے پاکستانی جوٹ کے بیوپار میں زیادہ دلچسپی نہیں لی اس وجہ سے یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ اور کچھ دنوں کے لئے جوٹ کا بازار ماند پڑ گیا مگر مرکزی حکومت کی فوری توجہ سے جوٹ بورڈ قائم ہوا تاکہ صورت حال سے نپٹنے میں آسانی ہو۔ جوٹ بورڈ نے بھاری مقدار میں جوٹ کی خریداری کی۔ تباہ کن حالات کا رخ بدلا اور مصیبت ایک گونہ ٹل گئی۔

جوٹ کا بازار

پہلے ہوتا یہ تھا کہ جب جوٹ کھیتوں میں تیار ہوتا تو جوٹ کی قیمت بہت گرا دی جاتی تھی اور کاشتکاروں کو بہت کم پیسے میں اپنی پیداوار بیچنا پڑتی تھی۔ کاشتکاروں کے ہاتھ سے نکلتے ہی قیمت ضرورت سے زیادہ بڑھا دی جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ایک طرف تو کاشتکاروں کو بہت کم پیسے ملتے اور دوسری طرف بیرونی ممالک کے خریدار بہت بڑھی ہوئی قیمت سے گھبرا کر جوٹ کا بدل تلاش کرتے تھے۔ ملک کی سلامتی کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں کہ اس کا خیال رکھا جائے کہ کاشتکاروں کو بھی پوری قیمت ملے اور غیر ممالک کے بازار بھی ہاتھ سے نہ نکلنے پائیں۔

اچھے قسم کے جوٹ کی قیمت بھی اچھی ملتی ہے۔ اس لئے گھٹیا قسم کے "منا" جوٹ کی کاشت پر پابندی لگا دی گئی۔ اور بڑے رقبہ میں عمدہ جوٹ پیدا کرنے کے لئے لائسنس جاری کئے گئے۔ جوٹ کے محکمہ کے تحت کوآپریٹو ادارے کھولے گئے جہاں کاشتکار اپنا جوٹ فروخت کرکے اچھا نفع حاصل کریں نیز سرحدی حاشیہ پر اور سرحد کے آس پاس پیدا ہونے والے جوٹ سرحد پار اسمگل ہونے سے بھی محفوظ رہیں۔

پہلے جوٹ کے تجارتی حلقوں نے یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ جوٹ کے ابتدائی موسم میں ایسی افواہیں اور بے سروپا بیان مشتہر کرتے تھے کہ اس سال بہت بڑے رقبہ میں ضرورت سے زیادہ جوٹ پیدا ہوا ہے اور غریب کاشتکاروں کے دلوں میں کچھ ایسی الجھنیں پیدا کر دیتے تھے کہ وہ گھبرا کر جلدی جلدی اپنی پیداوار فروخت کر دیا کرتے تھے مگر اب اس قسم کی افواہیں پھیلانے کی خبر جونہی ملتی ہے تو حکومت اخباروں کے ذریعہ محکمہ پبلسٹی کے ذریعہ اور محکمہ جوٹ کے عملوں کے ذریعہ کاشتکاروں کو صحیح حالات سے باخبر کر دیتی ہے خصوصاً ہر علاقہ میں کوآپریٹو سوسائٹی قائم ہو جانے کی وجہ سے جوٹ کی قیمت اور کاشتکاروں کے مفاد پر خوشگوار ردعمل ہوا ہے۔

پیکنگ کے میدان میں جوٹ کے بیوپار کو نقصان رہا کیونکہ بعض بیرونی ممالک میں پیکنگ کے مصرف اور کام کے لئے جوٹ کا بدل تلاش اور تیار کیا گیا ہے مثلاً پیکنگ کے کاغذ، کینواس اور سیسل وغیرہ مگر تجربات بتاتے ہیں کہ پیکنگ کے کام کے لئے ان تمام اشیا سے جوٹ بہتر ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ سستے داموں میں جوٹ غیر ممالک کو برآمد کیا جائے۔ لہذا جوٹ کے تاجروں کے لالچ اور زائد نفع خوری پر کنٹرول رکھنا ضروری ہوا۔

ترکی، مصر، عراق، انڈونیشیا اور دیگر ممالک میں جوٹ ملیں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ جب وہ ملیں کام شروع کردیں گی تو پاکستان کا جوٹ دوبارہ اپنی پہلی پوزیشن حاصل کرے گا۔ چاٹگام کی بندرگاہ اور چالنا کی لنگرگاہ بن جانے کی وجہ سے مسلسل بھاری مقدار میں دیگر ممالک کو جوٹ برآمد کیا جا رہا ہے۔

تقسیم کے بعد سے جوٹ کی ضروریات میں خودکفیل بننے کے لئے ہندوستان مسلسل جدوجہد کر رہا ہے اور اپنے جوٹ کی پیداوار میں سو فیصدی اضافہ کرچکا ہے۔ پاکستان میں جوٹ کی پیداوار ستر لاکھ سے گھٹ کر ۵۵ لاکھ بیل ہوگئی تھی۔ جوٹ کی پیداوار میں یہ کمی ایک خاص اقتصادی پالیسی کے تحت تھی۔ لیکن اپنے ملوں میں زائد خام جوٹ کی تیار شدہ اشیا دیگر ممالک کو برآمد کرکے پاکستان کھوئی پوزیشن دوبارہ حاصل کرسکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بہتر اور عمدہ قسم کا جوٹ پیدا کرکے زیادہ سے زیادہ بیرونی زرمبادلہ کمایا جائے۔

چاٹگام کے پہاڑی قبائل (سلسلہ ص ۱۴۸)

بدھوں سے تعلق رکھتا ہے۔ تریپورہ قبیلے کے تقریباً پچاس ہزار نفوس صرف چاٹگام ہل ٹریکٹ میں رہتے ہیں۔

مذکورہ تین قبائل بیشمار چھوٹے چھوٹے ضمنی قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں کہ چاٹگام کی ان دور افتادہ پہاڑیوں پر ان عجوبہ قبائل کا مذاق فطرت کا ایک بڑا ہی دلکش منظر ہے اور قدرت کی حسن آفرینیوں کا ایک بڑا ہی دلکش نمونہ۔ پہاڑی بلندیوں پر جہاں کہیں تھوڑی سی ہموار جگہ نظر آئی تو فوراً یہ قبائلی اس پر اگے ہوئے جنگل کو صاف کرتے ہیں، پھر پتھر پر جمی ہوئی مٹی کو اپنے ہاتھوں سے برابر کرلینے کے بعد یہ سادہ غریب لوگ اس پر غلہ وغیرہ اگاتے ہیں۔ ان قبائل کی اکثریت اتنی غریب ہے کہ ہل بیل مہیا کرنا ان کے لئے "کارے دارد" والی بات ہے۔ بہرحال جھوم کاشتکاری خاصا مشکل کام ہے لیکن موسم ان کا ساتھ دیتا ہے تو ان کی محنت اکارت نہیں جاتی۔ اور معاوضہ بہت اچھا مل جاتا ہے۔

عابد دانا پوری

شاہ جلال یمنی (سلہٹ)

سلہٹ مشرقی پاکستان کی شمال مشرق سرحد پر واقع ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سبز و شاداب دیہات آباد ہیں۔ دھان کے ہرے بھرے کھیتوں اور نارنگیوں کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان عمدہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ شمال مغرب کے سوا سلہٹ میں ہر طرف ریل کی پٹریاں ہیں یا دریائی راستے اور نیچی نیچی پہاڑیاں ہیں۔ اس کے دکھن۔ پورب اور اتر جانب ہندوستانی علاقے ہیں۔ کھاسی اور جینتیا کی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ داہنی جانب کچھار اور نیچے تریپورہ راج ہے۔ بائیں جانب نیچے کو دلدل اور جھیل ہیں جنھیں مقامی لوگ ہاور کہتے ہیں۔ یہی ہاور برسات میں سمندر کی سی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ خشک موسم کے زمانہ میں یہ ہاور طرح طرح کی مچھلیوں سے بھر جاتے ہیں۔

برسات میں آسمان بدلیوں سے ڈھکا رہتا ہے اور صدہا ندی نالے پہاڑی چٹانوں کے درمیان سے پیچ و خم کھاتے ہوئے تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف گرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سارا علاقہ ایک وسیع سمندر نظر آتا ہے اور گاؤں سب جزیرے معلوم ہوتے ہیں۔ نارنگیوں کے پھلدار درختوں کی نظار سے بھی عجیب منظر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کے چائے کے باغات کی دلفریبی بھی قدرت کا کرشمہ ہے۔

چائے کے باغات کا ایک حسین سلسلہ پہاڑیوں کی بلندی سے تدریجاً نیچے کی طرف آتا ہے۔ عورتیں زنگار رنگ کے لباس میں ان باغات کے اندر اپنی صاف ستھری انگلیوں سے بڑی ہشیاری اور مشاقی کے ساتھ نرم پتیاں توڑ کر اپنی ٹوکریوں میں جمع کرتی پھرتی ہیں۔

اس حسین دیار میں حضرت شاہ جلال چودھویں صدی کے اوائل میں اسلام کی تبلیغ کے لئے تشریف لائے۔ حضرت شاہ جلال مجرد یمنی قبیلہ قریش سے تھے۔ آپ کے والد کا نام محمد یمنی تھا۔ آپ کے لوحِ مزار کی کندہ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کرنیہ کے باشندے تھے۔ بعض مورخوں کے خیال کے مطابق کرنیہ یمن کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ حضرت جلال ابھی بہت کمسن ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے آپ کی پرورش آپ کے ماموں سید احمد کبیر بن جلال بخاری نے کی۔

دینیات و روحانیات کی تعلیم مکہ معظمہ میں اپنے ماموں ہی سے پائی۔ تعلیم کے بعد آپ کے ماموں نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ہندوستان جانے کی ہدایت کی۔ اور جاتے وقت اپنے حجرے کی ایک مٹھی خاک شاہ جلال کو دیتے ہوئے یہ تاکید فرمائی کہ جس مقام پر انھیں اس رنگ اور اس بو باس کی مٹی ملے وہیں اقامت اختیار کریں۔

حضرت شاہ جلال دہلی پہنچے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیائے سے ملے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے آپ کو نیلے کبوتروں کے دو جوڑے عطا کئے۔ شاہ جلال ان کبوتروں کو اپنے ساتھ سلہٹ لے آئے۔ اور آج ان کبوتروں کی تعداد سلہٹ میں لاکھوں ہے جنھیں یہاں لوگ جلالی کبوتر کہتے ہیں اور ایک بڑے ولی کی یادگار ہونے کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک نہیں کرتا۔ اس کے بعد شاہ جلال تردینی کے قریب ساتگاؤں کے مقام پر تشریف لائے اور برہان الدین سے ملے۔ برہان الدین سلہٹ کے باشندہ تھے محلہ تلتکور میں رہا کرتے تھے۔ برہان الدین کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو انہوں نے ایک گائے کی قربانی دی۔ اس قربانی کی خبر جب راجہ گور گوبند کو ہوئی تو اس نے نہ صرف نوزائیدہ بچے کو ہلاک کروا دیا بلکہ اس کے باپ کا داہنا ہاتھ بھی قلم کروا دیا۔ برہان الدین نے حاکم بنگال سے فریاد کی۔ حاکم نے اپنے بھتیجے سکندر غازی کی کمان میں ایک لشکر بھیجا۔ لیکن گور گوبند کے خلاف سکندر غازی کی دو مہمیں ناکام رہیں۔ برہان الدین کی التجا پر حضرت شاہ جلال نے سکندر خاں غازی کی تیسری مہم میں اپنے ۳۶۰ ہمراہیوں کے ساتھ شرکت فرمائی۔

ایک قدیم کتبہ سے یہ بات واضح اور صاف طور پر معلوم ہو گئی ہے کہ شاہ جلال کے سلہٹ آنے کی صحیح تاریخ ۱۳۰۳ء ہے۔

راجہ گور گوبند کے ساتھ حضرت شاہ جلال کا پہلا مقابلہ پرگنہ چوکی کے مقام پر ہوا۔ شاہ جلال نے بڑی آسانی سے اُسے شکست دی۔ اس کے بعد

بہادر پور کے قریب اپنی جانماز پر بیٹھکر بارک ندی کو عبور کیا۔ (عقیدتمندوں کی روایت ہے)۔

دریا عبور کرنے کے قبل ایک رات شاہ جلال نے بہادر پور کے قریب فتحپور میں قیام کیا۔ "مقام" کے نام سے آج بھی وہاں ایک یادگار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

کہتے ہیں کہ گور گوبند نے اپنے قاصد کے ذریعہ ایک آہنی کمان شاہ جلال کے پاس یہ کہکر بھیجی کہ اگر کوئی شخص اسے سیدھا کردے تو وہ اپنا پورا علاقہ بغیر جنگ کے اس کے حوالے کردیگا۔

حضرت شاہ جلال کی ہدایت کے مطابق سپہ سالار نصیر الدین۔ (جنہوں نے کبھی نماز فجر قضا نہیں کی تھی) نے اس کام کو انجام دیا۔ گور گوبند پرچاگڑھ فرار ہوگیا۔ غالباً گور گوبند تریپورہ کے راجہ کا باجگزار تھا۔

جب حضرت شاہ جلال اس پہاڑی پر پہنچے جہاں آپ کا مزار ہے تو آپنے وہاں کی مٹی کا رنگ اور بو بالکل اس خاک سے ملتا جلتا پایا جو آپکے ماموں نے آپ کو دی تھی تو آپ نے وہاں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

آپکے ہمسفر معتقدوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں مگر مشہور ہے کہ آپکے ساتھ ۳۶۰ افراد تھے جن میں یمن کے شاہزادہ علی۔ سید عمر سمرقندی۔ سید محمد غزنوی۔ ذکریا عربی۔ سید علاؤ الدین بغدادی۔ شاہ کمال یمنی وغیرہ ممتاز شخصیتیں تھیں۔

شاہ جلال جب سلہٹ پہنچے تو اس وقت آپ کی عمر ۳۲ سال کی تھی آپنے ۱۳۴۰ء عیسوی میں وفات پائی وفات کے وقت آپ کی عمر ستر سال تھی۔ آپ کی تاریخ وفات شاہ جلال مجرد قطب الدین سے نکلتی ہے۔

سلہٹ کی فتح کے بعد حضرت شاہ جلال نے اپنے معتقدین کو تبلیغ اسلام کے لئے اندرونی اضلاع میں بھیجا اور انھیں تاکید فرمائی کہ وہ جس ضلع میں تبلیغ کا کام انجام دیں۔ وہیں سکونت بھی اختیار کریں۔ ان میں سے زیادہ لوگوں نے جینتیا سب ڈویژن میں سکونت اختیار کی۔

۔اس سب ڈویژن میں اس وقت ایک ہندو حکمراں تھا چونکہ اس ضلع کا جنوبی علاقہ تریپورہ کے راجہ کے ماتحت تھا اس لئے بہت کم معتقدین نے اس علاقہ میں رہنا پسند کیا۔

۱۳۰۳ء کے خشک موسم میں حضرت شاہ جلال ۳۶۰ ہمراہیوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار مشرقی بنگال پہنچے۔ سرما دیلی کی حسین وادیوں تک آنے میں انھیں گھنے جنگلوں سے گزرنا پڑا۔ یہ لوگ دو دو سواروں کی قطار میں تھے۔ گھوڑوں کی زین بہت سادہ تھی اور خدا کے یہ مخلص بندے خود ڈھیلے ڈھالے موٹے کپڑے کی لمبی لمبی قمیصیں یا عبا پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر عمامہ۔ چہرے پر نمایاں ریش تھی جس سے ان لوگوں کی خدا ترسی کے ساتھ ساتھ سپاہانہ جذبے نمایاں تھے۔ ہر گھوڑے کی پیٹھ پر ایک تھیلی بندھی ہے تو کسی کی کلائی پر تسبیح لپٹی ہے۔ مختصر یہ کہ اس سادگی کے باوجود ان کی ہر ادا سے ان کا جوش ایمان اور جذبۂ دین جھلک رہا تھا راہ میں جہاں سورج غروب ہوتا یہ اللہ کے بندے گھوڑوں سے اتر پڑتے ان کی اذانوں کی آواز سے جنگل اور بیابان گونج اٹھتے۔

جب پوری طرح سلہٹ میں اسلام داخل ہوچکا شاہ جلال نے بڑی تندی اور سرگرمی کے ساتھ اصلاحات اور اخلاقی درستی کی طرف توجہ دی۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو سچی آزادی اور مسرت نصیب ہوئی۔ حضرت جلال کے معتقدین سلہٹ سے باہر ٹیپرہ، میمن سنگھ۔ نواکھالی۔ اور چاٹگام تک پھیل گئے۔

حضرت شاہ جلال نے ملک کی حکومت سکندر غازی کے ہاتھوں میں دیدی۔ اور خود گوشہ نشین ہوکر یاد الہٰی میں مصروف ہوگئے۔ شاہ جلال کی روحانی قوت۔ خدا ترسی اور عبادت گزاریوں کا شہرہ دور دراز علاقوں تک پہنچا۔ کسب فیض کے لئے ہر طرف سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی اور ہجوم ہونے لگا۔ ۳۷ سال تک حضرت شاہ جلال نے حق و صداقت کی تبلیغ کی۔

مورخین کا بیان ہے کہ دنیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ ۱۳۴۶ء کے موسم سرما میں بنگال آیا تھا اور شاہ جلال سے ملا تھا۔

ابن بطوطہ کا کہنا ہے کہ میں نے کمرو تک سیاحت کی یہ کمرو پہاڑی سلسلہ تبت اور چین تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ جادوگری کے لئے مشہور ہے۔ شاہ جلال سے ملنے کے بعد میں (ابن بطوطہ) ہانگ پہنچا۔ یہ نہایت خوبصورت شہر ہے جس کے بیچ سے وہ نہر بہتی ہے جو کمرو پہاڑ سے نکلتی ہے۔ اس نہر کو "ازرک" کہتے ہیں۔ ہانگ سیب ساگر ضلع میں واقع ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ شاہ جلال نے چالیس سال تک مسلسل روزے رکھے اور ہر دسویں دن روزے

چھوڑتے تھے۔ ان کے پاس ایک گائے تھی اسی کے دودھ سے افطار فرماتے تھے۔ رات رات بھر اللہ کی یاد میں کھڑے رہا کرتے تھے۔ بلند قامت آدمی تھے۔ داڑھی مختصر تھی۔ گالوں پر بال بہت کم تھے۔ سلہٹ کے پہاڑی علاقوں میں آپ ہی کی تبلیغ سے اسلام پھیلا ہے اور مستقل طور پر شاہ جلال نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

پندرہویں صدی کے مورخین کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے برہمپتر کو ازرق بتایا ہے۔ جادوگری کا جو ذکر کیا ہے اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ بطوطہ نے کامروپ کی پہاڑیوں کی سیاحت کی تھی۔ کامروپ کو آج بھی بہت سے لوگ کمرد کہتے ہیں۔

حضرت سید شاہ جلال مجرد یمنی نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ ۱۳۴۰ء میں جب وفات پائی تو سلہٹ کے درگاہ محلہ میں مدفون ہوئے جہاں آپ کا مزار ہے۔ مزار شہر سلہٹ کے شمالی علاقہ میں ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ ہر فرقہ اور عقیدہ کے لوگ آپ کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ مزار کے ہر طرف اینٹ کی دیوار کا احاطہ ہے۔ مزار کے چاروں کونے پر اونچے اونچے پائے اور ستون ہیں جن پر گنبد نما چھتر تعمیر ہے۔ احاطہ کے اندر پچھم جانب ایک مسجد ہے جس کی تعمیر مسٹر ولیس نے دوبارہ کروائی تھی۔ مسٹر ولیس ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۳ء تک سلہٹ کے کلکٹر تھے۔ اس درگاہ کی سب سے بڑی عمارت کو گنبد کہتے ہیں۔ ۱۶۷۷ء میں فرہاد خان نے شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں بنوائی تھی۔

گنبد کے جنوب میں دوسری سب سے بڑی مسجد سلہٹ کے فوجدار بہرام خاں نے ۱۷۴۴ء میں تعمیر کروائی تھی۔ ابتداء سے یہ طریقہ رائج رہا ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان حاکم سلہٹ آیا تو سب سے پہلے اس نے حضرت شاہ جلال کے مزار کی زیارت ضرور کی۔

مسٹر لِنڈسے ۱۷۷۹ء میں سلہٹ کا کلکٹر تھا وہ لکھتا ہے کہ مروجہ روایت کے مطابق میں نے بھی اُس مقدس ہستی (شاہ جلال) کے مزار کی زیارت کی۔ درگاہ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر اپنا جوتا اتار دیا اور مزار پر ۵ مُہر طلائی بطور نذرانہ پیش کرنے کے بعد جب اپنی قیامگاہ پر آیا تو رعایا نے مجھے اطاعت پیش کی۔

دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کے پوتے مرزا فیروز شاہ نے ۱۸۴۹ء میں حضرت شاہ کے مزار کی زیارت کی۔

حضرت شاہ یمنی کی زندگی کے حالات سب سے پہلے اپنی تصنیف "روضۃ الصالحین" میں مسمی حمید الدین نے ۱۱۲۴ ہجری میں لکھے۔ مصنف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود حضرت جلال کے ہمراہیوں میں سے تھے۔

بقیہ: مشرقی پاکستان کے چار گیت (سلسلہ صفحہ ۱۴۹)

پتے لرز رہے ہیں
کٹھل کی پتیاں بھی
رُو رُو کے گر رہی ہیں
مرغابیاں تڑپ کر
دیتی ہیں اپنی جانیں
بے آب خشکیوں پر ——— پانی کی جستجو میں
روتی ہیں قمریاں بھی ——— سب گھونسلوں میں اپنے
گرتے ہیں پھول نیچے
مرجھا کے شاخ گل سے
اللہ بدلی دے بارش دے اور رحم کر۔

واضح رہے کہ یہ سارے کے سارے گیت دیہات کی ٹھیٹ بنگالی زبان میں ہوتے ہیں۔

کوٹھی باڑی ـ (سلسلہ صفحہ ۱۵۴)

اور تحفظ کے لئے پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ بعد کو ۱۹۵۱ء میں ایسٹ بنگال ٹیننسی ایکٹ کے تحت پوری جائداد زمینداروں کے ایجنٹوں کے حوالے کر دی گئی۔ اور ایجنٹوں سے تاکید کے ساتھ التجا کی گئی کہ عظیم شاعر کی شایانِ شان ان کی یادگار قیامگاہ (کوٹھی باڑی) اور اس کے گرد و نواح کے ماحول اور فضا کی حفاظت اور نگرانی کی جائے تاکہ اس عمارت کی عظمت و خوشنمائی میں کمی نہ آئے اور سیاحوں کے لئے بھی اس میں کشش باقی رہے۔ مگر اس درخواست پر عمل کرنے میں ایجنٹ کلی طور پر ناکام رہے۔ مجبوراً خود حکومت کو اس یادگار مکان کی دیکھ بھال اور تحفظ کی طرف توجہ دینی پڑی۔

عابد دانا پوری

کوٹھی باڑی

مشرقی پاکستان میں ٹیگور کا مکان

کوٹھی باڑی بنگالی زبان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے اُس مکان کا نام ہے جو مشرقی پاکستان میں ضلع کشتیہ کے شلائی ڈاہ نامی ایک گاؤں میں واقع ہے جہاں ٹیگور کی زمینداری بھی تھی۔ اس کوٹھی باڑی کو ۱۹۵۷ء میں حاصل کرنے کے بعد حکومت نے محکمہ آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دیا ہے تاکہ اس نامور شاعر کی شایانِ شان اس یادگار مکان کی مرمت اور حفاظت کی جائے۔

حکام نے تقریباً پچاس فیصدی وہ سامان بھی حاصل کر لیا ہے جو اس مکان میں تھے اور جسے بھگیا کل کے زمینداروں کے مقامی ایجنٹ، ٹھیکیداروں نے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا تھا۔

پہلے تو حکومت نے کوٹھی باڑی اور اس سے ملحق اور متعلق زمینوں کو عطیہ کے طور پر حاصل کرنا چاہا تاکہ ایک عظیم شاعر کی رہائش گاہ کو یادگار کے طور پر رکھا جائے۔ لیکن زمینداروں نے حکومت کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔

زمینداروں کے ایجنٹ اور ٹھیکیداروں نے بہت سارے عمدہ درختوں کو بیچ ڈالا تھا۔ یہ اشجار ایسے تھے جن سے عمارت کی عظمت و شوکت دوبالا ہوتی تھی۔ تالاب اور آم کے باغات اچھی حالت میں ہیں۔

ٹیگور کی یہ کوٹھی باڑی دو منزلہ عمارت دریا سے بمسافت صرف دو فرلانگ پر ہے۔ قصبہ شیلائی ڈاہ کشتیا شہر سے تقریباً ۲ میل اور کماکھالی ریلوے اسٹیشن سے بھی کم و بیش یہی فاصلہ ہوگا۔

یہ مکان آج سے اسّی یا نوے سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔ یہ عمارت یوں بھی دیکھنے میں خوشنما ہے۔ اس کے ہر چہار طرف سکون بخش ماحول۔ آم کے باغات۔ سلیقے سے لگائے ہوئے اشجار اور قاعدے سے بنائے ہوئے تالاب وغیرہ مل کر کوٹھی باڑی کی فضا کو اس قدر پُر بہار بنا دیتے ہیں۔ جہاں ایک شاعر کے احساسات و جذبات کا بیدار ہونا فطرتاً لازمی ہے۔

اس کوٹھی باڑی میں رابندر ناتھ ٹیگور نے یہی جاگیر کا دفتر بھی بنایا تھا اور اکثر و بیشتر وہ اسی کوٹھی باڑی میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ ٹیگور نے اسی کوٹھی کی بالائی منزل کے ایک چھوٹے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنی بہت ساری مشہور نظمیں لکھی ہیں۔

شیلائی ڈاہ دو لفظوں کا مرکب ہے شیلی اور ڈاہ۔ مسٹر شیلی نیل کا مشہور تنکار تھا۔ اس کی کوٹھی کو دریائے پدما کا پانی بہا لے گیا۔ ڈاہ کے معنی چکردار یا آبِ گرداں کے ہیں۔

شیلائی ڈاہ کی جاگیر ضلع ندیا، ضلع پبنہ اور ضلع فرید پور تک پھیلی ہوئی تھی۔ عہدِ مغلیہ میں یہ جاگیر پرگنہ براہیم پور کے ساتھ کرشنا گر (ندیا) کے راجاؤں کی وسیع زمینداری کا ایک حصہ تھی۔ اس ریاست کا بانی بھابانند مجمدار تھا۔ شمالی بنگال کے راجاؤں کی بغاوت کی سرکوبی کے بعد راجشاہی کی وسیع و عریض زمینداری جس میں اُس وقت پرگنہ براہیم پور بھی شامل تھا۔ اس زمینداری کو نواب مرشد قلی خان نے اپنے منظورِ نظر راجہ رگھو نندن کو عطا کر دی تھی۔ یہی رگھو نندن نٹور راج کا بھی بانی ہے۔

پرگنہ براہیم پور کی جاگیر ندیا راج سے منتقل ہو کر نٹور راج کے تصرف میں آ گئی۔ یہاں تک کہ راجہ دوارکا ناتھ ٹیگور نے مالگزاری کے ایک نیلام میں اس پرگنہ کو خرید لیا۔ پھر ۱۹۳۷ء میں کلکتہ ہائیکورٹ کے ریسیور کے ایک مقدمہ کے فیصلے کے مطابق یہ جاگیر ٹیگور خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر نیلام کے ذریعہ بھگیا کل کی ریاست کی ٹرسٹی شریمتی شیام راگی رائے چودھری کے قبضے میں آ گئی۔

کوٹھی باڑی اور اس کے ملحق زمین، تالاب اور باغات کو چھوڑ کر باقی پوری ریاست کو حکومت نے ۱۹۵۲ء میں حاصل کر لیا تھا اور اس کی نگرانی

(بقیہ صفحہ ۱۵۳ پر)

عابد دانا پوری

مشرقی پاکستان اور صوفیائے کرام

اختیار الدین محمد بختیار خلجی کی فتوحات سے بہت پہلے
عرب کے مسلمان تاجر اور سوداگروں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے روابط قائم
ہو چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں کی جہاز رانی عروج پر تھی مشرقی ممالک
میں ان کے بیڑے کثرت سے آنے جانے لگے تھے۔ چاٹگام کے ساحلی علاقوں
میں عربوں کی نوآبادیات قائم ہو چکی تھیں۔ اور انہیں مقامات سے عرب
اندرون ملک میں داخل ہونے لگے تھے۔ عہد عباسی کے جو سکے دستیاب
ہوئے ہیں ان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

عرب تاجروں کی بکثرت اور متواتر آمد و رفت ہی صوفیوں اور
مبلغوں کے یہاں آنے کا سبب ہوئی۔ تاریخی چھان بین سے یہ بات پایۂ ثبوت
کو پہنچ چکی ہے کہ ترک افواج کا اس وقت تک ملک پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ تاریخ
بتاتی ہے کہ اس علاقہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد بھی مسلم حکمراں دوسری طرف
جنگوں میں الجھے ہوئے تھے۔ نہ تو انہیں انتظامی امور کی طرف توجہ دینے کا
موقع تھا اور نہ ان کے پاس اسلام کی باضابطہ اور باقاعدہ تبلیغ کے لئے
وقت تھا۔ یہ کام صوفیوں اور بزرگوں نے انجام دیا۔ اس دیار کے دور
دراز اندرونی گوشوں تک پہنچ کر صوفیائے کرام ہی نے یہاں کے محکوم اور
[illegible] انسانوں کو زندگی کا نیا پیغام دیا اور انہی بزرگان دین نے مشرقی
پاکستان کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی مشعل روشن کی اور اسلامی تہذیب
تمدن کی بنا ڈالی۔ صوفیائے کرام اور مبلغین دور دراز ممالک سے آئے
اور یہاں کے گوشے گوشے میں دین کی تبلیغ کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس صوبہ
کا کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں کوئی بزرگ نہ پہنچے ہوں۔

جس زمانہ میں بخارا، سمرقند، ایران، شام اور عرب سے صوفیائے
کرام اور مبلغین کی آمد جاری تھی اس وقت مشرقی پاکستان شدت کے
ساتھ مذہبی کشمکش میں گھرا ہوا تھا۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں کو ملک سے
نکالا گیا تو انہوں نے بنگال اور بہار میں پناہ لی تھی۔ اُن دنوں بنگال میں
سین خاندان کا راج تھا۔ برہمنوں کی مدد سے بدھ مذہب والوں
پر حملے [illegible] ان کی [illegible] اور رہنمائی کی کوشش [illegible] کئی مبلغین [illegible]
اور دوسرے حضرات لوگ بدھ مذہب والوں کے پاس گئے ان کی [illegible]
اور [illegible] ترکیب [illegible] کے ساتھ ہمدردیاں کیں اور ان کے دلوں میں
اسلام کی محبت پیدا کی۔

تاریخی طور پر مشرقی پاکستان آنے والے صوفیائے کرام کے دو گروہ قائم
کئے جا سکتے ہیں۔ اول وہ جو مسلم دور کی فتوحات سے پہلے یہاں پہنچے تھے۔۔۔
دوئم وہ جو فتوحات کے بعد آئے۔

فتوحات سے پہلے یہاں پہنچنے والے صوفیوں اور بزرگوں کے
مزارات آج تک اسی روایتی طور پر مسلمانوں کی مقدس زیارت گاہیں ہیں
مگر تاریخی طور سے صحیح صحیح تعین ذرا مشکل ہے کہ فتوحات سے پہلے کون بزرگ
سب سے پہلے مشرقی پاکستان تشریف لائے۔ جدا جدا اور فرداً فرداً ان کے [illegible]
کا پتہ تو کئی مختلف طریقوں سے ملتا ہے مگر ان کے صحیح حالات زندگی کے
ساتھ غلط سلط حکایتیں اور روایتیں جوڑ دینے کی وجہ سے پیچیدگیاں
پیدا ہو گئی ہیں اس لئے سب سے پہلے آنے والے بزرگ کا تعین دشوار ہو گیا ہے
دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بزرگ [illegible] سنت [illegible] اپنا کام تبلیغ
انجام دیتے تھے ان کے [illegible] تابعین میں اعلیٰ صلاحیت کے لوگ
کم تھے [illegible] اس مضمون میں صرف
ان بزرگوں کا ذکر ہے جن کی اہمیت اور شہرت آج تک مسلم ہے۔

بابا آدم شہید

تاریخ سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان
میں سب سے پہلے بابا آدم شہید تشریف لائے
اور یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ ان کا مزار ضلع ڈھاکہ کے منشی گنج سب ڈویژن
کے رامپال نامی ایک مقام پر ہے۔ رامپال کو راجہ بلال سین کی راجدھانی
بتاتے ہیں۔

حکایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ بابا آدم شہید جب مکہ میں تھے
تو ان کے پاس رامپال کا ایک باشندہ حاضر ہوا اور استدعا کی کہ مجھے

راجہ بلال سین کے مظالم سے بچایئے۔ بابا آدم اس کی مظلومیت سے بہت متاثر ہوئے اور تقریباً پانچ ہزار عقیدت مندوں کی جماعت کے ساتھ مشرقی پاکستان آئے۔ رامپال کے قریب خیمہ زن ہوئے [illegible] نوبت کی معاملہ یہاں تک بڑھا کہ بابا آدم شہید اور راجہ بلال سین میں جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں بابا آدم بھی شہید ہوئے اور راجہ بھی اپنے پورے کنبے کے ساتھ ہلاک ہوا۔ اس واقعہ کی صداقت اور عدم صداقت سے قطع نظر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قومی فتوحات سے بہت پہلے ہی مسلمان مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہو چکے تھے اور ان کی آمد سب تاجروں کے ذریعہ ہوئی تھی۔

شاہ سلطان رومی

سلطان رومی کا مزار مدنپور نامی ایک مقام پر ضلع میمن سنگھ میں ہے تقریباً [illegible] صدی عیسوی کے وسط میں سلطان رومی مشرقی پاکستان آئے اور مدنپور میں سکونت فرمائی۔ ان کے بزرگ و اخلاق کی وجہ سے [illegible] لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس زمانہ میں یہاں ایک [illegible] کی حکومت تھی۔ وہ سلطان رومی کی ہر دلعزیزی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہوا۔ اور آپ کا امتحان لینے کی غرض سے زہر ہلاہل کا خاص طور پر تیار کیا ہوا ایک پیالہ آپ کو پینے کے لئے دیا۔ آپ نے بسم اللہ کہا اور پی گئے۔ اب تو راجہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

کہتے ہیں سلطان رومی [illegible] سلطان اسکندر کے فرزند تھے باپ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوئے مگر [illegible] شان و شوکت کی شاہانہ زندگی سے متنفر ہو کر تخت و تاج سے دستبردار ہو گئے وطن مالوف [illegible] ہوا اور [illegible] شیخ [illegible] کے مرید ہوئے۔ اپنے مرشد سے کسب روحانی کے بعد ان کی ہدایات کے مطابق [illegible] اسلام [illegible] سندیپ ہوتے ہوئے ہری رام نگر پہنچے۔ ہری رام نگر اس وقت مشرقی پاکستان کا ایک خوبصورت شہر تھا۔

اس شہر پر راجہ بالارام کی حکومت تھی۔ یہ سلطان کے [illegible] گیا۔ اس راجہ کے وزیر نے اسلام قبول کر لیا۔ [illegible] سلطان رومی [illegible] دیوکوٹ پہنچے۔ یہاں کے مقامی راجہ اور [illegible] کی بہن [illegible] کی لڑائی ہوئی۔ راجہ اس کی بہن کی مکمل پسپائی کے بعد سلطان رومی نے اس مقام پر ایک مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی جو سردار

تک اس مقام سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت فرماتے رہے۔ اسی مقام پر وفات پائی اور یہیں آپ کا مزار ہے۔

مخدوم شاہ دولہ شہید

آپ کا مزار شہزاد پور (ضلع پبنہ) میں ہے مخدوم شاہ دولہ غالباً یمن سے تشریف لائے تھے۔ وہ زمانہ تھا جب بختیار خلجی لکھنوتی (بنگال) فتح کر رہا تھا۔

آپ کے بارے میں روایت یہ ہے کہ آپ معاذ بن جبل کے فرزند تھے۔ اور خود [illegible] بن جبل کو صحابہ رسول میں سے بتلاتے ہیں۔ مخدوم شاہ دولہ نے بیرون ممالک میں اسلام کی تبلیغ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور اپنے والد بزرگوار سے اجازت لے کر ایک بڑی جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستہ میں آپ نے حضرت شاہ جلال الدین بخاری سے ملاقات کی۔ حضرت جلال الدین بخاری نے دعائیں دیں۔ طویل سفر طے کرنے کے بعد بحری راستہ سے شہزاد پور پہنچے۔ اس وقت صوبہ بہار کے ایک راجہ کی حکومت اس علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ راجہ نے شہزاد پور میں آپ کے قیام کی مخالفت کی۔ اس جنگ میں آپ اپنے ہمراہیوں کی بھاری تعداد کے ساتھ شہید ہوئے۔ اس جگہ آپ کے مزار پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔

سلطان بایزید بسطامی

چاٹگام کو بارہ اولیاء اللہ کا مسکن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ بارہ بزرگ ہستیاں ہیں۔ جنہوں نے صرف چاٹگام ہی نہیں بلکہ گرد و نواح کے دوسرے اضلاع میں بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔ حضرت سلطان بایزید اور حضرت شیخ فریدالدین کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ یہ دونوں بزرگ لفظی [illegible] طور پر فوجی فتوحات سے پہلے مشرقی پاکستان تشریف لائے۔ روایتی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان بایزید نویں صدی (یعنی ۸۰۰ء) کے آخری ایام میں چاٹگام شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر نصیر آباد پہنچے۔ یہ مقام اس زمانہ میں نہایت گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل میں [illegible] کب روانہ کیا۔ لیکن بعض اہل علم کہتے ہیں کہ نصیر آباد میں [illegible] شاہ بھی ایک بار تشریف لائے تھے۔ بہرکیف صورت حال کچھ بھی ہو، اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس مقام پر سلطان بایزید نے وفات نہیں پائی اور نصیر آباد کے ٹیلے پر سلطان بایزید کا مقبرہ نہیں ہے بلکہ وہ آپ کی ایک مزید نما یادگار ہے اور اس پر ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

شیخ فریدالدین

چاٹگام شہر کے قریب ایک چشمہ شیخ فرید کے نام سے منسوب ہے بیشمار لوگ اس چشمہ کا پانی لے جاتے ہیں۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس چشمہ کا پانی شفا بخش ہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن ہی میں شیخ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ماں نے پرورش کی دینی اور روحانی تعلیم دلوائی۔ بعد کو حضرت شیخ فریدالدین دہلی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔ واپسی کے وقت خواجہ نظام الدین کو دنیا سے بچنے اور اللہ کی سیدھی راہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ نظام الدین اپنے وقت کے سب سے بڑے ولیوں میں شمار ہوئے۔ اور آج تک ہند و پاک کے کونے کونے میں آپ کے عقیدتمندوں کی کمی نہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ وہی حضرت بابا شیخ فریدالدین شکر گنج ہیں۔ جنہوں نے ۱۲۶۹ء میں وفات پائی اور آپ کا مزار پاک پٹن پنجاب میں ہے۔

دوسرا دور

ہند و پاکستان کے اس خطہ بنگالہ و مشرقی پاکستان پر ترک لشکر کا قبضہ ہو جانے کے بعد جنوبی ہند اور مشرق وسطی کے دیگر ممالک سے صوفیائے کرام۔ بزرگانِ دین اور مبلغینِ اسلام بڑی تعداد میں یہاں آنا شروع ہوئے۔ ان کی آمد کا پتہ مختلف نگارشات مثلاً تذکرہ کی کتاب سوانح حیات اور سفر ناموں سے چلتا ہے۔ جب یہ علاقہ پوری طرح مسلمانوں کے زیر اقتدار آگیا تو مبلغین کے لئے پہلی جیسی مشکلات نہ رہیں مساجد اور خانقاہیں کثرت سے تعمیر ہوئیں۔ بیشمار لنگر خانے اور امدادی ادارے قائم ہوئے اور بھاری تعداد میں مقامی باشندے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مخدوم شیخ جلال الدین تبریزی

دور ثانی میں سب سے پہلے مخدوم شیخ جلال الدین تبریزی آئے۔ آپ تبریز (ایران) میں پیدا ہوئے اور مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ خلجی فتوحات کے فوراً بعد بنگال آئے اور پنڈوا میں قیام کیا اور وہیں وفات پائی۔ ان کے موثر اور دلکش انداز تبلیغ سے بھاری تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے حضرت تبریزی کی تبلیغ کا میدان مشرقی پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔

شاہ جلال یمنی سلہٹ

سہروردیہ سلسلہ کی دوسری بہت بڑی بزرگ ہستی جو مشرقی پاکستان آئی وہ حضرت شاہ جلال یمنی کی ذات گرامی تھی۔ آپ ۱۳۰۳ء یعنی چودھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں مشرقی پاکستان تشریف لائے۔ اور سلہٹ کے پہاڑی علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی شاہ جلال قبیلہ قریش سے تھے آپ شیخ الشیوخ شاہ محمد کے فرزند ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ماموں نے ایک مٹھی خاک دی اور یہ کہہ کر آپ کو رخصت کیا کہ جس جگہ کی مٹی کی بو باس اس خاک سے ملتی جلتی ہو وہیں قیام کرنا۔ شاہ جلال مشرق کی طرف روانہ ہوئے اور سلہٹ پہنچے۔ سلہٹ کے راجہ گور گوبند کو شکست دینے میں مدد دی۔ سلہٹ کی مٹی کا رنگ اور بو باس اس خاک سے ملتی جلتی پائی جو آپ کے ماموں نے دی تھی۔ اس لئے سلہٹ ہی میں ٹھہر گئے اور وہیں سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا۔

مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ ابن بطوطہ نے سلہٹ میں شاہ جلال سے بھی ملاقات کی اور اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ شاہ جلال نے چالیس سال تک مسلسل روزے رکھے اور ہر دسویں دن ایک روزہ چھوڑتے تھے۔ شاہ جلال کے پاس ایک گائے تھی اسی کے دودھ سے افطار فرماتے تھے۔ رات رات بھر اللہ کی یاد میں کھڑے رہا کرتے تھے۔ بلند قامت آدمی تھے۔ داڑھی مختصر تھی۔ گالوں پر بال بہت کم تھے۔ سلہٹ کے پہاڑی علاقوں میں آپ ہی کی تبلیغ سے اسلام پھیلا مستقل طور پر شاہ جلال نے سلہٹ ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وفات پائی اور وہیں آپ کا مزار آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

شیخ علاءالحق

حضرت شیخ علاءالحق لاہور کے شیخ اسد کے بیٹے تھے شیخ کا کہنا تھا کہ ان کا نسب نامہ حضرت خالد بن ولید سے ملتا ہے۔

غالباً چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شیخ کے والدین بنگال پہنچے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ بہت جلد گور کے بارونق شہر میں صاحب ثروت آدمی شمار کئے جانے لگے۔ شیخ علاءالحق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد شیخ اخی کے مرید ہوئے۔ شیخ علاء دل کے سخی اور خیر بزرگ تھے۔ غربا۔ مسکین۔ محتاج۔ مسافر اور طالب علموں کی حاجت روائی کے علاوہ ان کے طعام و قیام پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ لیکن کبھی کسی کو اس کی خبر نہ ہو سکی کہ اس قدر دولت شیخ کے پاس کہاں سے آتی ہے اور اتنے بڑے اخراجات کے لئے

اتنی بھاری رقم انہوں نے غیبی ذرائع کیا ہیں۔

شیخ کی غیبی دولت اور ان کی دریادلی کو دیکھ کر بادشاہ سلطان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے شیخ کو ذبح کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ شیخ سنار گاؤں چلے گئے اور کچھ دنوں وہاں رہے۔ راہ میں پہلے سے بھی زیادہ عزت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دوبارہ شیخ علاء الحق کو پنڈوا آنے کی دعوت دی۔ شیخ نے ۱۳۹۸ء میں رحلت فرمائی۔

بدیع الدین شاہ مدار

بدیع شاہ مدار مشرقی پاکستان میں مداریہ فرقہ یا جماعت کے بانی ہیں۔ سید ابو اسحاق شامی براہ راست حضرت ہارون کی نسل سے تھے۔ بدیع شاہ مدار نے ہندو پاکستان کے بیشمار شمالی علاقوں کا دورہ کیا اور چند سال مشرقی پاکستان میں بھی گزارے۔ مشرقی پاکستان میں کے تمام لوگ زمانے میں وہ مدار پور (ضلع فریدپور) اور چاٹگام کے مدارشاہ کے علاقوں میں گئے۔ شاہ مدار اگلے جلد چلے گئے۔ ان کی یاد منانے کے لیے ہر سال مالش کر کے جلوس نکالتے ہیں جسے مدار بانس کہتے ہیں۔

سید العارفین

ضلع باقرگنج میں سید العارفین کا مزار ہے جہاں ہر سال دسمبر کے مہینے میں میلہ لگتا ہے اور آپ کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ سید کے مستند حالات زندگی نہیں ملتے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ تیمور لنگ نے انھیں اسلام کی تبلیغ کے لئے مشرقی پاکستان بھیجا تھا۔ متعدد مقامات کی جادہ پیمائی کے بعد آپ باقرگنج پہنچے۔ یہاں پہنچ کر ہر کام میں انھیں کامیابی حاصل ہوتی رہی۔

روایت ہے کہ ایک دن سید العارفین ایک جانماز پر دریا عبور کر رہے تھے کہ آپ کی نظر کالی سمندر کی ایک لڑکی پر پڑی۔ اس لڑکی کو مسلمان کیا۔ اسی گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ عمر بھر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔

شاہ اسمعیل غازی

شاہ اسمعیل غازی کا رشتہ خاندان نبوی سے منسلک ہے۔ آپ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ اسلام کی تبلیغ کے لئے وسیع شمالی علاقوں کی سیاحت فرمائی۔ یہاں تک کہ لکھنوتی (بنگال) پہنچے۔ یہ شہر سلطان بربک شاہ کا دارالحکومت تھا۔ سلطان نے انھیں سپہ سالار مقرر کیا۔ شاہ غازی نے کامروپ کے راجہ کمیشور کو شکست دی۔ یہ راجہ برسوں سے سلطان کے ساتھ برسرپیکار تھا اور لڑائی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ شاہ غازی اس مفتوحہ علاقے کے حاکم مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں گوراگھاٹ میں چندسی رائے نامی ہندو افسر حاکم تھا۔ شاہ غازی کے اثر و رسوخ اور ان کی بڑھتی ہوئی عظمت دیکھ کر اس کے سینے میں حسد کی آگ بھڑکی اور دل میں جلن پیدا ہوئی تو اس راجہ چندسی رائے نے شاہ غازی کے خلاف سازش کی اور سلطان کو یہ جھوٹی خبر بھجوائی کہ شاہ غازی پوشیدہ طور پر راجہ کے ساتھ معاہدہ کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کا سامان کر رہے ہیں۔ جب یہ خبر سلطان تک پہنچی تو بہت برہم ہوا اور بے سوچے سمجھے طیش میں آکر حکم دے دیا کہ اسمٰعیل غازی کا سر قلم کر دیا جائے۔ فوراً اس فرمان پر عمل کیا گیا۔ اور ۱۴۷۴ء کو حضرت شاہ اسمٰعیل غازی شہید کر دیئے گئے۔ آپ کا سر مبارک ضلع رنگپور میں جا بجا متفرق مقامات پر دفن ہے۔ یہ چاروں مقامات آج تک مسلمانوں کی زیارت گاہ ہیں۔

پیر بدر الدین بدر عالم

یہ بزرگ مشرقی پاکستان میں بدر شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور چاٹگام کے قطب یا محافظ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ بدر شاہ ایک پتھر کے تختے پر بہتے ہوئے چاٹگام پہنچے۔ ان دنوں چاٹگام میں جن و پری کا غلبہ تھا۔ بدر شاہ نے چاٹگام کو جن و پری سے نجات دلائی اور خود یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور چاٹگام ہی سے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور وفات کے بعد بخشی بازار میں دفن ہوئے۔ یہ بازار چاٹگام شہر کے بیچ میں واقع ہے۔ آپ کے مزار پر آج تک بہت عقیدتمندوں کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس مقام پر پہلے ہندو حکومت تھی۔ یہ راجہ مسلمانوں پر ظلم کرتا تھا۔ اس کی سرکوبی کے لئے پیر بدر شاہ روانہ ہوئے۔ شاہ حاکم بنگال از ۱۲۹۳ء تا ۱۳۱۹ء کی مدد سے انہوں نے راجہ کو شکست دی۔ پیر بدر شاہ نے مشرقی پاکستان کے متعدد مقامات کی سیاحت کی۔ ان مقامات پر بعد کو یادگار کے طور پر درگاہیں بنیں۔ روایت کے ساتھ بدر شاہ کے متعلق حکایتیں اور روایتیں وسیع پیمانے پر مشرقی پاکستان بلکہ پورے بنگال کے ماہیوں میں بہت زیادہ ہیں۔ کچھ شہرت بہت زیادہ ہے۔ یہاں کے مانجھی اور ملاح ہر کام شروع کرتے وقت اور خصوصاً کشتی کا لنگر اٹھاتے وقت "یا بدر" کا نعرہ لگاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بزرگوں کے اثرات

مذکورہ بالا چند بزرگوں اور صوفیوں کی زندگی کے مختصر حالات کے مطالعہ سے غیر مبہم اور واضح طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس قدر تیزی سے اسلام پھیلانے والے یہی بزرگ تھے۔ انہیں کی مسلسل آمد اور تبلیغ سے دین حق پھیلا۔ انھیں کے اخلاقِ حسنہ، برگزیدہ اوصاف، بے غرضی، بلند نظری، نہایت خدا ترسی، ایثار، عمل صالح، خلوص اور بے لوث خدمات سے لوگوں کے دلوں میں دین کی کشش پیدا ہوئی۔ لوگ ہر طرف سے جوق جوق ان بزرگوں کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے اور حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے۔ بعد یہ صوبہ مسلم اکثریت والا علاقہ بنتا گیا۔ ان بزرگوں کے لنگر خانوں کے دروازے ہر وقت ناداروں اور فاقہ کشوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ ان بزرگوں کی خانقاہیں اور قیام گاہیں راہگیروں اور مسافروں کیلئے پناہ گاہیں تھیں۔ جہاں ہر وقت راہگیروں اور مسافروں کے لئے طعام و قیام کا سامان مہیا رہتا تھا۔

یہ بزرگ ہستیاں ظالموں سے بازپرس کرنے میں بھی بیباک تھیں، مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے میں فراخدل اور دوسروں کے نقصان کی تلافی کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ ان بزرگوں اور صوفیوں کی خدمات صرف بارونق شہروں تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ یہ لوگ صوبہ کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ تک پہنچے نہایت آزادی کے ساتھ مل جلکر رہے۔ لوگوں کے غم اور خوشی میں دل کھول کر شریک ہوئے۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں اسلام کی عظمت اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کی اور رفتہ رفتہ انھیں اسلامی تعلیم سے واقف بناتے رہے۔

حضرت شرف الدین توامہ

سونار گاؤں میں حضرت شرف الدین توامہ کا مزار ہے۔ جہاں آج تک ماہِ شعبان کی ۸ تاریخ کو اطراف و جوانب سے ہزاروں عقیدتمند جمع ہوتے ہیں اور عرس ہوتا ہے۔ مولانا توامہ کا آبائی وطن بخارا تھا۔ سب سے پہلے آپ دلی پہنچے وہاں سے منیر (صوبہ بہار) گئے۔ جہاں مدت تک حضرت مخدوم یحیٰ منیری کے مہمان رہے۔ وہاں سے سونار گاؤں تشریف لائے اور یہاں مشعلِ علم و ہدایت روشن کی۔ حضرت شرف الدین توامہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین بھی تھے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتِ وقت نے آپ کے مدرسہ کی نگہداشت اپنے ذمے لی تھی اور مولانا توامہ کے اس مدرسہ کو ایک مدت تک ایک اسلامی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل رہی۔

مولانا شرف الدین توامہ کی جلائی ہوئی مشعل پر دور دراز کے بیرونی ممالک تک سے علم کے پروانے آتے رہے۔ اس شہر میں بڑے بڑے علماء اور مشائخ نے سکونت اختیار کی۔ لیکن جب مغل صوبہ دار اسلام خان نے ۱۶۰۸ء میں ڈھاکہ کو اپنا مرکزی مقام بنالیا تو بتدریج سونار گاؤں کی رونق و عظمت کا چراغ مضمحل ہوگیا اور وہ پُر رونق شہر ایک ویران بستی میں تبدیل ہوگیا جہاں اب صرف کچھ کھنڈرات اور مزارات کی اینٹیں ماضی کی یاد دلانے کو باقی ہیں۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام اپنے خلوص کی وجہ سے غیر مذہب والوں میں بھی بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

افسر ماہ پوری

مشرقی پاکستان کے بنگالی فنکار

مشرقی پاکستان کے بنگلہ ادب میں جو نیا رجحان رونما ہوا وہ ٹیگور کی ملکوتی سرمستی و لطافت کا ردِ عمل تھا۔ یہ رجحان ہیئت، مواد دونوں میں کارفرما ہوا۔ بنگال میں یہ رجحان اس وقت نمودار ہوا جب انگلستان میں رومانی روایتیں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے ہاتھوں ختم ہو رہی تھیں۔ بنگلہ شاعری کا موجودہ رجحان ایک قسم کے مذہب کا آغاز ہے اور مشینی تہذیب دین سے محروم دانشوروں کی۔ دنیا دشمن پسپائی کا اور شاید دنیا کے اسی طبقہ کو اسے خوش کرنا ہی مقصود تھا۔

اس صدی کے اوائل میں بعض مسلمان شاعر اپنی ڈگر آپ نکالنے لگے۔ فن کا جو ورثہ انہیں ملا تھا وہ اس میں اضافہ کرنے لگے۔ عروضی جدتیں آزادی سے رواج پانے لگیں ارباب کو منثور نظم عین بن گئی ہے مگر شاعرانہ زبان ہی عوام کی زبان ہے۔ زبان کو مضبوط ٹھوس درست بنانے کے لئے پرانے اور لطیف الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں الفاظ کی موسیقی صلاحیتوں کا سراغ لگایا جاتا ہے اور موسیقی و اشاریت پیدا کرنے میں ان کی قوت کا ماہرانہ استعمال ہوتا ہے۔

روزمرہ زندگی اپنی تمام خوشیوں اور غموں کے ساتھ شاعری کا نفیس مضمون ہے۔ شعری اور نثری زبان میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ موجودہ فن کی خصوصیتوں میں ایجاز و اشاریت جو علامتوں کے پیدا کردہ ہیں، شامل ہیں۔

نذرالاسلام اس جماعت کے اولین فرد ہیں جنھوں نے ٹیگور کی تیری نرمی اور سکینی کے خلاف اس ردِعمل کو مستحکم کیا۔ عہد ساں کے سیاسی و معاشرتی مسائل نذرالاسلام کے آتشیں فن کے موضوع بنے۔ بنگال کی ادبی تاریخ میں ان کی ذاتی زندگی سب سے زیادہ رنگین اور متنوع تھی اور وہ اپنی آخری منزل میں سب سے زیادہ المناک۔ ان کی جذباتی و سیاسی نظمیں زیادہ تر ان کی بے پناہ قوت عمل اور تمرد پسند مزاج کی مظہر ہیں۔ ان کی شاعری ولولہ انگیز ہے، اس میں دل گرما دینے والی صلاحیت ہے۔

نذرالاسلام کی فنکاری کا پرجوش بہاؤ ان کی نو بہ نو غنائیت سے ایک آبشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں موسیقی و شاعری ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ اسی لئے ہر ایک شاعر کو ادا شناس موسیقی کا بھی ہونا ازبس ضروری ہے۔

نذرالاسلام کے گیتوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری اور موسیقی نے بیک وقت ایک دوسرے ہی کے لئے جنم لیا ہے۔ اس اتحادِ کامل سے جو چیز وجود پذیر ہوتی ہے وہ نہ تو شاعری میں ہماری سماعتوں کی نمائندگی ہے اور نہ موسیقی میں۔ بلکہ اس سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے جو کچھ شاعری سے بھی زیادہ غیر مرئی اور موسیقی سے بھی زیادہ نزاکت طلب ہے۔

ابوالحسین ایک جوان فکر و جواں سال شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز کی شستگی اور تلخی کی حقیقت پسندی کا بہترین امتزاج ہے۔ ان کے کلام میں کوئی غریب و قدیم لفظ شاذ ہی ملتا ہے۔ چند بہترین جذباتی و غنائی نظمیں لکھنے والوں میں وہ بھی ہیں۔ ان کی زبان بامحاورہ ہے اور وہ کبھی گفتاری زبان سے بھی اظہار کا کام لیتے ہیں۔ ان کی ایمائی نظمیں عوام کی زبان میں اپنا جادو جگاتی ہیں۔

بعض شاعر جو جدید جماعت میں ایک علیحدہ شعبہ کی حیثیت رکھتے ہیں [illegible] وغیرہ کے ایلیٹ پسندانہ مکتبہ خیال سے گہرے طور پر متاثر ہیں، ہیئت کے لحاظ سے بھی اور طرز فکر کے لحاظ سے بھی۔ ان شاعروں کا کلام ان کے تبحر علمی، جدت طرازی، انفرادیت اور ہیئت میں آزاد روی کا غماز ہے۔ ان کی شاعری میں بین الاقوامیت کی ایک واضح گونج سنائی دیتی ہے۔

فرخ احمد مشرقی بنگال کے بہترین غنائی شاعروں میں ہیں مگر انہوں نے بہت سی آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں عملاً شریک رہے ہیں اور اس کے پیغام کو شاعرانہ انداز سے عوام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نذرالاسلام کے حقیقت کیش ہونے کے باوجود ان کا قلم اپنے استاد معنوی کے برعکس کافی محتاط ہے۔

جسیم الدین مشرقی بنگال کے آسمان ادب کے ایک تنہا ستارہ ہیں جس نے دیہی بنگال کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی دیہاتی زبان ہی میں کی ہے۔ ان کی شاعری قدیم بنگال کے عوامی گیتوں اور میلوں کا گل سرسبد

نظر جزیات میں ڈوب جاتی ہے اور وہ ان جزیات کو وحدت کل کے تابع کرنے میں قدرت تامہ رکھتے ہیں۔

وہ میدانِ باطن، کھیرے اور عفانہ بدوش دوشیزہ کے دلوں کے بعید ترین گوشے غیر معمولی فنکاری کے ساتھ اجاگر کرتے اور ان کے راز و نیاز کی مفصل منظر کشی کرتے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھتے وقت قاری گاؤں والے کی شدید محبت اور عمیق غم دونوں کا لطف پاتا ہے۔ ان کا دیہی کردار اپنی روح کی گہرائیوں سے خوشیاں مناتا، مصیبتیں جھیلتا، کسی کو چاہتا، نفرت کرتا اور مایوس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کوئی چیز معمولی نہیں، کوئی چیز مصنوعی نہیں۔

بنگال میں ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی سرپرستی میں عوامی ادب کافی پھلا پھولا بعض دوسرے شاعروں نے بھی اس ایک صدی قدیم قیمتی ادب کے احیاء کے لئے سعی کی۔ اس متنوع ادب کو دنیا کے کسی بھی عوامی ادب کے سامنے بلا جھجک پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی احساس نے بعض دور جدید کے شاعروں کو اپنی پرانی روایتوں کے اپنانے کا جذبہ تیز کیا اور انہیں ان شاعروں نے اس رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا کہ مشرقی بنگال میں قدیم و جدید ادب سینہ بسینہ اور پہلو بہ پہلو فروغ پانے لگے۔ زبان و مکان کی ان حد بندیوں سے گزر جانے کے احساس ہی نے بعض شاعروں کو "قدامت پرست" بنا دیا۔ شہادت حسین، شمشیر علی اور علی احسن خاص طور پر اس بات کے قائل ہیں کہ کوئی شاعر تنہا حسن تکمیل حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کی اہمیت کا مدار بڑی حد تک مردہ شاعروں کے زندہ خیالات سے اسکے رشتہ کی قربت و نوعیت پر ہے وہ خیالات کے تسلسل کو مانتے ہیں ـــــ قدیم و جدید کے اتحاد کے داعی ہیں۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ ماضی کو حال اتنا ہی بدل دیتا ہے جتنا کہ حال کو ماضی۔

عبدالکریم، منصور الدین، جسیم الدین اور روشن یزدانی نے پوتھیوں کی ایک معتد بہ تعداد جمع کی ہے۔ ان کے ذخیرے میں دیہاتی گیت اور بیلے بھی شامل ہیں۔ ان ذخیروں کو مشرقی بنگال کی ادبی نشاۃ الثانیہ میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے صرف محسوسات میں نہیں بلکہ ہیئت و آہنگ میں بھی ڈھائی ہزار الفاظ جو عربی، فارسی اور اردو نثر اور نظم میں اور عوامی ادب میں کثرت سے مستعمل تھے، مگر درمیان میں ہندوا اقتدار کے اثر سے متروک ہو چکے تھے، موجودہ فن کاروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کی قدر و قیمت کا دوبارہ تعین کرتے اور اپنے کلام میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح مشرقی بنگال میں ایک نئی زبان پیدا ہو رہی ہے اور ایک نیا ادب پروان چڑھ رہا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں افسانہ نگاری کو خاص طور پر فروغ ہوا ہے۔ شوکت عثمان کی "پرستش"، "منزلت علی"، "انسان سب سے بڑی سچائی" ہے"، شمس الدین کی "انجانی راہ"، اشرف الزماں کی "رنگا دالا"، رابعہ خاتون کی "خالہ"، ابو رشید کی "پہلا خاندان"، عبید الحق کی "تسلیمہ"، واجد علی کی "مہاجر" اور اشرف صدیقی کی "رابعہ آپا" وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو اپنی فنی خوبیوں کی بنا پر دنیا کی کسی زبان کے بھی افسانوں کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہیں۔ تقریباً ایک درجن ناول جو تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آئے ہیں ان میں ابو رشید کی "راہ معانی میں طوفان"، ابوالفضل کی "ہونہار صبح" اور ولی اللہ کی "لال شالو" سب سے زیادہ قابل لحاظ ناول ہیں۔ ان ناولوں میں مشرقی بنگال کی زندگی کے سارے پہلو خصوصاً غربا کی زندگی نہایت بیباکی اور گہرائی سے پیش کی گئی ہے۔

شوکت عثمان کے افسانوں کا حسن خاص طور پر ان کی مدھم آہستہ خرام اور گل عذار زبان کی وجہ سے نکھرتا ہے اور دیہی پس منظر میں ان کے دیہاتی کرداروں کی سادگی و معصومیت سے اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اپنی حالیہ تمثیل "املا ماسیا" میں شوکت عثمان نے طنز نگاری میں انتہائی بلندیوں کو چھو لیا ہے اور طنز کو ایک تیز دفاعی حربے کی حیثیت سے نہایت خلاقانہ طور پر استعمال کیا ہے ان کی پہونچ ان برائیوں تک براہ راست جا پہنچتی ہے، جو ہماری زندگی کے قویٰ کو مجموعی طور پر گھن کی طرح کھاتی جا رہی ہیں۔

ان فن کاروں میں جنھوں نے بنگلہ ادب کو اردو اور اسلامی مطمح نظر سے قریب تر لانے میں اہم خدمتیں انجام دی ہیں ان میں گوہی غلام مصطفےٰ (مترجم کلام اقبال و حالی) قاضی طاہر حسین وغیرہ ہم کے نام سر فہرست ہیں۔ انھوں نے مسلم بنگلہ ادب کے مطالعہ و مقبولیت میں کافی وسعت پیدا کی اور اس برصغیر میں مسلمانوں کے افکار و خیالات کے مشترکہ سرچشمہ کا سراغ لگایا ہے۔

افسر ماہ پوری

مشرقی پاکستان کے چند لوک گیت

مشرقی پاکستان کے لوک گیت اپنے رنگ، روپ اور رس کی گوناگونی کے اعتبار سے لوک ادب میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیتیں نتیجہ ہیں ان فطری قدرتی مناظر و مظاہر کی جن کی تازگی و شادابی سے مشرقی پاکستان کا گوشہ گوشہ والی باغباں کو کیف گلفروش نظر آتا ہے۔ لہراتے ہوئے دریا، دریاؤں کی چنگھاتی ہوئی بےقرار موجوں پر بادبانی کشتیوں کا ہجوم، دور سرمئی افق پر جنگلوں اور دوسرے آبی پرندوں کی اڑتی ہوئی قطاریں، سپاری اور ناریل کے لمبے لمبے پھل اور جھومتے ہوئے پیڑ، بانسوں اور کیلوں کے ہرے ہرے پتوں میں گنگناتی ہوائیں، امنڈتی ہوئی کالی کالی گھٹائیں، گرجتے ہوئے بادل، چمکتی ہوئی بجلیاں اور اسی قسم کے دوسرے مناظر ایسا جادو جگاتے ہیں کہ گونگی زبان بھی گنگنا اٹھے، نور آنکھ بھی منور ہو جائے اور مردہ دل بھی زندگی کی حرارت سے دھڑکنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوک گیت حسن و عشق کی ان داستانوں، فراق و وصال کے ان افسانوں، حیات و کائنات کے ان جلوؤں کے آئینہ دار ہیں، جن سے مشرقی پاکستان کا گاؤں عبارت ہیں۔

مانجھی، ناؤ اور دریا یہ تینوں چیزیں مشرقی پاکستان کی زندگی، جد و جہد، دشواری و آسانی اور ناکامی و کامرانی کی علامتیں ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی ناؤ، گہرا اور طوفانی دریا اور غافل مانجھی، یہ ایسی رکاوٹیں ہیں، جو مشرقی پاکستان کے لوگوں کو عمل پر اکساتی اور زندگی کی کٹھن منزلوں کو سر کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوک گیت اسی فضا میں جنم لیتے ہیں اس لئے ان میں دل کی آگ بھی ہے اور راگ بھی اور درد ... بھی ... انی بھی اور زندگی کی جوانی بھی۔

ذیل میں آپ کی خدمت میں مشرقی پاکستان کے چار ایسے گیت پیش کئے جاتے ہیں جو نہ صرف ان خصوصیتوں کے حامل ہیں بلکہ اپنی مقبولیت، دلکشی اور رعنائی کی بنا پر خاص رتبہ کے مالک ہیں۔

(۱)

مرا محبوب ہے کتنا رنگیلا
وہ دل لیتا تو ہے، دیتا نہیں ہے
گلوں کا ہار پہناتا نہیں ہے
دلاتا ہے امیدیں چال چل کر
کیا کرتا ہے وعدے گال بھر کر
مگر جانے نہ وہ الفت کا شعلہ
مرا محبوب ہے کتنا رنگیلا۔

میں جنگل میں تھی جنگل کا پرندہ
بسایا تھا وہاں سکھ کا بسیرا
محبت سے تری سب کچھ گنوایا
مجھے بے خانماں، برباد کر کے
نہ باتیں یوں بنا، بیداد کر کے
ارے بے رحم، او ظالم، ہٹیلا
کبھی دیتا نہیں پھولوں کی مالا

امید خام میں جنون یہ گزرا
مہینے جا چکے، یہ دن بھی بسرا
مرے محبوب اب بھی تو کرم کر
ٹھہرتی ہی نہیں یہ جان دم بھر
کہا تھا کتنی الفت سے کہا تھا
مجھے تا عمر راحت میں رکھے گا

مگر اس کے عوض اے ناگ تو نے
مرے سینے میں بھر دی آگ تو نے
مرے گھر کو مٹایا بے رخی سے
مجھے شکوہ ہے اپنی بے بسی سے
تپش سے یہ بدن ہوتا ہے کالا
مرا محبوب ہے کتنا رنگیلا۔
کبھی دیتا نہیں پھولوں کی مالا

---

(۲) اُسے اپنے دل کی کہانی سناتی
سنا کر غم زندگانی مٹاتی
اگر اتفاقاً اسے دیکھ پاتی
تو اس زندگی کی تمنا مٹاتی
جمال اس کا میں آنکھ بھر دیکھ پاتی
مگر میرا جیون یہ، بیکار گزرا
جو دکھ تھا مرے من کا من ہی میں ٹھہرا
اگر موت آتی تو اچھا ہی ہوتا
نکل جاتی یہ جاں تو اچھا ہی ہوتا
میں ہوش و خرد اپنے کیسے سنبھالوں
جو دل پہ گزرتی ہے، کیسے بتاؤں
میں کرتی ہوں کیا اور کیا ہو رہا ہے
یہ دل طاقت صبر بھی کھو رہا ہے
خدا جانے دل میں ترے کیا چھپا تھا
مجھے ایسی پُرہول موجوں میں ڈالا
مرا گھر کہاں ہے سہارا کہاں ہے
سفینہ کہاں ہے کنارا کہاں ہے
میں جاتی ہوں اشکوں میں بہتی بہاتی
اگر اتفاقاً اسے دیکھ پاتی ــــ
اسے اپنے دل کی کہانی سُناتی۔

---

(۳) بانسری کی آگ سے تپتی ہے جاں
کون رہ سکتا ہے یوں گھر میں بھلا
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا۔
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا
اُس کے درشن کے لئے جائیگی کون
ارے سکھیو، میں اکیلی جاؤں گی
کوئی تم میں سے اگر
ہے کسی کا رُوپ آنکھوں میں بسا
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا
سوچ کر کہتا ہے یہ پاگل رَمن
اصل میں ہے جانِ من جانانِ من
اس جہاں میں صرف تنہا ہے بدن
زندگی کے بعد، ہو اُمید کیا
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا
ہائے میرا طائرِ دل اُڑ گیا

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کی اس مالا میں اب آپ کی خدمت میں آخری گیت پیش کیا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ مذہب کے بڑے پرستار ہیں اور حب خدا اور رسولؐ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

(۶) اے میرے بھائی مانجھی، کیا تم بتا سکو گے؟
یہ بیقرار دھارے جاتے ہیں دور کتنے
کس گھاٹ پر یہ جا کر رکتے ہیں، کون جانے
شاید چلے گئے ہوں، ساگر کے اس کنارے
آسودہ ہو گئے ہوں ساحل میں آسماں کے
آتا ہے کون تھامے بادل کا یہ کنارا۔
اب شام ہو چکی ہے کس نے کسے پکارا

(بقیہ صفحہ ۱۶۸ پر)

افسر ماہ پوری

سلہٹ

(احمدی بیگم اپنے شاگرد پرویز اور سمن کو ساتھ لیکر سلہٹ کی سیر کے لئے
ڈھاکہ سے ریل کے ذریعہ روانہ ہوتی ہیں۔ اب اُن کی منزل قریب آ چکی ہے۔)
(پس منظر ریل کے چلنے کی آواز)

احمدی بیگم:- اُٹھو بچو، جاگو، سحر ہو گئی
پرویز:- ہاں سحر ہو گئی!
احمدی بیگم:- ابھی اور سونے کی نیت ہے کیا؟
دیر سلہٹ کے آنے میں کیا ہے بھلا
پرویز:- ارے تم سمن، جاگتیں کیوں نہیں
وہ دیکھو مناظر ہیں کتنے حسیں
سمن:- ہٹو، میں بھی دیکھوں ذرا ٹھیک سے
بڑا دل کشا ہے سماں واقعی
یہاں دیکھنے سے ہے ترو تازگی۔
پرویز:- وہ دیکھو، وہاں نیلگوں سا دھواں
وہ شاید پہاڑوں کی ہیں چوٹیاں
احمدی بیگم:- یقیناً بجا ہے تمہارا گماں
پرویز:- زمیں کس قدر سبز و شاداب ہے
مصور کا گویا حسیں خواب ہے
سمن:- یہ سلہٹ ہے حصہ اسی ملک کا؟
احمدی بیگم:- بتائے تمہیں کون جغرافیہ
تمہارا بھی ہے حال پرویز کا
نہ جغرافیہ سے تمہیں شوق ہے
نہ تاریخ ہی کا تمہیں ذوق ہے
ضروری اسی واسطے سیر ہے
وہ سلہٹ بھی آ ہی چلا خیر سے

(خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں)
سمن:- مگر میں نے باجی، یہ پوچھا نہ تھا
یہ سلہٹ تھا پہلے بھی بنگال میں؟
احمدی بیگم:- ضلع پہلے سلہٹ تھا آسام کا
مگر جب بٹا ملک ہندوستاں
چلا آیا سلہٹ ادھر سے یہاں
وہاں لوگ زیادہ مسلمان تھے
وہ اصحاب ایمان و قرآن تھے
جدا ہو کے سلہٹ یوں آسام سے
گلے مل گیا اہل اسلام سے
پرویز:- ارے باجی، گاڑی تو تھمنے لگی
سمن:- یہی اپنی منزل ہے شاید یہی
احمدی بیگم:- یہی اپنی منزل ہے بچو اُٹھو!
(وقفہ۔ ریل کی آواز بند ہو جاتی ہے)
احمدی بیگم:- اس راہ سے چلیں ہیں ہم سلہٹ کی سیر کرنے
پرویز:- دامانِ آرزو کو رنگینیوں سے بھرنے
سمن:- لیکن سڑک یہ باجی کتنی ہے صاف ستھری
جیسے کہ آسماں پر ہو کہکشاں سی نکھری
پرویز:- اس کا سبب بتائیں۔
احمدی بیگم:- شامل ہیں ریت پتھر سلہٹ کے آب و گل میں
ٹکتا نہیں ہے پانی، بارش کا ہو کہ گھر کا

احمدی بیگم:۔ نالی کہیں نہیں ہے، نالا کہیں نہیں ہے

پرویز:۔ خالو کہیں نہیں ہے، خالا کہیں نہیں ہے

(قہقہہ)

سمن:۔ رستے کے دونوں جانب سب ٹین ہی کے گھر تھا

احمدی بیگم:۔ لیکن یہ کتنے اچھے دلکش، حسین مکاں ہیں۔

سمن:۔ شاخوں پہ جیسے باجی طائر کے آشیاں ہیں

پرویز:۔ چلئے اب اور آگے

احمدی بیگم:۔ اُس پُل کو دیکھتے ہو، سرماندی کے اُوپر؟

سمن:۔ کیا خوب پُل ہے باجی!

پرویز:۔ کافی بڑا ہے یہ تو۔

سمن:۔ لیکن کبوتروں کا یہ ازدہام کیا ہے!

احمدی بیگم:۔ حضرت جلالؒ) کا یہ چھوٹا سا معجزہ ہے
شاید اسی لئے ہیں مشہور یہ جلالی
سلہٹ کے رہنے والے کرتے ہیں اُن کی عزت
سلہٹ کا ہر مکاں ہے اُن طائروں کا مسکن

پرویز:۔ پرواز دیکھئے وہ، پُل پر کبوتروں کی
اتنے کبُوتروں کو یکجا کبھی نہ دیکھا

سمن:۔ کرتے ہیں کیا غٹرگوں، کرتے ہیں کیا غٹرگوں

پرویز:۔ گا ہے یہاں غٹرگوں گا ہے وہاں غٹرگوں

(قہقہہ:۔ مسّرت سے تالیاں بجاتے ہیں)

سمن:۔ ہے صاف کتنا پانی سرماندی کا پانی

احمدی بیگم:۔ برسات میں بھی گدلا ہوتا نہیں یہ پانی
کہتے سے لوگ اس کو سمجھیں گے اک کہانی

پرویز:۔ دریا میں کتنے نو کے ہر سو رواں دواں ہیں
ان پر ہیں مال رکھے اُن پر سواریاں ہیں

سمن:۔ ہر سمت کشتیاں ہیں

احمدی بیگم:۔ آتا ہے لُطف جب ہو نارنگیوں کا موسم
پڑتے ہیں عکس اُن کے پانی میں جھم جھما جھم
پانی میں جلوہ گُستر ہوتی ہے اک دھنک سی
ہر موج مضطرب سے اُٹھتی ہے اک لہک سی
اس جلوۂ حسیں کو آتے ہیں دیکھنے سب

پرویز:۔ آئیگا جب یہ موسم، آئینگے ہم یہاں سب

احمدی بیگم:۔ جنّت کے پھل سمجھ لو سلہٹ کے سنتروں کو

سمن:۔ کھاتے ہیں چاؤ سے ہم سلہٹ کے سنتروں کو

احمدی بیگم:۔ اب قافلہ رواں ہو .....

(ساز ...... وقفہ)

احمدی بیگم:۔ وہ دیکھو دریا کنارے، وہ ڈاک بنگلہ ہے۔
بساطِ سبز گویا سفید بگلا ہے

(بچے ہنستے ہیں)

سمن:۔ یہ کتنی دلکش دجنت نشاں عمارت ہے

پرویز:۔ یہ بائیں ہاتھ پہ کیسی ہیں کوٹھیاں باجی؟

احمدی بیگم:۔ کلکٹریٹ، عدالت ہے نوجداری کی
کچھ اور آگے ہے، اجلاس منصفِ اعلیٰ
بڑھے چلے آگے یوں ہی سلسلہ دفاتر کا

سمن:۔ یہ دائیں ہاتھ پہ پرویز کیا عمارت ہے؟

پرویز:۔ یہ مجھ سے پُوچھ کے حضرت کمال کرتی ہیں

(ہنستے ہیں)

احمدی بیگم:۔ جناب ڈپٹی کمشنر کا ہے یہ کاشانہ

پرویز:۔ نظرنواز، دل افروز ہے یہ کوٹھی بھی

سمن:۔ نہ ہے بہت ہی بڑی اور نہ ہے یہ چھوٹی بھی

احمدی بیگم:۔ ہمارے سامنے آیا، وہ چوک سلہٹ کا
یہیں سے چلتا ہے سب کاروبار سلہٹ کا

سمن:۔ بہار کیسی دکھاتے ہیں بید کے سامان
یہ حد ہے، بید کی ملتی ہے سائیکل بھی یہاں

احمدی بیگم:۔ خدا کے فضل سے سلہٹ میں کیا نہیں ہوتا
کہیں ہیں کھیت انناس کے بہار سے
کہیں ہیں چائے کے باغات سبزہ زار سے
کہیں دکھاتی ہیں، نارنگیاں پھبن اپنی
انہی سے رشک گلستاں ہے انجمن اپنی

پرویز:۔ سمنٹ ہم نے سنا ہے یہیں پہ بنتا ہے

احمدی بیگم:۔ یہیں پہ گیس یہیں تیل بھی نکلتا ہے
نہ جانے کتنے دفینے چھپے ہیں سلہٹ میں

سمن:۔ نہ جانے کتنے خزینے چھپے ہیں سلہٹ میں
احمدی بیگم:۔ ہزاروں صنعتیں ہر سو یہاں ابھرتی ہیں
(ساز ...... وقفہ)
احمدی بیگم:۔ دیکھو بچو! یہ ایم سی کالج ہے
پرویز:۔ کیا یہاں صرف ایک کالج ہے
احمدی بیگم:۔ اور بھی جانے کتنے کالج ہیں
پر یہ کالج سبھوں میں افضل ہے
سمن:۔ ہے کوئی عورتوں کا کالج بھی
احمدی بیگم:۔ وہ بھی موجود ہے سمن بی بی۔
جامعہ ملیہ، وہاں دیکھو
اک مدرسہ ہے، تم جہاں دیکھو
اُس طرف دیکھو وہ کتب خانہ
عقل و دانش، ادب کا کاشانہ
احمدی بیگم:۔ یہ خزانہ ہے علم و حکمت کا
سیم و زر کا نہ مال و دولت کا
پرویز:۔ اور کیا خوبیاں ہیں سلہٹ کی
احمدی بیگم:۔ واقعہ ہے کہ خاکِ سلہٹ میں
علم و فن کو سدا فروغ رہا
علم دینی ہو خواہ دُنیا وی
لوگ دونوں پہ جان دیتے ہیں
جتنی تعلیم کی لگن ہے یہاں
اتنی دیکھی ہے تم نے اور کہاں
اسلئے جتنے مدرسے ہیں یہاں
جتنے اسکول جتنے کالج ہیں
جتنے عالم ہیں جتنے فاضل ہیں
جتنے ماہر ہیں جتنے کامل ہیں
جتنے شاعر ہیں جتنے عابد ہیں
جتنے عابد ہیں جتنے زاہد ہیں
اتنے کیونکر ملیں گے اور کہیں
یہ عجب آسماں عجب ہے زمیں
سمن لوگ سلہٹ کے نیک ہی ہونگے

احمدی بیگم:۔ لوگ تصویر ہیں شرافت کی
خلق کی مہر کی، محبت کی
دین کے پیرو ہیں اہلِ ایماں ہیں
قابلِ فخر یہ مسلماں ہیں
یہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے ہیں
اپنے پیارے نبیؐ پہ مرتے ہیں
اُن کو اُلفت ہے سب بزرگوں سے
معتقد ہیں جلال بابا کے
سمن و پرویز بیک وقت:۔ کس قدر اچھے لوگ ہیں باجی
احمدی بیگم:۔ اب ذرا آؤ اس طرف بچو!
یہ ہے بزمِ ترقیٔ اُردو
چاند کا روپ پھول کی خوشبو
یہ ادارہ بہت پرانا ہے
یہ حقیقت بھرا فسانہ ہے
لوگ سلہٹ کے چاہتے ہیں اسے
یہ بھی زلفِ وطن کی ہے خوشبو
جیسی بنگلہ ہے ویسی ہی اُردو
ان کو اُردو سے پیار ایسا ہے
ہم کو بنگلہ سے پریم جیسا ہے
سمن:۔ سامنے کونسی عمارت ہے؟
احمدی بیگم:۔ یہ ہے سلہٹ کا ہسپتال سمن
پرویز:۔ کس قدر شاندار ہے باجی
اور وہ کونسی عمارت ہے؟
احمدی بیگم:۔ یہ اسی کا ہے ہوسٹل بچو!
سمن:۔ کتنا اچھا ہے خوبصورت ہے
پرویز:۔ فنِ تعمیر کی کرامت ہے
احمدی بیگم:۔ روز اس کو عروج ہوتا ہے
ایک رحمت ہے یہ شفاخانہ
ہے مریضوں کی جنتِ ارضی
سمن:۔ اور آگے چلیں، بڑھیں، باجی
(ساز ...... وقفہ)

احمدی بیگم:۔ وہ سامنے ہے خلد کمال جمال کی
وہ بارگاہ حضرت شاہ جلالؒ کی
پرویز:۔ باجی یہ کون حضرت شاہ جلالؒ تھے
سمن:۔ سلہٹ میں کیسے آئے تھے باہر سے اس جگہ
احمدی بیگم:۔ دلکش بہت ہے آپ کی روداد زندگی
اونچا کیا ہے آپ نے معیار بندگی
سمن:۔ باجی ہمیں بھی ان کی حکایت سنائیے
پرویز:۔ جو کچھ سنا ہے آپ نے ہم کو بتائیے
(ہنستے ہیں)
احمدی بیگم:۔ وہ سرزمین ترک سے آئے تھے اس طرف
صوفی تھے وہ، بزرگ تھے وہ، جاں فروش تھے
دل کے غنی تھے، صاحب ادراک و ہوش تھے
سلہٹ میں جب وہ آئے تو ظلمت کا دور تھا
چھایا تھا کفر ہر سو زمانہ وہ اور تھا
راجہ گوبند دشمن اسلام تھا یہاں
وہ مسلموں کو جھوٹ بھی دیتا نہ تھا اماں
اس پر جلال آگیا حضرت جلالؒ کو ـــ
موقوف کر کے پھر وہ جواب سوال کو
اعلان جنگ کر دیا کفار کے خلاف
اہل فساد، منکر غفار کے خلاف
وہ رن پڑا کہ کفر کا چہرہ بگڑ گیا
قدرت نے اپنا رنگ کرامی دکھا دیا
حضرت کے ساتھیوں نے شجاعت کی داد دی
اپنے خلوص، اپنی ارادت کی داد دی۔
آخر بلند ہو گیا اسلام کا علم ـــ
آئے یہاں حضور کے اس شان سے قدم
پھر ایک دن عنان حکومت کو توڑ کر
جا بیٹھے اعتکاف میں دنیا کو چھوڑ کر
(وقفہ)

احمدی بیگم:۔ یاد خدا میں تھے کہ قضا ان کو لے گئی
پرویز:۔ پر جوش کس قدر ہے یہ روداد زندگی
سمن:۔ اس داستان پاک کے جادو میں کھو گئی
احمدی بیگم:۔ اب آؤ ہم زیارت درگاہ بھی کریں
پہلے مزار پاک پہ ہم فاتحہ پڑھیں
(وقفہ)
پرویز:۔ تالاب کے قریب ہے لوگوں کی بھیڑ کیوں؟
سمن:۔ تالاب میں دکھاتی ہیں کیا کھیل مچھلیاں
احمدی بیگم:۔ سچ مچ یہاں کی طرفہ تماشا ہیں مچھلیاں
یہ یادگار حضرت شاہ جلالؒ ہیں
ان کا یہاں کے لوگوں پہ کھانا حرام ہے
مرنے پہ ان کی ہوتی ہے تدفین شان سے
دانے ذرا سے پھینک کے پھر دیکھ لو مزا
سمن:۔ دانے میں پھینکتی ہوں بڑا لطف آئیگا
پرویز:۔ یہ مچھلیوں کی بھیڑ کہ فوج عظیم ہے!
سمن:۔ پانی میں کس قدر ہے تلاطم مچا ہوا۔
پرویز:۔ ان مچھلیوں سے خوف سا لگتا ہے اے سمن
(وقفہ)
احمدی بیگم:۔ بچو اب آؤ، ساتھ میرے اس طرف چلو
سمن:۔ باجی یہاں ہیں کتنی دکانیں سجی ہوئی
پرویز:۔ لیکن سجی ہوئی ہیں فقط موم بتیاں
احمدی بیگم:۔ آتا ہے جو بھی روضۂ شاہ جلالؒ پہ
روشن ضرور کرتا ہے کچھ موم بتیاں
جلتے ہیں یہ چراغ عقیدت کے رات دن
پرویز:۔ وہ کیا کھڑے ہیں لوگ پیالے لئے ہوئے
احمدی بیگم ہندو ہیں اصل میں وہ گوالے ہیں ذات کے
لیکن جلالؒ بابا کے ہیں وہ بھی معتقد
گھی لاتے ہیں پیالوں میں درگاہ کے لئے
سایہ ہو تاکہ ان کے بھی سر پہ حضور کا

سمن :۔ یہ پھر کبوتروں کے پر بے ناچنے لگے

پرویز :۔ سرعت سے کتنی چاروں طرف بھاگنے لگے

احمدی بیگم :۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ دانوں کی بوریاں

ہو جائیں گے یہ سارے کبوتر جمع وہاں

سمن :۔ لو اک جگہ پہ کتنے کبوتر اُتر گئے

پرویز :۔ جیسے کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بھر گئے

ہر سو وہی فضا میں غٹر گوں کا شور ہے

سمن :۔ ہر سو وہی فضا میں غٹر گوں کا شور ہے

(وقفہ)

احمدی بیگم :۔ یوں لاکھ زور شوق سے دانوں کو کھائیں یہ

لیکن مجال کیا ہے کہ گنبد پہ جائیں یہ

اُن کو بھی احترام ہے شاہ جلالؒ کا

پرویز :۔ لیکن اُدھر بھیڑ ہے لوگوں کی کس لئے

احمدی بیگم :۔ شاید کوئی فقیر ہو اس بارگاہ کا

سمن :۔ لیکن گا رہا ہے بڑے سوز و ساز سے

احمدی بیگم :۔ بچو! اب آؤ ہم بھی سنیں اُسکے گیت کو

سلہٹ کی سیر سمجھو کہ اب ختم ہو گئی

بقیہ :۔ مشرقی پاکستان کے چند لوک گیت :۔

(بسلسلہ صفحہ ۱۶۲)

پھولوں کے تیر کھا کر کیسے وہ جی رہا ہے

شمعیں ہزاروں، لاکھوں تاروں کی جل رہی ہیں

حوریں فلک کی پیہم آنکھوں کو مل رہی ہیں ۔

کتنی ہلالِ نو کی بے تاب ہو رہی ہے

ہر موج مضطرب سے سیماب ہو رہی ہے

یہ چل رہی ہے لیکن انجان ہے کنارا

افسر ماہ پوری

مشرقی پاکستان ——— دریا بہ دریا

اڑتی ہوئی ناؤ دیکھتا ہوں

دریا کا بہاؤ دیکھتا ہوں

ناؤ اور بہاؤ مشرقی پاکستان کی زندگی کے دو ایسے روپ ہیں، جن سے اس سرزمین کی زرخیزی و شادابی نکھرتی اور اس زمین کے رہنے والوں کی توانائی و پامردی ابھرتی ہے مشرقی پاکستان کے لمبے چوڑے اور گہرے دریا یہاں کے بسنے والوں کے دلوں میں کشادگی نظروں میں گہرائی اور اخلاق میں گیرائی جنم دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔ دریا مشرقی پاکستان کی زندگی میں رواں، دواں ہیں اور دریاؤں پر یہاں کی زندگی موجیں مارتی ہے۔ پانی اور انسانی زندگی میں جتنا قریبی رشتہ یہاں نظر آتا ہے، اتنا شاید چولی دامن میں بھی نہیں۔

جس طرح انسانی جسم میں رگ پٹھے پھیلے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ جسم کا ہر حصہ طاقت حاصل کرتا ہے، اسی طرح مشرقی پاکستان کے تمام حصوں میں دریاؤں اور ان کی چھوٹی، بڑی شاخوں کا جال بچھا ہوا ہے، جس سے اس صوبے کے تمام علاقوں میں ان دریاؤں کا پانی خون بن کر دوڑتا، اسے سبزی اور شادابی سے مالا مال کرتا اور قدرتی ساز و سامان کے بے حساب ذخیرے مہیا کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہاں زندگی کی گاڑی تیل کے بجائے پانی سے چلتی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کا شاید ہی کوئی حصہ مشرقی پاکستان کا مقابلہ کر سکے۔

دریا مشرقی پاکستان کی سبزی و شادابی ہی کا سبب نہیں بلکہ آمد و رفت کے تمام وسائل بھی ہیں۔ نہروں کی گہما گہمی اور دیہاتوں کا سکون ان ہی آبی راستوں کی وجہ سے قائم ہے۔ ڈینگی، نوکا، شمپان، لانچ اور اسٹیمر صوبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانی کے راستوں پر دوڑتے ہیں، مسافروں کو ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچاتے ہیں۔ مال و اسباب کو ایک منڈی سے دوسری منڈی تک ڈھوتے اور سکھ کے سندیسے اور دکھ کی خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جاتے ہیں۔ یوں تو مشرقی پاکستان میں ریل گاڑیاں بھی چلتی اور ہوائی جہاز بھی اڑتے ہیں مگر ان آبی سواریوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

مشرقی پاکستان کے دریا عظیم بھی ہیں اور ان گنت بھی مشکل یہ ہے کہ اس کہانی میں کہاں کا بیان ہو اور کسے چھوڑ دیا جائے مشرقی پاکستان کے دریاؤں کا تذکرہ خود مشرقی پاکستان کی حکایت ہے اور اتنی دلچسپ کہ ایک بار چھڑے تو دریا کا بہاؤ بن جائے۔ بہر حال مشرقی پاکستان کے جو اہم دریا ہیں، ان میں برہم پتر، میگھنا، پدما، تستا، اترائی، مدھومانی، گومتی اور کرنا فلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دریائے برہم پتر مشرقی پاکستان میں اتری پور کی طرف سے داخل ہوتا ہے اور بیچوں بیچ بہتا ہوا دکھن کی طرف بڑھتا ہے۔ اور خلیج بنگال میں گر جاتا ہے اس بڑے دریا کا نچلا حصہ جمونا کے نام سے عوام میں مشہور ہے۔ اس دریا کے کنارے مشرقی پاکستان میں جو سب سے بڑا شہر ہے، وہ میمن سنگھ ہے۔ ضلع میمن سنگھ پٹ سن کی کاشت کے لئے بہت مشہور ہے اور سنہرے ریشوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ جہاں برہم پتر کے کنارے سنہرے ریشوں کی چمک دمک سے پر رونق رہتے ہیں اور ملک کی دولت میں دن دونے اضافہ

بستے رہتے ہیں، وہاں ان پر نہ جانے حسن و عشق کے کتنے گیت اور افسانے لکھے گئے اور آئندہ لکھے جائیں گے۔

دریائے میگھنا نے دو دریاؤں کے ملاپ سے جنم لیا ہے، جس میں دریائے سرما سے ہر شخص واقف ہے۔ یہ دونوں دریا آسام کی پہاڑیوں سے پھوٹتے ہیں اور مشرقی پاکستان میں داخل ہو کر ایک ہو جانے پر میگھنا کے نام سے شہرت پاتے ہیں۔ یہ میگھنا چاندپور کے قریب دریائے پدما سے مل جاتا ہے۔ چاندپور بھی پٹ سن کا بہت بڑا مرکز ہے اور مشرقی پاکستان کی منڈیوں میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ میگھنا کی سطح پر بادبانی کشتیوں کا ہجوم اور رات کے سناٹے میں ملاحوں کے گیت عجب دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔

دریائے پدما ہمالیہ کی چوٹی سے ابلتا ہے اور یوپی، بہار اور مغربی بنگال کے میدانوں کو سیراب کرتا ہوا مشرقی پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور گوالندو کے پاس برہم پتر سے گلے مل جاتا ہے یہ دریا یوپی بہار کی طرف گنگا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر مشرقی پاکستان میں پہنچ کر یہ پدما کا روپ دھار لیتا ہے۔ پدما مشرقی پاکستان کے دریاؤں میں ایک خاص عظمت رکھتا ہے اور اس کے ساحل پر نہ جانے حسن و عشق کی کتنی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ یہ دریا نہ جانے کتنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بن چکا ہے۔ پدما میں مشرقی پاکستان کا جمال بھی ہے اور جلال بھی۔

دریائے تستا اور دریائے ترای دونوں ہمالیہ پہاڑ سے نکلتے ہیں۔ تستا ترکی کی طرف مشرقی پاکستان میں داخل ہو کر برہم پتر سے ملتا ہے اور ترای جمنا میں گرتا ہے جو برہم پتر کا نچلا حصہ ہے۔

دریائے کرنافلی اپنی موجودہ شہرت و اہمیت کے لحاظ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو گھنٹوں میں کرنا پھولی کو حاصل ہے۔ چاٹگام کی پہاڑیوں سے دو دریا نکلتے ہیں۔ سانجوق اور مایانی یہ دونوں دریا ساتھ مل کر چلتے ہیں اور کرنافلی کے نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ کرنافلی چاٹگام کے قریب خلیج بنگال میں گر جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے پٹ سن کا سب سے مشہور مرکز۔ نرائن گنج میں دریا کے کنارے پر واقع ہے، جس سے بوڑھی گنگا چھوٹی ہے۔ ڈھاکا شہر اسی بوڑھی گنگا کے کنارے آباد ہے۔ یہ گنگا گو بہت بوڑھی ہے اور زمانے کے سرد و گرم نہ معلوم کب سے جھیلتی آرہی ہے، لیکن اس کی رونق کی جوانی کبھی ماند نہ پڑی اور پاکستان قائم ہونے کے بعد تو اس میں سچ مچ چار چاند لگ گئے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کی رونق اور جوان ہوتی جائے گی۔

دریا اگر اپنی حد میں ہیں تو رحمت ہیں، ورنہ زحمت۔ مشرقی پاکستان ہمیشہ اپنے دریاؤں کے غضب کا شکار بھی رہا ہے اور ان کے لطف و کرم کا مرکز بھی۔ دریاؤں کا غضب جب سیلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر سخت جانی و مالی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے دریاؤں کی بدمزاجی دور کرنے کے لئے پاکستان کے قیام کے بعد ہی عملی کوشش کی جانے لگی۔ لیکن موجودہ انقلابی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کوشش نے بڑے بڑے منصوبوں کی صورت اختیار کر لی ہے، جو صوبے کے مختلف حصوں میں زیر تکمیل ہیں اور ان پر روپیہ نہایت فیاضی سے خرچ کیا جا رہا ہے۔

کرنافلی کے پانی سے بجلی پیدا کرنے کا جو منصوبہ عرصے سے زیر تعمیل تھا اب مکمل ہو چکا ہے اور کرنافلی کے وہ دھارے جو گھروں کو اپنے تھپیڑوں سے تباہ کر دیا کرتے تھے اب گھروں کو روشن کریں گے اور ان کی روشنی سے محل اور کٹیا یکساں جگمگا اٹھیں گے

اس طرح مشرقی پاکستان کے شمالی اضلاع میں گنگا۔ کوباڈک نامی منصوبہ تکمیل پا رہا ہے۔ سیلاب و طغیانی کی روک تھام کرنے کے لئے بھی بہت سارے منصوبے عمل میں آچکے ہیں اور اب وہ دن دور نہیں جب مشرقی پاکستان کے دریا اصل معنوں میں رحمت ثابت ہوں گے اور ان کی شائستہ موجوں پر یہاں کا رواں "دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم" رواں دواں ہوگا۔

افسر ماہ پوری

مشرقی پاکستان کے چند لوک گیت

مشرقی پاکستان شعر و نغمہ اور سبزہ و دریا کی سرزمین ہے۔ دریاؤں کی روانی اور قدرتی مناظر کی فراوانی دل میں شاعرانہ جذبات ابھارتی اور انہیں نغموں اور گیتوں کا روپ دیتی ہے۔ اسی لئے مشرقی پاکستان کے لوگ شعر و نغمہ سے ایک فطری مناسبت اور راگ رنگ سے ایک قدرتی لگاؤ رکھتے ہیں یہاں کی آب و ہوا کی یہ جادوگری دیہاتوں میں اور نکھرتی ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں جتنے موثر اور رنگارنگ لوک گیت پائے جاتے ہیں ملتے کہیں اور شاید ہی ملیں۔ ان لوک گیتوں کی یہ خصوصیت قابل لحاظ ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ واضح کرتے ہیں اور اسی بنا پر وہ الگ الگ نام سے مشہور ہیں۔ ان لوک گیتوں میں بھاٹیالی، بادل، بھوٹیا، زاری، ساری معرفتی اور مرشدی بہت ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں۔ آج کی محبت میں مرشدی، بھوٹیا اور دیہی نعت کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ مرشدی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے درویشوں اور اللہ والوں کا نغمہ ہے وہ دیس نقیر اسے اک تارے، دوتارے یا سارنگی پر گاؤں گاؤں گاتے پھرتے ہیں اور گاؤں والوں کے دل گرماتے اور تڑپاتے ہیں۔ مرشدی میں عشق خدا، حب رسول اور عقیدت صوفیا کا بڑا موثر اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور عقبیٰ کی ابدیت مرشدی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چونکہ یہ گیت صحیح معنوں میں مشرقی پاکستان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں اس لئے عام طور پر ان میں دیہی تمثیل ملینگی، جو در بانو کا، مانجھی، اور طوفان وغیرہ سے عبارت ہیں۔ بہرحال، مرشدی کا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

اے مرے دیس کے غمگسار، ذرا
میری کشتی چلا دے بہر خدا
سے دل رکا، ہوا سے یہ کشتی
آندھیوں میں ادھر ادھر بھٹکتی۔
ترے دریا میں ڈال کر نوکا۔
کھول کر آسمان تک پردا
تھامے پتوار کو میں بیٹھا ہوں
تیری جانب ہمیشہ تکتا ہوں

آج کیوں یہ اداس چہرہ ہے
خوف سے دل مرا لرزتا ہے
جانے مجھ سے وہ کیا قصور ہوا
میرے محبوب کچھ تو بول، ذرا
کیا ہے میری خطا، قصور مرا
مجھ کو دریا میں بات چھوڑ گیا
مجھ پہ اک بار تو کرم کر دے
دیکھ لے اس طرف محبت سے

جسیم الدین مشرقی پاکستان کے ممتاز شاعروں میں ہیں۔ ان کی دیہی شاعری بین الاقوامی شہرت و مقبولیت رکھتی ہے۔ ان کا مرشدی گیت بھی ملاحظہ ہو۔

نہ معلوم تھا یہ، مرے مہرباں
کہ تیری محبت میں جائے گی کی جاں

ندا تیری الفت میں جو مبتلا
لٹ راستہ دین کا مل گیا
مری زندگی روتے روتے کٹی
سمندر گئی، تسرید نسرید گئی
اس وہ مقصود کی آرزو ——
لئے پھرتی ہے، جا بجا کو بکو
سمندر کا پانی کچھ ایسا چڑھا
جو آنچل میں رونا تھا وہ بھی گیا
قلم کرکے انگلی، بنا یا قلم
کی پھر اشکوں سے روشنائی بہم
لکھا نامہ شوق، دل چیر کر
روانہ کیا اپنے "چندا" کے گھر

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں میں بھوٹیا کو خاص ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ یہ گیت عام طور پر [illegible] بانکنے والے گاتے ہیں۔ جب سفر طویل ہوتا ہے تو وہ اس گیت سے دل بہلاتے ہیں۔ کبھی کبھی ملاح بھی بھوٹیا گا گا کر اپنے آبی سفر کی صعوبتوں کو بہلاتے ہیں۔ بھوٹیا گانے کا رواج تو سفر ہی میں ہے، مگر جب بادل امڈے آرہے ہوں اور پنڈالوں میں کسانوں کی بھیڑ جمع ہوتی جارہی ہو تو کوئی خوش گلو بھوٹیا کی تان چھیڑ دیتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔

مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو
آئی ہوں گھاٹ پہ میں دریا کو پار کرکے گو جانتی نہیں ہوں
مانجھی کا نام کیا ہے کیونکر بتاؤں کیسے اسے پکاروں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو
گھڑیال کالا کالا پانی سے خود نکلا، دل کس قدر ہے مضطر
کس وقت وہ بچھڑے، یکبارگی جھکے، لگتا ہے کس قدر دور
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی، آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو
سائے کی جستجو میں برگد کے نیچے آئی، لیکن وہ پیڑ بوڑھا
دیتا نہیں ہے سایہ فعلوں کا اپنے آخر بدلہ یہیں پہ پایا
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے پار مجھ کو۔

رحیم الدین گاؤں اور گاؤں والوں کے شاعر ہیں۔ مشرقی پاکستان کا کوئی شاعر اس میدان میں ان کا حریف نہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے صرف گاؤں والوں کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی ہی نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کو ایک مخصوص زبان بھی دی ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ خدا کے بڑے پرستار اور رسولِ اکرم کے بڑے فدائی ہیں۔ رحیم الدین نے یہ نعت گاؤں والوں کے لئے لکھی ہے۔

مدینے پہ کیسا ہے یہ نور چھایا
رسولِ خدا بن کے یہ کون آیا
بتائے کوئی، توڑ کر آسماں سے
یہ ماہِ مبین کون دنیا میں لایا

گلے میں ہے تسبیح کی ایک مالا
میرا کملی والا، میرا کملی والا
خدا را سے لائے کوئی بلا کر
میرے خانہ سینہ و دل کے اندر
نہ دیکھا ہے ایسا نہ ایسا سنا ہے
کہ انساں نے انساں کا غم لے لیا ہے
کہاں ہے کوئی ایسا ہمدرد انساں
ہوں حیرت زدہ میں بھی دنیا بھی حیراں

افسر ماہ پوری

جسیم الدین ۔ مشرقی پاکستان کا شاعر فطرت

(ذیل کا مضمون ایک انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے۔ جسیم الدین موضع گوبند پور، ضلع فرید پور (مشرقی پاکستان) کا رہنے والا ہے۔ فی الحال محکمۂ نشریات، حکومت مشرقی پاکستان سے متعلق ہے۔ اس کی معرکہ آرا مثنوی "ناکشی کانتھر ماٹھ" کا انگریزی ترجمہ " " کے زیر عنوان ای ایم ملفورڈ کے قلم سے ہوا ہے۔ ترجمہ آزاد ہے مگر بہت رفتہ و شستہ۔ جسیم الدین صرف بنگال ہی میں مشہور نہیں۔ وہ پاکستان و ہندوستان کے علاوہ مغربی دنیا سے بھی کافی متعارف ہو چکا ہے۔ ماہ پوری۔)

جسیم الدین دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا شاعر ہے۔ اس کا نغمہ ایک آوارہ گرد کی بانسری کا نغمہ ہے، جس میں کھوکھلی تانیں نہیں ہیں۔ اس کے گیتوں میں جو صورتیں جھلکتی ہیں، وہ بہت مانوس اور جانی پہچانی ہیں۔ اس کے نغموں میں جو پرچھائیاں رینگتی ہیں، وہ وہی پرچھائیاں ہیں جو یہاں کے پُرانے پراتم پیڑوں کی گھنیری چھاؤں میں آرام کرتی ہوئی دیکھی جاتی ہیں۔ یہ ان انسانی زندگیوں کی پرچھائیاں ہیں، جو پھونس کی چھتوں کے نیچے پروان چڑھتی ہیں۔ جسیم الدین کی قلمرو میں کوئی چیز نئی، اچھوتی اور حیران کن نہیں ہے۔ جو لوگ گاؤں اور گاؤں کی زندگی کو بھول چکے ہیں، البتہ اُن کے لئے جسیم الدین ایک انکشاف ہے، ایک دریافت ہے۔ ان کے لئے وہ ایک ایسا ڈاکیہ ہے جس کے تھیلے ایسے خطوط سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں بہت پہلے پہنچنا تھا۔ زمین کی زبان مجھ سے کچھ کہتی ہے۔ میں اس کے دل کی دھڑکنیں سُن سکتا ہوں (ترجمہ ملفورڈ)۔ یہ جملہ شاعر کے مقصد و مسلک کا بہترین ترجمان ہے۔

دھانوں کی پیٹائی، گنگناتے ہوئے نکلے، نمود سحر کے وقت کھیتوں پر شبنم کے ننھے ننھے قطرے، دیواروں اور بانسوں کی ڈالیوں میں سرسراتی اور کیلوں کے جھنڈ میں گنگناتی ہوئی ہوائیں، کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، مویشیوں کو ہانکتے ہوئے چرواہے، سطح دریا پر رقص کرتی ہوئی بادبانی کشتیاں، ہنسوں کی طمانیت و تمنا میں بھری ہوئی چہکار، پنگھٹ پر حسین دوشیزاؤں کی چہلیں، کنول کو توڑنے کے لئے بچوں کی بھاگ دوڑ، ہنستے ہوئے چہروں پر پانی کی چھینٹیں، لہراتی ہوئی بیلیں، جھومتی ہوئی شاخیں، پتیوں پر بوندوں کا جل ترنگ، درختوں کی ہری ہری آستینوں سے چھنتی ہوئی آفتاب کی شعاعیں، پتیوں کے گلوں میں گھٹی ہوئی آہیں، میکے سے بچھڑی ہوئی نئی نویلی دلہنوں کی حسرتیں، اپنے بچے کے بستر مرگ کے قریب سناٹے میں بیٹھی ہوئی کسی بے بس ماں کی دلدوز فریادیں، سبز و شاداب فصل کے افتتاحی ترانے اور پکی ہوئی کھیتی کے اختتامی گیت، یہ ہیں وہ چیزیں جو جسیم الدین کے نغموں اور گیتوں میں رنگ، موسیقی اور رس بھرتی ہیں۔

مواد

وہ کونسا مواد ہے جس کے گرد جسیم الدین اپنے گیتوں کے لئے رنگ و روغن فراہم کرتا ہے؟ گاؤں والوں کی سیدھی سادی، فطری زندگیاں ہیں۔ ان کی محبت اور نفرت ہے ان کے دل کی خفیہ دھڑکنیں ہیں اور وہ ماحول ہے، جس سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔

گاؤں والوں کا شاعر

جسیم الدین گاؤں اور گاؤں والوں کا شاعر ہے۔ وہ بنگال کا واحد شاعر ہے جس کی ابدی زندگی گاؤں کے سکون و سرور میں جذب ہے۔ اس کے

بعض دیہاتی محاورے دماغ کے ان لطیف اور ناقابلِ بیان کیفیات اُجاگر کرنے میں عجیب و غریب صلاحیت رکھتے ہیں جن سے شستہ زبان عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اسے چند مخصوص سانچے اور پیمانے بہت پسند ہیں۔ وہ چند استعاروں سے والہانہ محبت کرتا ہے ہم اس کی تانوں کو شوق سے سنتے ہیں اور ان لفظوں سے اچھی طرح واقف ہیں، جو ان کو جنم دیتے ہیں۔

بعض اوقات صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورے قصداً چُنے گئے ہیں۔ حلاوت و صدوبت توازن و اصول کی رہینِ منت ہے۔ کیا یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری کبھی کبھی اس کے منشا سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے؟ زیادہ حسین معلوم ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ خصوصیت اس کی شاعری کو اس افسوں انگیز روانی و آسانی سے محروم کر دیتی ہے، جس کو ہم "کلاسکل" کہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کی شاعری الفاظ کے نیچے دب کر بالکل بے جان ہو جاتی ہے۔ البتہ اس کی شاعری کا عامیانہ مواد ضرورت سے زیادہ رومانی ہے۔ یہ رومانیت اس کی شاعری سے ہر جگہ چھنتی نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری ایک خاص سطح سے زیادہ بلند نہ ہو سکی۔ لیکن وہ اپنے دائرۂ سخن میں ممتاز ترین فنکار ہے اور اس کا کوئی حریف مشکل سے نکلے گا۔ وہ ملیا منی ہے جسے اب تک نہ کوئی مات دے سکا اور نہ بے دخل کر سکا۔ وہ اپنی جگہ بہت بھاری اور اٹل ہے۔ اس کے زمزمے متعدد مفہوم سے رنگین ہوتے ہیں۔

جسیم الدین کی "زرکار لحاف کا میدان"[1] اگر اس کے دوسرے فن پاروں سے علیحدہ کر کے پڑھی جائے تو بھی بے لوث تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ یہ ایک "رزمیہ" ہے، ایک داستان ہے، ایک گمنام کسان کی، پُر خلوص، دلآویز اور جدید۔

"زرکار لحاف" کی کہانی نہایت سادہ ہے۔ ایک روپی، ایک بچارن ۔۔۔ یہ دو دیہاتی معصوم روحیں پڑوس کے گاؤں سے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں اسیر ہو جاتی ہیں۔ پہلے تو چھپے چوری ملاقاتیں ہوتی ہیں پھر عشق کی شورش بڑھتی ہے۔ راز افشا ہو جاتا ہے اور گاؤں میں ان کے متعلق عجیب و غریب چرچے ہونے لگتے ہیں۔ آخر ایک تجربہ کار و جہاں دیدہ مشاطگی معاملہ کو بھانپ جاتا ہے اور اپنی حکمت عملی سے دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیتا ہے۔ سب کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ نامرادیاں شادکامیوں میں بدل جاتی ہیں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

مگر وائے حسرت! شادی کے ساتھ اس مشاطگی سے ایک بڑا مشاطگی ان کے گلوں میں محرومیوں کا ایک پھندا بھی چپکے سے ڈال دیتا ہے۔ انہیں پھول ملے مگر کانٹوں بھرے ہوئے۔ ایک لمحہ کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی بہار آفریں صحبت و معیت میں زندگی سے بہت خوش ہیں، بہت مسرور ہیں۔ دفعتاً ایک ناگہانی حادثہ ان کی مسرت و جوانی بھری زندگی کے ڈرامہ پر پردہ گرا دیتا ہے۔ روپی کو ایک خوں ریز بلوے میں حصہ لینا پڑتا ہے اور اسے ملک بدر ہونا پڑتا ہے۔ بچارن اپنی کٹیا ہی میں رہتی ہے اور اپنے بریدہ وجود پہ چپکے چپکے دن رات آنسو بہاتی ہے۔ وہ "زرکار لحاف" جس پر وہ اپنے ایامِ مسرت کے حسین مناظر کاڑھا کرتی تھی، بالآخر ان کی پہلو بہ پہلو سوئی ہوئی لاشوں پر چادر تن دیتا ہے۔

یہ ایک الم ناک طویل مختصر افسانہ ہے ۔۔۔ ایک واحد افسانہ جو بنگال کے کاشتکاروں اور ان کی مٹیالی اور دھندلی زندگی کے پس منظر میں اسی زبان میں لکھا گیا ہے۔

اقتباسات

جسیم الدین کی دیہاتی عکاسی کا کمال واضح کرنے کے لئے بعض اقتباسات ناگزیر ہیں۔ اس کھیت کے منظر کو لیجئے جو موسمِ گرما کے بے ابر و باراں آسمان کے نیچے، دہکتے اور سلگتے ہوئے آسمان کے نیچے، لہرا رہا ہے۔

"چوب شکن سورج، زمیں شگاف سورج،
آگ کا کھیل کھیل رہا ہے اور گرد و غبار
یوں اُڑتا ہے،
جیسے بگولوں میں دھواں، جس کو
کبھی سکون نہیں ہوتا (ترجمہ ملفورڈ)

گاؤں کا زمانہ ساز مشاطگی، شاعر کے سامنے اپنی مخصوص ہیئت

[1] مثنوی کا عنوان ہے "نکشی کانتھر ماٹھ" جس کا ترجمہ ملفورڈ نے کیا ہے۔

میں نظر آتا ہے اور شاعر الفاظ ذیل میں اس کا من وعن خاکہ بتا دیتا ہے۔

"جب وہ ترنگ میں گنگناتے تھرکتے چلتا ہے تو اس کی ریشمی داڑھی اس طرح لہراتی ہے

جیسے کسی پرانے، سال خوردہ برگد کے مہین مہین تنے

دوش صبا پر مچلتے اور

فرط مسرت سے جھولتے ہیں" (ترجمہ ملفوظ)

اگرچہ جسیم الدین اپنے موضوع کے تئیں فطری اور عمیق شیفتگی رکھتا ہے لیکن اس کا دائرۂ انتخاب بہت محدود ہے۔ اس کے ذوق کی خلش اسے دیہاتی زندگی اور دہقانی ماحول کی منظر کشی پر بار بار اکساتی ہے۔ وہ دہقانی دنیا ہی کے مظاہر و مناظر سے اپنے تخیلات کے لئے آب و رنگ کھینچتا ہے۔ اس کا تبسم، اس کے آنسو، اس کا سوز، اس کا ساز، گاؤں ہی کی روزمرہ زندگی کے اجزاء میں۔ ذرا آپ بھی سنئے:۔

"سرسوں اپنی شگفتگی کو

پکتی ہوئی کھیتیوں کو تھپک تھپک کر سلا دینے والی نسیم سحر کی آغوش میں ڈال دیتے ہیں۔

نسیم سحر اس کی چھوٹی بہن مٹر کی کلی کے ننھے سے چہرے پر بوسے دیتی اور

اور اس سے سبز پتیوں کی نقاب الٹ دیتی ہے:

"پیڑوں کے نیچے

کرلوں کے چھوٹے چھوٹے پھول،

حلقہ در حلقہ

اوپر ہوا میں لہراتی ہوئی ڈالیوں تک

رقص کرتے ہیں"

"شاید آسمان کی اس پنہائی میں، جو تیرے دریچے سے روشن ہے،

ستارے

فردوس کے حسین غلمانوں کی طرح

زمین پر خوابوں کا نیلگوں غبار بکھیرتے ہیں"

اس کی مختصر نظموں کی سب سے نمایاں خصوصیت سودیشی پن ہے۔ ایسی نظموں کے لفظ لفظ میں سودیشی فضا بسی ہوئی ہے۔ ان میں مذہبی خیالات کی ایک رمق بھی نہیں۔ وہ بدیسی اثرات اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے یکسر پاک ہیں۔ "پھوپھو رماں بکرے"، "پروان پوکھر"۔ "رکھال راجو گی"، "رنگیلا ناؤ ماجھی" اور "کاٹا دھان بدریہ" اس کے "عدم احتیاج" کی بہترین مثالیں ہیں۔

آخرالذکر نظم لطافت و سلاست اور یاس انگیز صداقت و حقیقت کا شاہکار۔ جو لوگ "زمین" سے نزدیک ہیں وہی دھان کے کھیتوں کے مزاج کو محسوس کر سکتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ لطیف و نازک استعارات و تخیلات شاعر کے زاویۂ نظر کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جسیم الدین کے استعارات و تخیلات عمیق نہیں ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ گاؤں کے لوگ الہیاتی مسائل نہیں سوچ سکتے۔ وہ کسی گائے کے بدن پر کچھ لکیریں دیکھتا ہے تو کدو کے پتے سے تشبیہہ دیتا ہے استعارۃً ان کو کسی کسان کی بیوی کے پیکر کی پرچھائیں بتاتا ہے۔ اس کی شاعری اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے نہ تو مطلوبہ جوش اظہار رکھتی ہے۔ اور نہ تغزل کی دلکشی و دلآویزی۔ وہ مدت سے اس ٹھہرے ہوئے چشمہ میں ہیجان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں "مفلس، جاقو زما، اپاہج اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے لوگ، سطح سے اپنی ناکیں بلند کئے ہوئے ہانپ رہے ہیں"۔

جسیم الدین کے پورے کلام میں مظلوموں اور معتوبوں کے لئے ہمدردی و غمگساری کی دبی دبی موجیں رواں نظر آتی ہیں۔ ان کے لئے ایک قسم کی رفاقت جھلکتی ہے، جو اپنے آقا کی خاطر خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ ان کے لئے شیر و شہد مہیا کرتے ہیں اور خود ان کی پلیٹوں کے جھوٹوں پر جیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ جذبہ دھیما، اور بند بنسے اور موجوں کی روانی سست ہے جیسا کہ "زرکار لحاف" میں ہے۔

"رکھال راجو گی" میں کسان کو اپنا گاؤں ہمدوش فردوس معلوم ہوتا ہے۔

"بانسری کی تانیں دلوں کو لبھاتی اور دماغوں کو وجد میں لاتی ہیں۔

تلوار کی حکومت ایک دم توڑتی ہوئی قوم میں بھی

بے شمار جنگجو سورما پیدا کر دیتی ہے۔

غم انہیں بھی متلاطم کر دیتا ہے، جنہیں

لوگ چرواہا، بزدل اور غیر مہذب کہتے ہیں۔

وہ ہل

جو زمین کا سینہ چیرتا ہے،

کھوپڑیوں کو بھی پھاڑ سکتا ہے۔

ہم آندھیوں اور ہواؤں کے تھپیڑوں سے پنجے لڑاتے ہیں؛

ہم طوفان باراں سے لڑتے ہیں۔

ہم برسات سے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔

اور فصلیں کاٹتے ہیں۔

ہم تلوار کی حکومت کا یقینی خاتمہ دیکھنے کے لئے

ضرور زندہ رہیں گے "

میرے خیال میں مفلوک الحال ستم رسیدہ عوام کا رمزی بیان "چودھری دربکھو" کی ابتدائی سطروں میں نہایت حسن و خوبی سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کے اشعار سے آبادیوں کے ہجوم میں بھی ویرانی و حسرت صاف جھلکتی ہے۔

" چودھریوں کا رنبو ۔۔۔ اس کی داہنی طرف ایک سڑک ہے۔

اندر ابابیلوں اور چمگادڑوں نے گھونسلے بنالئے ہیں۔

بڑی چمگادڑ پرسکون اور مطمئن بیٹھی آرام کا مزہ لے رہی ہے۔

وہ وسیع دنیا سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی ہے، غافل ہے۔

وہ چمگادڑ کو بھی متوجہ نہ کر سکی۔

طاقت ور دیوتا "گدودا" کی مورت موجود ہے۔

برگد کے تنے دیوتا کے سر سے پھوٹ پڑے ہیں۔

پھر بھی دیوتا کی زبان گنگ ہی رہی۔

لکڑی کے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔

امتداد زمانہ کی عادی بہت سکستہ و ریختہ ہو گئی ہے۔

لیکن اس کی کسے پروا ہے؟

کسی زندہ مخلوق نے آج تک کبھی احتجاج نہیں کیا "

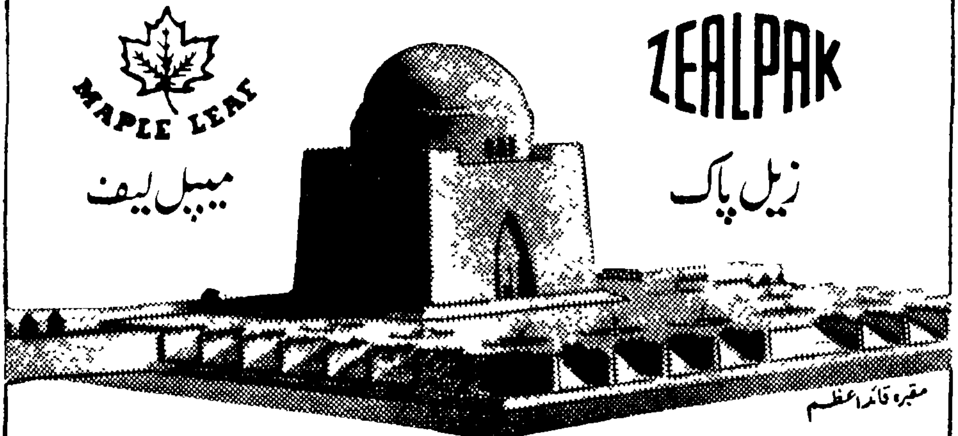
ان عبارتوں کی غائت اور ان پیچیدہ جملوں میں لاکھوں رنگیں کلبلاتی مخلوقات کی بے حس و بے مقصد زندگی کا نشان ملتا ہے ۔ بنگال کا گاؤں اب تک لکیر کا فقیر بنا سڑگل رہا ہے۔ اس پر باہر کی ہنگامہ خیز دنیا کے ولولوں سے کوئی اثر نہیں پڑا۔

" نوجوان گڈریے کے غم گونگے ہوتے ہیں، جن کو صرف بانسری ہی ظاہر کر سکتی ہے " (ترجمہ ملفورڈ)

ان گونگے غموں نے اس زمین کی بولی میں اپنا اظہار پا لیا ہے۔ یہ بولی اسی موضوع کے لئے مناسب و سازگار ہے۔ یہ غم جسیم الدین کی بانسری کے سروں میں زندہ ہیں۔ یہی بے حسی، گونگا پن اور خود فراموشی ہے، جس کے پس منظر میں شاعر کا قلم جولانیاں دکھاتا ہے۔ الغرض جسیم الدین ایک بانسری ہے، جس میں دہقانی بنگال اپنی موسیقی انڈیلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری اسقدر پیاری، گھریلو اور خانہ زاد معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام یہاں اور باہر یکساں دلچسپی سے پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

مستحکم عمارتیں

پی - آئی - ڈی - سی سیمنٹ سے ہی تیار ہوتی ہیں



مقبرہ قائداعظم

یہ اعلیٰ معیار کے سیمنٹ ہماری قومی اُمنگوں کو

حقیقت کا رُوپ دے رہے ہیں

زیل پاک سیمنٹ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے
قائداعظم کے مقبرہ کی تعمیر میں استعمال کے لئے
موزوں سمجھا گیا۔
بے مثال خوبیوں اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے ہی
ہوٹل انٹرکانٹینینٹل اور نیشنل بینک
آف پاکستان کی عظیم تعمیرات
کے لئے زیل پاک سیمنٹ استعمال
کیا جا رہا ہے۔
یہی نہیں ملک کے۔ ڈی - اے کی
اسکیموں کے تحت بننے والی
عمارتوں میں بھی یہی سیمنٹ
استعمال ہو رہا ہے۔

میپل لیف سیمنٹ بھی یکساں
خوبیوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
فن تعمیر کے ماہروں اور انجینیروں نے
پشاور یونیورسٹی۔
یونیورسٹی کیمپس لاہور
اور نئے دارالخلافہ اسلام آباد
کی تعمیر نیز واپڈا کے
دوسرے تعمیری منصوبوں
کے لئے
میپل لیف
سیمنٹ کا انتخاب
کیا ہے۔

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

PRESTIGE


ریحانی
خوشرنگ و خوش ذائقہ اور عام طاقت بخش
مشروب ہے
بیحد فرحت اور نشاط انگیز ہے
دلکی دھڑکن وحشت اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہی
قوت ہاضمہ کو حیرت انگیز طور پر بڑھاتا ہی بدنمیں
خون صالح پیدا کرتا ہی نقاہت زدہ مریضوں کو زور و
ناتوانوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے
ریحانی
خوشرنگ
و
خوش ذائقہ
مشروب
نظامی دواخانہ
کراچی
UNIVERSAL BLOCK

ڈینی فرڈ ہامس

"آبِ رواں کی سرزمین"

"قلمرِ بنگالہ بڑی وسیع ہے۔ اس کی پیداوار گوناگوں اور آبادی کثیر ہے۔ باشندے مسلمان ہیں اور لین دین کے بڑے کھرے ہیں۔ امیر لوگ جہاز بناتے ہیں جن سے وہ دوسری قوموں کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، کئی لوگ کاروبار کرتے ہیں اور بہت سے زراعت پیشہ ہیں۔ بعض صنعت و حرفت سے روزی کماتے ہیں۔"

یہ الفاظ آج بھی مشرقی پاکستان کے اس قدر حسبِ حال ہیں گویا یہ کل ہی لکھے گئے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس رپورٹ کا حصہ ہیں جو پانچ سو سال ہوئے ایک چینی سیاح نے شہنشاہ چین کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں مزید بیان کیا گیا ہے کہ زمین کس قدر زرخیز ہے۔ یہاں سال بھر میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ گیہوں، باجرہ، تل، دالیں، ادرک، رائی، پیاز، پٹ سن، بینگن اور دوسری طرح طرح کی سبزیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی قسم کے پھل بھی پیدا ہوتے ہیں جن میں کیلا بہت نمایاں ہے۔ تین چار قسم کی شرابیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ ناریل اور چاول کی شراب اور تاڑی اور گانجا۔

اس طرح یہ چینی سیاح مفید جانوروں اور پرندوں اور شکر کی ان مختلف قسموں کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس ملک میں تیار ہوتی ہیں۔ ایک کفایت شعار چینی کے لئے پیداوار اور چرند پرند کی یہ کثرت ایک ایسی بات تھی جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے الفاظ سے بنگال کی غیر معمولی کشش صاف جھلکتی ہے۔ اسے یہاں کے بےحد خوبصورت پارچات، ریشمی رومال، زربفت کی ٹوپیاں اور ایک ایک درخت کی چھال سے بنا ہوا سفید کاغذ جو ہرن کی کھال کی طرح گداز اور ملائم تھا، بہت پسند تھا۔

تب سے اب تک سالہا سال گزر جانے کے باوجود مشرقی بنگال کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، ایک طرف اس کی علیحدگی اور دوسری طرف جغرافیائی حالات نے اسے ایک عجیب سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے دریا آن میں کچھ اور آن میں کچھ ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ بڑی سست رفتاری سے چپ چاپ بہے جاتے ہیں اور کبھی طغیانی میں آکر نہایت تند و تیز وحشی سیلاب بن جاتے ہیں۔ ریت کے ٹیلے جو خشک لگنے کے باوجود دلدلی ہوتے ہیں۔ ہر قدم پر دھوکہ دیتے ہیں۔ زمین بڑی زرخیز چکنی مٹی پر مشتمل ہے۔ سمندر تک پہونچنے کے لئے بڑی بڑی آبی شاہراہوں کی بجائے بے شمار تنگنائیں ہیں۔ ان سب نے مِل جُل کر ملک کو ایک خاص وضع عطا کر دی ہے جس میں صدہا سال سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اگر مشرق کی طرف چاٹگام کے پہاڑی علاقے اور شمال میں سطح مرتفع بارند کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو باقی تمام ملک پر دریائے برہمپترا اور گنگا اور ان کے معاونوں کا پیچ در پیچ جال پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے میں خشکی بھی ہے اور تری بھی۔ اور لوگ جتنا خشکی سے تعلق رکھتے ہیں اتنا ہی

ترّی سے بھی تعلق رکھتے ہیں، اور ان دونوں کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ ملک کے ۹۰ فی صدی باشندوں کا پیشہ کاشتکاری ہے۔ وہ پٹ سن اُگاتے ہیں جس کی دوسرے ملکوں میں کھپت ہوتی ہے۔ وہ چاول اور باجرے کی کاشت کرتے ہیں، دالیں، سبزیاں اور پھل پیدا کرتے ہیں اور مال مویشی بھیڑ بکریاں اور مرغیاں پالتے ہیں۔ گاؤں پانی سے گھرے ہوئے ہیں اور نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ شہروں کے بڑے بڑے بازاروں کے ساتھ بھی پانی ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔

بنگال میں بچے بڑی چھوٹی عمر ہی سے تیرنا اور کشتی چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ سارا گاؤں پانی میں بڑی خوشی سے کھیلتا ہے، عورتیں قدرتی شرم و حیا کے سبب الگ کھیلتی ہیں۔ ممکن ہو تو درختوں کی آڑ میں، لیکن وہ ہمیشہ تازہ پانی کی ٹھنڈک پسند کرتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موسلا دھار بارش سے ندی ایک خوفناک گرجتا ہوا سیلاب بن کر سارے گاؤں کو بہالے جائے، فصلوں کو تباہ کر دے، گھروں کا کھوج مٹا دے اور انسانوں اور مویشیوں کو سخت نقصان پہونچائے۔ ان حالات میں بھی لوگ پانی کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔ وہ مویشیوں کو ہانک ہانک کر اونچے اونچے ٹیلوں پر لے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ اتنا چارہ بھی جو سیلاب کے فرو ہونے تک کافی ہو۔ وہ اپنے ڈوبے ہوئے گھروں کو چھوڑ کر مچانیں اور جھونپڑیاں بنا لیتے ہیں تاکہ وہ کچھ دیر سیلاب کی زد سے باہر رہیں۔

ایسے سیلاب زدہ ملک میں بادبانی کشتی یا ناؤ میں بیٹھ کر سفر کرنا عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ گھر آدھے کے قریب پانی میں غرق ہوتے ہیں۔ سیلاب بے شمار سانپوں کو جو دریاؤں کے کنارے بلوں میں گھسے ہوتے ہیں باہر نکال پھینکتا ہے اور وہ دوسرے موذی جانوروں اور حشرات الارض کے ساتھ جھونپڑوں کی خشک چھتوں پر پناہ لیتے ہیں۔ گائیں بڑے اطمینان سے گھٹنوں تک پانی میں کھڑی رہتی ہیں۔ کوڑا کرکٹ اور گلی سڑی فصلیں اُن کے پاس سے گزرتی چلی جاتی ہیں۔ درختوں کے تنے پانی میں ڈوبے ہوتے ہیں اور شاخیں پانی کی سطح پر بچھ جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں آموں یا آلو کے درختوں کے نیچے بندھی ہوتی ہیں اور اُوپر نیچے اُچھلتی نظر آتی ہیں گویا وہ پھر پانی میں چلنے پھرنے کے لئے بیقرار ہوں۔ ننگے بچے خوشی سے اِدھر اُدھر پانی میں تیر تیر کر کلیلیں کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ان کے ماں باپ کس قدر پریشان ہیں۔ ماں بیچاری اپنا گھر برباد ہونے پر افسردہ ہے اور باپ اپنی فصلیں اُجڑ جانے اور روزی خراب ہونے پر۔

اگر سیلاب غیر معمولی نہ ہوں تو وہ بہت جلد گزر جاتے ہیں اور لوگ پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی چیزوں اور گھر بار کو ٹھیک کر کے کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جب پانی اُتر جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دریا نے اپنا رُخ بدل لیا ہے۔ اس طرح دریا کی رہگزر بدل جاتی ہے اور خالی جہاز چھپے ہوئے ریت کے ٹیلوں میں جنہیں "چرس" کہتے ہیں پھنس جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو سارے کا سارا گاؤں کسی اور جگہ آباد کرنا پڑتا ہے۔ مشرقی بنگال کے کئی پُرانے شہر انہی وجوہ کی بنا پر وقتاً فوقتاً ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔

کسی علاقے میں طوفان گزر جانے کے بعد ہر قسم کی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اسٹیمر پاش پاش ہو کر کناروں پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ درخت جڑ سے اُکھڑ کر کھیتوں میں جا پڑتے ہیں۔ گھر چکنا چور ہو جاتے ہیں اور میلوں تک تباہی و بربادی ہی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن یہ سیلاب کام بھی بہت آتے ہیں۔ دریائے آس پاس جو چکنی مٹی رہ جاتی ہے وہ بہت ہی زرخیز ہوتی

ہے۔ اور اس میں زمین کو تیار کئے بغیر ہی چاول بویا جا سکتا ہے۔ اور پوری فصل کاٹی جا سکتی ہے۔ اسی پیلی مٹی میں چھوٹے چھوٹے نازک نازک سفید بگلے چلتے پھرتے ہیں۔ اور اکثر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔ دور پرے ندی میں مچھیروں کی مچھلی پکڑنے کی بنسیاں گڑی ہوتی ہیں۔ جن کے سرے پر آبی پرندے اس تاک میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ ادھر کوئی مچھلی نظر آئے اور اُدھر وہ اُس پر ٹوٹ پڑیں۔ غوطہ مارتے وقت دھوپ میں انکی چونچیں اور ملائم پر خوب چمکتے ہیں۔ اُوپر ہوا میں چیلیں بھی گھومتی پھرتی ہیں۔ اور اپنی تیکھی تیکھی آواز بلند کرتی ہیں۔ اس اُمید میں کہ شام کو کسی جال میں کوئی مچھلی پھنس جائے تو وہ اسے جھپٹ کر اُچک لیں۔

ادھر پانی میں ایک قافلہ چلا آتا ہے۔ یہ قہقہے مارتے شور مچاتے اسکول کے لڑکے ہیں جو اپنے اپنے گاؤں میں اسکول سے گھر واپس آتے ہیں۔ ہر لڑکا ایک گھڑے پر سوار ہوتا ہے جس کو وہ ٹانگوں کے نیچے دبائے چلا آتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ لگاتے اور ٹکراتے ہیں جس کا نتیجہ کیمبرج کی دوڑ سے کہیں زیادہ سنگین ہوتا ہے کیونکہ کشتیاں جلد ٹوٹ جانے والی کچی مٹی کی بنی ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کا قافلہ ہنسی خوشی شور مچاتا چلا جاتا ہے۔ جب کوئی گھڑا ٹوٹ جاتا ہے تو اُس سوار کو باقی راستہ تیر کر طے کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے کتابوں کو پانی سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے سے تیرتا جاتا ہے۔

یہ سب تو ہوتے دن کے کام۔ جب لڑکے گھروں کو واپس جا رہے ہوتے ہیں تو ندی کے کنارے ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑی کشتیوں کی قطاریں ہی قطاریں نظر آتی ہیں جن پر پٹ سن، سبزیوں یا گھاس کو لاد کر کتنے ہی میل نیچے پہونچا دیا جاتا ہے، ان دریاؤں میں ہر قسم کی کشتیاں چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض چپوؤں، بعض ڈانڈوں اور بعض بادبانوں سے چلنے والی۔ مثلاً ڈنگھی، مکھیا، پنچی، گھاسی، گوننا، ان کے علاوہ کئی اور قسم کی کشتیاں بھی ہیں۔ نمک لے جانے والی کشتیوں کو لوگ بڑی مشکل سے دھوپ میں چلتے اور ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہاتے کنارے کنارے چڑھاؤ پر رسوں سے کھینچ کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ یہی دیہاتی کشتیاں پٹ سن کو لاد لاد کر لے جاتی ہیں تاکہ اسے بیچ کر دُنیا کی منڈیوں اور کارخانوں کے لئے بھیجا جائے۔

بعض کشتیاں جن کے چھوٹے چھوٹے چوکور بادبان ہوتے ہیں، بالکل ایک خاص قسم کے چینی جہاز معلوم ہوتے ہیں۔ بعض کے بادبان تکونے ہوتے ہیں۔ بعض بہت سے چپوؤں سے چلتی ہیں اور بعض ڈانڈ سے چلتی ہیں۔ ان کا مانجھی بڑی تنگ لنگی پہنتا ہے جو اُس کی کمر سے پاؤں تک پہونچتی ہے۔ اس کے کندھے ننگے ہوتے ہیں اور دھوپ میں خوب چمکتے ہیں۔ وہ دُنیا کے مقدس ترین دریاؤں میں سے ایک پُراسرار پانی میں ڈانڈ کو خوب گہرا ڈبو کر اوپر اُٹھاتا ہے اور اُس کے سر سے پانی کی جگمگ کرتی نقرئی بوندیں ٹپک ٹپک جاتی ہیں اس طرح وہ پھر ملاحوں کا بھٹیالی گیت گاتے ہوتے ڈانڈ کو پانی کے سینے میں گاڑ دیتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا کہ مشرقی بنگال کے ملاح دُنیا کی ہر بندرگاہ میں پائے جاتے ہیں۔

بعض کنبے تو رہتے ہی کشتیوں میں ہیں۔ وہ دریا میں سے مچھلیاں شکار کر کے کھاتے اور زمین کی پیداوار کو شہروں میں پہونچا کر اس کے عوض چاول حاصل کرتے ہیں، ان لوگوں اور ملاحوں کے گیت جو "بھٹیالی" کہلاتے ہیں، بہت پُرانے اور روایتی گیت ہیں جنہیں پڑھے لکھے لوگ آج کل جمع کر کر کے شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ کہیں اس نئی روشنی کے زمانے میں ناپید نہ ہو جائیں۔ دُور کسی ٹیلے پر یا بیلوں سے ان گیتوں کی رس بھری دُھنوں کا

سُننا عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ ملّاحوں کی آواز میں بلا کا کیف اور توانائی ہوتی ہے۔ گیتوں کا آہنگ ان کے کام کاج یعنی چپو یا ڈانڈ یا پاؤں سے ناؤ کھینے کا آہنگ ہوتا ہے وہ اللہ میاں، اپنے گھر والوں، پیار اور محبت کام کاج کے سلسلے کے گیت ہوتے ہیں۔

بنگال کی ہموار سرزمین کی ایک خاص طور پر دلفریب چیز پانی کے لمبے چوڑے نالے ہیں جنہیں لوگ کھال یا دریا کہتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے دریاؤں کی طرح چلتے نظر نہیں آتے بلکہ چپ چاپ بہے جاتے ہیں۔ یہ دریاؤں کے نشیب میں حائل ہو کر وسیع علاقے پر پھیل جانے سے پیدا ہوتے ہیں جس سے پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اس پانی پر نیلوفر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سوسن بھی۔ بعض اوقات دیہاتیوں کے مکان جو اونچی زمین پر بنے ہوئے ہیں پانی میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات پانی کھیتوں میں جمع ہو جاتا ہے اور پودوں کا کچھ حصہ اس کے اوپر رہ جاتا ہے، جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کھیت میں کشتی چلی جا رہی ہے۔ لوگ ایسے پانی میں سے ڈونگیوں یا گھڑوں پر تیر کر جاتے ہیں۔ دریا کو بالعموم کشتی ہی سے پار کیا جاتا ہے جو عام طور پر بانس کی بنی ہوتی ہیں۔ گھاٹ بانسوں کے جھنڈ اور برگد کے درخت کے پاس ہوتا ہے تاکہ مسافر اس کے نیچے بیٹھ کر انتظار کر سکیں۔ چند پیسے دے کر وہ بحفاظت دریا پار کر لیتے ہیں۔

جب کوئی اجنبی اس ملک میں آتا ہے تو وہ خود کو ایک بڑی مسحور کن جگہ میں پاتا ہے جہاں ہر طرف سے ملّاحوں کے گیتوں اور چرواہوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اوپر آسمان اور نیچے لمبے چوڑے میدان دور تک پھیلے دکھائی دیتے ہیں جن کی یکسانیت کو کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لوگوں یا بہتی ہوئی کشتیوں کی پرچھائیاں ہی دور کرتی ہیں۔ خاموش نالوں پر پھوٹی ہوئی شفق کا سماں عجیب بہار دیتا ہے جیسے کوئی الاؤ بھڑک رہا ہو۔ کشتیوں کی چہل پہل بڑا مزا دیتی ہے وہ منمناتی ہوئی بکریاں جو ان پر چڑھنے سے انکار کرتی ہیں، بچے بہترین کپڑے پہنے بازار میں چلتے پھرتے، گھر گرہستنیں انڈوں یا سبزیوں کی ٹوکریاں لئے ایک دوسرے کے ساتھ زور شور سے بات چیت کرتی ہوئیں جیسا کہ وہ ساری دنیا میں کرتی ہیں، ہرے بھرے کھیتوں کا بانکپن اور آن بان جو زمینوں پر چڑھ کر سمندر کی طرف جاتی ہیں اور ملّاحوں اور ان کے مشہور ... قدرتی سادگی، مذہبی ذوق و شوق، سدھ بدھ، ... ہنسی خوشی اور شعر و نغمہ یہ سب مل جل کر مشرقی بنگال کو واقعی ایک جادو بھری زمین بنا دیتے ہیں۔

فصلیں تیار ہوتے ہی ساری زمین سے گیت پھوٹ پھوٹ پڑتے ہیں۔ دھان کاٹ کاٹ کر چاول جمع کرنے کی خوشی منانے میں گاؤں ایک دوسرے کا گیتوں بانسریوں اور ڈھولکوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔

اور پھر جہاں کہیں جوان لوگ ہیں وہاں رومان بھی ہیں۔ لڑکیاں ہر روز دریا کے گھاٹ پر پانی بھرنے جاتی ہیں۔ سیاہ گھونگھر والے بالوں والے نوجوان جن کے بدن تیل سے چمک رہے ہوتے ہیں بانسوں کے جھنڈ میں گھنٹوں سے انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور دوپہر کا کھانا ان کی لنگیوں میں بندھا ہوتا ہے۔ جب نیلا اپنے سر پر گھڑا رکھے اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس سے گزرتی ہے تو واسم جھینپا جھینپا سا، ... آنکھوں کی کنکھیوں سے دیکھتا ہے اور پیار بھرے الفاظ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر آجاتے ہیں:-

نیلا پیاری۔ آؤ پیاری
سُندر لٹ میں رنگ بساؤں
تیری کلائی بے کنگن ہے
اس کو چوڑیاں پہناؤں

شادی بیاہ کے گیتوں میں جنہیں گاؤں کی عورتیں اور
لیاں دعوت کی تیاری کے وقت گاتی ہیں، مشرقی بنگال کے
ں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جب وہ بڑی اُستادی سے
ٹھائیاں یعنی رس گلے، جلیبیاں، میٹھے کیک اور پان ہار
ر دوسری آرائش کی چیزیں تیار کرتی ہیں تو وہ یہی گیت
تی ہیں، اُس وقت کوئی مرد پاس نہیں ہوتا جو ان گیتوں
سُنے۔ وہ الگ اپنے گیتوں سے دولہا کے جذبات کی ترجمانی
تے ہیں۔

اس دوران میں شادی کا معاملہ طے کرنے والے
ے اپنا کام کر چکتے ہیں۔ جہیز مقرر ہو جاتا ہے۔ نیلا ایک
بصورت لحاف تیار کر لیتی ہے اور قاسم سے اُس کی شادی
ہو جاتی ہے۔

دولہا شادی کے دن سچ مچ بادشاہ ہوتا ہے اور
ات کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے۔ اُس کے پیچھے پیچھے کھٹیالوں
ی لٹھ بند محافظوں کا دستہ ہوتا ہے۔ آخر کسی لڑائی
ڑائی کے بغیر اور بڑی خوشی و خرمی کے ساتھ "لڑائی" ختم
و جاتی ہے۔ دولہا گھوڑے سے اُتر پڑتا ہے اور دلہن کا
ے گاؤں کا نمبردار اور ملا اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

دُلہن کی رُخصتی پر ایک اور گیت گایا جاتا ہے جس
ں رنج و غم کی جھلک دکھائی دیتی ہے:۔

گر میں جانتی میری مُغبّنہ تو پردیس چلی جائیگی
ہم سے ہمارے گھر سے دور لے جائیگا غیر کوئی
تجھ کو سینے سے لگا کر رکھتی میں اے نازک بالی
سِل پہ پڑا رہتا ہی بیکار گھسے بنا صندل یونہی
دھان بھی رہتے دھان ہمیشہ انکو چھلکتی میں کبھی

ان گاؤں کی خاموش زندگی کے برعکس جو دریا کے
نے دہانے پر واقع ہیں۔ بحری اور دریائی بندرگاہوں
یا ڈھو سے پُر زندگی دکھائی دیتی ہے۔ ان بندرگاہوں
ں ڈھاکہ سب سے دلچسپ ہے، مغلوں، پُرتگیزوں، ولندیزوں اور
انگریزوں نے اس شہر میں لب دریا اور بازاروں میں بڑی بڑی شاندار
عمارتیں تعمیر کی ہیں جن کا مجموعی نتیجہ بے حد خوبصورت معلوم
ہوتا ہے۔ سوداگر صدہا سال سے یہاں آکر ڈھاکہ کی مشہور
مکڑی کے جالے کی طرح باریک ململ خریدتے رہے ہیں اور
یہیں دیہاتی کشتیاں آ آکر پٹ سن کے سنہری ریشے لیجاتی رہتی
ہیں جو جہازوں میں لاد لاد کر دُنیا بھر میں بھیجے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ دیہاتی کشتیاں مشرقی بنگال کی قیمتی
اجناس — چاول، سبزیاں، انڈے، گھاس، پھل اور دیہات
کی بنی ہوئی چیزیں۔ برتن، ٹوکریاں اور چٹائیاں، بازار میں
بیچنے کو لاتی ہیں۔ بھٹیالی گیتوں، بانسریوں اور ڈھولوں کی
آواز شہر کے شور و غل میں بالکل محو ہو جاتی ہے اور اُس کی
جگہ پُر تصنع موسیقی اور سینما کے پختہ کار مغنیوں کے گانے
لوگوں کے کانوں کو مسحور کرتے ہیں۔ بازاروں میں ملاحوں کے
لئے خریدنے کی کتنی ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ بچوں کے لئے کھلونے،
مشینوں سے بنی ہوئی ساڑیاں اور شلوکے وغیرہ، برتن،
پانی اور مقدس تہواروں کے لئے زیورات، ساتھ ہی مسالے
اور طرح طرح کی چٹپٹی چیزیں بھی ملتی ہیں جن میں کھانے پینے
کی چیزوں کے علاوہ غیبیں بھی شامل ہیں۔ دوسرے ملکوں
سے آئے ہوئے اجنبی بھی کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن شام کو ملاح جیبیں خالی کر کے اپنی کشتیوں میں
آرام کرنے چلے جاتے ہیں اور اگلے دن دریا کے چڑھاؤ کے
رُخ واپس گھر جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس چھوٹی
سی کشتی میں جو سیپی کی طرح نازک ہوتی ہے، ناظم اور
قاسم اور رحیم سفید چادر سے لپٹے پانی کے جھکولوں سے
اِدھر اُدھر جھولتے ہیں اور انہیں اپنے اور دگر کشتیوں وغیرہ
کے آنے جانے کی کوئی سُدھ بُدھ نہیں ہوتی۔ کشتیوں میں لیٹے
ہوئے وہ اپنے گھر کے خواب دیکھتے ہیں۔ آموں کے جھنڈ میں
جھونپڑوں کی ایک بستی، دریا کا ایک موڑ جہاں وہ سب
نہاتے ہیں۔ پانی میں شلنگیں لگاتے ہوئے (بقیہ صفحہ پر)

ڈاکٹر شہید اللہ

ترجمہ :- عبدالرحمن بیخود

بنگلا زبان

علمائے "علم الانسان" نے جس طرح دنیا کے تمام انسانوں کو حبشی، منگول، کاکیشین وغیرہ مختلف اقوام میں منقسم کیا ہے۔ اسی طرح ماہرین علم الالسنہ نے دنیا کی تمام زبانوں کو ہند و یورپی، سامی، دراوڑی وغیرہ مختلف صنف میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اقوام کی تقسیم اور زبانوں کی تقسیم کی راہیں الگ الگ ہیں اور انہیں بالکل یکساں نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح ہندو یا ننان مذہب کی قائم کی ہوئی ذاتیں اور علمائے علم الانسان کی مشاہدہ و تحقیق پر مبنی ذاتیں ایک نہیں ہیں۔ اسی طرح تقسیم اقوام و ملل اور تقسیم السنہ مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے ہر موقع پر ایک زبان بولنے والی قوم کا نسلی طور پر مختلف اقوام سے متعلق ہونا بھی درست اور صحیح ہے۔

پاک ہند برصغیر میں چند اصلی زبانوں کی قسمیں موجود ہیں۔ مثلاً ہند و یورپین اصل زبان کی آرین شاخ میں سے نکلی ہوئی ذیلی شاخیں دراوڑی اور بھارتی زبانیں ہیں۔ اسی طرح دراوڑی زبانیں جنوبی اصل زبان کی جنوب ایشیائی شاخ ہیں۔ چینی اصل زبان کی "تھائی" چینی شاخ اور تبتی برمی اصل زبان کی شاخیں ہمالین، تبتی، بورو، ناگا، کوکی چین اور لوئی وغیرہ زبانیں ہیں۔

ہند و آرین ذیلی شاخ سے نکلی ہوئی مندرجہ ذیل جدید ہند آریائی زبانیں ہند و پاکستان میں مروج ہیں۔ سندھی، مرہٹی، اڑیا، میتھلی، آسامی، ہندوستانی (اُردو۔ ہندی) پنجابی، گجراتی، راجستھانی، نیپالی، کشمیری وغیرہ۔ بنگلا زبان بھی اس فہرست میں جگہ پا سکتی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ دراوڑی، ذیلی شاخ سے نکلی ہوئی پانشگلی اور چترالی وغیرہ زبانیں شمالی مغربی سرحد میں بولی جاتی ہیں۔ جنوبی زبان کی نوع سے نکلی ہوئی دکھنی ایشیائی شاخ سے منڈاری اور خاصی وغیرہ ذیلی شاخیں پاک ہند برصغیر کے مشرقی علاقے میں مروج ہیں۔ چینی زبان کی نوع سے تھائی چینی شاخ کی "آہوم" زبان کسی زمانے میں آسام میں بولی جاتی تھی۔ اس نوع کی کھامتی زبان آج بھی مشرقی آسام میں بولی جاتی تھی۔ تبتی، برمی زبان کی نوع سے نکلی ہوئی ہمالین شاخ کی بہت سی زبانیں مثلاً نواری، لیپچا وغیرہ تبتی شاخ کی بھوٹانی۔ لدنی وغیرہ اور کوکی چین شاخ کی بورو کاروا اور ٹپرا وغیرہ۔ ناگا شاخ کی ناگا، میکر وغیرہ اور کوکی چین شاخ کی "مے ٹی تھے ٹی" (منی پوری) اور شک لوئی شاخ سے اندرو وغیرہ زبانیں ہمالیہ کے جنوبی حصے آسام و مشرقی بنگال کے پوربی علاقے میں مروج ہیں۔

یہاں تک میں نے جن ساری زبانوں کی نوعیتیں اور ان کے حالات بتائے ہیں وہ اکثر پاک ہند برصغیر کے شمالی علاقے میں رائج ہیں۔ جنوبی حصے میں بیشتر دراوڑ زبان سے نکلی ہوئی مختلف زبانیں مثلاً تیلگو اور تامل وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ ان انواع السنہ میں براہوئی، کرخ اور مالتو شمالی علاقوں میں آج بھی موجود ہیں۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا رہ جاتا ہے کہ بنگلا زبان کی اصل کیا ہے اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی متعین کرنا پڑے گا کہ وہ دراصل کس صنف زبان کی شاخ ہے۔

جس طرح علم انسان کے ماہرین نے سر کی لمبائی چوڑائی ناک کی ساخت، بالوں آنکھوں اور جسم کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے بنی نوع انسان کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ اسی طرح علمائے علم الالسنہ نے بھی زبان کے قواعد، اسماء و افعال کی وضع و ساخت، کثیر الاستعمال الفاظ مثلاً

ضمائر۔ اعداد۔ اسمائے قرابت و اسمائے جوارح وغیرہ کا مقابلہ کرکے ایک سے زیادہ زبانوں کو ایک اصل یا صنف یا اسکی ذیلی شاخوں میں داخل کیا ہے۔ وہ دو زبانوں کا مقابلہ کرنے کے وقت ہر زبان کی اصلی نوعیت کا فیصلہ علم الاصوات PHonology کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ اکثر وہ زبان کی قدیمی صورت دیکھ کر اپنی رائے کا تعین کرتے ہیں۔ اسی اصول پر اب ہم بنگلا لفظ "پا" "تی پا ئں" کا دوسری زبانوں سے مقابلہ کریں گے۔ سنسکرت میں پاد' پد یا پاد'، آبستان یا قدیم فارسی میں پد' پاد' یونانی میں پدوس (بحالت اضافی) - لاطینی میں پیوس (بحالت اضافی) قدیم انگریزی میں فوط Fote - جدید میں فٹ Foot - جرمن میں فس' فرانسیسی میں پی۔ لے۔ اسپینی میں پی۔ لے' پرتگالی میں پے' - اطالوی میں "پی لے دے" اور ارمنی میں "ہیت" کہتے ہیں۔ یہ تمام الفاظ ایک ہی اصل یعنی ہندویورپی زبان کے لفظ پود یا پید سے ماخوذ ہیں۔ یہ بات ہم مختلف زبانوں کے علم الاصوات کے ذریعہ ثابت کرسکتے ہیں۔

تفصیلی طور پر حروف علت کا بیان نہ کرکے حروف صحیح کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:-

(۱) اصل میں درمیانی مخارج کے حروف مثلاً ک۔ گ۔ چ۔ ج۔ ت۔ د۔ پ۔ ب اور د کی آوازیں پراکرت زبان میں آکر حذف ہوجاتی ہیں لیکن پراکرت سے بنی ہوئی جدید ہند آریائی زبانوں میں آکر وہ آوازیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اسی لئے ہندیورپین زبان کا "پود" یا آریہ زبان کا "پاد" لفظ ہی بنگلا میں آکر "پا" بن گیا۔

(۲) اصل لفظ ک ت۔ پ کی جگہ پر انگریزی وغیرہ کی ٹیوٹانک Tutonic شاخ میں جو کہ جرمنی Lower German کی ذیلی شاخ میں گزرچکی ہے اسی زبان کے دہا پران یعنی صفیرہ Aspirate حروف کھ۔ تھ۔ پھ بن جاتے ہیں اور اصل کے گ۔ د۔ ب حروف ک۔ ت۔ پ۔ ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے "پود" لفظ کی جگہ فوٹ اور اس کے بعد فُٹ ہوگیا۔ جرمن زبان میں انگریزی الفاظ کے آخر کا "ٹ"۔ "س" سے بدل جاتا ہے اسی لئے اس زبان میں فٹ کی بجائے فس ہوگیا۔ ارمنی زبان میں اصل کے پ کی جگہ ہ اور 'د' کے بدلے ت متلفظ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا تلفظ "ہیت" کرتے ہیں۔ یونانی اور لاطینی زبانوں میں ک۔ پ۔ ت اور گ۔ د۔ ب حروف اپنی اصلی آواز باقی رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یونانی میں پودس اور پیدس کہتے ہیں فرانسیسی' اسپینی' پرتگیزی' اور اطالوی وغیرہ زبانیں لاطینی زبان کی عام استعمالی صورت سے ماخوذ ہیں۔ ان تمام زبانوں کے درمیانی مخارج حروف گ۔ د۔ ب۔ وغیرہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ہم ابھی پاک و ہند کی دو کثیر الاستعمال زبانوں کے ساتھ بنگلا زبان کا موازنہ کریں گے۔ اختصار کے لئے ہم مثال کے طور پر تمام اصناف زبان میں سے صرف ایک صنف کی ایک زبان کے الفاظ لیں گے۔ اس فہرست میں ہندوستانی کے تحت ہم قدیم آریہ بول چال کی زبان کے الفاظ لکھیں گے۔ ان الفاظ کی مماثلت سنسکرت کے ساتھ ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کثیر الاستعمال الفاظ کا موازنہ کریں گے۔ اور پھر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے:-

بنگلا	ہندستانی: اردو	ہندستانی: ہندی	بنگلا	ہندستانی: اردو	ہندستانی: ہندی
ایک	ایک	ایک	ناک	ناک	ننک
دوئی	دو	دو	دانت	دانت	دنت
تین	تین	ترینی	کان	کان	کرنو
چاری	چار	چلتواری	چوکھ	آنکھ	ہیکو۔ اشی
پانچ	پانچ	پنچ	لوہا	لوہا	لوہو
چھے	چھ	شٹ	سُرج	سورج	سری

شات	سات	شیت	چانہ	چاند	چندرد
آٹھ	آٹھ	اشٹ	تارا	تارا	تارا
نوے	نو	نو	آگن	آگ	اگنی
دش	دس	دش	پانی	پانی	پانیہ
شت	سو	شت	گھوڑا	گھوڑا	گھوٹک
موئی (نظم میں)	میں	سوبا	گائی	گائے	گوی
مور (نظم میں)	میرا	ممکاری	کوکر	کتا	ککر
آمی	ہم	اسمے	باپ	باپ	بپیرو
آمار	ہمارا	اسمت کاری	ما	ماں	ماتا
توئی	تو	توم. توایا	بھائی	بھائی	بھراترک
توی	تم	تنمے	بون	بہن	بھیگنی
ہات	ہاتھ	ہست	اونچو	اونچا	اچ
پا	پاؤں	پاد	دور	دور	دور
جا	جا	جا	ادھوئے	وہ ہے	بھی
کھا	کھا	کھادُ	رتنی ہوں	وہ ہیں	بھبتی
بوش	بیٹھ	ادپش	موئی جاؤں	(۱) ہیں جاؤں	یاہی
مر	مر	مری	آمی جائی	ہم جائیں	یائی تے
دے	دے	دے	توئی جاش	تو جائے	جاہی
موئی ہوں	ہم ہیں	ھرامی	توسی جاؤ	تم جاؤ	یاتھ
آمی ہوئی	میں ہوئی	بھوئے تے	ادھجائے	وہ جائے	یاتی
توئی ہئس	تو ہے	بھبسی	تنی جان	وہ جائیں	یانتی
توی ہوڈ	تم ہو	بھبھتہ			

مادے کی صورت میں جس طرح قدیم حالت (آواز کی تبدیلی کے ساتھ) باقی رہتی ہے الفاظ کی حالت اس طرح باقی نہیں رہتی۔ اس میں قدیم علامت، حالت کے بجائے زبان کے مابعد کی ہئیت میں علامات حالت کے لئے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آرین شاخ کی آرین ذیلی شاخ سے مرکب جدید فارسی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ سنسکرت کی طرح قدیم فارسی میں تشکیل جمع کے لئے بہت سی حالتیں نہ پیدا ہو کر صرف دو صورتیں "آں" اور "ہا" باقی رہ گئیں ہیں۔ علامت مفعول "را" قدیم فارسی لفظ "رادی" سے ماخوذ ہے۔ "ار"، "بہ"، وغیرہ حروف جار کے ذریعہ سے جدید فارسی میں حالتیں متعین ہوتی ہیں۔ یہ دونوں حروف آریائی "سچا" اور "ابھی" سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح قدیم ہند آرین زبان کی حالتیں بہت زیادہ تبدیلیاں قبول نہ کر کے جدید پاک ہند آرین زبان میں بالخصوص علامات حالت الفاظ کے ذریعہ تعین پذیر ہوتی ہیں متعدد الفاظ نے آوازیں بدلنے کی وجہ سے موجودہ زمانے میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ جدید بنگلا زبان میں علامت مفعول وظرف کے لئے لفظ "کے" مستعمل ہے۔ قدیم بنگلا میں ہمیں نظر آتا ہے کہ یہاں حالت مفعولی Dative

(۱) ہوں جاؤں، وغیرہ بنگلہ میں دور وسطیٰ کا تلفظ ہے۔

[redacted]

اور حالت ظرفی نیز حالت اضافی میں "ک" مستعمل تھا۔ پالی اور پراکرت میں حالت اضافی ہی حالت ظرفی کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ دراصل حالت کلانی سے "ک" حالت مفعولی نہیں آیا ہے۔ وہ عموماً علامت مفعول محذوف رہتی ہے جیسے "تومی چاند دیکھو"۔ اور "تومی چاندکے دیکھو"۔ (تم چاند کو دیکھو۔ اور تم چاند دیکھو) اس دوسرے جملے میں لفظ "کے" حالت ظرفی سے آیا ہے۔ اور یہاں چاند سے مراد کوئی شخص خاص ہے لیکن اس حرف "ک" کا ماخذ کیا ہے؟ ہم بدھ گانوں میں اضافت کے "سی" کے بجائے تحلیلی (اناولیقا) صورت میں "کریت" کا لفظ پاتے ہیں۔ مثلاً "رامتس گریہم (رام کا گھر) کے بجائے بدھ گانوں میں "رام کرئینگ گریہم" پایا جاتا ہے۔ یہی کرینت' پالی زبان میں 'کتو' پراکرت میں 'ک ا' قدیم بنگلا میں "ک" اور جدید بنگلا میں "کے" کی صورت میں مستعمل ہے۔ اسی کریت سے ہندوستانی (ہندی وار دو) میں اضافت کے لئے "کا" اور مفعول وظرف کیلئے "کو" ماخوذ ہے۔ "رامتس گریہم" کے بجائے جس طرح "رام کرئینگ گریہم" بنتا تھا۔ اسی طرح "رام کاربنگ گریہم" بھی کہا جاتا تھا۔ یہی لفظ کارتی پراکرت میں "دکیر" اور بنگلا میں "ایر" سے مقابلہ ہوکر اضافی حالت اور ظرفی ومفعولی گردانوں میں "ایرے" ہوگیا ہے اسی طرح ہم موجودہ پاک ہند آریائی زبان میں نئی حالتوں کی گردانوں کا ماخذ واشتقاق متعین کر سکتے ہیں۔ جدید بنگلا میں قدیم ہند آریہ زبانوں کی گردان سے حرف ظرف (ادھی کرن) کا "اے" آریہ زبان سے ماخوذ ہوکر "اے" ہی رہ گیا ہے۔ اسی طرح حروف سبب کا "اے" اپو بھرنگشو زبان میں "ایں" اور آریہ زبان میں "ایں" سے ماخوذ ہوکر باقی رہا ہے۔

قواعد کی رو سے نیز اہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کا جائزہ لینے جدید ہند آریہ زبان (اردو ہندی) ہندوستانی' سندھی' مرہٹی وغیرہ زبانوں کے۔ انند بنگلا کو بھی انہیں زبانوں کی ایک بہن ماننا پڑے گا۔ یہ بات قابل قبول ہے کہ اختلاط کی وجہ سے دنیا کی ہر زبان دوسری زبان سے الفاظ مستعار لے سکتی ہے لیکن اس کی وجہ سے اس زبان کی اصلیت تبدیل نہیں ہوسکتی ہے۔ عربی زبان میں بھی یونانی زبان کے الفاظ مثلاً دینار' درہم' انجیل اقلیس قنطار' قاموس' فیلسوف' صابن' ایاغوجی' قانون' وغیرہ موجود ہیں۔ اور زبانوں سے بھی عربی میں الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ لیکن اسکی وجہ سے عربی زبان سامی زبان کی صنف سے علیحدہ نہیں ہوگئی۔ سنسکرت میں بھی دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ مثلاً یونانی سے کیندر' ہورا' درمو' کرمیلک' متر وغیرہ۔ عربی سے اوپی' بین وغیرہ۔ دراوڑی سے نیر' پیک وغیرہ دکھنی Austric سے مویور' تمبول' اولا بو وغیرہ۔ انگریزی زبان میں بھی فرانسیسی' یونانی اور لاطینی زبانوں سے بہت سارے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ دنیا کی بہت ساری زبانوں نے انگریزی سے الفاظ لیکر اپنی لغت کو وسیع کیا ہے۔ تمدنی یا سیاسی اختلاط کی وجہ سے کبھی کبھی عام استعمال کے الفاظ بھی دوسری زبانوں سے آکر خود ملکی زبان کے الفاظ کو بے دخل کر دیتے ہیں۔ جیسے مسلمانوں کو بنگلا میں پھوپھا' چچا' دادا' نانا وغیرہ الفاظ راج پوت زبان سے آئے ہیں۔ خالہ کا لفظ عربی سے مستعار ہے۔ عام بنگلا زبان میں ماچھا کا نکہ' نلی' بوہیو' دشوشو' شر شنشار' کوکرا' سائے جان تانا' بھوئی وغیرہ الفاظ بید خل ہوگئے ہیں اور ان کی ان کی جگہ۔ ترتیب کمر' بل' جبار' ہزار' نیز خرگوش' مرغ' باز گرم اور زمین وغیرہ فارسی الفاظ دخیل ہوگئے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے بنگلا زبان ایرانی نہیں بن سکتی۔ ہم نے جن الفاظ کا موازنہ کیا ہے۔ انہیں یہ بات نظر آئے گی کہ تمدنی ملاپ کی وجہ سے تیلگو زبان نے بھی سنسکرت سے کچھ الفاظ عاریۃً لئے ہیں لیکن اسکی وجہ سے تیلگو زبان اپنی اصل یعنی دراوڑ زبان کی صنف سے خارج نہیں ہوئی۔ ان دلائل کی روشنی میں بنگلا زبان میں بھی دراوڑ یا دکھنی زبان کی اصلیت کے چند الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے ہم بنگلا کے ساتھ ان زبانوں کی صرف اختلاط کا تو اقرار کر سکتے ہیں لیکن انہیں ایک ذات کی زبان نہیں کہہ سکتے۔

فہرست مندرجہ بالا میں ہمیں نظر آتا ہے کہ امی' تومی' آنک' اور باپ الفاظ کی اصل اسمے' تسمے' تکو اور بیرد الفاظ سنسکرت میں نہیں ہیں۔ ساتھ ہی کسی اور زبان سے بھی ماخوذ نہیں معلوم ہوتے۔ پالی اور پراکرت میں آن سے ماخوذ الفاظ: ام ہے' تم ہے' تکو' بپو پائے جاتے ہیں۔ بنگلا زبان کی جدید ترین پاک ہند آرین زبان میں بھی انکی مانند کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل جملوں کی حالت پر غور کیا جاسکتا ہے:۔ "آمی دیکھی" (میں دیکھتا ہوں) "تومی آچھو" (تم ہو)۔ انکی صورتیں سنسکرت میں "ویم پیشاہ" (آہنگ پیشامی) یوپم استھد (تم اسی) ہیں۔ بنگلا زبان کے یہ الفاظ کسی طرح بھی سنسکرت سے ماخوذ نہیں کہے جاسکتے

پراکرت میں ان کی صورتیں یہ ہیں :- "ام ہے (ام سے منگ) ورکشٹ (نسیم اچھ بقد) اس قسم کے بہت سے دلائل ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ بنگالی زبان سنسکرت سے مستقلاً ماخوذ نہیں ہے۔ بلکہ یہ سنسکرت ہی کی ہم ذات ایک قدیم ہند آریہ بول چال کی زبان سے نکل کر بار آور ہوئی ہے۔ واقعی طور پر ہم خود لفظ سنسکرت ہی سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ سنسکرت دراصل بول چال کی زبان کی ایک مہذب اور شستہ صورت تھی "رامائن اور مہابھارت" سے یہ اچھی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سنسکرت زبان دراصل خاص برہمنوں کی ایک شستہ زبان کا نام تھا۔ "رامائن" میں ملتا ہے :-

بے رحم الل برہمن کا روپ دھارن کر کے سنسکرت بولتا اور شرادھ کی نیت سے برہمنوں کو مدعو کرتا۔" (رامائن کانڈ۔ ۱۱ شرگ) رامائن)

اشوک بن میں سیتا کو دیکھ کر ہنومان یہ خیال کرتا ہے۔ -

"اگر میں برہمنوں کی طرح سنسکرت الفاظ استعمال کروں تو سیتا مجھے بھی راون سمجھ کر مجھ سے خوف زدہ ہو جائے گی۔ اسلئے با محاورہ انسانی کلام میں باتیں کرنا ہی ضروری ہے۔ ورنہ میں اس معصوم سیتا کو تسلی و تشفی نہ دے سکوں گا"۔ (ارنیہ کانڈ ۳۰ شرگ رامائن)

اسی انسانی با محاورہ کلام کو ہم نے قدیم ہند آریہ بول چال کی زبان کا نام دیا ہے۔ برہمن قوم اسی عوامی زبان کو مخش، گندہ اور ملیچھ زبان خیال کرتی تھی اور خود اسکے بدلے سنسکرت زبان استعمال کرتی تھی۔ پتنجلی کی "مہابھاشیہ" میں مذکور ہے :-

"اسی قسم کی گندی زبان استعمال کر کے اسور وغیرہ تباہ ہوئے تھے۔ اس لئے برہمن ہرگز ملیچھ بھاشا نہیں بولیں گے۔ وہ ناپاک زبان استعمال نہیں کریں گے۔ یہی زبان جسے عوام بولتے ہیں ملیچھ بھاشا ہے۔" اس کے بعد پتنجلی کہتے ہیں [illegible] اسکی بہت سی "اپوبھرنگش" صورتیں ہیں۔ مثلاً گاوی، گونی، گوتا، گوپوتلیکا وغیرہ۔ اسی گاو کی نقل سے بنگلا میں گاوی اور گائے بھی الفاظ آئے ہیں [illegible] کے بجائے کہتے ہیں۔

قدیم ہند آریہ بول چال کی زبان کا میدان چونکہ وسیع تھا اسلئے اس کے درمیان [illegible] اختلاف ضرور تھا۔ پتنجلی نے اپنی "مہابھاشیہ" میں لکھا ہے کہ کمبوج (فارس) میں "شتی" سوراشٹر میں "ہمی" وسط مشرقی علاقے میں "گمھنی" الفاظ آریہ بول سے [illegible] کے بجائے مستعمل تھے آریہ زبانیں فقط "دشو" کہتے تھے یا مشرقی علاقوں میں چھیدنا یعنی کاٹنا کے لئے فعل "واتی" اسی معنی میں مستعمل ہے۔ شمالی حصہ ملک میں "داتی" کے بجائے "داتر" یعنی کٹار یا داس" استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح بنگلا و ہندوستانی زبانوں میں "گم" کے بجائے مصدر "جا" مستعمل ہے مثلاً "رہنے جائے" (رہ جائے) اسی قیاس پر "داتی" مصدر سے فعل "دائے" استعمال کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل ضرب المثل میں یہی لفظ مستعمل ہے :-

" باباز کالے نائی کو پاش — ہے دھان دائیتے جاش"

(باپ کے وقت تو کھیتی باڑی تھی ہی نہیں کس کا دھان کاٹنے جا رہے ہو؟)

اسی طرح داتر کے لفظ سے "دا" کا لفظ یعنی داس یا کٹار آج بھی بنگلا میں مستعمل ہے۔

"پاطینی" نے اپنی "اشٹو دھائی" میں مشرقی بھارت کی قدیم زبان کا نام پراچی (مشرقی) اور شمالی ہند کی زبان کا نام اُدیچی (شمالی) تحریر کیا ہے۔ اس سے پہلے "یاسکو" نے بھی کمبوج، شمالی، مشرقی اور مشرقی شمالی ہندی زبانوں کا اختلاف بیان کیا ہے۔

ہم اس قدیم بھارتی آریائی بول چال کی زبان کا زمانہ ۸۰۰ ق م سے [illegible] ق م تک متعین کر سکتے ہیں۔ یہ زبان تدریجی طور پر پراکرت زبان میں مدغم یا تبدیل ہو گئی۔ یہی پراکرت جو گوڑ کے مقام پر رائج تھی۔ اس سے ہماری مادری زبان بنگلا [illegible] کے لگ بھگ رفتہ رفتہ وجود میں آئی۔ "دنڈی" نے اپنے کاویہ درشن" میں ساتویں صدی عیسوی میں گوڑ کی مستعمل پراکرت زبان کا نام "گوڑی زبان" ظاہر کیا ہے۔

(استقلال نمبر ۱۹۵۴ء)

سید امجد علی

مشرقی پاکستان کے لوک گیت

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی بیشتر دیہات ہی کی دنیا ہے۔ یہاں کے شہروں تک میں ایک دیہاتی رنگ ہے قطع نظر ان نئی نویلی بستیوں کے جو جدید ترقیات کی مظہر ہیں لیکن ابھی ماحول میں رچی بسی نہیں۔ دیہات کے ذکر سے مقصد اس ذہنی سکون اور فطرت کے قرب کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس زندگی کی خصوصیت ہے۔ مشرقی پاکستان کے رہنے والے فطرت سے بہت قریب زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی فطرت بھی اور قلب و روح کی فطرت بھی۔ باوجود سطحی اور جزدی ہنگامہ آرائی کے کاروان حیات یہاں اپنے ازلی وقار سے خراماں خراماں گامزن ہے۔ داخلی کیفیات ایسی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں خواہ وہ کنبہ کے افراد کا باہمی لگاؤ ہو یا جوانوں کا والہانہ عشق، خواہ مذہبی جذب و کیف ہو یا رنگین ملت کی ساحری، خواہ شاعری کا جادو ہو یا نغمے کا سرور۔ ان داخلی کیفیات میں مشرقی پاکستانی ڈوبا ہوا ہے، ان مواقع کو سینے سے لگائے ہوئے ہے یکسوئی اور انہماک کے ساتھ دولت یا منصب کے حصول کی کوشش کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ عام شہریوں کی سی ہوس اور خود غرضی اس میں نہیں ہے جس کے بغیر مادی ترقی ذرا مشکل سے ہوتی ہے تو بس وقت پر محنت کرنے کا قائل ہے اور پھر آرام سے محنت کا پھل کھانے کا۔

فطرت کے خارجی جلوؤں سے تو وہ ہر جگہ دو چار ہے۔ مثلاً وہ بے پناہ بارش جو سال میں آٹھ مہینے موسلا دھار برستی ہے، وہ ذخار دریا گنگا، میگھنا اور برہم پترا جن پر آج تک انسان پل نہ باندھ سکا اور جن کے معاون ایک سنہری جال کی طرح ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ انسان حیوان اور نباتات کے قافلے کا سلسلہ پیدائش افزائش اور موت جو چشم بصیرت کے لئے ہر لمحہ فطرت کے اسرار اور موز اجاگر کر رہا ہے۔ یہ ہیں مشرقی پاکستان کی زندگی کے اہم حقائق جو جزئیات پر حاوی ہیں اور یہاں کے باشندوں کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہوئے ہیں۔ باشندے بھی ایسے جو قدرتاً ذکی اور احساس ہوں۔ پھر جب خیال کیا جائے کہ انہیں اکثر کا کام ہی زمین کی کاشت ہے۔ یعنی قوائے فطرت کو قابو میں لانا یا ان سے تعاون کرنا تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مشرقی پاکستان والے واقعی قدرت سے بہت قریب ہیں۔

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ انکی تمام زندگی بس جذب و کیف کی ترنگ میں گزرتی ہے حقیقت تو اسکے برعکس ہے۔ ٹھوس حقیقتوں سے ان کے خواب کی دنیا جابجا الجھ کر پارہ پارہ ہے، پھر بھی یہ صحیح ہے کہ انکا دل کیفیات سے لبریز ہے، خواہ وہ خوشی کی ہوں یا غم کی، سرشاری ہو یا میر گرانی، ان کے دل کی دنیا جذبات اور شدید احساسات سے رچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گیت کی شکل میں اظہار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اہل عمل جب واقعات زندگی سے متاثر ہوتے ہیں تو کسی اور ہی ڈھب سے اس کا جواب دیتے ہیں لیکن اہل دل کا انداز یہی ہے۔ اور دیکھا جائے تو شدید جذبات کا پورا پورا اظہار بھی یہ ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہاں والے جس بات سے بھی متاثر ہوتے ہیں اسکو گیت کی شکل دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس گیتوں کا ایک خزانہ ہے جو شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔

ہر موقع کا ایک گیت ہے۔ ہر موسم کا، بلکہ ہر موڈ کا۔ ادبی حلقوں تک جو گیت پہنچے ہیں وہ تو عشر عشیر ہیں ان لاتعداد زمزموں کا جو یہاں کی وادی و کہسار میں گونجتے ہیں، جو وہاں کے کھیتوں اور جنگلوں میں مرتعش ہیں، جو یہاں کے گھروں، بستیوں اور کشتیوں میں جادو جگاتے ہیں۔ ایک آدھ صدی سے

زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ڈاکٹر دنیش چندر سین نے اس گنج بادآورد کو سمیٹنا شروع کیا اور ان اوراقِ پریشاں کی تدوین و تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ پھر ان کے شاگرد ارجمند جناب جسیم الدین نے کام جاری رکھا اور یہ خود آگے چل کر ہمارے بڑا اور عوامی شاعر بنے۔ ان کے علاوہ کئی اور فاضل ادیبوں اور عالموں نے اس نیک کام میں ہاتھ بٹایا۔ منجملہ اوروں کے مولوی عبدالکریم، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، ڈاکٹر انعام الحق وغیرہ نے بھی۔ کل کی بات ہے کہ پہلی دفعہ ٹیگور نے شہر والوں کی توجہ ان صوفیانہ گیتوں کی طرف دلائی جو "باؤل" یا "بول" کہلاتے ہیں اور جن کے گانے والے بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان انمول جواہر پاروں سے لوگ کم واقف تھے۔ جب ٹیگور نے ان کے متعلق انکشاف کیا کہ "زبان کی سادگی اور فکر کی گہرائی اور بولوں کے رسیلے پن میں ان گیتوں کا دنیا کے شعر میں جواب نہیں ہے۔" جب لوگوں کی توجہ ادھر ہوئی تو ایسے گیت کہنے والوں کو ڈھونڈھ نکالا گیا اور چند گمنام اور غیر معروف لیکن باکمال استادوں کی تو خوب خوب قدر ہوئی جیسے حسن رضا اور لیلا کنائی جو اس صدی کے شروع ہی میں زندہ تھے لیکن ایسے کتنے ہوں گے جو قریہ قریہ، دیہات دیہات، اپنی دھنیں الاپتے ہوں گے اور دنیا کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے۔ گیتوں کی بہتات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ضلع کے گیت بھی اگر جمع کئے جائیں تو بمشکل ایک کتاب میں سما سکیں گے جیسے میمن سنگھ کے گیتوں کو "میمن سنگھ گیتیکا" میں جمع کیا گیا ہے۔ تاہم اس سرسری جائزے میں یہ کوشش کی جائے گی کہ قارئین کو کم از کم ہر گاؤں کی ہر ایک صنف سے متعارف کرا دیا جائے۔

بھٹیالی لوک گیتوں میں مقبول ترین بھٹیالی ہے۔ اس کا نام بھاٹ سے مشتق ہے۔ اور یہی لفظ "جوار بھاٹا" میں بھی پایا جاتا ہے جہاں اس کے معنی ہیں پانی کا اترنا۔ چنانچہ یہ گیت کشتی کھینے والے "ماجھی" تب گاتے ہیں جب ان کی کشتی بہاؤ پہ بہتی جا رہی ہو اور وہ آرام سے بیٹھے شام کی پرسکون فضا سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ یہ گیت تب ہی گایا جاتا ہے جب کھیتی باڑی کے کام سے فارغ ہو کر کسان شام کو سستاتا اور گانے سے دل بہلاتا ہے۔ بھٹیالی کی لمبی تانیں ایسی ہوتی ہیں کہ خواہ کہیں بھی گائی جائیں وہ وسیع مناظر، پھیلے ہوئے آسمان اور طول طویل دریاؤں کی یاد دلاتی ہیں اور ایک سماں باندھ دیتی ہیں۔ اس کے گانے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سے اونچے سُروں میں گایا جاتا ہے اور آواز کو بہت کھینچا جاتا ہے جس سے گہرے سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر بول جما کر اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ادا کیا جاتا ہے جیسے: "او — رے — ماں — جھی — بے — بھا — ئی" اور ہر بول کو بڑے پیار سے "گھلا کر" ادا کیا جاتا ہے۔

آج جہاں کہیں بنگال کے لوک گیتوں کا ذکر آتا ہے پہلے نام بھٹیالی کا ہی لیا جاتا ہے بلکہ بعض تو اسے بنگالی لوک گیت کے مترادف ہی سمجھتے ہیں۔ سچ بھی ہے کہ بھٹیالی نام کی ایک دھن ہے جو بہت سے بنگالی لوک گیتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن بھٹیالی گیتوں کے متعلق شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بیس سال پہلے بنگال کے شہروں میں بھی کم لوگ ان گیتوں سے آشنا تھے۔ پھر ایک روز ایک مشہور گراموفون کمپنی نے اس کا ایک ریکارڈ بازار میں پیش کر دیا جس میں جسیم الدین کا گایا ہوا ایک بھٹیالی گیت بھرا ہوا تھا۔ لوگ سن کر جھوم اٹھے۔ اشتیاق بڑھا، مانگ پیدا ہوئی اور یوں بھٹیالی گانوں کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ جسیم الدین اور دوسرے شہری گائکوں کے گائے ہوئے بھٹیالی ہو بہو وہ چیز نہیں جو باریسال یا میمن سنگھ کے ماجھی موج میں آ کر اپنی کشتیوں پہ بیٹھے الاپتے ہیں۔ بہت کچھ نوک پلک کی درستی اور سُر تال کی صحت کا خیال رکھنے کے بعد ان گانوں کو متمدن طبقوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اور اس کے بغیر شاید سامعین ان گانوں سے لطف اندوز ہو بھی نہ سکیں لیکن یہ ضرور ہے کہ بھٹیالی کی روح ان گانوں میں پوری طرح باقی رہتی ہے مثلاً یہ گیت سنیے :-

(۱)

او رے ماجھی رے بھائی
شل ہو گئے اپنے ہاتھ
کشتی کو بس اب کھینا
اپنے ہیں بس کی بات،

(۲)

کھیتے تھے ہم اکثر
کشتی کو بصد مشکل
دریا کے مخالف بھی.

پراب نہیں اس قابل

(۳)

اب آلیا پیری نے،
حسرت رہی جاتی ہے
ہیہات کہ یہ کشتی،
واپس بھی جاتی ہے

(۴)

آگے سے شکستہ ہے
پامال ہے حال اس کا
کوشش رہی لاحاصل
بچنا ہے محال اس کا

(۵)

چپو کو اٹھا رکھ دے
اور سے ماجھی رے بھائی
بے سود تھی ہر کوشش
آخر کو قضا آئی - !

یا پھر اس تفکر آمیز رنگ کی بجائے سیدھی سادی محبت کی باتیں ہوتی ہیں مثلاً:-

اے ملکوتی بشر اے آسمانوں کی پری
روشنی ہے جسکے دم سے زندگانی میری
تیری خاطر ہو گیا ہوں میں سراپا انتظار
اور تیرا گھر ہے اس دریائے بے پایاں کے پار
بے بسی میں تیرے گھر کو یوں کھڑا ہوں تکتا
دفعتاً آنکھوں سے میری ایک گرم آنسو بہا
مل گیا دریا کی موجوں میں آنکھوں سے چھلک
کاش پہنچے موج دریا اسکو لیکے تم تلک

چٹکا اس بھٹیالی میں ماجھی کی محبت کا اظہار اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے اسی طرح "چٹکا" ایک گانا ہے جس میں عورت اپنے دور گئے ہوئے ماجھی کی یاد میں نغمہ سرا ہوتی ہے - یہ گیت مرد بھی گاتے ہیں لیکن اصل میں یہ عورت کی طرف ایک دلسوز خطاب ہوتا ہے - یوں تصور کیجئے کہ مشرقی پاکستان کے شمالی علاقوں کی سرسبز پہاڑیوں میں ایک ٹیلے پر چند دیہاتی عورتیں بیٹھی ہیں - ان کے سامنے ڈھلان کے آگے ایک وسیع منظر پھیلا ہوا ہے جس میں ایک پرشور دریا دور تک بہا چلا جا رہا ہے ادھر ٹھنڈی ہوائیں ان کے آنچل اڑا رہی ہیں ادھر ہوا کشتی کے رنگین بادبانوں کو دھکیلتی ہوئی سطح آب پہ لئے جا رہی ہے - ان کشتیوں کے چلانے والے جیسا کوئی ماجھی ان کے دلوں کے قریب لیکن نظروں سے دور ہے جسکی یاد میں نغمہ سرا ہیں-

جیسا طریقہ ہے کئی شیریں آوازیں مل کر تیز تیز اس گانے کو گاتی ہیں آس پاس کی پہاڑیوں اور وادیوں میں انکے سر گونجتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس گانے کو "چٹکا" یا "صدائے بازگشت" کہتے ہیں -

گیت کا مضمون ماجھی سے التجا ہوتی ہے کہ اپنے لامتناہی سفر کو مختصر کرے - طرح طرح پیار سے اپنی خدمت کا یقین دلایا جاتا ہے - گھریلو آرام و آسائش کی دلآویز تصویر کھینچی جاتی ہے - پھر اپنی تنہائی اور حسرت کا المناک نقشہ کھینچا جاتا ہے — اور یہ سب اظہار ایسے دل نشین انداز میں ہوتا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی پانی ہو جائے۔

او ماجھی او رخوبصورت کشتی والے
بس موڑ لے کشتی کو اس گھاٹ لگا لے
یوں ندی کو بہتے رہنا آخر کب تک
اس کشتی کو آخر کھینا آخر کب تک
کس دھن میں چلا جاتا ہے شام سویرے
دل میں کیا راز چھپا ہے ماجھی میرے
دریا یہ ختم بھی ہوگا، او رے ماجھی
کیا اس کا سرا نہیں ہے کہوں ماجھی
گھڑیا میں جب میں پانی بھرنے آئی
رنگین کشتی نے تیری یاد دلائی
اک لہر نے گھڑیا چھین لی یوں اللہ تم سے
دل چھین لیا تھا جیسے تم نے ہم سے

ساری گان اور گمبھیرا

بھٹیالی اور ٹپا دونوں سوز و گداز کے گیت ہیں - ان کے مدھم اور نرم کومل سُروں میں دلدوز جذبات کا اظہار ہوتا ہے لیکن اور گیت بھی ہیں، جو ان کے برعکس ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز دھوم دھام سے گائے جاتے ہیں - یہ سرخوشی و انبساط کے نغمے ہیں، جوش و خروش کے گیت - ان میں سے ایک ساری گان ہے - اگر بھٹیالی بہاؤ کیساتھ کشتی چھوڑ کر گایا جاتا ہے تو ساری گان کی لچکدار اور تیز تانیں تب اٹھائی جاتی ہیں جب کشتی مشکل بہاؤ کے اوپر جا رہی ہو، یا پھر جب برسات میں دریا پانی سے بھر جاتے ہیں اور بہاؤ تیز ہوتا ہے تو جوان اپنے جوش میں ان پر خروش دریاؤں میں کشتیاں دوڑاتے ہیں اور خوب مقابلے ہوتے ہیں - چاہی ملک بھر میں کشتی بانی کے میلے منعقد ہوتے ہیں کیونکہ یہ تو یہاں کے لوگوں کا قدرتی مشغلہ ٹھہرا - ان مقابلوں میں جب دو فریق ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہوتے ہیں تو مل کر "ساری گان" گاتے ہیں جسکے لفظی معنی ہیں "ساروں کا گانا" یعنی گیت سُر ملا کر گایا ہوا - چنانچہ چپوؤں کی یکساں حرکت کے ساتھ گانے کے بول بھی ملا جلا کر گائے جاتے ہیں - ایک دم زور سے آواز کو اٹھاتے ہیں پھر آہستہ سے نیچے لے آتے ہیں اس طرح جوں جوں دوڑ اختتام کو پہنچتی ہے گانے میں بھی جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے -

لوک سنگیت کے ماہر عباس الدین نے اس گانے کو یوں خوبصورتی سے بیان کیا ہے:-

"ابر چھا رہا ہے، ہوا تیز چل رہی ہے اور دریا میں موجیں اٹھ رہی ہیں - ملاح خطرہ محسوس کرتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے اور گاتا ہے 'کدھر جاؤں کس کنارے کو چھوڑوں کس کنارے کو پکڑوں' بادل اس کے سامنے صف اندر صف پھیل رہے ہیں - بجلی کوند رہی ہے اور ہیبت ناک تاریک منظر کو سنہری لکیروں سے اجاگر کر رہی ہے - طوفانی ہوا کے اثر سے دریا میں قیامت برپا ہے موجیں غصے سے بل کھا رہی ہیں اور ان کے منہ سے گویا جھاگ نکل رہے ہیں - ملاح اپنے ساتھیوں سمیت ان کوہ پیکر موجوں سے لڑنے کیلئے کمر باندھتا ہے، چپوؤں پر جھوم جھوم کر زور لگاتا ہے اور ساری کے بلند آہنگ نغمے گاتا جاتا ہے -

"دریا کبھی آپ جہاں طوفانے چلاؤ تاری"

طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کا دل جوش سے بھر جاتا ہے بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ اسے گھیرے ہوئے ہیں - سیاہ لہریں اسکی طرف بڑھتی ہیں لیکن اس کی چپوؤں کا ڈنک کھا کر وہ اپنے پھن نیچے کر لیتی ہیں - جو بیماد دریا کے سینے پر زندگی گذارتا ہو، وہ طوفانوں سے کب ڈرنے والا ہے - بجلی اور کڑک تو اس کے دن رات کے ساتھی ہیں"-

گمبھیرا

یہ بھی "ساری" کی طرح مل جل کر گایا جاتا ہے بلکہ یہ کچھ کچھ قوالی کی طرح ہے - ایک آدمی ایک بول گاتا ہے - پھر دوسرے مل کر گاتے ہیں اور ساتھ گانے لگتے ہیں - یہ خوشی اور سرشاری کا گانا ہے اور اس میں قوالی کی طرح خوب دھما چوکڑی ہوتی ہے اور غم دور کرنے کا اچھا طریقہ ہے - ضلع رنگ پور اور مالدہ سے یہ گانا مخصوص ہے اور ڈھول اور ڈھاک سے اسکی سنگت ہوتی ہے -

بھوّیا

پانی کے گیتوں کا بہت ذکر ہو چکا ہے - اب ذرا ان گیتوں کو لیجئے جو کھیت اور کھلیان، وادی اور جنگلوں میں ترنم آفریں ہیں - شمال کے ایک وسیع میدانی علاقے کا تصور کیجئے - جہاں دور دور تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں - ایک کچی سی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی ہے - اسکے کنارے کہیں ناریل اور چھالیا کے حسین و خوشنما قطاریں ہیں، کہیں کہیں آم اور کیلے کے جھنڈ - سڑک سے ہٹ کر ادھر ادھر اکا دکا گاؤں بھی نظر آتے ہیں - ان کے بیچ میں سڑک پر ایک لمبا قافلہ ٹھیلوں کا ہچکولے کھاتا چلا رہا ہے - اس پر دیہات کی پیداوار کی مختلف چیزیں لدی ہوئی ہیں جیسے پھل، ترکاریاں، اناج، گڑ وغیرہ - یہ قافلہ کسی منڈی کی طرف رواں ہے - جہاں سامان فروخت کر کے غریب کسان اپنے گذارے کا انتظام کرتے ہیں -

جیسے جیسے سفر کی تھکن بڑھتی جاتی ہے - اور گھر کی یاد ستاتی ہے گاڑی والوں کی طبیعت انہیں گانے پر اکساتی ہے اور ایسے وقت میں وہ "بھوّیا" کی تان اٹھاتے ہیں - پہلی گاڑی والا ایک مصرع گاتا ہے، دوسرا اسے دہراتا ہے اور پھر تیسرا، چوتھا - اس طرح آن کی آن میں ساری وادی سینکڑوں آوازوں کے گانے سے گونج اٹھتی ہے - اس کا مضمون محبت کے سیدھے سادے اظہار پر مبنی ہے، جو کسان کی طرف سے اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے

حضور میں ہوتا ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہر جا تجھ کو میں
اے مرے محبوب، میرے جان و دل
جس کی خاطر منزلیں چھانا کیے
اپنی کٹیا سے گیا آخر تو مل کے

اس گانے میں بڑا سوز و گداز ہوتا ہے اور اسکے گانے کے انداز میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ گانے گاتے یک بیک آواز شدت سے لٹک جاتی ہے جیسے ساز کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ انجان سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ گانیوالا بہک گیا لیکن دراصل یہ دانستہ ہوتا ہے اور اس سے وہی یاس انگیز کیفیت کا اظہار مقصود ہے جو نفس مضمون میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً گویا اسے کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اکھڑے اکھڑے بول پھر صحیح سرگم میں نظر آجاتے ہیں۔ یہ تھا بھوایا جو مشرقی پاکستان کے شمال مشرقی علاقوں کا خاص گانا ہے اور تاثیر میں یکتا ہے۔

رکھالی

جس طرح گاڑی بان سفر کی تھکن اور کوفت دور کرنے کیلئے بھوایا گاتے ہیں، اسی طرح اکثر دوسرے پیشہ ور بھی اپنے اپنے کام کے ساتھ گانے کا مشغلہ جاری رکھتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نوجوان کسان اکثر وہ خوبصورت گیت گاتے ہیں جو "رکھالی" کہلاتے ہیں ان میں کرشن اور گوپیوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ ہرے بھرے کھیتوں میں جب جابجا لوگ جھکے ہوئے کام میں مشغول ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک رکھالی کی تان اٹھاتا ہے اور دوسرے اسکے بعد دہراتے ہیں حتیٰ کہ کھیت نغموں سے معمور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح کمہار بھی برتن بناتے ہوئے گاتے ہیں اور جلاہے کپڑا بنتے ہوئے، لوہار لوہا کوٹتے ہوئے اور ہر ایک اپنے کام پر خواہ کچھ ہو۔

کیرتن

چنانچہ پھیری والوں کا مقبول گانا کیرتن ہے اور بڑھئی بھی اسے بہت شوق سے گاتے ہیں اور رات رات بھر کیرتن کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہ ایک طرح کے مذہبی گیت ہوتے ہیں جن میں وشنوی عقیدے کے لوگ بڑے جوش و عقیدت سے حصہ لیتے ہیں۔ سنگیت کے لیے "کھول" ہوتا ہے جو ایک طرح کا لمبا ڈھول ہوتا ہے جو بیچ میں سے چوڑا اور دونوں سروں پر سے پتلا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ پیتل کی تھالیاں یعنی "کرتال" اور لکڑی کے دو ٹکڑے جن پر گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں اور جو ایک ہی ہاتھ سے آپس میں بجائے جاتے ہیں لئے "کاٹ کرتال" کہتے ہیں۔ ان گانوں میں حال اور سرشاری کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو ان محفلوں کا حاصل سمجھی جاتی ہے اور جس میں دنیاوی تفکرات سے بالاتر ہو کر حصہ لینے والے ایک روحانی سرور حاصل کرتے ہیں۔

جاگ گان

رات کے گانوں کا جب ذکر آیا ہے تو اس ایک مستقل رسم کا ذکر کرنا بھی لازم ہو گیا۔ یہ رسم "جاگ گان" کہلاتی ہے یعنی رات کو جاگنے (رتجگے) کا گانا۔ دسمبر کے پوس کے مہینے میں جب خریف کی فصلیں کاٹی جا رہی ہوتی ہیں، دل خوشی سے معمور ہوتے ہیں اور کھلیان اناج سے، کھانے پینے کی فراوانی ہوتی ہے اور گھر والیاں طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرتی ہیں۔ خاص کر پیٹھے یعنی چاول کے آٹے کی لذیذ میٹھی ٹکیاں۔ ایک دوسرے کی دعوتیں ہوتی ہیں تحفے بھیجے جاتے ہیں اور ہر طرف مسرت کے شادیانے بجتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کٹائی کے کام میں ایک گھرانہ دوسرے کی مدد لیتا ہے۔ رات کو کٹی ہوئی فصل کی رکھوالی بھی کرنی پڑتی ہے۔ سب لوگ کسی بڑے پیپل یا بڑ کے نیچے بیٹھ کے آگ جلا لیتے ہیں اور یوں رات گذارتے ہیں۔ ایسے میں قدرتاً گانے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ "جاگ گان" کا مضمون عام طور سے اولیاء کی زندگی کے حالات ہوتے ہیں اور ان کے معجزات اور کمالات کا بیان۔ جاگ گان خاص طور پر راج شاہی اور پبنہ اور دوسرے ضلعوں میں رائج ہیں۔

کبھی کبھی ان رتجگوں میں کہانیاں بیان کی جاتی ہے اور یہ "پالا گان" کہلاتا ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور منظوم کہانیاں یہ ہیں: "میودا"، "ملوا"، "کاجل ریکھا"، "دیوانہ بھبنہ" اور "دیوان مدینہ" (۱) آخر الذکر کا لکھنے والا دو صدی پہلے کا ایک مقامی شاعر بنام منصور بیاتی تھا۔ یہ داستان اس قدر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے کہ مشہور فرانسیسی ادیب، رومان رولاں نے بھی اس کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ یہ داستانیں عام انسانوں سے متعلق

ہوتی ہیں اور روزمرہ زندگی کی آئینہ دار۔ دوسرے ملکوں کے لوک گیتوں کی طرح ان میں بھی مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں لیکن کم۔ کہانی کا ہیرو بادشاہ ہو یا کوئی بڑا سورما اسکی زندگی کے معمولات وہی ہوتے ہیں جو ایک عام انسان کے۔ اسکی بھی وہی مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں جو آدمیوں کی۔ مثلاً کہانی میں ملکہ کو بھی دوسری عورتوں کی طرح گھاٹ پر جاکر نہانا ہوتا ہے۔ اسکو بھی صحن میں بیٹھ کر کھیلی کاٹنی پڑتی ہے وغیرہ۔ چنانچہ ان کہانیوں کا رنگ عوامی ہے۔ اور عوامی زندگی کی عکاس ہیں۔

ان کی ایک اور خصوصیت حزن و ملال ہے۔ یہ کہانیاں اکثر و بیشتر یاس انگیز ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مقبول گیت حزنیہ ہی ہوتے ہیں۔ یا پھر اس یاس و حسرت میں بھی یہاں کی اصل زندگی کا عکس ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ یہاں کے دیہات کی زندگی سراپا الم ہے حقیقت تو یہ ہے کہ باوجود زندگی کی مشکلات کے۔ لوگ خاصے مست اور مگن رہتے ہیں۔ البتہ ہر بلائے آسمانی اور حوادثِ انسانی کے وہ اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کہانی گھڑتے وقت بھی واقعات کی کڑیاں قدرتاً وہ اس طرح جوڑتے ہیں کہ ٹریجڈی پر منتج ہوں دراصل ایسی کہانیاں بنانے والے اور گانے والے گویا اس طرح اپنا دل ہلکا کر لیتے ہیں اور یونان میں ٹریجڈی کا مقصد یہی سمجھا جاتا ہے یعنی 'کیتھارسس'۔

یہاں گانوں میں آہ و زاری ایک مستقل صنف کی شکل میں بھی موجود ہے جیسے "زاری گان" ۲۔ یعنی حزنیہ گانے کہتے ہیں۔ اکثر تو ان گانوں کا موضوع واقعات کربلا ہی ہوتے ہیں اور اس طرح ان کو مرثیوں کے مترادف سمجھنا چاہیے لیکن اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے غم روزگار جو ہیں ان کا دکھڑا "زاری" یا "جاری" کی شکل میں رویا جاتا ہے۔ طغیانی سے تباہی آگئی یا دریا پھیل گیا۔ بارش نہیں ہوئی یا قحط پڑ گیا' ہر غم کا اظہار "جاری" میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

"دوپہر کی دھوپ میں ریت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے
دھوپ کی تپش سے بلا کی پیاس لگ رہی ہے
خدایا ابر بھیج' بارش بھیج
زمین سوکھ گئی ہے' آسمان تپ گیا ہے
بادلوں کا بادشاہ شاید سو رہا ہے
اے خدا ابر بھیج' بارش بھیج"!

یا یہ لیجئے:

"دریائے سرما میں طغیانی آگئی ہے
ہفتے سے پانی چڑھنا شروع ہوا
اور اتوار تک ہر چیز زیر آب ہوگئی
جس کے پاس بڑی بڑی کشتیاں ہیں
وہ تو دوسرے گاؤں میں چلے گئے
لیکن غریب کیا کریں
ان کے لئے تو طغیانی موت کا پیغام ہے"۔

بارو ماشی [۱]

زندگی کی عکاسی کی یہی خصوصیت ان گانوں میں بھی نمایاں ہیں جو 'بارو ماشی' کہلاتے ہیں لفظ کا مطلب ہے "سال کے بارہ مہینے" اور اس میں بارہ مہینے کی گھریلو زندگی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بیان ایک بیوی کی زبانی ہوتا ہے جو اپنے شوہر کے فراق میں زندگی کے وہ لطف بیان کرتی ہے جو اس کے ہوتے ہوئے میسر آتے ہیں۔ بڑی حسرت سے وہ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بیان کرتی ہے جو ایک غریب لیکن بابرکت گھر میں نصیب ہوتی ہیں۔ اس بیان سے گویا بچھڑے ہوئے شوہر کو اپنے پیار اور محبت کا یقین دلانا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ اس دوری کو روانہ رکھے اور پھر واپس آجائے۔

"سکھی اگھن کا مہینہ شروع ہو گیا' کھیت پک گئے دھان پک گئے ہیں
دل کا راجہ تو پردیس میں ہے' مجھے کیا سکھ ملے گا
سکھی! لو پوس بھی آگیا' یہ جوانی بوجھ بن گئی ہے مجھ پر
کب تک برہ کی آگ میں جلتی رہوں گی
ماگھ آگیا' بن میں شیر دہاڑتے ہیں

(۱) دیوان = دیوانہ' دیوانی: مدینہ = ایک عورت کا نام تھا
(۲) "جاری" یا "زاری" = رونا: "گانا" = گانا۔

(۱) بارو ماشی = "بارہ ماش": ماش = ماہ' مثل "بارہ ماسہ" پورب کے دیہاتی گیت۔

وہ مجھ جیسی کامنی نار سے دور کیوں ہے؟
پھاگن شروع ہوگیا پھاگ کھیلنے کے دن!
میں کس کے ساتھ کھیلوں؟
سکھی چیت کا مہینہ کیسے گذاروں
سارا جسم سیاہ ہوتا جا رہا ہے
بیساکھ آیا اور آندھیاں آنے لگیں
میرے دل میں بھی طوفان مچلنے لگے
سکھی لو درختوں میں آم پکنے لگے
جیٹھ کا مہینہ شروع ہوگیا
کھانے میں مزہ کہاں، وہ جو مجھ سے بہت دور ہے
آساڑھ آیا اور بادل گرجنے لگے
کیا من کا میت بھیگتے بھیگتے آئے گا؟"

ایک اور خصوصیت بنگال کے گیتوں میں ان کا ناصحانہ رنگ ہے ہر کہانی اور ہر گانے کے آخر میں پند نصائح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے مثلاً کسی دلیر کسان کی شیر سے لڑائی کا ذکر ہوتا ہے۔ داستان گو تصور کی شدت اور بیان کی قوت سے ایک سماں باندھ دیتا ہے لیکن کہانی ختم ہونے ہی وہ رخ بدلتا ہے اور اس میں نصیحت کا پہلو نکالتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ اس طرح جان جوکھوں میں ڈالنا اچھی بات نہیں کیونکہ جان خدا کی دی ہوئی نعمت ہے اور تھوڑی سی شہرت اور نفع کی خاطر اسکو ضائع کرنا گناہ ہے۔

یہ قرون وسطیٰ کا ناصحانہ رنگ اکثر بنگالی لوک گیتوں میں ملے گا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نمایاں ان گانوں کا مذہبی رنگ ہے بیشتر گانے تو ہیں ہی ان موضوعات پر مشتمل اور دوسرے میں کوئی نہ کوئی پہلو خدا رسول کے ذکر کا نکال ہی لیا جاتا ہے۔ مذہبی گانوں میں ہندوؤں کے کیرتن کا ذکر آ ہی چکا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے "معرفتی" "مرشدی"۔ "بول" اور "دیہوتتہ" ہیں۔

لیکن اس مذہبیت کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ اول تو اس میں روکھا پن اور یبوست نہیں، بلکہ مذہبی جذبے کا اظہار ان گیتوں میں بڑے جوش اور وارفتگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے قوالی میں، بلکہ کبھی تما شے، دھوم دھڑکے کے قصوں کہانیوں کے ساتھ بھی یہ مذہبیت نبھ جاتی ہے۔

ایک پہلو اس مذہبیت کا وہ عالم خدا ترسی اور انسان دوستی ہے جسکی دوسرے مذاہب نے تلقین کی ہے۔ مگر اسلام میں خاص طور پر شرف آدم کو بلند کرنے اور اخوت بشر کو پھیلانے پر زور دیا مخصوصاً صوفیا کے مسلک نے اسکو بہت فروغ دیا۔ بہرکیف حقیقت یہ ہے کہ ان گیتوں میں ان خیالات و جذبات کا محرک تنہا اسلام کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دراصل ان کا ماخذ بھگتی مذہب، خدا پرستی یا صوفیت کے وہ گیت اور گانے ہیں جنکی مثالی شکل چودہویں صدی کے مشہور شاعر چنڈی داس کے کلام میں ملتی ہے (اور بھگتی مذہب جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلام کے زیر اثر نمودار ہوا) مثلاً چنڈی داس کا یہ قول لیجئے

"سن رے مانس بھائی
سب سے اوپر انسان کی بھلائی
اس سے بھی اوپر کچھ ناہی"۔

اور اسلام میں بھی یہ خیال ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔ مثلاً سعدی رح کا شعر ہے

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اور خود ہمارے شاعر اعظم علامہ اقبال کا قول ہے

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

بہرحال انسان دوستی کے یہ خیالات کچھ ہندوؤں کے فرقہ ویشنو کے شعراء کے ذریعہ اور بھی پھیلے اور اس سلسلے میں بہت سے مسلمان شاعر بھی منسلک ہیں مثلاً سید مرتضیٰ، مرزا کنگلی، فیض اللہ، ناصر محمود، علی رضا وغیرہ۔ انکے کلام میں انسان کی طرف سے خالق، اللہ کی جستجو کو عشق مجازی کے پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے انسانوں کی پیار محبت کی باتوں کے ذریعے خالق و مخلوق کے تعلق کو بڑے موثر اور محسوس طریقے پر پیش کیا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور یگانگت کی باتوں میں خدا کی دوری ختم ہو جاتی ہے اور انسان کی کم مائگی کا احساس بھی بھلا دیا جاتا ہے پھر اس وارفتہ محبت میں مادی نعمتوں کی خواہش بھی ختم ہو جاتی ہے اور صرف لطف عنایت پر نظر رہتی ہے۔ ایسے بہت سے شاعر گھربار چھوڑ کر تلاش حق میں حیران و سرگرداں پھرتے رہے اور اس عشق الٰہی کو بڑے لطیف و دلنشین پیرائے میں بیان کرتے رہے۔

مثلاً ایک پرانے شاعر کے شعر ہیں:

کچھ پیار کی باتیں کر' اے دوست کہ میرا دل
اکتا گیا دنیا سے ملول ہو گیا الفت سے
بس عشق آلہی کی اب پیاس مجھے بھی ہے
دل ڈھونڈتا ہے مرہم اللہ کی محبت سے
اس شاہ رعنا کا دیدار جہاں بھی ہو
ہم جائیں گے مر کے بل محنت سے مشقت سے
کس میت پہ زرکبھی ہو' سکھ بونا دھوکا ہے
دل اسکو دو جو بخشے کچھ عشق کی دولت سے
جو فیض کا منبع ہے' جو چین کا داتا ہے
رکھ دل کے دوارے میں' کام اسکی عبادت سے
چھوڑ اور صنم سارے' کر بند نظر اپنی
بس اس کے قدم پر رکھ سر اپنا عقیدت سے
پھر سکھ کا زمانہ ہے' پھر شانتی سے جیون ہے
نیت کا نہ غم ہوگا' آزاد نہ نفرت سے

ان صوفیانہ گیتوں کی مختلف شکلوں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق ہے۔ "باؤل" کہتے ہیں کہ "اولیا" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے ۱۔ اسکے گانیوالے قلندر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور انکے امام شیخ مدن باؤل جو عہد مغلیہ کے ایک شاعر تھے۔ کیفیں نامعلوم ہے انکے صوفیانہ خیالات کا اندازہ انکے اس گیت سے لگایا جاسکتا ہے

کھل رہا ہے کتنی صدیوں سے مرے دل کا کنول
میں ہی کیا' تو بھی مقید ہے' نہیں رہتا' سنبھل
حیف دونوں کسقدر مجبور ہیں
اس کا چہرہ ہے شگفتہ اور امنڈا اس کا نور
شہد کا اس میں خزانہ' اس سے ہے دل کا سرور
کس قدر پرکیف کیا بے مثال
لالچی بھونرے اسے تو چھوڑ سکتا ہی نہیں
میں بھی دیوانہ نہیں' تو بھی آزاد ہے اسکے قریں

اس جہاں میں دل کو آزادی کہاں

(ترجمہ: یونس احمد)

مشرقی گیت بھی کسی حد تک باؤل کی طرح ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کا موضوع بھی خودی کی پہچان ہے۔ "من عرف نفسہ' فقد عرف ربہ"۔ اس ضمن میں بہت سے نادر صوفیانہ مضمون ان گیتوں میں ملتے ہیں مثلاً لالن شاہ کا یہ نادر گیت ملاحظہ ہو:-

اور کسی نے داب رکھی ہے میرے گھر کی پونجی
پل پل لٹتے کیسے دیکھوں اپنے گھر کی پونجی
اپنے گھر میں رکھ کر من' دھن دولت مال خزانہ
لین دین پرایوں سے کرنیکو ہوا روانہ
دام گرہ میں اور کے' اور سودا کسی کے ساتھ
دھن والا تھا جنم کا اندھا' دھویا دھن سے ہاتھ
دریا دریا کنکر رولے' من موتی کے اندر
لالن اپنا آپ نہ جانا من بسی چیز کو پاکر

(ترجمہ: یونس احمد دش۔ حقی)

اسکے علاوہ مرشدی گیت ہوتے ہیں جنمیں اولیا اللہ کی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور عجیب معجزات اور کمالات کے بیان کے علاوہ نہایت مبالغہ آمیز عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ سادہ لوح دیہاتیوں کی نظر میں اسلامی خیالات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اسکے لکھنے والے بھی بیشتر جاہل فقیر ہوتے ہیں جنمیں درگائی فقیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔

"دیہوتو" بھی اسی قبیل کا ایک مذہبی گیت ہے جسمیں دلکو یا روح کو ایک پرندہ سمجھا جاتا ہے اور بدن کو ایک پنجرہ جسمیں وہ مقید ہے۔ اس طویل استعارے میں جلد' تصور کی جاتی ہے' ہڈیاں ستون' آنکھیں کھڑکیاں' منہ دروازہ اور روح کے پرندہ کی کہانی بیان کی جاتی ہے آیا وہ اڑکر خدا کی طرف جائیگا یا شیطان کی طرف

مختصر یہ ہے کہ ہمارے بنگال کے سیدھے سادے باشندوں کے گیت اپنی سادگی' صفائے احساس دروئی اظہار میں یکتا ہیں۔ انکو یقیناً کوئی شاعری کے بہت خاص نمونے سمجھے گا۔ جو نکلا یہ بنا ہوا دھارا صدیوں سے بہتا چلا آرہا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح دلوں کو شاداب کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان گیتوں میں ملک کی تصویر دکھائی دیتی ہے اور قوم کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

۱۔ باؤل = "آؤل" = اولیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ "باؤلے" یا مجذوب فقرا کے گیت ہیں۔ بعض اسے "بول" سے مشتق بتاتے ہیں

انور سعید گیلانی

مشرقی پاکستان: اُردو شاعری کے آئینہ میں

ڈھاکہ، چٹاگانگ کبھی ہم ان کا نام یوں لیا کرتے تھے جیسے یہ خبر نہیں دُنیا کے کس دُور دراز گوشے میں ہیں۔ وہاں تک پہنچنا گویا خواب و خیال کی بات ہے۔ اسی لئے ہم ان کا ذکر اکثر سنا کرتے تھے کبھی ڈھاکہ کی کبھی بنگال کی یعنی یہ بعید دیار، بعید از مکان، یاد رہا کرتی ہیں۔ لیکن اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قیامِ پاکستان سے صورتِ حال ہی دگرگوں ہو گئی ہے۔ اب تو ڈھاکہ بنگالہ ہم سے کہیں دُور نہیں، پاس ہی ہیں۔ وہ قائم کے واسطے پر جیسے کراچی، جیسے لاہور، جیسے پشاور، وہ تو ہمارے اپنے ملک ہی کا حصہ ہیں۔ کیا ہوا جو وہ مغربی بازو سے ۱۱۰۰ میل دُور ہیں۔ اور ان کے مابین کوئی کوہ بلند دریا گلیاری نہیں۔ محبت و شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار۔ یہی وجہ ہے کہ اب سحرِ بنگالہ ہمارا اپنا یعنی مغربی پاکستان کا سحر بھی بن گیا ہے۔ اس کی تر و تازہ سرزمین، اس کے جنگل، اس کے پہاڑ، اس کے دریا، اس کے باشندے سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ہمارا اپنا گوشت پوست۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہاں کے لوگ یہاں کے گن گاتے ہیں اور یہاں کے لوگ وہاں کے۔ وہاں کے گائک ہمارے گیت گاتے ہیں اور یہاں کے مغنی وہاں کے۔ وہاں کے کوی اپنی کویتا میں یہاں کے نغمے سناتے ہیں اور یہاں کے شاعر شاد ہیں اپنے فن پاروں میں مشرقی پاکستان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اُس کی رنگا رنگ تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور اب تو ہوتے ہوتے نظم و نثر کے یہ شہ پارے اتنے ہو گئے ہیں کہ ان سے ایک شاندار گلدستہ تصویروں کا ایسا مرتب ہو کر مرقع تیار ہو سکے جس یگانگت کا ایک پہلو ہماری اتحادی و ثقافتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو وہ سارا ادب ہے جس میں مغربی و مشرقی پاکستان ایک دوسرے کی جھلکیاں پیش کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں اس لئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک جنتِ خیال، ایک رومانوی دُنیا سے تحیّر بن گئے ہیں۔ جو سراپا ذوق و شوق بن کر شعر و ادب کے آئینے میں منعکس ہوتے ہیں۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ہماری شاعری میں جہاں بھی مشرقی پاکستان کی جھلکیاں ہوتی ہیں وہ بہت ہی رنگین ہیں اس لئے نہیں کہ وہ اس باغ و بہار سرزمین کی مہکتی رنگینیوں کا عکس پیش کرتی ہیں۔ بلکہ شعری حیثیت سے بھی۔ ان چمن در چمن رنگین عکسوں کے سلسلے میں ایک شاعر پیش پیش ہے۔ جعفر طاہر اور اس میں کلام نہیں کہ وہ یہ رنگین کردار ادا کرنے کے لئے بڑی ہی رنگین صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ جس طرح اس کا کینوس وسیع ہے اسی طرح اس کا کلام یعنی تخیل بھی وسیع ہے اور زبان و بیان کا وہ طلسمی محدّب شیشہ بھی جو ان رنگین عکسوں کو اپنی پُرکار گرفت میں لاتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کا وصف خصوصی اور مابہ الامتیاز یہی ہے۔ وہ خارجی لطافتوں کا ماہر مُرقّع نگار ہے۔ اور ان کی نقاشی کے لئے اس کے پاس صدہا رنگوں سے معمور کلر بکس ہے اور ایسا ذخیرۂ الفاظ، ایسے ذرائع بیان جن کی مثال کم ہی دستیاب ہوتی ہے۔ وہ اپنے دُور کا قاآنی ہے اور اسی طرح قادر الکلام بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وہ بنگال پر قلم اُٹھاتا ہے۔ اور اُس نے بارہا ایسا کیا ہے تو ماہِ نو کی حد تک متعدد نظموں

ہیں جو ایک سے بڑھ کر ایک فن کارانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ "لہو ترنگ" "سُگن رُرب" "کنول کُنڈ" تو اس کا کلام خود سحر بنگال بلکہ اس کا حریف بن جاتا ہے اور ایک نشہ ریز کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس سحر کا آغاز نظموں کے شگفتہ و رنگین عنوانات ہی سے ہو جاتا ہے۔ [illegible] جو مشرقی پاکستان کے حسین مناظر کو [illegible] کرنے کے لئے آئینہ تصویر نما ہیں۔ مثلاً "لہو ترنگ" کیا ہے۔ شہید بنگالہ سراج الدولہ کا دلدوز المیہ جس کے خون سے خود اُس کے عزیزوں اور قوم کے خود غرض لوگوں نے ہولی کھیلی۔ اور اس کے نتیجہ میں بالآخر قوم کے خون کی ندیاں بھی بہے بغیر نہ رہ سکیں مگر شہیدوں کا خون احمر [illegible] رنگ لایا اور اس سے ایک آزاد مُلک [illegible] قوم کی [illegible]۔ چنانچہ نظم کے آخر میں دور انقلاب کا شاندار منظر دکھائی دیتا ہے

خالص شعری اور فنی حیثیت سے "نیم" کے بعد "سگن رُرب" اور "کنول کُنڈ" ہماری شاعری میں ایسی آفاق بوس بلندیوں کی حریف ہیں جو عالمی شاعری کی فلک رس بلندیوں کی حریف معلوم ہوتی ہیں۔ یہ فن پارے دراصل ایک [illegible] کے اجزا ہیں۔ "ہفت کشور" جس میں سات [illegible] خطوں کی [illegible] شعر، رنگ، [illegible] اور فلسفہ طرازیوں کا [illegible] گیا ہے اور اس مرقع نگاری کے میدان میں جعفر طاہر کے کم ہی حریف ہیں۔ ہر شاعر کسی ایک بات ہی میں منفرد ہوتا ہے۔ جو ممکن ہے کبھی اس کی کمزوری بھی بن جائے۔ جعفر طاہر کا جوہر خاص مرقع کشی ہے۔ وہ خارجی مناظر اور واضح [illegible] کوائف کا ناشر ہے۔ اس کے لئے اُس نے جہان معلومات کا دائرۃ المعارف [illegible] کیا ہے [illegible] الفاظ کا حیرت انگیز ذخیرہ بھی بہم پہنچایا ہے۔ [illegible] ایک جہان گرد تخیل [illegible] کی تمام [illegible] ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام [illegible] سے جو چیز پیدا ہوگی وہ کیا ہوگی۔ جعفر طاہر کی شاعری اسی کا شاندار مرقع ہے۔ اس سے کسی داخلی، کسبی انفعالی مصوری کی توقع بے سود ہے اور نہ ہر شاعر سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ میر یا غالب ہو۔ بعض خالص انشا پرداز بھی تو ہوتے ہیں۔ جعفر طاہر کی شاعری [illegible] ہی کی [illegible] ہے۔ ایک دوسرا ابیقورس جو حواس کی تلچھٹ تک میں بے پایاں لذت محسوس کرتا ہے [illegible] جیسی کیف رنگ اور لطف رعنائی کی [illegible] تک نہیں چھوڑتا [illegible] باریک ترین جزئیات اپنے موقلم کی باریک نوک سے اُجاگر کر دیتا ہے۔ مثلاً "نیم کے بعد" (ماہ نو ستمبر ۱۹۶۰ء) کو ملاحظہ فرمایئے جس میں نظم کا جادو عنوان ہی سے شروع ہوتا ہے۔ [illegible] آگیا۔ [illegible] کے لئے ہمارا معنی آلش [illegible] سات اور [illegible] سرگم سمبولو [illegible] کا انداز ہے جس کا [illegible] ہم میں سے کس کے ذہن [illegible] ایسا ہوا نہیں؟ اس الاپ میں مغربی پاکستان کے [illegible] کے سندر دیس کا سماں اس کی سندر بھاشا میں کھینچا ہے

یہ صرف [illegible] صحیح ہے "نیم" کے بعد قدرتی طور پر ششم ہی ہو سکتا ہے اور یہ [illegible] ششم ہی ہے۔ سنگیت کے [illegible] سے الاپ کی [illegible] ظاہر ہے۔ جعفر طاہر اس لحاظ سے ہمارے تمام شاعروں میں منفرد ہے کہ وہ ملک [illegible] سے اُن [illegible] زبان کو جان لیتا ہے [illegible] ان بھی اسی طرح بے تکلفی سے برتتا ہے جس طرح کشمیری، پوٹھوہاری، پنجابی، ملتانی، [illegible] اور یہ دلوں ہی کی بات ہے کہ وہ بنگلا کو بھی اسی طرح برتنے لگا ہے جیسے شاید خود بنگالی بھی نہیں برت پاتے [illegible] ساتھ ہی اُس نے جس طرح "نیم" کے بعد اور اس کے بعد کی نظموں میں مشرقی پاکستان کی زندگی اور فضا کے نقشے پیش کئے ہیں اُن کی مثال بنگالی کوتاہیں بھی دکھائی نہیں دیتی!

رینگتے ناگ، جوان شیر، یہ وحشی چیتے ا
سر جھکائے ہوئے ہاتھی کہیں پانی پیتے
دامنی جیسے کوئی چنچل، الھڑ ا ... بجلی
تیلیاں توڑ کے چلمن کی جیسے جا ... ہو
ہائے سا ... گا ... آنکھ ... ا ... ل

اور اس خوبصورت رنگ ہی رنگ تصویر کا ... تو شاید ہی کہیں دکھائی دے:-

"میری دھرتی تو بنی بیٹھی ہے دلہن جس کو
پیا ملنے آیا ہے ساون کا رنگیلا ... ا
رنگ میں ڈوب کے آئے ہیں ... سارے
مونگئے ملنے لپٹے ہیں سروں سے ... بادل
سبز ڈولی کوئی کاندھے لیا جائے دیکھو لیا
پیچھے پیچھے کوئی دیتا چلا جاتا ہے ... برات ... نصب

"بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن یا نبی، اللہ اکبر
یا رسول اللہ!

مختار صدیقی کی آوازوں کی ... گو ... اس مدھر سنگیت کے رنگ رس کو اور بھی دوبالا کر ... ہے۔ دیکھنے کی مغربی پاکستان کا ہوتے ہوئے بنگالی بھاشا ... کا رس گھولتا ہے:-

"نشتے جا ... پھولو بنے ہے ... ا
نشتے جا ... پھولو بنے
جالائے چندر بدرو باتی
جیگے رد بدو شادارا تی کو
کو نیبو کتھا شیشر و شنئے بہے کھو سرا

صرف اسی نظم کو لیا جائے تو اس کے متعلق کہنے کو ایک دنیا ہے۔ "سکن روپ" (ماہ نو دسمبر ۱۹۶۰ء) میں نے کچھ اور آگے بڑھتی ہے۔ الا یہ کہ بعد بڑھت ... کھو را لے کے ... سے مست ہو کر کیا رنگ دکھاتا ہے۔

تیلیں رہنے۔ مہکتے ہوئے بن، مست فضائیں یہ سگن روپ کی گاتی ہوئی دھوپ، تال، تالاب، کنول، کنڈ، بھرے جھنڈ، گھٹا، دھرتی کا یہ پھاؤ یہ البیلا سروپ شمال میں شالی کے لپٹے ہوئے فردوس، جنوں زار یہ پٹ سن کی ... زر تار ناریاں، سانوریاں، کامنیاں، جن کے کھرے جوڑوں پہ تقدیر کے پیچاک شمار کوئی سنتھال کی دوشیزہ جو دوسرے پہ تو سلہٹ پہ ابھرتا ہوا سورج کوئی گنتی آکاس مکھی دیویاں، شبھ نام جیرن کملیاں، گج گامنیاں، نند ردنی ہائے یہ تال پہ توڑے یہ تڑپ کون سرت کا رپہ گت ناچتی ہے ... اواں میں سے گلہ کیا جو کہے کون یہ مادان گمت ناچتی ہے۔

اور اس کے بعد خالص جعفر طاہری جیز جو اسی کا حصہ ہے اور صرف وہی اس کے گر جانتا ہے:-

ہا یہ بنگال کا ناچ
میری دھرتی کے ... سال کا ناچ
آر دھنگ روپ
جیسے چھاؤں دھوپ
نرکھت انوپ
ہے جگ تو کھوپ
کرڈھک ڈھمک گتی ڈامرو باجے
ڈا ڈ ڈھا ڈھا ڈھا ڈھا

"کنول کنڈ" میں کوی بنگلا دیش کے اور بھی نت نئے گیت روپ اجاگر کرتا ہے اور ہمارے سامنے اس کے اڑتے ہوئے بادلوں کی پرچھائیوں پر پرچھائیاں یا ہوا کی موجوں سے بدنا اور بوڑھی گنگا کی سطح پر ان گنت سرت کار آکاس مکھی شبھ نام جیرن کملی، گج گامی، نند ردنی، لہروں پر لہریں کیا کیا البیلی مدھر گتوں پر ناچتی ہیں۔

مشرقی پاکستان نے جس طرح مغربی پاکستان کے شاعروں کو مسحور کرنا شروع کر دیا تھا اس کی جھلک ہمیں قیام پاکستان کے جلد ہی بعد دکھائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ

محمود اکبرآبادی کی نظم "مشرقی بنگال کا ملاح" بنگالی زندگی کی ایک پُرلطف مثال ہے۔ اس کے ایک دو بند ملاحظہ ہوں جو موجودہ طوفانوں کے پس منظر میں معنی رکھتے ہیں [illegible] ہمتی ہی نہیں بلکہ ان [illegible] جوان [illegible]

وہ ہمارے میٹھے پانی کے [illegible]
جن کی پہنائی سے حیرت میں ہے [illegible]
جن کی موجوں سے ازل کا جوش ہے [illegible]
ان کے طوفاں نے تھکے سو بار [illegible]
تجھ پہ [illegible] اور [illegible]
کہ ہزاروں امتحاں سے سُرخرو آیا ہے تو
دونوں جانب پاٹ کے کھیت اور وہ دھان کے [illegible]
وہ بگلا [illegible] سے منظر کا [illegible]
نرم ساحل اور [illegible] دریا کا [illegible]
تُو نے جو دیکھا ہے مجھ کو بھی دکھلا [illegible]
وہ بحر وہ [illegible] لیکن کہاں سے لاؤں گا
تیری نظروں کا فسوں لیکن کہاں سے لاؤں گا

ایسے ہی شاعر کے تصور نے مشرقی پاکستان کے ایک دلآویز منظر کا عکس بھی پیش کیا ہے "بوڑھی گنگا کے کنارے شفق کا منظر" وہ کہتا ہے:

[illegible] رنگ رنگ کی [illegible]
[illegible] عالم نو سے عقل دنگ
احمر و زعفرانی و [illegible] کبود و سُرمئی
اخضر و ارغوانی و [illegible] و بنفشئی

اور ان بے شمار رنگوں میں ایک رنگ یہ بھی ہے:

جورِ وطن سے چھوٹ کر [illegible]
دختِ مہاجرِ غریب تُو نے یہاں پناہ لی

اس شاعر کو بنگال کے جس جادو نے مسحور کیا ہے وہ شنید سے زیادہ دید پر مبنی ہے۔ اسی لئے اس میں تخیل کے ساتھ واقعیت کا رنگ بھی چوکھا ہے۔ ایک سحر زدہ انسان کی طرح وہ اس کی طرف بار بار رجوع بھی کرتا ہے۔ لیکن "دوشیزہ کا نغمہ اور پاٹ کا کھیت" غالباً اس کی بہترین چیز ہے۔ یہ نظم [illegible] بہت ڈوب کر لکھی گئی ہے:

[illegible] میرے بنگال کی [illegible]
تجھ کو قسمت نے پالا ہے جہاں فاقہ [illegible]
[illegible] نہ صحرا ہوں نہ میں پریوں کی ہمسر ہوں
[illegible] تن آزاری کی خوگر ہوں
[illegible] وہ جوہر ہوں
[illegible] گردن [illegible]
[illegible]
[illegible] کو کلا [illegible]
[illegible] کوئل کی وہ [illegible]
[illegible] طوطوں سے [illegible]
[illegible] کی خوشبو
[illegible]

مختصر یہ [illegible] "بنگال" سے قطع نظر جس میں اس نے مشرقی پاکستان کے بعض پہلوؤں کے علاوہ [illegible] آبادیوں کی ایک تصویر "[illegible] لڑائی" کا تذکرہ بھی کیا ہے اس نے ایک طویل نظم "ملکہ بنگال" بھی لکھی ہے جسے مشرقی بانو کی [illegible] کا سراپا کہنا چاہیے۔ ایک جیتی جاگتی تمثیل اسی کے پس منظر میں [illegible] جو نظم میں اور بھی گہرائی، پہنائی اور نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ صنف قدیم ہونے کے باوجود رنگ آہنگ اور تصور بالکل جدید ہے:

اک عالم برق و آب دیکھا
کل رات عجیب خواب دیکھا
اوڑھے ہوئے چار سو فضائیں
ظلمت کی ہزار [illegible] ردائیں
جنگل کی دھاڑتی ہوائیں

صحرا سے اُٹھی ہوئی بلائیں
یکبار گھری ہوئی گھٹائیں
ہر سمت بلا کی سائیں سائیں
پانی وہ برس رہا تھا چھاجوں
بیزار تھی رُوح جس کے ہاتھوں
ایسے میں کڑک کر ایک بجلی
یوں صحن میں میرے چھم سے اُتری
اک پل میں دل و نظر کو روندا
نس نس میں اُتر گیا وہ کوندا

طوفانوں کا نقشہ کس قدر زوردار یعنی طوفانی ہے:۔

اب موت کا راگ ہے چھما چھم
ہر سمت چھڑا ہوا ہے ماتم
اک وحشتِ مرگ زاد ہر سو
ہے ہلّہ برق و باد ہر سو
پانی نے اِدھر کسے شکنجے
بجلی نے اُدھر چبھوئے پنجے!
سُن تو نے اُٹھائے ہیں وہ طوفاں
ملّاح بچے نہ جن سے دہقاں

انہی نغمہ وروں میں ایک جمیل الدین عالی بھی ہیں جس نے دوہوں کے درپن میں مشرقی پاکستان کی بڑی اچھوتی اور من بھاتی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس مختصر پیمانے پر تصویر کشی کے برعکس رفیق خاور زیادہ وسیع کینوس پر مرقع کشی کرنے والے یگانہ رزوں میں شامل ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا اُس نے اپنی طویل نظم "سرود دریائی" میں پاکستان کے مختلف حصّوں کا نقشہ ان کی سب سے نمایاں چیزوں کے ضمن میں پیش کیا تھا، اور مشرقی پاکستان کی سب سے نمایاں چیز آبِ رواں سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ مُرقّع بہت طویل ہے اس لئے اسکو بجنسہٖ پڑھا جائے تبھی اسکا صحیح کیف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے دریاؤں کی بے اندازہ طغیانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نظم کو بھی قصداً طویل بنایا گیا ہے اور آب رواں کی ہلکی چھلکی بولی میں مشرقی پاکستان کی زندگی ہی نہیں سمو دی گئی بلکہ تازہ ترین ترقیات کی طرف نہایت بلیغ اشارے بھی ہیں (ملاحظہ ہو ماہ نو خاص نمبر بابت اگست سنہ ۱۹۵۵ء)

اُردو شاعری نے جہاں چند ہی سال کے مختصر عرصے میں مشرقی پاکستان کے اس قدر گوناگوں، لطیف اور اچھوتے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے وہ اس کے لئے باعثِ ناز ہے اور ہمارے دیس کے اس حصّہ کو قریب تر لانے اور مانوس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس عکاسی کے علاوہ خود بنگلا دیش کے بھی کتنے ہی شہ پارے ہیں جو اُردو شاعری کے دامن میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان کی کیفیت جُداگانہ ہے اور الگ تعارف کی مُتقاضی۔ مشرقی پاکستان کی جس شعری عکاسی کا یہاں سرسری تعارف کرایا گیا ہے، اگر اسکا ٹیپ کا بند کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ اُس کوی ہی کے یہ اشعار ہیں جس نے شروع شروع میں اس گیت کا الاپ پیش کیا ہے:۔

یہ لہریں یہ ان کے نرالے ترانے سُہانے سُروں کے مقدّس خزانے
یہ لہریں جو تلوا رہی آئینہ بھی "لورے چندرانی" "ستی مو ئنا" بھی
یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ سُناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماسہ"
یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری ہے قاضی کی عزّت سے عزّت ہماری
یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر یہ تحفہ یہ سیف الملوک اور سکندر
گگن کی طرح موجۂ ہفت پیکر یہ پدماتی جائسی کی طرح پر
اِدھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو یہ مسلم ساہتیہ سمیتی بھی دیکھو
سُنو آج سیّد الاوّل کی بولی یہ سانول کی بولی یہ اُنول کی بولی
یہ بولی ہے نذرل سے آتش بیاں کی مشرف کی اور کیقبا د جواں کی
یہ لہریں سُناتی ہیں شیشہ شکوہا سُنا تا ہوں میں انکو ہاشم کا دوہا

....

ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جس کا نام
سیس نوائے سورج راجہ اُدرج کرے پرنام

احمد حسن دانی

بنگال میں اسلام

(عہدِ مغلیہ سے قبل)

مسلمانوں کی فتح بنگالہ سے کہیں پہلے اسلام اس سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں مسلمان مشائخ، مبلغین اور صوفیائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ کو بہت دخل ہے جنہوں نے عوام کے دلوں میں تبدیلی پیدا کی۔ اگرچہ اس وقت کے معاشی اور مذہبی حالات نے اسلام کی ترویج میں کافی مدد دی ہوگی، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے تسلط نے بھی اسے مقبول عام بنانے اور لوگوں کے دل اس کی طرف راغب کرنے میں مدد کی پھر بھی بلاشبہ اشاعت اسلام کا سہرا زیادہ تر اُن مسلمان درویشوں کے سر ہے جنہوں نے ہمت و جرأت سے کام لے کر شمع ہدایت روشن کرنے کے لئے سب سے پہلے اس اسلام سے ناآشنا سرزمین پر قدم رکھا، مخالف مذاہب کے پیشواؤں سے ملاقات کی اور انہیں بحث و مباحثہ اور زہد و تقویٰ میں شکست دے کر بالآخر ان کی جگہ خود لے لی اور اپنے گرد و پیش کے عوام کے قلوب کو اپنے کشف و کرامات اور فیوض باطنی سے مسخر کر لیا۔

زمانہ قدیم سے یہ بات مشہور ہے کہ عرب لوگ تجارت کی غرض سے بنگال کے ساحلی علاقوں میں آتے تھے اور اُس زمانے میں ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ جس ملک میں جاتے اپنے نجی کاموں کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے جاتے۔ اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ نویں صدی عیسوی میں ایک مرتبہ ان عربوں کے جہاز رنبی کے ساحل سے پرے ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ جو عرب اس حادثہ سے بچ گئے تھے اُنہیں اراکان کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ بادشاہ ان کے مذاہب سے بہت متاثر ہوا اور انہیں مواضعات میں آباد کرا دیا۔ مسٹر جی۔ ای۔ ہاروی نے اپنی تصنیف "تاریخ برما" میں ان عربوں کے مذہبی مقامات کی تصریح کی ہے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس صدی کے لگ بھگ اور اس کے بعد بھی بنگال میں کچھ بزرگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ان میں شاہ سلطان مہیشور، بابا آدم شہید اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان حضرات کے متعلق جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔ اور انہوں نے بنگال میں کیا اثر چھوڑا۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب شاید کبھی نہ مل سکے۔ کیونکہ کسی مستند تاریخ میں ان کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ بہرحال ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ محمد بختیار خلجی کی فتح سے بہت پہلے بنگال میں مسلمان بزرگوں کی آمد کا راستہ چاٹگام رہا ہے۔ محمد خاں کی تصنیف "مقتل حسین" میں جو بعد کے زمانے کی تصنیف ہے، اس علاقے میں مسلمانوں کی پہلی فتح اور مسلمان بزرگوں کی آمد کے متعلق کچھ روایات درج ہیں۔

ان صدیوں میں بنگالی معاشرہ عمرانی و مذہبی لحاظ سے ایک انقلابی دور سے گذر رہا تھا۔ یہاں کی آبادی جس میں غیر آریائی لوگوں کی اکثریت تھی، خاص طور پر جنوب اور مشرق میں بدھ مت کی اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر

اُس کی بیرون بنگلی تھی اور گورا مائن، مہابھارت دیوی دیوتاؤں کے ہر دلعزیز قصے کہانیاں ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے پھر بھی ان کے مذہبی عقائد میں تنتروں یعنی سنسکرت کی قدیم مقدس کتابوں کی طلسمی عبادت کو بہت دخل تھا۔ وہ اپنے تنتروں کے گیانی پُراسرار گرو سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور اس کا بے حد احترام اور پرستش کرتے تھے۔ بدھ مت اور ہندو مذہب میں کوئی کشمکش نہ تھی۔ کیونکہ گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بدھ مت والے ہندو دیوتاؤں اور ہندو مذہب والے بدھ مت والوں کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن جہاں تک ذاتوں کی تقسیم کا تعلق ہے ہم ان کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے اگر قدیم روایات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ سینا دور میں ذات پات کے اصولوں کی تہذیب اصلاح کی گئی اور نئے سرے سے ذاتوں کی تقسیم عمل میں آئی۔ ممکن ہے کہ بعض علاقوں میں لوگوں کا رجحان پھر سے ہندو مذہب کی طرف ہو گیا جس کی وجہ سے ہم بدھوں کے کھنڈرات پر ہندو مندروں کو کھڑا پاتے ہیں مثلاً مہاستھان میں۔ لیکن اگر برہمنوں سے قطع نظر کر لی جائے تو ہمیں قطعاً معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں عوام کا ردِ عمل کیا تھا۔

اُس زمانے میں ہم تادیا بر بختیار خلجی کے حملے لکھنوتی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو جانے کا حال پڑھتے ہیں لیکن ان سورماؤں کے ہاتھوں غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کرنے کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ مسجدوں کی تعمیر اور مدرسوں کے قیام کی بابت ضرور معلومات فراہم ہوتی ہیں، طبقات ناصری میں صرف ایک شخص علی میچا کا نام ملتا ہے جسے خود بختیار خلجی نے مسلمان بنایا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس جیسے اور بھی بہت سے آدمی مسلمان ہوئے ہوں لیکن ان کا مقصد تمام تر مادی ہو مگر اس میں مثالیں صریحاً مستثنیات کے ضمن میں ہوتی ہیں۔ غیاث الدین عوض خلجی کے متعلق سننے میں آتا ہے کہ وہ اہلِ علم و اہلِ صفا کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا اور اُن کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھتا تھا۔ ایک دفعہ فیروز کوہ کا ایک امام زادہ اس کے دربار میں آیا اور اس نے ذکرِ امام علیہ السلام بیان فرمایا جس کے صلے میں اُسے بیش بہا تحائف پیش کئے گئے۔ اسی تیرھویں صدی عیسوی میں لکھنوتی اور دہلی کے مابین گہرے تعلقات تھے اور گمان غالب ہے کہ نئے نئے صوبیداروں کی آمد کے ساتھ ساتھ بنگال میں نئے مسلمان پہونچتے رہے اور مشہور مشائخ کے مریدوں نے بھی اس علاقے میں اپنے پاؤں جما لئے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک خط مرقومہ ۱۴۱۵ء سے ہمیں ان بزرگانِ دین کے مختلف سلسلوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے اُنہوں نے لکھا ہے کہ سرزمین بنگال بھی کتنی عمدہ سرزمین ہے جہاں مختلف مقامات سے بے شمار مشائخ اور فقرا آئے جنہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر دیو گاؤں کو لیجئے جہاں شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے ستر ممتاز مُرید ابدی نیند سو رہے ہیں سلسلۂ سہروردیہ کے کئی اور ممتاز بزرگ مہیسن میں مدفون ہیں۔ یہی حال دیوتلہ میں سلسلۂ جلیلیہ کے بزرگوں کا ہے۔ نارکوٹی کے مقام پر بھی شیخ المشائخ اور شیخ احمد دمشقی کے بعض بہترین رفقا کے مزاروں کا پتہ چلا ہے سلسلۂ قادر خانی کے بارہ بزرگوں میں سے ایک حضرت شیخ شرف الدین طوامہ کا مزار سنار گاؤں میں ہے حضرت شیخ شرف الدین خیری آپ کے خاص مریدین میں سے تھے ان کے بعد حضرت باد عالم اور حضرت بدھ عالم زاہدی گزرے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کے شہروں کا تو کیا ذکر کوئی قصبہ اور کوئی قریہ ایسا نہ تھا جہاں بزرگانِ نہ پہونچے ہوں اور آباد نہ ہوئے ہوں۔

ان بزرگوں میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزی اور

حضرت بدرِ عالم کے نام خاص طور پر مشہور ہیں موخر الذکر غالباً وہی بزرگ ہیں جنہیں بنگالی روایات کے مطابق شیخ بدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور آج تک بنگالی ملاحوں کے دل و دماغ پر ان کا غلبہ ہے۔ شیخ جلال الدین کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ شیخ جلال الدین تبریزی کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ ان سے ابنِ بطوطہ نے کامرو میں ملاقات کی تھی۔ شیخ جلال کے نام کے ایک اور بزرگ سلہٹ کی درگاہ میں مدفون ہیں ۱۵۱۲ء کے بعد کے کتبوں میں ان کا نام درج ہے۔ جلال الدین شاہ نامی ایک اور بزرگ کا تذکرہ سنسکرت کی کتاب "سکس بھودا" میں ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ تمام لوگ ایک ہی شخص کے مختلف نام ہوں لیکن سنسکرت کی اس کتاب میں جو کہانیاں درج ہیں اُن سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان مسلمان بزرگانِ دین نے غیر مسلم آبادی کو کس حد تک متاثر کر لیا تھا۔ اُن حضرات نے اپنے کشف و کرامات، اپنی پرہیزگاری، دانشمندی اور سب سے بڑھ کر اپنی سادہ و بے لوث زندگی سے لوگوں کو بیش از بیش تعداد میں ان سے فیضان حاصل کرنے پر آمادہ کیا ہو گا کم از کم اس کتاب سے یہی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اور بہت سے بزرگانِ دین بنگال آئے جن کا مسلمان بادشاہوں کے دربار میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان فخر الدین کو فقرا سے اس قدر محبت و عقیدت تھی کہ اُس نے ایک بزرگ کو سدکوان میں اپنا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ سلطان فخر الدین نے حکم جاری کر دیا تھا کہ دریائی سفر میں فقرا سے سامان کا محصول نہ لیا جائے اور جن کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ ہو اُن کے کھانے پینے کا سامان کیا جائے۔ جب کبھی کوئی فقیر کسی گاؤں میں پہونچے تو اُسے نصف دینار دیا جائے۔

الیاس شاہ کے کتبوں (۱۳۴۲ء) میں ایک اور بزرگ علاء الحق کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اخی سراج الدین کے جانشین تھے جن کا مزار گوڑ کے مقام پر ہے۔ علاء الحق کے فرزند حضرت نور قطب عالم اس لئے مشہور ہیں کہ انہوں نے راجہ گنیش کے زمانۂ عروج میں سیاسی معاملات میں دخل دیا تھا۔ راجہ گنیش کے بیٹے نے جس کا اسلامی نام جلال الدین تھا۔ انہی کے اثر سے اسلام قبول کیا یا نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ آزاد خیال ہندو تخت حاصل کرنے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس قسم کی آزاد خیالی کی کافی شہادت ملتی ہے۔ پورنیہ کے شیخ حسین دھکرپوش جو مخدوم شاہ حسین اور بی بی کمال کے صاحبزادے تھے حضرت شاہ نور قطب کے ہمعصر تھے۔ ایک اور مشہور بزرگ مولانا عطا گزرے ہیں جن کا مزار سکندر شاہ نے دیوی کوٹ میں تعمیر کرایا تھا۔

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اشاعت اسلام کے سلسلے میں کیا خدمات انجام دیں۔ الیاس شاہی سلاطین اور حسین شاہی حکمران فطرتاً بڑے فراخ حوصلہ تھے اور اُن کے زمانے میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل تھے۔ اُس زمانے میں ہمیں بنگال کی تاریخ میں ہندوؤں پر جزیہ یا اسی قسم کے کسی اور ٹیکس کا ذکر دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برخلاف ہم ہندوؤں کو اعلیٰ شہری اور فوجی منصب پر فائز پاتے ہیں۔ گہرا تعلق یقیناً ان میں اختلاط و ارتباط کا باعث ہوا ہو گا۔ بعض ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ رتن فا جیسے غیر ملکی حکمرانوں کو مسلمان بادشاہوں نے "منکیا" کے ہندوانہ خطاب سے نوازا۔ سرکاری افسروں اور شاعروں کو مسلم خطابات دینے کا رواج عام تھا۔ اس سلسلے میں استثنا بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ جب ارا کان کے جلا وطن راجہ کو غالباً نصیر الدین محمود نے اس کی گدی واپس دلائی تو اُسے اپنے سکے پر کلمہ ثبت کرنے اور اسلامی نام اختیار

کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ایسا جبراً ہوتا تھا یا رضامندی سے۔ علاوہ ازیں کافی شہادت موجود ہے کہ مسلمان بادشاہ فقرا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن کے لئے خانقاہیں تعمیر کراتے تھے۔ گزارے کے لئے اراضیات عطا کرتے تھے اور روزمرہ کی زندگی کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرتے تھے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی ان بزرگوں کو غیر مسلم راجاؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو مسلمان بادشاہ ان کی امداد کے لئے فوجی کمک بھیجتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ کس طرح فیروز شاہ نے سلہٹ کے بزرگ شاہ جلال کو گور گوبند کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے امداد دی تھی لیکن اس کی صداقت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اس سے قطع نظر ایک اور قسم کے سورما بھی ہیں جنہوں نے اشاعت اسلام میں قطعی طور پر امداد کی ہے، مسلمان سلاطین نے اپنے سپہ سالاروں خان جہاں (جو بیگار ہاٹ میں مدفون ہیں) ظفر خاں غازی اور کنند وار کے شاہ اسمٰعیل غازی کو اپنے اپنے علاقے فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے تو اُن کا اثر اس قدر پھیلا کہ لوگوں نے انہیں بزرگ تصوّر کرنا شروع کر دیا اور بہت سے مقامی باشندے ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ پیر علی مسلمان کا واقعہ جو خان جہاں کے سامنے ایمان لایا تھا اس قدر مشہور ہے کہ اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

ان مسلمان بزرگوں کی خانقاہیں بالعموم ایسی جگہوں پر ہیں جو مقامی باشندوں کی نظر میں پہلے ہی سے اس لئے مقدس تھیں کہ ان کا تعلق ان کے پرانے گردوں، مندروں اور پاٹھ شالوں سے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب لوگوں کے جوق در جوق آنے سے ان بزرگوں کی پرہیزگاری، دانائی اور کشف و کرامات کا چرچا سُنا تو یہاں کے باشندوں کو ان سے اور بھی محبت و عقیدت ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے جوق در جوق ان کی خدمت میں آ کر فیضان حاصل کرنا اپنے لئے سعادت کا باعث سمجھا بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمان کہنے میں مطلقاً کوئی پس و پیش محسوس نہ کی۔

آبِ رواں کی سرزمین (بقیہ سلسلہ)

ہنستے کھیلتے بچّوں کی آوازیں، اور چرواہے کی بانسری کی درد بھری آواز گونج ڈھولی کے وقت۔ یہی وہ گھر ہے جس کی لگن ہر مسافر کے دل میں رہتی ہے، خواہ یہ کتنا ہی سیدھا سادا کیوں نہ ہو یہ وہی جگہ ہے جس کے متعلق ہم عظمت اللہ مرحوم کے ہمنوا ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ:۔

وہ چین کہاں اپنے گھر کا
وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا اپنا گھر

مخمور اکبر آبادی

مشکیں دوشیزہ کا نغمہ!

اور

پاٹ کا کھیت

(مشرقی پاکستان کی حیات کا ایک منظر)

زمیں میری ہے میں بنگال کی گمنام دختر ہوں   مجھے عسرت نے پالا ہے جمالِ فاقہ پرور ہوں
نہ خضرا ہوں، نہ حمرا ہوں، نہ میں بربوٹی ہمسر ہوں   فسونِ جانفشانی ہوں، تن آزاری کی خوگر ہوں
جسے اب تک نگاہوں نے نہیں پرکھا، وہ جوہر ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

زمانہ میرا دشمن ہے فلک مجھ کو کچلتا ہے   کھڑی رہتی ہوں دن دن بھر تپش سے تن پگھلتا ہے
لہو کی آگ کا لیکن زمیں پر زور چلتا ہے   جنوں کا جوش، آخر خاک کی فطرت بدلتا ہے
مری ہمت سے اِک دن کھیت میں سونا اُبلتا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

یہ لو پٹ سن بناؤ اس سے شہزادی کا پیراہن   نہیں محتاجِ آرائش، ازل سے حسن کا تن من
مری تزئین کو کافی ہے، میرا مدہ بھرا جوبن   چھریرا تن، کمر پتلی، سُتی پنڈلی، نظر پرفن
مری بدلی مرا کاجل، مرا دریا مرا درپن
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

مری سنگیں جوانی، تنسبے قبرنگ سے نم ہے   خطوط و خم کا جادو ہے، نوید لامِش و رم ہے
لبوں کی نرم جنبش، ارغنِ فطرت کی سرگم ہے   میں جس دم گنگناتی ہوں، حیاتِ دل دہی دم ہے
مری اٹھکھیلیوں کی چال رقصِ موجۂ یم ہے
نہ ڈالا مری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

ڈلی کے کُنج میں جب لی ہے میں نے تن کے انگڑائی — تو دیکھا ہے کہ اکثر جُھوم کر کالی گھٹا چھائی
فضا بدلی، اچھوتی سوندھی سی پُھوٹی، مہک آئی — انوکھے رُوپ میں ہوتی ہے مستی کی پزیرائی
تڑپ جاتی ہوں، یوں دیتی ہے فطرت داد برنائی
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

جدھر نظریں اُٹھاؤں تتلیوں کی جھیل ہے ہر سُو — مرے اُڑتے کھلونے ہیں پلوٹھے، کوکلا، تیتھو
پپیہے کی وہ پیہم پی کہاں کویل کی وہ کُو کُو — فضا طوطوں سے پُر اور ڈالیوں پر ان گنت جگنو
مجھے مدہوش سا رکھتی ہے پکے مور کی خوشبو
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مرا ہر گام گت، باشے میں جب چاول پساتی ہوں — مرا ہر گام سم، باشے سے جب کھیتی پہ جاتی ہوں
اندھیری رات کو آمین کی لوری سے سُلاتی ہوں — گجر دم جُو گئے سے نور کا جادو جگاتی ہوں
بھری برسات میں ملہار سے جھڑیاں لگاتی ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مجھے دیکھو، مجھے دیکھو، میں ایمانِ فلاکت ہوں — مری ثروت یہ کیا کم ہے کہ میں محرومِ ثروت ہوں
مرا نام و نسب کیا، جذبۂ ایثار و خدمت ہوں — محبت کے لئے پیدا ہوئی ہوں میں محبت ہوں
مجھے پُوچھو نہ پُوچھو قوم کی دولت ہوں قسمت ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

بصیرت مِٹ چکی تو مِٹ چکی، لیکن یہ رونا ہے — کہ ذوقِ پاک بینی جس کو کہئے وہ بھی عنقا ہے
اندھیرا چھا رہا ہے لیکن ایک انجم جھلکتا ہے — مجھے اعجاز نے مخمور کی نظروں سے دیکھا ہے
وہ فخرِ اہلِ بینش، شوق کی آنکھوں کا تارا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

جعفر طاہر

کنول کنڈ

رے کنارے چلا جا رہا ہوں — نئی زندگی چار سو پا رہا ہوں
لہریں یہ ان کے نرالے ترانے — سُہانے سُروں کے مقدس خزانے
لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی — "نورے چندرانی"، "ستی مومینا" بھی
لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ — سناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماشہ"
قاضی کھد دولت ہے دولت ہماری — ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری
لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر — "یہ تحفہ" "یہ سیف الملوک" اور "سکندر"
ن کی طرح موجۂ "ہفت پیکر" — یہ "پدما بتی"، "یا نسی کی طرح پر
، تمام ان کے کئی کام ان کے — ہزاروں ہی جلوے بہرگام ان کے
ھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو — "یہ مسلم ساہتیہ سمیتی" بھی دیکھو
و آج سید الاول کی بولی — یہ ساتول کی بولی یہ راتول کی بولی
ولی ہے نذرل سے آتش بہار کی — مشرف کی اور کیفیا درجوان کی
لہریں سُناتی ہیں "شیشہ شکوہا" — سُناتا ہوں میں ان کو ہاشم کا دوہا
کہتی ہیں آؤ کوئی بیٹھ جاؤ — کوئی ہیر کے دیس کا گیت گاؤ

ڈھولا ٹریا دیندا میں ہئی چُنڑ دی پھٹی
تیری سوہنڑی صورت میری جندڑی لٹی
سیتو ترڑی مُٹھی

ڈھولا ٹریا دیندا
ڈھولا ٹریا دیندا میں ہئی دیلاں پھُٹی
ڈھولا نڑ کرے میں دی رہسیم ٹُٹی
میں دی ڈاڈھی بھٹی

ڈھولا ٹریا دیندا......
ڈھولا ٹریا دیندا میں ہئی رکھدی پُھٹی
ڈھولے مڑکے جوں تکیا میں ہس کے اُٹھی

سیتو دلڑی کُٹھی

ڈھولا ٹریا دیندا........
ڈھولا زمیاں دا راجہ میں چن دی گُھٹی
ڈھولا آپے آیا میری سوہنہ دی ٹُھٹی
میں تاں چوری کُٹی

ڈھولا ٹریا دیندا........
ڈھولا ٹریا دیندا بیٹھی منگدی دعائیں
شالا خیر ہووی ڈھولا وطناں تے آئیں
شالا ملیس چھٹی

ڈھولا ٹریا دیندا........
گیت سنگیت کی ہنس ہنس کے اُبھرتی لہریں
رقص کرتی ہوئی گنگ کنارے پریاں
ڈھلتے جسم پہ سینوں کے تھرکتے بجرے
سانوری باہنوں کی جھنکار پہ گاتے گجرے
پھول جوڑوں میں سجائے ہوئے سجرے سجرے
ناچتے نینوں میں کجراج ہے منڈل باندھے
ناگ جس طرح کنول کنڈ پہ کنڈل کاڑھے
پتلے ہونٹوں پہ ہنسی جیسے کسی وادی میں
حوریں سرگوشیاں کرتی ہوں خدا کے بارے
یہ کمر مار کے چلتی ہوئی دوشیزائیں
یہ ٹھمک چال، گگن کھیل، کھڑی لہرائیں
اور گماں ہو کہ سمے ناچ رہا ہے مادھو!
گہری لالی سے دہن لعل کا چھلا گویا

بات جس طرح خدا سوچ کے خوش ہوتا ہو
بال جس طرح کسی رُوح کی بھیانک راتیں
تہ بہ تہ، حلقہ بحلقہ، یم جولاں پیچاں
جس طرح سایوں میں گھلتے ہوئے لاکھوں سائے
جس طرح موت کی بڑھتی ہوئی لہریں ہائے
کشتیاں کتنے بھنور جال، یہ ماجھی بھائی
بالدا باغ سے گاتی ہوئی خوشبو آئی
لڑکیاں، بلبلے، دوکاں دار، کوی متوالے
ہائے یہ شہر یہ اس شہر کے رہنے والے
ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جسکا نام
سیس نوائے سورج راجہ روج کرے پرنام
محل دو محلے جگمگ جگمگ امرتی کا مان
باڑی باغ، بغیچے یگ یگ پریوں کے استھان
ہرے بھرے بانسوں کے جنگل پریم شوالے لاکھ
ملکر گائیں ان رُمنوں میں ساون اور بیساکھ
یہ شوبھا یہ جوبن یہ رچنا یہ رُوپ سروپ
چُپ کی چھاؤں شیتل ٹھنڈی ہنستی کنواری دُھوپ
چکر ملکر لہرائیں ناچیں ساگر ناچ سدا
دھن تا گے دِھن دھن دھن نا تو کتا دھے نک تا
ہنس ہنس کر دے پھول جو ماریں مُنش نہیں حیوان
طوطا، مینا، بکری، بلّی، گھوڑا، ہرن، سوان[1] (SWAN)
رات کو ران میں سوئی چھوئیں اور سجائیں سیج
گنگا جل کے چھینٹے ماریں ملے انوکھا تیج

جادو چھڑیاں، لِس کی بُڑیاں، تریا ترس کی بات
جھیل کنارے چندا تارے پیا ملن کی رات
دان میں دیں پردیسیوں کو جیون کی سندر جوت
آنکھ ملا کر مُکھ چُھپ جائیں کون لگائے چُھوت
ہر صورت پدما کی مورت کوئی میل نہ کھوٹ
منوا لِلک لِلک لہکائے نجریں ہوں لہلوٹ
جنم سوارتھ جنک ستا سیتاؤں کے بیرھاگ
اُوپر اُوپر پانی پانی اندر اندر آگ
یہ پُروا کی میٹھی تانیں بادل بہتے خواب
پاؤں دھریں تو دھرتی ساری عود، عبیر گلاب
گاتی گلیاں ہنستے ہاٹ، چہکتے سُندر باٹ
یہ دریا کا پاٹ چمکتا چاند، چھلکتے گھاٹ
ڈھولے جھومیں ڈامبرو باجیں کلمہ حمد اذان
گنگا جل میں بامن تیریاں آن کریں اشنان
چاند سے ملکر ہولی کھیلیں گائیں اگ لبسنت
رُوپ نِدھان، پدم پرتاپ، منوہر مکھ، جسونت
جس البیلی نار کو دیکھو وہ لالوں کی لال
تن پُھولوں کی گٹھڑی بھیگے بال بھڑکتے گال
کون کوی ہے جو نہیں لیوے انکی خاطر جوگ
لیکن میراسین سے میراجی والا سنجوگ
یہ ڈھاکہ ہے ڈھاکہ دیکھا سکے دوار ہزار
اس کی باون گلیاں باون اور ترپن بازار

ای۔ایم ملفورڈ

جسیم الدّین۔ دیہات کا شاعر

بنگلا کا یہ نامور شاعر بیسویں صدی کے اوائل میں مشرقی بنگال کے ضلع فریدپور میں پیدا ہوا۔ دیہات میں ذہین لڑکوں کو تعلیم حاصل کرنے میں عموماً بڑی دقّت پیش آتی ہے چنانچہ جسیم الدین کو بھی حصولِ تعلیم کے لئے بڑی جدّ وجہد کرنی پڑی۔ حُسنِ اتفاق سے ان دنوں ونیش آرداس کے زیرِ قیادت نوجوانوں کا ایک معرکہ آرا گروہ میدان میں تھا جو کلّول گروہ کے نام سے مشہور رہے۔ اور بعد کے ایک علم وادب کے پرستار گروہ کا پیشرو تھا جو "پاری چوئی" کہلاتا تھا اور اپنے علمی شغف کی بنا پر بعینہٖ غالب کے ان الفاظ کا مصداق تھا کہ

تریا کی قدیم ہوں دودِ چراغ کا

ان نوجوانوں نے اپنا سارا وقت ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور بنگلا ادب میں نئی رُوح پھونکنے کے لئے تجربات کرنا ان کا خاص مطمحِ نظر تھا۔ ان کی تعلیم تربیت تو زیادہ تر انگریزی میں ہوئی تھی پھر بھی اُنہوں نے ضرورت محسوس کی کہ وہ اپنی مادری زبان بنگلا میں زورِ قلم دکھائیں اور نظم ونثر کے نمونے پیش کریں۔ اس گروہ کے ممتاز اراکین ابنندر ناتھ ٹیگور اور برنندر ناتھ ٹیگور تھے۔ اِنہی کی مدد سے جسیم الدین کا پہلا افسانہ شائع ہوا اور اُس نے بنگلا میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

اِس کے بعد جسیم الدین نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کیا اور دیکھا کہ اس کی ایک نظم نصاب میں شامل ہے!

شروع شروع میں جسیم الدین کو سماجی اصلاح کا بے حد شوق تھا خواہ اُس کا تعلق کسی قوم یا ذات سے ہو۔ مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی، اسے اپنا دوست بنایا اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی عزّت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے حالانکہ ایک مُسلمان تھا اور دوسرا برہمو سماج کا پیرو۔

سنہ ۱۹۳۷ء کے قریب جسیم الدین ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہوا اور سنہ ۱۹۴۰ء میں نرائن گنج کی ایک خوبصورت خاتون سے شادی کی۔

جب جنگ کا آغاز ہوا تو گیت اور ڈرامے لکھنے کا جو خداداد ملکہ جسیم الدین میں تھا وہ حکومت بنگال کے فوجی پرچار کے شعبہ میں بہت مفید ثابت ہوا۔ جسیم الدین نے کتنے ہی گیت لکھے جن سے قحط زدوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے۔ فوجی بھرتی۔ شہری دفاع اور دواؤں کے نظم وضبط وغیرہ کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پایا۔ یہ گیت ریل گاڑیوں منڈیوں اور دیہات میں زور شور سے گائے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بھٹیالی عوامی گیت بڑے مقبول تھے۔ چنانچہ جسیم الدین نے بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کے لئے ان کو اپنایا۔ قیامِ پاکستان پر اس نے بڑے ذوق وشوق سے اس نئی مملکتِ خُداداد کی محبّت کے گیت گانے شروع کئے۔

حال میں جسیم الدین نے "سپیرے کی بیٹی" کے نام سے ایک بڑا زوردار ڈراما لکھا ہے جسے نشر بھی کیا گیا ہے۔ اور اسٹیج پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اسے انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔

جہاں کہیں شہروں سے دُور دیہات کی آزاد فضا پائی

جاتی ہے وہاں گیت اور ناچ خوب پھولتے پھلتے ہیں۔ یہ دونوں خوشی و خرمی اور باہمی عزت و احترام کی علامت ہیں۔ جہاں آجکل کی صنعتوں اور جدید تہذیب نے اپنا قدم رکھا وہاں یہ دونوں چیزیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ نہ گیتوں کی ترنگ باقی رہتی ہے نہ ناچ کی اُمنگ۔ ان کے برعکس انسانوں کو صرف ریڈیو ہی ہوائی نغمے بہم پہنچاتا ہے جو کام کرتے وقت ان کا دل بہلاتے ہیں۔ بلکہ دیہاتیوں کے آپس میں بے تکلف میل جول اور بھائی چارے سے جو ناچ پیدا ہوتے ہیں وہ بھی یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی شہری آبادیوں کے بالکل میکانکی، بے رُوح اور رُندھے ہوئے ناچوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

حقیقی عوامی شاعری ہمیشہ غنائیہ ہوتی ہے تاکہ اسے گایا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری زیادہ تر چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل ہوگی لیکن یہ لمبی نظموں کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے جن میں رہ رہ کر کوئی ٹیپ کا مصرع یا شعر آتا ہے یا کورس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ عوامی گیتوں کی ایک ٹھیٹ مثال یہ ہے ؎

ماچھی کو دُھن گہرے جل کی
پنچھیوں کو ہے ڈالی پیاری
ماں کو ممتا ہے جائے کی
جس کی کسک کو جانے وہ ہی
رنگ جُدا ہے سب گایوں کا
پر ہے دودھ سبھی کا اُجلا
سب دُنیا میں ماں کا نام
اور بیٹے بھی وہی مُدام

مشرقی بنگال کے دیہات میں جس طرح زندگی اپنی بھرپور توانائی اور آزادی کے ساتھ برقرار رہی ہے اس کی مثال اس برصغیر کے اور کسی حصے میں دکھائی نہیں دیتی۔ شاید یہ دریائی زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہو کیونکہ اس سے انسان قدرتی طور پر مضبوط اور جفاکش بنتا ہے اور ایک خاص قسم کا چلن پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سارے علاقے میں قریبی زمانے تک دیہاتی گھروں کے سردل بیل بوٹوں سے آراستہ ہوتے تھے اور دیواریں نقش و نگار سے بڑی آب و تاب کے ساتھ مُزیّن ہوتی تھیں۔ جہاں گرو مذہبی درویش جو جابجا گھوم پھر کر دینی تعلیم دیتے تھے وہ لمبی چوڑی بھڑک دار تصویروں سے مذہبی داستانوں کی توضیح و تشریح کرتے تھے۔ اچھے شگون کے لئے برتنوں۔ بالخصوص چاولوں کے برتنوں کے سرپوشوں پر بڑی نفاست سے رنگ روغن کیا جاتا تھا۔ بچے لکڑی اور چینی کے بڑے شوخ رنگ کھلونوں سے کھیلتے تھے۔ غریب عورتیں جو قیمتی جھالریں خریدنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ اپنی پھٹی پُرانی ساڑھیوں ہی سے لحاف بنایا کرتی تھیں۔

ڈھاکہ مشرقی بنگال کی عوامی تہذیب و تمدّن کا مرکز ہے اور جسیم الدین کی بود و باش اسی کے قریب ایک گاؤں میں ہے۔ جب میں اس سے پہلی بار ملی تو وہ میرے یہاں اسی طرح خوش خوش، مُسکراتا ہوا اور تاب و توانائی جرأت و ہمّت سے بھرپور آیا جیسے جنگل سے کوئی چمکیلی آنکھوں والا ہرن یا شیر اُچھلتا کودتا چلا آئے۔ کالرج کے "اگلے سموں کے کھیون ہار" کی طرح وہ بھی جب تک اپنی کہانی ختم نہ کرلے۔ آپ کو اپنی "آنکھوں کی گرفت ناگزیر" سے ہلنے نہیں دیتا تھا۔ اپنے سر کو بے پروائی سے پیچھے کی طرف جُھکائے چمکتے دانتوں اور خوش دلی اور بذلہ سنجی سے دمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ برابر اپنی کہانیاں اور گیت سُنائے جاتا تھا۔ اس کو سُنتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اُس نے دوسروں سے کیا لیا ہے اور کونسی چیزیں وہ اس وقت ایجاد کر رہا ہے۔

جسیم الدین سر سے پاؤں تک عوامی گیتوں اور قصّے کہانیوں میں ڈوبا ہے۔ وہ اپنے ہر فن پارے کے

شروع میں زیبِ داستاں کے لئے کسی نہ کسی عوامی گیت سے ایک دو مناسب مصرعے یا اشعار تحریر کر دیتا ہے۔

ایک اور شخص جس نے جسیم الدین ہی کی طرح عوامی گیتوں کو ہر دلعزیز بنایا ہے معنیؔ شیریں نفس عبوس الدین احمد ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جسیم الدین کی شعری پیداوار محض عوامی شاعری تک محدود ہے۔ اس میں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اوّل جسیم الدین نہ صرف غنائیہ نظمیں لکھ سکتا ہے بلکہ ایسی نظمیں بھی لکھ سکتا ہے جن میں تخیّل کی مُسلسل پرواز اور طویل بیانات کی ضرورت ہو۔ جو کسی زبان میں بھی ایک نادر اہلیت ہے۔ بیشک وہ مشرقی بنگال ہی کی زبان اور محاورہ استعمال کرتا ہے لیکن اس کے کلام سے صاف جھلکتا ہے کہ اُس نے ٹیگور کا بڑا غائر مطالعہ کیا ہے۔ یہ خصوصیت اس کے " سوز و گداز سے بھی جھلکتی ہے۔ یا اِس قسم کے اشعار سے :-

یہ گاؤں اُس گاؤں کو دیکھے
وہ گاؤں اِس گاؤں کو!

جسیم الدین کی خالص دیہاتی رُوح اسے زیادہ سے زیادہ حسّی اور واضح ہونے پر مجبور کرتی ہے اِس لئے اس کے یہاں نکھار ہی نکھار ہے۔ ابہام کا دُھندلا پن ذرا بھی نہیں۔ اِس لئے وہ اپنے نوجوان ہیرو رؔوپا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ وہ :-

کاٹ رہا ہے اوڑا بان
ٹاآلا بان کی تیکھی نوک
کال دھوتن بانوں کی جوڑی
کالکا بان اور آلکا بان
سب بانوں کی سینکڑوں شاخیں

کیا یہ نکھرے نکھرے اُجلے اُجلے الفاظ ایسے نہیں کہ شہروں کے باسی انہیں دیکھکر خود کو حقیر اور المقر خیال کریں؟

جسیم الدین کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر نظموں کا مجموعہ "بالوچر" یعنی "بیلا" ہے۔ چار کتابیں لمبی لمبی نظموں پر مُشتمل ہیں جن میں مُسلسل پروازِ خیال دکھائی دیتی ہے۔ ان سب میں کہانی کے مربوط و مُسلسل بیان کی وجہ سے بے حد ڈرامائی چستی پائی جاتی ہے اور افراد قصہ کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ ان میں سے "شوجان بندیار گھاٹ" کو سب سے زیادہ زوردار خیال کیا جاتا ہے۔ اب تک ان چار کتابوں میں سے صرف ایک یعنی سراپا کیف "زرکار لحاف کا کھیت" کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "رنگلا نائر ماجھی" اور "رکھائی" دو اور قابلِ قدر تصانیف ہیں۔ ان سب سے دیہاتی لوگوں کی جانی پہچانی خوشیاں اور غمیاں جھلکتی ہیں اور ساتھ ہی ایک حساس شاعر کی گہری ہمدردی اور سرور و کیف بھی چھلکا پڑتا ہے ؎

ہم کیا سمجھیں۔ ہم کیا جانیں؟ ‖ جروا ہے کے دل کی چوٹیں
کھیت میں وہ تن من کو گھلا نے ‖ من میں رکھے دُکھ درد کے سائے
خوشیاں ہماری "غم پرچھائیں" ‖ کیسے اس کا بھید بتائیں
اپنے دُکھوں کی اک دُنیا نے ‖ کتنے ہی دفتر ہیں بچھانے
کتنی "داریں" کتنے فسانے ‖ اور گیتوں کے تانے بانے
جو بھی پڑھیں یہ بول اور غزلیں ‖ جانے ہمارے دل کی باتیں
لیکن چروا ہے کا دُکھڑا ‖ من میں کھویا کھویا، گونگا!
اُس کی دُھنوں کو جانے کون؟ ‖ اُس کے سُر پہچانے کون؟
صرف اِک بنسی کی آواز ‖ اُس کے دل کا رونا ساز
دل پر لکھی ہے اک لافانی ‖ درد اور دُکھ کی تلخ کہانی
جیسے نہ گا یا کسی کوی نے ‖ دُور ہیں وہ سب اسکی لَے سے
پھر بھی اگر میں کان لگاؤں ‖ دھرتی سے دل کو دل سے ملاؤں
بالوں گا میں لڑہ اُس دُکھ کی ‖ دبی ہوئی بپتا اَن سُکھ کی

دھرتی مجھ کو پاس بُلائے
دل کی دھڑکن مجھ کو سُنائے

جسیم الدین دُکھ کے ماروں کی لمبی چوڑی بپتا سُنانے سے کبھی نہیں گھبراتا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک خالص بنگالی ہے۔

جسیم الدین عموماً بارہ یا سولہ ہجاؤں کی مثنوی میں نظم لکھتا ہے۔ جس میں صاف ناچ کی گتوں کی کھنک سُنائی دیتی ہے۔ ہلکے پھلکے بزمیہ مضامین میں یہ بڑی تیزی سے چلتی ہے لیکن المیہ موضوعات میں بڑی سنجیدہ بن جاتی ہے۔ برجستہ الفاظ کی ٹھیک ٹھیک تنظیم سے جسیم الدین نہ صرف گرمی اور پیاس کی شدت سے چٹختی ہوئی زمین کے کرخت چٹاخے کو ظاہر کرسکتا ہے بلکہ کوندے سے کڑکتے ہوئے طوفانی بادلوں کے ہجوم اور گھن گرج کو بھی ظاہر کرسکتا ہے۔ وہ شاعر کے بھیس میں مصوّر ہے۔ اس کے استعارے اور تشبیہیں گھسی پٹی اور پائمال نہیں۔ مثلاً:-

"کھال اُس کی سیاہ روغن سی"

"درخت چیرتی۔ کھیتوں سے شرر اُڑاتی دھوپ"

جسیم الدین کی شاعری میں کوئی بناوٹ، دور از کار بات یا بھول بھلیاں کی کیفیت نہیں۔ اس کے اشعار اس صفائی سے بہتے چلے آتے ہیں جیسے کوئی آبشار جھر رہا ہو اور اس میں حقیقی زندگی کے سے بے تکلف قہقہے اور آنسو ہیں۔ انسان اسے ایک بار ہی نہیں پڑھتا بلکہ بار بار نشے کیف سے پڑھتا ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں:-

"ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

جلال الدین احمد

زین العابدین

آج سے کوئی پندرہ برس پہلے ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ بنگال میں خوفناک قحط پڑا۔ کئی لاکھ مرد، عورتیں اور بچے بھوک اور فاقہ زدگی کا شکار ہو کر موت سے ہمکنار ہوئے۔ دیہات سے لے کر چھوٹے چھوٹے شہروں تک اور ان چھوٹے شہروں سے کلکتہ تک فاقہ زدوں کا ایک رینگتا، گھسٹتا کارواں تھا جس میں کتنے ہی راستے میں مر کھپ گئے اور جو کلکتہ پہنچ بھی گئے وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے اردگرد بچے ہوئے روٹی کے گلے ٹکڑوں پر جھپٹتے، غراتے ہوئے کوؤں اور کتوں سے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے زندگی سے ہاتھ دھوتے گئے۔

مصوری کا ایک جواں سال استاد جو لڑکپن میں گھر سے اس لئے بھاگ نکلا تھا کہ وہ بڑا ہو کر بڑے بڑے رنگین مناظر کی تصویریں کھینچنے میں کمال پیدا کرے گا، اور جس نے آرٹ اسکول کی طویل رخصتیں سنتھال پرگنہ کی دلفریب اور زندگی سے بھرپور عورتوں کی تصویریں کھینچنے میں بسر کی تھیں، ایک دن اسکول جا رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک ماں اور بچہ دکھائی دئے۔ ان ماں بچوں سے بالکل مختلف جن کی تصویریں وہ مصوری کے بڑے بڑے کلاسیکی شاہکاروں اور زندہ ماڈلوں سے تخلیق یا نقل کیا کرتا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی اُسے اپنی مصوری کی کلاسیں بھول گئیں اور وہ ایک کرب اور خود رفتگی کے عالم میں اپنے چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے پر لوٹ آیا۔ اس رات اس نے "میڈونا ۱۹۴۳ء" نامی تصویر بنائی۔ حسرت، شیفتگی اور گہرے کرب کا یہ نقش کم سے کم خطوط پر مشتمل ایک پُر زور خاکہ ہے جس میں ایک بچہ بھوک سے بیتاب، ایک عورت — جو کچھ دیر پہلے اُس کی جیتی جاگتی ماں تھی! — کے بھیانک پنجر کی فاقوں سے نڈھال چھاتیوں میں دودھ کی تلاش کر رہا ہے!! بچے کی یہ معصوم سوالیہ تلاش — اس المناک صورت حال پر بڑا ہی پُرمعنی تبصرہ تھا اور انسانی ضمیر کے لئے ایک لرزہ خیز چیلنج!

یہ اُن متعدد خاکوں میں سے ایک تھا جو مصوّر نے سینکڑوں کی تعداد میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ تخلیق کئے تھے۔ یہ خاکے بغیر کسی اہتمام کے دیسی سیاہی اور موقلم سے معمولی خاکی کاغذ کے پُرزوں اور گتے پر بنائے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیا اور بالکل غیر معروف نام، "زین العابدین" مصوّری کی دُنیا پر بجلی کی طرح چمک گیا۔ فنّی حلقوں میں خط کشی پر اس جواں سال مصوّر کی اُستادانہ قدرت اور اس کی بھرپور اختصار پسند اور گہری داخلیت کا چرچا ہونے لگا۔ یہ بنگال کا پہلا مُسلمان مصوّر تھا جسے اتنی عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ادھر یہ سب تھا اور اُدھر خود زین العابدین اکیلا، چُپ چاپ اسی تیزی اور تاثر کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا اور خاکوں پر خاکے بنتے گئے۔ ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی نقّاد "اسٹوارٹ گرفن" نے گزشتہ سال اپنے ایک مضمون میں زین العابدین اور اسپین کے عوامی مصوّر (GOYA) کا موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مصوّر GOYA کی طرح جو جبر و تشدّد، قید و بند اور جنگ و جدل کی صعوبتوں اور تباہ کاریوں پر غصّہ سے

جھلا اُٹھا تھا، زین العابدین بھی کھول اُٹھا اور ہسپانوی مصوّر کی طرح گہرے تاثر اور طیش کے عالم میں یہ ہولناک مناظر مصوّر کرتا رہا۔ کئی کئی دن صبح سے شام تک اس مہیب لامتناہی سلسلے پر نظریں جمائے وہ خاکوں پر خاکے بنائے جاتا اور جب آخر کار اس کا دل ہلکا ہوگیا اور اُس نے کام روکا تو دو ہزار کے قریب نقش تیار ہو چکے تھے! جن میں برصغیر کے اس دلدوز حادثے کا نقشہ یوں پیش کیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے آئے، ان خاکوں کو دیکھے اور پُوری طرح اندازہ کرلے کہ یہ حادثہ کیسا جانکاہ اور کتنا سنگین تھا۔ اس طرح ایک نوجوان مصوّر، جس کا نام شاید ہی کوئی جانتا ہو، تھوڑے ہی عرصے میں ایک عظیم فن کار تسلیم کرلیا گیا!!"

آج زین العابدین اپنی عمر کے چالیسویں سال میں ہیں، لیکن اب بھی پہلے ہی کی طرح شرمیلے، حسّاس اور دُھن کے پکّے۔ پاکستان میں آرٹ کی زبردست تحریک کے رُوحِ رواں۔ وہ مشرقی پاکستان میں فن کاروں کے اس حلقے کے بانی اور اس کے سب سے ممتاز فن کار ہیں جسے عام طور پر "ڈھاکہ آرٹ گروپ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ "گورنمنٹ آرٹ انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ" کے پرنسپل بھی ہیں۔ یونیسکو اور مختلف بین الاقوامی اداروں کے زیرِ اہتمام ان کی تصاویر کی متعدد نمائشیں بھی ہوچکی ہیں۔ نیز برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، میکسیکو اور امریکہ کے کئی کئی شہروں میں الگ الگ ان کا کام خراجِ تحسین وصول کرچکا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں ٹوکیو میں ان کی نمائش کے موقع پر ایک جاپانی نقاد ایبیس گرلی نے کہا تھا کہ "جہاں تک طرح، موضوع تک رسائی اور تکنیک کا تعلق ہے، یہ مصوّر ایک عظیم و قدیم ملک کی فنّی میراث سے کماحقہٗ واقف ہے اور ساتھ ہی ان نئے نئے تصورات پر بھی حاوی ہے جو عالمگیر ہوتے جارہے ہیں۔ اسے 'فضا' اور پس منظر کی ان تمام پیچیدگیوں، ہیئت کے جُدا جُدا پاروں اور قدرت کی اقلیدسی تشکیل کا فطری احساس ہے جس کی "مکعبیت" (CUBISM) کے علمبردار حمایت کرتے ہیں لیکن معلومات کے اس نئے خزینے سے اس نے صرف اتنا ہی کچھ لیا ہے جتنا وہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فن کی قومی اور مقامی روایتوں سے آمیز کرسکتا ہے۔"

اِس سے پہلے ۱۹۵۲ء میں جب پہلی دفعہ پارکلے گیلریز، لندن میں زین العابدین کی تصاویر کی نمائش ہوئی تو انگلستان کے مشہور نقّاد ایرک نیوٹن نے بھی زین العابدین کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ "ان تصویروں میں مشرق و مغرب کا ایسا امتزاج نظر آتا ہے جسے تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت دیکھ بھی رہا ہے اور سوچ بھی رہا ہے اور اس کے موقلم کی رفتار جو نہ کبھی جھجھکتی ہے اور نہ کبھی جھٹکے کھاتی ہے، اس کے مقصد کے لئے عین موزوں ہے۔ اس کا ہاتھ ایک خالص مشرقی فن کار کی طرح مخصوص روایتی انداز میں موقلم تھامے ہوئے جاذب کاغذ پر پانی اور رواں کالی روشنائی کے سوا کچھ نہ برتتے ہوئے کام کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن پُورے وقت یہ احساس بھی ہوتا رہتا ہے کہ ایک یورپی آنکھ اُس کی رہنمائی کررہی ہے۔"

زین العابدین کی اس ابتدائی شہرت نے جو قحطِ بنگال کے خاکوں کی بنا پر ۲۶ سال کی عمر میں حاصل ہوگئی تھی انہیں بھی اس شدید خطرے سے دوچار کردیا جس کے شکار ہوکر کتنے ہی ہونہار فن کار آئندہ ترقی کی راہیں گنوا بیٹھتے ہیں، یعنی غلط احساسِ طمانیت۔ اِس کے برعکس زین العابدین ایک فعال مصوّر کی حیثیت سے برابر تن دہی کے ساتھ اپنے طبعی جوہروں کو مسلسل مشق و ریاضت سے بروئے کار لاتے اور فن کے میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ نئے نئے اسلوب

سیکھنے اور انہیں سمجھنے اور برتنے میں وہ آج بھی سب سے آگے ہیں۔

زین العابدین پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۷ء میں ضلع میمن سنگھ (جو اب مشرقی پاکستان میں شامل ہے) کے قصبہ کشور گنج میں پیدا ہوئے یہ ضلع خالص زراعتی ہے یہاں دھان خوب ہوتا ہے، اور عابدین کی ابتدائی یادیں اسی علاقہ کی سیدھی سادی زندگی اور اس کے دلفریب قدرتی مناظر سے وابستہ رہیں۔ رواں دواں برہم پتر دریا جو ہرے بھرے دیہاتوں کے گرد بل کھاتا ہوا ایک شان بے نیازی کے ساتھ بہتا رہتا ہے، ان یادوں میں ایک نئی جوت جگاتا ہے۔ افلاس، سادگی اور حسن کے اس ماحول میں ایک طرح کی اداسی رچی ہوئی ہے اور دل میں ڈوب کر سوچنے والی کیفیت بھی جسے عابدین نے بعد میں بڑی چابکدستی سے دھیمے دھیمے آبی رنگوں اور تیکھے تیکھے بھرے بھرے زور دار خطوط میں اسیر کرکے زندہ جاوید کیا۔

عابدین کے باپ پولیس افسر تھے اور انکی خواہش تھی کہ یہ بچہ بھی بڑا ہوکر پولیس افسر بنے لیکن نوعمر عابدین کو شروع ہی سے مصوری میں فطری دلچسپی تھی۔ اپنے اسکول کی کاپیوں پر حساب کے سوال کرنے کے بجائے وہ عجیب وغریب نقش ونگار بنایا کرتے چنانچہ خاندانی روایات کے خلاف وہ بڑے ہی استقلال اور ثابت قدمی سے جد وجہد کرتے کرتے "کلکتہ سکول آف آرٹ" جا پہونچے۔ یہاں انہوں نے فنونِ لطیفہ کا چھ سالہ کورس بڑے امتیاز سے مکمّل کیا اور فوراً اس اسکول میں استاد بھی مقرر ہوگئے۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آئی تو عابدین نے ڈھاکہ میں ایک آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا منصوبہ بنایا جو اب پاکستان میں نقاشی و مصوری کی تعلیم کا بہترین ادارہ بن گیا ہے۔ یہاں فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ کمرشل آرٹ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے مکمّل نصاب پانچ سال کا ہے، اور تمام معلّم پاکستانی ہیں جن میں سے اکثر پہلے بھی زین العابدین کے ساتھ کام کرچکے ہیں۔ عابدین خود اس کے پرنسپل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انتظامی ذمہ داریوں نے ان کے تخلیقی کام کے لئے زیادہ وقت نہیں چھوڑا ہے پھر بھی مصوری سے انہیں جو شغف ہے اُس کی بنا پر وہ کبھی ہسپانوی مصوّر "ال گریکو" کے ایوان کو ایک مصور کا خراج عقیدت پیش کرنے میڈرڈ پہونچ جاتے ہیں۔ اور کبھی میکسیکو میں راہ چلتے منظر کشی کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کبھی جاپانی پرنٹ اور کندہ کاری کا فن سیکھنے کے لئے ٹوکیو اور اوساکا کے مصوروں میں جا بیٹھتے ہیں اور کبھی جٹا گانگ کے قبائلی علاقے میں ہفتوں قیام کرنے کے بعد یکایک ڈھاکہ میں نمودار ہوجاتے ہیں۔ رنگا رنگ، علاقائی اور عوامی آرٹ کے نادر نمونوں کو جمع کئے ہوتے، اور اپنی خاکہ کشی کی کاپیوں بیسیوں اسکیچوں اور خاکوں سے بھرے ہوئے! اس تمام عرصے میں زین العابدین نے اس کثرت سے تصاویر بنائی ہیں، اور اتنے مختلف اور گوناگوں پیرایوں میں، کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ پھر بھی انہیں تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور (IMPRESSIONIST) انداز کی ابتدائی منظر کشی سے شروع ہوکر قحط کی تصاویر پر ختم ہوتا ہے، یعنی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک — اس دور کے اکثر نقوش، خاص طور سے ابتدائی حصّے میں، خالص معروضی اور تقریباً عکاسانہ نوعیت کے ہیں۔ خود قحط کی تصاویر میں مُبالغہ آمیزی اور ایک طرح کی اندرونیت کے باوجود بُنیادی معروضیت ملتی ہے۔

دوسرا دور ان ممتاز تجریدی اور نیم تجریدی تجربوں کا ہے جو ۱۹۴۷-۴۸ء میں کمرشل آرٹ میں زین العابدین کی دلچسپی سے شروع ہوکر ۱۹۵۴ء تک کی تصاویر پر مشتمل ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایچنگ اور لیتھوگرافی میں بھی کافی کام کیا۔

، دور کے کام کی نوعیت زیادہ تر تجرباتی ہے۔ لیکن بعض
ادیر، مثلاً "مزار قائد اعظم کے راستے میں" اور "سنگار"
، پختگی کی آئینہ دار ہیں۔

تیسرا دور ۱۹۵۴ء سے شروع ہوتا ہے جب تجریدی
ربوں میں ان کی دلچسپی بڑی حد تک ختم ہو گئی اور وہ
بارہ اپنے معروضی اسلوب کی طرف رجوع ہوئے۔
ریدی تجربوں نے اشکال اور اوضاع، ان کے تناسب
ر ترتیب کا جو نیا شعور انہیں دیا وہ ان بعد کی
ما دیر میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن ان مُرقعوں کی دلاویزی
ادی طور پر اپنے خطوط کی پائداری اور اپنے رنگوں
معتدل استعمال پر مبنی ہے۔

مابعد قحط کی تصاویر سے صراحتاً پتہ چلتا ہے
عابدین اپنے فن میں وہ ضبط و اعتدال پیدا کرنے
وشش کر رہے ہیں جو ان کے پختہ تر کاموں میں نمایاں
ے۔ مثلاً وہ بڑی زوردار تصویر جس کا عنوان ہے
دگی" یا خطوط کا وہ حیرت انگیز مُرقع "کشتی کھینچے
لے"۔

یہ صحیح ہے کہ زین العابدین کی ابرنگی تصاویر
ں جو چابکدستی اور روانی ملتی ہے وہ عام طور پر
کی روغنی یا مخلوط الاسلوب (GOCHE) تصاویر
مفقود ہے۔ لیکن یہ فرق پیرائے سے زیادہ موضوع
رق ہے۔ جہاں مصوّر اپنے موضوع پر حاوی ہے
ں پیرایہ اور اسلوب پوری طرح مصوّر کا ساتھ
یتے ہیں۔ ایرک نیوٹن نے عابدین کی انہیں تصاویر
، ضبط و اعتدال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابتدائی
ر بالخصوص قحط کی تصویروں کے برخلاف "ان
یہ مُرقعوں میں موضوع کے سامنے آتے ہی فوراً تصویر
ڈالنے کی بے چینی مفقود ہے اور اس کی جگہ ایک
ضبط ٹھہراؤ نے لے لی ہے۔ اب مصوّر کو جلد جلد
بُرش چلانے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ پانی کی سطح پر تیرتی
ہوئی سبزی منڈی، بجائے خود ایک رنگا رنگ، ہنستا بولتا
ہوا نظارہ ہے جس میں مزے مزے سے ہلکورے لیتی
ہوئی کشتیاں خود ہی جزئیات مہیّا کر دیتی ہیں۔ یہی
وہ مقام ہے جہاں فن کار کا ہُنر اپنی جولانی دکھاتا
ہے۔ اور اس میں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے
گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصاویر میں پیش منظر
خالصاً مشرقی ہے۔ لیکن پس منظر کی تفصیلات میں
مغربی رچاؤ ہے۔ بار بار تصویر کے خد و خال یاد دلاتے
ہیں کہ یہ سب کچھ ایشیائی ہے۔ لیکن جزئیات کی ترتیب
اور تقسیم پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی
انگریز آب رنگی فن کار کے موقلم سے نکلی ہیں"۔ مشرق و
مغرب کو آمیز کرنے اور دونوں کے امکانات سے
تخلیقی فنکاری کا حق ادا کرنے کی یہی وہ صلاحیت
ہے جس کی بنا پر آرٹ سے لگاؤ رکھنے والے عابدین کے
فنّی مستقبل کو بڑی پُر اُمید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

(مارچ ۱۹۵۸)

کلیم اللہ

مشرقی پاکستان کے لوک گیت

ادب کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش جس قدر تیز ہوتی جاتی ہے "لوک گیت" یا عوامی نغموں کی اہمیت اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہے۔ سبب معلوم کر لینا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ان گیتوں میں صدیوں کا وہ پرانا تمدن اور زندگی موجود ہے جنہیں نظر انداز کرنے کے بعد کسی ملک کی سچی اور صحیح تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی، تاریخ کی آغوش شہنشاہوں اور حکمرانوں کے لئے ہمیشہ کھلی رہی، لیکن عوامی گیتوں سے وہ قریب قریب دامن کشاں گزر گئی، لیکن یہی بات اب بدلے ہوئے ماحول میں تاریخ کی ضروری کڑیاں تسلیم کر لئے گئے ہیں۔

عوامی نغموں کا ذکر آتے ہی پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ گیت کس نے لکھے؟ کیا یہ گیت ایک ہی فرد کے ذہن کی تخلیق ہیں، جنہیں عوام نے اپنا لیا۔ یا خود عوام ان کے خلاق ہیں اور ترتیب دینے والوں نے یہ گیت اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر لئے۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن اس حقیقت سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ شاعر سے پہلے شاعری وجود میں آئی جس طرح موسیقار سے پہلے موسیقی، ان گیتوں کے متعلق درحقیقت اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ گیت کس نے کہے، بلکہ یہ ہے کہ ان گیتوں میں اثر تھا، کیف تھا، زندگی تھی، اس لئے عوام میں مقبول ہوئے۔ قبولِ عام کا درجہ پاتے ہی یہ بہت دماغوں میں محفوظ ہوتے گئے اور سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے، لہٰذا غور کرنے کی چیز ان گیتوں کی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ زندہ رہے اور آج بھی ان میں از سرِ نو جینے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔

"لوک گیت" کی بڑی خصوصیت اس کا اندازِ بیان ہے، جو کچھ کہا جاتا ہے بے تکلف کہہ دیا جاتا ہے، ان میں تنقید نہیں ہوتی، مقاصد کی چھان بین نہیں کی جاتی، واقعات کے اسباب و علل پر تبصرہ نہیں ہوتا۔ خیالات کا اظہار سادگی، صفائی، اور سچائی سے کر دیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں بے ربطی بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن محض سلسلہ قائم رکھنے کی خاطر سادگی قربان نہیں کی جاتی۔

بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ خدمات و احساسات کی ہو بہو تصویر کشی بھی ہوتی ہے، جیسی سادہ معاشرت جیسا بے ریا ماحول، ویسے ہی جذبات کہیں الجھاؤ نہیں، پیچ و خم نہیں، ان گیتوں کی اصلی روح ان کی حقیقت بیانی ہے۔ یہ گیت اپنی راہ سے نہیں ہٹتے اور نہ اپنے حدود سے باہر نکلتے ہیں ان کی منزل متعین ہے۔

مشرقی پاکستان کا ماحول، اس کی معاشرت اور اس کی زندگی یہاں کے نغموں میں پوری طرح جھلکتی ہے۔ گاؤں، گاؤں کے آس پاس بہتی ہوئی ندیاں، ان ندیوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ٹیڑھے کبڑے گھاٹ، ماجھیوں کے آوارہ نغمے، ننگ دھڑنگ بچے، کالے اور لال کناروں کی گاڑھے کی ساریوں میں ملبوس دوشیزائیں، مٹی اور پھوس کے جھونپڑے، کہیں کہیں ٹین کی چھت آنگن میں یا پائیں باغ میں کیلے، ناریل اور ڈلی کے درخت، چند ہی قدم پر ندی کی دوسری طرف لہلہاتے ہوئے کھیت، کھیتوں میں بارش کی کثرت سے ڈوبی ہوئی

پاٹ اور دھان کی فصلیں، تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ، بھری برسات میں ندی نالوں میں طغیانی اُن میں مچھیروں کے جال، جھینگر اور مینڈک کا شور، رسم و رواج، شادی بیاہ، پیار اور محبت کی باتیں، ہجر و فراق کے افسانے، غرض گاؤں کی روزمرہ کی زندگی ان گیتوں میں موجود ہے۔

عوامی گیتوں کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی موسیقی ہے یہ عنصر موجود نہ ہوتا تو وہ بیش بہا سرمایہ جسے ہم عوامی ادب کہتے ہیں آج ہم تک نہ پہنچتا کب کا مرچکا ہوتا۔ "عوامی نغمے" پریس کی بے شمار برکتوں کے باوجود کتابی شکلوں میں اب تک ترتیب سے محفوظ نہیں کئے کئے گئے ہیں ظاہر ہے پریس کی ایجاد سے پہلے ان کی کس مپرسی کا کیا عالم رہا ہوگا، ان گیتوں کی بقا اور اُن کی حفاظت کے ذمہ دار صرف وہ تھے جنہوں نے یہ حرف حرف اپنے سر آنکھوں سے لگائے اور اپنے ذہن میں محفوظ کرتے گئے۔ گیتوں میں چونکہ موسیقی تھی، ترنم تھا اس لئے آسانی سے یاد ہوتے گئے، روکھے پھیکے اور بے مزہ موضوعات بھی جب موسیقی کا جامہ پہن لیتے ہیں تو ذہن میں ایک مدت تک مُرتسم رہتے ہیں، نثر میں یہ بات نہیں

مشرقی پاکستان کے عوامی گیتوں میں بھی بلا کا ترنم اور موسیقی ہے، ان میں ندی کی روانی بھی ہے اور تیزی بھی دریا کا سکون بھی ہے اور طوفان بھی وسعت بھی اتنی جتنی میگھنا اور پدما کے پاٹ میں، تانوں میں جوار بھاٹے کی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے، ان گیتوں کی جان، ان کا مٹھاس اور رسیلا پن ہے۔

عوامی گیتوں کے موضوع زیادہ تر حزنیہ ہوتے ہیں، عشق و محبت کا بار بار ذکر آتا ہے جس کا انجام مایوسی ہے، رنج و غم کا اظہار ہوتا ہے، لیکن انداز بیان میں پاکیزگی ہے سرکشی نہیں، غم روزگار کے شکوے بھی کئے جاتے ہیں لیکن ان میں بغاوت نہیں، تان صبر و رضا پر ٹوٹتی ہے مشرقی پاکستان کے عوامی نغموں، خاص طور سے لوک کہانیوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

عوامی نغموں کا ایک اور محبوب موضوع مذہب رہا ہے، مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں میں بھی یہ موضوع بڑے شدومد سے موجود ہے۔ ان گیتوں میں مذہب سے محبت اور عقیدت کے والہانہ جذبات کا اظہار ہے ان ہی جذبات نے ایک خاص صنف کی تخلیق کی جو معرفتی اور مُرشدی کے نام سے مشہور ہے۔

(یہاں تک ان خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو کم و بیش ہر ملک کے عوامی نغموں میں مشترک ہے ہیں اب ان خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو مشرقی پاکستان کے عوامی نغموں کے لئے مخصوص ہیں)

عوامی نغموں کے متعلق وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے تصنیف کرنے والے کون تھے، شاعر ہمیشہ گمنامی میں رہا مشرقی پاکستان کے عوامی نغموں کی خصوصیت یہ ہے کہ گیتوں کے ساتھ گیت لکھنے والوں کے نام بھی بڑی حد تک محفوظ ہیں عوامی نغموں کے اس مجموعے کو پوتھی لٹریچر کا نام دیا گیا ہے۔ پوتھی کتابیں بنگالی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں ان قلمی کتابوں نے جو عربی رسم الخط میں ہیں اور ناریل کے کاغذ پر لکھی گئی ہیں یہی نہیں کہ عوامی ادب کو زمانے کے دست و بُرد سے بچا لیا، بلکہ مُصنف کے نام بھی محفوظ رکھے بعض اوقات تو دیہات کے شاعروں نے اپنے کلام کا مجموعہ خود مرتب دیا ہے۔ پاگلا کنائی، مدار شاہ، لالن شاہ، کا تذکرہ یہاں کے عوامی ادب میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہماری کلاسیکی شاعری میں ولی، نظیر، میر اور غالب کی ہوسکتی ہے۔ ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ اور ملکوں کے برخلاف مشرقی پاکستان میں عوامی ادب کا دھارا کبھی رُکا نہیں، مجموعی حیثیت سے اس کی رفتار تیز رہی ہے انیسویں صدی کے آخر میں

بنگال کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے خود عوامی گیتوں کو اپنی شاعری میں مستقل جگہ دی، باؤل میں جو عوامی نغموں کی ایک اہم صنف ہے ٹیگور نے نوک پلک درست کر کے چار چاند لگا دیئے، رابندر سنگیت کی عمارت، باؤل گیتوں کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا عوامی شاعر جسیم الدین تو یہاں کے عوامی گیتوں سے اتنا متاثر نظر آتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھتا، یہ بات نہیں کہ جسیم الدین ایک اَن پڑھ دیہاتی شاعر ہے۔ وہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے پروفیسر بھی رہ چکا ہے اور اب صوبائی حکومت کا ایک ذمہ دار افسر ہے، اس کے باوجود عوامی نغمے اس کی شاعری کی رُوحِ رواں ہیں۔ وہ اسی دُنیا کا ہے اور یہاں سے الگ ہو کر وہ کچھ نہیں لکھ سکتا، اس نے اپنی زبان تک بدل دی ہے۔ مقامی بولیوں میں گیت تصنیف کرتا ہے عوامی نغموں کی ایسی شاندار فتوحات کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

صوبے کی زندگی عام طور سے سست رفتار رہی ہے، پاٹ اور دھان کی فصلیں کاٹ لینے کے بعد کسان کے پاس کچھ زیادہ کام نہیں رہتا، وہ سال کے چھ مہینے محنت کرتا ہے باقی چھ مہینے قریب قریب فرصت ہی رہتی ہے، بیکاری کے لمحات نے اُسے سوچنے کا عادی بنا دیا ہے، ذہن نے رُوحانی آسودگی کی تلاش کا تصور پیدا کیا۔ دیر و حرم جنّت، دوزخ اور پیر و مُرشد کے قصے نکلے، باؤل گیتوں کا اصل موضوع یہی ہے۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کی ایک اور خصوصیت جو انہیں دوسرے مُلکوں کے عوامی نغموں سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہاں کے گیتوں میں اسلامی حکایتوں کا ذکر ہے۔ جگہ جگہ اسلامی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں پیغمبروں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ اولیاء کی کرامتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اسلامی حکایتوں میں خاص طور سے کربلا کا واقعہ بڑے اہتمام سے بیان کیا جاتا ہے "جاری گان" کا واحد موضوع کربلا کی داستان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیو مالا کی جگہ تاریخی اور نیم تاریخی تذکروں نے لے لی۔ مافوق الفطرت عناصر کم ہوتے گئے۔

دوسرے مُلکوں کی طرح یہاں کے عوامی گیتوں میں بھی راجہ رانی، شاہزادے اور شاہزادیوں کا ذکر کیا جاتا ہے، شاہی دربار کے جاہ و جلال کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ان گیتوں میں، جن، پری، بُھوت پریت اور دیویوں کے قصے خال خال نظر آتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کا عوامی ادب مُسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ اُنہوں نے ایک طرف تو "چنڈی" اور "مونگول کا بو" جیسی مافوق الفطرت روایتوں کا انسداد کیا، اور دوسری طرف مقامی زندگی کے موضوعات کی طرف رغبت دلائی، عوامی ادب کا مزاج بدل گیا، فطری عناصر کو خوشگوار فضا میں پنپنے کا موقعہ نصیب ہوا۔

صوبے کے لوک گیت کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ بھی ہے کہ مرد اور عورت کے گیت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ایسے گیت بہت ہی کم ہیں جو مل کر گائے جاتے ہوں، یہاں کی معاشرت نے عورت اور مرد کو روزمرّہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے جُدا رکھا، خود مکان کی ساخت اس بات کا ثبوت دے رہی ہے، بیٹھک خانہ زنانہ حویلی سے بالکل الگ، مکان کی چوحدی میں ایک ہی تالاب لیکن گھاٹ کا کھُلا ہوا ایک سرا مردوں کیلئے اور دوسرا سرا ٹیڑھے بند عورتوں کے لئے مخصوص، محنت کی تقسیم نے فاصلہ

اور بڑھا دیا۔ مرد کھیت میں فصل کاٹ رہا ہے، عورت گھر میں دھان کوٹ رہی ہے دونوں کا ماحول ایک لیکن کام کی تقسیم نے مرد اور عورت کے گانوں کی نوعیت بدل دی نتیجہ یہ ہوا کہ "مے لی گان" یعنی عورتوں کے گیت کی الگ بنیاد پڑ گئی۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کا موضوع معاشرتی اور سیاسی بھی رہا ہے۔ اور مجلسی زندگی کا محبوب موضوع "ہندو مسلم اتحاد" بعض اوقات شدت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اللہ، بھگوان، گوشائیں ست پیرا دلیاء اور سادھو، یہ تمام الفاظ ہندو مسلمان دونوں کی زبانوں سے بلا تکلف ادا ہوتے ہیں۔ زمینداروں کے جبر و ستم کا ذکر بھی آتا ہے اور بہتر نظام کی طرف مبہم سا اشارہ بھی ملتا ہے لیکن اس میں تندی اور تیزی نہیں۔

موضوع اور ٹیکنک کے اعتبار سے صوبے کے عوامی نغموں کی بیشمار قسمیں ہیں، تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں صرف ان خاص خاص قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے گیتوں کے عام رجحان اور مزاج کا پتہ چل جائے۔ یہاں کے گیتوں کی دو بڑی تقسیم کی جاسکتی ہے۔ لوک کہانیاں اور لوک سنگیت۔ لوک کہانیاں دراصل لوک گیت ہی، کا جزو اعظم ہیں۔ لوک کہانی ایک ایسا گیت ہے جو کہانی کے ذریعہ کہا جائے یا ایک کہانی جو گیتوں میں سنائی جائے۔ مشرقی پاکستان کی تمام تر لوک کہانیوں کا مولد و مسکن میمن سنگھ ہے کہانیوں کا موضوع محبت ہے چاہنے چاہے جانے والوں پر جو گزرتی ہے ان گیتوں میں وہی کیفیتیں بیان کی جاتی ہیں کہانی عموماً المیہ پر ختم ہوتی ہے، ان کہانیوں میں عام اصول کے خلاف راجہ رانی یا جن اور پریوں کا ذکر نہیں ہوتا۔ ان میں گاؤں کے افراد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، کبھی کبھی کسی بادشاہ یا گاؤں کے بابو کا ذکر آجاتا ہے تو اس طرح جیسے بستی میں چور گھس آیا ہے یا کوئی شہری گاؤں کا سکون برباد کرنے چلا آیا ہے۔ "بنیا جوگ" کی کہانی میں (بنیا جوگ سلہٹ میں ایک گاؤں ہے جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا گاؤں تصور کیا جاتا ہے مجموعی آبادی بیس ہزار پائی جاتی ہے) راجہ کے مرنے کے بعد رانی اپنے دو سوتیلے بیٹوں کو شہر بدر کر دیتی ہے اور اپنے بیٹے کو راج گدی پر بٹھا دیتی ہے، دونوں شاہزادے مارے مارے پھرتے ہیں بڑے شاہزادے کی ایک امیر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ امیر کی مدد سے وہ ایک فوج تیار کرتا ہے اپنی سوتیلی ماں کے خلاف جنگ کر کے تخت و تاج واپس لے لیتا ہے چھوٹا شاہزادہ ایک گاؤں میں پناہ لیتا ہے، گاؤں کی ایک لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے۔ کچھ دنوں بعد بڑا بھائی اسے شہر بلاتا ہے، دولت اور حکومت کے لالچ میں آکر وہ اپنی بیوی کو گاؤں میں چھوڑ کر شہر چلا جاتا ہے، اس کی شادی ایک شاہزادی سے کر دی جاتی ہے، کچھ مدت تک تو وہ خوش رہتا ہے۔ پھر ضمیر کی ملامت شروع ہوتی ہے۔ آخر ایک دن گھبرا کر وہ گاؤں واپس چلا جاتا ہے۔ اپنی محبوبہ کو دم توڑتے پاتا ہے۔ محبوبہ کے مرنے کے بعد شاہزادہ اسی کی قبر پر اپنی زندگی کے باقی دن گزار دیتا ہے، اور افسوس کرتا ہے کہ گاؤں والوں کو دھوکا دے کر خود اپنی زندگی کھوکھلی کر ڈالی۔

لوک کہانیوں میں ڈرامائی عناصر کی کمی نہیں ہوتی۔ کہیں راوی قصے سناتا ہے، کہیں ہیرو اپنے کارنامے اس طرح بیان کرتا ہے کہ رجز کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی محبوبہ اپنا دکھڑا روتی ہے، کہیں رقیب اپنے سیاہ منصوبوں کا جال بنتا نظر آتا ہے۔ کیرکٹر کے ساتھ ماحول بھی بدلتے رہتے ہیں، پیر فقیروں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ خاص طور سے "ست پیر

یعنی سچے پیر کی کرامتیں تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا تعلق رقص سے بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی نغموں کے ساتھ رقص بھی ہوتا ہے۔ شراب دو آتشہ کی جاتی ہے۔

یہ کہانیاں اکیلے میں نہیں سنائی جاتیں۔ باقاعدہ ایک مجلس بلائی جاتی ہے، گانے والا جھوم جھوم کر قصے سناتا ہے۔ بعض اوقات دو سے چار گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ کہانیاں عموماً طویل ہوتی ہیں۔

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیوں کے جمع کرنے کی اب تک کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ان بیشمار کہانیوں میں سے صرف بارہ ایسی ہیں جو کتابی صورت میں آچکی ہیں، اس کا سہرا کلکتہ یونیورسٹی کے بنگالی کے پروفیسر رمیش چندر سین کے سر ہے، اس مجموعہ کا نام "میمن سنگھ گیتی کا" ہے۔ باقی لوک کہانیاں جن میں گونائی بی بی بیرگان" اور "غاجیر گیت" بہت مشہور ہیں، ابھی تک گاؤں کی فضا سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ لوک کہانیوں کے علاوہ لوک گیتوں کی چند خاص قسمیں یہ ہیں بھاٹیالی، بھوپیا۔ جاری، ساری، پالی گان، کوبیر گان بیرگان، دھان بھگانیر گان، بارہ ماسے، باؤل، معرفتی، باشیدگان اور مرشدی۔

ان میں سے پالی گان اور کوبیر گان اپنی ساخت اور موضوع کے اعتبار سے بڑی حد تک لوک کہانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ گیت زیادہ طویل نہیں ہوتے۔

کوبیر گان کی وہی حیثیت ہے جو کجری کی ہے شاعروں کا مقابلہ ہوتا ہے ایک شاعر کوئی موضوع چھیڑتا ہے دوسرا جواب دیتا ہے، دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں قافیہ اور وزن کی پوری پابندی کے ساتھ۔ موضوع میں خدا، مذہب، عشق و محبت سے لیکر ہجو تک شامل ہے۔

پالی گان کی حیثیت نوٹنکی یا جاترا کی سی ہے موجودہ تھیٹر کی بگڑی ہوئی شکل سمجھ لیجئے۔ اس میں گانوں سے زیادہ کہانی حیثیت رکھتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ کہانی کے کردار جو کہتے ہیں فی البدیہہ کہتے ہیں یاد کرکے نہیں آتے، البتہ پلاٹ پہلے سے سوچ لیا جاتا ہے۔ بیرگان، دھان بھگانیر گان اور بارہ ماسے۔ یہ وہ گیت ہیں جو صرف عورتیں گاتی ہیں جنہیں لے لی گان کہتے ہیں۔ ان گیتوں میں عورت کی پوری معاشرتی زندگی کا عکس ملتا ہے، بیرگان جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شادی بیاہ کے گیت ہیں اس میں خوشی کا عنصر غالب ہے، رخصتی کے گیتوں میں البتہ بڑا درد ہوتا ہے گاؤں میں عورتوں کی دلچسپیوں کا واحد مرکز شادی بیاہ ہوتا ہے جس گھر میں شادی ہوتی ہے وہی ان کا کلب بن جاتا ہے ان گیتوں میں دلہن کی آئندہ زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور دلہن کے بناؤ سنگار کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہلدی کوٹی جاری ہے۔ داماد بالکل بھینسا جیسا ملا ہے ہلدی پیسنے کا فائدہ؟ اس موٹو سے ہم اپنی لڑکی کا بیاہ نہیں کریں گے، ہماری بچی تو گڑیا ہے دودھ کی پرت، وہ کیسے غیر کے گھر جا سکتی ہے۔ سسرال جاکر کچھ دنوں بعد شوہر کے ہاتھ مار کھائے گی۔ دروازے کی آڑ میں منہ چھپا کر غریب رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے گی۔ شوہر بیت سے بیچاری کو خوب پیٹے گا۔ بچی کی پیٹھ پر کالے نشان پڑ جائیں گے۔ ماں نے اسے کاجل کی ڈبیا دی ہے باپ نے ساری، بھائی نے اسے مار مار کر گھر سے باہر کر دیا ہے وہ اپنے شوہر کے گھر جا رہی ہے۔ میری پیاری بچی رو رو کر جی ہلکان نہ کر۔ چڑیاں کھیت چگ ہی جاتی ہیں، میری دلاری ضمیرن اپنی سسرال جا رہی ہے

"رخصتی کے وقت کا ایک گیت"

ہماری موہنی آج ہم سے بچھڑ رہی ہے۔ تیرے چہرے پر غم کے بادل چھائے ہیں تو رو رہی ہے۔ تو تو بڑی پیاری تھی۔ میری سونا تھی جب اتنی بڑی ہوگئی تو اب تجھے لے جانے کے لئے کوئی آ ہی پہونچا۔ تو گھر کی سنہری رانی تھی، تیرا بدن بھی سونے کا تھا۔ سونے کے لالچ نے دوسروں کو رجھا ہی لیا آخر کار وہ تجھے لینے آ ہی گئے بڑا دکھ ہے تجھے تیرے گلے میں آواز بھی پھنس کر رہ گئی ہے۔

بارہ ماسہ۔ بیاہ کے گیتوں کے برعکس ان گیتوں میں رنج وغم کی باتیں ہوتی ہیں عورت اپنا دکھ سکھ خصوصاً ہجر وفراق کی داستانیں سناتی ہے اور اپنی گھریلو زندگی کا نقشہ کھینچتی ہے۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ اس کے جذبات پر جو اثر پڑتا ہے ان گیتوں میں اسکا پورا عکس ملتا ہے ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

بھادوں میں میرے بال کھل کر شانوں پر بکھر جاتے ہیں۔ یوں دل کی الجھن کا راز کھل جاتا ہے۔ پر کیا کروں؟ اساڑھ میں برسات تھم جاتی ہے میرا عجیب حال ہوتا ہے۔ کاتک میں خون کے آنسو روتی ہوں یاد کر کر کے روتی ہوں کہ گھر کی دولت، یعنی ساجن پردیس سدھائے جی اچاٹ ہے۔

ہر چند لکھتی رہتی ہوں۔ تاکید بھی کر دیتی ہوں کہ گھر جلدی لوٹ آؤ لیکن پردیس میں اس کا دل بھی پتھر کا ہو گیا ہے۔ اگہن میں دھان پک جاتے ہیں، پوس میں گھر کی نوکا، ساجن کو لانے باہر بھیج دیتی ہوں، ماگھ آتے ہی میرا من مندر ڈھے جاتا ہے، کروں تو کیا کروں گھر کی دولت، ساجن پردیس چلا گیا ہے لکھنے پر بھی واپس نہیں آتا۔ پردیس جا کر اس کا دل بھی پتھر کا ہو گیا ہے۔ پھاگن میں بلا کی گرمی پڑتی ہے جیٹ میں بدن پھنکنے لگتا ہے۔ دھوپ سے رنگ کالا ہو جاتا ہے بیساکھ میں ٹھنڈی ہوائیں جسم کو گدگداتی ہیں۔ لیکن اس سے حاصل؟ گھر کی دولت تو باہر ہے۔ بلاتی ہوں ہر مہینے لیکن آتا نہیں، پردیس جا کر اس کا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔ جیٹھ میں درختوں میں پھل آجاتے ہیں، اساڑھ میں برکھا رت شروع ہو جاتی ہے۔ ساون میں میں تالاب میں نہانے جاتی ہوں اور روتی ہوں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کیسے اچھا لگے؟ ساجن پردیس سدھارے تاکید کرنے پر بھی نہیں لوٹے۔ پردیس جا کر اس کا دل بھی پتھر کا ہو گیا ہے۔

دھان کھگا نیر گان۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ دھان کوٹتے وقت عورتیں یہ گیت گاتی ہیں۔ فصل کٹ کر آتی ہے۔ کھلیان، اناج سے بھرتے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر جو خوشی ہوتی ہے ان گیتوں میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔

"نمونہ ملاحظہ ہو"

ڈھیکی میں دھان کوٹا جا رہا ہے۔ ڈھیکی کے سرے سے پاؤں اٹھانے اور رکھنے سے کرک، کرک کی آواز نکلتی ہے۔

گھر کی بڑی بہو نے جب ڈھیکی پر چاول رکھدئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے خوشی کے مارے ڈھیکی آسمان سے جا لگے گی۔

بڑی بہو نے جب پاؤں نکال لئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے ڈھیکی تحت الثریٰ پہونچ گئی۔ چھوٹی بہو ہنس ہنس کر بڑی بہو سے کہتی ہے، اب کے فصل اچھی ہوئی، تمہاری ساتوں لڑکیوں کے بیاہ کا سامان ہو جائے گا۔

جس طرح بعض گیت عورتوں کے لئے مخصوص ہیں، اسی طرح کچھ گیت ایسے ہیں جنہیں صرف مرد ہی گاتے ہیں۔

بھاٹیالی ۔بھوایا۔ ساری اور جاری گیت، خاص مردوں کے گیت ہیں۔ بھاٹیالی اور ساری کا راست تعلق دریا اور دریا کی زندگی سے ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوامی نغموں میں سب سے اہم صنف بھاٹیالی ہے۔ یہاں کی ندیوں نے اس گیت کو جنم دیا ہے۔ بھاٹیالی بڑا ہی میٹھا، رس بھرا اور سادہ نغمہ ہے جس میں ایک مانجھی کی پوری کی پوری زندگی پائی جاتی ہے (بچپن میں وہ کہتا ہے) ہم مانجھی کے لڑکے ہیں۔ گھر پر ہمارا کیا کام؟ یا با چلو ہم سب کشتی کھینے چلیں ہم مانجھی کے لڑکے ہیں، ناؤ ہماری جان ہے۔

"مانجھی کی گھریلو زندگی کا ایک عکس"۔ مانجھی مچھلی کا شکار کھیلنے چلا گیا ہے۔ بیوی گھر پر جال بُن رہی ہے سُوت پر سُوت چڑھاتی جاتی ہے۔ جال لمبا ہوتا جاتا ہے۔ اُلجھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ دل کی دُنیا بھی۔ ادھر موجوں پر مانجھی کی کشتی لرز رہی ہے اور گھر پر اُس کی بیوی کا دل۔ مانجھی کو اپنے گھر کا خیال آتا ہے۔ اُس کی بیوی جو اُس کی زندگی کی کشتی ٹھہری۔ بیوی کے دل کی کیفیت کو راز ہی رکھنا مناسب ہے۔ بے چاری جال بُننے میں بھول کر رہی ہے۔ سُتلی اُلجھتی جا رہی ہے۔ وہ سوچتی ہے کاش شوہر کی کشتی کے بادبان میں میرے جذبات ہواؤں کی طرح بھر جائیں۔

کاش میں کلسی کو اپنی زُلفوں کی رسّی سے باندھ کر دریا میں تیرتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس پہونچ جاتی۔

"مانجھی کا تعشق"۔ وہ میرے سامنے سے ہوکر گزر گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پورے بدن میں آگ لگ گئی۔ اس آگ سے میرا کلیجہ پھنک رہا ہے، دریا دائیں بائیں رُخ بدلتا رہا۔ دریا کے ساتھ ساتھ اس کے کنارے ٹوٹتے رہے۔ اور دریا کے ساتھ ساتھ میرے آنسو بھی بہتے رہے۔"

دو نمونے اور پیش کئے جاتے ہیں جن میں مانجھی کا صحیح کردار اُجاگر کیا گیا ہے۔

پہلا نمونہ:- میں پدما کا مانجھی ہوں طوفانوں سے نہیں ڈرتا۔ میں طوفانوں سے کھیلتا ہوں، میں طوفانوں کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا، ہار نہ مانوں گا۔

دوسرا نمونہ:- میں ڈوب رہا ہوں۔ بہہ رہا ہوں۔ اس دریا کا شاید کوئی کنارا نہیں، مانجھی بڑی ہوشیاری سے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی چلاؤ۔ موج پر موج چڑھی چلی آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ موجیں آسمان سے ٹکرا کر دم لیں گی۔ آسمان دریا کی طرف اور دریا آسمان کی طرف تک رہا ہے لاکھوں برس سے دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح سے تک رہے ہیں۔ اب تک ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے، نہ اُوپر آسمان کا کوئی کنارہ ہے اور نہ نیچے دریا کا۔ آسمان دریا کا کنارہ دیکھنے کے لئے بے چین ہے اور دریا آسمان کا یہی بے چینی دونوں کو تڑپا رہی ہے۔ مانجھی ایسے میں ہوشیاری سے چپّو چلاتا

ساری:- کشتی رانی یا بوٹ ریس، یہاں کے ملاحوں کی محبوب ترین تفریح ہے "ساری گیت" عام طور سے ایسے ہی موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ ایک شخص شروع کرتا ہے۔ دوسرے ساتھ دیتے ہیں۔ موضوع میں جان نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو بیہودہ اور بے سر و پا باتیں کہدی جاتی ہیں الفاظ کے ذریعہ مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ تو تان بھگڑا اور ضلع جگت پر ٹوٹتی ہے۔

نمونہ ملاحظہ کیجئے:- آج تہوار کا دن ہے چھوٹے بڑے کا لحاظ ختم کرو، بھول جاؤ کہ تم داماد ہو! میں تمہارا خُسرا، تو تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔ میں تارا پور ایک کشتی خریدنے گیا۔ چالیس روپے لگ گئے لیکن کیسے بتاؤں

پچاس کہیں اور جاتے رہے ہے۔ میرے داماد آج تہوار کا
دن ہے چھوٹے بڑے کا لحاظ بیکار ہے۔ تم ہی بتاؤ
جس تالاب میں پانی نہیں اُس کا مصرف ہی کیا عورت
کے پاس اُس کا شوہر نہیں تو اُس کا حُسن کس کام کا؟
بالو سے داؤں تیز کیا جاتا ہے۔ کھانڈے پر پتھر سے
سان دی جاتی ہے۔ اچھے آدمی کی زبان میٹھی ہوتی ہے
لیکن جیسا مزہ ایک دوشیزہ کی میٹھی میٹھی گالیوں
اور مار میں ہے سچ پوچھو تو اور کسی چیز میں نہیں۔
میرے داماد آج تہوار کا دن ہے۔ آج کے دن چھوٹے
بڑے کا لحاظ کیسا؟

جاری گان :۔ یہ بھی مردوں کا گیت ہے اور مل کر گایا جاتا ہے۔ اصل موضوع کربلا کی داستان ہے' انہیں گیتوں کی وجہ سے یہاں کے عوامی نغموں میں تاریخی عنصر آیا۔ اس موضوع کے ذریعہ عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہو گئے۔ گور و کفن۔ زہر۔ کربلا۔ تعزیہ، ماتم، حق و باطل، شہید۔ غازی۔ اسی طرح کے بے شمار الفاظ جو کربلا سے تعلق رکھتے ہیں بلا تکلف استعمال ہونے لگے۔ جاری گان کا سلسلہ اب وسیع ہو گیا ہے ہر وہ گیت جس میں ظلم، بے انصافی، جھوٹ، اور بے ایمانی کے خلاف جنگ ہے جاری گان کہلانے لگا ہے۔

بھوٹیا :۔ یہ گیت صوبے کے شمال میں گائے جاتے ہیں۔ یہی گیت ہیں جو دریا سے زیادہ زمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن میں زیادہ تر کسان کی زندگی جھلکتی ہے۔ ان گیتوں میں نہ تو جذبات کی شدت ہوتی ہے اور نہ کوئی مستقل کیف۔ ایک واقعہ ہے جو بیان کر دیا جاتا ہے۔

نمونہ :۔ سادہ لوح بگلا جال میں پھنس گیا ہے' رو رو کر کہتا ہے مچھیروں نے مچھلی پکڑنے کے لئے جال بچھایا تھا۔ مچھلیاں تڑپتی دیکھکر میں بھی لالچ میں آکر اُن کی طرف لپکا۔ اب کیسے چھٹکارا ملے۔ نکلنے کی جتنی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی جال کا ہر تار لوہے کی سلاخ بنا جا رہا ہے۔ میری بیکسی رحم کے قابل ہے۔ ہائے میں اب اپنے ساتھی سے نہ مل پاؤنگا۔ ایک ہرن ٹڈی۔ ادھر سے گذرتی ہے۔ بگلے کی حالت زار دیکھتی ہے۔ بگلے کے ساتھی کو جاکر خبر دیتی ہے کہ سونا ندی کے کنارے تمہارا ساتھی گرفتار ہو گیا ہے۔ محبوبہ بے تحاشا اُڑتے ہوئے دریا کے کنارے پہونچتی ہے' محبوب کی بے بسی دیکھکر رونے لگتی ہے۔ بگلا بھی رونے لگتا ہے۔)

ایک اور نمونہ :۔ میں اسی مٹی سے پیدا ہوا' مجھے اس سے پیار ہے دن رات اسی مٹی پر کام کرتا ہوں' اسی مٹی سے طرح طرح کی سبزی اور اناج پیدا کرتا ہوں۔ انہیں بیچ کر ضرورت کا سامان خریدتا ہوں۔ میں پانی میں بھیگتا ہوں، دھوپ میں بُھنتا ہوں، کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہوں' میرا رنگ کالا ہے' دل کالا نہیں۔

باؤل جسے شبدھ گان ادھے ہو تو، معرفتی اور مرشدی بھی کہتے ہیں۔

ان گیتوں میں اور گیتوں کے برعکس روزمرّہ کی زندگی کے بجائے رُوحانی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ باؤل کا اصل موضوع، مذہب، اخوت، محبّت، اور نفس کشی اور روحانیت ہے۔

خیالات میں بڑی بلندی اور پاکیزگی ہوتی ہے زبان کی سادگی اور شگفتگی بدستور قائم رہتی ہے۔ روزمرّہ کے الفاظ، مثلاً تانت، چرخہ، کشتی، چڑیا تشبیہات اور استعارات کا نیا جامہ پہن کر آتے ہیں اور تصوف، ریاضت اور وحدانیت، کے رموز بیان کرتے ہیں۔

ان گیتوں کے اصل موجد ہندو مذہب کے پجاری ہیں جو مغربی بنگال کے تھے۔ بعد کو بدھ مت کی

روایتوں کو بھی پروان چڑھنے کا موقع ملا ان گیتوں میں جہاں عبادت اور ریاضت کے طریقے بیان کئے جاتے ہیں وہاں ان مذہبوں کا اثر صاف ظاہر ہو جاتا ہے یہی گیت جب مشرقی بنگال میں آئے تو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ان پر اسلامی رنگ چڑھنے لگا۔ فارسی کے ذریعہ صوفی خیالات نے ان گیتوں پر بہت گہرا اثر ڈالا کہ معرفتی کے نام سے ایک جداگانہ صنف تخلیق میں آ گئی۔ معرفتی باؤل کی وہ نئی شکل ہے جس میں اسلامی تصوف کا رنگ حاوی ہے۔ یہاں کے عوام ان گیتوں کو فقیری گانا بھی کہتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بیشتر مسلمان درویشوں اور فقیروں کے ہاتھ اپنے کمال کو پہونچے ان میں سراج سائیں، لالن فقیر، فقیر چاند، پاگلا کانائی، اور سید نعمت کافی مشہور ہیں۔

باؤل کا قدیم موضوع تیاگ تھا مسلمان صوفیوں نے محبت کا پیغام دیا۔ تلاشِ حق کے لئے بندرابن اور کاشی جانے کی ہدایت نہیں دی من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کا راستہ بتایا لالن شاہ کا ایک گیت ملاحظہ ہو، عنوان "تلاش" ہے۔

اپنے خالق کو ڈھونڈھ، جانتا ہے کہاں ہے وہ؟ ضمیر کی رہبری میں اُسے تلاش کر، تیرے نفس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ تو اندھا ہو گیا ہے جستجو جاری رکھ، تیرے ہی پاس ہے۔ تجھے مل سکتا ہے۔ لالن کا مشورہ ہے۔ اپنا مقام پہچان، کہیں جانے کی حاجت نہیں ہے۔ جس کی تلاش ہے وہ یہیں موجود ہے۔

باؤل گیتوں کی تصنیف میں مدن باؤل کا بڑا ممتاز درجہ ہے اسکے گیتوں میں اسلامی تصوف کا بڑا گہرا اثر ہے، بعض اوقات تو وہ ایسے مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں دیر و حرم کے جھگڑے مٹ جاتے ہیں، جہاں خضرِ راہ کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

مسجد و مندر نے میرا راستہ روک رکھا ہے میری پکار سن رہا ہوں لیکن تیرے پاس نہیں پہونچ سکتا، گرو اور مرشد میرا راستہ روک دیتے ہیں تیرے دروازے پر [illegible] کے تالے پڑے ہوئے ہیں [illegible] [illegible] پہونچوں کیسے؟ فارسی کا ایک شاعر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہندوؤں کی معاشرت اور مسلمانوں کی تہذیب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان میں ہندو سنیاسیوں اور مسلمان صوفیوں کی عبادت اور ریاضت سے متعلق اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ ان گیتوں میں خالق، آدم، جبروت، ملکوت، فنا فی اللہ، نفسِ امارہ، کعبہ، مسجد، پروردگار، شرع، مقام، طلب، قیامت اور درگ جیسے فارسی اور عربی کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور سائیں، [illegible] گوسائیں، [illegible] جیسے سنسکرت الفاظ بھی۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کی حقیقت اور موضوع [illegible] کے بعد اس نتیجے پر پہونچنا مشکل نہیں کہ [illegible] کے عوامی نغموں کی طرح [illegible] کی زندگی کی [illegible] حرارت موجود ہے۔ بنگالی ادب میں ان گیتوں کے جو احسانات ہیں وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

ان جواہر پاروں کو ادب کی خام پیداوار کہہ لیجئے۔لیکن یہی کچا سونا ٹیگور اور جسیم الدین کے قلم سے تپ کر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ باؤل نے ٹیگور کی شاعری کا مزاج بدل کر رکھدیا۔ اُرخ، انسانیت اور عالمگیر اخوت کی طرف پھیر دیا۔ بھاٹیالی نے جسیم الدین کی شاعری میں حلاوت ترنم اور تازگی پیدا کردی، اسی ادب کی ترجمانی کرنے کے لئے وہ امریکہ اور چیکوسلوکیہ کی بین الاقوامی لوک گیت کانفرنسوں میں شرکت کرچکا ہے۔

بنگالی ادب کا تغزل اس کا رومان، اس کی سادگی اور پاکیزگی۔ یہ سب کچھ عوامی نغموں کی بخشش ہیں۔جن کا اعتراف خود ٹیگور نے کیا ہے۔اس کے علاوہ ان گیتوں کی مدد سے مختلف مذاہب کے امتزاج اور تصادم سے اس صوبے میں جو کلچر پیدا ہوا اور خاص کر اسلام نے یہاں تمدن اور معاشرت میں جو انقلاب برپا کیا اور گہرے نقوش چھوڑے اُس کی اچھی خاصی تاریخ ترتیب دی جاسکتی ہے۔پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان گیتوں میں مشرقی پاکستان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا وہ سچ مچ ہے۔مشرقی پاکستان دراصل گاؤں میں بستا ہے۔اور یہ لوک گیت گاؤں کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔اگر بنگالی ادب کو زندگی کا ساتھ دینا ہے تو ان گیتوں کو سر آنکھوں سے لگانا ہی ہوگا۔یہی نہیں بلکہ وہ آرٹ جسے ہم کچھ دنوں کے بعد "پاکستانی موسیقی" کہیں گے عوامی نغموں کی بنیاد پر ترتیب پائے گا اور پروان چڑھے گا۔

کتب خانے (بسلسلۂ صفحہ ۲۳)

ہی ایسے کتب خانے ہیں جن میں کتابوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زیادہ ہے۔

دیہاتوں میں بھی کتب خانے کے رواج کو عام کرنے کی کوشش جاری ہے' ایشیا فاؤنڈیشن کی مدد سے کتابوں کا بکس گاؤں گاؤں بھیجا جاتا ہے تاکہ پڑھنے کا رواج دیہاتوں میں بھی عام ہوسکے۔

ان کتب خانوں کے علاوہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے کتب خانے اور تحقیقاتی اداروں کے کتب خانے بھی موجود ہیں۔ ان میں مشرقی پاکستان سیکریٹریٹ کا کتب خانہ سب سے بڑا ہے جس میں تقریباً ۸۰ ہزار کتابیں ہیں صوبائی اسمبلی کا کتب خانہ محکمہ زراعت (مرکزی) کا کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کا کتب خانہ وغیرہ بھی نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں' اس کے علاوہ، برٹش کونسل اور یو۔ایس۔آئی۔ایس کے اپنے کتب خانے بھی ہیں' جو ڈھاکے کے علاوہ دوسرے اہم تعلیمی شہروں میں قائم ہیں' ان کتب خانوں سے یونیورسٹی اور کالج کے طلباء اور اساتذہ کو نصابی کتابیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ برٹش کونسل نے نصابی کتابوں کی ایک الگ لائبریری قائم کررکھی ہے جہاں بیک وقت تقریباً ۲ کتابیں ۳ ماہ کیلئے جاری کی جاتی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں کتب خانوں کے ایوان میں کتابوں کے چراغ اب روشن ہوچکے ہیں' ان کی روشنی کہیں مدھم ہے اور کہیں تیز' ان روشنیوں کے دائرے مشرقی پاکستان کی سماجی ثقافتی اور تعلیمی ترقی کی راہوں کا راستہ دکھاتے ہیں' اس روشنی کو ابھی اور تیز ہونا ہے' اور اب تک جو ترقی اس سلسلے میں حاصل ہوئی ہے اُس سے ایک خوشگوار مستقبل کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔

انیس خورشید

"مشرقی پاکستان کے کُتب خانے"

بنگال کے تہذیبی نشوونما میں مُسلم ثقافت کا اثر دسویں صدی عیسوی سے ہی ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اِس صدی کے آغاز میں عرب تاجروں کا ایک گروہ برصغیر ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے راہ و رسم پیدا کرتا ہوا بنگال میں آبسا تھا۔ اور جب تین سو سال بعد (۱۲۰۳ء) یہ علاقہ خلجی خاندان کے دائرہ اقتدار میں آگیا تو پُرانی قدروں کے سحر ٹوٹنے لگے اور وہ نقوش جو مُسلمانوں کے اثر سے زمانۂ قدیم سے ترتیب پا رہے تھے، واضح طور پر اُبھر کر ایک نئے کلچر اور ایک نئی تہذیب کی نشان دہی کرنے لگے اِس اُبھرتی ہوئی ثقافت کی مشاطگی میں فارسی کو خاص دخل تھا جو اُس وقت سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہو چکی تھی تب ہی حافظ نے کہا تھا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

بنگال اُس وقت بھی دیارِ رقص و نغمہ کہلاتا تھا اور اس کے سحر آگیں نغمے دیوارِ چین کی حدوں کو پار کر کے دُور دُور پھیل چکے تھے۔ اس کا ادب عوام کی زندگی میں رچ بس گیا تھا جب مُسلمان آئے تو اپنے ادب اور کلچر کی اعلیٰ روایات کو ساتھ لے کر آئے، نئے تہذیبی رشتوں کی بُنیاد پڑی۔ نغمہ و سرود کی لے اور رسیلی ہوگئی، زبان و ادب میں مزید حلاوت پیدا ہوئی۔ شاعری کا مزاج بدلا، فارسی، عربی اور تُرکی کے الفاظ بنگالی زبان میں مدغم ہونے لگے۔

اِس تحریک میں مقامی مُسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی برابر کے شریک تھے لیکن جب مُسلمانوں کے اقتدار کے زوال کی ابتدا ہوئی تو بنگالی زبان سنسکرت کے دائرہ اثر میں آگئی اور فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں ایک ایسی زبان کا رواج عام ہونے لگا جو سنسکرت آلودہ تھی چنانچہ کیکا باد اور مشرف حسین جیسے شعراء بھی اسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ اُس وقت قاضی نذر الاسلام نے بنگالی ادب کو سنبھالا دیا اور حافظ و خیام کی غزلوں اور رُباعیوں کے ترجمے کر کے اس میں ایک نئی رُوح پھونک دی اِس طرح نذرل نے نہ صرف بنگالی شاعری کا رُخ ہی موڑا بلکہ اسے زندگی کی مہک اور اُمید کی شادمانیوں سے ہمکنار کیا۔ جب مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو بنگال دو حصّوں میں منقسم ہوگیا۔ اُس وقت جو زبان مشرقی بنگال میں رواج پا چکی تھی وہ اس زبان سے مختلف تھی جو مغربی بنگال میں بول چال اور ادب کی زبان تھی۔ البتّہ یہ ضرور تھا کہ ان دونوں ثقافتوں کا مرکز کلکتہ تھا۔ جہاں تعلیمی اور ثقافتی ادارے بکثرت تھے اور جہاں کتابوں کے بہتر ذخائر اور اُن کی اشاعت اور خرید و فروخت کے مراکز بھی موجود تھے۔

کلکتہ کے یوں مغربی بنگال سے چلے جانے سے مشرقی بنگال (جو اب مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم ہے) کی جیسے شہ رگ کٹ گئی ہو۔ مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل دوری اس پر مستزاد تھی۔ پاکستان کی پُوری آبادی کا

نصف سے زائد حصہ اس علاقے میں آباد تھا۔ خواندہ آبادی کا تناسب اس وقت بھی ۶ و ۷ فیصد سے زائد نہیں کلکتہ کے اس طرح کٹ جانے سے مشرقی پاکستان کی تہذیبی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ صرف ایک یونیورسٹی اس وسیع علاقے کی تعلیمی زندگی کا مرکز تھی۔ کالج بھی خال خال تھے۔ ان کی تعداد بھی مشرقی پاکستان میں ۶۴ سے زیادہ نہ تھی۔ ڈھاکہ ایک تنہا شہر تھا جہاں یونیورسٹی بھی قائم تھی۔ اور اس اعتبار سے سب سے زیادہ کالج بھی یہیں تھے۔ لیکن ان کی تعداد بھی ۶ سے اوپر نہ تھی۔ یہی کیفیت بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ابتر حالت یہاں کے تحقیقی اور ثقافتی اداروں کی تھی۔ کتب خانے تو سارے کے سارے مغربی بنگال ہی میں رہ گئے اور تو اور ان کتابی ذخائر کا ادنیٰ حصہ بھی تقسیم ملکیت کے نتیجہ میں حاصل نہ ہو سکا۔

لیکن اس بے سروسامانی میں بھی اُجڑے ہوئے دلوں میں رمق جان باقی تھی۔ نم آلود آنکھوں میں جل پریاں رقصاں تھیں۔ مملکت پاکستان کو جنہوں نے اپنے خون سے سینچا تھا اب جب اس میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو اسے مرجھاتا ہوا کیسے دیکھ سکتے تھے۔ یہیں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ آنسو پی کر اور کلکتہ، دہلی اور تاج کے ماتم میں سینہ کوبی سے پہلو تہی کر کے لوگ اپنے زخم آلود ہاتھوں سے عظیم تر نئی بستیاں بسانے میں مصروف ہو گئے۔

اس تعمیری کام کے لئے عام تعلیم کا رواج ضروری تھا۔ اس لئے باوجود وسائل کی کمی کے تعلیم پر توجہ دی جانے لگی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۷ء ہی میں مشرقی پاکستان میں تین کالجوں کی اور بنیاد رکھی گئی۔ ان کالجوں کے ساتھ ہی ساتھ کتب خانوں کا بھی قیام عمل میں آیا اس طرح ہر سال ان کی تعداد میں مزید اضافہ کیا جانے لگا اور اب مشرقی پاکستان میں چار یونیورسٹی، ۱۰۰ کالج اور ۲۹۸۰۵ مدارس موجود ہیں۔ علمی اور ثقافتی ادارے بھی اس درمیان میں قائم ہوتے رہے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ کتب خانوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا یوں تو تیرھویں صدی کے آغاز میں ہی مدرسوں کا رواج عام ہو چکا تھا اور برطانوی حکومت کے زمانے میں ان کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے میں علم و ادب کو جو فروغ حاصل ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں کا استعمال بھی کثرت سے کیا گیا ہوگا۔ کتابوں سے یہ استفادہ کتب خانوں کے ذریعے سے ہی حاصل کیا گیا ہوگا۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس سلسلے کی کوئی نشاندہی نہیں کرتے۔ البتہ ڈھاکہ میں مدرسہ شائستہ خاں کے کتب خانہ کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں نوابوں۔ زمینداروں اور امراء کے ذاتی کتب خانے تو ضرور تھے جو جائدادوں کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ خاتمۂ زمینداری کے وقت مخطوطات کے بیشتر ذخیرے سرکاری تحویل میں لے کر مقفل کر دئے گئے۔ مدرسوں میں رہے سہے کتب خانے بھی بے اعتنائی کا شکار تھے۔ دو چار جو اچھے کتب خانے تھے وہ ڈھاکہ میں اب بھی موجود ہیں۔ ان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی ہے جو آج سے تقریباً ۴۱ سال پہلے قائم ہوا تھا۔ اس کتب خانے کا شمار آج ملک کے عظیم کتب خانوں میں ہوتا ہے اس میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد کتابیں اور تقریباً ۲۶ ہزار نایاب مخطوطات ہیں۔ مخطوطات میں عربی، اردو، فارسی، بنگالی اور سنسکرت کے نسخے شامل ہیں جو ملک میں اپنی تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا ذخیرہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں زمانہ قدیم کی وہ تحریریں بھی شامل ہیں جو کھجور کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں لیکن ان کا بیشتر حصہ نہ صرف مناسب فہرست کا محتاج ہے بلکہ ایک تاریک کونے میں الماریوں کے اوپر گرد و غبار سے اٹا ہوا پڑا ہے۔

ان مخطوطات میں پوتھی ادب کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو موجودہ مسلم بنگالی ادب کی بنیاد سمجھا جاتا ہے یہ کتب خانہ تاریخ عہد قدیم کے ادب پر برصغیر ہند و پاکستان میں ایک بے مثال حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون پر دُنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں بھی یہاں موجود ہیں۔ جگہ کی شدید قلت کی وجہ سے یہ لائبریری فی الوقت دو علیحدہ حصوں میں تقسیم ہے اور اسی لئے اس کی خاطر خواہ تنظیم اب تک عمل میں نہیں آسکی ہے آج سے کچھ سال پہلے تربیت یافتہ عملہ کی بھی شدید کمی تھی لیکن اب صورتِ حال کسی قدر اطمینان بخش ہے۔ ۱۹۵۷ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری بلیٹن بھی کتب خانے سے شائع ہوتا ہے جو مشرقی پاکستان کا فن کتب خانہ پر واحد ماہانہ رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات پر بھی توضیحی نوٹ کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

اس یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ ۱۹۵۵ء میں ایک نئی یونیورسٹی لائبریری کی بنیاد راجشاہی میں رکھی گئی۔ یہ لائبریری بہت تیزی سے کتابوں کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہے اور ۷ سال کے اس مختصر سے عرصے میں کتابوں کی تعداد ۰۴ ہزار تک پہنچ چکی ہے اس کتب خانہ کی عمارت کا نقشہ تیار ہو چکا ہے اور اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں ایک جدید طرز کی عمارت اس کی ضروریات کے بموجب قائم ہو جائے گی۔

تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں ۲ مزید یونیورسٹیوں کا قیام ۱۹۶۱ء میں عمل میں آیا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی ڈھاکہ میں قائم ہوئی اور زراعتی یونیورسٹی میمن سنگھ میں ان یونیورسٹیوں کے کتب خانے بھی ۱۹۶۲ء میں قائم ہو گئے، زراعتی یونیورسٹی نے لائبریرین کا تقرر بھی کر لیا ہے اور اسکی اپنی عمارت کا بھی تیار ہو چکا ہے کتابوں کی خرید بھی مستعدی سے جاری ہے۔

یہ ۶ کتب خانے اس وقت مشرقی پاکستان میں کتب خانوں کی قیادت کر رہے ہیں ان کے وسائل ملک کے دوسرے کتب خانوں کے وسائل سے کئی گنا زیادہ ہیں ان کے سربراہ (سوائے انجینئرنگ یونیورسٹی کے) غیر ممالک کے سند یافتہ ہیں۔ اس اعتبار سے کتب خانوں کی تنظیم بہت حد تک جدید فنی اصولوں پر مبنی ہے۔ لائبریرین کی تنخواہ بھی یونیورسٹی کے اساتذہ (ریڈر) کے برابر ہے۔ عمارت کی نامناسبت اور جگہ کی قلت البتہ ان کتب خانوں کی ترقی میں سدِ راہ ثابت ہو رہی ہے اس کے باوجود ان کی کارکردگی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے اس پھیلاؤ سے جہاں چند اچھے کتب خانے قائم ہوئے اور جو قائم تھے ان سے اور وسعت ملی، مشرقی پاکستان کے دیگر کتب خانوں کی رفتار ترقی بھی تیز ہو گئی۔ اچھے کتب خانے بہرحال اسی وقت قائم ہو سکتے ہیں جب کہ تربیت یافتہ عملہ موجود ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی نے ۱۹۵۲ء میں فن کتاب داری کا پہلا ڈپلومہ کورس شروع کیا۔ یہ کورس چند ناگزیر حالات کی بنا پر جاری نہ رہ سکا۔ دوسری کوشش ۱۹۵۹ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ایک مختصر تربیتی کورس کا انعقاد کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء تک جاری رہا۔ ہر سال مضمون کی نوعیت وقت کی ضرورت کے لحاظ سے تبدیل کر دی جاتی تھی۔ اس کورس کے سلسلے میں ایجوکیشن فاؤنڈیشن ہر سال ایک امریکن لائبریرین کو بُلاتی رہی اس طرح نہ صرف یہ تربیتی پروگرام ہی کامیاب ثابت ہوا بلکہ مجموعی طور پر ڈھاکہ کے کتب خانوں کی تنظیم میں بھی ان اساتذہ سے کافی مدد ملی۔ ڈھاکہ میں ایک مثالی لائبریری کا قیام

بھی اسی ضمن میں عمل میں آیا۔

۱۹۵۹ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے یکسالہ ڈپلوما کورس کا آغاز کیا جس میں بی۔اے یا بی۔ایس سی پاس طلباء کو داخلے کی اجازت تھی۔ حسب دستور ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے امریکی اُستاد بہم پہنچا کر اور ایشیا فاؤنڈیشن نے کتابیں اور وظیفے فراہم کر کے اس کورس کے قیام میں خاصی مدد پہنچائی۔ اب ۱۹۶۲ء سے اس تربیتی کورس کو دو سالہ ایم۔اے کورس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اِس عرصے میں کُتب خانوں کی تحریک کافی عام ہوتی جا رہی تھی۔ ابتدائی سالوں میں اِس تحریک کی پُشت پناہی کے لئے کسی انجمن کا وجود بھی نہیں تھا۔ تحریک کا مرکز اس وقت ڈھاکہ ہی تھا اور یہیں سے ۱۹۵۴ء میں ایک انجمن کے قیام کی تجویز ہوئی ۱۹۵۵ء میں ایک انتظامی مجلس کی تشکیل عمل میں آئی اور ۱۹۵۶ء میں ایک باقاعدہ جماعت مشرقی پاکستان کے کُتب خانوں کی انجمن کے نام سے قیام پذیر ہوئی۔ اس انجمن نے مشرقی پاکستان کے کُتب خانوں کے سربراہوں کو نہ صرف ایک پلیٹ فارم بہم پہنچایا بلکہ کُتب خانوں کی تحریک کو ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک عام کرنے میں دامے، درمے، سخنے مدد بھی کی۔ نتیجے کے طور پر وہ جماعت جو ابتداء میں صرف چند افراد پر مشتمل تھی اب ایک وسیع برادری بن چُکی ہے۔ اس انجمن نے ۱۹۵۸ء میں ایک سرٹیفکیٹ کورس کا بھی آغاز کیا جو اب تک باقاعدگی سے جاری ہے۔ اس انجمن کی دوسری کوشش پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے تیسرے سالانہ اجلاس کا ۱۹۶۰ء میں ڈھاکہ میں انعقاد تھا۔ یہ پہلی کوشش تھی جس میں کتب خانوں کی قومی انجمن نے اپنی شریک انجمن کے ساتھ ایک مُشترکہ اجلاس کا بندوبست کیا ہو۔ اس کانفرنس کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں ایک مُشترکہ جدوجہد کے لئے میدان خاصہ ہموار ہو گیا۔ اور نتیجے کے طور پر ۱۹۶۲ء میں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کا مرکزی دفتر دو سال کے لئے ڈھاکہ منتقل ہو چُکا ہے۔ انجمن کا پانچواں سالانہ جلسہ بھی اس سال ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا ہے۔

اب جو نئے کالج کھلنے لگے تو اُن کے کُتب خانوں کے لئے تربیت یافتہ عملہ آسانی سے فراہم ہونے لگا۔ کتابی ضرورتیں بھی ایشیا فاؤنڈیشن کی مدد سے کسی حد تک پُوری ہونے لگیں۔ اِن تعمیری سرگرمیوں کا دوررس نتیجہ مرتب ہوا۔ آج اِن کُتب خانوں میں کتابیں بھی موجود ہیں، اسٹاف بھی کچھ تربیت یافتہ ہے، لیکن تنخواہوں کی کمی، حکام کی بے اعتنائی، جگہ کی قلت اور لائبریری کے بجٹ میں تخفیف بدستور جاری ہے۔ اِن سب باتوں نے کُتب خانوں کی افادیت اور استعمال کو محدود کر دیا ہے۔

۱۹۶۰ء میں مشرقی پاکستان کی انجمن نے اہم کالجوں کے کُتب خانوں کا ایک جائزہ شائع کیا۔ اس جائزہ سے معلوم ہوا کہ اِس وقت کئی کُتب خانوں میں کتابوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۲۰،۰۱۵ اور کم سے کم ۲۳۵ تھی۔ دو برس میں مختلف کُتب خانوں کی کتابوں میں اضافہ ہوا ہو گا۔

بہرحال اس وقت کے اعداد و شمار کے مطابق ہر طالب علم کے لئے صرف ۷.۰۱۱ کتابیں موجود تھیں، اِن کالجوں میں صرف ۲۶ کالج ایسے تھے جس میں لائبریرین کا تقرر کیا گیا تھا ورنہ بیشتر کالج میں اساتذہ کے ذمہ ہی کُتب خانوں کی دیکھ بھال کا کام سُپرد تھا۔ زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۱۵۰ روپے ماہانہ تھی اور کم سے کم ۴۵ روپے، یہی کیفیت اب بھی بیشتر کُتب خانوں میں پائی جاتی ہے۔ اچھے کُتب خانے معدودے چند ہیں۔ ان میں ڈھاکہ کالج لائبریری (قائم شدہ ۱۸۴۱ء) ...

جگن ناتھ کالج لائبریری (ڈھاکہ) (قائم شدہ ۱۸۸۲ء) برجومہن کالج لائبریری (باریسال) (قائم شدہ ۱۸۸۹ء) چٹاگانگ کالج لائبریری (قائم شدہ ۱۸۶۹ء) کومیلا وکٹوریہ کالج لائبریری (قائم شدہ ۱۸۹۹ء) اور انندا موہن کالج لائبریری (قائم شدہ ۱۹۰۹ء) شامل ہیں۔

اسکولوں کے کُتب خانوں کی حالت بھی غیر اطمینان بخش ہے، مذکورہ بالا جائزہ میں عام اسکول بھی شامل تھے اور ایسے اسکول بھی جنہیں محکمۂ تعلیمات نے اپنے ترقیاتی منصوبے کے لئے منتخب کیا تھا، اور اس میں بعض کو تو رہنما مدارس کی حیثیت حاصل تھی اِس جائزہ کے اعداد شمار حسبِ ذیل ہیں:۔

ہر کُتب خانے میں کتابوں کی اوسط تعداد ..	۳،۱۶۸
زیادہ سے زیادہ کتابیں	۶۲،۶۰۰
کم سے کم کتابیں	۲۰۲
ہر اسکول میں طلبا کی اوسط تعداد ..	۷۴۱
ہر طالبعلم کیلئے کتاب کی اوسط تعداد	۲،۷۲

یہ اعداد و شمار صرف ۱۲۶ اسکولوں کے ہیں لیکن ان مدارس کی حالت دوسرے مدارس سے قدرے بہتر ہی ہو اس لحاظ سے جو نتائج اُوپر کے اعداد و شمار سے اخذ کئے جاسکتے ہیں اُن کا اطلاق کچھ تخفیف کے ساتھ سارے مدارس کے کُتب خانوں پر کیا جاسکتا ہے، ڈھاکہ میں ایک مثالی اسکول لائبریری کے قیام کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اسکے نمونے کے مطابق دوسرے کُتب خانوں کو ترقی دینے کی تجویز زیرِ غور ہے۔

عوامی کُتب خانوں کے ذیل میں مشرقی پاکستان کے کُتب خانے بھی مغربی پاکستان کی طرح عوامی تو کہلاتے ہیں لیکن معنوی حیثیت سے عوامی کُتب خانوں کے حقیقی تصوّر سے دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ آج عوامی کُتب خانے ہماری مُراد اُن کُتب خانے سے ہوتی ہے جو مقامی حکومت کی سرکردگی میں بغیر معاوضے کے کتابوں کے اجراء کی اجازت دیتے ہیں۔ عوام کی ساری کتابی و علمی ضروریات کا مرکز یہی ادارہ ہوتا ہے، جو مذہب، رنگ و نسل اور سیاسی عقائد سے بے نیاز ہوتا ہے، اس طرح کے کُتب خانے مشرقی پاکستان میں بھی ناپید ہیں، اگر ہمیں اقوامِ عالم میں ایک بلند تہذیبی درجہ حاصل کرنا ہے تو عوامی کُتب خانوں کا قیام اِس کے لئے ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۳ء میں پہلی بار قدم اُٹھایا گیا تھا اور ایک مرکزی کتب خانہ کی بُنیاد ڈھاکہ میں رکھی گئی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں ایک خوبصورت نئی عمارت میں یہ لائبریری اپنے فرائض انجام دینے لگی۔ پُورے پاکستان میں یہ عمارت لائبریری کی پہلی عمارت ہے جو آزادی کے بعد تعمیر کی گئی ہے۔ اِس عمارت پر دس لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے لیکن ۳۳۳ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی یہ عمارت اپنی اندرونی بناوٹ کے اعتبار سے لائبریری کی ضروریات کے لئے ناموزوں ہے، یہ لائبریری اس وقت ایک حوالہ جاتی لائبریری کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے کتابوں کے اجراء کی اجازت نہیں پچھلے سال یونسیکو کی اعانت سے بچّوں کی کتابوں کا ایک سیکشن بھی یہاں کھل گیا ہے، اِس وقت اس لائبریری میں ۲۰ ہزار سے زیادہ کتابیں اُردو، بنگالی اور انگریزی میں ہیں، اس کُتب خانے کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ حکومت مشرقی پاکستان نے دس ہزار روپے کی امدادی رقم پندرہ اضلاع کے کُتب خانوں کیلئے منظور کی ۱۹۵۷ء سے تقریباً ۲ لاکھ کی رقم ہر سال ضلع، تحصیل اور مفصل کے کُتب خانوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۸ء کے ایک سرسری جائزہ کے مطابق مشرقی پاکستان میں ۲۸ عوامی کُتب خانے ہیں جن میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۸۲۵۱۰ ہے مشرقی پاکستان کے مرکزی کُتب خانے کے علاوہ صرف راجشاہی پبلک لائبریری اور خواجہ ناظم الدین مُسلم ہال لائبریری (دیناجپور)

(بقیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

وفا راشدی

بھٹیالی گیت

"بھٹیالی" مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کی ایک قسم ہے جسے "ماجھی گان" یعنی ملاحوں کے گیت کہتے ہیں - یہ گیت وہاں کے تمام گیتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ، دلنشین، موثر اور رومانی ہوتے ہیں سبزہ زاروں کی آغوش میں لہراتی ندیوں کی طرح ان کے دلوں میں جذبات کا ایک دریا موجزن ہوتا ہے کبھی وہ لوگ اپنے دکھ سکھ کی کہانی، واردات قلب اور واقعات زندگی کا اظہار نظموں اور گیتوں کے ذریعہ دلآویز انداز میں کرتے ہیں اور کبھی محبوب کی جدائی کے غم میں گیت کو تسکین کا باعث سمجھتے ہیں — گانے والے کی آواز میں درد ہوتا ہے اور فضا پر تشنگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے گانے والا ایک خاص سر میں گاتا ہے اور یہ آواز بڑی دیر تک فضا میں حکمرانی رہتی ہے .فریدپور، میمن سنگھ، رنگ پور اور سلہٹ کے ماجھی اس گیت کے بڑے رسیا ہوتے ہیں، گانے والے کی آواز میں بھی بے انتہا درد ہوتا ہے -جب وہ گاتے ہیں تو خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور جب کسی دیہاتی لڑکی کے لبوں سے اس قسم کے گیتوں کا چشمہ پھوٹتا ہے تو فضا نغمہ ہی نغمہ، رس ہی رس ہو جاتی ہے میں یہاں بنگال کے مشہور عوامی شاعر جسیم الدین کے ایک ایسے ہی پر کیف گیت کا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں محبوبہ اپنے پریمی کے انتظار میں کس طرح بیتاب ہو رہی ہے اس کا نقشہ دیکھئے ؎

گنگا کا کنارہ ٹوٹ گیا

اے دوست جدائی میں تیری

بے حال ہوں میں روتے روتے

اس پار تو ہے میری کٹیا

اور ندی کے اس پار ہے تو

اس پار سے کیسے آئے گا تو

اب ملنے کی امید نہیں!

میں کھول رہی ہوں کالی لٹیں

کالی راتوں کے سایوں سے

سارے سنسار کو گھیر لیا

(جو ٹوٹ گیا)

—+—

آکاش میں جتنے تارے ہیں

ہر ایک کو گن کر بیٹھی ہوں

ہر اس ملاپ کی لوٹ چکی

ہر آن بہار کی بیت چکی

تھکا ماندہ ملاح اپنی کشتی میں بیٹھا سکون کی سانس لے رہا ہے اچانک اسکی نگاہیں دریا کی دلفریب لہروں پر پیلگوں آسماں کے رنگین عکس اور آفتاب کے ڈوبتے ہوئے رد رخ پور منظر پر آپڑتی ہیں — اس کے دل میں گدگداہٹ سی ہونے لگتی ہے - وہ تصورات کی دنیا میں کھوجاتا ہے اور اس کے لبوں پر بے اختیار یہ بول مچلنے لگتے ہیں ؎

اے گہرے دریاؤں کے ماجھی

تو ناؤ کو کھے کر کہاں چلا؟

میری آنکھیں دور کنارے ایک گوشے

کی متلاشی ہیں۔

اے پیارے تیرا وہ دیس کہاں

جہاں سے تجھے کوئی آواز دے

؎ تمام گیت جسیم الدین کی بنگالی کتاب "رنگیلا نائیر ماجھی" سے براہ راست ترجمہ کیے گئے

پھیلے بادل کے پیچھے جاکر
کوئی اس سے پوچھے
تیری یاد میں کوئی کب تک آنسو بہائے؟

اسی اثنا میں دریا کے اس پار ردمان پرور سبزہ زار میں اسکی دل نواز محبوبہ رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ملاح وارفتگی کے عالم میں اپنی محبوبہ کی طرف کشتی کو لیے چل پڑتا ہے آندھی طوفان بادل کے خوف سے اس کا دل کانپ اٹھتا ہے لیکن پتوار اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتے۔ وہ ہمت کا دامن تھامے کشتی کو تیز تیز کھیتا چلا جاتا ہے اس حالت میں وہ ایک بار ابر آلود آسمان کو دیکھ کر زیر لب کچھ گنگناتا اور دل ہی دل میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا بھی ہو جاتا ہے

"یا اللہ!
کس سے جاکر پوچھوں کہ اپنی سیا کدھر لے جاؤں
ہر طرف گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
بجلی کی چمک، بادل کی گرج، راستے میں حائل ہیں
ابھی ابھی وہ میری آنکھوں کے سامنے تھی
پھر اچانک اوجھل ہو گئی
اسے پانے کی آشا دل میں ناچ رہی ہے
مگر اپنی ٹوٹی نیا لے کر کیسے پہنچوں
یا اللہ!

یک دم ایک آندھی آتی ہے۔ بارش زور سے ہونے لگتی ہے بدمانی موجیں سر پٹکنے لگتی ہیں لیکن ملاح کے ہاتھ سے ہمت کے پتوار نہیں چھوٹتے۔ چند ساعت پہلے وہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور اب اپنی نیا کو آندھیوں سے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف ہے، عین اس وقت دریا کے اس پار اس کی محبوبہ کے گانے کی سریلی آواز سے "بادو باراں" سے لبریز فضا میں زندگی سی بکھر جاتی ہے

پیارے ماجھی میں تجھ پر نثار
تیری نیا طوفان میں گھری ہے
مگر ہے کیا ڈر
بجلی اور طوفان تو تیرے جیون ساتھی ہیں

جب لہریں ناگن کی طرح سر اٹھاتی ہیں
تو تیرے مضبوط چپوان کے سر کچل دیتے ہیں
آندھی کا زور بارش کا شور آج ایسا ہی ہے
کہ دل دہل جائیں۔
پھر بھی دل خوشی سے رقص کر رہا ہے اور گانے پر لبا؟
میں سراپا رقص ہوں نغمہ مجسم
تو طوفان ہے، بجلی ہے، بادل ہے
دیکھا آسمان کی طرف
بادل کی اوٹ میں کوئی حسینہ
تیرا انتظار کر رہی ہے
طوفان سے گزر جا
بجلی، دریا دلی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے
ہمت سے کام لے
تیری جیت ضرور ہوگی
پیارے ماجھی سچ ہے تیرا پیار
تو آ جا اس پار

اور پھر طوفان گزر جاتا ہے، بارش تھم جاتی ہے۔ کشتی کنارے پر آلگتی ہے جہاں ماجھی کی محبوبہ دل میں دعائیں، لبوں پر مسکراہٹیں، انگ انگ میں پیار اور آنکھوں میں میخانہ لئے اس کے انتظار میں کھڑی ہے۔

غرض بھاٹیالی گیتوں کے موضوعات زیادہ تر اسی کے گرد گھومتے ہیں اور بعض اپنے موثر بولوں، رسیلے لفظوں اور احساسات کی سچی تصویریں ہونے کے باعث مشرقی پاکستان کے ماجھیوں اور اس نغمہ پرور سرزمین کے عوام کے مقبول ترین گیت کہا جاتا ہے اور جو ہمارے عوامی ادب کا عزیز ترین سرمایہ ہیں انھیں محفوظ کرنے اور ملک کی علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

سعد منیر

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیاں

ماہرین عمرانیات کے خیال کے مطابق دنیا کے ہر ادب کی تہہ میں زبانی روایتوں کی لامحدود دولت چھپی ہوئی ہے، اس دولت کو لوک ثقافت سے موسوم کیا جا سکتا ہے، لوک ثقافت بظاہر مختصر سے الفاظ ہیں مگر یہ بڑی متلاطم تاریخ کے حامل، لغوی معنی میں اس کا مطلب ہوگا عوام کا علم و دانش، علم انسانیات میں لوک ثقافت کی اصطلاح سے جانوروں کی حکایتیں، قصے، داستانیں، اساطیر، لوک کہانیاں، پرستانی کہانیاں اور سحر، توہم وغیرہ مراد ہو سکتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے اگر لوک ثقافت کو زبانی فن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، لوک ثقافت بھی ایک طرح کی تاریخی سائنس ہے، تاریخی سائنس اس لئے کہ اس سے ہمارے ماضی پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے جو نتائج نکالے جاتے ہیں وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہوتے، بلکہ ہر طرح کی سائنسی تحقیق و تفتیش کی طرح ان کے لئے استقرائی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے، مختصر یہ کہ لوک ثقافت علم الانسان ہی کی ایک شاخ ہے اور ہمارے ماضی کے زندہ آثار کی حامل، اس سے ہمارے قدیم زمانے کے رسم و رواج، معاشرت، طریقہ عبادت اور عقائد کا پتہ چلتا ہے، لوک ثقافت کی قدر و قیمت اور اہمیت کے اندازہ کا سلسلہ انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے، جب کہ مفکرین انسانی معاشرہ کی تاریخی توضیح اور تشریح کی خاطر باقاعدگی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کے مطالعہ میں مصروف ہوئے۔

ہر ملک کی لوک کہانیاں لوک ثقافت کا ایک جزو ہیں اور قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہیں، بہت سی کہانیاں معمولی معمولی فرق کے ساتھ بہت سے ملکوں میں ملتی ہیں، علماء تاریخ کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی یاد دلاتی ہیں جب آریا ایک جگہ رہتے تھے اور جب ان میں سے بعضے یورپ اور بعضے برصغیر ہندوستان و پاکستان گئے تو ثقافت کی دولت بھی انکے ساتھ وہاں چلی گئی، مشرقی پاکستان کی بہت سی لوک کہانیاں ہند یورپی کے سرچشمہ کی ہی ایک شاخ ہیں جن میں ہند یورپی روایتیں گھلی ملی ہیں ان کہانیوں میں جادو، سحر، عقائد، توہم وغیرہ بر جستہ ہیں اور دیو، بھوت، جن، دیومالا، جادوگر، جادوگرنیاں، پرستان اور دوسرے حیوان کردار ادا کرتے ہیں، سیار، شیر وغیرہ اپنے پسندیدہ انسانی کرداروں کی اعانت کرتے ہیں،

ان کہانیوں کے علاوہ مشرقی پاکستان میں ایسی بھی کہانیاں ہیں جو خاص یہاں کی پیداوار ہیں، انہیں یہاں کی مخصوص فضا اور ماحول نمایاں اور خاص چڑیاں ملتی ہیں، فقیر چند کی چڑیاں بے ہنگامہ اور بے ہنگامی کی مثال کی جا سکتی ہے۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوک کہانیاں کب وجود میں آئیں، البتہ اتنا قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم باشندے دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد خاص کر جاڑے کی سرد راتوں میں اپنے چولہوں کے گرد جمع ہو کر بیٹھتے ہوں گے اور اپنے بچوں کو بہلانے کے لئے قصے کہانیاں سنایا کرتے ہوں گے اور انہیں کے ذریعہ کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق بھی دے دیا کرتے ہوں گے انھوں نے خیر و شر کے تصور سے پیش کرتے ہونگے ایسی کہانیوں میں نیکی ہمیشہ بدی پر غلبہ حاصل کرتی ہے انصاف کا بول بالا ہوتا ہے اور محنت و عمل کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں، خوش اخلاقی اور سخاوت کی صفتیں ناانصافی پر فتح حاصل کرتی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں زیادہ تر لوک کہانیاں دیہاتوں میں تخلیق ہوئیں، اور وہ اغلباً عورتوں ہی کی پیداوار ہیں جو آم کے درختوں کے جھنڈ سے گھرے ہوئے گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے پرسکون ماحول میں بیٹھ بیٹھ کر انہیں سنایا کرتیں، یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں اور سولہویں صدی عیسوی سے پہلے بنگال میں انہیں تحریر کا جامہ پہننا نصیب نہ ہوا،

برصغیر ہند و پاک میں کہانیاں کہنے کا فن ہزار ہا برس سے چلا آرہا ہے۔ اس کی مثالیں رامائن میں بھی ملتی ہیں۔ (ان بنگلہ) کے محل میں داستان گویوں کی موجودگی پائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ راجکمار بھرت کسی وجہ سے بہت اداس تھے تو ان کا دل کہانیاں سنا کر بہلایا گیا تھا۔ بنگلہ زبان میں سیتا کہانیاں سن سن کر اپنا دل خوش رکھتی تھیں۔ لوک کہانیوں میں اکثر اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ رانیاں اور شہزادیاں اپنے محلوں میں پیشہ ور داستان گو رکھتی تھیں۔ یہ داستان گو عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ داستان گوئی کا پیشہ مالیوں اور ماؤں سے مخصوص تھا۔ ان کہانیاں کہنے والیوں کا کام صرف دل ہی بہلانا نہ تھا بلکہ وہ رانیوں اور شہزادیوں کی ہمدرد و ہمراز بھی ہوا کرتی تھیں اور اخلاقی سبق اور پاکبازی کے اصول بھی سکھایا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر پانچ مالا کی کہانی پیش کی جا سکتی ہے۔

مشرقی پاکستان کی زیادہ تر لوک کہانیاں بدھ مت کی ترقی اور زوال کے درمیان کے زمانے میں تخلیق ہوئیں۔ یہ زمانہ تیسری صدی سے دسویں صدی تک کا ہو سکتا ہے۔ ان کہانیوں میں ہیروئن کے حسن و جمال کے طویل بیانات نہیں ملتے، صرف ایک دو لفظ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو طویل بیانوں سے کہیں زیادہ تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لوک کہانیوں میں عورتوں کی خاص خوبی ان کے دل کے لطیف و نازک جذبات میں مضمر ہوتی ہے۔ عورتوں کا اعلیٰ جوہر شریفانہ صفتیں قرار پاتی ہیں۔ ان لوک کہانیوں میں سوداگر کو معاشرہ میں بلند درجہ حاصل ہے اور وہ مرتبہ میں قریب قریب راجاؤں کے برابر ہوتا ہے۔ راجہ کا لڑکا سوداگر کے لڑکے کے ساتھ ہی دوستی کرتا تھا۔ وزیر اور کوتوال کے لڑکے بھی اس کی دوستی کے حقدار ہوتے تھے مگر وہ سوداگر کے لڑکے کے مقابلہ میں کمتر درجہ رکھتے تھے۔ شہزادیاں عام طور پر سوداگر کے لڑکوں ہی سے شادیاں کرنا پسند کرتی تھیں۔ لوک کہانیوں میں تجارت اور بحری سفروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان کی بدولت خوشحالی اور کامرانی سے لوگ دوچار تھے۔ عشق و محبت، ایثار و قربانی اور اس طرح کے دوسرے جذبات اور سازشوں سے پیدا ہونے والی صورتیں اور کہانیوں میں بھی بیان ہوئی ہیں مگر انہیں یہاں کا مخصوص رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ لیکن جب بدھ مت کو زوال ہوا اور ہندوؤں اور برہمنوں کو پھر عروج حاصل ہوا تو لوک کہانیوں میں مذہب کی رزمیہ نظموں اور دیومالائی عناصر جگہ لینے لگے۔ بھگوت، رامائن اور مہابھارت سے مواد حاصل ہوا۔ عبادات اور روحانیت پر زیادہ زور دیا گیا۔ بحری سفر ممنوع قرار پائے۔ تجارت اور سوداگری کے مواقع کم ہونے شروع ہو گئے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے عربی اثرات بنگالی قوم اور بنگلہ زبان میں سرایت کرنے لگے۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے سے پہلے اور بعد کے زمانے میں مسلمان عرب تاجر چاٹگام کے اردگرد کے علاقوں میں داخل ہوئے اور تجارت کے ساتھ مذہب کی بھی تبلیغ کرتے رہے۔ صوفیا اور درویش حضرات نے بھی اس سرزمین کو نوازا۔ ان کے سیدھے سادے پاکیزہ کردار کے مشاہدے سے کثیر تعداد میں لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ۱۱۹۹ء میں ترکی سپاہی بختیار خلجی نے راجہ لچھمن سین کو شکست دی۔ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ برہمنیت کا اقتدار ختم ہوا۔ اسلامی رسم و رواج عام ہوئے۔ اسلامی عقائد اور مساوات نے برہمنیت سے کچلی ہوئی آبادی خاص کر ہندوؤں میں ذہنی احیاء پیدا ہوا۔ ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ انتہائی زبردست انقلاب پیدا ہو چکا تھا مگر عرصہ دراز تک لوک کہانیاں جو بدھوں اور برہمنوں میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مشترک تھیں اپنی اصلی شکلوں میں جاری رہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی مسلمان عورتیں وہی پرانی کہانیاں کہتی رہیں جو انہوں نے اپنی دادیوں نانیوں سے سن رکھی تھیں مثلاً پانچ مالا، بھالو متی، سات بھائی چمپا، سونا چاندی، مدھو مالا، مالتی کسم وغیرہ۔ کہانیاں جس طرح ہندو کسانوں کے گھروں میں سنی جاتی ہیں، اسی طرح مسلمان کاشتکاروں کے گھروں میں دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی ہیں۔ مسلمان مرد بھی اپنے خاندانی پیشے برقرار رکھے رہے اگرچہ ان پیشوں کا تعلق ہندو مذہب ہی سے تھا اور ان میں دیوی دیوتاؤں کے تعریفی گیت گائے جاتے تھے۔ سانپ کے کاٹے اور آسیب زدوں کے بھوت اتارنے کے منتر مسلمان اوجھا ہی جانتے تھے۔ رفتہ رفتہ پرانی کہانیوں میں اسلامی تصورات بھی داخل ہونے لگے۔ ان کی روح اور واقعات تو ایک رہے مگر کرداروں کے ناموں میں تبدیلی ہو گئی۔ دیوی دیوتاؤں کی جگہ پیروں اور ولیوں نے لے لی۔ عربی ایرانی کہانیاں بھی لوگوں میں مقبول ہوئیں۔ بعد کو مسلمانوں نے جدت سے

بھی کام لیا، اور دیوی، دیوتاؤں اور ان کے فوق الفطرت اثرات کو خارج کر کے صرف انسانی باتوں کو کہانیوں کا موضوع بنایا، تاریخی شخصیتوں کے متعلق بھی کہانیاں کہی گئیں، ان کے کارناموں میں رومانی رنگ بھر آگیا،

عام طور پر جو کہانیاں مسلمان گھرانوں میں رائج ہیں انہیں کچھ ایسی ہیں جو بزرگوں اور درویشوں کی کرامتیں دکھائی گئی ہیں، ایسی کہانیاں ہندوؤں میں بھی رائج ہیں، یہ فوق الفطرت پیر کہلاتے ہیں، مثال کے طور پر مانک پیر اور ست پیر، یہ کہانیاں پندرہویں سولہویں صدیوں میں تخلیق ہوئیں، کچھ کہانیاں اسلامی مجاہدوں اور تاریخی ہستیوں کے کارناموں کی حامل ہیں، ان میں اسلامی مجاہد ہندو حکمرانوں پر غلبہ حاصل کرتے ہیں اور راجکماریوں سے بیاہ کرتے ہیں، ایسی کہانیاں عربی و فارسی کہانیوں کے واقعات سے متاثر ہیں، بعض کہانیوں میں حضرت محمد صلعم کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، زیادہ تر کہانیاں نظم میں ہیں، بنگلہ زبان کی بعض ایسی پوتھیاں بھی اس زمرے میں آسکتی ہیں جنمیں قصے کہانیاں اور عشق و محبت کی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔

جو کہانیاں ہزار ہا برس سے چلی آرہی ہیں انمیں پرستانی کہانیاں، مزاحیہ کہانیاں، براتا کتھا اور گیتی کتھا شامل ہیں، پرستانی کہانیوں میں فوق الفطرت عناصر جاری ہیں، راکشس، دیو، بھوت پریت جن، پریاں، دیویاں اور مندرے کردار ادا کرتے ہیں، یہ کہانیاں محض خیالی اور عجیب و غریب واقعات سے پُر ہیں، ان کہانیوں میں رسّی چاند کی عمر بتا سکتے ہیں، مچھلیوں کو سمندر سے بلا سکتے ہیں، پہاڑوں کی ہیئت بدل سکتے ہیں، مردہ جسم کے ٹکڑے جوڑ کر آدمی زندہ کر سکتے ہیں، سنہرے جوتے پہن کر سمندر پر چل سکتے ہیں، فانی انسان فوق الفطرت طاقت رکھتے ہیں، اس قسم کی کہانیاں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں، ان کی صورتیں مختلف ہیں، اور واقعات مماثلت رکھتے ہیں، بنگلہ زبان کی روپ کتھاؤں میں اخلاقی نکات بھی ملتے ہیں، مزاحیہ کہانیوں میں سیدھے سادے کرداروں اور معمولی واقعات سے ہنسنے ہنسانے کا سامان پیدا کیا گیا ہے، وہ چبھتی ہوئی گہرائی سے عاری ہوسکتی ہیں، مگر بڑی دلچسپ، ان سے دیہاتوں میں بسنے والوں کی بھولی بھالی مزاحیہ صلاحیتیں آشکار ہوتی ہیں، براتا کتھاؤں میں دعائیں اور بھجن شامل ہیں جنمیں بنگالی لڑکیاں مقامی دیوی، دیوتاؤں کے حضور اپنی مرادیں اور آرزوئیں پوری ہونے کے لئے کچھ رسموں کے ساتھ گاتی ہیں، گیتا کتھا ایسی کہانیاں ہیں جنمیں بیچ بیچ میں کورس کی شکل میں گیت گائے جاتے ہیں، مشرقی بنگال میں گیت کتھا بڑے خاندانوں کی عورتوں کو ان کی زچگی کے زمانے میں خاص کر چھٹی کی رات کو نچلے طبقے کی بوڑھیاں سنایا کرتیں اور ان کے گیت کئی عورتیں مل کر گایا کرتیں، کہا جاتا ہے کہ چھٹی کی رات کو قسمت کا دیوتا بچے کی پیشانی پر قسمت لکھنے آتا ہے، اور ماں وغیرہ کو جگائے رکھنے کے لئے یہ کہانیاں سنائی جاتی تھیں، ان کہانیوں میں مالنچ مالا امتیازی درجہ رکھتی ہے،

اب تک بہت سی اچھی کہانیاں تحریری شکل اختیار نہیں کر سکی ہیں، جو تحریری شکل میں دستیاب ہیں وہ اپنا اصلی روپ کھو بیٹھی ہیں ان میں لکھنے والوں کا سلیم و تفضل زیادہ نمایاں ہیں، مسلمانوں میں نیم پڑھے منشیوں اور پورآن کے شارح ہندوؤں نے ان کو اصلی شکل میں پیش کرنا مناسب نہ سمجھا ان کے خیال میں ان کا اصلی روپ بہت ادنیٰ درجہ کا ہے اس لئے تحریری شکل میں جو کہانیاں ملتی ہیں ان میں بڑا ہی قدیم عالمانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے سنسکرت اور عربی و فارسی) اثرات نے ان کے حسنِ سادہ کو مجروح کر دیا،

کہانیوں کو تحریری شکل بخشنے والوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، ہندوؤں کی لکھی ہوئی کہانیوں میں تو خیر ہندوانی فضا ہوئی ہی چاہیے تھی، مگر جن کہانیوں کو مسلمانوں نے تحریری صورت بخشی ہے ان میں بھی وہی ہندوانی فضا چھائی ہوئی ہے، مثال کے طور پر محمد منشی کی کنچن مالا، منشی جاوید علی کی مدھو مالا، واعظ الدین کی مالنچ مالا، منشی قربان علی کی ساکھی سونا، غلام قادر کی سینا دستا پیش کی جا سکتی ہیں،

غالباً برصغیر ہند و پاک میں سب سے پہلے ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان دکھشنا رنجن مجمدار نے "ٹھاکر دادار جھولی" "ٹھاکر مار جھولی" اور "دادا مات ار جھولی" کے ناموں سے لوک کہانیاں شائع کیں ان کتابوں میں جو کہانیاں شریک ہیں وہ انہوں نے بنگالہ کے مختلف دیہی مسلمانوں خاص کر میمن سنگھ کے دیہاتوں میں گھوم پھر کر کہانیاں کہنے والی بڑھیوں کی زبانی سنی ہیں اور ان کو بڑی حد تک اسی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن میں کہ وہ کہی جاتی ہیں، اسی طرح کچھ کہانیاں

سعد منیر

کنچن مالا

بہت دنوں کا ذکر ہے، مہارانی نگر میں ایک سوداگر رہا کرتا تھا۔ اس کے پاس چودہ بڑی بڑی اور بہت سی کشتیاں تھیں، وہ ان کشتیوں پر مال و اسباب لاد کر دیس بدیس جاتا اور سامان بیچ کر پھرتا۔ سوداگری کرتے کرتے تھوڑے دنوں میں اتنا امیر بن گیا، اتنا امیر بن گیا کہ دھن دولت اور ہیرے جواہرات سے اس کا گھر بھر گیا۔ اس نے اپنے گھر کے تمام در و دیوار سونے سے منڈھوا لیے اور ... سے اس کا گھر جھل جھل کیا کرتا۔

اس سوداگر کے پاس اتنا سب کچھ تھا پھر بھی اس کا دل بہت دکھی تھا اور اس کا دکھ دن بدن بڑھتا ہی جاتا تھا، وہ اکثر سوچا کرتا اور کڑھا کرتا یہ دھن دولت اس کے کس کام کے۔ بہت زیادہ دن کا مال کس کے نصیب اور دھن میں جائے گا، کاش میرا کوئی لڑکا یا لڑکی ہوتی۔ لوگ سوداگر کو دیکھتے تو اس کا مذاق اڑایا کرتے، اسے طعنے تشنے دیا کرتے اور کہا کرتے بڑا منحوس ہے، صبح صبح اس کا منہ دکھائی دے جائے تو سارا دن خراب ہو جائے۔ سوداگر یہ سب سنتا اور تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہایا کرتا۔

ایک دن کیا ہوا کہ جب سوداگر رنج و غم میں ڈوبا راستے میں بیٹھا جا رہا تھا تو اسکی ایک سادھو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگا، مہاراج کوئی ایسا منتر کیجیے کہ میرے یہاں اولاد ہو۔ سوداگر کی حالت زار دیکھ کر سادھو کا دل پگھل گیا۔ اس نے ایک پھل اپنی جھولی سے نکالا، نکال کر سوداگر کو دیا اور بولا یہ پھل اپنی پتنی کو کھلا دینا، اسکے کھانے سے تمہارے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوگی۔ وہ اتنی خوبصورت ہوگی کہ تم جہاں بھی اسے رکھو گے تمہارا گھر اسکی روشنی سے جگمگاتا رہے گا، تمہارا کوئی غم باقی نہ رہے گا، اور لوگ بھی تم کو منحوس نہیں کہا کریں گے، لیکن ایک بات ہے تو یہ کہ لڑکی کے نو برس کی ہونے سے پہلے تم کو اس کا بیاہ کر دینا ہوگا، اگر تم نے اس مدت کے اندر اندر اس کا بیاہ نہ کیا تو تمہاری چودہ کشتیاں تو تباہ ہو جائیں گی، تمہارا گھر بار، مال و دولت بھی باقی نہ رہے گا اور سب کا سب یکلخت بھسم ہو جائے گا۔

اب کیا تھا سوداگر پھل لے کر ہنسی خوشی گھر آیا اور اسے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ اسکی بیوی نے ایک سنیچر کو اچھی ساعت دیکھ کر وہ پھل کھا لیا۔ پھل کھانے کے کچھ ہی دنوں کے بعد سوداگر کی بیوی کو محسوس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ سوداگر کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ خوشی خوشی رسمیں جو پہلے مہینے سے دسویں مہینے تک ہوتی ہیں وہ سب انجام دی گئیں۔ جب دن پورے ہو گئے تو ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

اس لڑکی کے حسن و جمال کا کچھ پوچھنا ہی نہ تھا۔ وہ ہنستی تو سارے گھر میں بجلی سی چمکنے لگتی۔ اس کے بدن میں عجب طرح کی چمک ہوتی تھی۔ سوداگر نے اس کا نام کنچن مالا رکھ دیا۔

ایک ایک دو دو کر کے دن گزرنے لگے اور لڑکی نو برس کی ہونے کو ہو گئی۔ اس درمیان سوداگر کی زندگی میں سکھ بھی آئے دکھ بھی آئے۔ سوداگر کی بیوی لڑکی کا منہ دیکھ کر سکون محسوس کرتے نہ کرتے کچھ ہی دنوں میں چل بسی۔ سوداگر نے بہت کٹھنائیوں سے کسی نہ کسی طرح ایک سال کاٹ دیا۔

ہوتے ہوتے نو برس ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا۔

سوداگر کو اچانک سادھو کی بات یاد آگئی۔ اس کا یاد آنا تھا کہ ڈر کے مارے سوداگر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ زبردست خلجان میں گرفتار ہو گیا۔ اگر وہ اس تھوڑے سے وقت میں اپنی بیٹی کا بیاہ نہ کر سکا تو کیا ہوگا۔ اسکی سونے کی حویلی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اب سوداگر نے یہ ٹھان لی کہ جو بھی سب سے پہلے سامنے آ جائے گا اسی کے ساتھ بیٹی کا بیاہ کر دیگا۔ قسمت کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے، تو جس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس نے اپنی پسند کے بر کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر کوئی

بھی ملنا نہ ملا۔

سوداگر اسی ادھیڑبن میں پھنسا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی، اس نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک برہمن فقیر چھ مہینے کے سوکھے سے مریل لڑکے کو گود میں لئے کھڑا ہے، لڑکا اندھا بھی ہے، برہمن عاقبت درست کرنے کیلئے کاشی جانا چاہتا تھا اس کی بیوی مرچکی تھی کوئی اب نہ تھا جس کے پاس وہ اپنے لڑکے کو چھوڑ جاتا، اور اس امید پر آیا تھا کہ اگر اسے کہیں آسرا مل جاتا تو وہ اطمینان سے اپنے جاترے پر روانہ ہوسکتا تھا، سوداگر نے اس کا ارادہ سنا، یہ قسمت ہی کا تو کھیل تھا سوداگر لڑکے کو برہمن سے لیکر اندر چلا آیا، اس کا سینہ غم سے پھٹا جاتا تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی،

کنچن مالا نے جو اپنے ابا کو روتے دیکھا تو وہ بےچین ہوگئی اور پوچھنے لگی ابا جان جیسے آپ کو کوئی دکھ دبا ہے، کیا؟ اس کے باپ نے اسے اس کی زندگی کی ساری کہانی سنا کر بتایا کہ اب نو برس پورے ہونے میں صرف چند گھڑیاں رہ گئی ہیں، ان چند گھڑیوں کے اندر اس کو اس اندھے لڑکے کے ساتھ بیاہ کرنا ہوگا، اس نے بہت کوشش کی کہ کوئی اچھا بر ڈھونڈ سکا۔ اب قسمت کے لکھے کا کیا کیا جاسکتا تھا، یہ اندھا لڑکا ہی کنچن کا بر ہوکر آیا ہے

کنچن یہ سب سنکر بہت اداس ہوئی، اپنی ماں کیلئے اس کا دل مسوس کر رہ گیا، وہ سوچنے لگی کاش اس کے ایک ہی بھائی ہوتا تو شاید وہ اسے اس مصیبت سے نجات دلا دیتا،

کنچن نے روتے روتے اس چھ مہینے کے اندھے لڑکے کو اپنا سوامی بنالیا، اور بولی میری قسمت میں یہی لکھا تھا، آج سے میری تمام خوشیاں رخصت ہوگئیں اور دکھ سدا کا ساتھی بن گیا،

کالی اندھیاری رات تھی کہیں بھی کوئی نظر نہ آتا تھا، ہر طرف بھائیں بھائیں ہو رہا تھا، رات کے اندھیرے میں کنچن اپنے ننھے بچے سوامی کو گود میں لے کر باہر نکل کھڑی ہوئی، اسکی عمر ہی کتنی تھی، یہی نو برس، ان نو برسوں میں سوائے سکھ کے کچھ دیکھا ہی نہ تھا، وہ یہ بھی نہ جانتی تھی کہ دکھ کیا چیز ہوتا ہے، وہ باہر نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ راستہ بھی نہیں جانتی، قدم قدم پر دشواریاں حائل تھیں، وہ ننھی سی جان ننھے سوامی کو گود میں لئے اندھیری رات میں چلتی رہی، اور چلتے چلتے ایک گھنے جنگل میں آنکلی، ہر طرف شیر اور بھالو دہاڑ رہے تھے، گیدڑ زور زور سے چیخیں لگا رہے تھے، جھینگروں کی آوازیں شور مچا رہی تھیں، ہر طرف کالی سیاہ رات کی وحشت ناک ہیبت چھائی ہوئی تھی،

وہ چلتی رہی چلتی رہی اتنا ایک بڑے بھاری پیپل کے درخت کے نیچے پہونچی اور اس کی جڑ میں تین ہاتھ ٹیکا کر بولی اگر تم سنہرے پیڑ کے درخت ہو تو مجھے پناہ دو، اس کے اتنا کہتے ہی درخت بیچ سے پھٹ گیا، اس کا پھٹنا تھا کہ کنچن مالا کیا دیکھتی ہے وہاں ایک کوٹھڑی بنی ہوئی ہے وہ شیر اور بھالوؤں کے ڈر سے اس میں داخل ہوگئی، ابھی وہ داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک بڈھا دھاری سادھو اسکی طرف بڑھ کر آیا اور کہنے لگا بیٹی آج کی رات تم میرے چھونے ہی پر سو رہو، میں تمہارے لئے جگہ چھوڑے دے رہا ہوں، کل تم کو بتاؤں گا کہ تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے،

جوں ہی پو پھٹی بوڑھا سادھو نے کنچن کا ہاتھ دیکھا اور بولا قسمت میں جو دکھ لکھا ہے وہ کوئی دور نہیں کرسکتا، تمہاری گرہ ہی خراب ہے، تمہاری باقی زندگی دکھ ہی میں کٹے گی، میں تم کو یہ پھل دیتا ہوں، تم یہ اپنے سوامی کو کھلا دینا، اس کی آنکھوں میں روشنی آجائے گی، اب تم اس راستے پر آگے چلی جاؤ، کچھ دور جاکر تم کو ایک لکڑہارا ملے گا تم اس کے ہاں اپنے سوامی سمیت رہنا، وہاں اس کا بچپنا کٹ جائے گا اور وہ جوان ہوجائے گا پھر تمہارے کچھ دن خوشیوں میں گذر جائیں گے، اگر تم کو پھر کسی تکلیف کا سامنا ہو تو مجھے یاد کرنا،

کنچن مالا وہاں سے چل پڑی کچھ دور جاکر اس نے سادھو کا دیا ہوا پھل اپنے سوامی کو کھلا دیا دیکھتے ہی دیکھتے اس ننھے بچے کی آنکھوں میں روشنی آگئی، اس کا سوکھا مرجھایا ہوا بدن بھی خوبصورت ہوگیا، کنچن مالا کی طرح اس کے چہرے کی جوت سے سارا بن روشن ہوگیا، کنچن یہ دیکھ کر دکھ میں بھی خوشی سے لہلہا اٹھی،

چلتے چلتے وہ لکڑہارے کی جھونپڑی تک جا پہونچی، وہاں کیا دیکھتی ہے کہ لکڑہارے اور اسکی بیوی اور اس کے خاندان والوں نے لکڑیوں کی ٹالیں لگا رکھی ہیں اور لکڑیاں چیری اور بیچی جارہی ہیں، اس ذریعے سے وہ اپنی روزی کماتے ہیں، لکڑہارا اور اسکی بیوی کنچن مالا اور اس کے سوامی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئے، ان کے کوئی بیٹا بالا نہ تھا، انہوں نے انہیں دونوں کو اپنا بیٹی بیٹا بنالیا اور ان کی دیکھ بھال شروع کردی، کنچن مالا

کی اپنی قسمت تو اچھی نہ تھی۔ وہ بہار جہاں رہتی وہاں کے لوگ خوش حال ہوتے جاتے۔ لکڑہارے کی آمدنی بھی روز بروز بڑھنے لگی۔ لکڑہارا اور اس کی بیوی کنچن اور اس کے سوامی کو اور بھی چاہنے لگے۔

لکڑہارا جس گاؤں میں رہتا تھا وہاں سے کچھ دور ایک میلہ ہر سال ہوا کرتا تھا۔ گاؤں کے سب ہی لوگ میلہ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن لکڑہارا اور کنچن مالا اور اس کے سوامی کو بھی میلہ دکھانے لے گئے۔ وہاں اس میلے کے اندر کا میلہ پن ملا دیکھنے آیا ہوا تھا وہ بھی بڑا تھا۔ راجہ کے لڑکے کی کنچن مالا کے سر پر نظر پڑی۔ وہ اس قدر خوبصورت ہو گئی تھی کہ لوگ اسے بھول کمار کی ... کہ کنچن مالا بھی اسے سوامی کہہ کر سُن کر بہت خوش ہوتی تھی۔ بھول کمار جوانی میں قدم رکھ رہا تھا ... جب راجہ کے لڑکے نے جواسے دکھا تو اسے خیال ہوا کہ ایسے دیسے کا لڑکا نہیں ہو سکتا۔ لکڑہارے کا تو کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا اور کالڑکا اس کے اور بھی نزدیک آگیا جب تو اس کے بالکل سامنے آیا تو اس کے ماتھے پر راج تلک دکھائی دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھول کمار کو ضرور اُڑا لے جائے گا۔ جب وہ گھر واپس جانے لگا تو اس نے آدمیوں سے کہا کہ وہ تو بھول کی طرح لڑکا دکھائی دے رہا ہے جب وہ گھر جانے لگے تو ان کے آدمیوں کو گھیر کر اُن سے چھین لائیں۔

راجہ کا حکم ملا تھا ویسا ہی کیا گیا۔ راجہ کے آدمیوں نے ... کے آدمیوں سے زبردستی چھین کر اس کے سامنے حاضر کر دیا اور کنچن مالا ... اس دن سے بہت ... ہو گئے۔

جب کنچن مالا سے بھول کمار چھین گیا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ پھر تک گھس گئے ... سب اس کے ساتھ رونے رہے تھے کہ کنچن مالا کے غم میں ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے تھے۔ ان کا سوامی جب بھول کی طرح کھیلنے لگا تھا تو وہ اب سب درد کھو ... اسے اپنے دکھ میں بھی روشنی کی کرن دکھائی دیتی تھی مگر ہائے ری قسمت اب تو سب کچھ ہی جاتا رہا تھا۔

وہ غم سے پاگل ہو کر اپنے پالنے والے ماں باپ لکڑہاروں کے ساتھ سوامی کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی اور بن بن جنگل جنگل پھرتی رہی۔ سنے است جوگا پہاڑ کے قریب ڈھونڈھا جہاں پہر جنگل پہاڑ سے جا ملتا ہے جہاں دیو جیسے آدمی انسان کی گردن مروڑ کر اس کا خون پیتے ہیں اور جہاں آدمی اور سانپ دوست بنے رہتے ہیں اور جنگا پہاڑ کے اردگرد بھی جہاں شیر بھالو دن دہاڑے آدمی کو پکڑ کر کھا جاتے ہیں لیکن خوف اور تکلیف کی پرواکئے اپنی جان سے زیادہ پیارے بھول کمار کو ڈھونڈتی پھری اسکو ڈھونڈتے ڈھونڈتے چھ برس گذر گئے مگر کہیں بھی اس کے دل کا پیارا اس کی قسمت کا مالک دکھائی نہ پڑا کوئی اس کا پتہ نشان بتانے والا نہ تھا۔ اسے تسلی دلاسہ دینے والا نہ تھا اور پہاڑوں، وادیوں، جنگلوں، صحراؤں، راستوں، گھاٹوں میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے سونائی نگر جا پہنچی۔

سونائی نگر کا راجہ بڑا دھرمی تھا اس کی ایک لڑکی تھی، بڑی ہی خوبصورت بڑی ہی حسین، نام تھا کنچن لتا، کنچن لتا کو ایک داسی کی ضرورت ہوئی ... والے نے ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ کنچن مالا نے بھی سنا اس سے ... حالانکہ اس کی حالت بڑی خراب ہو رہی تھی، اس نے سوچا اس سے اپنے من اپنے کو تسلی و تشفی ... کر دیا اور کنچن لتا کی داسی بن گئی۔

کنچن لتا کو اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا مگر وہ کنچن مالا کے حسن و جمال کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی اور اس سے جلنے لگی۔ کنچن مالا درد و غم میں بھی شاہی کی مورتی بنی رہتی، اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر کنچن لتا کے دل میں جلنے کے باوجود ترس پیدا ہو گیا۔ وہ آخر سوچتی رہتی کون ہے یہ بے مثال حسن والی لڑکی؟

کنچن مالا جب کنچن لتا کے ہاں رہنے لگی تو اسے بھول کمار دکھائی دیا۔ بھول کمار نے بھی کنچن مالا کو پہچان لیا۔ مگر اب دونوں کے درمیان کوسوں کا فاصلہ آن پڑا تھا۔ اور یہ فاصلہ سونائی نگر کی راج کنیا کنچن لتا کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ کنچن لتا اس کی بیوی بنی ہوئی تھی۔

بھول کمار اور کنچن لتا کی زندگیاں ہنسی خوشی گذر رہی تھیں۔ بھول کمار کو کنچن مالا سے بچھڑنے کے بعد جو کاری زخم لگا تھا وہ کنچن لتا کے ملنے کے بعد دھیرے دھیرے بھر آیا تھا۔ البتہ جب کبھی جنوب کی خوشگوار ہوائیں شوخیاں کرتی آتیں تو اس پر خاموشی چھا جاتی اور اس کے دل و دماغ میں نیرس مدھر دُنیا ابھر آتی اور اسے بھولے بسرے دنوں کی یاد آ جاتی اور اس کا دل رہ رہ کے درد کی ٹیسیں محسوس کرنے لگتا۔

اب کنج لتا کو پھول کمار میں ایک عجیب تبدیلی محسوس ہوئی، یہ تبدیلی اُس دن سے دکھائی دینے لگی تھی جس دن سے کنچن مالا وہاں آئی تھی، وہ دیکھتی کہ پھول کمار کبھی کبھی ایک دم سے کسی خیال میں کھو جاتا ہے، جب وہ اس سے وجہ پوچھتی تو وہ کہہ دیا کرتا اسے کچھ بھی تو نہیں،

کنج لتا نے پھول کمار سے پوچھا وہ لکڑہاروں کے ہاں کیسے پہونچا تھا، وہاں اس کے دن کیسے گزرتے تھے، پھول کمار نے اسے اپنی کہانی سنائی، مگر وہ اسے سب باتیں نہ بتا سکا، جب کنچن مالا کی بات نکلی تو اس کا دل درد سے بیتاب ہو گیا، اس نے درد بھری آواز میں بتایا کہ کنچن نے اسکی بیدائشی اندھی آنکھوں میں کس طرح دیئے جلائے تھے، وہ اس کی جان سے بھی پیاری ساتھی تھی، ذرا دیر کے لئے بھی وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے تھے، کنچن نے اسے بہت دنوں سے نہیں دیکھا، اس کی جدائی میں نہ جانے اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہو گی، اس کی محبت کا خیال کر کے اُس کا دل بیٹھا جاتا ہے، اس کے گُن اور مُکھ کی خوبصورتی کا ذکر کرتے کرتے وہ یکبارگی بیخود سا ہو گیا تھا، کنج لتا جو جو پوچھتی گئی وہ بے خودی میں بتاتا گیا، کنج لتا سُن سُن کر حیران ہو گئی، جو تصویر اس نے کھینچی تھی وہ ہو بہو اسکی داسی سے ملتی تھی،

گرمی کے دن تھے، کنج لتا دیکھتی رہتی کہ کنچن پنکھا جھل رہی ہے اور پھول کمار سو رہا ہے، کنچن کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہ ہوتا تو پھول کمار کی سیری نہ ہوتی، کنچن مالا سوتی ہوتی تو پھول کمار پنکھا جھلا کرتا، کنچن ذرا دیر کیلئے بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی تو وہ بیقرار ہو جاتا، کنچن مالا سے کوئی بات کہنے کو کہا جاتا تو وہ اس سے کوئی بات نہ کرتا، اس کی زندگی کے بارے میں بھی کچھ پوچھنے نہیں دیتا، شاید ہی کبھی کنج لتا کے دل میں ایسی بے قراریاں پیدا ہوئی ہوں گی، کنج لتا یہ سوچتی، یہ میں نے کیا کیا، میں خود ہی گھڑیال کو اپنے گھر لے آئی،

ایک دن پھول کمار شکار کھیلنے گیا ہوا تھا، کنج لتا نے کیا کیا کہ کنچن مالا کو بڑی محبت اور پیار سے اپنے بچھونے پر بٹھایا اور اس کی زندگی کا حال پوچھنے لگی، اس سے پہلے کنچن نے بڑی بڑی مصیبتوں میں بھی دانشمندی کا ثبوت دیا تھا لیکن محبت اور پیار کے ملنے سے جھوٹے تے اس کا دل، قبو اسا دیا تھا اور اس نے اپنی سب داستان سے لے کر ۔۔۔ ل اس ۔۔۔ ساتھ دن گذارنے اور پھر اس کے گم ہونے کے بعد اس کی تلاش میں پھرنے کی روئداد ایک ایک کر کے سنا ڈالی،

اب کنج لتا کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ کنچن مالا اسکی سوت ہے، جو ہمدردی اس کے دل میں اس کے لئے پیدا ہو گئی تھی وہ اب زہریلے حسد میں بدل گئی، وہ تنتناتی ہوئی اُٹھی اور فوراً ماں باپ کے پاس جا کر بولی کنچن میری سوت ہے، اُسے ابھی گھر سے نکال دیا جائے، مگر وہ یوں کیسے نکالی جا سکتی تھی، پھول کمار شکار سے واپس آکر اگر اسے نہ دیکھے گا تو نہ معلوم کیا فیل مچانا شروع کر دے، ماں بیٹی نے مشورہ کر دو ڈھائی اور بیٹے کیا کہ کنچن مالا کو ڈائن مشہور کر دیا جائے، اس سے پھول کمار کے دل میں اس کی طرف سے شک پیدا ہو جائے گا اور وہ اسے گھر سے نکالے جانے پر کچھ نہ کہے گا،

پھول کمار جب شکار سے واپس آیا تو سب سے پہلے جو بات اس نے سنی وہ یہ تھی کہ اصطبل کا سب سے اچھا گھوڑا مر گیا ہے اور اس کا گوشت اور ہڈیاں کنچن مالا کی کوٹھڑی میں پائی گئی ہیں، دو دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ سنا گیا کہ ان کا سب سے اصلی ہاتھی کہیں دکھائی نہیں دیتا، اس کا گوشت اور ہڈیاں بھی کنچن مالا کی کوٹھڑی میں پائی گئیں، ملک کے تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کنچن مالا ڈائن ہے اور وہ خوف کے مارے گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے، سارا شہر اُجڑنے لگا، سب کو یہ ڈر ہو گیا تھا نہ جانے کب ڈائن ان کو اور ان کے بچوں کو ہڑپ کر جائے، اب کیا تھا کنج لتا اور اس کی ماں نے پھول کمار کو یقین دلا دیا کہ کنچن ڈائن ہے، اسے نکال باہر کیا گیا، کنچن کو پھر بن باس اختیار کرنا پڑا،

قسمت کا لکھا کوئی کیا کر سکتا تھا،

چین اور سکھ گھڑی بھر میں یونہی دُکھ میں بدل جاتے ہیں، انسان کی زندگی سکھ دکھ میں پروان چڑھتی ہے، کنول کے پتے پر جیسے پانی کا قطرہ تھرتھراتا ہے، سکھ دکھ میں انسانی زندگی بھی اسی طرح ڈگمگ کرتی رہتی ہے، کبھی سکھ ہے کبھی دکھ، آج جو راجہ ہے وہ کل بھکاری بن جاتا ہے، آج جو خوش ہے کل اس کی خوشی نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے، دُنیا میں دکھ ہی سچ ہے اور سکھ محض وہم و خیال،

کنچن مالا روتی آنسو بہاتی جنگلوں اور پہاڑوں میں ماری ماری

بھرنے لگی، لکڑہاروں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا، اب وہ کس کے سامنے اپنا دکھ بیان کرتی؟ وہ اپنے دکھ درد کو اپنے دل میں چھپائے جنگل جنگل پھرتی رہی۔ اس کا دل بہت گھبراتا تھا، پیڑ بھی جواب دیتے جاتے تھے، راستہ لمبا تھا، اکیلے تاریک راستہ کا سفر کہاں ہوتا ہے۔ اسے کون بتا سکتا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل جھڑی لگی ہوئی تھی۔

ایسا کی اسے مصیبت میں کام آنے والے اپنے سادھو کی یاد آگئی، وہ کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ اسے وہی پرانا پیپل کا پیڑ دکھائی دیا، وہ درخت کے قریب پہنچا تو اسے خوب احتیاط لگی، جب وہ اس کی پرکشش دیکھ رہی تھی تو سادھو درخت کے کھول سے باہر نکل آیا، کنجن نے اپنا تمام کرتا سنا دیا۔ اب وہ سب کہہ چکا تو بولا تم سات دن اسی کھول میں رہو، جو گھر میں موجود ہے وہ کھاؤ پیو، میں سات روز بعد پھر تم سے ملوں گا۔

کنجن وہاں رہنے لگی، وہ رات کو روزانہ سنا کرتی کہ کوئی درخت کو کاٹ رہا ہے، یہ آوازیں سن کر وہ سوچتی مصیبت میں سہارا دینے والے درختوں کو بھی کیا لوگ کاٹ ڈالیں گے۔ بےکس زندگی دکھ جھیلتی رہتی ہے کیا ان کا صرف دکھ ہی ساتھی ہوتا ہے، آخر اس سے ایک دن صبر نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگی، باہر جو دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ گل سے سانپ، اژدہے، شیر، بھالو سب سونے کی کلہاڑیاں لیکر جنگل کاٹ رہے ہیں اور دوسری طرف بڑے بڑے کمرے، دالان کھڑے ہوتے جاتے ہیں، دیکھتے دیکھتے ایک بڑا شہر بن گیا، وہاں جتنے بھی گھر تھے وہ سب راج محل کی طرح سجے ہوئے تھے۔

جب سات دن گذر گئے تو سادھو آیا اور کنجن سے بولا بیٹی آج سے تمہارا سارا دکھ درد دور ہوگیا، یہ راج تمہارا ہے، یہاں کالا لشکر تمہارا فرمانبردار رہے گا، تم اس محل میں رہو، کھاؤ پیو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔

اس کے بعد کیا ہوا کہ سادھو نے چاروں طرف ڈگی پٹوا دی کہ نئے راج کی چاند جیسی راجکماری اپنی مرضی سے اپنا بیاہ کرے گی، وہ ایک کہانی کا آدھا حصہ بیان کرے گی جو کوئی کہانی کا باقی آدھا حصہ پورا سنا دے گا راجکماری کنجن مالا اسی کے ساتھ بیاہ کرے گی۔

اس اعلان کے سنتے ہی آس پاس کے بہت سے راجکمار اس شہر کی طرف دوڑ پڑے اب انہوں نے راجکماری کنجن مالا کی خوبصورتی دیکھی تو وہ حیران رہ گئے مگر راجکماری کی کہانی کا باقی آدھا حصہ کوئی بھی پورا نہ کر سکا، اور سب کے سب مایوس لوٹ گئے۔

ایک دن کیا ہوا کہ ایک فقیر راستہ چلتے چلتے کنجن مالا کے راج محل میں گھس آیا اور پاس جا کر بولا، راجکماری میں کوئی فقیر نہیں ہوں تم سے باتیں کرنے کا موقع حاصل کرنے کیلئے میں نے یہ بھیس بنا لیا ہے مجھے یہ نہیں معلوم کہ تم غریبوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہو یا نہیں جو کچھ بھی ہو تم اپنی آدھی کہانی سنا کر مجھے سناؤ، اگر میں بقیہ آدھی کہانی پوری کردوں تو کیا تم مجھ سے بیاہ کرلو گی کہ نہیں کنجن مالا نے جواب دیا جو شرط لگائی گئی ہے اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔

پھر کنجن مالا نے اپنی زندگی کی کہانی، اپنی پیدائش کا بیان، ادھے سوامی سے بیاہ، پھول کمار کا قصہ اس کا لکڑہارے کے ہاں سے غائب ہونا، اپنے جنگل میں مارے مارے پھرنے کے بعد گنج لتا کے گھر میں اس کا ملنا اور وہاں سے ڈائن قرار پاکر گھر سے نکال دیا جانا سب بیان کیا اور پھر کہا اس کے بعد کیا ہوا وہ نہیں جانتی، اس کے بعد کی کہانی اسے بتانا ہوگی جو بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

فقیر نے بتایا جب کنجن مالا کو ڈائن بتا کر گھر سے نکال دیا گیا تو پھول کمار کا سارا چین کا مارا آرام جاتا رہا اور غم دکھ سے تڑپنے لگا، اور اس کی جدائی میں آنسو بہاتے بہاتے اندھا ہوگیا، اب وہ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے بس اس کی تلاش میں سرگرداں پھرا کرتا ہے اور دکھ کر کانٹا ہوگیا ہے اور آج فقیر بنا ہوا ہے۔

کنجن مالا فوراً فقیر کو پہچان گئی، اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگی، ہائے یہ فقیر میرا پھول کمار ہے اس کی یہ حالت ہوگئی، اسی کے فراق میں وہ پھر اندھا ہوگیا، اس کے سینہ میں سکھ دکھ، رنج و خوشی اور تکلیف کا سیلاب امڈ آیا، وہ پھول کمار سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی، اب یہ دیکھ کر بات کا تھا اسکو اپنی جان و دل کا مالک، اس کا پھول کمار تو مل گیا تھا اس کے باوجود اس کا دکھ ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ پھول کمار کی دونوں آنکھیں پھر جاتی رہی تھیں۔

روتے روتے اسے پھر سادھو یاد آگیا، وہ اس کے پاس

دوڑ گئی مگر اس بار سادھو کو بہت ناگوار گزرا اور غصے سے بولا تم مجھے بار بار کاہے کو پریشان کرتی ہو! کچن بولی پربھو تم ہی نے تو مجھے یہ اختیار دیا ہے، سادھو کا غصہ دھیما پڑ گیا اور اس نے پوچھا اب تم کیا چاہتی ہو کچن بولی پربھو میرے سوامی کی دونوں آنکھیں پھر اچھی کر دو اس کے لئے میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوں، اگر یہ نہیں کر سکتے تو میری آنکھوں کی روشنی بھی لے لو، مجھ سے ان کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، جسے اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیل کر پایا ہو اس کی یہ تکلیف کیسے برداشت کی جا سکتی ہے، میرے پربھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں پیروں پڑتی ہوں کسی طرح میرے سوامی کی آنکھیں اچھی کر دو،

سادھو بولا یہ تو بڑا ہی مشکل کام ہے، یہ ممکن ہی نہیں اگر تم ممکن ہی بنانا چاہتی ہو تو تم کو ایسی قربانی دینی ہوگی جو دنیا میں کوئی دے ہی نہیں سکتا، بولو، تیار ہو؟ وہ بولی اپنے پھول کمار کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینی میرے لئے معمولی سی بات ہوگی میں ہنسی خوشی پھول جان کر سب سہہ لوں گی، جو بھی تم چاہو گے وہ میں بڑی خوشی کے ساتھ کروں گی، سادھو نے کہا اچھی طرح سوچ سمجھ لو، پھر کوئی عہد کرو، کچن نے کہا میں کچھ سننا نہیں چاہتی تم جس طرح بھی ہو میرے سوامی کی آنکھیں اچھی کر دو، سادھو بولا تو پھر سنو، میں ایک پھل دیتا ہوں، مگر یہ پھل تم اپنے ہاتھ سے اپنے سوامی کو نہیں کھلا سکتیں، اسے کنج لتا کو کھلانا ہوگا، پھل کھاتے ہی تمہارے پھول کمار کی آنکھیں لوٹ آئیں گی، اس کی آنکھیں اچھے ہوتے ہی تم کو اپنا راج پاٹ، دھن، دولت محل اور اپنا سوامی کنج لتا کے حوالہ کر کے باہر نکل جانا ہوگا اور ہاں یہ سب چھوڑتے وقت تمہاری آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ آنا چاہیئے، ذرا سی آہ نہ نکلنا چاہیئے دل میں دکھ کا گزر بھی نہ ہونا چاہیئے، اگر تم کو ذرا سا بھی دکھ محسوس ہوا تو پھر تمہارے سوامی کی آنکھیں کبھی بھی روشن نہ ہوں گی، تمام رنج و غم تمام دکھ اور تکلیفیں ہنسی خوشی برداشت کر کے اپنے سوامی کو کنج لتا کے حوالہ کر دینا اور گھر سے باہر نکل جانا، یہ باتیں سن کر کچن مالا کا دل پاش پاش ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں لگ گئے، سادھو نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کہا تم تو سنتے ہی رونے لگیں، پھر اپنے پیارے کو کیسے چھوڑ سکو گی، کچن نے اپنے دل کو سنبھالا اور اپنے دل کو پتھر کی طرح سخت بنا لیا، پھر اس کے ہونٹوں پر نرم نرم ہنسی نمودار ہوئی کتنی شیریں کتنی خوبصورت کتنی پر ترنم، وہ ہنسی،

اب کچن مالا نے سادھو سے کہا کنج لتا کو بلا کر لے آؤ اور اسے پھل دے کر پھول کمار کو کھلا دو، جب اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی تو میں اپنے ہاتھ سے اپنا سب کچھ اپنی جان سے پیارے پھول کمار کو اس کے حوالہ کر کے باہر نکل جاؤں گی،

سادھو اپنے درخت کے کھول سے کنج لتا کو باہر نکال لایا اور اسے پھل دے دیا، کنج لتا نے وہ پھل پھول کمار کے منہ میں رکھ دیا، پھل کا منہ میں رکھنا تھا کہ پھول کمار کی آنکھیں روشن ہو گئیں، اس کا چہرا نکھر کر شاداب ہو گیا اور وہ پھر پھول کمار ہی ہو گیا،

کچن مالا نے جب یہ تبدیلی دیکھی تو اس کی عجیب طرح کے سکون سے چمک اٹھا اور ان سے آسمانی روشنیاں پھوٹنے لگیں،

پھر کچن نے کنج لتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا بہن اب یہ سب تمہارا ہے، پھول کمار کو بھی تمہارے سپرد کیا، تم اس کی جی جان سے خدمت کرتی رہنا، تم اور وہ ہمیشہ آرام و چین اور ہنسی خوشی زندگی گذارتے رہنا،

سادھو غائب ہو گیا،

اور کچن مالا؟ وہ خوش خوش ہنستی مسکراتی راستے پر چل کھڑی ہوئی، اندھیرا راستہ تھا، اندھیرے راستے ہی اس کی منزل تھی کون بتا سکتا ہے کہ وہ راستہ کہاں ختم ہوتا ہے؟

(بنگلہ سے پاک عائشہ ترک کے قلم سے)

سعد منیر

مالنچ مالا

ایک راجہ تھا۔ اُس راجہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ راجہ بہت اُداس رہا کرتا تھا۔ ایک دن اس راجہ نے کہا کہ دیس میں جتنے بھی سادھو، جوتشی اسی اور پنڈت تھے ان سب کو جمع کیا اور اولاد ہونے کے لیے پوجا پاٹ کرائی اور چڑھاوے چڑھائے۔ جب یہ سب ہو چکا تو غیب سے ایک آواز سنائی دی کہ راجہ تین دن اور تین راتیں برت رکھیں، چوتھے دن صبح ہوتے ہی باغ میں جائیں وہاں ایک آم کے پیڑ پر سنہرے پکے پکے آم ایک ٹہنی سے لٹک رہے ہوں گے انہی آموں میں سے ایک سے راجہ اپنا برت کھولیں۔ بایاں آم تو رانی کھائیں اور داہنا آم راجہ کھائیں۔

راجہ نے یہ سُن کر راج محل کے چاروں جانب چکر لگایا اور راج سبھا کے تمام آدمیوں کو رخصت کر دیا اور رنگ محل کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہے۔ تین دن اور تین رات نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

چوتھے دن تڑکے ہی تڑکے راج محل کا چہیتا گھوڑا سجا سجایا دروازے پر تیار کھڑا ہو گیا۔ راجہ نے اشنان کیا اور جاکر مندر کے سامنے دیوتاؤں کو سجدہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر باغ کی طرف چل دیے۔ اور دیوتاؤں کا نام جپتے جپتے پلک جھپکتے میں باغ میں آم کے پیڑ کے پاس جا پہنچے۔ اس پیڑ میں تین برسوں سے آم نہیں آتے تھے، وہاں پہنچ کر راجہ کیا دیکھتے ہیں کہ دو پکے سونے کی طرح چمکتے آم ایک ٹہنی میں لٹک رہے ہیں۔ راجہ کو پہلے یقین ہی نہ آیا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں زور زور سے ملیں اور پھر غور سے دیکھا۔ جب یقین آ گیا کہ ان کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں، تو انہوں نے دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے کی منت مانی۔

سونے کے رنگ کے آم نرم نازک پتوں کے نیچے ایک ٹہنی سے لٹک رہے تھے۔ راجہ نے کمان سنبھالی اور آم کی ٹہنی پر تیر مارا، مگر آم نہیں گرے۔ راجہ نے لکڑی سے توڑنے کی کوشش کی، پھر بھی آم نہیں ٹوٹے۔ اب جو بھی کوشش کر سکتا ہو توڑے، مگر آم ٹہنی سے الگ نہ ہونے پائیں۔

راجہ کے وزیر، امیر، درباری، باری باری سے اُٹھے اور ایک ایک کر کے آم توڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تیر مارتے تو تیر آم کی طرف جاتا ہی نہ تھا، لکڑی سے توڑتے تو لکڑی ٹوٹ جاتی۔ جب اس طرح آم نہ ٹوٹے تو وزیروں نے چاہا کہ درخت پر چڑھ کر آم توڑیں۔ جب انہوں نے درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تو وہ پھسل پھسل کر گر پڑے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا، کسی کا پیر ٹوٹا۔ آخر سب کے سب ہاتھ پیر تڑا کر گردنیں جھکا کر بیٹھ گئے۔

راجہ نے یہ دیکھا تو گلے کا ہار توڑا اور سر کا تاج پھینک پھانک خود درخت پر چڑھنے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ کوتوال سامنے آ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "مہاراج آپ کی جے ہو۔ گنواروں کے گن گنوار ہی پرکھ سکتے ہیں، اگر مہاراج کا حکم ہو تو یہ غلام بھی ایک بار کوشش کر دیکھے" جتنے آدمی وہاں جمع تھے وہ سب کوتوال کی یہ بات سن کر بہت بہت کرنے لگے "ہاتھی گھوڑے تو بہہ گئے، گدھا پوچھے کتنا پانی"۔

راجہ نے کہا "یہی بات ہے۔ لیکن کوتوال یاد رکھو اگر تم سے آم ٹوٹ گئے تو دوشالہ ملے گا، اور اگر نہیں ٹوٹے تو سر اُڑا دیا جائے گا"

کوتوال نے بھی اطمینان سے کہہ دیا "مانتے تو ہاتھی، تو ٹوٹے تو راجہ کا خزانہ اس سے کم ہرگز نہیں"۔ اتنا کہنے کے بعد کوتوال نے ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھایا کوئی منتر پڑھا اور ڈھیلا آموں کی طرف مار دیا۔ ڈھیلا ان سے آموں کی ٹہنی پر جا لگا، اور ٹہنی آموں سمیت زمین پر گر پڑی، کوتوال نے وہ اٹھا کر راجہ کے سامنے بڑھا دی۔ جتنے لوگوں نے یہ تماشا دیکھا ان سب کے سر شرم سے جھک گئے۔

آموں کے ٹوٹتے ہی راج محل میں نقارے بجنے لگے، اصطبل میں گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر ناچنے لگے، رانی اپنے کمرے میں اٹھ بیٹھیں۔ راجہ نے اپنا دوشالہ کوتوال

کو سمجھا دیا، اور آم لے گجراج پر سوار ہو کر محل کی طرف روانہ ہوگئے۔

اب کیا ہوا کہ چلتے چلتے راستے میں ٹہنی ٹوٹ گئی، گجراج بدک کر دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا، دونوں آم اُچھل گئے، کونسا آم داہنی طرف تھا کونسا بائیں طرف تھا، یہ کوئی بھی پہچان نہیں سکا، اور کھاتے وقت راجہ نے بائیں طرف کا آم کھایا اور رانی نے داہنی طرف والا آم کھایا۔

ہوتے ہوتے کئی مہینے کٹ گئے رانی اُمید سے ہوئیں، راجہ کے دل کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ رہا، انہوں نے دربار میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور گلے سے ہار اتار کر ہیرے جواہرات درباریوں میں بانٹ دیئے اور خزانے کے دروازے سب کے لئے کھول دیئے۔

دیکھتے دیکھتے دس مہینے گذر گئے، راجہ نے نقارچیوں کے شہر سے نقارچی طلب کئے، ڈھولکیوں کے شہر سے ڈھولکئے بلائے اور دس دن پہلے ہی نقاروں ڈھولکوں، شہنائیوں، نفیریوں اور جھانجھوں کی آوازوں سے شہر گونجنے لگا، اتنا دھوم دھڑکا تھا، اتنی چہل پہل تھی کہ چڑیوں اور پرندوں کو زمین پر اُترنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی

ہمت ہی نہ ہوتی تھی ——— دسویں دن رات کو راجہ کے محل میں ایک بیٹا ہوا، اتنا خوبصورت، اتنا پیارا کہ چودہویں کا چاند بھی اس کے آگے گرد تھا، زچہ خانہ کو راجہ کا بیٹا جگمگاتا رہا، اس کے مکھڑے سے جوت پھوٹتی رہی۔

راجہ کی راجدھانی میں خوشیوں کی دھوم مچی ہوئی تھی، راجہ نے خوشی میں دیوتاؤں پر چڑھاوے چڑھائے، خلقت کو خوب خوب کھانے کھلائے چرند پرند کو کھلا پلا کر نہال کیا، سڑکیں بنوائیں، ہاٹ بازاریں قائم کیں، کنوئیں تالاب کھدوائے، ملک کے گوشے گوشے میں راجہ کی جے پکاری جانے لگی۔

ایک ایک کرکے دن گذرتے رہے اور چھٹی کا دن آ گیا، راجہ نے صحن میں سونے کی جھالروں والے شامیانے لگوائے، تین تین قطاروں میں گھی کے چراغ روشن کئے گئے، ایک سو ایک گانے بجانے والے زور شور سے گانے بجانے میں مصروف ہوگئے، چاروں طرف آگ کے گنڈ جلا دیئے گئے، پیادے، سپاہی، ہاتھ ہتھیار سجے رات بھر راجہ کے حکم سے پہرا دیتے رہے، زچہ خانے کی طرف جانے والے راستے پر پھول بکھرائے گئے، سیندور چھڑکا گیا، اور راستے کے ادھر اُدھر جھنڈیوں کے ہار ٹانگ دیئے گئے، اسی راستے سے دھارا، تارا اور بدھاتا بچے کی پیشانی پر قسمت کا لکھا لکھنے جائیں گے۔

پہریدار پہرا دیتے رہے، وقفہ وقفہ سے نقارے بجتے رہے، دائی کھلائی اور دالن زچہ خانے کی چوکھٹ پر آڑی آڑی لیٹی شہزادہ اور شہزادیوں کی کہانیاں اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی رہیں، کہانیاں سنتے سنتے دائی کو نیند آ گئی، کہانیاں کہتے کہتے ان کی پلک جھپک گئی۔

آدھی رات کا گجر بجا پہریدار اونگھ گئے تھے، یہی وقت تھا کہ دھارا، تارا قسمت کے دیوتا ہاتھوں میں قلموں کا بنڈل دبائے، پھولوں سے آراستہ، چندن سے مہکتی، سیندور سے جھلکتی راہ پر چل کر زچہ خانے کی چوکھٹ پر پہنچ گئے، وہ زچہ خانے میں داخل ہی ہونے والے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ بیچ میں کوئی آڑا آڑا لیٹا ہے، ان کے پیر اٹھ چکے تھے، وہ انہوں نے جلدی سے پیچھے کر لئے، انہوں نے ایک ساتھ سیٹی بجائی، مگر جو لیٹا تھا وہ نہ ہٹا، وقت گذرا جا رہا تھا، اب وہ بڑی مشکل میں پڑے، آخر انہوں نے تین ستاروں کو گواہ بنایا اور جو لیٹا تھا اسے چھلانگ کر زچہ خانے کے اندر چلے گئے۔

زچہ خانے کے اندر چلے گئے، سب سے پہلے دھارا نے قلم اٹھایا علم، عقل، دھن دولت، اور خدمتگاروں کی تعداد کی لکیریں اور جو کچھ اچھے بھاگ میں ہو سکتا تھا ان سب کی لکیریں کھینچ دیں، پھر بچہ کی ہتھیلی میں پرچم اور کنول بنا کر ایک بہترین زائچہ کھینچے اور شمار کرتے رہے، اور جتنے وہ قلم لائے تھے وہ سب ختم ہوگئے۔

جب ان کے قلم ختم ہوگئے تو تارا نے اپنا قلم اٹھایا، قلم اٹھا کر جیسے ہی انہوں نے راجکمار کے ماتھے سے اسے لگایا ویسے ہی اسے پھینک دیا اور کھڑے ہوگئے، ان کا کھڑا ہونا تھا کہ دھارا نے پوچھا کیا دیکھا؟ تارا نے منہ پھیر کر کہا دیکھنا کیا؟ آؤ چلیں، راجکمار کی عمر صرف بارہ دن کی ہے، دھارا نے کہا صرف بارہ دن کی، لاؤ ذرا میں دیکھوں، اتنا کہہ کر دھارا نے قلم لیا اور حساب لگانے لگے جتنی بار انہوں نے حساب لگایا اتنی بار بارہ اور صرف بارہ ہی کا عدد نکلا، انہوں نے بارہ کے اوپر ایک صفر بڑھا دیا، مگر صفر تو صفر ہی ہوتا ہے وہ مٹ مٹ گیا۔

اب تو دھارا نے قلم دے پٹخ دیا، اگر دیوتا رونے اور واویلا کرنے لگتے تو سارا سنسار ہی رو رو کر جان دے دیتا، اس لئے انہوں نے اپنے اُمڈتے ہوئے آنسو دامن میں چھپا لئے اور واپس جانے لگے، باہر جانے لگے تو مائن چوکھٹ پر آڑی آڑی لیٹی ہوئی تھی، دونوں نے تین ستاروں کو گواہ بنایا اور اس کے اوپر سے

پھلانگنے لگے، دھار تو پھلانگ گئے تارا پھلانگنے لگے تو ان کا پیر مالن سے چھو گیا، مالن کی آنکھ کھل گئی، اس نے پیر پکڑ لیا، اور پوچھا بتاؤ تم کون ہو؟ دیوتا ہو؟ آدمی ہو؟ سایہ ہو کر چور ہو؟ کیا ہو بتاؤ؟ یہاں راجہ کا بیٹا سو رہا ہے میں مالن یہاں پہرہ دے رہی ہوں، یہاں تو جم بھی نہیں آسکتا، تارا نے کہا میں قسمت کا دیوتا ہوں، میرا پیر چھوڑ دے، مالن نے کہا تم قسمت کے دیوتا ہو تو بتاتے جاؤ، تم نے راجہ کے بیٹے کی قسمت میں کیا لکھا، دیوتا مصیبت میں پڑ گئے۔ انہوں نے کہا مالن! یہ تیرے سننے کی بات نہیں ہے، تو میرا پیر چھوڑ دے، مالن نے پیر تو چھوڑا نہیں، اُلٹے اور اپنے آنچل سے کس لیا، بدھاتا کی آنکھوں میں جو آنسو اب تک رکا ہوا تھا وہ مالن کے اوپر گر گیا اور انہوں نے کہا — کیا بتاؤں مالن! راجہ کے بیٹے کی عمر صرف بارہ دن کی ہے۔

صرف بارہ دن کی، مالن دہاڑیں مار کر رونے لگی، نقارے ایک دم سے پھٹ گئے، باجا گاجا ایک دم سے بند ہو گیا، پہرہ دار کے نیزے کی نوک خود اس کے سینہ میں چبھ گئی، رانی چونک کر اُٹھ بیٹھیں، کیا ہوا؟ خود راجہ باہر نکل کر پوچھنے لگے کیا ہوا؟ وزیر، درباری، سارا شہر امڈ کر سمیٹ آیا اور پوچھنے لگا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

مالن پتھر پر سر پٹکتی، چیخی مہاراج آپ نے کتنے نذرانے چڑھائے کتنی قربانیاں دیں، اس کے بعد یہ چاند آپ کے محل میں جگمگایا لیکن یہ چاند پورے پندرہ دن بھی نہ چمک پائے گا، بارہ دن بعد اماوس آجائے گی، ہے بھگوان یہ کیسا انصاف ہے؟

راجہ، وزیر، درباری غم سے بیہوش ہو گئے، رانی کی یہ حالت تھی نہ مرے میں نہ جئے میں۔

فیل خانے کے ہاتھی زنجیر تڑا کر نکل بھاگے، اصطبل کے گھوڑے نے بھی گھاس دانہ پانی چھوڑ دیا، راجہ کے رشتہ دار اور شہر کے برہمن لرزتے کانپتے آم کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے، دھارا، تارا دوسرے دیوتاؤں کے پاس گئے اور بولے سورگ کے دیوتاؤ! یہ کیا انصاف ہے، اتنے نذرانوں منتوں کا لڑکا اور وہ صرف بارہ دن زندہ رہے، راجہ کا دیس تباہی کے کنارے کھڑا ہے، تمام زمین آنسوؤں میں ڈوبی جا رہی ہے، دیوتاؤں نے کہا ایسی بات ہے، ایک بوڑھے دیوتا نے برہمن کا روپ دھارا اور آم کے درخت

کے نیچے جا پہنچے، برہمن کے جسم سے روشنی پھوٹ رہی تھی، اسے دیکھتے ہی سارا مجمع اس کی طرف دوڑ پڑا، آپ کے بدن سے سونے کی جوت نکل رہی ہے آپ کون ہیں مہاراج! آپ جوتشی ہوں، زچہ خانہ میں راج کمار صرف بارہ دن جیئے گا، آپ اس کی قسمت بدل دیجئے، اسے بچا لیجئے، برہمن بولا، راہو تو چاند سورج تک کو نگل جاتا ہے، پھر آدمی کی قسمت کا لکھا کیسے مٹ سکتا ہے؟ پھر بھی چلو زائچہ کر دیکھیں۔

راجہ، وزیر، درباری جتنے لوگ تھے وہ برہمن کو زچہ خانہ میں لے گئے، برہمن نے راجکمار کا منہ دیکھا، ہاتھ دیکھے، ماتھے کی لکیریں دیکھیں، جب اچھی طرح دیکھ بھال لیا تو بولے، مہاراج اس سات دن کے لڑکے کی عمر اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب آپ اس کی شادی ایسی لڑکی سے کر دیں جو آج ہی بارہ برس کی ہوئی ہو، اتنا کہنے کے بعد برہمن نے جانے کی اجازت مانگی، راجہ نے اپنے خزانے کے تمام ہیرے جواہر برہمن کے پیروں پر رکھ دیئے، مگر دیوتا دھن دولت لے کر کیا کرتے، انہوں نے صرف ایک چمکیلا ہیرا اٹھا لیا اور جاتے وقت اسے کوتوال کے گھر پھینک کر چلے گئے۔

رات ختم ہوگئی، نور کا تڑکا ہو گیا، باغ میں پھول کھل اٹھے چڑیاں چہچہانے لگیں، سارے شہر میں ہلچل مچ گئی، ملک بھر میں ہرکارے بھیجے گئے، بارہ برس کی راجکماری چاہئے، مگر جہاں جہاں ہرکارے بھیجے گئے تھے وہ وہاں سے واپس آگئے، بارہ برس کی راجکماری کہیں بھی نہیں ملی، سب لوگ مایوس ہو کر پھر آم کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔

سب لوگ دھرنا دئے بیٹھے رہے، تالاب کے دوسرے کنارے پر ٹھیک آم کے درخت کے سامنے کوتوال کی لڑکی مادھو مالا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی، آج وہ پورے بارہ سال کی ہوگئی تھی، اسے وہ ہیرا جو دیوتا جاتے وقت پھینک گئے تھے اپنی جھونپڑی کے احاطہ میں کیچڑ میں پڑا ملا تھا، وہ اسی کو دھونے کے لئے نیچے اتر رہی تھی، اس کی کمر سے چھوٹی سی کلسی لٹکی ہوئی تھی، سیڑھیوں سے اترتے وقت اس کے پیروں کے گھنگرو چھم چھم بج رہے تھے سب ہی تعجب کرنے لگے، یہ کون ہے؟ جس کے گھنگروؤں سے میٹھے راگ نکل رہے ہیں، یہ کوئی دیوی ہے یا کوئی کنواری ہے؟ ایک تارے بجانے والے نے ہاتھ روک کر کہا شاید شہد کی مکھیاں چھتے کے ارد گرد بھنبھنا رہی ہیں، دوسرا بولا معلوم ہوتا ہے تالاب میں راج ہنسوں کا غول اٹھکھیلیاں

کر رہا ہے؟ نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟ رشتہ داروں، درباریوں اور وزیروں نے تالاب کے پاس آ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بارہ برس کی لڑکی سیڑھیوں سے اتر رہی ہے اور اسی کے گھنگھرو بج رہے ہیں۔

سب کے منہ سے نکلا ارے یہ تو لڑکی ہے لڑکی، کیس کی لڑکی ہے؟ کسی نے بتایا کہ یہ کوتوال کی لڑکی ہے۔ راجہ حیرت میں ڈوب گئے، اس کے گھنگھرو میں شہد کی مکھیوں کی آواز گونج رہی تھی، جہاں وہ قدم رکھتی تھی وہاں پھول کھل اٹھتے تھے، اس کی باہوں میں راج ہنسوں کی گردنوں کی لچک تھی، سیاہ بالوں میں سمندر کی لہریں لہرا رہی تھیں، صورت چاند ہو رہی تھی، وہ سونے کی مورتی ہی لگ رہی تھی، مگر تھی تو وہ کوتوال کی لڑکی، راجہ گہری فکر میں ڈوب گئے، رانی کے پاس آدمی بھیجا گیا، رانی نے کہلا بھیجا، اگر لڑکی خوبصورت ہے تو چاہے وہ کوتوال کی لڑکی ہو یا کسی اور کی اس کے ساتھ راجکمار کا بیاہ کر دیا جائے اور کوتوال کا درجہ بڑھا دیا جائے،

راجہ سوچتے رہے، سوچتے سوچتے وہ کبھی کھڑے ہو جاتے، کبھی بیٹھ جاتے، آخر سوچتے سوچتے انہوں نے کہہ ہی دیا، اچھا تو بیاہ ہو جائے کوتوال کے پاس پیغام بھیجا جائے۔ فوراً کوتوال کے پاس پیغام بھیج دیا گیا، کوتوال نے راجہ کا دیا ہوا دوشالا اوڑھا، ہاتھ میں نیزہ لیا اور پڑوسیوں میں جا کر کہنے لگا پڑوسیو! پڑوسیو! سنو میں نے پھل توڑا تھا نا، اس لئے آج میری لڑکی راجکمار سے بیاہی جائے گی، اب تم مجھے نذرانہ دو،

کوتوال نے اپنے صحن میں چوڑے سرطک بنوائی، دروازہ تڑوا کر چوڑا کروایا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، کوتوال کی بیوی کہنے لگی ہم لوگ کوڑا کرکٹ ہیں، اور کوڑے کرکٹ میں رہتے ہیں، مگر یہاں بھی راجہ کی جھینکیں آئے جا رہی ہیں، میں کیسے اپنی لڑکی صرف بارہ دن زندہ رہنے والے بچے کے ساتھ بیاہ دوں، تم راجہ سے جا کر کہہ دو ہم بیاہ نہیں کریں گے،

کوتوال کی لڑکی مالنچ بولی، پتا جی ماتا جی جب راجہ نے حکم بھیجا ہے تو مجھے بھیج دیجئے، میں جاؤں گی، لیکن پتا جی پہلے آپ اُن سے جا کر پوچھ آیئے وہ میری شرطیں مانیں گے، کوتوال نے پوچھا کونسی شرطیں؟ مالنچ نے کہا اُن سے پوچھیئے کہ وہ دلہا کو کوتوال کے گھر آنے دیں گے یا نہیں؟ کوتوال بولا ہاں ٹھیک تو ہے، مالنچ نے کہا پتا جی ایک اور شرط ہے، کوتوال بولا وہ کیا؟ وہ یہ ہے کہ میرے سسرے راجہ اور میری ساس رانی میرے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھائینگے یا نہیں کھائیں گے؟ کوتوال نے کہا ہاں ہاں بالکل ٹھیک، تیسری شرط یہ ہے کہ بیاہ کی رات ساس سسرے رسم کے مطابق چڑھاوے دیں گے کہ نہیں دیں گے؟ کوتوال نے کہا ٹھیک بالکل ٹھیک، کوتوال تو راجہ کے پاس چلا گیا، اور مالنچ نے اپنی ماں سے کہا، ماں مجھے دلہن بنا دو، کوتوال کی بیوی، اب کیا کر سکتی تھی، اس نے سنگھاردان نکالا اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ بیٹی کو دلہن بنانے لگی۔

کوتوال راجہ کے پاس جا کر بولا مہاراج آپ راجاؤں کے راجہ ٹھہرے مگر آج بالکل میرے سمدھی بن جائیں گے، آپ میری لڑکی تو لیں گے مگر پہلے یہ تو بتایئے اپنے لڑکے کو کوتوال کے گھر جانے کی اجازت دیں گے داماد سسرے کے گھر جا سکے گا؟ راجہ نے ترچھی نگاہوں سے کوتوال کو دیکھا، اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے پہلے لڑکی بیاہ کر سسرال تو آئے پھر دیکھا جائیگا، کوتوال نے پھر پوچھا اچھا یہ تو بتایئے راجہ رانی بہو کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں گے یا نہیں کھائیں گے، راجہ نے کہا کوتوال خبردار جب لڑکی دلہن کے کمرے میں آ جائے گی تب بتاؤں گا، کوتوال نے تیسری بار پوچھا مہاراج دلہن کو جو چڑھاوے دیئے جاتے ہیں وہ سمدھی سمدھن اسے دیں گے کہ نہیں، راجہ نے کہا دیکھو کوتوال یہ سب میں اس وقت بتاؤں گا جب لڑکی محل میں آ جائے گی، کوتوال گھر واپس آ گیا، اور جو باتیں راجہ سے ہوئی تھیں وہ سب بیٹی کو بتا دیں۔

مالنچ نے دلہن بن کر ماں کے قدموں کی خاک لی، اس کے بعد باپ کے قدموں کی خاک لی، اور پھر کہا، اماں مجھے جانے کی اجازت دیجئے، ابا مجھے راجہ کے محل لے چلئے، مگر پہلے راجہ رانی سے پوچھئے اگر میرا سوامی بیاہ کی پہلی رات کو مر جائے تو کیا وہ اس کی لاش مجھے لے جانے کی اجازت دیدیں گے۔ کوتوال سے جیسا کہا گیا تھا وہ اس نے راجہ سے جا کر کہہ دیا، اسے سن کر راجہ غصے کے مارے لال بھبوکا ہو گیا اور زور سے چیخ پڑا، یہ ذلیل آدمی اتنی بڑی بڑی باتیں بنا رہا ہے، کمینے کوتوال کی گنوار لڑکی کی یہ ہمت کہ وہ بار بار شرطیں لگا کر مجھے پریشان کرے، میری بات کاٹے اور ایسی منحوس باتیں منہ سے نکالے کوئی ہے؟ کوتوال کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دو، کوتوال کی لڑکی کو سنسان راستہ سے پکڑ لائے، اور راجکمار سے بیاہ دے۔ حکم کی دیر تھی فوراً اس کے آدمی کوتوال کے ہاں دوڑ گئے اور اونچے اونچے بانسوں میں ڈولا باندھ کر کوتوال کی لڑکی کو گھسا...

بستہ سے لے آئے اور اسے بیاہ دیا۔

بیاہ کیا تھا بس دکھاوا تھا۔ نہ تیل نہ ہلدی، نہ کوئی رسم نہ ریت۔ ...ھر کے محل میں بس ایک شہنائی بجی اور بیاہ ہو گیا۔ نہ منتر پڑھے گئے نہ ... رسیدہ بچیہ اواں، اواں ... رانی آن کر دروازہ ... رنگیں، نقارچی ... ڈھول نقارے بجا کر اسے چپ کرنے لگے ... معمول تھے۔ ... تھی۔ خالی مالنچ ... سوامی کے گرد سات پھیرے لگائے اور اسے گود میں لے کر کمرہ عروسی میں لے گئی۔

مالنچ تو کمرہ میں چلی گئی اور ادھر زور شور سے پانی برسنے لگا، راجہ کے ...ل کے کنگورے گر گئے، محل میں آگ لگ گئی، دلہن کے کمرہ میں ... اور اپنی دلہن کی گود میں جان دے دی۔

راج محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، راجہ پاگل ہو گئے، رانی بے ہوش ... میں، رعیت نے رنج و غم میں دلہن کا کمرہ گھیر لیا۔ راجہ چلائے کوتوال کی لڑکی ... ہے اس کے جھونٹے پکڑ کر باہر نکال دیا جائے۔ اس کو، اس کی آنکھیں ... کر آگ میں جھونک دی جائیں۔ جتنے لوگ جمع تھے ... چیختے دھاڑتے ... کے کمرہ کا دروازہ توڑنے لگے۔ مالنچ نے کھڑکیوں اور ... سے ... میری ساس اور سسر سے پوچھ آؤ کہ مجھے جو قول دیئے گئے تھے ان کا ... ہوگا؟ کیسا قول؟ قول یہ تھا کہ وہ داماد کو میرے گھر بھیج دیں گے اب وہ ... پورا کریں گے کہ نہیں کریں گے۔

راجہ نے جو یہ سنا تو وہ غصہ میں چیخا کون ہے؟ کوتوال کو پکڑ لائے ... وہاں بھیج دیا جائے جہاں میرا بیٹا چلا گیا ہے، کوتوال لایا گیا اور اس کی ... کھچ سے اڑا دی گئی۔ مالنچ نے کہا میں نے دیکھ لیا، داسی جاؤ اور ساس سسر ... پوچھو دوسرے قول کا کیا ہوگا؟ وہ کونسا قول ہے؟ یہی کہ وہ بہو کے ہاتھ کا ... پکا کھانا کھائیں گے کہ نہیں؟ حکم دیا، داسیو! کوتوال لڑکی کے دونوں ہاتھ ... ڈالو! داسی بڑی لانبی چھری سے مالنچ کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے، اور ... خون بھل بھل بہنے لگا۔ مالنچ نے کہا داسی ... اب ... قول کا کیا ہوگا؟ وہ کونسا قول ہے؟ داسی راجہ سے کہو ... دھو دینے ... لگائے، پانچ گھی سے جلنے والے چراغ، چندن کی لکڑیاں، سونے کا چولہا، ... کے چمچے، ہیرے کا پیالہ، سونے چاندی کے پیلے، سفید سرسوں ... ہوتے تکئے، کارچوبی کام کے لحاف تو شک، بالوں میں لگانے کے کانٹے، اور ... سرمہ لگانے کی چاندی کی سلائی چڑھاوے میں چڑھائیں، پھاٹک پر پہرہ نہ ... بٹھائیں اور ... بیٹے کی بارہ برس تک کوئی خبر نہ لیں۔

راجہ نے کڑک کر کہا کوتوال کی لڑکی کی یہ جسارت! کون ہے؟ دلہن کے کمرے کا دروازہ توڑ ڈالا جائے۔ حکم سنتے دلہن کے کمرے کا دروازہ توڑ دیا گیا اور راجہ نے چڑھاوے میں ... کے بدلے ایک گدھا دیا، لکڑیوں کے بدلے لنگر پتھر دیئے، سونے کے چولہے کے بدلے چاول پھٹکنے کا سوپ دیا، موتیوں کے گچھے کے بدلے ٹوٹی ہانڈیوں اور ناریل کے چھلکوں کا ہار بنا کر مالنچ کے گلے میں ڈالا، گوبر سے بھری ہوئی ٹوکری اس کی پیٹھ سے بندھوائی اور چھری کے بدلے کلہاڑی دی، اور گھٹ سے پچھے ... نے جہیز سے منگوا کر اسے پہنوائے، پھر ایک آئینہ اس کے ہاتھ میں دے کر اور اس کو گدھے پر سوار کرا کر سارے شہر میں پھروایا اور اس کا سر منڈوا کر اس پر ... لیا گیا۔ جب یہ سب ہو گیا تو راجہ نے جلاد کو حکم دیا کہ کوتوال کی لڑکی ذات سے ... جنگل میں ... اس کی آنکھوں میں سلائی پہلے ہی پھیری جا چکی تھی، ان سے خون بہے جا رہا تھا، اس حالت میں جلاد اس کو شہر کے باہر لے جانے لگا، اسی وقت مالنچ نے کہا میری ساس سسر سے پوچھا جائے ایک اور قول جو رہ گیا ہے اس کا کیا ہوگا؟ اب کونسا قول رہ گیا ہے؟ میرے سوامی نے دلہن کے کمرے ——— میں جان دی ہے، انہوں نے قول دیا تھا کہ اس کی لاش مجھے ران دی جائے گی، اچھا اب ... چاہیئے؟ کوئی ہے چتا تیار کی جائے حکم ملتے ہی چتا تیار کی گئی، آگ کے شعلے لپ لپ کرتے بھڑک اٹھے اور مردہ راجکمار کو چتا پر رکھ کر مالنچ کے ناک کان کاٹ کر اسے آگ میں جھونک دیا گیا۔

اور پھر بارش زور شور سے رم جھم ہونے لگی، چتا کی آگ بجھ گئی، بھوت پریت بھن بھن کرتے آگے بڑھے، بیچی راج پاگل ہو گیا، اور چاروں طرف ... کرتا ندیاں جھاڑنے لگا، راجہ، وزیر، درباری جان بچا کر محل بھاگ آئے، محل کے دروازے بند کر لئے گئے۔

اور مالنچ پتی کو گود میں لئے چتا پر بیٹھی رہی اور کہتی رہی پتی! سو رہے ہیں کہ مر گئے؟ جواب ملا مر گئے ہیں، مالنچ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر کہا پتی! سو رہے ہیں کہ مر گئے؟ جواب ملا مر گئے ہیں، مالنچ نے تھوڑی دیر بعد دوبارہ پوچھا پتی! سو رہے ہیں کہ مر گئے، جواب ملا سو رہے ہیں، سو رہے ہیں ——— مالنچ کے منہ سے نکلا اور وہ مسکرائیں اور انہوں نے مردہ پتی کو سینے کے اوپر اٹھا لیا

ان کی کٹی ہوئی ناک سے خون بہتا رہا، کٹے ہوئے کانوں سے خون بہتا رہا، آنکھوں سے خون بہتا رہا۔ بھوت پریت چسکی لے لے کر خون چاٹتے رہے، اور آوازیں آتی رہیں "اری مالنچ تو بیٹھی ہوئی ہے نا؟" ہاں "پتی کو لے کر کیا کرے گی؟ پتی کا مردہ جسم دیدے نا!" "نہیں دونگی" چتا کی لکڑیوں میں دھیرے دھیرے جان آگئی، ان میں ہاتھ نکل آئے پیر نکل آئے، اور وہ چھپ چھپ، کھپ کھپ کرنے لگیں "مالنچ تم بیٹھی ہوئی ہو؟" ہاں بیٹھی ہوں! دیکھ مالنچ ہم اتنے لوگ بیٹھے ہیں، مردہ پتی ہم کو دیدے نا" "نہیں دونگی"۔

تھوڑی مدت گذر گئی، چتا کے دھوئیں میں بہت سے خونخوار دانت نکل آئے، چاروں طرف سے وحشتناک قہقہے بلند ہوئے، مالنچ تو بیٹھی ہوئی ہے نا؟ ہاں بیٹھی تو ہوں، پھر کیا؟ مردہ پتی دیدے تو میں بجھ جاؤں، نہیں میں نہیں دونگی! نہیں دے گی؟ نہیں نہیں،

ایک طرف سے ایک بڑھیا بلبلاتی نکلی — "مالنچ تو مار ڈالی جائیگی نہیں تو اپنا مردہ پتی مجھے دیدے"، دوسری طرف سے ہاؤ ماؤ کرتا ایک بڈھا نکلا اور چیخا "مالنچ تو مار ڈالی جائے گی، مردہ پتی دیدے اور جان بچالے"، ایک اور طرف سے ندی کا گھڑیال منہ پھاڑ کر بولا — "اری مالنچ یہ بچہ مجھے دیدے، ہم اس کو مزے سے لکھائیں گے" آسمان کی گھٹائیں، بجلیاں، خبیث، روحیں چلّایا سنتی بیٹھیں، مالنچ یہ تو ہم نرم نرم ہاتھوں کو منہ میں رکھیں گے"

مالنچ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں وہ پتی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی، دن گذرے، ہفتے گذرے، دیکھتے دیکھتے ندی کے کنارے بڑا بھاری جنگل پیدا ہو گیا، جم دوت کا بھائی کال دوت، اور اس کا بھائی سال دوت، دونوں کے دونوں آئے اور بولے۔ مالنچ! جم کا حکم ہے مردہ سوامی چھوڑ دے، مالنچ نے کہا تم کون ہو؟ اگر طاقت ہے تو لے لو میں دیتی ہوں، "تم کیسے لیتے ہو؟" کال دوت، سال دوت ہوا میں غائب ہو گئے۔ مالنچ جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی، دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف چاندنی کھیت ہو گئی، اور ایک نازک ہاتھ پیروں والی، چمکتے دمکتے چہرے والی خوبصورت سی لڑکی ظاہر ہوئی اور بولی — "اری مالنچ تو ہے؟ ہم جب چھوٹے چھوٹے تھے تو ہم میں ایک دوسرے کے لئے کتنا پیار تھا، ہم دونوں سہیلیاں تھے آج مجھے تو سب بھول گئی، ہائے ری یہ تو نے کیا حالت بنا رکھی ہے، تو اس سڑے گلے بچہ کو کیوں گود میں لیے بیٹھی ہے؟ اسے پھینک دے پھینک دے" مالنچ نے کہا، تم کون ہو، تم میری سکھی بنتی ہو؟ تم یہ بھی نہیں جانتیں سوامی کا غم کیسا ہوتا ہے،

لڑکی بولی "ارے مالنچ یہ تیرا پتی ہے۔ تیرے پتی کی یہ کیا حالت ہو گئی اسے میری گود میں تو دے، تو جا کر ندی سے تھوڑا سا پانی لے آ" "ندی میں پانی نہیں ہے۔ پانی نہیں ہے؟" اگر ہوتا تو یہ حالت ہوتی" "اچھا جا کر جڑی بوٹی لے آ" "جڑی بھی نہیں ہے بوٹی بھی نہیں ہے۔" "اری مالنچ آسمان کی طرف تو دیکھ، آسمان پر بادل چھا رہے ہیں، پانی کا سیلاب امنڈ رہا ہے، اٹھ، اٹھ، یہ میرے ہاتھ پھیلے ہیں اپنے پتی کو میرے ہاتھوں پر دیدے، جلدی کر"، مالنچ نے اپنے پتی کو سینے میں زور سے دبا لیا اور بولیں، دیوتاؤ! میرے گواہ رہنا، میرا پتی میری گود میں ہے، میں پوترا اور ست والی ہوں تو یہ ورغلانے والی لڑکی میرے ہاتھ لگاتے ہی جل کر بھسم ہو جائے، میں مالنچ ہوں کوئی اور نہیں ہوں، تو چڑیل ہے، دور ہو یہ ہے اے رات اگر تو نہیں گذرتی تو میں اپنے ننھے سوامی کو گود میں لئے لئے کہتی ہوں میں تاروں کو انگارے اور پھولوں کو تارے بنا دونگی، رات ڈرتی ڈرتی جلدی سے گذر گئی اور جنگل میں صبح جھانکنے لگی، مالنچ کی گود ہلی "مالنچ بچہ کو ذرا دیکھ تو"، مالنچ کو معلوم پڑا جیسے وہاں کوئی بھی نہیں ہے، اور گود میں اس کا سوامی ہاتھ پیر اچھالنے لگا ہے، اور وہ ایک لق و دق صحرا میں اکیلی بیٹھی ہیں، ان کے دل میں اپنے سوامی کو دیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی، آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں نور آ گیا، وہ دوڑ دھوپ کی ہانڈی کی تلاش کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں، جیسے ہی انہیں اس کا خیال آیا ویسے ہی ان کے ہاتھ نکل آئے، کان سننے لگے، ناک سانس لینے لگی اور سر پر ڈھیر کے ڈھیر گھونگھریالے بال لہرانے لگے، انہوں نے جو یہ سب دیکھا تو کہہ اٹھیں — "میری سکھی! تم سدا سہاگن رہو، تم کون ہو؟ میں نے تم کو برا بھلا کہا، گالیاں دیں، میری صورت دیکھ کے مجھے معاف کر دو" اب جو انہوں نے دیکھا تو کیا دیکھتی ہیں کہ سونے کا چولہا، چندن کی لکڑیاں، سفید سرسوں کا مکھن، ہیرے کا پیالا موتیوں کے چمچے ان کے قریب رکھے ہوئے ہیں، مالنچ مالا نے چندن کی لکڑیوں سے چولہا جلایا، چاندی کی پتیلی پر دودھ گرم کیا اور ہیرے کے پیالہ میں انڈیل کر چمچے سے سوامی کو دودھ کھلایا، اور ساڑی کے آنچل سے گردن اور منہ پونچھ کر نرم نرم گدے پر سفید سرسوں کے تکئے سرہانے لگا کر لٹا دیا، اور گھاٹ کے کنارے دھوپ سے آڑ کر کے بیٹھ گئیں، اور گھی کے چراغ جلا کر کاجل بنایا اور چاندی کی سلائی سے ان کی آنکھوں میں لگا دیا۔

مالنچ اسی طرح ریگستانی کنارے پر اپنے ننھے سوامی کے ساتھ دن

کاشتی رہیں، انہیں نہ اپنے کھانے کی فکر تھی، نہ پہننے کی فکر تھی، دودھ بھی تھا سامان بھی تھا، وہ اپنے سوامی کو کھلاتی رہتیں، آنچل سے ان کا منہ اور گردن پونچھتی رہتیں، آنکھوں میں کاجل لگاتی رہتیں، پھر تھپکیاں ان کا منہ تکنے لگ جاتیں، جب ننھے چُنے ہنسنے تو وہ بھی ہنسنے لگتیں اور جب وہ رونے لگتے تو وہ بھی رونے لگتیں، جب وہ بولنے لگتے تو وہ ان کی باتوں کا جواب دیتیں، جب وہ ننھے ہاتھ پیر اچھالتے تو وہ ان سے کھیلتیں، وہ انہیں اپنے آنسوؤں سے نہلاتیں، اپنے بالوں سے ان کا بدن پونچھتیں، اپنی سانسوں سے ان کا جسم خشک کرتیں، اور ساڑی کا آنچل ڈال کر ان کو سینے سے لگا کر بیٹھ جاتیں،

دن گزرتے رہتے، یہاں تک کہ ایک سال گذر گیا،

اب کیا ہوا، دیکھو اپنے سوامی جیسے ننھے سے بچے کا سارا درد دھوپ کے، مالنچ سے دیکھا کر شکل ساتھی حالی ہو گئی، مالنچ نے اپنے ننھے سوامی کو گود میں لیا اور گاؤں کے دور بھاگتے انسانوں کی بستی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں، وہ چلتی رہیں چلتی رہیں، چلتے چلتے انہوں نے دیکھا کہ سوامی کے منہ پر دھوپ آ جاتی ہے انہوں نے ان کے منہ کو آنچل سے چھپا لیا، چلتے چلتے جب پانی برسنے لگتا تو وہ انہیں اپنے سینے میں چھپا لیتیں، گرد اڑتی تو وہ اسے اپنے بالوں سے اڑا دیتیں، وہ تھوڑی دور جاتیں اور سوامی کو تاروں سے پنکھا جھلنے لگتیں، وہ چلتے چلتے ایک گھنے جنگل میں جا پہنچیں، انہیں انسانی بستی دکھائی دی، اور نہ گائے کا دودھ ہی میسر آیا، ان کے بجائے ایک شیر جھپٹا ہوا باہر نکلا اور بولا "واہ واہ، بہت دنوں سے بھوکا ہوں، تمہارے کھانے کی طاقت نہیں، لڑکی یہ بچہ میں کھا لوں گا"، مالنچ نے کہا "دیکھو شیر! یہ میرے سوامی ہیں، ان کے کھانے سے تو تیرا پیٹ بھرنے کا نہیں، تو مجھے کھا لے" "جی یہ تیرا سوامی ہے، اتنے ننھے سوامی کے ساتھ تم اکیلی خوفناک جنگل میں رہو گی، تو پھر میں کسی کو بھی نہیں کھاؤں گا، تم یہیں رہو، میں تمہاری نگہبانی کروں گا"، مالنچ نے کہا "ماموں! میں اپنے سوامی کو کیا کھلاؤں، یہاں کوئی گائے کہاں ملے گی"، "اچھا دیکھنا ہو، ابھیں کاٹنے والے بھی ہے" "نہیں" شیر تو چلا گیا اور مالنچ رو رو کر پکارنے لگیں "میرے دیوتا، تم کہاں ہو؟ میرے سوامی بھوک سے بلبلا رہے ہیں، اگر یہاں کہیں سے بھی ایک قطرہ دودھ مل جائے تو ان کا پیٹ بھر جائے"، اتنے میں شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ادھر نکل آئی، اس نے جو مالنچ کو روتے دیکھا تو پوچھا، "بچی تو کون ہے؟ جنگل میں دودھ، دودھ کیوں چیخ رہی ہے؟ اگر میرا دودھ کام آ سکتا ہے تو لے"، مالنچ نے کہا "ٹھیک ہے"،

شیر کو کھانے کو نہیں ملی، وہ واپس آ گیا، اس نے شیرنی کو جو دیکھا تو کہنے لگا۔ "ارے تم بھی یہاں آ گئیں، مجھے تمہارا خیال ہی نہیں آیا"۔

چندر مانک شیرنی کا دودھ پی کر بڑھنے لگے، شیر شیرنی بچوں کی حفاظت کرتے رہے، مالنچ اپنے سوامی کی قدم قدم پر نگہبانی کرتی رہیں، ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتیں، ان کے لئے پھل پھلیری جمع کرتیں، جب وہ جاگتے ہوتے تو ان کے ساتھ کھیلتی رہتیں، سونے لگتے تو لوریاں سناتیں، ہوتے ہوتے پانچ سال گذر گئے، ایک روز مالنچ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شیر اور شیرنی سے کہا "ماموں، ممانی اب میں یہاں نہیں رہ سکتی، اب مجھے جنگل چھوڑنا ہی ہوگا"۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی! ایسی بات نہ کہو، آخر ہوا کیا؟ کسی نے کچھ کہا ہو تو اس کی گردن مروڑ دیں، ابھی اس کو پکڑ کر کھا جائیں"۔ "نہیں ماموں ممانی! ایسی کوئی بات نہیں ہے، تم لوگ نہیں جانتے، میرے سوامی راجہ کے بیٹے ہیں، اب وہ پانچ برس کے ہو گئے ہیں، اگر میں ان کو پڑھنا لکھنا نہ سکھواؤں تو کام کیسے چلے گا"۔ "یہ بات ہے؟ تو تم ان کو لکھنا پڑھنا سکھلوا دو، کتنے ہی پنڈت شام سویرے ہوتا ہوا یہاں چھپتے پھرتے ہیں، تم کہو تو ان کو پکڑ لائیں"۔ "نہیں ماموں! ان سے بھلا کام نہیں چلے گا، میں جاؤں گی اور کسی شہر کے نزدیک جا کر رہوں گی، تم کبھی کبھار ہماری خیر خبر لیتے رہنا"۔ مالنچ روتیں، سسکیاں بھرتیں ان سے رخصت ہوئیں، شیر اور شیرنی جنگل کے کنارے تک ان کے ساتھ ساتھ آئے اور مالنچ چندر مانک کے ساتھ ان سے رخصت ہو گئیں، اس غم میں شیر اور شیرنی نے چار دن تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، بچے گھبرائے گھبرائے جنگل میں ادھر ادھر پھرتے رہے۔

مالنچ چندر مانک کو گود میں لئے لئے چلتی رہیں چلتی رہیں، چلتے چلتے وہ ایک مالن کے باغ میں جا پہنچیں، بارہ برس سے اس باغ میں پھول نہیں کھلے تھے، باغ کے پاس کا تالاب سوکھا پڑا تھا، باغ جھاڑ جھنکار کا جنگل اور سانپوں کا مسکن ہو رہا تھا، سخت دھوپ نکلی ہوئی تھی، مالنچ تھک کر ذرا دیر کے لئے وہاں بیٹھ گئیں، وہ ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے باغ گونجنے لگا، رنگ برنگی چڑیاں ان کے گرد پھر پھرانے لگیں، الٹے سیدھے درخت پودے ہرے ہرے پتوں سے چھا گئے، بیلیں ہری بھری ہو گئیں، ان پر بے شمار پھول کھل اٹھے، پھولوں کی خوشبوئیں جو مالن تک اڑ کر پہنچیں تو وہ پاگلوں

ہ لودوں کے پیچھے کی آوازیں

کی طرح باہر نکل آئی، اور سوچنے لگی بارہ برس سے باغ میں پھول نہیں کھلے تھے تالاب سوکھا پڑا تھا، آج سارا باغ پھولوں سے بھرا ہوا ہے، تالاب میں کنول کھلے ہوئے ہیں، میری تو آج قسمت جاگ گئی، مگر یہ سب ہوا کیسے؟ مالن ادھر اُدھر دیکھنے لگی، دیکھتے دیکھتے وہ دیکھتی کیا ہے کہ ایک مولسری کے درخت پر کوئل کوک رہی ہے، اور نیچے کوئی دیوی چاند گود میں لئے بیٹھی ہے، مالن ان کے پاس دوڑ گئی، اور پوچھا "بیٹی تم کس سورگ کی دیوی ہو، تمہارے آتے ہی اُجڑا باغ لہلہا اُٹھا، بتاؤ تم کون ہو؟" مالنج نے کہا "ماں میں اسی دنیا کی انسان ہوں، تمہارے باغ میں ذرا سستانے بیٹھ گئی تھی"۔ "آہ میری بانجی! تو میری جھونپڑی میں چل، تو تو بالکل میری بھانجی جیسی ہے، وہی صورت، وہی رنگ ویسی ہی آنکھیں اور ویسے ہی ہاتھ، بارہ برس ہوئے وہ مر گئی، بارہ برس سے میری آنکھیں اُس کے غم میں آنسو بہاتی رہتی ہیں، کیا وہی اس خوبصورت روپ میں آگئی بیٹی"۔ مالنج نے کہا "خالہ میں کچھ نہیں جانتی ہیں تو ابھی ابھی تمہارے باغ میں آئی ہوں" "اب جو بھی بات ہو، تم میری جھونپڑی میں چلو بیٹی"! مالن بہت خوش تھی، اب ہمیشہ اسکے باغ میں پھول کھلتے رہیں گے، اور وہ روزانہ راجہ کے محل میں پھول بیچنے جایا کرے گی مالنج نے سوچا مالن سے شہر کی خبریں ملتی رہا کریں گی، دونوں جھونپڑی کے اندر آگئیں وہاں مالن نے مالنج سے کہا "بیٹی تیری صورت مرجھائی ہوئی ہے، کچھ کھالے"، مالنج نے کہا "اگر دودھ ہو تو تھوڑا سا لادو"، مالن دودھ لے آئی، مالنج نے سوامی کو دودھ پلا کر سُلا دیا، اور جھونپڑی میں جو جگہ مالن نے اسے رہنے کے لئے بتائی تھی اسے صاف کیا، باغ میں جا کر پھولوں سے آنچل بھر لائیں، اور اپنے سوامی کے گرد چاروں طرف پھول سجا دیئے، جب اس کام سے فراغت ہو گئی تو انہوں نے مالن سے کہا "خالہ، میں دوسروں کے ہاتھ کا پکایا ہوا نہیں کھاتی تم مجھے سامان لادو میں خود پکا لوں گی"۔

مالن بہت خوش ہوئی اور اس نے سب سامان لا کر دیا، مالنج نے مالن سے یہ نہیں بتایا کہ یہ لڑکا اُن کا سوامی ہے، وہ مالن کے گھر میں رہتی رہیں، مالن کا گھر خراب ہو رہا تھا، مالنج نے کہا "خالہ ٹوٹے پھوٹے گھر میں کیوں تکلیف اُٹھائی جائے آدمی بلوا لو، نیا گھر بنوا لیا جائے"۔ نیا گھر تیار ہو گیا، پہلے گھر میں ایک ہی کوٹھری تھی، اب تین کوٹھریاں ہو گئیں، ایک میں مالن رہنے لگی، دوسری میں مالنج اور راجکمار رہنے لگے اور ایک خالی رہی، ایک دن مالنج نے مالن سے پوچھا "خالہ شہر میں بچے کہاں پڑھتے ہیں؟" "ارے راج محل میں ایک پنڈت جی ان سے بہت سے لڑکے پڑھتے ہیں اور ایک سے ایک پڑھنے والے ہیں، کوئی کُبڑا ہے کوئی لمبوترا ہے، کسی کو فیل پا ہے، کسی کی کمر جھکی ہوئی ہے کسی کی مینڈکوں کی سی آواز ہے، پھر راجہ کے بیٹے بھی وہاں پڑھتے ہیں، دن رات کائیں کائیں کِل بِل ہوتی رہتی ہے، کوؤں اور بگلوں کا ہاٹ ہی تو لگا رہتا ہے"۔ "تو پھر خالہ ایسا کرو اور دوات قلم خرید لاؤ اور ان کو پاٹھ شالہ لے جاؤ"۔

چندر مانک پاٹھ شالہ جانے لگے، جب وہ وہاں سے گھر آتے تو اُن کا چہرہ اور کپڑے روشنائی میں سنے ہوتے، خالی کوٹھری ان کے پڑھنے کے کام آتی۔ مالنج مالن سے انہیں نہلواتیں، ان کا منہ ہاتھ دھلاتیں، خود کھانا پکاتیں اور پکا کر بیٹھ جاتیں، مالن انہیں کھلا لاتی اور میٹھے کر کھلاتی، مالنج چندر مانک کے سامنے نہ آتیں، انہیں ڈر لگا رہتا کہیں وہ ان کو ماں نہ پکار بیٹھیں، وہ اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے سوامی کو دیکھا کرتیں، اور اُن سے دور دور رہا کرتیں، اس طرح سات سال اور گذر گئے۔

اس دیس کا راجہ دودھ برن تھا، اس کے سات بیٹے بھی پنڈت سے پڑھتے تھے، اس کی بیٹی بھی پڑھتی تھی، لیکن راجہ کی بیٹی پڑھائی میں آگے نہ بڑھ پاتی تھی، بھائی پوچھتے کہ بچی! تو اتنا لکھتی پڑھتی ہے لیکن تیرا سبق آگے نہیں بڑھتا، آخر تو کیا لکھتی پڑھتی ہے؟ کانچی مالا کہتی "کیا لکھوں، کیا پڑھوں؟ دیکھتے نہیں اس کے ہاتھوں میں کیسا چاند روشن ہے، پیروں میں بھی چاند روشن ہے، ماتھے پر بھی چاند روشن ہے، سینکڑوں ہی تو چاند اس کے بدن پر چمکتے رہتے ہیں، اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ مالی کا لڑکا ہے، میں نے تو اسے دیکھ دیکھ کے چاروں وید اور آٹھوں پرانوں کی حد پا حاصل کر لی ہے کہیں آدمی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے؟" جب بھائیوں نے کانچی کی یہ باتیں سنیں تو ساتوں کے ساتوں حیران رہ گئے، انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ ایسا کرنا چاہیئے کہ مالی کا لڑکا پاٹھ شالہ میں نہ آنے پائے، وہ اس کے پاس گئے اور بولے "دیکھ مالی تیرے ہاتھ اور تیرے منہ میں روشنائی بھری رہتی ہے، ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا، اگر کل سے تو میلے کچیلے کپڑے پہن کر آیا تو تیری گردن اُڑا دی جائے گی"۔ راجہ کے لڑکوں نے سوچا تھا کہ مالی کا لڑکا نہ صاف ستھرے کپڑے پہن پائے گا نہ پاٹھ شالہ آسکے گا۔

چندر مانک اپنی کتابیں چھوڑ چھاڑ روتے ہوئے گھر آئے، مالنج نے جو اُن کو روتے دیکھا تو مالن سے کہا "دیکھو خالہ وہ کیوں رو رہے ہیں؟" مالن نے

ماجرا دریافت کیا، اور آخر بولی، وہ کہتے ہیں تھوڑا سا دن اور رات باقی رہ گئی ہے کل صبح اُن کی گردن اُڑا دی جائے گی، مالنچ نے پوچھا آخر کیوں گردن ماری جائے گی! مالن نے سارا حال بیان کر دیا، مالنچ نے کہا تو خالہ یہ روپے لو اور ایسے کپڑے خرید لاؤ جو راجہ کے لڑکوں کے پاس بھی نہ ہوں"۔ مالنچ کے پاس ہیرا تو تھا ہی، اُنہوں نے آنچل بھر کر روپے دے دیے تھے، دوسرے دن جب چندر مانک پاٹھ شالہ گئے تو اُسے راجکماروں کی سی پوشاک پہنے دیکھ کر دنگ رہ گئے، آپس میں کہنے لگے ایسی پوشاکیں تو ہمارے پاس بھی نہیں، اس مالی کے لڑکے کو کہاں سے مل گئی؟ کاپجی نے ساتوں بھائیوں سے کہا، دیکھتے کیا ہو، یہ کہیں مالی کا لڑکا ہو سکتا ہے، راجہ کے لڑکوں نے کہا ہاں ٹھیک۔ تو بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے، انہوں نے چندر مانک سے کہا دیکھو تم نے پوشاک تو عمدہ پہن رکھی ہے، مگر آئے ہو پیدل، یہ کتنی شرم کی بات ہے، اگر کل سے تم پالکی پر نہ آئے تو تمہاری گردن اُڑادی جائے گی، اُنہوں نے سوچا کہ پوشاک تو اسے کہیں دان میں مل گئی ہوگی، وہ پالکی کہاں سے لائے گا، جب اسے پالکی نہ ملے گی تو وہ پاٹھ شالہ بھی نہ آئے گا۔

اُس دن بھی چندر مانک روتے ہوئے گھر پہنچے، اور پوشاک اُتار اور اسے پھینک پھانک زمین پر پڑ رہے، مالنچ نے مالن سے کہا اُن سے پوچھو اب وہ کیوں زمین پر پڑے رو رہے ہیں، مالن نے آن کر بتایا، دن کے چند گھنٹے اور رات باقی رہ گئی ہے، کل راجہ کے لڑکے ان کی گردن ماردیں گے، انہوں نے پوچھا اب وہ کیوں گردن ماردیں گے؟ مالن نے پوچھ کر بتایا کہ راجہ کے لڑکے کہتے ہیں کہ اُنہوں نے پوشاک تو اتنی عمدہ پہن رکھی ہے پھر وہ پیدل کیوں آتے ہیں؟ مالنچ نے کہا اچھا خالہ یہ روپے لو اور شہر میں جتنی بھی اچھی سے اچھی پالکیاں ہوں وہ سب لے آؤ، مالن گئی اور خالی لوٹ آئی، کوئی بھی کہار مالی کے لڑکے کو پالکی پر سوار کرانے کے لئے تیار نہ ہوا، مالنچ نے کہا تم کہاروں کو سونے کی دس دس اشرفیاں دو وہ ضرور راضی ہو جائیں گے، اور کہاروں میں ٹوکری بھر کر اشرفیاں بانٹ دی گئیں، اور جتنی بھی اچھی سے اچھی پالکیاں تھیں وہ سب آگئیں، ان میں ایک پالکی ایسی تھی جس میں سونے کا چھتر لگا ہوا تھا، اس پر ہاتھی بنا ہوا تھا اور بڑے بڑے آدمی سوار ہوا کرتے تھے، دوسرے دن چندر مانک اسی پالکی میں سوار ہو کر پاٹھ شالہ گئے، راستہ میں جو بھی اسے دیکھتا اس کے ساتھ ہو جاتا، جتنے پڑھنے والے تھے وہ تعجب سے کھڑے ہو گئے، یہ کون آ رہا ہے، کوئی راجکمار ہے یا کوئی

اور؟ کاپجی نے کتابیں بند کر قلم دوات پھینک پھانک بھائیوں سے کہا۔ آج پاٹھ شالہ کو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ اندر کی سبھا ہو رہی ہے، یا جواہرات کے بازار میں بڑا سا ہیرا چمک رہا ہے، تم سات بھائیوں کی میں اکیلی بہن ہوں، اگر تم میرا بیاہ چندر مانک کے ساتھ نہ کروگے تو میں جان دے دوں گی، ساتوں بھائی مصیبت میں گھر گئے، اب کیا کیا جائے؟ سوچتے سوچتے انہوں نے چندر مانک سے کہا دیکھو مالی! تم نے سب کچھ تو ٹھیک کر لیا، اب تم ایک گھوڑے کا انتظام کرو اور شہسواری میں ہم سے مقابلہ کرو، ہم ساتوں بھائیوں کے گھوڑے سات سات میل کے فاصلہ پر کھڑے ہوں گے اور تمہارا گھوڑا سب سے آخر میں کھڑا ہوگا، ہم اپنا اپنے گھوڑے دوڑائیں گے، اگر تم آگے نکل جاؤ تو اچھا ہے، نہیں تو تمہاری گردن ماردی جائے گی، راجہ کے لڑکے دل ہی دل میں ہنستے رہے، کہ مالی کا لڑکا بھلا گھوڑے سواری کیسے کر سکتا ہے، وہ چڑھتے ہی گھوڑے سے گر پڑے گا اور مر جائے گا، چندر مانک پھر روتے دھوتے گھر پہنچے، مالنچ نے کہا دیکھو تو ماں خالہ آج کیا ہوا، مالن چندر مانک کے پاس گئی اور معلوم کر آئی کہ آج یہ بات ہوئی ہے، مالنچ نے کہا اچھا خالہ یہ روپیہ لو، جتنا خرچ کروں میں گھوڑے کی تلاش میں جاتی ہوں، مجھے تین دن اور تین راتوں سے زیادہ نہ لگیں گے، میں اسی مدت میں گھوڑا لے کر آجاؤں گی۔

یہ سب کہہ کہا کر، مالنچ روانہ ہو گئیں، وہ چلتی رہیں چلتی رہیں، اور بارہ راجاؤں کے تیرہ ملکوں سے گذر کر ایک راجدھانی میں پہنچیں، وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہیں کہ محل کے سب پھاٹک بند ہیں، اور لوگ باگ اپنے اپنے دروازے بند کئے سب چھپے بیٹھے ہیں، نہ راجہ کی سبھا ہو رہی ہے، نہ راجدھانی میں کوئی چہل پہل ہے، ہر طرف نحوست برس رہی ہے، ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ مالنچ کو پتہ چلا کہ راجہ کا پکھی راج گھوڑا پاگل ہو گیا ہے، اور ادھر اُدھر دولتیاں جھاڑتا پھرتا ہے، کوئی آدمی نظر آتا ہے تو اسے مار ڈالتا ہے، مالنچ نے جو یہ سنا تو انہوں نے آواز لگائی، پکھی راج تم کہاں ادھم مچاتے پھر رہے ہو؟ تم کو چندر مانک یاد ہیں؟ آواز سنتے ہی گھوڑا جہاں کا تہاں کھڑا ہو گیا، اس کے کان کھڑے ہو گئے، وہ ان کی طرف دوڑا آیا اور بولا، ارے لڑکی تم نے چندر مانک کا نام کہاں سنا، اتنے دنوں کے بعد کیا چندر مانک مجھے مل جائیں گے؟ مالنچ نے کہا پکھی راج تم میرے ساتھ چلو، آگے آگے مالنچ چلیں، پیچھے پیچھے گھوڑا چلنے لگا۔ راجدھانی کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے، اور آپس میں باتیں کرنے لگے،

چندرمانک وکب کے مر چکے ہیں، اس لڑکی نے جونہی ان کا نام لیا گھوڑا رام ہو گیا، یہ کیسی جادوگرنی ہے، راجہ رانی بولے دیکھو تو یہ کون ہے، مالنچ چلتی جاتیں اور گاتی جاتیں "یہ وہی گھوڑا ہے جس پر سوار ہو کر مہاراج باغ میں گئے تھے، وہاں ان کو آم ملے تھے جن کے کھانے سے بیمار پڑتے تھے، اور کوتوال کی لڑکی پکڑ کر لائی گئی تھی، اور اس کا بیاہ ان سے کر دیا گیا تھا، وہی کوتوال کی لڑکی گھوڑا لئے جا رہی ہے، بارہ برس پورے ہونے تک مہاراج معاف کریں، چند دن اور رہ گئے ہیں، جب وہ ختم ہو جائیں گے تو مہاراج کو سب حال بتایا جائیگا۔" جب گانا ختم ہو گیا تو مالنچ تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

راجہ نے جو یہ ماجرا سنا تو وہ کہنے لگے "ارے یہ کیا مالنچ ہے، مالنچ نے راج بھائی کو گھوڑے سے نجات دلائی ہے، مالنچ نے گھوڑے کو رام کر لیا، ہائے ہائے اُس کے ہاتھ کٹوا دیئے تھے، اُسے اذیت پہنچائی تھی، اسی مالنچ نے آ کر سب کو نجات دلائی، لوگو اپنے گھروں کے دروازے کھولو، مالنچ کو ماں نے پہچان لیا، بھائیوں نے پہچان لیا، راجہ رانی نے پہچان لیا، یہ تو وہی مالنچ ہے، آج اس کے کان ناک پھول ہو رہے ہیں، ہاتھوں کی انگلیاں چمپا کی کلیاں ہو رہی ہیں، آنکھوں میں چاند سورج چمک رہے ہیں، سب ہی مالنچ مالنچ چیختے چیختے اس طرف دوڑ پڑے، مگر مالنچ بکھی راج کے ساتھ جا چکی تھیں، راجہ نے ان کی تلاش میں آدمی دوڑا دیئے، کوتوال کی بیوی کو محل میں بلا کر دھوم دھام سے اس کی دعوت کی گئی، رانی نے بھی اس کے ساتھ کھانا کھایا، دن گذرتے چلے گئے، راتیں گذرتی چلی گئیں، اور تمام لوگ مالنچ کی خیر خبر آنے کا انتظار کرتے رہے۔

ادھر دوسرے دن راجہ کے دیس میں سنکھ بجے، رات گذرنے اور دن چڑھنے کا اعلان ہوا، تمام طالب علم اپنے اپنے سبق پڑھنے میں مشغول ہو گئے، اچھی عورت کی بچی مالنچ گھوڑا لے کر واپس آگئیں، مالنچ نے آواز دی "مالن گھوڑا ایسا کھڑا ہے"، مالن نے باہر نکل کر دیکھا، گھوڑے کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں، کان کھڑے ہیں، وہ اپنے سم پٹخ رہا ہے، زمین تھر تھر کانپ رہی ہے، مالن نے پوچھا "بیٹی! مجھے کیا کرنا ہوگا؟" مالنچ نے کہا "گھوڑا تیار ہے تم لے جاؤ"، مالن بولی "تم جو کوئی بھی کام کرنے کو کہو میں کروں گی، مگر گھوڑا مجھ سے نہ پکڑا جائیگا"، مالنچ نے کہا "وہ تم سے کچھ نہ بولے گا، تم اسے لے جاؤ"، مگر مالن نے کہہ دیا "میری جان بھی چلی جائے تو بھی میں اس کے پاس تک نہ جاؤں گی"، مالنچ کا منہ لٹک گیا۔ انہوں نے ماتھے کا پسینہ پونچھا، اور دانتوں میں انگلی دبا کر لمحہ بھر سوچتی رہیں کہ اب کیا کیا جائے، آخر انہوں نے گھوڑے پر خوبصورت زین کس دی اور جھک کر آنکھیں نیچی کر کے سوامی کو گھوڑے پر سوار کروا دیا، سوار کروا کر انہوں نے اپنے آنچل میں گرہیں باندھیں اور بکھی راج سے کہا "بکھی راج تم کو اپنا فرض معلوم ہے، میں نے اپنے سوامی کو تمہاری پیٹھ پر سوار کر دیا ہے، جب تک میں تمام گرہیں کھولوں تم انہیں واپس میرے پاس لے آنا"، گھوڑے کو ہدایت دے کر مالنچ سوامی کو رس پکڑانے کے لئے آگے بڑھیں اور رس پکڑاتے وقت دونوں کی نظریں ملیں، اُن کی صورت دیکھ لی، اور جوتوں کی خاک جھاڑنے کے بہانے پیروں کی خاک لی، چندرمانک نے یہ دیکھ کر ان سے پوچھا "تم کون ہو؟ تم ہمیشہ میرے آس پاس رہتی ہو، مگر مجھ سے بات نہیں کرتیں، صورت سے اچھی ذات کی ہو مگر مجھے کھلاتی نہیں، آج میں نے تمہارے ہاتھ دیکھے پیر دیکھے، تمہارا منہ دیکھا، تم نے میرا منہ دیکھا، اور پیروں کی خاک بھی لی، آخر تم میری ہو کون؟" "میں کون ہوں؟" کمار پوچھتے ہیں، "ایسا جو ہوں سو ہوں، دکوتوال کی لڑکی ہوں"۔ اتنا کہنے کے بعد مالنچ نے بال سنوارنے کے بہانے اپنا منہ پھیر لیا، اور جلدی سے آنچل سے ایک ڈورا نکال کر بکھی راج کی گردن میں باندھ دیا، اور اسے روانہ کر دیا، بکھی راج ہوا سے باتیں کرنے لگا، مالنچ تالاب کے کنارے بیٹھ کر گرہیں کھولنے لگیں۔

پاٹھ شالہ میں گھوڑا دیکھ کر راجہ کے لڑکے ہکا بکا رہ گئے، کہنے لگے "یہ گھوڑا نہیں ہے، یہ تو بکھی راج ہے، ایسا گھوڑا تو ہمارے اصطبل میں بھی نہیں، یہ مالی کے لڑکے کو کہاں سے مل گیا"، آج راجکمار چندرمانک گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، گھوڑا دوڑنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا، جیسے کہ نئے نئے پر نکلنے والا پرندہ اُڑنے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے، چندرمانک لگام زور سے کھینچے ہوئے تھے، گھوڑے کا انگ انگ پھڑک رہا تھا، کھُر زمین پر پٹ پٹ کر رہے تھے، اسے صبر کی تاب نہیں ہو رہی تھی، راجہ کے ساتوں لڑکے بوکھلائے ہوتے تھے، آپس میں کہتے جاتے تھے ہم نے مقابلہ کے لئے کہا ہے تو ہم ضرور مقابلہ کریں گے، اگر یہ جیت بھی جائے تو کچھ نہ ہوگا، راج ہمارا ہے، ہم اس کی گردن اڑا دیں گے، انہوں نے چندرمانک سے کہا، مالی اگر تو آگے گھوڑا کرے گا تو ہم تیری گردن اڑا دیں گے، تو اپنا گھوڑا سات میل پیچھے رکھ، جیسا کہا گیا تھا ویسا ہی انتظام ہوا، ہر گھوڑے سوار ایک ایک میل کے فاصلہ پر کھڑا ہوا، چندرمانک کو سب سے پیچھے کھڑا کیا گیا، جب انہوں نے پوچھا کہ دوڑ شروع ہوئی کہ نہیں؟ جواب ملا، ذرا دیر ہوئی راجہ کے لڑکے گھوڑے دوڑا چکے تھے، جب چندرمانک نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی بکھی راج

کو اپنا لگاری، لکھی راج نے ڈرتا ہوا [illegible] پلک جھپکتے ہی سب سے آگے نکل گیا۔ راجہ
کے لڑکوں نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگے کہ ابھی دوڑ ختم نہیں ہوئی، ابھی تو ہمیں
اُتر کی طرف کی دوڑ دوڑنی ہے۔ اب پورب کی طرف دوڑ شروع ہوئی [illegible]
پہلے لکھی کا گھوڑا پورب کی طرف سب سے آگے نکل گیا۔ انہوں نے
کہا اب پچھم کی طرف، پچھم کی طرف بھی [illegible] کی جیت ہوئی۔ انہوں نے
کہا اب دکھن کی طرف، دکھن کی طرف بھی ان کی جیت ہوئی۔ [illegible] لڑکے بولے
ہاں بھائی تم جیت گئے [illegible] گھوڑا بہت اچھا ہے۔ اب تم [illegible] ہم
سب لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ کل [illegible]
ہی یا تو اس کو قید کر دیں گے یا اس کی گردن مار دیں گے [illegible]
مگر لکھی راج وہاں سے ذرا بھی نہ ہلا۔ [illegible] رمانک نے لکھی راج کی گردن پر جا کر
[illegible] انہوں نے جب چوما تو لکھی راج کی گود میں [illegible] ہوا [illegible] گیا
کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو [illegible] زندگی بھر کی [illegible]
راج نے [illegible] کا سانس کھینچا اور چل پڑا اور ایک دن وہ اپنے محل [illegible] کے سات
جاکر کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ [illegible] تالاب [illegible] جیت [illegible]
جیتا ہے اس وقت کیا ہوا جہاں سونے کی [illegible]۔ وہاں کانچ کی مالا
سونے کی صورتی کی طرح [illegible] لے جو چندر مانک [illegible] دیکھ [illegible] مالا
ہاتھیں [illegible] مالا [illegible]
چندر مانک [illegible] کے گلے میں ڈال چکا [illegible] دیکھو [illegible]
غور [illegible] ہو گیا [illegible] مالا ان ہی [illegible]
کیا ہو سکتا تھا؟ سب لوگ چپ ہو گئے، ساتوں بھائی [illegible]
کے ساتھ دربار لے گئے۔ اچھے درباروں سے پوچھا کس کے قاعدے سے راجہ
کا بیاہ مالی کے لڑکے سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟ درباروں نے کہا ہو سکتا ہے اگر
مالی کا لڑکا بارہ سال تک قید میں رکھا جاتا [illegible] بیاہ ہو گیا
تین دن اور تین راتیں راج محل میں بڑی خوشیاں منائی گئیں [illegible] شام
کے وقت راجہ کے ساتوں لڑکے مالی کے لڑکے کے گلے میں [illegible]
میں بند کر آئے۔

ادھر کیا ہوا جب لکھی راج چلا گیا تو مالنچ تالاب کے کنارے خاک میں
لوٹ رہی تھیں، جیسے کہ باروں میں جا [illegible] لوٹ رہا تھا، وہ لوٹتی جاتی تھیں
اور کہتی جاتی تھیں ہائے میں نے سوامی کو کیوں [illegible] بتا دیا [illegible] کون [illegible]

[illegible] انہوں نے دیکھا کہ لکھی راج سامنے کھڑا ہے، اسے دیکھتے ہی [illegible] پوچھنے لگیں
لکھی راج میرے سوامی کہاں ہیں؟ اور اُن کی آنکھیں آگ کی طرح جل اٹھیں
وہ زمین سے اٹھ پڑیں اور آپ ہی آپ کہنے لگیں ہائے یہ کم بخت نے کیا
کیا [illegible] کیا دیکھ رہی ہوں، وہ پھر پچھاڑیں کھانے لگیں، لکھی راج بولا جی
میں کچھ [illegible] کہوں، راج محل کی سونے کی [illegible] کے پاس کانچ کی مالا پڑی
[illegible] تمہارے سوامی کو راج محل میں کھینچ لے گیا۔
[illegible] جب یہ سنا تو وہ اٹھ بیٹھیں، اُن کے آنسو تھم
گئے۔ انہوں نے لکھی [illegible] سے کہا تعجب ہے جس غرض سے میں نے سوامی
[illegible] بارہ برس تک [illegible] پوری ہو گئی، آج بارہ برس پورے ہو گئے
[illegible] خوش قسمت کی صورت دیکھ کے
[illegible] ہوں، تم میرے سسر مہاراج کو دینا
[illegible] سسر مہاراج، راجکماری کی زندگی
[illegible] اگر آپ [illegible] محل
[illegible] گے، وہاں کی راجکماری کا کانچ
مالا پڑا اچھا [illegible] انہوں نے اس کے ساتھ بیاہ کر لیا ہے۔ اُن
کی [illegible] آپ کو ملے اس روز آپ
[illegible] نے پہلے پہل کوتوال کی لڑکی کو دیکھا تھا۔
[illegible] تالاب میں اپنے قدم ڈال کر عزت بچائے
مالنچ مالا [illegible] لکھی راج کے حوالے کیا، اور اسے دانہ گھاس پانی کھلا
پلا کر رخصت کر دیا۔ اسے رخصت کر کے وہ خاک میں اپنے کپڑوں اور سروں
کے ساتھ [illegible] دروازے کے سامنے کے دروازے سے جس سے وہ بھی
[illegible] انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور
[illegible] آج تک تم کو نہیں بتایا تھا، آج بتاتی
ہوں [illegible] وہ میرے سوامی ہیں، اب
جو کچھ میرا [illegible] تمہارا ہے، تم نے ہم کو بہت تکلیفیں دیں، ان کی
[illegible] ساری عمر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی، آج میں
تم سے رخصت ہوتی ہوں۔ مالن نے جو یہ سنا تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا
چھا گیا اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اور مالنچ اپنے باپ کے تالاب میں
ڈوبنے کے لئے [illegible] کی طرف چل دیں۔ وہ سوچتی جاتی تھیں کہ جس تالاب

کے پاس مجھے یہ ہار ملا تھا جس شہر میں میں نے اپنے باپ کو کھویا، اسی دیس کے تالاب میں میرے تمام درد و غم دور ہو گئے۔ راجہ کی راجکماری کا ہار سوامی کے گلے میں کتنی شوبھا دے رہا ہے کیا! ہائے بابا نہیں مجھے کتنی خوشیاں حاصل نہ ہوں گی، چلتے چلتے اُنہوں نے پھر سوچا سوامی نے تو پوچھا تھا کہ میں کون ہوں، میں بدقسمت کوتوال کی لڑکی سوامی کو کیوں نہ دکھ دوں، ہائے میں نے خود ہی نہیں بتایا کہ سوامی میرے سوامی ہیں!

مانیج چلتی رہیں، مالن کا باغ پیچھے چھوٹ گیا، چھوٹے بڑے تالاب پیچھے رہ گئے، جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل پیچھے رہ گیا، اور مانیج چلتی رہیں، راستے میں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد تھا، چلتے چلتے وہ شیر شیرنی کے جنگل پہنچیں، اور کہنے لگیں، ماما آن مجھے کھا ڈالو، ماموں آج مجھے کھا ڈالو، بچو! تم سب بڑے ہو گئے ہو مجھے کھا ڈالو۔ وہ بولے ارے بیٹی تم آگئیں، یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، یہ تو بتاؤ تم کہاں رہیں؟ وہ بولیں، مالن کے باغ میں، اور وہ کہاں ہیں جن کو تم گود میں لے گئی تھیں جن کو ہم نے دودھ پلا کر بڑا کیا تھا، دیوی چندر مانک کہاں ہیں؟ مانیج نے کہا ماموں، ممانی! بس کوتوال کی لڑکی نے گلے میں ہار ڈال دیا ہے اس سے بیاہ ہو جائے گا، ہمارے لئے کیا خوشی کی بات ہے، آج خوشی کے دن تم مجھے کھا ڈالو، پھر شیر اور شیرنی نے مانیج سے سارا حال سنا، سارا حال سن کر ان کو گھبراہٹ ہوئی، وہ بولے بیٹی اب تو یہ بیاہ ہو گا، ہیں، قید کی زنجیر۔ اُنہوں نے پوچھا قید کی زنجیر کیسے؟ شیر بولا اس دیس کا دستور ہے اگر راجہ کا داماد بیاہ مالن کے گھر میں ہوتا تو لڑکے کو بارہ برس کی قید ہو گی، مانیج نے یہ سنا تو وہ ہونٹ کاٹتی کھڑی ہو گئیں۔ شیر اور شیرنی نے کہا بیٹی! تم ہمارے سروں کا گوند لے کے اپنے سر میں لگا لو، پھر تم راجہ بھائی کی طرف چلی جاؤ گی، مانیج کچھ نہ بولیں اور ان کے سروں کا گوند لے کے اپنے سر میں لگا لیا گوند لگاتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور شیر شیرنی اُن کے دل کے ساتھ لے چلے رو رہے تھے جنگل میں۔

ادھر سُکھی رانی مانیج کا خط لے کر ان کے سسرال پہنچیں جیسے ہی وہ محل کے پھاٹک میں داخل ہوا، لوگ بھاگ سہم گئے، راجہ کانپنے لگے، رانی کانپنے لگیں، اُنہوں نے سمجھا گھڑیال مانیج کو مار کر واپس آیا ہے، سُکھی رانی نے کہا مہاراج ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں ایک خط لایا ہوں، راجہ نے کہا اگر خط ہے تو لنگر ڈال کے ذریعہ دور سے مجھے دے دیا جائے، راجہ نے خط لے کر جو پڑھا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، وہ خوشی سے پاگل ہو کر چیخ پڑے، ارے لوگو! کہاں ہو، میرا چندر مانک مل گیا۔

سب ایک ساتھ چلّائے، کہاں ہیں، کہاں ہیں، راجہ نے کہا، دودھ بن کے دیس میں، راجہ نے جتنے ہرکارے مانیج کی تلاش میں بھیجے تھے، واپس بلوا لئے اور جتنے سپاہی جتنی فوجیں تھیں ان کو لے کر تیز بھاگ پڑے، پھر سب طرف دودھ بن کے دیس کی تلاش میں چل دئیے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے راجہ ایک جگہ آ کر دیکھتے ہیں کہ ایک مالن اپنے باغ کے پھول نیچے ڈال رہی ہے، شاخیں توڑ کے ڈال رہی ہے، مٹی کے ڈھیلے تالاب میں پھینکے جا رہی ہے، اور چیخے جا رہی ہے ہائے میری بھابی، ہائے میرے بچے!

گیت

پیا لجیب۔ مانک زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، میری بھابی!
سوامی ہو کر جنگل میں نکل گئی ہے، آئی تالاب میں میری بھابی
صبح و شام نہاتی تھی، اس طرف سے میری بھابی یاد کی کلسی بھر کے
رکھ کر آتی تھی، میرا چندر مانک یہاں بیٹھ کر پڑھتا تھا، رات کو وہ
اُس گھاٹ پر سوتا تھا،

راجہ نے کہا یہاں رہ جیسے گا رہنے جائیں، سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو راجہ نے دودھ بن راجہ کے نام خط لکھا۔ چندر پور کے راجہ چندر یہ خط روانہ کر رہے ہیں تم یہ بتاؤ کہ کیا میرا بیٹا تمہارے محل میں ہے، اگر ہے تو وہ کیسا ہے، اور کس بات پر، ٹھیک ٹھیک جواب آئے، میرے بیٹے کا نام چندر مانک ہے، وہ تمہارے بن کے پاٹھ شالہ میں پڑھتا تھا، کیا تمہاری بیٹی نے اُس کے گلے میں ہار ڈال دیا تھا؟ اگر خیریت چاہتے ہو تو اُس کی زنجیر کھول کر اُسے میرے پاس بھیج دو، میری بہو بھی میرے پاس بھیج دی جائے۔

دودھ بن نے جواب میں لکھ بھیجا، راجہ اگر وہ تمہارا بیٹا ہے تو لڑ کر اسے چھڑا لے جاؤ۔ راجہ نے دودھ بن پر چڑھائی کر دی، دودھ بن کی فوج زیادہ طاقتور تھی، راجہ لڑائی میں ہار گئے اور گرفتار کر لئے گئے، دن ڈھل گیا، شام ہو گئی، مانیج شیر کا گوند سر میں لگانے سب کی نظروں سے چھپی وہاں پہنچ گئیں جہاں اُن کے سوامی قید تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ کیا دیکھتی ہیں کہ سوامی زنجیر کے بوجھ سے زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں، اُن کی یہ حالت دیکھ کر مانیج کے آنسو نکل پڑے، وہ اپنے آنسو پونچھ کر اُن کے قریب چلی گئیں، اور تو اُن کے پاس کچھ نہ تھا، وہ دانتوں سے زنجیر توڑنے لگیں، لوہے کی زنجیر بھلا دانتوں سے کیسے ٹوٹ سکتی تھی، وہ بیٹھے بیٹھے تمام رات کوشش کرتی رہیں، بڑی مشکلوں سے

چوہری زنجیر کی ایک ایک کڑی ایک ایک پہر میں ٹوٹی، ہر ایک کڑی کے ٹوٹنے میں اُن کے آٹھ آٹھ دانت ٹوٹ ٹوٹ گئے، جب سب کڑیاں ٹوٹ گئیں تو زنجیر بھی زمین پہ گر پڑی، اُن کے منہ سے بھل بھل خون بہتا رہا، مانیخ اپنی کامیابی پہ مسکرائیں اور بیہوش ہو کر گر پڑیں،

چند سانگ چونک کر اٹھ بیٹھے، ان کو مانیخ تو دکھائی نہ دیں، البتہ زنجیر ٹوٹی ہوئی ملی، چند سانگ شیروں کا تو دودھ پیتے ہی رہتے تھے، ان کے ایک ہی جھٹکے سے دروازہ ٹوٹ گیا، اور وہ باہر نکل آئے، اُن کے چہرے پر رنجش کا حال دیکھ کر شیروں نے انہیں پہچان لیا، وہ آپس میں کہنے لگے، چند سانگ تو ہم کو مل گئے، اب چلو دودھ برن کے محل کے دیوں کو کھا ڈالیں، شیروں کا دل خوش ہو گئے ... گھسے، اور شیروں نے ہاتھی، گھوڑوں، آدمیوں، طبیوں، سانتوں، سب کو کھا لیا، اور راجہ کو ہڑپ کر ڈالا، اور پھر گھومتے رہے، راجکماری کی بہو کی تلاش کرنے لگے،

مانیخ کو ہوش آیا تو انہوں نے یہ تباہی دیکھی، وہ پاگلوں کی طرح شیروں کی طرف چیختی دوڑیں، اے ماموں سالی، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم نے سب اجاڑ کر رکھ دیا، محل میں کوئی دیا تک جلانے والا نہ چھوڑا، دیکھو تم میرے والی کسان سسرال والوں کو مت کھانا، دیکھو دیکھو میرے سوامی، راجہ اور راجکماری کا بچی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، شیروں نے جو ان کی واویلا سنی تو بہت شرمندہ ہوئے، افسوس ہم نے کیا کیا، ہم نے راجہ کو کھا لیا، رانی کو کھا لیا، اُن کے سارے لوگوں کو کھا لیا، ان کے تمام آدمیوں کو کھا لیا، اب ہم راجکمار کی بڑی بے تابی سے تلاش کر رہے ہیں تو تم ہم کو روک رہی ہو، مانیخ اپنا ماتھا پتھر پہ پٹخ پٹخ کر بولیں ہائے تمہاری دہائی ہے، دہائی ہے، تم راجکماری کی طرف دیکھنا بھی نہیں، اگر تم کو ایسا ہی کرنا ہے تو تم مجھ کو کھا لو، مانیخ شیروں کے سامنے لیٹ گئیں، اب شیر کیا کرتے انہوں نے راجکماری کو چھوڑ دیا اور مانیخ کے رہی ہو گئے، بولے، ہم نے بڑی مزے دار دعوت اڑائی، اب ہم پیاس سے مرے جا رہے ہیں، مانیخ نے کچھ کلسیاں تلاش کر لیں، اور پانی لانے تالاب پر چلی گئیں،

شیر تو دودھ برن راجہ کا شہر تباہ ہی کر چکے تھے، تیسرے ... شہر سے باہر نکلے، باہر نکل کر انہوں نے دیکھا کہ چند سانگ اُن کے آدمیوں کے درمیان کھڑے ہیں، انہوں نے نقارے بجوائے اور دھوم دھام سے بیٹے ہو کر گنگا کے کنارے دربھانگی کی طرف کوچ کر دیا، راستے میں تالاب دکھائی دیا، راجہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے، وہاں مانیخ اپنی کلسیاں بھر رہی تھیں،

انہوں نے دو کلسیاں راجہ کے بائیں طرف رکھیں اور انہیں دوب سے ڈھانک کر راجہ کے قدم لئے، راجہ نے پوچھا تم کون ہو؟ مانیخ نے کہا،

گیت

میرے بھاگ کتنے اچھے ہیں تمام عمر میں مصیبتیں جھیلتی رہی
ہوں، آج بارہ برس بعد مجھے اپنے سسر کے قدم دیکھنے کو ملے ہیں۔
آج وہ اپنے محل جا رہے ہیں، عورت کے لئے اس کے شوہر کا
گھر ... سب کچھ ہے، یہ داسی اسی سے محروم ہے، مہاراج آج
مجھ باندی کے لئے کن خوشیوں کا حکم دیتے ہیں؟

راجہ غصے سے بولے، چھوڑو، کوتوال کی لڑکی ہٹو، اس سے کوئی سروکار نہیں، سیانا ہو گیا ہے، اب تم راجکماری سے ملنے آئی ہو، کوتوال کی لڑکی کو دور کرو، راجکمار نے کہا مہاراج، اسی کوتوال کی لڑکی نے ہم سب کو گھوڑے سے جان ورانی تھی، راجہ نے ... مہاراج اسی نے دودھ برن راجہ پر شیروں سے حملہ کرا کے تباہ کیا ہے، مہاراج اسی نے راجکمار کو زندگی دی ہے، راجہ نے کہا، دیکھو راجکمار، اگر ... تو میری ... اڑا دی جائیں گی، اس نے مر کر بھی کہیں ... ہے تو وہ کوتوال ہی کی لڑکی، بھکارن کہیں کی رانی بنی ہے؟ اگر وہ ناچ جانتی ہے تو اس سے کہو شان و شوکت سے پالکی میں سوار ہو کر آئے۔ اتنا کہنے کے بعد راجہ کی سواری آگے بڑھ گئی،

مانیخ نے پیاسے شیروں کو پانی پلایا، قرض ادھار لے کر رانیوں کے لائق پالکی کا انتظام کیا، اور شیروں کے غول کے بیچ میں روانہ ہو گئیں، شیر دوڑ کر راجہ کے پاس پہنچ گئے اور راجہ سے کہا، مہاراج، مانیخ رانیوں جیسے کپڑے پہنے اور رانی کے لائق پالکی میں سوار ہو کر آگئی ہے، وہ آپ کی بہو ہیں اب آپ انہیں اپنے ساتھ رکھئے، راجہ نے انہیں کڑوا کسیلا جواب دے دیا، شیروں نے کہا، ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں، اگر کہو تو ہم راجہ کی ساری فوج کا صفایا کر دیں، راجہ کی راجکماری بہو کو کھا جائیں، اور تمہارے چند سانگ کو تمہارے پاس لا دیں، مانیخ بولیں، دیکھو شیرو ایسی بات منہ سے نکالو تو میرے سسر کی فوج کھانا چاہتے ہو؟ تمہاری یہ ہمت، اگر ایسا ہی ہے تو مجھے کھا جاؤ،

گیت

جس راستے سے میرے سسر گذریں گے اس راستہ کو اپنے بالوں سے
صاف کروں گی، اگر مجھے اپنے سسر کے ساتھ خار زار جھاڑیوں سے

بھی گذرنا پڑے تو بھی میں ان کے ساتھ جاؤں گی"۔

شیر ماموں، شیر بھائی تم میرے کہنے کا برا نہ ماننا، اب تم لوگ مجھے چھوڑ دو۔ شیر بھلا اسے چھوڑ کر کہیں جا سکتے تھے؟ راجہ اور راجہ کی فوج خاص سڑک پر آ گئی، مالنچ بھی کانٹوں اور جھاڑیوں کی راہ سے ساتھ ساتھ چلتی رہیں، ان کے ساتھ ساتھ شیر بھی چلتے رہے، چلتے چلتے راجہ سب لوگوں کے ساتھ راجدھانی پہنچ گئے نقارے بجے، شہنائیاں بجیں، اور راجہ دھوم دھام سے راجکمار اور بہو کے ساتھ محل میں چلے گئے، مالنچ باہر ہی رہ گئیں، شیر باہر رہ گئے، سات دن اور سات راتیں گذر گئیں، مالنچ وہاں سے نہیں گئیں، وہ روتیں اور گاتیں،

گیت

"یہ میری سسرال ہے، میرا سورگ ہے، یہ میرا تیرتھ ہے،
یہیں مجھے میرے سوامی ملے تھے، یہیں میرا بیاہ ہوا تھا، سسرال
میرے لئے مندر ہے، سونے کے گھر سے زیادہ قیمتی، میں تو یہیں
رہوں گی، شیر، شیرنی، ماموں، مامی تم جاؤ"

مگر شیر شیرنی بولے، مالنچ اب بھی کہو تو ہم راجہ کا محل اجاڑ دیں، راجہ کو چیر پھاڑ ڈالیں، راجکماری کو کھا ڈالیں، اور تمہارے چندر مانک کو تمہیں دلا دیں، مالنچ ان کی باتیں سن کر تلملا گئیں اور بولیں، شیر، شیرنی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو تمہاری مت ماری گئی ہے کیا؟ تم مجھ ہی کو کیوں نہیں کھا جاتے؟ اگر مجھے لونڈی باندی کی طرح کام کرنا پڑے، گوبر اٹھانا پڑے، تو بھی میں اسی گھر میں رہوں گی، ماموں، مامی میں منتی کرتی ہوں، تمہارے پیر پڑتی ہوں، تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ، میں تمہارے پیروں کی خاک لیتی ہوں، شیروں نے کہا اب کیا کریں، مالنچ تو ہماری بات مانتی ہی نہیں، اچھا چلو تھوڑے دنوں کے لئے کہیں چلے جائیں، شیر چلے گئے تو راجہ کو اطمینان ہوا، انہوں نے حکم دیا کوتوال کی لڑکی دن رات پھاٹک پر آنسو بہا کر نحوست پھیلاتی ہے، اسے نکال دو، راجہ کے آدمی کوتوال کی لڑکی اور کوتوالنی کو دور بہت دور نکال آئے، ماں بیٹی روتی آنسو بہاتی ادھر ادھر پھرنے لگیں، ماں کہتی بیٹی! ایسی زندگی گذارنے سے کیا فائدہ، چلو تالاب میں ڈوب مروں! اور ماں نے تالاب میں ڈوب کر جان دے دی، مالنچ آہ و زاری کرتی رہیں

گیت

"ماں جان نہ رو، مجھے اکیلا نہ چھوڑو، مجھے مرنے سے دکھ
ہوتا ہے، میں کیسے مروں، ماں، مرنے سے پہلے میں نے
اپنے سسر کا منہ تو دیکھا ہی نہیں، اپنے چندر مانک کا پیارا
چہرہ تو دیکھا ہی نہیں، میں کیسے مرسکتی ہوں"۔

مالنچ اپنی تنہائی سے اکتا کر جہاں بھی ڈوبنے جاتیں　وہاں دیکھتیں کہ ان کے سسر نے کہیں تو تالاب کو جھاڑ جھنکار سے بھروا دیا ہے، کہیں مٹی سے پاٹ دیا ہے، اور کسی کے چاروں طرف پہرے بٹھا دئے ہیں، مالنچ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہیں بار دیں، ان کے سسر تو انہیں دکھ کا بوجھ بھی نہیں پھینکنے دیتے، نہیں پھینکنے دیتے تو نہ پھینکنے دیں، مجھے دنیا میں دکھ دینے والا بھی تو اور کوئی نہیں ہے۔

محل کے پھاٹک پر ایک پہر پر ڈنکا بجتا تھا، مالنچ ڈنکا بجتے وقت ایک ایک دو دو قدم محل کی طرف بڑھنے لگیں، ڈنکے کی آواز کی وجہ سے ان کے قدموں کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، وہ رسان رسان بڑھتے بڑھتے اس کمرے کے پاس پہنچ گئیں جہاں راجکمار اپنی دلہن کے ساتھ سو رہے تھے، انہوں نے چپکے سے دروازہ کھولا تو دیکھا چودھویں کے چاند کی حسین کمیت ہے، کمرے میں گھی کے آٹھ دیئے جل رہے ہیں، سارا کمرہ جگمگا رہا ہے، اور سونے کے پلنگ پر سنہری جھالر والے بچھونے پر راجکمار اور ان کی دلہن چاندنی میں پھولوں کی طرح سو رہے ہیں، مالنچ ان کو دروازہ پر کھڑے کھڑے دیکھتی رہیں، کمرے کے اندر آ کر دیکھتی رہیں، ائتیاں، دبے پاؤں آ کے دیکھتی رہیں، سرہانے سے دیکھتی رہیں، پائنتی کھڑے ہو کر دیکھتی رہیں، وہ رات بھر انہیں یونہی دیکھتی رہیں، پھر بھی ان کا جی نہ بھرا، آہ! کتنی شوبھا ہے، بے بھگوان ایسے شاندار راجکمار کو تم نے کوتوال کی ذلیل لڑکی داں دی تھی، مالنچ دونوں کو دیکھتی رہیں، مالنچ کے بال بچھونے پر بکھر گئے، ان کی سانسوں سے بچھونے کی کلیاں کھل اٹھیں، ان کی خوشی کے آنسو موتیوں کی طرح برستے رہے، صبح ہونے لگی، کوے کائیں کائیں کرنے لگے، مالنچ نے پوتر تھالی سے تھوڑی سی دوب اور چاول کے دانے لئے، اپنے دو بال توڑے، اور کاجل کی لکیر سے چھلا کر سوامی کے پیروں کے پاس رکھ کر آہستہ آہستہ گانے لگیں۔

گیت

راجکمار راجکماری خوش رہو، شاد رہو، دلہن کے کمرے کے دیئے
پشتوں جلتے رہیں، ہمیشہ ہمیشہ چتر سایہ کئے رہے، اے
جنگل، اے درختو، اے زمین، اے پانی، اس گھر کی رکھوالی
کرتے رہنا، اس محل کی برجیاں سدا اونچی رہیں، چاند سورج
کی کرنیں ہمیشہ ہمیشہ محل کے کلس پر برستی رہیں، میرے سوامی کا

دلہن برابر ملاقات ... نیچ کا نشان بنا رہے، اچھا ہی
اپنے ساتھی کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم رہے، میں نے سوانی
کتنی تکلیفیں اُٹھا کر اتنا بڑا کیا ہے۔ آج انہیں دیکھ کے
میرا دل خوشی سے بھرا جا رہا ہے، میں پانی میں بھی ہو جاؤں
تو بھی انہیں دیکھ کے خوش ہوتی رہوں گی، میں جانور ہو جاؤں
پرندہ ہو جاؤں تو بھی انہیں دیکھنے آیا کروں گی۔"

مالن ہر رات کو اسی طرح آتی رہی، اس طرح آتے آتے تین راتیں گذر گئیں، چوتھی رات کو مالن نے گنگنانا شروع کیا تھا کہ راجکمار کی آنکھ کھل گئی، وہ اُٹھ بیٹھے اور پوچھا، تم کون ہو جو ہمارے کمرے میں گنگنا رہی ہو؟ مالن نے کہا میں وہی ہوں جسے اس کمرے میں آنے کا حق ہے، راجکمار مجھے معاف کریں میں نے شاید آپ کو نیند میں جگا دیا، میں من کی داسی ہوں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے آپ سو جائیں، راجکمار بولے تم داسی ہو؟ سچ بتاؤ ورنہ یہ تلوار دیکھتی ہو۔

گیت

"دیکھو اگر تم داسی ہو تو میں نے مالن کے باغ میں جو چہرہ
دیکھا تھا وہ کیوں دکھائی دے رہا ہے، میرے انگ
انگ سے خوشیاں کیوں پھوٹی پڑ رہی ہیں، میرے
خون میں جوار بھاٹا کیوں برپا ہے، مجھے تو یاد پڑتا ہے اپنی
کومل ہاتھوں نے مجھے بڑا کیا ہے۔"

"تم اور داسی؟ یہ اس سے کہو جو جانتا نہیں ہو، تم جو ہو سو میں جانتا ہوں، آج سچ سچ بتاؤ تم میری کون ہو؟" "دیکھو کہ سورج کی پہلی کرنیں چمکنے لگی ہیں آج میں کچھ نہیں بتا سکتی، میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔" مالن جانے کے لئے مڑ گئیں، چندر سائک نے اُن کا دامن تھام لیا، میں بغیر سُنے تم کو نہیں جانے دوں گا، مالن نے سر جھکا کر کہا آپ زیادتی کر رہے ہیں، یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پہرہ دار سپاہی دوڑتے بھاگتے وہاں آگئے، خود راجہ بھی وہاں آ پہنچے، سب کے ہونٹوں پر یہی تھا، دلہن کے کمرے میں کون گیا، آنگن میں کس کے پیروں کے نشان ہیں، چھیوں دن تو مالن صبح ہی صبح لوٹ گئی تھیں، انہوں نے جاتے وقت قدموں کے نشان مٹا دیے تھے، لیکن آج اُن کے قدموں کے نشان دیکھ لئے گئے تھے سپاہی پیارے دلہن کے کمرے تک آگئے، کمرے کا دروازہ کھولا گیا، ایک عجیب قسم کی روشنی کمرے سے نکل رہی تھی، سب کی آنکھیں چوندھیا گئیں، راجہ بھی روشنی کی تاب نہ لا سکے، انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے پوچھا "تم کون ہو؟" راجکمار نے جواب دیا "پتا جی یہ رانی کوتوال کی لڑکی ہیں!" راجہ کے منہ سے نکلا "کوتوال کی لڑکی؟" راجکمار نے کہا "پتا جی اگر یہ کوتوال کی لڑکی ہیں تو پھر ان سے پوچھئے اچھے سلوک کا کون مستحق ہے؟" راجہ نے کہا "بیٹیا! اس سے کہہ دو یہ پھر کبھی یہاں نہ آئے جس رستہ سے آتی ہے اسی رستہ سے چلی جائے۔" مالن جو کچھ کہنا چاہتی تھیں وہ نہ کہہ سکیں، اور جس راستہ سے آئی تھیں اسی سے واپس چلی گئیں۔

مالن تو چلی گئیں، مگر محل پر آفتیں نازل ہونے لگیں، ایک دن اس کا پھاٹک گر گیا، دوسرے دن اس کے کلس ٹوٹ گئے، آج یہ گرا کل وہ گر گیا، دن بدن تباہی آتی رہی، ہوتے ہوتے بارہ برس گذر گئے، راجکمار کے سات لڑکے ہوئے اور ساتوں کے ساتوں جاتے رہے، راجہ نے کہا یہ کارستانی اسی چڑیل کی ہے، اسی جادوگرنی کا کام ہے؟ ساتویں یا آٹھویں روز راجہ جس طرف بھی جاتے وہاں پھول کھل اٹھتے، جہاں رکتے وہاں شہنائیاں بجتی سنائی دیتیں، ان کی آنکھیں راج محل کے پھاٹک کی طرف اٹھ گئیں، وہ آپ ہی آپ اپنی اصلی حالت پر آ گیا تھا، راجہ کے ساتوں پوتوں نے آن کر راجہ کو گھیر لیا، راجہ تعجب سے کہنے لگے یہ کیا ماجرا ہے؟ راجکمار نے کہا یہ اسی کوتوال کی لڑکی کے کام ہیں، وہ توڑ بھی سکتی ہیں اور بنا بھی سکتی ہیں۔" راجہ گرجے "سب جھوٹ! اگر وہ مرے ہوؤں کو زندہ کر سکتی ہے، تو پہلے اپنے ماں باپ کو زندہ کرتی۔" راجہ اپنے دربار میں پہنچے، کوتوال سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، اور بولا راجاؤں کے راجہ پرنام! رانی اپنے دالان میں بیٹھی تھیں کہ کوتوالنی آئیں کہنے لگیں "بہت دنوں تک ہم ساتھ رہے ہیں آج ملنے آئی ہوں"۔ راجہ یہ سب دیکھ کر بہت حیران ہوئے، کہنے لگے یہ سب کیا ماجرا ہے، میرا دماغ چکرایا جاتا ہے۔ مجھے ضرور تازی ہوا میں سانسیں لینا چاہئیں، میں جنگل میں شکار کھیلنے جاؤں گا، اپنے دماغ کو تازہ کروں گا، راجہ لاؤ لشکر لے کر شکار کھیلنے نکلے، جنگل میں شیر ان کے لاؤ لشکر کو کھا گئے، راجہ راستہ بھول گئے اور جنگل میں بھٹکتے پھرے۔ پھرتے پھرتے ان کو پیاس لگنے لگی، اُن کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے، مگر پانی کہیں بھی دکھائی نہ دیا، راجہ تھک ہار کر ایک سوکھے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے، وہ بیٹھے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں، ایک خوبصورت لڑکی کمر پر کلسی رکھے چلی آ رہی ہے، راجہ نے دیکھتے ہی کہا بیٹی تم کون ہو؟ اگر تمہاری کلسی میں

پانی ہو تو پلا کر میری جان بچا۔ تو لڑکی بولی مہاراج میرے پاس پانی تو نہیں ہے، ہاں دودھ ضرور ہے، راجہ بولے دودھ! دودھ سے کہیں پیاس بجھتی ہے، اگر پانی ہو پیاس بجھا کر جان بچا۔ خوبصورت لڑکی ہنس پڑی اور کلسی سے پانی پلایا، جب راجہ نے جی بھر کر پانی پی لیا تو کہا بیٹی! جو ہو سو ہو، تم اپنے سسر کے گھر کو روشنی بخشتی رہو، جیسا تم نے مجھے پانی پلا کر خوش کیا ہے، ویسے ہی تم بھی سکھی رہو، مالنچ نے کلسی زمین پر رکھ دی، اور آگے بڑھ کر قدموں کی خاک لی، اور بولیں۔

گیت

سسر مہاراج! آج میں اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں ہو سکتا، آج میری قسمت جاگ گئی ہے، آج مجھے آپ کے منہ سے میٹھے بول سنائی دیئے ہیں، آج اگر میں مر بھی جاؤں تو خوشی سے میری جان نکلے گی، آج مجھے ... کی دھول دیجئے،

تو کون ہے بیٹی! کوتوال کی لڑکی مالنچ ہے؟ راجہ نے تین بار گلے سے لگا لے کر مالنچ کے ماتھے پر چوما، اور کہا بیٹی! تم میرے گھر چلو، مالنچ گیت گانے لگیں

گیت

میں میر گھر ہے، آج تم نے مجھے بیٹی کے نام سے پکارا ہے،
یہ جگہ میرے لئے سورگ ہے، جو میں چاہتی تھی وہ مجھے مل
گیا، جہاں تمہارے قدم پڑے ہیں وہاں میں اپنی کٹیا بناؤں گی
میں اسی میں رہوں گی اور کہیں نہیں جاؤں گی"۔

راجہ کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے بچی! نادانی میں میں نے تجھ جیسی گنوا دی، تو تکلیفیں پہنچائی ہیں، تو نے بھی بھلا کر میرے گھر چل، مالنچ بولیں یہاں مجھے آپ نے پیار سے پکارا، میں نے آپ کے منہ سے میٹھے بول سنے ہیں یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں، راجہ نے کہا بیٹی!—

معاف کرو، اور میرے ساتھ چلو، مالنچ بولی سسر مہاراج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں، اتنا کہہ کر وہ راجہ کے پیروں پر گر پڑی، اور قدموں کی خاک لے کر اپنی پیشانی پر ملی اور بولیں بابا میں صرف دو چار روز اس جنگل میں رہنا چاہتی ہوں میں اپنے ماموں، ساتھی اور مالن خالہ کی خبر خبر لوں گی، جب مجھے معلوم ہو جائے گا وہ کیسے ہیں تو پھر میں آ جاؤں گی، راجہ نے کہا اچھا میں تالاب بنواؤں گا، سڑک بنواؤں گا اور دوسری تیاری کر رکھوں گا، تم اس طرف سے اپنے ماموں، ساتھی کو لے کر آنا، اتنا کہہ کر راجہ روانہ ہو گئے، جب راجدھانی پہنچے تو انہوں نے اپنے خزانے کے دروازے کھول دیئے

خوب زر و جواہر لٹاتے، جنگلوں میں راستے بنواتے، تالاب بنواتے، جگہ جگہ خیمے لگوائے، سڑکوں پر گلال چھڑکوائے، دونوں طرف بانٹنے کے لئے کوڑیوں کے ڈھیر لگوائے اور اپنا لاؤ لشکر اور ساتوں پوتوں کو لے کر پھاٹک پر مالنچ کا انتظار کرنے لگے،

راجہ تو وہاں انتظار کرنے لگے اور مالنچ بن بن پھرتی رہیں، پھرتے پھرتے وہ کیا دیکھتی ہیں کہ ماموں ساتھی مالنچ مالنچ پکار پکار کر ان کے غم میں گھلے جا رہے ہیں، انہوں نے ان کو ساتھ لیا اور مالن کے یہاں پہنچیں، وہاں وہ کیا دیکھتی ہیں کہ مالن ان کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی ہیں، پتھر سے سر پھوڑ رہی ہیں اور آنسو بہا رہی ہیں، مالنچ نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے، اور سب کو ساتھ لے کر وہ دودھ برن کے محل میں پہنچیں، محل سنسان ویران پڑا تھا، نہ وہاں کوئی وارث تھا، نہ کوئی دیا جلانے والا تھا، اس کی حالت دیکھ کے اس کے آنسو نکل آئے، چودھویں رات کو انہوں نے اپنی ساڑھی کے آنچل سے دھجیاں پھاڑیں، ان کی بتیاں بنائیں، اور سات گھی کے دیئے جلا دیئے، اور بڑے ہال میں راجہ کے آسن پر جوگن بن بیٹھ گئیں، تین دن اور تین راتیں گذر گئیں، اور وہ وہاں ایک طرح سے بیٹھی رہیں، تیسرے دن شام کو اچانک محل کا دروازہ کھل گیا، اور جو بن جگہ شیر کے پیٹ میں گیا تھا، وہ وہاں زندہ ہو گیا، مالنچ نے راجہ، راجہ کے ساتوں لڑکوں کو ساتھ لیا اور وہاں سے چل پڑیں، راستہ میں جہاں پالکی کے لئے ادھر لیا تھا وہ ادھار ادا کیا، جہاں جہاں راجہ کے سپاہیوں کو شیروں نے کھایا تھا وہاں وہاں سات دیوؤں کا گھی چھڑک کر ان کو زندہ کیا، ہر طرف شور و غل اور ہلچل مچ گئی، وہ چلتی رہیں چلتی رہیں، چلتے چلتے جب سات دن کا راستہ رہ گیا تو لوگوں نے جان لیا کہ مالنچ آ رہی ہیں،

جب مالنچ محل کے پھاٹک کے قریب پہنچنے لگیں تو نقارے زور زور سے بجنے لگے، تالابوں میں پھول کھل کر ناچنے لگے، سپاہی، پیادے، پہرہ دار، درباری سب ہی یہاں تک کہ راجہ رانی بھی جے جے کے نعرے لگانے لگے۔
کوتوال کی لڑکی مالنچ آج اپنی سسرال میں قدم رکھ رہی تھیں،

قدم رکھ رہی تھیں، کوتوال آئے، کوتوالنی آئیں، دھارا، تارا، بدھاتا اور جتنے دیوتا تھے وہ آسمان پر چراغاں کر کے آئے، جتنے بھی لوگ، دیوتا، ماں، باپ ساس، سسر، نند، بلا، باری، چرندے، پرندے، درندے تھے ان میں سے کسی نے مالنچ کے سر پر دوب رکھی، کسی نے مالنچ کے چرنوں کی خاک لی، جشنوں اور خوشیوں سے سارا محل گونج اٹھا، پکشی راج دوڑتا ہوا راجہ کے پاس آیا، اور بولا، مہاراج جتنے

گھوڑے میں نے مارے تھے آج سب کو زندہ کر دیا۔ مانیج نے پیارے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا۔ پکھی راج خوشی سے ہنہنایا۔ اُڑتا سارے دیس کا چکر لگا آیا۔ اور بولا مہاراج بارہ برس میں جن جن کو مارا تھا آج وہ زندہ ہو گئے۔ مہاراج نے حکم دیا کہ مانیج کے اعزاز میں نقارے بجتے رہیں۔ حکم دینا تھا کہ مانیج کے نام کے ڈنکے بجنے لگے، سارا دیس جے جے سے گونج اٹھا۔

مانیج کانچی کے پاس جا کر بولا آج ایک بار پھر ہار دو۔ کانچی نے ہار تیار کر دیا۔ مانیج نے وہ ہار اپنے رمانی کے گلے میں ڈال دیا اور کانچی کو سینے سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔ ہنسی خوشی کے نغموں اور شادیانوں سے محل گونجتا رہا۔ سات دن اور سات رات غریب غربا کھیر کھسن اور ٹکی اڑاتے رہے۔ تمام شیر راجہ کے دشمنوں کے لشکر کا صفایا کر آئے۔ اور پانی اپنے راج میں آن کر رہا۔ ان کو سونے کے سونے کے تخت دیئے گئے۔ راجہ نے کوتوال کو سینے سے لگا کر بھائی اور دوست بنا لیا۔ اُن کو جاگیریں دے کر خاص سردار بنایا۔ راجہ شیروں کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ شیر اس بات سے بہت خوش ہوئے۔ اور خوش خوش رخصت ہوئے۔ مالن نے اپنے لئے نیا ایک باغ تیار کر لیا۔ دودھ برن راجہ کچھ عرصہ رہ کر پھر اپنے راج چلے گئے۔

مانیج نے کانچی کو بڑی رانی بنا دیا۔ مگر دیس کے لوگوں نے مانیج کو اپنے دلوں میں جگہ دے کر ٹھاکرانی بنا لیا۔ دیوتا، انسان، چرند، پرند، پتنگے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ دنیا اور آسمان کے سب دیوتاؤں نے آشیرباد دی، اور پھر سورج اور چاند کی سنہری کرنیں محل کے کلسوں پر سونا لٹانے لگیں۔ راجہ چندر، راجکمار اور راجکمار کے لڑکوں نے آم کے درخت اور کوتوال کے گھر تک عمدہ عمدہ عالیشان سڑکیں بنوائیں۔ ان کو سونے، چاندی، ہیرے جواہرات سے آراستہ کر دیا اور ہنسی خوشی راج کرتے رہے۔

(دکھنا رنجن مجمدار کی ٹھاکر دادار جھولی سے)

لوک کہانیاں (بسلسلہ صفحہ ۲۳۵)

لال بہاری دے نے بھی Folk TALES OF BENGAL کے نام سے انگریزی میں پیش کی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں دنیش چندر سین نے ——— Folk Literature of Bengal کے نام سے اپنے لیکچروں کا مجموعہ شائع کیا، جن میں لوک کہانیوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

مشرقی پاکستان میں شاید سب سے پہلے ادارہ مطبوعات پاکستان ڈھاکہ نے "پورب پاکستانیر لوک گیتیکا" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں لوک کہانیاں شائع کی ہیں، ان کو تحریری شکل میں پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر شہید اللہ، محبوب العالم، ابوالفضل اور ڈاکٹر عبدالحئی وغیرہ صاحبانِ علم و فضل بھی ہیں مگر اس کے ساتھ کوئی مقدمہ یا تعارفی نوٹ نہیں ہے جس سے ان کہانیوں کے ماخذوں اور دوسری باتوں پر روشنی پڑ سکتی۔ اشرف صدیقی پہلے شخص ہیں جنہوں نے امریکہ جا کر خاص مضمون کی حیثیت سے لوک ثقافت کا مطالعہ کیا اور انگریزی زبان میں "ٹمبل واس اور ٹنٹنی" کے نام سے پاکستانی لوک کہانیاں اور Bengali Riddles کے نام سے پہیلیاں جمع کی ہیں، ۱۹۶۰ء میں کوی جسیم الدین نے "دی بنگالیر ہاسیر گلپ" کے نام سے مزاحیہ کہانیاں پیش کی ہیں، انہوں نے بھی یہ کہانیاں مختلف افراد سے سنی ہیں،

* * *

سعد منیر

پاکستانی طوطے کی کہانی

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک جنگل میں ایک غریب چڑی مار چڑیوں کی تلاش میں حیران پریشان مارا مارا پھر رہا تھا، اسے صبح سے کوئی چڑیا پکڑائی نہیں دی تھی، اُس کا دل بہت اداس تھا۔ پھر بھی وہ پھرتا ہی رہا، پھرتے پھرتے اس نے دیکھا کہ ایک بڑا ہی خوبصورت طوطا ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہے، وہ اسے پکڑنے کے لئے جو آگے بڑھا تو وہ آسانی سے ہاتھ آگیا چڑی مار خوشی خوشی اسے اپنی بیوی کے پاس لے آیا۔ چڑی مار کی بیوی اسے پکانے کی تیاری کرنے لگی، جیسے ہی چھُری اس کی گردن پر پھیری جانے لگی وہ طوطا بول اٹھا، یارو! مجھے مارو نہیں، بلکہ بادشاہ کے پاس لے چلو اور اس کے ہاتھ بیچ ڈالو۔

چڑیمار اور اس کی بیوی نے جو اسے بات کرتے دیکھا تو وہ حیرت میں ڈوب گئے مگر ان کے کانوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا، طوطا پھر بولا مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو میں تم کو دولت مند بنا دوں گا۔“

شام کو چڑیمار اور اُس کی بیوی طوطا لے کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور اس کو بیچنے کے لئے پیش کیا بادشاہ کو خوبصورت چیزیں بہت بھاتی تھیں طوطا اُس کی نظروں میں کھب گیا اس نے چڑیمار سے پوچھا تم اس طوطے کی کیا قیمت لوگے، چڑی مار نے کہا طوطا خود ہی بتا دے گا، طوطے نے کہا آٹھ ہزار روپے، جہاں پناہ! مناسب قیمت ہے نا؟

بادشاہ نے جو طوطے کو بولتے سُنا تو وہ اتنا حیران ہوا، اتنا حیران ہوا کہ بہت دیر تک اُس کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکلی، آخر اُس کے منہ سے نکلا ــــ اگر یہ کوئی فریب ہے تو طوطے جان رکھ! تیرا خوبصورت سر اڑا دیا جائے گا، اور اگر یہ کوئی فریب نہیں ہے تو پھر تو میرا بڑا قیمتی ساتھی بن جائے گا۔ بادشاہ کے حکم سے خوش قسمت چڑیمار کو آٹھ ہزار روپے دیدیئے گئے، اور چڑیمار اور اُس کی بیوی خوشی سے ناچتے اچھلتے اپنے گھر لوٹ گئے۔

اب کیا ہوا کہ بادشاہ کو جو ایک بولتا پرندہ ہاتھ آیا تو وہ اتنا خوش ہوا کہ ہر چیز سے غافل ہوگیا یہاں تک کہ اپنی چھ ملکاؤں سے بھی غفلت برتنے لگا، وہ طوطا ہر بات اور ہر مضمون پر بڑی سمجھداری کی باتیں کیا کرتا اور جب اس نے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے نام گنوا دیئے تو بادشاہ کی حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی، بادشاہ اس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا، ملکاؤں نے جو یہ دیکھا تو وہ رشک و حسد سے طوطے سے جلنے لگیں، انہوں نے اس کا کام تمام کرنے کی ٹھان لی،

بہت جلد ان کو موقع بھی ہاتھ آگیا، بادشاہ کو ایک نہایت ضروری کام سے پڑوس کی ریاست میں جانا پڑا وہ طوطے کو ایک پنجرے میں بند کرکے محل ہی میں چھوڑ گیا۔ چھیوں ملکاؤں نے آپس میں صلاح کی اور یہ طے کیا کہ وہ طوطے سے یہ پوچھیں کہ ان میں سب سے زیادہ بدصورت کون ہے اور جیسے ہی وہ کسی کا نام بتلائے ویسے ہی اُس کی گستاخی پر اس کی گردن مروڑ دی جائے، ملکائیں یہ سازش کرکے طوطے کے پاس پہنچ گئیں لیکن ابھی وہ پوچھنے بھی نہ پائی تھیں کہ طوطے نے ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے نام جپنا شروع کردیئے۔ ملکائیں اس کی پارسائی سے بہت متاثر ہوئیں، انہیں اس پر ترس آگیا اور اپنی خوفناک سازش سے باز آگئیں، مگر جلد ہی اُن کا حسد پھر بھڑک اٹھا، انہوں نے تہیہ کرلیا اب کے وہ طوطے کو ضرور مار ڈالیں گی، وہ طوطے کے پاس پہنچیں اور اس سے پوچھنے لگیں، طوطے، طوطے تو تو بڑا عقلمند اور دانا ہے ذرا یہ تو بتا ہم میں سے کون سب سے زیادہ بدصورت ہے؟

طوطا تو یہ جانتا ہی تھا کہ ملکاؤں کی نیت اچھی نہیں ہے، وہ

ہوشیاری سے بولا پہلے مجھے پنجرے سے تو نکالئے، جب تک میں پاس سے ہر ایک کو نہ دیکھوں ٹھیک ٹھیک کیسے بتا سکتا ہوں، ملکاؤں نے سب دروازے کھڑکیاں بند کرکے طوطے کو پنجرے سے کھول دیا۔ طوطا باہر نکل کر باری باری سے ہر ایک ملکہ کے پاس آہستہ آہستہ گیا اور اسے غور سے دیکھتا رہا، اس بہانے وہ دراصل نکل بھاگنے کا راستہ معلوم کرنا چاہتا تھا، دیکھتے دیکھتے اس کی نظر دیوار کے ایک شگاف پر جا پڑی وہ اس کی طرف رساں رساں بڑھتا گیا، جب وہ شگاف کے بالکل ہی قریب پہنچ گیا تو کہنے لگا میری خوبصورت ملکاؤ، ایک شہزادی ہے جو چار سمندر اور سات دریاؤں کے پار رہتی ہے خوبصورتی میں تم میں سے کوئی بھی اس کی جوتی کے برابر بھی نہیں، ملکائیں بھلا یہ کیسے برداشت کرسکتی تھیں چھیوں کی چھے اس غریب طوطے پر جھپٹ پڑیں لیکن دانا طوطا اُن کا وار خالی دے کر شگاف سے باہر نکل گیا۔

اب کیا ہوا کہ جب بادشاہ اپنے سفر سے واپس آیا اور اس نے اپنا پیارا طوطا موجود نہیں پایا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا بہت دنوں تک وہ آنسو بہاتا رہا، اس نے چہار طرف ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو اس کا پیارا طوطا لائے اسے انعام سے مالا مال کردیا جائیگا، خدا کا کرنا وہ طوطا ایک خوش قسمت چڑی مار کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اسے محل میں واپس لے آیا۔ بادشاہ نے اُسے انعام سے مالا مال کردیا، طوطے نے ملکاؤں کی سازش کا حال بادشاہ سے بیان کردیا بادشاہ نے چھیوں ملکاؤں کو شہر بدر کردیا۔

ایک دن بادشاہ اپنے کمرے میں رونق افروز تھا حسب معمول طوطا بھی پاس ہی موجود تھا، باتوں باتوں میں بادشاہ نے پوچھا اے طوطے تو نے ملکاؤں سے کسی شہزادی کا ذکر کیا تھا خوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اگر یہ سچ ہے اور ایسی شہزادی موجود ہے تو تو مجھے اس کے پاس لے چل، طوطا بولا جہاں پناہ ایسی شہزادی تو سچ مچ موجود ہے اگر آپ جو میں کہوں وہ کریں تو وہ شہزادی آپ کی ہوجائے گی۔ مگر اس کے لئے بہت دور کا سفر کرنا ہوگا، آپ ایک اڑنے والے گھوڑے کا پہلے انتظام کیجئے پھر چاندی کے بہت سے بٹن بنوائیے، بادشاہ کے حکم سے دونوں چیزیں تیار ہوگئیں۔ بادشاہ اڑنے والے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور طوطا اس کے کندھے پر بیٹھ گیا، اُڑنے سے پہلے طوطے نے پھر کہا جہاں پناہ ایک بات اور یاد رکھئے، آپ جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی گھوڑے کو صرف ایک ہی بار چابک ماریں، اگر کہیں آپ نے اس کو ایک سے زائد بار چابک ماردی تو پھر ہم لوگ بیچ راستہ ہی میں مصیبت میں گھر جائینگے۔

بادشاہ نے طوطے کی بات مان کر آہستہ سے گھوڑے کو چابک لگا دی، چابک کا لگنا تھا کہ گھوڑے نے زمین سے ایک زقند لگائی اور رات کے آسمان پر بلند پرواز ہوگیا۔ اُڑتے اُڑتے انہوں نے چار سمندر اور سات دریا پار کئے اور چوبیس گھنٹے کے بعد حسین شہزادی کے محل کے قریب زمین پر اُتر گئے۔ طوطے کی ہدایت کے مطابق بادشاہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اب طوطے نے کیا کیا کہ چاندی کے جتنے بٹن تھے وہ اُس نے ایک ایک قدم کے فاصلہ سے شہزادی کے محل کے پھاٹک تک بکھرا دیئے۔

تھوڑی ہی دیر میں خوبصورت شہزادی بڑی نفیس زعفرانی پوشاک پہنے باہر نکل آئی اور رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں گلگشت کرنے لگی، آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ جوں ہی شہزادی آگے بڑھی اس کی نظر چاندنی میں چمکتے ہوئے چاندی کے ایک بٹن پر جا پڑی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھی تو اُسے دوسرا بٹن دکھائی دیا، پھر تیسرا دکھائی دیا، اب تو شہزادی کا اشتیاق بڑھ گیا اور وہ بٹنوں کی راہ پر آگے بڑھتی رہی، بڑھتے بڑھتے وہ جھاڑی کے پاس جا پہنچی۔ جب وہ جھاڑی کے بالکل قریب پہنچ گئی تو بادشاہ جھاڑی کے پیچھے سے جھپٹ کر نکلا اور جلدی سے شہزادی کو اٹھا کر اس جگہ لے گیا جہاں طوطا اور اڑنے والا گھوڑا انتظار میں کھڑے تھے، اور گھوڑے پر سوار ہوکر ہلکا سا چابک رسید کردیا۔ گھوڑے نے اپنے بازو پھیلائے اور کالی رات کی فضاؤں میں اوپر اُڑا، اب کیا ہوا کہ بادشاہ اپنے محل میں جلد پہنچنے اور حسین شہزادی کو دیکھنے کے لئے اتنا بیتاب ہوا کہ اس نے گھوڑے کو ایک اور چابک رسید کردی، دوسری چابک لگنا تھی کہ گھوڑے کے بازو سمٹ گئے اور وہ پتا نہراتا نیچے ایک گھنے جنگل میں آگرا۔

طوطا چیخا جہاں پناہ یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ آپ نے میری بات نہ مانی، اب گھوڑے کی طاقت لوٹنے میں چھ مہینے لگیں گے، وہ بھی اس وقت جب اُسے عمدہ سے عمدہ دانہ کھانے کو ملے گا۔

اب تینوں کے تینوں سنسان ویران جنگل میں پھنس کے رہ گئے۔ وہ بہت دیر تک اپنی مصیبت پر آنسو بہاتے رہے۔ آنسو بہاتے بہاتے اُن کی آنکھ لگ گئی۔

اب کیا ہوا کہ اس ملک کا شہزادہ جنگل میں ہرنوں کا شکار کرتا پھر رہا تھا، پھرتے پھرتے وہ اُس جگہ آن نکلا جہاں یہ تینوں پڑے سو رہے تھے، اس شہزادے نے جو اتنی حسین اتنی خوبصورت لڑکی کو دیکھا تو وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا، اس نے اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا کہ وہ اُس حسین لڑکی کو اٹھا کر محل پہنچا دیں اور خود اس نے یہ کیا کہ طوطے کے آقا کی آنکھیں نکال لیں۔ غم کا مارا طوطا ایک درخت کی اونچی شاخ پر چھپا بیٹھا رہا اور ظالم شہزادہ کے واپس جانے کا انتظار کرتا رہا، اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ بادشاہ کے پاس رہے گا اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتا رہے گا۔

ظالم شہزادہ خوبصورت شہزادی کو اس کے محبوب کے پاس سے اُٹھوا کر اپنے محل لے آیا اور اس سے بیاہ رچانے کی فکر میں ہوا، شہزادی دل ہی دل میں روتی رہی اور شہزادے سے ایسی دانشمندی کی باتیں کرتی رہی کہ شہزادہ بہت خوش ہوا شہزادے کو جو اتنا خوش دیکھا تو شہزادی نے گھوڑے کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت مانگی، شہزادہ کو اس میں کوئی خطرہ نظر نہ آیا۔ اور اس نے قریب ہی ایک اصطبل بنوا دیا۔ اب شہزادی گھوڑے کو عمدہ سے عمدہ دانہ کھلانے لگی، کھلاتے کھلاتے چھ مہینے گزر گئے اور گھوڑے میں پہلے کی طرح طاقت آ گئی، گھوڑا تو طاقتور ہوگیا تھا مگر اب تک طوطے کی کوئی خبر نہ لگی تھی، اس سے ملے بغیر شہزادی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ شہزادہ محل کے باغ سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، کوئی ایسا بھی نہ تھا جس پر وہ بھروسہ کرتی اور اپنے دل کی باتیں کہہ سکتی، سوچتے سوچتے آخر اُسے ایک تدبیر سوجھ گئی اُس نے چڑیوں اور پرندوں میں دلچسپی لینی شروع کردی، وہ روزانہ محل کی چھت پر چلی جاتی اور دانہ ڈالتی رہتی، چڑیوں نے جو عمدہ اور نفیس دانہ وہاں دیکھا تو اُن کے جھنڈ کے جھنڈ آنے لگے اور دانہ چگنے لگے، شہزادی دن بھر بیٹھی اُن کو دیکھا کرتی، اُسے اُمید تھی کہ طوطا بھی اسی طرح ایک دن آجائے گا۔

اِدھر تو شہزادی یہ کر رہی تھی اور اُدھر یکسانیت کی وجہ سے بادشاہ اور طوطے کی زندگیاں بڑی ہی بے رنگ گزر رہی تھیں، دونوں تمام دن جنگل میں پھرتے رہتے اور وفادار طوطا بادشاہ کے لئے اچھے اچھے پھل اور میوے جمع کرتا رہتا اور اُسے کھلاتا رہتا۔ جب رات ہو جاتی تو دونوں صنوبر کی نرم نرم جھاڑیوں میں سو جایا کرتے، ایک دن کیا ہوا کہ جہاں طوطا بادشاہ کے لئے آلوچے توڑ رہا تھا وہاں ایک تالاب کے کنارے چڑیوں کا ایک غول پانی پینے کے لئے نیچے اُترا، طوطے کو جو آلوچے توڑتے دیکھا تو وہ ایک ساتھ کہنے لگیں۔ ارے میاں طوطے! یہاں کیا تکلیفیں جھیل رہے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو، ہر روز ایک نیک شہزادی اپنی چھت پر عمدہ عمدہ دانہ ڈالتی ہے، ہم میں کی ہزاروں وہاں جاتے ہیں اور خوب جی بھر دانہ کھاتے ہیں۔ اُس شہزادی کو اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

طوطے کو اس خبر سے بے انتہا خوشی ہوئی، اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ نیک شہزادی وہی ہوگی، وہ فوراً اس محل کی طرف چل دیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو وہی شہزادی وہاں موجود تھی، شہزادی نے بھی طوطے کو دیکھ لیا وہ جلدی سے اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ دونوں کے درمیان گھنٹوں باتیں کیا کئے، اور وہاں سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بناتے رہے شہزادی بولی پیارے طوطے! سب سے بڑا سوال تو اب تک حل نہیں ہوا ہے۔ بادشاہ ابھی تک اندھا ہے، چار سمندر اور سات دریاؤں کے پار جو میرا باغ ہے اس کے پھاٹک کے پاس ایک درخت ہے اس پر سبز اور سوسنی رنگ کی چڑیوں کے گھونسلے ہیں تم وہاں جانا اور ان کی بیٹ جمع کر لانا، طوطا فوراً اپنی مہم پر روانہ ہوگیا اور دوسرے دن وہ صحت بخش مرہم لے کر آگیا، اور اپنے آقا کی آنکھوں میں لگا دیا۔ ادھر کیا ہوا کہ شہزادی اڑنے والے گھوڑے پر محل سے بھاگ نکلی، بادشاہ کی جو آنکھیں کھلیں تو پہلی چیز جو اسے دکھائی دی وہ اس کی ہونے والی حسین و جمیل دلہن تھی۔ تینوں کے تینوں اُڑنے والے گھوڑے پر سوار ہو کر بادشاہ کے محل میں جا پہنچے کئی روز تک چہار طرف بڑی دھوم دھام رہی، خوب دعوتیں اڑیں اور خوشیاں منائی گئیں، اس کے بعد سے بادشاہ اور اس کی پیاری ملکہ ہنسی خوشی رہنے لگے، اور دونوں اس وفادار طوطے کو ہمیشہ جان سے لگائے رہے!

سعد منیر

بھمبل داس شیر ببر کا ماموں

سالہا سال کی بات ہے بنگال کے کسی دیہات میں ایک کسان رہتا تھا، اس کے پاس ایک بکرا تھا، وہ بکرا بہت بوڑھا ہو گیا تھا سب ہی جانتے ہیں جوں جوں بڑھاپا آتا جاتا ہے تجربے بڑھتے جاتے ہیں اور جوں جوں تجربے بڑھتے جاتے ہیں عقل بھی بڑھتی جاتی ہے، وہ بکرا بوڑھا تو تھا ہی اس لئے بہت تجربہ کار تھا۔ اکثر آدمی جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ڈاڑھیاں رکھ لیتے ہیں۔ ڈاڑھیوں سے تجربے ظاہر ہوتے ہیں نا، اس بکرے نے بھی ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی۔

وہ بکرا صبح ہوتے ہی جنگل کی طرف نکل جایا کرتا اور درختوں کی پتیاں اور گھاس چرتا پھرتا، چرتے چرتے جب شام ڈھلنے لگتی اور سورج جنگل کے پیچھے چھپنے لگتا تو وہ اپنے کسان کے گھر لوٹ آتا، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بکرا زیادہ گھاس اور پتیاں کھا جاتا، جس روز وہ بہت زیادہ کھا جاتا اس روز اس پر غنودگی چھانے لگتی اور وہ اونگھتے اونگھتے سو جاتا، اور جس روز وہ زیادہ نہ کھاتا اس روز اس کو نیند بھی نہ آتی اور وہ اپنی منڈیا اور اپنی دم ہلا ہلا کر مزے سے تانیں لگایا کرتا ؂

میں میں موں موں ماں ماں
کیا ہی اچھا تھا وہ کھانا
آہا آہا ای ہی ای ہی
کیا ہی اچھی دعوت کھائی

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بکرے کو بڑی ہی نرم نرم میٹھی میٹھی گھاس اور پتیاں کھانے کو مل جاتیں، جس دن ایسا ہوتا تو وہ خوش ہوتا، اور مارے خوشی کے اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر بے تحاشا ناچنا شروع کر دیتا، وہ ناچتا رہتا، تھرکتا رہتا اور گلے بازیاں کیا کرتا ؂

تا تا تھیا
تا تا تھیا
دن دن بھر
دن دن بھر
چھم چھم چھم
چھم چھم چھم
کی بڑھیا دعوت ہضم

وہ بکرا اسی طرح دن دن بھر کھاتا رہتا، گاتا رہتا، ناچتا رہتا سوتا رہتا اور جیسے ہی سورج ڈوبنے لگتا اپنے مالک کے گھر لوٹ آتا یہی اس کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ بکرا گھاس اور پتیاں کھاتے کھاتے جنگل کے دور کے حصہ میں نکل گیا، خدا کی شان وہاں کی گھاس بڑی ہی میٹھی بڑی ہی رسیلی تھی، بکرے کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا، وہ مزے سے چرتا رہا، چرتا رہا، چرتے چرتے وہ بہت سی گھاس کھا گیا، بہت زیادہ کھا گیا تو وہ اونگھنے لگا، اونگھتے اونگھتے اس پر نیند سوار ہو گئی، پھر تو وہ ایسا سویا ایسا سویا کہ اس کے خراٹے نکلنے لگے۔

خر خرات،
خ۔ رر رات
خر خارات،

بکرا سوتا رہا، سوتا رہا سوتے سوتے جب اس کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ رات ہو گئی ہے اور جنگل میں چہار طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے اور بڑے بڑے درختوں کے سائے بھائیں بھائیں کر رہے ہیں اب تو اس کے اوسان ہی جاتے رہے، وہ گھبرا گھبرا کر

ادھر اُدھر دیکھتا اور سوچتا اب میں گھر کیسے جاؤں، راستہ تو ملتا ہی نہیں، اسے اپنے آپ پر غصہ ہی تو آگیا۔

وہ مصیبت میں پھنسا ہوا راستہ کی تلاش کرتا رہا، مگر راستہ ملا تھا نہ ملا، وہ بیچارا بوڑھا تھا اور بڑھاپے نے اُس کی آنکھوں کی روشنی کم کردی تھی، اس لئے اُسے اندھیرے میں کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا،

بکرا حیران و پریشان راستہ ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کو ایک دم سے پہلے ایک خوفناک گرج سنائی دی اور پھر خطرناک غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ سارے کا سارا جنگل لرزنے کانپنے لگا۔ جیسے بھونچال ہی تو آگیا تھا۔ اس جنگل میں بڑے خونخوار شیر ببر، چیتے، بھالو اور درندے رہتے تھے۔

بکرے کی قسمت اچھی تھی اس کو قریب کی پہاڑی کے دامن میں ایک غار دکھائی دے گیا، وہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں رینگتا رینگتا اُس میں گھس گیا اور اپنی سلامتی کے لئے ہزار ہا دعائیں پڑھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنے لگا۔

اس غار میں ایک شیر رہا کرتا تھا، وہ شیر تھوڑی دیر بعد وہاں آن پہنچا، غار میں داڑھی والے سفید حضرت موجود تھے۔ خدا کا کرنا وہ شیر بھی بوڑھا تھا اُسے بھی ٹھیک سے سجھائی نہیں دیتا تھا اس لئے وہ دہاڑنے لگا۔

عالی جاہ کے مسکن میں کس نے گھسنے کی ہمت کی؟

بکرا خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا، اس نے سمجھ لیا موت آن پہنچی ہے، پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری، وہ کوئی چال تو چل ہی سکتا ہے، اُس نے سوچا ہمت والوں پر ہی قسمت مسکراتی ہے، اور ایک کہاوت بھی ہے

حاضر دماغی جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے،
شیر پھر طیش میں گرجا ـــــ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے؟
جلدی سے بولے نہیں تو . . . .

بکرا بھاری بھرکم سی آواز میں بولا ؎

میں ہوں شیر ببر کا ماموں
بھمبل داس ہے میرا نام
پچاس شیر ہوں ناشتہ میں
تب بنے ہے میرا کام

شیر ببر تو جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے، اور یہ حضرت شیر ببر کے ماموں ہیں، ان کا نام بھمبل داس ہے اور ناشتہ میں پچاس شیر کھاتے ہیں یہ سوچنا تھا کہ شیر دُم دبا کر بھاگا، وہ پودوں کو روندتا راندتا، درختوں کو توڑتا تاڑتا بھاگتا جاتا اور چیختا جاتا۔ باپ رے باپ، باپ رے باپ، یہ تو شیر ببر کا ماموں ہے پچاس شیروں کا ناشتہ کرتا ہے، شیر بھاگتے بھاگتے بے دم ہوا جا رہا تھا، اس کا سانس سینہ میں نہیں سماتا تھا، پھر بھی وہ بھاگے جا رہا تھا کہ ایک بندر کی نظر اس پر جا پڑی، اُس نے جو شیر کو یوں بھاگتے دیکھا تو پوچھا چچا جان! کیا ہوا جو آپ بچوں کی طرح بھاگے جا رہے ہیں؟ شیر نے دوڑتے دوڑتے ہی جواب دیا۔ کیا بتاؤں جان برادر! بھمبل داس نام کے ایک حضرت ہیں وہ شیر ببر کے ماموں ہیں، اور ناشتہ کرتے ہیں پچاس شیروں کا، اب شیر کا سانس پھول گیا، اس سے کچھ بولا نہ گیا، بندر نے جب یہ دیکھا تو شیر کو پانی پلایا، شیر اتنا تھک گیا تھا کہ اب اُس سے دوڑا بھی نہ جاتا تھا، تھوڑی دیر وہ سستاتا رہا، جب اس کی سانسیں ٹھیک ہوگئیں تو اس نے بندر کو بتایا کہ بھمبل داس نے میرے گھر پر قبضہ جما رکھا ہے۔

بندر کو شیر کے کہنے کا یقین نہ آیا، وہ بولا ضرور آپ سے کہیں غلطی ہوگئی ہے، چلئے ذرا چل کر دیکھیں تو،

مگر شیر میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ اُس کی بات مانتا، اُس نے سر ہلا کر کہہ دیا نا بابا! میں نہیں جاؤں گا، بندر نے اسے بہت پھسلایا، بہت اطمینان دلایا، بڑی مشکلوں سے شیر راضی ہوگیا اور دونوں کے دونوں غار کی جانب چل پڑے، بندر آگے آگے چلا، اور شیر اس سے دبک پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اب جو بکرے نے بندر اور شیر کو دیکھا تو اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑکنے لگا، اور وہ خوف سے سر سے پیر تک کانپنے لگا، اس نے سمجھ لیا کہ اب کے موت سچ مچ مجھے ہڑپ کر جائے گی، لیکن ابھی اس کے پاس داؤں کا ذخیرہ موجود تھا وہ دل ہی دل میں کہنے لگا ـــــ جب تک سانس تب تک آس۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۵ پر)

سعد منیر

آئینہ

ایک کسان اپنے کھیت میں دھان کاٹ رہا تھا، کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھ ایک آئینہ آگیا اس وقت تک اس دیس میں آئینہ کا چلن نہیں ہوا تھا، وہ آئینہ ایک کابلی کے تھیلے سے گر پڑا تھا کسان نے آئینہ اٹھالیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، اچانک وہ کیا دیکھتا ہے کہ آئینہ کے اندر ایک آدمی کی صورت دکھائی دے رہی ہے "آہ! آہا! یہ تو میرے ابا جان کا چہرہ ہے"،

کسان کا ابا بہت دن ہوئے مرگیا تھا، آج جب وہ کسان خود بڑا ہوگیا تھا اس کا چہرہ بالکل ابا جیسا ہوگیا تھا، جب لڑکے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے چہرے کچھ نہ کچھ اباؤں کے چہروں سے ملنے لگتے ہیں۔ کسان کو جو اپنا چہرہ آئینہ میں دکھائی دیا تو اسے گمان ہوا یہ اس کے ابا کا چہرہ ہے اس نے آئینہ کو سلام کیا اور پیشانی کے قریب لیجا کر چوما، "آہ ابا جان! آپ آسمان سے نیچے اتر کر دھان کے کھیت میں چھپ رہے، ابا جان! میرے ابا جان!! میرے ابا جان!!! کسان یہی کرتا جاتا اور آئینہ دیکھتا جاتا، آئینہ کے اندر اس کے ابا جان تاکے جاتے اور نہ معلوم کتنی حرکتیں کرتے جاتے تھے، کسان کہتا رہا — "ابا جان! آپ تو مرگئے، میں نے آپ کے کھیت میں سونا دیکھ دان اگائے ہیں لکھی نناؤں دھان اگائے ہیں دیکھئے دیکھئے ابا جان! دھوپ میں وہ کیسے چمک رہے ہیں آپ جب مرے تھے تو رہنے کیلئے صرف ایک جھونپڑا تھا، میں نے تین تین جھونپڑے بنائے ہیں، ابا جان! میرے پیارے ابا جان!! میرے بڑے اچھے ابا جان!!!

اس دن کسان نے دوسرا کوئی کام ہی نہ کیا، وہ آئینہ ہاتھ میں لئے لئے اپنے تمام کھیتوں میں گھومتا رہا، شام کو جو وہ گھر لوٹا تو اسے یہ فکر ہوئی کہ آئینہ کو کہاں رکھے، وہ غریب آدمی تھا، اس کے ہاں بکس صندوق کچھ بھی نہ تھا، آخر سوچتے اس نے آئینہ کو پانی کی کلسی میں چھپا کر رکھ دیا،

دوسرے دن کسان کبھی یہ کام کرتا، کبھی وہ کام کرتا، اور دوڑ کر گھر بھاگ آتا، پھر کبھی وہ ادھر جاتا اور پھر دوڑ کر گھر بھاگ آتا اور پانی کی کلسی سے آئینہ نکال کر طرح طرح کی باتیں کرتا رہتا — ابا جان! میرے ابا جان!! میں کبھی اس کام کو کرنے چلا جاتا ہوں کبھی اس کام کو کرنے چلا جاتا ہوں، اور آپ یہاں اکیلے رہ جاتے ہیں آپ خفا نہ ہوئیے گا ابا جان! دیکھئے ابا جان اگر ہم ٹھیک سے کام نہ کریں تو پھر کھائیں گے کہاں سے"؟

کسان کی بیوی نے یہ دیکھا تو اسے بڑی فکر ہوئی کہ ذرا دیکھو تو اتنے دنوں تک تو میرا میاں میرے ساتھ اچھی اچھی باتیں کیا کرتا تھا بڑے لاڈ پیار سے ہنس ہنس کر کبھی یہ مانگا کرتا تھا، کبھی وہ مانگا کرتا تھا، لیکن آج کچھ دنوں سے تو وہ مجھ سے ایک بات بھی نہیں کرتا، نہ جانے پانی کی کلسی سے کیا نکال نکال کر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے، بات کیا ہے آخر؟ ایک دن کسان کھیتوں میں کام کرنے گیا ہوا تھا، اسکی بیوی آہستہ آہستہ دبے پاؤں پانی کی کلسی کے پاس گئی اور اس میں ہاتھ ڈالا، اللہ! آئینہ اس کے ہاتھ میں آگیا" اس نے اسے دیکھا تو غصہ میں جلبلا تو گئی، آئینہ میں اس کا اپنا عکس پڑ رہا تھا، اس نے آئینہ کو کبھی دیکھا نہ تھا، اس لئے سوچا اس کا میاں ایک عورت بیاہ لایا ہے، اور اسے پانی کی کلسی میں چھپا رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کئی دن سے وہ میرے ساتھ کوئی بات ہی نہیں کرتا، آنے دو آج

میاں جی کو ذرا گھر! مزانہ چکھایا ہو تو میرا نام نہیں' بیوی نے ایک جھاڑو اٹھائی اور غصہ میں پھول کر کُپّا ہوتی رہی) اور جو جو باتیں میاں کو سنانا چاہتی تھی انہیں رٹ رٹ کر اس پر سان رکھتی تھی'

جب دوپہر ہوگئی تو اس کا میاں تھکا ہارا' پسینہ میں تر بتر گھر آیا جیسے ہی اس نے دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی بیوی جھاڑو اٹھا کر اس پر جھپٹی' — ارے غلام! تیرے یہ کرتوت' تو کس مردی کو بیاہ لایا ہے؟" یہ کہتے اس نے آئینہ کسان کے سامنے پھینک دیا'

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ کیا کر رہی ہو؟ اسے یہ تو میرے ابا جان ہیں" اتنا کہہ کر اس نے آئینہ بڑے ادب سے اٹھا لیا'

"دیکھو تو تیرے ابا جان کو؟ بیوی نے زور سے آئینہ گھسیٹ لیا اور بولی — "آدمی! دیکھ تو اس کے اندر کون سُندری بیٹھی ہے؟ دکھ یہ تیری نئی بیوی ہے کہ نہیں"؟

کسان چلایا — ارے پاگل ہوگئی ہے کیا؟ یہ تو میرے ابا جان ہیں"

"ارے غلام اسے پنج فات!! دیکھئے پر بھی کہے جاتا ہے یہ میرے ابا جان ہیں' تیرے ابا جان کیا گلے میں ہنسلی پہنے ہیں' ناک میں نتھنی پہنے ہیں' ماتھے پر بندیا لگاتے ہیں" بیوی بھڑکتی چلی گئی

اس گھر کی بڑی بہو گھومنے نکلی ہوئی تھیں انہوں نے منہ پر آدھا آنچل گھسیٹ کر پوچھا — اے آج گھر میں یہ جھگڑا بکھیڑا کیسا ہو رہا ہے تم لوگ تو بڑے میل اور محبت سے رہتے تھے' ایک دن کبھی چیخ پکار کی آواز بھی نہیں سنائی دیں'

کسان کی بیوی آگے بڑھ کر بولی —" دیکھئے تو بوبو! میرا میاں ایک اور عورت بیاہ لایا ہے' اور اسکو پانی کی کلسی میں چھپا رکھا ہے اس موئی سوت کو پیروں سے کیوں نہ کچل ڈالوں! دیکھئے دیکھئے بوبو! اس میں کیا ہے

اس گھر کی بہو نے آئینہ کی طرف منہ کیا تو اس میں دو عورتیں دکھائی دینے لگیں' بڑی بہو بولیں یہ تو تو ہی ہے' مگر ایک عورت اور دکھائی دے رہی ہے'" کسان بولا — "کیا کہہ رہی ہیں بوبو جان! اس میں تو میرے ابا جان دکھائی دے رہے ہیں' وہ بھی آگے بڑھ کر اس میں دیکھنے لگا' اب تو تین تین چہرے دکھائی دینے لگے' ان لوگوں کا شور و غل سن کر اس گھر کی چھوٹی بہو' اس گھر کی منجھلی دلہن' عرفان کی ماں' رحمٰن کی بہن

الوار کی نانی بھی ہانپتی کانپتی آگئیں' جو بھی آئینہ دیکھتا' اسی کا چہرہ آئینہ میں دکھائی دینے لگتا' یہ تو بڑے تعجب کی بات تھی' شدہ شدہ یہ بات اس گاؤں سے اس گاؤں میں اور اس گاؤں سے ایک دوسرے گاؤں میں جا پہنچی' دور دور کے لوگ اس جادو کی چیز کو دیکھنے آنے لگے' آخر بہت دنوں کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ ارے یہ تو آئینہ ہے!"

بھمبل داس (سلسلہ صـ ۲۶۳)

بندر زور سے چلایا شیر کے غار میں کس نے قبضہ جما رکھا ہے؟ جو بھی ہو جلدی سے جواب دے، بکرا بھاری آواز بنا کر بولا — ارے بندر کے بچے! تو کتنا بدذات ہوگیا ہے، اب میں تجھ ہی کو کھا جاؤں گا، میں نے تجھ سے شام کے ناشتہ کے لئے دس شیر لانے کو کہا تھا اور تو آیا بھی اتنی دیر میں اور صرف ایک شیر لایا ہے۔

شیر نے جو یہ بات سُنی تو اس نے سمجھا کہ بندر نے شیر ببر کے ماموں بھمبل داس سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے، اور وہ مجھے دھوکا دے کر یہاں لے آیا ہے، اتنا سوچنا تھا کہ شیر وہاں سے پودوں کو روندتا راندتا درختوں کو توڑتا تاڑتا وہاں سے بھاگا، وہ بھاگتا جاتا تھا اور بندر کو دھمکاتا جاتا تھا — اچھا تم کو کسی دن سمجھوں گا، ضرور سمجھوں گا۔

اب رات ختم ہوگئی تھی، آہستہ آہستہ نور کا تڑکا ہوتا جا رہا تھا، بوڑھا بکرا کسان کے گھر کی طرف چل دیا، وہ چلتا جاتا، اور سر اور دُم ہلا ہلا کر خوشی سے الاپتا جاتا۔

آہا ہا، آہا ہا، آہا ہام
بھمبل داس ہے میرا نام
کرتی ہے دنیا میں کام
حاضر دماغی کا اونچا نام

سعادت نیر

کون بڑا

بائیس من کا ایک پہلوان تھا، بڑے بڑے ہاتھ، بڑے بڑے پیر تھے اس کے سینے پر ہاتھ مار دے تو جیسے پہاڑ کا پہاڑ سینہ پر آ گرے۔

اس بائیس من کے پہلوان کے نام کا زبردست ڈنکا بج رہا تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ گاؤں میں ایک جنگلی ہاتھی آ نکلا، اور لگا تباہی اور بربادی مچانے، فوراً بائیس من کے پہلوان کو اطلاع دی گئی۔ بائیس من کے پہلوان نے آتے ہی ہاتھی کی دم پکڑ لی اور اسے اس زور سے گھما کر پھینکا کہ وہ دس میل دور سمندر میں چاروں خانے چت جا گرا۔

ایک دن بائیس من کا پہلوان راستے میں جا رہا تھا، اتفاق سے ادھر سے ایک پردیسی آ نکلا، پردیسی نے جو اسے دیکھا تو بولا ارے میاں بائیس من کے پہلوان! تم تو بڑی دھن گرج کے ساتھ سینہ اینٹھ کر زمین پر دھمک ڈالتے چل رہے ہو، ہمارے گاؤں کے تئیس من کے پہلوان کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا، اگر تم اس سے کشتی لڑ کر اسے پچھاڑ دو تب میں جانوں کہ ہاں تم کوئی پہلوان ہو۔

اتنا سننا تھا کہ بائیس من کے پہلوان کو تاؤ آ گیا، فوراً ہی اس نے پردیسی سے تئیس من کے پہلوان کا ٹھور ٹھکانہ پوچھا اور اس کے گاؤں کی طرف چل کھڑا ہوا، وہ چلتا رہا، چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی وہ چلتا ہی رہا، چلتے چلتے چلتے چلتے دوپہر بھی تمام ہونے کو آئی، چلتے چلتے وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا بھاری تالاب لہریں مار رہا ہے، اتنی دور چلتے چلتے بائیس من کے پہلوان کو بڑے زور کی پیاس لگ آئی تھی۔ وہ فوراً تالاب کے بیچوں بیچ جا کر کھڑا ہو گیا مگر ہائے پانی اتنا کم تھا کہ بائیس من کے پہلوان کے صرف گھٹنے ہی اس میں ڈوبے، بدمادی کی طرح اگر پانی گہرا ہوتا تو اس کی کمر تک آتا اور وہ آسانی کے ساتھ چلو بھر بھر کر پانی پی لیتا۔ اب اتنے کم پانی میں وہ کیا کرتا، آخر وہ تالاب میں اوندھا لیٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے پانی اچھ اچھ کر اپنے منہ کے اندر گھپ گھپ گھپ ڈالنے لگا، پیتے پیتے پیتے پیتے سارے کا سارا پانی ختم ہو گیا، صرف کیچڑ سا رہ گیا پانی۔ اگر وہ اس پانی کو پیتا تو اس کے پیٹ میں درد ہو جاتا، بائیس من کے پہلوان نے کسی طرح اپنی پیاس بجھائی اور پھر سے چلنا شروع کر دیا۔

وہ چلتا رہا، چلتا رہا، چلتا رہا کہ سہ پہر ختم ہو گئی اور شام شروع ہوئی، شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے بائیس من کے پہلوان کا جی خوش کر دیا، سامنے ہی برگد کا بڑا بھاری پیڑ تھا، بائیس من کے پہلوان نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر برگد کے پیڑ کو توڑ لیا، اور اس کی جڑ دانتوں سے مسواک کرنے لگا، وہ مسواک کرتا جاتا اور چلتا جاتا، اسی طرح وہ تئیس من کے پہلوان کے دروازے پر پہنچ گیا، دروازہ اندر سے بند تھا، وہ مسواک کرتے کرتے دروازہ دھب دھبانے اور آوازیں لگانے لگا۔ ارے او تئیس من کے پہلوان! او تئیس من کے پہلوان!! اس کے دھب دھبانے سے دروازہ، دیواریں، چھتیں تھر تھر کانپنے لگیں۔

تئیس من کا پہلوان تو گھر پر موجود نہ تھا، البتہ اس کی چھوٹی لڑکی گھر میں موجود تھی، اس نے دروازہ کھولا اور ذرا آگے بڑھ کر بڑی آواز میں ناگواری کے ساتھ پوچھا۔

دروازے پر کون چیخ رہا ہے؟ دروازہ کون ہلا رہا ہے؟

اپنے جیسے جسیم پہلوان کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر جب لڑکی کو ذرا بھی متعجب نہ دیکھا تو بائیس من کے پہلوان کے تن بدن میں

آگ ہی تو لگ گئی، اس نے گھر کر پوچھا۔ "تیئیس منا پہلوان گھر میں ہے؟"

"تمہیں ان سے کیا کام ہے؟"

"میں بائیس منا پہلوان ہوں، میں اس سے کشتی لڑنے کیلئے آیا ہوں، تم تیئیس منے پہلوان کی کون ہو؟"

"میں اسکی لڑکی ہوں! ارے تمہارے ہاتھ میں یہ کیا چیز ہے" لڑکی نے حقارت سے پوچھا،

بائیس منے پہلوان نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے جواب دیا۔ "راستہ میں آ رہا تھا کہ یہ برگد کا درخت دکھائی دیا، بس میں نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اسے جڑ سمیت اکھاڑ لیا، اور اس سے مسواک کرتا کرتا یہاں آن پہنچا،"

لڑکی تمسخر سے ہنستی ہوئی بولی۔ "بس اسی طاقت کے بل بوتے پر میرے ابا کے ساتھ کشتی لڑنے آئے ہو، میرے ابا تو اس سے خلال کرتے ہیں" یہ کہہ کر لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی، اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ بائیس منے پہلوان کے سینہ پر جیسے زور کا ہتھوڑا لگا، اسے اتنا غصہ آیا، اتنا غصہ آیا کہ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

اتنی دور آنے کے بعد بھی تیئیس منے پہلوان کا سامنا نہ ہوا، بہت دنوں کے بعد تو اسکی طبیعت کے موافق ایسا آدمی ملا تھا جس کے ساتھ واقعی کشتی لڑی جا سکتی تھی، ورنہ جنگل کے شیر، بھالو تو جیسے مکھی ہو چکے تھے کہ پکڑا اور مسل کر رکھ دیا، ایسا کوئی بھی آدمی قسمت سے نہیں ملا کہ جس کے ساتھ جی لگا کر کشتی لڑی جا سکتی،

بائیس منے پہلوان کو بڑی مایوسی ہوئی، وہ بڑے دکھ کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا، چلتے چلتے وہ ایک کھیت کے قریب پہنچا، کھیت اتنا بڑا تھا اتنا بڑا تھا کہ اس کا ایک سرا دوسرے سرے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، ایکا ایکی کھیت کی زمین بیچ میں بھونچال کی طرح کانپنے لگی بائیس منے پہلوان نے کھیت میں کام کرنے والوں سے پوچھا "یہ زمین اتنی زور زور کیوں ہل رہی ہے؟"

کسانوں نے کہا "ارے یہ بھی نہیں جانتے کہ تیئیس منا پہلوان اورنگ آباد کی لڑائی سر کر کے گھر لوٹ رہا ہے، اسکے قدموں کی دھمک سے کھیت کی زمین کانپ رہی ہے۔ وہ دیکھو وہ سامنے جو پہاڑ جیسا دکھائی دے رہا ہے وہی تیئیس منا پہلوان ہے"

اب کیا تھا بائیس منا پہلوان نے اپنی لنگی لنگوٹ کی طرح کس لی اور سینہ پر تال ٹھونکتا ہوا تیئیس منے پہلوان کی سامنے جا ڈٹا، تیئیس منے پہلوان نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟" بائیس منے پہلوان نے رعد کی طرح اتنی زور سے کڑک کر جواب دیا جیسے آسمان سے بجلی گر پڑی۔ "میں تم سے لڑنے آیا ہوں، میرا نام تم نے نہیں سنا؟ میں بائیس منا پہلوان ہوں!"

بس بائیس منے پہلوان اور تیئیس منے پہلوان میں لڑائی چھڑ گئی ادھر سے بائیس منا پہلوان خم ٹھونکتا ہوا تیئیس منے پہلوان کی طرف جھپٹا، اور ادھر سے تیئیس منا پہلوان خم ٹھونکتا بائیس منے پہلوان کی طرف جھپٹا، دونوں اس طرح ٹکرا گئے جیسے پہاڑ کے اوپر دوسرا پہاڑ گر پڑا ہو، یا پھر جیسے بادلوں سے بادل ٹکرا کر گرج کڑک رہے ہوں، کوئی بھی دوسرے سے کسی طرح کم نہ تھا، وہ اسکو ٹھیلتا ٹھیلتا تھوڑی دور ادھر ڈھکیل دیتا، یہ اسکو ٹھیلتا ٹھیلتا تھوڑی دور ادھر ڈھکیل دیتا، انکی اس ٹھیلا ٹھیلی ڈھکیلا ڈھکیلی کی چوٹوں سے چاروں طرف کی زمین اور ہوا تھر تھر تھر تھر کانپتے لرزنے لگیں اور ہمالیہ پہاڑ کی تین چار چوٹیاں دھڑام سے نیچے آ رہیں۔

ادھر سے ایک بڑھیا اپنی سوا لاکھ بکریاں چرا کر گھر لوٹ رہی تھی، بکریاں ایک قطار میں بڑھیا کے ساتھ چل رہی تھیں، بائیس منے پہلوان اور تیئیس منے پہلوان کی اچھل پھاند سے بکریاں تتر بتر ہو گئیں، دودھار کا تو انکے پیروں سے کچل کر دم ہی نکل گیا، بڑھیا نے جلدی جلدی اپنی سوا لاکھ بکریاں جھولی میں بھر لیں، اور اپنے ایک کندھے پر بائیس منے پہلوان کو اور دوسرے کندھے پر تیئیس منے پہلوان کو اٹھا لیا اور اپنی لاٹھی کے سہارے ٹیڑھی بانکی ہوتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی، بائیس منا پہلوان اور تیئیس منا پہلوان اس کے کندھوں پر پھر لڑائی میں جٹ گئے کبھی یہ چھلانگ لگا کر اسطرف کے کندھے پر چلا جاتا اور کبھی وہ چھلانگ کر ادھر کے کندھے پر چلا جاتا، ایک دوسرے سے کسی طرح بھی کم نہ تھا

اب کیا ہوا کہ ایک چیل نے بڑھیا کی بکریاں دیکھیں وہ انکی تاک میں بڑھیا کے اوپر منڈلانے لگی، منڈلاتے منڈلاتے اس نے ایک دفعہ زور کا جھپٹا مارا، اور سوا لاکھ بکریوں اور کندھوں پر سوار پہلوانوں سمیت بڑھیا کو لے اڑی،

اس دیس کی راج کنیا اشنان کرنے کے بعد بھیگے بال جھٹکائے چھت کے اوپر بیٹھی ہوئی دھوپ کھا رہی تھی، ایکا ایکی چیل کے پنجہ سے سوا لاکھ بکریوں اور پہلوانوں سمیت بڑھیا چھوٹ کر راج کنیا کی آنکھ میں جا گری

انکا گرنا تھا کہ راج کنیا چیخ چیخ کر واویلا کرنے لگی۔ اے میری آنکھ میں کچھ گر گیا ارے میری آنکھ میں کچھ گر گیا، اسکی واویلا سنکر اسکی سہیلیاں اسکے پاس دوڑ آئیں

سہیلیاں بہت سے جمک جھمک ٹھمک ٹھمک کر ان کی روشنیوں میں راج کنیا کی آنکھ چیر چیر کر گھس گھس کر دیکھنے لگیں، مگر ان کو راج کنیا کی آنکھ میں کچھ دکھائی ہی نہیں دیا، راجہ کو جو خبر لگی تو وہ جلدی سے تشریف لے آئے انکا آنا تھا کہ منتری، کوتوال، درباری، حولدار، پنکھا بردار سب ہی آن پہنچے،

راج وید بھی جڑی بوٹیاں کھرل میں گھوٹتے گھوٹتے آن پہنچے، انہوں نے آتے ہی آتشیں شیشہ جلا کر اور ایک سونیا نوے خوردبین لگا کر آنکھ کے اندر بہت دیکھا بہت ڈھونڈھا مگر راج کنیا کی آنکھ میں انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا راج کنیا برابر چیختی رہی ہائے آنکھ جل رہی ہے، ہائے آنکھ جل رہی ہے۔

اب کیا جائے، راجہ، منتری، درباری، کوتوال، صوبیدار، حولدار، پنکھا بردار اور راج وید سب کے سب سر جوڑ کر صلاح مشورہ کرنے بیٹھ گئے،

بڑی دیر تک سوچ بچار ہوتا رہا، آخر یہ فیصلہ ہوا کہ جل دھر ماہی گیر کو بلا کر راج کنیا کی آنکھ میں جال ڈلوایا جائے، اگر کوئی چیز آنکھ میں گر گئی ہوگی تو جال سے باہر نکل آئے گی، فوراً کوتوال کو حکم ہوا کہ وہ جل دھر ماہی گیر کو بلا لائے اب اگر راجہ کا حکم ہوتا پکڑ لاؤ تو کوتوال باندھ کر لاتا، باندھ کر لانے کا حکم ہوتا تو مار کر لاتا مارتے ہوئے لانے کا حکم ہوتا تو وہ چھوڑ کر آتا،

حکم ملتے ہی راج کوتوال سپاہی چار سے لے کر مچھلی والوں کے محلہ میں جا پہنچا، راجہ کے سپاہیوں نے مچھلی والوں کے دروازے توڑ ڈالے چھتیں گرا دیں جالوں کی رسیاں الجھا سلجھا دیں اور ہنگامہ برپا کر دیا، پھر بھی ملاح جل دھر ماہی گیر کا کہیں پتہ نہ لگا، وہ ڈر کے مارے مچھلیوں کے جھونے میں چھپا بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا بہت دیر کے بعد جب اس نے دیکھا کہ اگر وہ چھپا بیٹھا رہا تو مچھلی والوں کا سلسلہ ہی نہس ہو جائیگا جالوں کی رسیاں ٹوٹ تاٹ کر رہ جائیں گی تو وہ باہر نکلا اور کوتوال کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، کوتوال نے نگری کے راجہ کا حکم سنایا، راجہ کا حکم سنتے ہی ماہی گیر کی جان میں جان آئی وہ اپنے سوا لاکھ بچے کچے پوتے اٹھائے ساتھ لئے، جال، رسیاں اور بانس کندھوں پر رکھ محل میں حاضر ہو گیا

ماہی گیر آئے اور راجہ کے حکم سے راج کنیا کی آنکھ میں جال ڈالا گیا اور ماہی گیر اسکے سوا لاکھ بچے کچے ناتی پوتے ایک ساتھ مل کر جال کو گھسیٹنے لگے وہ جال کو کبھی ادھر سے ادھر لے جاتے اور کبھی ادھر سے ادھر لاتے رہے مگر جال میں کوئی چیز بھی نہ پھنسی،

جال گھسیٹتے گھسیٹتے دن ختم ہو گیا، رات آ گئی، رات ختم ہوئی اور پھر دن نکل آیا اسی طرح کرتے کرتے سات دن اور سات راتیں کٹ گئیں، آخر گھسیٹتے گھسیٹتے راج کنیا کی آنکھ کے کونے میں نہ جانے کیا آن کر اٹک گیا۔ جل دھر ماہی گیر اپنے سوا لاکھ ناتی پوتوں کے ساتھ مل کر بھی اسے باہر نہ نکال سکا، ہے ای یا جوانو ہیا ہیا جوانو! ہیا کی بہت سی آوازیں لگائیں، بڑی محنت اور سخت مشکلوں کے بعد گھسیٹتے گھسیٹتے جال کو کنارے لایا گیا اور آتشیں شیشہ جلا کر سوا لاکھ خوردبینوں کی مدد سے دیکھا گیا، اب جو دیکھا تو سب کے سب حیران، جال کے ایک خانہ میں وہی بڑھیا ہے، اور اس کے کندھوں پر بائیس منا پہلوان اور تیئس منا پہلوان کشتی لڑے جا رہے ہیں انہیں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اس عرصے میں کیا کچھ ہنگامہ برپا نہیں ہو گیا تھا، بڑھیا کی جھولی میں سوا لاکھ بکریاں بھی ویسی کی ویسی ہی موجود تھیں۔

راج کنیا کی آنکھ سے جب تنکا نکل گیا تو وہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی،

بتاؤ تو بچو! کون سب سے بڑا؟ دو پہلوان؟ کہ بڑھیا کہ چیل یا کوئی اور؟

سعد منیر

نائی برہمن

کہنے والے کہتے ہیں نائی کے پاس سولہ چونگے عقل ہوتی ہے، نائی بادشاہوں وزیروں سے لیکر پنڈتوں گیانیوں، گویّوں شاعروں سوداگروں تک بہت سے لوگوں کی حجامت بناتے رہتے ہیں اور جب حجامت بناتے ہیں تو ان سے طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے قصے کہانیاں سنتے ہیں جبھی تو نائی عام لوگوں سے کہیں زیادہ عقل رکھتے ہیں، مگر اس سے کیا ہوتا ہے سب ہی لوگ نائیوں کو ادنیٰ اور حقیر سمجھتے ہیں مگر ان کے کام میں برائی بھی ایسی کون ہوتی ہے؟ اگر نائی نہ ہوتے تو سب ہی لوگوں کے چہروں پر داڑھیوں کا جنگل اُگا رہتا اور کوئی کسی کو پہچان نہ پاتا، پھر ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اتنے بڑے ہو جاتے کہ آدمی بالکل جانور ہی بن جاتے۔

ایک برہمن کے پاس ایک نائی نوکر تھا، برہمن چیلوں کے گھر بھی جایا کرتا تھا اور برہمنوں کے گھر بھی جایا کرتا تھا اور برہمن کے ساتھ نائی بھی اس کی گٹھڑی سر پر اٹھائے اٹھائے کبھی اس دیس میں کبھی اس دیس میں جاتا آتا رہتا تھا، تین چار سال تک نوکری کرتے کرتے نائی نے برہمن کے پوجا پاٹ منتر جنتر سب ہی سیکھ ڈالے، اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اگر کسی سے کوئی اپرادھ ہو جائے تو پرائشچت کے لئے کیا حکم دینا ہوتا ہے، اور کس مہینے میں کیا کیا چیزیں کھانا ہوتی ہیں،

نوکری کرتے کرتے نائی اپنے دل میں سوچنے لگا کہ میں برہمن کی گٹھڑی سر پر اٹھائے اٹھائے کیوں دیس بدیس پھرا کرتا ہوں؟ اگر میں چاہوں تو میں بھی تو دیس بدیس جا کر اور لوگوں کو پوجا پاٹ کروا کروا کر اچھے خاصے کما سکتا ہوں؟ پردیس میں کون کس کو پہچانتا ہے؟ سب ہی لوگ مجھے غلام جان کر حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں اور جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ذات کا نائی ہوں تو میرا کتنا مذاق اڑاتے ہیں، عقل تو میرے پاس ہے ہی، کیوں نہ میں پردیس جا کر اسی عقل کی بدولت برہمن بن جاؤں، تب سب ذات کے لوگ میرا ادب کریں گے، مجھے عزت سے دیکھیں گے،

ایک دن اس نے اپنے سر سے گٹھڑی پٹخ کر برہمن سے کہہ دیا۔ ٹھاکر ماشا! اب میں آپ کی نوکری نہیں کروں گا، یہ رہی آپ کی گٹھڑی آپ مجھے رخصت کر دیجئے،

ٹھاکر ماشا نے جب یہ سنا تو آسمان سے زمین پر آ رہے، کہنے لگے کیا بات ہے رے؟ تو نوکری کیوں چھوڑے دے رہا ہے؟

نائی بولا "تین چار برس سے تو میں آپ کی گٹھڑی ڈھوتا دیس بدیس پھرتا رہتا ہوں اور آپ مجھے مہینے بھر میں صرف آٹھ روپے تنخواہ دیتے ہیں، اب میں یہ نوکری نہیں کروں گا"۔

اتنے دنوں کے بعد بھروسہ والے نوکر بھلا کون چھوڑنا چاہے گا، ٹھاکر ماشا بولے۔ اچھا "نہ ہو تو میں دو روپے تیری تنخواہ میں اور بڑھائے دیتا ہوں"

"دو روپے کا کیا لالچ دیتے ہیں ٹھاکر ماشا! آپ دیس پردیس گھوم کر جو منتر جنتر پڑھتے ہیں اور پوجا پاٹ کرواتے ہیں وہ سب مجھے آ گئے ہیں، اب میں خود برہمن بن کر دوسرے دیسوں میں جا کر پوجا پاٹ کرواؤں گا اور آپ کی طرح میں بھی بہت سے روپے کماؤں گا، پردیس میں کون اتنی خبر رکھتا ہے کہ فلاں برہمن ہے اور فلاں نائی"۔

نائی نے سچ مچ برہمن کی نوکری چھوڑ دی اور گلے میں جنیو ڈال دیوتاؤں کے نام چھپی ہوئی چادر سے تن ڈھانک اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں پہونچا تو اسے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا بہت بڑا گھر دکھائی

دیا، اس گھر کے رہنے والے کالستھ تھے۔

دونوں وقت مل رہے تھے نائی برہمن کا بھیس بنائے ہی ہوئے تھا وہ گھر کے سامنے پہونچا اور آواز لگائی۔ دیکھئے میں ایک پردیسی برہمن ہوں، میرا یہاں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے آج کی رات مجھے یہاں بسر کر لینے دیجئے۔ گھروالا بہت ہی اچھا آدمی تھا اور برہمنوں کا بڑا ادب کرتا تھا اس نے کہا — آپ اطمینان سے ہمارے یہاں رہیئے، آپ تو برہمن ہیں، ہمارے ہاتھ کا پکا نہیں کھائیں گے اس لئے سامان لئے دیتا ہوں آپ خود اپنا کھانا پکا لیں۔"

برہمن کا بھیس بنائے نائی نے اپنی گٹھری ایک طرف رکھ دیا اور گھر سے باہر اپنا کھانا پکانے لگا جب پڑوس کے لڑکوں نے ایک پردیسی کو کھانا پکاتے دیکھا تو وہ اس کے گرد آن کر کھڑے ہو گئے، پھر اس گھر کے بڑے مالک، اس گھر کے منجھلے مالک اور ادھر کے مالک اور بہت سارے آدمی اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے، ٹھاکر ماشا کھانا پکاتے جاتے اور ادھر ادھر کی باتیں بگھارتے جاتے باتیں بگھارتے بگھارتے وہ بولے۔ دیکھئے آپ کے گاؤں میں اتنے تو چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں اور انکے لئے گاؤں میں کوئی اچھا ساٹول تک نہیں ہے اگر یہ پڑھے لکھیں گے نہیں تو جاہل اور بیوقوف رہ جائیں گے" گاؤں کے مکھیا نے جواب دیا — اس گنوار وراجڈ گاؤں میں ایک بھی اچھا برہمن پنڈت نہیں ہے یہاں ٹول کیسے کھولا جا سکتا ہے۔

نائی زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ اگر آپ لوگوں کی مرضی ہو تو یہاں ٹول کھول کر آپکے لڑکے بالوں کی لکھائی پڑھائی کا بوجھ خود سنبھال سکتا ہوں، اگلے زمانے میں اسکول اور مکتب کو ٹول کہا جاتا تھا۔

اب کیا تھا، گاؤں کے مکھیا کے ہاتھ جیسے آسمان کا چاند آگیا انہوں نے کہا۔ کیا کہنے، اگر آپ جیسے پنڈت چھوٹے لڑکوں کے پڑھانے کا بار اپنے کندھوں پر لینے کو تیار ہیں تو ہم کل ہی سے پاٹھ شالہ کھول سکتے ہیں"۔

پھر کیا تھا گاؤں کے لوگوں نے رات بھر جاگ جوگ کر بڑے جوش خروش کے ساتھ پاٹھ شالہ کے لئے ایک کمرہ بنا ڈالا، دوسرے دن صبح ہوتے ہی نائی نے لڑکے پڑھانے شروع کر دیئے، چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو پڑھانا کونسی مشکل بات ہے، وہ کا، کھا کی کتاب تک نہیں پڑھے ہوتے ہوتے ہیں، نائی حروف تو پہچانتا ہی تھا، اسے لوگوں کو پڑھانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی"۔

دیس میں طرح طرح کی رسمیں، ریتیں، قاعدے، قانون، خاندانی چلن، رسم رواج، تیں سکی رواج کیا کچھ نہیں ہوتا، اور یہ سب اتنے سخت ہوتے ہیں کہ ان سے اتنا سا بھی نہیں ہٹا جا سکتا، اگر کسی سے ان قائدوں کی پالن میں ذرا بھی بھول ہو جاتی ہے تو وہ دوڑ کر برہمن کے پاس پہونچتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ اس بھول سے کیوں کر مخلصی پائی جا سکتی ہے دوسرے دوسرے برہمن پنڈت ایسی صورت میں کتنے ہی شاستر گھوٹ کر کتنے ہی وید دیدانت الٹ پلٹ کر کتنے ہی سنسکرت کے اشلوک ناک میں بھن بھنا کر ذرا سی بھول کیلئے بڑے بڑے پراشچتوں کی فہرست جھاڑ دیتے ہیں اگر وہ سب پراشچت گنے جائیں تو بھول کرنیوالے کی زندگی ہی تمام ہو جائے مگر یہ برہمن بھیس نائی پنڈت اتنے شاستر نہیں الٹتا تھا، جو حکم وہ صادر کرتا وہ گاؤں کے اجڈ گنوار اور آسانی کے ساتھ بجا لاتے تھے،

کوئی آکر کہتا — ٹھاکر ماشا! آج گنگا اشنان کے لئے نہانے میں دو مرتبان کیلا کھا گیا، اب میرا کیا ہوگا؟ بتایئے"؟ نائی فوراً بول اٹھتا — "آدھ گنڈے مرتبان کیلے لاکر اس برہمن پہ چڑھا دو تمہارا کوئی اپرادھ باقی نہیں رہے گا"۔

کبھی کوئی دوسرا آکر کہتا — "آج رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں رس گلے کھا رہا ہوں، سونے میں کھانا تو اننائے ہے اب بتایئے میں کیا کروں"۔

نائی جواب دیتا — "تم کو کچھ زیادہ کرنا نہیں ہوگا — میرے پاس سوا پانچ سیر رس گلے لے آنا میں منتر پڑھ کر تمہارا سارا اپرادھ دور کر دوں گا"

وہ آدمی خوش ہو کر سوا پانچ سیر رس گلے لے آتا، اس طرح اس چیز کے اس چیز کے چڑھاوے نائی پر برابر چڑھتے اور وہ مزے ہی سے اپنے دن کاٹ رہا تھا،

اس گاؤں میں ایک خاندانی برہمن بھی رہا کرتا تھا، اسکی دو بیٹیاں تھیں، دونوں کی دونوں بیاہنے کی عمر کی، خاندانی برہمنوں کی لڑکیوں کے بیاہ میں بہت سا دان جہیز دینا ہوتا ہے، لڑکیوں کا باپ بہت غریب

آدمی تھا، اس لئے اتنے دن ہو گئے تھے اور وہ اپنی لڑکیوں کا بیاہ نہ کر سکا تھا، ایک دن برہمن کی بیوی کہنے لگی — "ٹھاکر ماشا! میں کہتی ہوں کیا تمہاری آنکھیں جاتی رہی ہیں!"

برہمن نے پوچھا — "کیوں کیا ہوا"؟

بیوی نے جھڑک کر کہا — "دیکھتے نہیں دونوں لڑکیاں کیلے کے پیڑ کی طرح بڑھ گئی ہیں، انکے بیاہ کا بندوبست نہیں کرو گے؟

برہمن بولا — "کیسے کروں، آس پاس کے کسی گاؤں میں بھی تو برہمن کے لڑکے نہیں ملتے، کس کے ساتھ لڑکیوں کو بیاہ دوں؟"

برہمنی کہنے لگی — کیا آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں؟ آس پاس کے گاؤں کے ٹول میں جو پنڈت ماشا پڑھاتے ہیں وہ کنوارے ہیں ان کے ساتھ لڑکیوں کے بیاہ کی بات کیوں نہیں کرتے؟

برہمن نے کہا — ہاں ٹھیک تو ہے، کل دوپہر ہی کو میں پنڈت ماشا سے جا کر ملوں گا"

دوسرے دن برہمن نائی کے ٹول میں جا پہنچا، نائی نے جو گاؤں کے برہمن کو دیکھا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، نہ جانے وہ کون سے مشکل شاستر کا مطلب نہیں سمجھ سکا جواب میرے پاس اسکو حل کرنے کے لئے آیا ہے، ہائے غضب آج ہی سارا کیا دھرا پھوٹ جائے گا،

برہمن نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ نائی کو مخاطب کیا اور بولا — دیکھئے ٹھاکر ماشا! اگر ایک ہاتھی دلدل میں دھنس جاتا ہے تو اسے دوسرے ہاتھی کے ذریعہ نکالنا پڑتا ہے، ایک جہاز اگر بالو میں پھنس جاتا ہے تو دوسرے جہاز کی مدد سے اسے گھسیٹ کر پانی میں لانا پڑتا ہے، میں بھی برہمن ہوں اور آپ بھی برہمن ہیں، آپ ہی مجھے میری مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں"۔

اتنا سننا تھا کہ نائی کا منھ اور بھی سوکھ گیا وہ سمجھا کہ اب برہمن کوئی مشکل سوال ہی پوچھنے والا ہے، کسی نہ کسی طرح تھوک نگل کر اس نے جواب دیا — "تو پھر میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں"

برہمن نے کہا — "میرے گھر میں دو لڑکیاں ہیں کوئی اچھا بر نہیں مل سکا، اس لئے اب تک ان کا بیاہ نہ ہوا، آپ اگر دونوں اور میل کے پنتے چڑھا کر ان سے بیاہ کر لیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا"

نائی نے جو یہ سنا تو خوشی کے مارے اس کا ناچنے کو جی چاہنے لگا، مگر وہ دل کی بات چھپا کر بولا — "دیکھئے میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں کبھی بیاہ نہ کروں گا، لیکن آپ بزرگ ہیں اب آپ نے فرمایا ہے تو میں آپ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں آپ بھی برہمن ہیں اور میں بھی برہمن ہوں"

اب کیا تھا تیتھ دن اور مہورت اور گھڑی دیکھ کر دونوں لڑکیوں کا بیاہ نائی کے ساتھ ہو گیا، بیاہ ہوئے جب کچھ دن گذر گئے تو ساس نے داماد سے کہا — "دیکھو بابا! وہاں تم کو پکانا ریندھنا پڑتا ہے، تمہارے ہاتھ دانت جھلس جاتے ہوں گے، ہمارے ہاں ایک فالتو کمرہ ہے، تم اسی میں آن رہو، پھر کیا تھا وہ نائی سسرال میں رہنے لگا

اڑتے اڑتے یہ خبر نائی کے گاؤں میں بھی پھیل گئی، اما کیا کہنا فلاں گاؤں میں ہرو نائی برہمن کا بھیس بدل کر بڑے مزے اور آرام کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹور رہا ہے اس گاؤں میں منائی دت نام کا ایک آدمی بھی رہتا تھا، اس نے دل میں سوچا اگر ہرو نائی دوسری جگہ جا کر برہمن کا بھیس بنا کر روپیہ کما سکتا ہے تو میں کائستھ کا لڑکا ہو کر روپیہ کیسے نہیں کما سکتا؟

یہ سوچنا تھا کہ اس نے کان سے ایک جنیو لپیٹا، تو پنی کا روپ دھارا، اور گاؤں گاؤں پھر پھر کر اور لوگوں کی قسمت کا حال بتا بتا کر بڑے مزے سے روپیہ کمانا شروع کر دیا۔

وہ یوں ہی گاؤں گاؤں پھرتا پھراتا اس گاؤں میں بھی جا پہنچا، اور اسکی اس سے ملاقات ہو گئی

ارے ہرو نائی کیا حال ہے؟

نائی نے دوڑ کر اس کا منہ دونوں ہاتھوں سے بند کر دیا"

سب ستیاناس! دیکھئے اب ایسی بات نہ کہئے گا میں یہاں برہمن کا بھیس بنائے ہوئے ہوں اور یہیں ایک برہمن کی دو لڑکیوں سے بیاہ کر رکھا ہے اگر کسی کو ذرا بھی معلوم ہوا کہ میں نائی ہوں تو پھر میری جان نہ رہے گی، یہاں کے لوگ میری بوٹیاں بنا ڈالیں گے یہ پانچ روپے حاضر ہیں آپ اس گاؤں سے دوسرے گاؤں چلے جائیے"

نائی دت نے کہا — "اگر میں یہاں کچھ دن اور رکھو متا پھرتا تو کم از کم دس روپے تو مجھے ضرور ہی مل جاتے"

نائی نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے اور رکھ دیے۔ بس اب آپ اس گاؤں سے ابھی چلے جائیے۔

روپے لیکر نائی دت نے جواب دیا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے میں ابھی جاتا ہوں مگر یہ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری دونوں بیویاں ہیں کیسی

نائی بولا۔ دونوں کی دونوں بڑی خوبصورت ہیں بڑی بیوی مجھے زیادہ اچھی نہیں لگتی چھوٹی کو میں بہت چاہتا ہوں میں نے اسے بہت سا گہنا پاتا بھی بنوا دیا ہے"

نائی دت نائی سے رخصت ہوگیا، چلتے چلتے اس نے سوچا جب اتنی دور آگیا ہوں تو نائی کی دونوں بیویوں کو کیوں نہ دیکھتا چلوں، یہ سوچکر وہ پوچھتے پوچھتے نائی کی سسرال جا پہنچا اور آواز لگائی — "دو سال ٹھکرا ہوا ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال معلوم کروگی؟" آواز سنتا تھا کہ گھر کے لڑکے لڑکیاں جوان بوڑھے سب ہی نائی دت کے پاس دوڑ گئے اور شہد کی مکھیوں کی طرح اسے گھیر لیا ایک کہے پہلے میرا ہاتھ دیکھو دوسری کہے پہلا میرا ہاتھ دیکھو تیسری کہے پہلے میرا ہاتھ دیکھو، نائی دت ہر ایک کا ہاتھ دیکھتا جاتا اور سوچتا جاتا کہ ان میں نائی کی بیویاں کونسی ہیں، نائی پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دونوں دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہیں اور بڑی بہن سے زیادہ اسنے چھوٹی بہن کو گہنا دیا ہے، اس نے سوچا جب وہ دونوں ایک دوسری کی بہنیں ہیں تو ضرور دونوں کی صورتیں کچھ نہ کچھ ملتی جلتی ہونگی نائی دت ہاتھ بھی دیکھتا جاتا اور عورتوں کی صورتیں بھی دیکھتا جاتا، اچانک اسکی نظریں انپر جا پڑیں دونوں ایک ہی صورت کی تھیں، بڑی بہن کے تن پر زیادہ گہنا نہ تھا، اور چھوٹی آٹھوں زیور سے لدی ہوئی تھی،

نائی دت بڑی بہن کی طرف دیکھ کے کہنے لگا — "آہ یہ لڑکی سوت رکھتی ہے اور اسی سوت کے ساتھ رہتی بھی ہے" یہ تو اس نے بالکل سچ کہا، سب ہی حیرت میں ڈوب گئے، نائی دت نے پھر کہا "اس لڑکی کی سوت اسکی بہن ہے آہ لڑکی کا سوامی اسے نہیں چاہتا" گاؤں کے لوگ یہ بھی جانتے تھے انکو اور بھی تعجب ہوا یہ تو بڑا زبردست جوتشی ہے، ہاتھ بھی نہیں دیکھتا اور سارا حال بتا دیتا ہے،

تاکہ کچھ ہو، ماں کا دل ہی تو تھا، نائی کی ساس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جوتشی کے پاس لے آئی۔ بابا! دیکھو تو میرا داماد کس طرح اس لڑکی کو چاہنے لگے گا؟"

نائی دت بہت دیر تک چپ چاپ سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا — "میں اس لڑکی کو سب سے چھپ کر ایک منتر بتاؤں گا جسے پڑھتے ہی داماد کا دل اس سے خوش ہو جائے گا مگر اس بات کے لیے مجھے پانچ چونیوں کے پیسے دینے ہوں گے،

لڑکی کی ماں جلدی سے اندر گئی اور پانچ چونیوں کے پیسے لاکر جوتشی کے ہاتھ پر رکھ دیے وہ لڑکی کو سب سے الگ لے گیا اور اسے ایک منتر سکھا دیا، اور پھر بولا — "آج جب تمہارا آدمی گھر آوے تو کوئی ایسی بات کرنا کہ اسے غصہ آجائے جب وہ غصہ میں بھر کر تم کو مارنے بڑھے تو جیسے نائی ہتھیلی پر استرے کی دھار تیز کرتا ہے اسی طرح تم ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر گھس گھس کر یہ منتر پڑھنے لگنا، پھر دیکھنا تمہارے سوامی کا غصہ کیا پانی ہو جاتا ہے اور وہ تمہارا کیسا غلام بن جاتا ہے" یہ بتا کر نائی دت وہاں سے چمپت ہوگیا،

گھر میں بڑی بیوی کو روزانہ ہنڈیا چولہا کرنا پڑتا تھا اور چھوٹی بیوی رانی بنی بیٹھی رہتی تھی شام ہوگئی تو روزمرہ کی طرح بڑی بیوی کھانا پکانے نہیں گئی چھوٹی بیوی اس سے کہنے لگی — "اے دیدی آج تو یوں ہی بیٹھی رہوگی؟ رات ہو رہی ہے کھانا نہیں پکاؤگی کیا؟"

بڑی بیوی چھوٹی بیوی کے منہ پر تھپڑ لگا کر بولی — "چل موئی! روز تو میں پکاتی ہوں اور تو رانی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ آج تو جا کر کھانا پکا!"

اتنا کہہ کر اس نے ایک اور تھپڑ چھوٹی بیوی کے لگا دیا ایک تو وہ نائی کی بڑی چہیتی بیوی تھی اوپر سے اتنی کڑوی کسیلی باتیں، وہ غصہ میں پھول پھال کر زمین پر پٹخنیاں کھانے لگی، اور بڑی بیوی کپڑے بدل، سر میں تیل ڈال اور سیندور لگا چوکی کے اوپر رانی کی طرح بن ٹھن کر بیٹھ گئی،

اتنے میں نائی بھی گھر آگیا، اور دل میں مزے مزے کی

باتیں کرتا چھوٹی بیوی کے پاس بڑھا — میری لوٹیاں، میری مینا یہ کیا ہو رہا ہے؟ ارے تم تو زمین پر پٹیاں کھا رہی ہو؟"

چھوٹی بیوی روتی پیٹتی اِدھر اُدھر بڑھکتی پڑھکتی بولی — دیدی نے آج مجھے مارا ہے اور مجھے کھانا پکانے کو کہتی ہے؟"

"ہائیں" اتنی بڑی بات! کہاں گئی بڑی بیوی؟" کہتے کہتے جو اس نے دیکھا تو غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا، اور دہاڑا — تیری یہ ہمت؟ تو نے میری چہیتی پر ہاتھ اٹھایا، ابھی مزا چکھاتا ہوں، اتنا کہہ کر اس نے ایک لٹھیا اٹھائی اور لپکا بڑی بیوی کو مارنے بڑی بیوی کو جو تیشی نے جیسا بتایا تھا اسی طرح نائی کی نقل میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا ہاتھ گھس گھس کر منتر پڑھنے لگی —

ایشے چھیلو نائی دت
بوے کیچے تنکل تت
تمارا اے ای گن،
تمی ناکی امن تیمن

(نائی دت آیا، اس نے سچ بتایا، یہ تمہارے گن، ایسے ویسے ہو تم)

یہ منتر سننا تھا کہ نائی کا سارا غصہ فور ہو گیا، ہائے غضب! نائی رت سب کچھ بتا گیا، اس نے جلدی سے آگے چل کر بڑی بیوی کا منہ ہاتھ سے بند کر دیا — اری چپ رہ یہ بات کسی سے کبھی نہ کہنا،

بڑی بیوی نے دیکھا کہ منتر اپنا کام دکھا رہا ہے، وہ ہتھیلی اور بھی زور زور سے ہاتھ گھستے اور منتر پڑھنے لگی —

ایشے چھیلو نائی دت
بوے کیچے شوکل تت
تمارا اے ای گن
تمی ناکی امن تیمن

نائی نے دوڑ کر چھوٹی بیوی کو زور سے دھکا دیا اور کہنے لگا — "اچھا تجھ سے بھات پکانے کو کہتی ہے تو اس میں کیا ہوا، وہ ٹھہری بڑی بہن، تجھ سے بڑی ہے، اس کا جب جی چاہے گا کام کرے گی، اٹھ جا کر کھانا پکا،

اس کے بعد سے نائی اپنی بڑی بیوی کی بڑی دلداری کرنے لگا، اس سے لاڈ پیار سے پیش آنے لگا، اور جب کبھی بھولے سے نائی کو بڑی بیوی پر غصہ آتا تو وہ فوراً منتر پڑھنے لگتی —

ایشے چھیلو نائی دت
بوے کیچے شوکل تت
تمارا اے ای گن،
تمی ناکی امن تیمن

اور اسے ذرا تیز کرنے کی نقل میں ایک ہاتھ دوسری ہتھیلی پر گھسنے لگتی، اور نائی کا غصہ پلک جھپکتے میں ہوا ہو جاتا،

فقیر چند (بسلسلہ صفحہ ۲۸۵)

سنتا رہا، مگر ان کے سامنے نہیں گیا، اور اپنی بیوی کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی جلدی سے لوٹ کر بستر پر لیٹ رہا، دوسرے دن جب اس کی بیوی نے اس سے اداس رہنے کا سبب پوچھا تو اس نے راجکمار کے بچہ کے مرنے کی تمام باتیں بتا دیں، دوسرے دن آدھی رات کو اس کی بیوی پھر کالی مائی کے مندر گئی اور اپنے پتی کے اداس رہنے کا ماجرہ بتا دیا، دیوی نے سب سن کر کہا بچہ کو میرے پاس لے آؤ میں اسے زندہ کر دوں گی دوسری رات بچہ دیوی کے سامنے حاضر کر دیا گیا، دیوی نے اسے زندہ کر دیا، وزیر زادہ اسے زندہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوا جاتا تھا، اس نے بچہ کو اٹھا لیا اور جس قدر جلد ہو سکتا تھا راجکمار اور راجکماری کے پاس جا پہنچا، اور ان کو جیتا جاگتا بچہ پیش کر دیا، وہ دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے اور پھر سب ایک ساتھ مل کر خوشی سے دن گذارنے لگے +

سعد منیر

گپّی

کسی گاؤں میں ایک گپّی رہتا تھا، اس کی گپوں سے گاؤں میں ہر وقت ہنسی دل لگی ہوتی رہتی تھی، کوئی اس کے سر میں مٹی کے تیل کی مالش کرنے دوڑا آ رہا ہے کوئی اس کے بدن میں ڈھول جیسے ملتے لیکا آتا ہے مگر گپی کی گپیں تھیں کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں، ہوا کی طرح اس کے منہ سے طرح طرح کی جھوٹی سچی باتیں نکلتی ہی جاتی تھیں۔ آج جو میں کھیتوں کی طرف جا نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا بھاری کوڑیالا سانپ پڑا اینٹھ رہا ہے، اس نے جو مجھے دیکھا تو میری طرف جھپٹا، میں وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگا، میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، سانپ بھی میرا پیچھا کیا گیا، بھاگتے بھاگتے میں ایک دم سے ٹھوکر کھا کر دھڑام سے گر پڑا، اور سانپ میرے سر پر آپہنچا، اور مجھے کاٹنے کے لئے پھن اٹھالیا، اب میں کیا کرتا، کچھ اور تو میری سمجھ میں آیا نہیں بس جلدی سے اچک کر اس کے پھن پر چڑھ بیٹھا، اب سانپ بھاگنے لگا، میں پھن پر بیٹھا رہا اور وہ بھاگتا رہا، بھاگتے بھاگتے سانپ ایک جھیل میں گھس آیا، اس میں بے شمار کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے، میں نے پھن پر بیٹھے ہی بیٹھے چار کنول کے پھول توڑ لئے اور سانپ کا پھن گھر کی طرف کو پھیر دیا، سانپ بھاگتے بھاگتے آم کے باغ میں چلا آیا، وہ تو بل میں گھس گیا اور میں یہ کنول کے پھول لے کر یہاں چلا آیا، اگر یقین نہ آئے تو آم کے باغ میں جاؤ اور بل کھود کر دیکھ لو، نہیں تو ہمارے ہاتھ میں یہ کنول کے پھول دکھائی ہی دے رہے ہیں، کسی کا سر مارا گیا تھا کہ سانپ کا بل کھودنے جاتا، یقین کرنا ہی پڑا۔

گپی اسی طرح کی گپیں ہانکتا رہتا، ایسی گپوں کی کوئی انتہا نہ تھی، ایک دن وہ آکر کہنے لگا۔ ایک کنول کے پھول پر بہت بڑا چھتا تھا میں اس پر جا بیٹھا، میرا بیٹھنا تھا کہ شہد کی مکھیاں چھتا لے کر آسمان کی طرف اڑنے لگیں مگر میں چھتے پر بیٹھا ہی رہا، اڑتے اڑتے شہد کی مکھیاں آسمان پر جا پہنچیں، وہاں کالے کالے اودے اودے بادلوں کا بسیرا تھا، اس کے بھی اوپر شام کے تارے کا گھر تھا، اور چاروں طرف سینکڑوں کے پہاڑ پر راجہ ان تھے میں وہاں سے سات ندیوں کے کنارے چلا گیا، وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ کی بیٹی جگنو پکڑ پکڑ کے ہار گوندھ رہی ہے، میں نے اس سے ایک جگنو مانگ لیا اور گھر چلا آیا،

سننے والوں نے پوچھا تو پھر تم گھر کیسے لوٹے؟ آسمان سے کود پڑے تھے کیا؟ گپی سے اس کا کوئی جواب بن نہ پڑا، لوگوں نے اسے دھتکار کر وہاں سے بھگا دیا، مگر بچے اس کو بہت چاہتے تھے اس کی گپیں جھوٹی ہوتی ہیں تو ہوا کریں سننے میں تو بری نہیں معلوم ہوتیں

گپی کی بیوی بڑی ہی نیک عورت تھی دیکھنے میں بھی خوبصورت تھی اور باتیں تو اور بھی پیاری پیاری کرتی تھی لیکن جب لوگ اسے دیکھتے تو پکار اٹھا کرتے تھے یہ دیکھو گپی کی بیوی آرہی ہے، گپی جہاں جہاں جاتا وہاں جھوٹی سچی گپیں ہانکا کرتا تھا، وہ لوگ منہ بنا بنا کر وہی گپیں گپی کی بیوی کے سامنے دہرانے لگتے تھے اور قہقہے لگا لگا کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے بیچاری یہ کہاں تک برداشت کر سکتی تھی، ایک دن گپی بیوی کو خوش کرنے کے لئے دل میں عجیب عجیب باتیں گھڑتا گھر آیا، گھر پہنچا بیوی کی صورت دیکھ کے اسے بہت رنج ہوا وہ بیوی سے پوچھنے لگا کہ۔۔ ارے تم کو کیا ہوا جو تم منہ پھلائے بیٹھی ہو؟ بیوی جل بل کر بولی ہوا کیا؟ تم خود نہیں سمجھ سکتے؟ تم تو یہاں وہاں جھوٹی سچی باتیں بناتے پھرتے ہو اور لوگ ہیں کہ ہنس ہنس کر میرا مذاق اڑاتے

رہتے ہیں، اب تو دیکھتے دیکھتے سنتے سنتے میرا ناک میں دم آگیا ہے، مجھے جو دیکھتا ہے وہ ہی پکار اٹھتا ہے وہ دیکھو گپی کی بیوی آرہی ہے،

جب گپی نے بیوی کو دکھی دیکھا تو اس کا دل بہت دکھنے لگا اس نے بیوی سے پوچھا اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" بیوی بولی" کرنا کیا ہوگا بس تم اپنی گیہوں کا بورا کہیں دور پھینک آؤ" گپی بہت دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا، سوچتے سوچتے آخر وہ کہنے لگا۔" وہ جو پہاڑ سامنے دکھائی دے رہا ہے میں وہاں کل تڑکے ہی تڑکے جاکر اپنا بورا پھینک آؤں گا، وہاں بہت سے جانور رہتے ہیں، شیر رہتے ہیں، راستہ بڑا بھیانک ہے کون جانے وہاں سے سلامت لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں" بیوی بولی۔ تم لوٹو یا نہ لوٹو اسکی مجھے کوئی پرواہ نہیں مگر اپنی گیہوں کا بورا تم کو پھینک ہی آنا ہوگا"

بیوی نے غصے میں یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، یقین تو نہیں آتا، لیکن اگر سچ مچ ہی وہاں جانور اور شیر ہوئے تو پھر؟ بیوی تڑکے ہی اٹھ پڑی، اس نے بڑے جی سے کھانا پکایا اور دودھ اور بھات جی بھر کر گپی کو کھلایا، جب گپی کھاپی کر خوب سیر ہو گیا تو پان کی گلوری کے مزے لیتا اپنی گیہوں کا بورا سامنے کے پہاڑ پر پھینکنے کے لئے روانہ ہو گیا اور اسطرح چلتا رہا، اسطرح چلتا رہا جیسے کہ اس کے سر پر بڑا سارا بوجھ لدا ہوا ہے،

شام کے وقت گپی گھر لوٹ آیا، بیوی نے پوچھا۔" گیہوں کا بورا پھینک آئے نا" گپی نے جواب دیا کہ اسے پھینکنے کا موقع ہی نہیں ملا؟ میں پہاڑ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک شیر مجھے دیکھ کر میرا پیچھا کرنے لگا، میں ڈر سے بھاگا، میں آگے آگے بھاگتا رہا، شیر پیچھے پیچھے دوڑتا رہا بھاگتے بھاگتے بھاگتے بھاگتے میں بالکل پہاڑ کے نیچے پہنچ گیا اب جو دیکھا تو سامنے راستہ ہی نہ تھا اور شیر میرے سر پر ہی آن پہونچا، میں جان بچانے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا، ایک طرف اروی کا درخت لگا دکھائی دیا، بس میں اس کی ڈال پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا، میرے پیچھے پیچھے شیر بھی اوپر چڑھنے لگا، چڑھتے چڑھتے میں اور چڑھا، اور چڑھا، شیر بھی چڑھتا رہا، میں بھی چڑھتا گیا، شیر بھی چڑھتا گیا، میں بھی چڑھتا گیا، شیر بھی چڑھتا گیا، اس کے بعد کیا ہوا کہ اروی کی ڈال ہم دونوں کا بوجھ نہ سنبھال سکی اور چرچرا کر ٹوٹ گئی، میں جو گرا تو گرتا ہی چلا گیا اور ایک دم سے تمہارے باورچی خانے کے گھر کے سامنے جا گرا، تمہاری بھابی نے آج مرغی پکائی تھی چوپی بھی پکایا تھا، وہ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا! اور کھاپی کر گھر لوٹ آیا" یہ گپ جو گپی کی بیوی نے سنی تو ہنسی چھپاتے ہوئے بولی۔" ہائے اللہ! تم کو بھیجا تھا کہ اپنی گیہوں کا بورا پھینک آؤ اور تم ہو کہ گیہوں کا ایک اور بورا سر پر اٹھا لائے"

کملا (بسلسلہ صفحہ ۳۰۶)

ملا اور اپنے دل کی باتیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ کملا کا دل بھی رفتہ رفتہ شاہزادے کی طرف کھنچتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شادی کرنے پر رضا مند ہو گئی۔ شاہزادہ کملا کو اپنے ملک لے آیا۔ اور وہاں خوب دھوم دھام کے ساتھ شادی ہو گئی۔

پہلی رات!

شادی کے بعد پہلی بار جب کملا شاہزادے پردیپ کمار کے پاس آئی۔ اس نے بڑا ہی دلسوز نغمہ چھیڑا جس کے بول یہ ہیں:۔

جے دن ہوئی تے دیکھ پی بندھو تو مائے

شریک زندگی جس دن سے تمہیں گڈرے کی کٹیا میں دیکھا ہے،

تے دن ہوئی تے بندھو آمی پاگل ہوئیا پھیری

اسی روز سے میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی ہے

پائیرے تے شونی لے بندھو آرے بندھو تومار پائیر دھبن

باہر ہی سے تمہارے پاؤں کی چاپ سن کر

گھوم ہتی تے جاتی گا اٹھی آمی ابھاگین

میں بدنصیب گہری نیند سے جاگ اٹھتی ہوں

لوک بھاشیا جائی رے بندھو آرے بندھو مکھ پھوٹیا نا پاری

میری چھاتی پھٹی پڑتی ہے مگر زبان سے کچھ کہہ نہیں پاتی۔

انترا گونے آمی جالیا پڑیا مری

دل کی آگ میں جل کر بھسم ہو رہی ہوں۔

باٹا بھری بانائیا پائیر بندھو تورے دیتے لاج باسی

پان کے بیڑے بناتی ہوں لیکن تمہیں دیتے ہوئے شرماتی ہے م

نزہت سمیع ایم۔ اے
تحمینہ سمیع بی۔ اے

فقیر چند

ایک تھا راجہ کا لڑکا اور ایک تھا وزیر کا لڑکا، دونوں ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے، دونوں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، دونوں ایک ساتھ چلتے پھرتے، دونوں ہی ایک ساتھ کھاتے پیتے اور سویا کرتے۔ اس طرح کرتے کرتے بہت سے سال گذر گئے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ دونوں کے دل میں ایک دم سے دوسرے ملکوں کی سیر کرنے کی دھن سما گئی اور ایک دن دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر سفر پر چل دیئے، انھوں نے اپنے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ لیا، البتہ ان کے گھوڑے بڑے ہی خوبصورت تھے اور کپڑے راجکماروں کے سے، راجہ کہلاتے تھے، وہ چلتے رہے چلتے رہے اور ہرے بھرے دھان کے کھیتوں، شہروں، قصبوں، آب دگیاہ، ریگستانوں اور شیر اور بھالوؤں سے بھرے جنگلوں سے گذرتے رہے، ایک شام کو وہ ایسے جنگل سے گذر رہے تھے جہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد چلتے چلتے رات سر پر آگئی، کہیں کوئی ٹھہرنے کے لئے جگہ تو تھی نہیں اسلئے وہ ایک بڑے سے اونچے پیڑ کے نیچے اتر پڑے، اور اپنے گھوڑوں کو پیڑ کے تنے سے باندھ کر درخت کے اوپر چڑھ گئے اور گھنی پتیوں میں چھپ کر بیٹھ رہے، اس پیڑ کے پاس ہی ایک بڑا تالاب تھا، اس کا پانی ایسا چمکتا تھا ایسا چمکتا تھا جیسے کوے کی آنکھ، وہ آرام سے بیٹھ کر لگے ادھر ادھر کی باتیں کرنے، باتیں کرتے کرتے انہیں نیند آنے لگی لیکن ان کی ابھی آنکھ نہ لگی تھی کہ تالاب کا پانی زور سے اچھلتا سنائی دیا، انھوں نے جو ادھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا بھاری ناگ پانی سے اچھل کر باہر آگیا ہے، اس کا پھن بہت ہی بڑا تھا، اور دھڑ تو میلوں لمبا ہوگا مگر جس چیز نے انہیں بہت زیادہ حیران کیا وہ ایک بڑا سا من تھا جو ناگ کے پھن پر بڑے زوروں سے چمک رہا تھا، اسکی چمک سے تالاب اور کنارے کی چاروں طرف کی چیزیں روشن ہوگئی تھیں، وہ ناگ رینگتا، پھنکارتا باہر نکلا اور اپنا من زمین پر ڈال کر اپنی خوراک تلاش کرنے لگا، راجکمار اور وزیر زادہ درخت پر بیٹھے بیٹھے اس من کو دیکھتے رہے اور تعریف کرتے رہے انہوں نے ایسی چیز کبھی بھی نہ دیکھی تھی، البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ اس کی قیمت سات راجاؤں کے خزانوں کے برابر ہوتی ہے، وہ بیٹھے بیٹھے اسکی تعریف کر رہے تھے کہ وہ ناگ زور سے پھنکاریں مارتا اس درخت کے نیچے آگیا وہ بے انتہا ڈرے اور خوف زدہ ہوگئے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ناگ ان کے دونوں گھوڑوں کو نگل گیا، اب تو اور زیادہ ڈرے، انہوں نے خیال کیا کہ اب ہنکو نگلے گا، مگر ناگ رینگتا ہوا دوسری طرف دور چلا گیا، اور ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ جب وزیر زادے یہ دیکھا تو اس نے من چمکیلے من پر قبضہ جمانے کی سوچی، اس نے یہ سن رکھا تھا کہ گوبر یا لید من پر ڈال دی جائے تو اسکی چمکیلی روشنی چھپ جاتی ہے اور اس کے خیال میں لید درخت کے نیچے ضرور پڑی ہوگی، وہ چپکے سے نیچے اترا اور من کو لید سے ڈھانک کر جھٹ سے پیڑ پر چڑھ گیا، ناگ کو جب اپنے من کی روشنی نہیں دکھائی دی تو وہ غصہ میں کھولتا خفناک پھنکاریں لگاتا من کی طرف جھپٹ پڑا، اور اس کے چاروں طرف گھر سیتا بل کھاتا، ٹکریں کھانے لگا اور ٹکریں کھاتے اس کا دم نکل گیا

جب صبح ہوئی تو راجکمار اور وزیر زادہ پیڑ سے نیچے اترے اور اس جگہ آئے جہاں من پڑا ہوا تھا، ناگ تو بے جان تھا ہی وزیر زادہ نے لید کے تھیچے سے من نکال لیا اور تالاب کے پانی میں دھونے کے لئے تالاب پر چلا گیا، من دھل دھلا کر پہلے کی طرح پھر چمکنے لگا، اور اسکی روشنی سے بھی تالاب کی ساری تہہ دکھائی دینے لگی، تالاب میں سنہرا محل

مچھلیاں تیرتی پھر رہی تھیں لیکن جب انہیں من کی روشنی میں پانی کے اندر محل کی جیسی عالیشان اونچی اونچی دیواریں دکھائی دیں تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، وزیرزادہ تو من چاہتا ہی اس نے راج کمار سے غوطہ لگا کر محل میں جانے کی تجویز پیش کی، دونوں کے دونوں پانی میں کود پڑے، وزیرزادہ کے ہاتھ میں من تھا ہی وہ پلک جھپکتے میں محل کے پھاٹک پر جا کھڑے ہوئے، پھاٹک کھلا ہوا ہی تھا مگر وہاں کوئی آدمی ہی تھا اور نہ حیوان، وہ اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیچ میں ایک مکان ہے اور اس کے چاروں طرف بہت وسیع باغ ہے، اور اس باغ میں ہزارہا ہزار پھول کھلے ہوئے تھے اور ان کی خوشبوئیں ہر طرف مہک رہی تھیں بس خوشبوؤں کا طوفان ہی تو برپا تھا، راجکمار اور وزیرزادہ بھینی بھینی خوشبوؤں کی جنت سے گزرتے گزرتے مکان کی طرف چل دیئے، مکان کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے تھے، چلتے چلتے وہ مکان کے پھاٹک کے سامنے جا کھڑے ہوئے، مکان پریوں کا محل معلوم ہوتا تھا اس کی دیواروں پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا، جگہ جگہ چکاچوند برپا کر دینے والے ہیرے جڑے ہوئے تھے، یہاں بھی انکو کوئی آدمی یا کچھ اور نہ دکھائی دیا، معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں رہنے والے اسے چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں، پھرتے پھرتے وہ ایک اور کمرے میں پہنچے، اس کمرے میں ایک سونے کا چھپرکھٹ بچھا ہوا تھا اس پر ایک لڑکی سو رہی تھی، وہ لڑکی اتنی حسین تھی اتنی حسین تھی کہ کچھ بتایا نہیں جا سکتا، اسکی عمر سولہ برس کی ہوگی اسکی رنگت سرخ و سفید ہو رہی تھی، راجکمار اور وزیرزادہ نے جو اسے دیکھا تو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے وہ اسے حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ لڑکی نے اپنی ہرنی جیسی آنکھیں کھول دیں اس نے جونہی آدمیوں کو دیکھا تو بول اٹھی بدقسمت لوگو! تم یہاں کیسے آگئے، یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ، یہاں ایک ناگ رہتا ہے، وہ میرے باپ، ماں بھائی اور سب رشتہ داروں کو ہڑپ کر گیا ہے، صرف مجھ ہی کو چھوڑ دیا ہے، تم اپنی جانیں لے کر بھاگ جاؤ، نہیں تو وہ تم لوگوں کو بھی ہڑپ کر جائیگا وزیرزادہ نے بتایا ناگ مر چکا ہے اور اس کا من ہم دونوں کے قبضے میں ہے اور اسی کی روشنی کی مدد سے ہم یہاں تک آگئے ہیں جب لڑکی نے یہ سنا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے ان دونوں کا بہت شکریہ ادا کیا، اور ان سے وہاں ہی رہنے کی التجا کی، اور یہ بھی کہا کہ وہ اسے کبھی چھوڑ کر نہ جائیں، راجکمار اور وزیرزادہ نے اسکی بات خوشی سے مان لی، اب کیا ہوا کہ راجکمار کو لڑکی کے بے پناہ حسن و جمال نے موہ لیا اور وہ اس پر اتنا فریفتہ ہوا اتنا فریفتہ ہوا کہ اس سے بیاہ رچانے کی ٹھان لی، وہاں کوئی پروہت تو تھا نہیں اس لئے دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں ہار ڈال کر بیاہ رچا لیا۔

راجکمار راجکماری کی سنگت میں بیحد خوش تھا وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی سیرت کی بھی بہت اچھی تھی، وزیرزادہ کی بیوی اوپر کی دنیا میں رہتی تھی، مگر وہ بھی راجکمار کی خوشی میں شریک ہو کر ہنسی خوشی دن گزارنے لگا، ان کے دن یونہی ہنسی خوشی گذر رہے تھے کہ ایک دن راجکمار کو اپنے دیس جانے کا خیال آگیا وہ راجکماری کو بڑے ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لئے طے پایا کہ وزیرزادہ پانی کی دنیا سے اوپر جا کر راجہ سے ہاتھی گھوڑے لاؤ لشکر لے آئے اور پھر یہ سسر و رجوڑ بڑی دھوم دھام سے راجدھانی جائے، اس بات کے لئے ناگ کے من کی ضرورت تھی پس راجکمار من لے کر وزیرزادہ کو اوپر پہونچا آیا، وزیرزادہ نے رخصت ہونے سے پہلے راجکمار کو بتا دیا کہ فلاں دن اور فلاں وقت تمام لاؤ لشکر لیکر واپس آجائے گا اور کنارے پر راجکمار اور راجکماری کو نکلنے کا انتظار کرے گا، وزیرزادہ تو رخصت ہو گیا اور راجکمار اپنی بیوی کے ساتھ اس پریوں کے محل میں ہنسی خوشی دن کاٹنے لگا ایک دن کیا ہوا کہ راجکمار تو دن کا کھانا کھانے کے بعد سو رہا تھا کہ راجکماری کے دل میں اوپر کی دنیا دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی، اس نے اوپر کی دنیا کبھی بھی نہ دیکھی تھی اس نے من ہاتھ میں لے لیا اور اوپر جا پہنچی تالاب کے آس پاس کوئی بھی اسے نہ دکھائی دیا، وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نہانے لگی اور جی بھر کر نہائی جب اس کا دل نہانے سے بھر گیا تو ادھر ادھر کی سیر کرنے لگی اور وہاں کے حسین نظاروں سے دل بہلاتی رہی اور پھر اپنے محل میں واپس چلی، جب راجکمار جاگا تو اس نے اپنے اوپر جانے کا حال اسے نہ بتایا، دوسرے دن بھی اسی طرح اوپر کی دنیا کی سیر کرنے چلی گئی، اس دن بھی اسے وہاں کوئی نہ دکھائی دیا، اب تو اس کی

بہت بڑھ گئی اور وہ تیسرے دن بھی اسی وقت اوپر جا نکلی، اس دن کیا ہوا کہ جس دیس میں وہ تالاب تھا اس دیس کے راجہ کا لڑکا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلنے اُدھر آیا ہوا تھا، اس کا لاؤ لشکر تالاب کے کنارے ڈیرے خیمے ڈالے ہوئے تھا، اس کے ساتھی دوپہر کا کھانا پکانے میں مشغول تھے اور وہ تالاب کے پاس سیر و گشت کر رہا تھا، اور قریب ہی ایک بڑھیا جلانے کی لکڑیاں جمع کر رہی تھی کہ اتنے میں راجکماری تیسری بار اوپر نکلی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے ہی اس نے وہاں ایک آدمی اور ایک بڑھیا دیکھی وہ پانی کے اندر چلی گئی، راجہ کا لڑکا اور بڑھیا اسکی ایک ہی جھلک دیکھ پائے، راجہ کا لڑکا اس طرف دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا، اس نے ایسا حسن و جمال کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اسے وہ کوئی دیو کنیا یا آسمانی دیوی معلوم ہوئی جن کا تذکرہ قدیم کتابوں میں ملتا ہے اور جو کبھی کبھی اپنے درشنوں سے دنیا کو عزت بخشتی رہتی ہے اگرچہ راجہ کے لڑکے نے اسکی ایک ہی جھلک دیکھی تھی مگر اس کے آسمانی حسن نے اس کے دل پر اتنا زبردست اثر کیا کہ اس کے حواس جاتے رہے اور وہ اسکو دوبارہ دیکھنے کی امید میں گھنٹوں بت بنا اُدھر دیکھتا رہا، لیکن سب اکارت کیونکہ وہ راجکماری دوبارہ دکھائی ہی نہ دی، راجہ کا لڑکا اسکی محبت میں پاگل ہو گیا اور بکنے لگا ابھی دیکھا ابھی غائب ابھی دیکھا ابھی غائب، اس نے وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیا، اسکے دوست اسے زبردستی پکڑ لے گئے جب وہ اپنے باپ کے محل میں لایا گیا تو اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا نہ وہ کسی سے بولتا چالتا تھا نہ وہ ہنستا تھا بس ہر وقت پھوٹ پھوٹ کر روئے جاتا تھا اور بکے جاتا تھا ابھی دیکھا ابھی غائب، ابھی دیکھا ابھی غائب راجہ اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت غمگین ہوا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کس بات سے اس کے لڑکے کا دماغ پلٹ گیا تھا اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ — ابھی دیکھا ابھی غائب اسکے لئے پہیلی ہو گئے تھے، اس کا کوئی حل نہ تھا، اس کے ساتھی بھی اسکی وجہ نہیں بتا سکتے تھے دیس کے قابل سے قابل وید بلائے گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، جب وہ اس کے پاگل پنے کی وجہ ہی نہ جان سکے تو اس کا علاج ہی کیا کر سکتے تھے، ویدوں نے بھی کچھ پوچھا مگر جواب میں راجہ کے لڑکے کے منہ سے سوائے ابھی دیکھا ابھی غائب کے کچھ نہ نکلتا راجہ اور بھی رنجیدہ ہوا اس نے دیس بھر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا جو کوئی اس کے لڑکے کو اچھا کر دے گا وہ اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا اور آدھی سلطنت بھی اسے بخش دے گا مگر کوئی بھی نہ آیا، کیونکہ کسی کو بھی اس کے پاگل پن کی وجہ معلوم نہ تھی، آخر ایک دن ایک بڑھیا نے ڈنکہ پر چوٹ ماری اور بولی کہ میں راجہ کے بیٹے کی دیوانگی کا حال بھی بتا دوں گی اور اسکو اچھا بھی کر دوں گی، یہ بڑھیا وہی تھی جس نے لکڑیاں جمع کرتے وقت راجہ کے لڑکے کو پانی سے نکلنے والی راجکماری کو دیکھتے اور حواس کھوتے دیکھا تھا، اس بڑھیا کا ایک سنکی لڑکا تھا جس کا نام نفیر حیدر تھا اور وہ نفیر کی ماں بلکہ نفیرے کی ماں کہلاتی تھی، خدمتگاروں نے اس بڑھیا کو راجہ کے سامنے حاضر کر دیا، راجہ نے اسکو دیکھتے ہی پوچھا تم ہی نے ڈنکہ پر چوٹ ماری تھی؟ تم میرے بیٹے کے پاگل ہونے کا سبب جانتی ہو، بڑھیا بولی الضاف کے دیوتا! میں جانتی تو ہوں مگر جب تک اسے اچھا نہیں کر دیتی میں سبب بتاؤں گی نہیں، راجہ بولا میں کیسے یقین کر سکتا ہوں کہ تم میرے بیٹے کو اچھا ہی کر دو گی، بڑے بڑے وید اسے اچھا نہیں کر سکے، بڑھیا نے کہا جب تک میں اچھا نہ کر دوں یقین کرنے کی ضرورت بھی نہیں، بڑھیا کو بہت سے راز معلوم ہیں ان سے بڑے بڑے عقلمند لوگ واقف نہیں، راجہ بولا اچھا دیکھتا ہوں تم کیا کر سکتی ہو، تم کتنے دنوں میں اسے اچھا کر سکتی ہو؟ بڑھیا نے کہا وقت تو مقرر نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ کی مدد سے میں ابھی سے کوشش شروع کر دوں گی، راجہ نے پوچھا تم کس قسم کی مدد چاہتی ہو، بڑھیا نے کہا مہاراج اس تالاب کے کنارے ایک جھونپڑی بنوا دیں جہاں آپ کے بیٹے کو پہلے بیماری لگی تھی اور وہاں سے سو گز کے فاصلے پر اپنے تھوڑے سے سپاہی بھی تعینات کر دیں جو میرے آواز دینے پر مدد دینے کیلئے پہونچ جائیں، راجہ بولا میں ابھی سب سامان تیار کرنے کا حکم دیئے دیتا ہوں، تم کو اور کچھ چاہیے بڑھیا بولی اور تو کچھ نہیں چاہیے البتہ آپ کی شرط یاد دلانا چاہتی ہوں آپ نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی آپ کے راجکمار کو اچھا کر دے گا اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دیں گے اور اسے اپنی آدھی سلطنت

بھی دے دیں گے، میں اسی شرط پر اس بات کا بیڑا اٹھاتی ہوں، میں تو عورت ہوں آپ کی لڑکی سے بیاہ نہیں کر سکتی میری یہ پرارتھنا ہے کہ اگر میں راجکمار کو اچھا کر دوں تو آپ اپنی لڑکی میرے لڑکے فقیر چند سے بیاہ دیں اور آدھی سلطنت بھی اسی کو دے دیں، راجہ نے کہا مجھے سب منظور ہے،

پھر کیا تھا، راجہ نے حکم دے دیا، چند ہی گھنٹوں میں تالاب کے کنارے ایک جھونپڑی کھڑی کر دی گئی اور فقیر کی ماں اس میں رہنے لگی اور اسکی ہدایت کے مطابق تھوڑے فاصلہ پر کچھ سپاہی اور خدمتگار بھی متعین کر دیے گئے، فقیر کی ماں نے سب کو تاکید کر دی کہ کوئی بھی تالاب کے کنارے نہ جائے، ادھر تو فقیر کی ماں تاک لگائے بیٹھی تھی ادھر کیا ہوا کہ جب راجکماری نے راجہ کے لڑکے اور بڑھیا کو وہاں دیکھا تو پھر وہاں وہ چوتھی بار پانی سے باہر نہ نکلی اس نے اوپر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیا، مگر عورتیں تو مردوں سے زیادہ تجسس کا جذبہ رکھتی ہیں، راجکماری بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی، ایک دن جب کہ اس کا راجکمار کھانا کھانے کے بعد حسب معمول سو رہا تھا وہ ناگ کا من ہاتھ میں لیکر تالاب کے اندر کے محل سے اوپر آگئی بڑھیا تو منتظر تھی ہی وہ پانی میں ہلچل مچتی دیکھ جلدی سے جھونپڑی میں جا چھپی اور لگی درز سے جھانکنے راجکماری نے جب کسی کو آس پاس نہ دیکھا تو کنارے بیٹھ کر نہانے دھونے میں مشغول ہو گئی اسے نہاتے دیکھ کر فقیر کی ماں باہر نکل آئی اور اسکے پاس جا کر بڑی مٹھاس کے ساتھ بولی، میری چاند سی گڑیا! لا تجھے میں نہلا دوں اور اتنا کہہ کر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی، راجکماری نے یہ سمجھ کر کہ وہ عورت ہی تو ہے کوئی روک ٹوک نہ کی اور بڑھیا اسے نہلانے لگی، نہلاتے نہلاتے اس کی نظر راجکماری کے ہاتھ کے من پر جا پڑی بات دیکھتے ہی بولی ارے بیٹی تو اپنا ہیرا ہاتھ سے رکھدے، جب نہا چکنا تو پھر اٹھا لینا، راجکماری نے من زمین پر رکھدیا، ذرا ہی دیر بعد بڑھیا نے اس پر قبضہ جما کر اپنی کمر میں اڑس لیا، جب بڑھیا کو یقین ہو گیا کہ وہ بھاگ نہیں سکتی تو اس نے تالی بجا دی خدمتگار اس بات کے منتظر تو تھے ہی فوراً گھاٹ کی طرف دوڑ پڑے اور راجکماری کو قید کر دیا، بجلی کی طرح شہر میں خبر پہنچ گئی کہ بڑھیا نے ایک جل پری پکڑی ہے، یہ خبر سنتے ہی سارے شہر میں خوشیاں منائی جانے لگیں اب کیا تھا شہر بھر راجکماری کو دیکھنے کیلئے دوڑ پڑا،

انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ ناگ دیوتاؤں کی بیٹی ہے، راجکماری کو راجہ کے محل میں لے آیا گیا، جیسے ہی راجہ کے لڑکے نے اسے دیکھا وہ بے اختیار ہنسی میں چلا اٹھا مل گئی، مل گئی، جو بادل اس کے دماغ کے اوپر چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ گئے، اسکی بے نور خالی خالی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی، اسکی زبان جو صرف اتنی دیکھا ابھی غائب کے - والجھتی ہی نہ تھی اب باتیں کرنے لگی، راجہ نے جو یہ حالت دیکھی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، سارا شہر خوشیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا سب لوگ فقیر کی ماں کی تعریفیں کرنے رہے، اور راجہ کے لڑکے کی جل پری کے ساتھ شادی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگا، جب راجکماری نے یہ دیکھا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئی، وہ اور تو کچھ کر نہیں سکتی تھی اس لئے فقیر کی ماں کے ذریعہ یہ کہلوا دیا کہ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ سال بھر تک میں سوائے اپنے سوامی کے جو تالاب کے اندر محل میں رہتا ہے کسی دوسرے آدمی کا منھ نہیں دیکھوں گی اس لئے سال بھر تک بیاہ نہیں ہو سکتا، راجہ کے لڑکے کو بہت ملال ہوا مگر اس کہاوت کو یاد کر کے راضی ہو گیا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے -

اب راجکماری دن رات رنج و غم کے آنسو بہاتی اور اس منحوس گھڑی کو کوستی رہتی جب وہ اوپر کی دنیا دیکھنے کیلئے پانی سے باہر نکلی تھی، اسے اپنے سوامی کی تنہائی کا بھی خیال آتا رہتا اور وہ بھی کڑھتی رہتی، سخت پہرے کی وجہ سے وہ وہاں سے بھاگ نہیں سکتی اور اگر وہ محل سے بھاگ بھی نکلتی تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا بغیر ناگ کے من کے وہ تالاب کے نیچے والے محل میں نہیں پہنچ سکتی تھی فقیر کی ماں اور محل کی عورتیں اسے سمجھاتیں بجھاتیں مگر وہ کسی سے بات نہ کرتی بس دن رات روتی ہی رہتی، ہوتے ہوتے سال تمام ہونے کے قریب پہونچا، اور کوئی صورت چھٹکارے کی نہیں نکلی، اب تو بیاہ ہونا ہی تھا، راجہ نے برہمنوں اور جوتشیوں کو طلب کیا اور بیاہ کے لئے اچھا دن اور اچھی ساعت معلوم کروائی، اور بیاہ کی تیاریوں کی دھوم دھام ہونے لگی، شہر بھر کے حلوائی طرح طرح کی مٹھائیاں بنانے

میں مشغول ہو گئے، دودھ والے حوض بھر بھر کر دہی تیار کرنے لگے، آتش بازی بنانے والے بارود تیار کرنے لگے، شہنائیاں بجانے والوں نے محل کے پھاٹک کے سامنے شہنائی بجانے کیلئے تمبو تان دیئے سارے شہر میں دھوم دھام چہل پہل شروع ہو گئی۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اُدھر وزیرزادہ جب راجہ کے ہاں پہونچا تو اسے ساز و سامان کی تیاری میں مہینوں لگ گئے جب سامان تیار ہو گیا تو وہ ہاتھی گھوڑے اور لاؤ لشکر لیکر مقررہ دن سے دو دن پہلے تالاب کے کنارے پہنچ گیا، ہاتھی گھوڑے اور لاؤ لشکر کیلئے تالاب کے کنارے آم کے درختوں پر شامیانے لگا دیئے گئے، وزیرزادہ ہر وقت تالاب کی طرف ٹکٹکی لگائے رہتا، جو دن مقرر تھا اس دن دو پہر بھی ڈھل گیا مگر راجکمار اور راجکماری باہر نکلنا تھے نہ نکلے، وہ دو دن دیر تک اور انتظار کرتا رہا، پھر بھی جب وہ باہر نہ نکلے تو اسے خیال ہوا ان پر کوئی آفت تو نازل نہیں ہو گئی ہے، یا کہیں وہ مر تو نہیں گئے ہیں، یا ناگ کی ناگن نے انہیں ڈس تو نہیں لیا، نہ تو وہ کہیں کھو بیٹھے، وہ باہر نکلے ہوں تو اور کسی نے انہیں پکڑ لیا ہو، وزیرزادہ انہی پریشان خیالوں میں الجھا ہوا رنج و افسوس کرتا رہا جب سے وہ تالاب کے کنارے آیا تھا اسے قریب کے شہر سے شہنائیوں کی تانیں آتی سنائی دے رہی تھیں، اس نے پوچھ گچھ کی تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں کے راجہ کے لڑکے کا ایک بہت ہی حسین لڑکی سے بیاہ ہو رہا ہے وہ لڑکی تالاب سے پکڑی گئی ہے اور بیاہ آج سے تیسرے روز ہو رہا ہے، وزیرزادہ نے جب یہ سنا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ خوبصورت لڑکی ضرور اس کے دوست کی بیوی ہو گی اس نے شہر جا کر اس بات کا پتہ لگانے اور راجکماری کو چھڑانے کا تہیہ کر لیا، وزیرزادہ نے لاؤ لشکر کو رخصت کر دیا اور خود شہر جا کر ایک برہمن کے یہاں ٹھہرا کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد اس نے برہمن سے شہر میں شہنائیاں بجنے کا سبب دریافت کیا، اس کا سوال سنکر برہمن نے کہا تم دنیا کے کس حصے سے آ رہے ہو جو تم نے یہ عجیب و غریب واقعہ نہیں سنا، ہمارے راجہ کا لڑکا ایک ایسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے جو تالاب سے پکڑی گئی ہے، وزیرزادہ نے بن کر کہا میں تو کچھ نہیں جانتا کیا آپ مجھے یہ قصہ سنائیں گے، برہمن نے کہا آج ہی کل کے دن تھے

راجہ کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا اس کے خیمے ایک جنگل میں تالاب کے کنارے لگے ہوئے تھے، ایک دن کیا ہوا کہ وہ تالاب کے کنارے ٹہل رہا تھا، اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ ایک جوان لڑکی بلکہ دیوی کہنا چاہیے حسن و جمال کا مجسمہ بنی تالاب کے باہر نکلی اور چند لمحے ادھر ادھر دیکھ کر پھر غائب ہو گئی، راجہ کے لڑکے نے اس کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی، یہی ایک جھلک دیکھ کر وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور عشق کی آگ اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے، جب وہ محل میں لایا گیا تو بالکل پاگل ہو چکا تھا اس کے منہ سے صرف یہی الفاظ نکلتے تھے۔ ابھی دیکھا ابھی غائب راجہ نے اس کے علاج کیلئے بڑے بڑے وید بلائے مگر کوئی بھی اسے اچھا نہیں کر سکا، آخر اس نے ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو کوئی اس کے بیٹے کو اچھا کر دے گا اس کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا اور آدھا راج بھی دے دے گا، اسی شہر میں ایک بڑھیا رہتی ہے اس کو سب نفیر کی ماں پکارتے ہیں، وہ یہ سنکر محل کے قریب گئی اور نقارہ پر چوٹ مار کر کہنے لگی میں راجہ کے بیٹے کو اچھا کر سکتی ہوں، اس کے کہنے پر جہاں سے وہ لڑکی نکلی تھی وہاں ایک جھونپڑی ڈال دی گئی اور اس سے تھوڑے فاصلے پر سپاہیوں کے رہنے کا بندوبست کر دیا گیا تا کہ وقت پر اسکی مدد کر سکیں، بڑھیا اور سپاہی وہاں رہنے لگے، پھر جب حسن کی دیوی پانی سے باہر نکلی تو بڑھیا نے سپاہیوں کی مدد سے اسکو پکڑ لیا اور پالکی میں بٹھا کر محل لے آئی، راجہ کے بیٹے نے جونہی اسے دیکھا اس کے ہوش و حواس درست ہو گئے، اس کا بیاہ تو اسی وقت ہو جاتا مگر اس دیوی نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ایک سال تک کسی دوسرے مرد کی صورت نہیں دیکھے گی، اب سال پورا ہو گیا ہے، بیاہ ہونے والا ہے، شہنائیوں کی آوازیں راجہ کے محل سے آ رہی ہیں، یہ ہے سارا قصہ، وزیرزادہ تمام ماجرا سنکر بولا یہ تو بڑی عجیب و غریب کہانی ہے، مگر یہ تو بتایئے کہ نفیر کی ماں بلکہ نفیر جنت کے ساتھ راجہ کی لڑکی کی شادی بھی ہوئی اور اسے آدھا راج بھی ملا۔ برہمن نے کہا نفیر جیند کا تو ابھی تک پتہ ہی نہیں ہے، نہ جانے وہ کہاں ہے دراصل اس کا دماغ کچھ خراب ہے، وہ پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا ہے، ایک سال سے وہ گھر ہی نہیں آیا، اسکی ماں کو جلد ہی اس

کے آنے کی امید ہے، وزیرزادہ نے پوچھا وہ دیکھنے میں کیسا ہے اور جب وہ گھر آتا ہے تو کیا کرتا رہتا ہے، برہمن نے جواب دیا وہ بالکل تمہارے برابر ہے، مگر تم سے کچھ چھوٹا ہے، وہ لنگوٹی لگائے رہتا ہے اور جسم پر بھبوت ملے رہتا ہے وہ کسی درخت کی شاخ ہاتھ میں لئے لئے اپنی ماں کے دروازے پر پاگلوں کی طرح ناچتا ہے اور دھپ دھپ بڑبڑاتا رہتا ہے، جب اسکی ماں کچھ دن ساتھ رہنے کے لئے کہتی ہے تو وہ دیوانوں کی طرح کہتا ہے میں نہیں رہوں گا، میں نہیں رہوں گا، اگر رہنا چاہتا ہے تو صرف ہم ہم کر دیتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ رہے گا، برہمن نے جو یہ باتیں بتائیں تو وزیرزادہ نے اندازہ لگایا کہ راجکماری اکیلی سانپ کا من لیکر باہر نکلی ہوگی اور راجہ کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا ہوگا، اور ناگ کا من صرف فقیر کی ماں کے پاس ہوگا، اور راجکمار اکیلا پانی کے محل میں پھنسا ہوا ہوگا، اسکو نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہوگی، وزیرزادہ یہ خیال کرکے بہت مغموم ہوا، اور اپنے دوست کو نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگا، سوچتے سوچتے ایک دم سے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ بڑھیا سے سانپ کا من کسی طرح حاصل کرنا چاہیے اس کیلئے اس کو فقیر چند کا بھیس بنانا ہوگا اور وہ بڑھیا کے پاس جاکر اسکی مدد سے راجکماری کو بھی چھڑالے گا، بڑھیا کو اپنے لڑکے کے آنے کا انتظار تو ہے ہی اس لئے اسکو کچھ بھی شبہ نہ ہوگا، وزیرزادہ یہ سوچ سارہے دوسرے دن برہمن سے رخصت ہوکر شہر سے باہر چلا گیا، وہاں اس نے کپڑے اتار کر لنگوٹی لگائی اور اپنے جسم پر بھبوت مل کر اور ایک درخت کی شاخ ہاتھ میں لیکر فقیر کی ماں کی جھونپڑی میں جا پہنچا، دھپ دھپ بڑبڑا کر ناچنے لگا، اس کے بڑبڑانے اور ناچنے کی آوازیں جب بڑھیا نے سنیں تو اسے گمان ہوا میرا بیٹا آگیا ہے، وہ خوش ہوکر پکارنے لگی، فقیر تم آگئے، آؤ، آؤ، دیوتاؤں نے میری مراد سن لی، بڑھیا کی آواز سن کر بنا ہوا فقیر چند ہم ہم بڑبڑاتا درخت کی شاخ ہلاتا اور بھی زور زور سے ناچنے لگا، بڑھیا نے کہا دیکھو بیٹا اب تم میرے ساتھ ہی رہو، کہیں آؤ جاؤ نہیں، وزیرزادہ نے کہا میں نہیں رہوں گا میں نہیں رہوں گا، بڑھیا نے بڑے پیار سے کہا تو میرے ساتھ ٹھہر، میں تیرا بیاہ راجہ کی بیٹی سے کروادوں گی تو شادی کرے گا نہ وزیرزادہ نے ہم ہم کہدیا اور پاگلوں کی طرح بے تحاشا ناچنے لگا، بڑھیا نے پھر کہا فقیر تو سانپ کا من دیکھے گا، وہ سات راجاؤں کے خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے، وزیرزادہ نے ہم ہم کہہ دیا، بڑھیا نے سانپ کا من کمرے سے نکال کر وزیرزادہ کے ہاتھ پر رکھدیا، وہ اسے اپنا لڑکا تو سمجھے ہوئے تھی، وزیرزادہ نے من لے کر بڑی احتیاط سے اپنی کمر میں باندھ لیا، فقیر کی ماں اپنے لڑکے کے وقت پر آنکی خبر دینے اور اسے پانی سے نکلنے والی راجکماری دکھانے کے لئے محل میں جا پہنچی، وہ راجکماری کو پکڑنے کے بعد بڑی اہمیت حاصل کر چکی تھی، اسے اور اسکے لڑکے کو کسی نے بھی محل میں داخل ہونے سے نہیں روکا، بڑھیا سیدھی راجکماری کے کمرے میں چلی گئی، راجکماری نے ننگ دھڑنگ اور بھبوت ملے ہوئے پاگل کو رہ رہ کر جانوروں کی طرح ناچتے اچھلتے دیکھا تو اسے بہت برا معلوم ہوا مگر وہ کیا کر سکتی تھی، بڑھیا اور وزیرزادہ وہاں بہت دیر تک موجود رہے یہاں تک کہ دونوں وقت ملنے لگے، چراغ جلے بڑھیا نے اپنے لڑکے سے گھر واپس چلنے کو کہا، مگر بنے ہوئے فقیر چند نے اسکی بات نہ مانی اور وہاں رہنے کی ضد کرتا رہا، اسکی ماں نے بہت کوشش کی کہ وہ اسکے ساتھ گھر چلا چلے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا، اور یہی کہتا میں تو راجکماری کے پاس ہی رہوں گا، فقیر کی ماں مجبور ہوکر پہرے داروں سے اس کا خیال رکھنے کے بارے میں کہکر اپنے گھر چلی گئی جب سب لوگ آرام کرنے چلے گئے تو فقیر چند راجکماری کے پاس گیا اور اپنی اصلی آواز میں کہا راجکماری تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں وزیر کا لڑکا اور تمہارے سوامی کا دوست ہوں، راجکماری یہ سن کر پکار اٹھی اور زور سے بولی تم وزیر کے لڑکے! میرے سوامی کے جگری دوست، ہائے مجھے اس قید سے جلد چھڑاؤ، یہ زندگی تو موت سے بدتر ہے، میں خود اپنی بیوقوفی سے یہاں آن پھنسی، بھگوان کیلئے مجھے چھڑاؤ، جلد چھڑاؤ، یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وزیرزادہ نے تسلی و تشفی کی اور بولا میں آج رات ہی کو تمہیں آزاد کرانے کی کوشش کروں گا، جو جو میں کہوں وہ تم کرتی جاؤ، راجکماری نے کہا جو تم کہوگے وہی کروں گی،

اتنا کہہ کر نقلی فقیر چند انگنائی سے ہوتا ہوا محل سے باہر نکل گیا پہرے داروں نے اسے ٹوکا بھی مگر وہ ہُم ہُم کرتا یہ کہہ کر کہ میں ذرا دیر کے لئے باہر جاؤں گا اور پھر آ جاؤں گا باہر نکل ہی گیا پہرے داروں نے اسے پاگل فقیر سمجھ کر چلا جانے دیا، تھوڑی دیر بعد وہ راجکماری کے پاس لوٹ آیا، ایک گھنٹہ کے بعد وہ پھر باہر نکلا، پہرے داروں نے اسے للکارا، اس نے پھر ہم ہم کر دیا، پہرے دار اس کی اس حرکت پر بڑبڑانے لگے یہ سرپھرا تو رات بھر یوں ہی آتا جاتا رہے گا اور ہمارا ناک میں دم کر دے گا، چھوڑ دو جو اس کا جی چاہے کرے، اس کیلئے کون رات بھر بیٹھا رہے گا، وزیرزادہ بار بار اندر باہر آنے جانے سے پہرے داروں کو عادی بنا دینا چاہتا تھا کہ ان کو شبہ نہ ہونے پائے رات کے تیسرے پہر وزیرزادہ نے پھر انگنائی پار کی مگر اس بار کسی نے بھی اسے نہ ٹوکا، سب پہرے دار اونگھ گئے تھے، وزیرزادہ نے یہ وقت غنیمت جانا وہ خوشی خوشی راجکماری کے پاس گیا اور بولا، یہی گھڑی بھاگ نکلنے کی ہے، پہرے دار اونگھ رہے ہیں، آپ میری پیٹھ پر سوار ہو جائیے اور اپنے بال میری گردن میں لپیٹ کر مجھے مضبوطی سے پکڑے رہیے، راجکماری وزیرزادہ کی پیٹھ پر سوار ہو گئی اور وزیرزادہ اسے باہر نکال لے گیا، محل کے پھاٹک بھی کسی نے روک ٹوک نہ کی، وہ تیز تیز قدم بڑھاتا جلدی سے شہر کی حد پار کر کے تالاب پر پہنچا، راجکماری اس کی پیٹھ سے اتری اور یوں آسانی کے ساتھ چھٹکارا حاصل کرنے پر بہت خوش ہوئی اور خوشی کے مارے تھر تھر کانپنے لگی، وزیرزادہ نے کمر سے سانپ کا من نکالا اور راجکماری کو ساتھ لے پانی میں غوطہ لگا کر طلسمی محل میں جا پہنچا، راجکمار رنج و غم سے مردہ سے بدتر ہو گیا تھا جب اس نے اپنی بیوی اور دوست کو دیکھا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، تینوں ہی تو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے، انہوں نے تین دن محل میں گذارے، وزیرزادے نے جو کچھ بیتی تھی راجکمار سے بیان کی، راجکمار اور راجکماری وزیرزادہ کی جانثاری سے بہت متاثر ہوئے، اس کا شکریہ ادا کرتے کرتے ان کی زبانیں سوکھی جاتی تھیں، وہ اس کی دوستی کے دل سے قائل ہوئے اور مرتے دم تک دوستی نبھانے کا عہد کر لیا۔

تین دن کے بعد تینوں طلسمی محل سے نکل کر سانپ کے من کی روشنی میں تالاب سے باہر آ گئے ان کے پاس سواری کیلئے ہاتھی گھوڑے نہ تھے، انہیں پیدل ہی اپنے دیس کا رخ کرنا پڑا، راجکمار اور وزیرزادہ ناز و نعم میں پلے بڑھے تھے ان کیلئے اتنی دور تک پیدل چلنا تو دشوار تھا ہی مگر راجکماری کے لئے تو بہت زیادہ تکلیف دہ تھا، چلتے چلتے راستہ کے پتھروں اور کانٹوں نے اس کے نازک نازک پیروں کو لہولہان کر دیا، جب راجکماری کو زیادہ تکلیف ہونے لگتی اور اس میں چلنے کی تاب نہ رہتی تو راجکمار اسے اپنے چوڑے کندھے پر سوار کر لیتا، بوجھ کتنا ہی حسین اور نازک کیوں نہ ہو بہت دور تک اٹھا کر نہیں لے جایا جا سکتا، اس لئے راجکماری کو زیادہ تر پیدل ہی چلنا پڑتا،

تینوں چلتے رہے، چلتے رہے، ایک دن چلتے چلتے جنگل میں رات ہو گئی وہاں دور دور تک انسان کا نام و نشان نہ تھا وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ٹھہر گئے، وزیرزادے نے راجکمار اور راجکماری سے کہا آپ دونوں سو جایئے میں رکھوالی کروں گا، جلد ہی شاہی جوڑا نیند میں مدہوش ہو گیا، وزیرزادہ جاگتا رہا، اب کیا ہوا کہ اس پیڑ پر دو امر چڑیوں بے ہنگامہ اور بے ہنگامی کے جوڑے کا گھونسلہ تھا، وہ انسانوں کی طرح بول بھی سکتے تھے اور غیب کی باتیں بھی جانتے تھے، بے ہنگامہ اور بے ہنگامی آپس میں باتیں کرنے لگے، وزیرزادہ ان کی باتیں سن کر حیران رہ گیا، بے ہنگامہ نے کہا وزیرزادہ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے دوست راجکمار کو ابھی تو بچا لیا ہے لیکن آخر وقت وہ اسے بچا نہ سکے گا، بے ہنگامی نے پوچھا وہ کیوں ؟ بے ہنگامہ نے کہا راجکمار کو بہت سے خطرے پیش آنے والے ہیں، جب راجہ اپنے بیٹے کے آنے کی خبر سنے گا تو اس کے لئے ایک ہاتھی، ایک گھوڑا اور چند مندسگار بھیجے گا جب راجکمار ہاتھی پر چڑھے گا تو اس پر سے گر کر مر جائیگا بے ہنگامی بولی فرض کرو کہ کوئی راجکمار کو ہاتھی پر نہ بیٹھنے دے اور گھوڑے پر سوار کروا دے تو کیا اس کی جان نہ بچے گی، بے ہنگامہ نے کہا وہ اس خطرے سے تو بچ جائے گا مگر پھر دوسرے خطرے سے دوچار ہوگا جس وقت وہ اپنے باپ کے محل کے سامنے پہونچے گا اور شہر والے پھا

سے گذرنے لگے گا تو وہ پھاٹک گر پڑے گا اور وہ اس میں دب کر مر جائیگا بے ہنگامی بولی فرض کرو کہ کوئی شیروں والا پھاٹک راجکمار کے پہونچنے سے گروا دے تو کیا راجکمار بچ نہ جائے گا، بے ہنگامہ نے کہا ہاں وہ اس خطرے سے بھی بچ جائے گا، مگر ایک نیا خطرہ اور پیش آئیگا جب راجکمار محل پہونچے گا تو راجہ اس کے آنے کی خوشی میں دعوت کرے گا، راجکمار کے لئے رہو مچھلی کا کلہ خاص طور پر پکایا جائے گا، جب راجکمار وہ کلہ کھائے گا تو وہ اس کے حلق میں پھنس جائے گا اور اس کا دم گھٹ جائے گا،

بے ہنگامی نے کہا فرض کرو کہ کوئی آدمی اس کی تھالی سے وہ کلہ اٹھالے اور راجکمار کو کھانے نہ دے تو کیا وہ اسطرح بچ نہ جائے گا، بے ہنگامہ نے کہا اس خطرے سے تو اس کی جان بچ جائے گی مگر ایک اور خطرہ پیش آئے گا، کھانا کھانے کے بعد راجکمار اور راجکماری اپنے کمرے میں سونے جائیں گے تو ایک خوفناک ناگ نکل کر راجکمار کو ڈس لے گا،

بے ہنگامی بولی فرض کرو کوئی کمرے میں چھپ کر بیٹھ رہے اور جب سانپ نکلے تو اسے مار ڈالے تو بھی کیا راجکمار بچ نہ سکے گا، بے ہنگامہ نے کہا اس طرح راجکمار تو بچ جائے گا لیکن جو آدمی سانپ کو مارے گا اگر اس نے یہ باتیں راجکمار کو بتلادیں تو پتھر بن جائے گا، بے ہنگامی نے کہا کیا پتھر میں جان آنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، بے ہنگامہ نے کہا ہاں ہے، اگر راجکماری اپنے ہونے والے بچہ کے پیدا ہوتے ہی اسے مار کر اس کا خون پتھر پر چھڑک دے گی تو پتھر پھر آدمی بن جائے گا،

غیب داں چڑیوں کی باتیں یہیں تک ہونے پائی تھیں کہ کوے کائیں کائیں کرنے لگے، مشرق کی طرف آسمان پر سرخیاں چھاگئیں، پیڑ کے نیچے سوتے ہوئے مسافر بیدار ہوگئے، چڑیوں کی باتیں ختم ہوگئی تھیں مگر وزیر زادہ نے سب کچھ سن لیا تھا، تینوں پھر روانہ ہوگئے،

راجکمار، راجکماری اور وزیر زادہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ہاتھی گھوڑا اور بہت سے خدمتگار چلے آرہے ہیں، راجہ کو ان کے آنے کی خبر لگ گئی تھی، اس نے یہ سب ان کے لانے کے لئے بھیجا تھا، ہاتھی جس پر زر نگار جھول پڑی تھی راجکمار کیلئے آیا تھا چاندی کی آراستہ پیراستہ پالکی راجکماری کے لئے آئی تھی اور گھوڑا وزیر زادہ کے لئے آیا تھا، جیسے ہی راجکمار ہاتھی پر سوار ہونے کیلئے آگے بڑھا وزیر زادہ نے اس سے درخواست کی مجھے ہاتھی پر چلنے دیجئے اور آپ گھوڑے پر سوار ہو کر چلیے، راجکمار اس بات پر بہت متعجب ہوا، وہ سمجھا کہ وزیر زادہ نے جو اتنی خدمت انجام دی ہے اس لئے وہ اپنے کو اونچا سمجھنے لگا ہے، پھر یہ خیال کرکے کہ اس نے میری اور میری بیوی کی جانیں بچائی ہیں کچھ نہ کہا اور چپ چاپ گھوڑے پر سوار ہوگیا، اس کا دل وزیر زادہ کی اس حرکت پر خوش نہ تھا، جلوس روانہ ہوگیا اور محل کے قریب پہنچ گیا، شیروں والا پھاٹک راجکمار اور راجکماری کے استقبال کے لئے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، جب سب اس کے نزدیک پہنچے تو وزیر زادہ نے راجکمار سے کہا پہلے شیروں والا پھاٹک گروا دیا جائے پھر آپ اس سے گذریے گا اس پر راجکمار کو اور بھی حیرت ہوئی، جب وزیر زادہ اسکی کوئی وجہ نہ بتا سکا تو اس کا دل اس کی طرف سے اور کھنچ گیا پھر بھی اس کی خدمات کے خیال سے اسکی بات مان لی اور شیروں والا خوبصورت پھاٹک گروا دیا گیا اب سب لوگ محل میں داخل ہوئے، راجہ نے اپنے بیٹے، بہو اور وزیر زادہ کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا انھوں نے اپنی مصیبتوں اور آفتوں کے واقعات راجہ اور درباریوں کے سامنے بیان کیے سب لوگ سن کر بہت متعجب ہوئے اور وزیر زادہ کی عقل و دانش اور راجکمار کے ساتھ وفاداری کی بڑی تعریف کی،

محل میں جتنی عورتیں جمع تھیں وہ سب راجکماری کا غیر معمولی حسن و جمال دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئیں اور اس کی سرخ و سفید رنگت اس کی راج ہنس کی سی گردن، اس کی ہرنی کی سی بڑی بڑی سیاہ رسیلی آنکھیں، اس کے یاقوت کی طرح سُرخ سُرخ ہونٹ، اس کی ستواں ناک، گلاب جیسے شاداب رخسارے، ایڑی تک پہونچنے والے بال اور اس کی ہاتھی جیسی متوالی چال دیکھ دیکھ کے اسکے حُسن کے ترنم کے پل باندھتی رہیں، اور اس کے ماں باپ کا حال پوچھا کیں، طلسمی محل اور سانپ کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرتی رہیں باتیں کرتے کرتے کھانے کا وقت آگیا اور سونے کی تھالیوں میں ان کے آگے کھانا لگایا گیا، طرح طرح کے لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے تھے، راجکمار کے سامنے سونے کے بادیہ میں رہو کا بڑا سا کلہ رکھا گیا تھا کھانے کھانے وزیر زادہ نے راجکمار کے بادیہ سے کلا اٹھا لیا اور کہا راجکمار اسے

مجھے کھانے کی اجازت دیجئے" اب تو راجکمار کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور کچھ نہ کہا، وزیرزادہ نے تاڑ لیا کہ میرا دوست بے حد خفا ہو گیا ہے، لیکن وہ کچھ نہ سکتا تھا، اگر وہ کچھ کہتا تو اس کے دوست کی جان کو خطرہ تھا، اگر وہ اس کی وجہ بتاتا تو خود کے پتھر بن جانے کا اندیشہ تھا، جب کھانا ختم ہوا تو وزیرزادہ نے راجکمار سے گھر جانے کی اجازت چاہی، پہلے راجکمار اسکو جانے ہی نہ دیتا تھا، لیکن آج اسکی عجیب و غریب حرکتوں نے اس کو سخت صدمہ پہنچایا تھا اس نے اسے فوراً جانیکی اجازت دیدی، مگر وزیرزادہ ہرگز اپنے گھر جانا نہیں جانا چاہتا تھا، اسے اپنے دوست کی زندگی کو آخری خطرے سے بچانا باقی تھا، وہ تلوار لیکر راجکمار کے سونے کے کمرے میں جا کر مسہری کے نیچے چھپ گیا راجکمار اور راجکماری کھانے کے بعد بستر پر آن لیٹ رہے آدھی رات کو جب وہ گہری نیند سو رہے تھے تو وزیرزادہ نے دیکھا ایک بہت بڑا ناگ، نالی سے کمرے میں داخل ہوا اور رینگ کر مسہری پر چڑھنے لگا وزیرزادہ نے فوراً مسہری کے نیچے سے نکل کر تلوار سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ان ٹکڑوں کو پانی کی تھالی میں رکھ دیا، اب کیا ہوا کہ جب وزیرزادہ سانپ کے ٹکڑے کر رہا تھا تو اس کے خون کا ایک قطرہ راجکماری کے سینہ پر جا پڑا، اسے اندیشہ ہونے لگا کہیں وہ خون کا قطرہ نازک راجکماری کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے، اس لئے اس نے سوچا کہ اسے زبان سے چاٹ لے، اس کے لیے ایک نوجوان لڑکی کو نیم عریاں حالت میں دیکھنا زبردست گناہ تھا، اس نے کیا کیا کہ اپنی آنکھوں پر ماتھ پٹیاں باندھ لیں اور آگے بڑھ کر اور جھک کر خون کا قطرہ چاٹ لیا، اب کیا ہوا کہ جس وقت وہ خون چاٹ رہا تھا راجکماری کی آنکھ کھل گئی اور اس کی چیخ نکل گئی، اسکی چیخ سے راجکمار جاگ پڑا وہ جاگ کر کیا دیکھتا ہے کہ وزیرزادہ جسکو وہ سمجھتا تھا کہ گھر چلا گیا ہے اس کی بیوی پر جھکا ہوا ہے انتہائی غیظ کے عالم میں وہ جھپٹ کر اس کا کام تمام کرنا چاہتا تھا کہ وزیرزادہ بولا ذرا ضبط سے کام لیجئے میں نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ ہی کی جان بچانے کے لئے کیا ہے، راجکمار غصہ سے بولا میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا جب سے تم پانی کے محل سے نکلے ہو عجب عجب حرکتیں کر رہے ہو پہلے تم نے مجھے ہاتھی پر سوار ہونے نہیں دیا مجھے خیال ہوا کہ تم نے جو

خدمات انجام دی ہیں ان کے سبب تم اپنے کو بڑا سمجھنے لگے ہو جس طرح دے کیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا، دوسری بار تم نے شیروں والے پھاٹک کو گروانے کی ضد کی جسے میرے استقبال کے لئے میرے باپ نے بڑی خوبی سے آراستہ کروایا تھا، اس بار بھی میں کچھ نہ بولا، کھانے کے وقت تم نہایت بدتمیزی سے میرے سامنے سے رہو کا کلہ جھپٹ کر کھا گئے، میں نے اس سے بھی درگزر کی کیونکہ تم مجھ سے زیادہ عزت کے مستحق تھے، تم نے گھر جانے کا بہانہ کیا مجھے بالکل افسوس ہوا اس لئے کہ تم میری نظروں سے گر چکے تھے، اس وقت تم میرے خاص کمرے میں بیوی پر جھکے ہوئے تھے، ضرور تمہاری نیت خراب تھی اب تم مجھے یہ کہہ کر دھوکا دینا چاہتے ہو کہ تم نے جو کچھ کیا میری جان بچانے کے لیے کیا، میں تمہاری چال اچھی طرح سمجھتا ہوں، وزیرزادہ نے گڑگڑا کر کہا میری طرف سے بدگمان نہ ہو اپنے دل سے برے خیالات نکال دو، دیوتا جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں اور میں نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ کی زندگی بچانے کیلئے ہی کیا ہے اگر مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت ہوئی تو میں اپنے طرز عمل کی معقولیت کے بارے میں کچھ کہتا، راجکمار نے کڑک کر کہا تمہیں کہنے سے کس نے منع کیا ہے تمہاری زبان کو کون پکڑے ہوئے ہے، وزیرزادہ بولا میری قسمت نے میرا منہ بند کر دیا ہے اگر میں ذرا بھی زبان کھولوں تو فوراً پتھر بن جاؤں گا، راجکمار نے کہا پتھر بن جاؤ گے؟ تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتے ہو کہ میں تمہاری بکواس پر یقین کر لوں گا، وزیرزادہ بولا دوست اگر تم سب جاننا چاہتے ہو تو اپنے دوست کو پتھر میں تبدیل ہوتا دیکھنے کیلئے تیار ہو جاؤ، راجکمار نے کہا جیتے ہو سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا، اب وزیرزادہ کیلئے کوئی چارہ نہ تھا، اس کو سب باتیں بتانا تھیں چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے، پھر بھی اس نے راجکمار کو رازوں کو جاننے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر راجکمار نے ایک نہ سنی، آخر وزیرزادہ نے کہنا شروع کیا کہ جس رات ہم اونچے پیڑ کے نیچے سو رہے تھے بے نہگامہ اور بے نہگامی کا جوڑا آپس میں باتیں کر رہا تھا اور وہ باتیں میں نے سن لی تھیں، بے نہگامہ نے راجکمار کو پیش آنے والے خطروں کی پیش گوئی کی تھی اور کہا تھا کہ راجکمار کی جان جانے کا اندیشہ ہے، جیسے ہی وزیرزادہ نے ہاتھی پر سوار ہونے کے

خطرے کی بابت بتایا اس کا نچلا دھڑ پتھر میں تبدیل ہوگیا، اس نے راجکمار کی طرف مڑ کر کہا یہ دیکھو دوست میرا دھڑ پتھر کا ہوگیا ہے، راجکمار نے کہا اچھا اچھا اپنا قصہ بیان کیے جاؤ، جب وزیرزادہ نے پھاٹک گرد ہونے کے بارے میں بتایا تو وہ آدھے دھڑ تک پتھر کا ہوگیا، اس کے بعد جب اس نے مچھلی کا کلہ کھانے کا راز بتایا تو گردن تک پتھر کا ہوگیا، وزیرزادہ نے کہا دوست اب صرف میری گردن اور سر باقی رہ گئے ہیں، اگر میں نے باقی حال بتایا تو سمجھو پتھر میں تبدیل ہو جاؤں گا، اب بھی سب سننا چاہتے ہو، راجکمار غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی بولا ہاں ہاں باقی حال بھی بتاؤ، وزیرزادہ بولا جب تم نہیں مانتے تو میں آخر تک سناتا رہوں گا جب میں بالکل پتھر میں تبدیل ہو جاؤں اور تم پچھتاؤ اور مجھے پھر اصلی حالت میں دیکھنا چاہو تو اس کے لئے بھی ایک تدبیر ہے جب راجکماری کے ہاں پہلا بچہ ہو تو اس کا خون اگر میرے پتھر کے مجسمے پر مل دیا جائے گا تو پھر میں زندہ ہو جاؤں گا یہ بتانے کے بعد وزیرزادہ نے سانپ والی پیش گوئی بھی کہہ دی، آخری لفظ اس کے منہ سے ادا ہوا تھا کہ اس کا باقی حصہ بھی پتھر کا ہوگیا اور وہ زمین پر گر پڑا، راجکماری بچھونے سے اچھل پڑی　اور جب اس نے پاؤں کی تھالی دیکھی تو اس میں سانپ کے ٹکڑے موجود تھے اب تو راجکمار اور راجکماری دونوں بہت پچھتائے انہیں اپنے بچھڑے ہوئے دوست کی وفاداری اور جانثاری کا یقین ہوا وہ پتھر کے مجسمے کے پاس گئے مگر وہ بے جان پڑا ہوا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن مجسمے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی انھوں نے دل و جان سے طے کر لیا کہ وہ پتھر کے مجسمے کو کسی محفوظ جگہ چھپا کر رکھ دیں گے اور جب ان کے ہاں پہلا بچہ ہوگا تو اس کا خون اس پر مل کر اسے دوبارہ زندہ کر لیں گے،

دن گذرے، مہینے گذرے اور راجکماری کے ہاں بڑا ہی خوبصورت پھول جیسا بچہ پیدا ہوا، وہ ہو بہو اپنی ماں کی صورت کا تھا، راجکمار اور راجکماری اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اسکی خوبصورتی نے انہیں حیران بنا دیا وہ اس کو خوشی خوشی بچا سکتے تھے مگر انہیں اپنے پیارے جانثار دوست وزیرزادہ کو زندہ کرنے کا عہد یاد تھا، انہوں نے فوراً اپنے جگر گوشہ کے دو ٹکڑے کر کے اس کا خون پتھر کے مجسمے پر مل دیا خون کے ملتے ہی پتھر کے مجسمے میں جان آگئی اور وزیرزادہ راجکمار اور راجکماری کے سامنے جیتا جاگتا کھڑا ہوگیا یہ دیکھ کر ان دونوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی مگر جب وزیرزادہ نے خوبصورت بچہ کو خون میں لت پت دیکھا تو وہ بیحد رنجیدہ ہوا، اس نے مردہ بچہ کو کپڑے میں لپیٹ لیا اور اسکو دوبارہ زندہ کرنے کی تدبیر میں نکل کھڑا ہوا

وزیرزادہ اپنے دوست کے جگر گوشہ کو ہر قیمت اور ہر شرط پر زندگی دلانے کی ٹھان چکا تھا اس نے ملک بھر کے بڑے بڑے دیدوں کو اسے دکھایا مگر وہ بے بس تھے وہ کوئی بھی مرض ہو اسے اچھا کر سکتے تھے مگر کسی بیجان کو زندہ کرنا ان کے اختیار سے باہر تھا، وزیرزادہ اسی فکر و پریشانی میں غلطاں تھا کہ اس کو اپنی بیوی کا خیال آگیا وہ کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی اور کالی مائی کی زبردست بھگت تھی اس نے سوچا اس کی پوجا سے ہی شاید کالی مائی مردہ بچہ کو زندہ کر دے، یہ سوچ کر وہ اس شہر کی طرف مردہ بچہ کو لے کر چل دیا وہاں پہونچ کر اس نے بیوی کے گھر سے ملے ہوئے باغ کے ایک پیڑ سے کپڑے میں لپٹے ہوئے بچہ کو لٹکا دیا اور گھر میں داخل ہوگیا اسکی بیوی نے اتنے عرصے کے بعد جو اپنے سوامی کو دیکھا تو اس کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی مگر اس نے یہ دیکھا کہ وہ بہت اداس ہے اور بہت کم بولتا چالتا ہے اور ہر وقت کسی فکر میں ڈوبا رہتا ہے تو اسے حیرت بھی ہوئی اور رنج بھی ہوا اس نے اسکی اداسی کی وجہ بہت پوچھی مگر وزیرزادہ نے کوئی جواب ہی نہ دیا ایک رات اس نے کیا کیا کہ جب دونوں بچھونے پر سو رہے تھے تو وہ وزیرزادہ کو سوتا سمجھ کر چپکے سے اٹھ پڑی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی وزیرزادہ اپنی فکر کی وجہ سے سو نہیں رہا تھا جب اس نے آدھی رات کو اپنی بیوی کو باہر نکلتے دیکھا تو وہ چپکے چپکے اس کا پیچھا کرنے لگا، اس کی بیوی گھر کے قریب کے کالی مائی کے مندر میں جا پہنچی اور دیوی پر پھول چڑھا کر چندن کی لکڑی کی دھونی دے کر دیوی سے پرارتھنا کرنے لگی۔ کالی ماتا مجھ پر دیا کرو اور میری تکلیفیں دور کر دو، دیوی نے پوچھا اب تجھ کو کیا دکھ ہے، تو بہت دنوں سے اپنے پتی کی واپسی کی پرارتھنا کر رہی تھی اب وہ واپس آگیا ہے پھر تجھے کیا غم ہے، بیوی نے کہا یہ تو سچ ہے کہ میرے پتی واپس آگئے مگر وہ بہت رنجیدہ اور اداس رہتے ہیں، بولتے چالتے نہیں ہیں، مجھ سے ہنستے کھیلتے بھی نہیں ہیں، ہر وقت تنہائی میں بیٹھے کسی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں، دیوی نے کہا اپنے پتی سے اداس رہنے کی وجہ معلوم کر کے مجھے بتاؤ، وزیرزادہ اپنی بیوی اور دیوی کی باتیں چھپ کر

یونس احمر

آئینہ بی بی

مشرقی پاکستان کی سوندھی سوندھی مٹیوں اور توس قزحی فضاؤں میں ان گنت لوک گیت اور لوک کہانیاں روپوش ہیں ان کہانیوں اور گیتوں میں بنگال کے صحیح رنگ روپ ملتے ہیں ہمیں ملاحوں کے دلوں کی دھڑکنیں، ہیں چرواہوں کے دل‌رس نغمے ہیں۔ ان کے اندر کنواری ناریوں کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جو پنگھٹ کنارے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہیں بارہ ماسی گیت اساڑھ میں ندیوں نالوں کا شور، جاڑے کی ماتمی شامیں بھادوں کی چاندنی راتیں بسنت میں رنگ برنگ کے پھولوں پر بھونروں کی وارفتگی ـــ ان موسموں کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ لگانا ہو تو ان منظوم لوک کہانیوں کو پڑھئے جن کے خالق کاشتکار اور ملاح ہیں گاؤں دیہات کے ان ان پڑھ شاعروں نے زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں لفظوں کے جال نہیں بنتے انکی زبان سیدھی سادی مگر پراثر ہے وہ رمزیت اور اشاریت سے گریز کرتے ہیں۔

"آئینہ بی بی" بھی مشرقی پاکستان کی نہایت پراثر لوک کہانی ہے اس میں عشق و محبت کی دلسوزی و دل گرفتگی ہے گاؤں کی گوری کا حسن ضیا پاش عشق کی چشم نیم باز کو خیرہ کر رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گیتوں کی پھوار بن رہی ہے۔ سہمی سہمی ہوئی لہر بہر سا سنہیں کھیتوں میں دہقان کے خوشوں کو برما رہی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان کاشتکار محمود نے آئینہ بی بی کے چندن جیسے روپ کو دیکھا اور اسکی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

دیس میں اپنے سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہیں دھول

محمود کا جذبۂ عشق آئینہ بی بی کے حسن معصوم کو تپا گیا۔ وہ ندی کنارے دم بجز نگاہیں نیچی کئے کھڑی رہی اس کا چہرہ شرم کے مارے شفق زار بن گیا۔ وہ نوجوان کے سامنے سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن قدم سو سو من کے ہو گئے

محمود بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اسکی ماں نے دکھ جھیل کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ سولہ سال کی عمر ہوئی تو اس نے ہل بیل سنبھال لئے۔ کاشتکاری شروع کر دی۔ شب و روز کی محنتوں کا پھل جلد ہی مل گیا۔ دھان کے خوشے سر اٹھانے لگے ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ بیٹے کی محنت کا پھل ماں کو سرور و کیف دے گیا۔ اس نے پیر صاحب کی درگاہ میں منت مانی تھی۔ منت پوری ہو گئی۔ اسکی کٹیا کے در و بام جھوم اٹھے اور یکبارگی دعاؤں کے لئے اسکے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے:

مرے پتر کو آہنی کاٹھ دے
یہاں سورما کی طرح وہ جئے

محمود سچ مچ گبرو جوان تھا۔ اسکے انگ انگ سے شجاعت و مردانگی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ گاؤں کی گوریاں اسے دیکھتیں اور کٹ کٹ جاتیں۔ مگر:

سانے نہیں کٹتے ہیں دن جیٹھ مہینے کے
اور آنکھیں جھپکتے ہی ہو جاتی ہے پربھات

محمود تو کسی کل چین نہیں۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن ہے اسے کسی پہلو آرام نہیں ملتا۔ ایک نجانا سا درد ہے جسکے باعث اسکا من بیکل ہو رہا ہے اب کھیت میں اس کا جی نہیں لگتا اب ہل بیل اسے خوشی نہیں دیتے اب تو:

"آم پا کے جام پا کے کاگا بولے را"

اور "کاگا" کی کائیں کائیں دم بھر کے لئے امید بندھا جاتی ہے کہ اس کی کٹیا میں ضرور کوئی مہمان آنے والا ہے لیکن اسکی کٹیا میں کوئی نہیں آیا۔ اسکی ماں کی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں حالانکہ:

اسی بیٹے گھر ہیں بنائے بن کے سارے پنچھیوں نے

ہو نہ آئی ہائے بھاگ جلی کی کٹیا میں

اب اساڑھ کا مہینہ بھی آگیا۔ میگھ رانی کی سواری دور دور تک جانے لگی۔ سوکھی ندیاں جل تھل بن گئیں۔ گاؤں کے نوجوان کمائی کے لئے دور دیس جانے لگے۔ جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں بادبان اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود نے بھی دور دیس جانے کا قصد کیا۔ بھلا ماں کا دل کیسے مانتا۔ اس نے بیٹے کی منت سماجت کی۔ اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ نہ مانا۔ ماں کی آنکھوں میں اساڑھ کے بادل سماگئے۔ محمود رخصت ہونے لگا۔ آسمان کالی بدلیوں سے ڈھک گیا اور دیکھتے دیکھتے اسکی ناؤ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چھ ماہ جدائی میں بیت گئے مگر محمود کا پتہ نہ چلا۔

محمود کی ناؤ ایک نجانے دیس کے کنارے آکر رکی۔ اس نے ندی کنارے اگے ہوئے درخت کی جڑ سے اپنی ناؤ کو باندھا۔ وہ گاؤں کے اندر داخل ہوا کچھ دور چلنے کے بعد اسکی نگاہ ایک کٹیا پر پڑی جو کھاٹ پر ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا اسکی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ بڈھے نے محمود کو بلایا اور اس سے اپنی کیفیت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں آئینہ بی بی ندی سے گاگر بھر کر آگئی۔ اس نے ایک اجنبی جوان کو دروازے پر دیکھا تو:۔

شرم کے مارے لال ہوا منہ تھر تھر کلیجہ لاگا[1]

جانا چاہا پر نہیں اٹھے کنیا کے دو پا[2]

محمود آئینہ بی بی کے روپ رنگ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ایسا بے پناہ حسن اسنے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسکے سر کے کالے کالے بال پاؤں کو چھو رہے تھے آنکھوں میں کٹاری تھی۔ جسم کے انگ انگ میں جادو سمایا ہوا تھا اسکی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

دیس میں سندر پیارے پیارے پھول ہیں
اس ناری کے روپ کے آگے سب لگیں گے دھول

محمود نے بڈھے سے جب اپنا تعارف کرایا اور ماں باپ کے نام بتائے تو اسکی آنکھیں روپڑیں۔ بڈھے نے کہا۔ "زمانہ ہوا جب میں اور تمہارے باپ دوست تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے ہائے" محمود کو اپنے باپ کے بارے میں بہت سی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڈھے کو سلام کیا اور مودب ہو کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک اسکی نگاہیں آئینہ بی بی کا طواف کرتی رہیں۔ پھر وہ رخصت ہوگیا۔ اور اسکی ناؤ پورب دیس کی سمت بہنے لگی۔

محمود کی روانگی کے بعد آئینہ بی بی کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ اب اسکی آنکھیں کسی چت چور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنے من میں محبت کا دیپ جلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی شام ہوتی کٹیا میں چراغ جلانا بھول جاتی۔ ندی کنارے نہاں بھرن کو جاتی مگر آنکھیں کسی اور کو تلاش کرتیں اور دل ہی دل میں کہتی جاتی:۔

اپنے نگر میں کس نگری سے بہہ کر آئی نیا رے
کس نے من میں تیر چلایا، بول ذرا پردیا رے؟
کون بھلا پوچھے گا پیارے اپنے من کو رنگ کے کیا
چنتا ایسا روگ ہے بندھو جسکی نہیں کوئی دوا

لیکن محمود لوٹ کر آگے بڑھتا گیا۔ اب پورب سے بہہ کر آنیوالی ہوائیں اسکے من میں کانٹے چبھونے لگیں۔ اس کا جی بے کل ہونے لگا اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں لیکن آنکھیں بند کرنیکے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ آئینہ بی بی اسکے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے آسمان کی گود میں تنہا ایک تارہ جگمگا رہا ہو تین ماہ اس طرح بیت گئے۔ وہ پھر آئینہ کے گاؤں میں واپس آگیا اس نے جتنے مال واسباب خریدے تھے سب منہ مانگے دام میں بیچ دیئے اسکا من آئینہ سے ملنے کیلئے تڑپ رہا تھا مگر جب کٹیا کے اندر داخل ہوا تو وہاں آدمی تھا نہ آدم زاد۔ اسکے احساسات و جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ وہاں سے مایوس و نامراد لوٹ گیا کتنے گاؤں گھوم گھوم کر اس نے آئینہ کی تلاش کی مگر لا حاصل۔ اب وہ اپنی جھولی پھیلا کر گھر گھر جانے لگا کہیں سے اسکو بھیک مل جاتی۔ کوئی اسے گالیاں دیتا کسی نے اسکو اچکا اور لفنگا سمجھا، کسی نے پاگل اور دیوانہ گردانا اس طرح اس نے تین گاؤں کے پھیرے لگا دیئے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو محمود نے دوسرے گاؤں کا راستہ لیا اس وقت گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے وہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے رات اسی کے نیچے بسر کرنے کی ٹھانی۔

صبح ہوئی تو اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ وہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگتے مانگتے ایک دروازے کے پاس آیا کہ اسکی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی جھولی ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ محمود نے کہا:۔

"یہ روپ دھارن میں نے تمہارے لئے کیا ہے
تمہاری تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا کتنے گاؤں کی خاک چھانی

[1] لاگا۔ جسم سے [2] پا۔ پاؤں۔ بنگلا میں پاؤں کو پا کہتے ہیں

یہ سلسلہ لاتناہی چھ مہینے سے جاری تھا۔

جس نے مجھے اس روپ میں دیکھا پاگل سمجھا
پیاری میں چاول پیسے کی بھیک نہیں مانگتا ہوں۔
میں تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں
میں تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں، چلو اپنے دیس لوٹ چلیں"۔

آئینہ نے روتے روتے جواب دیا ـــــ

"ظالم باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے' یہ ماموں کا گھر ہے
چھ ماہ سے میں بھی آنکھوں سے گنگا بہا رہی ہوں۔
جہاں جی چاہے مجھے لے چلو پیارے!
پریت سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔
پریت ہی تو دھن ہے' پریت ہی جیون اور گلے کا ہار ہے"۔

ماموں کے لڑکے سے آئینہ کی نسبت طے پائی تھی۔ لیکن وہ محمود کے ساتھ فرار ہو گئی اس کے گھر میں آکر اس نے محمود سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ محمود جب بھی بازار جاتا آئینہ اس سے فرمائش کرتی ـــ

"پیارے تم میرے لئے کنگھی ضرور لانا ـــ اور ہاں نقد اور آسمانی رنگ کی ساڑھی بھی!
میں یہ ساری پہن کر ندی کنارے جاؤں گی اور تم مجھے دیکھ کر مسکراؤ گے۔

پیارے خوشبودار تیل لانا بھی نہ بھولو"۔

خوشی اور مسرت کے یہ دن مختصر ثابت ہوئے۔ محمود نے پھر دور دیس جانے کی ٹھانی۔ اسار ھ کے اس مہینے میں وہ دور دیس جا کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ آئینہ کو جب معلوم ہوا تو اس کی آنکھوں تلے تاریکی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسکی زندگی کا سورج گہنا گیا۔ وہ اداس ہو گئی اس کا دل بھر آیا۔ اسی عالم بے قراری میں وہ محمود سے مخاطب ہوئی۔

پیارے مجھے چھوڑ کر تم دور دیس نہ جاؤ
تمہارے بنا یہ پہاڑ سے دن میں کیسے کاٹوں گی۔
جوانی کے دنوں میں شوہر تو پھولوں پر بھونرا جیسا ہوتا ہے

پیارے نہ جاؤ!
دیکھو ندی کیسا شور مچا رہی ہے
میں اپنی اس بھری جوانی کو کیسے سنبھال کر رکھوں گی
میرے پاس نہ تو سونا ہے' نہ چاندی ہے نہ پیتل'
دل میں بس ایک آس ہے تمہاری' اسے نہ توڑو!"

لیکن محمود نہ مانا اپنے دوستوں کو لے کر دور دیس روانہ ہو گیا چند ہی دنوں کے بعد ہی دوست واپس آئے اور آئینہ کو اطلاع دی کہ ناؤ ڈوب جانے کی وجہ سے محمود بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس خبر کو سنکر آئینہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گئی اور گھر سے نکل گئی۔ کسی طرح وہ ندی کے کنارے آئی تھی کہ ایک خانہ بدوشوں کی ناؤ کنارے آ گئی اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان عورتوں سے اس نے اپنی حالت زار بیان کی۔ اسکی روداد غم سنکر وہ اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اسکو اپنی ناؤ میں رہنے کی اجازت دی۔ اسکے علاوہ ان خانہ بدوش عورتوں نے محمود کی تلاش میں آئینہ کی مدد بھی کی لیکن "چاند محل" نہ ملا۔ مسلسل تلاش جستجو کے بعد آئینہ مایوس نہ ہوئی۔ تین سال تک میدوں کا گھر ڈھونڈتا اور بگڑتا رہا۔ یکایک ایک دن چرواہے کی زبانی معلوم ہوا کہ جہاں ندی ختم ہو جاتی ہے وہیں "چاند محل" ہے۔ اور اس "چاند محل" میں ایک دلہن شام سے چراغ جلاتی ہے یہ سن کر آئینہ بی خانہ بدوش ناری کا لباس پہن کر باہر نکلی۔ اس نے جوڑا بھی ویسے ہی باندھا۔ گلے میں تعویذ گنڈے تھے اور سر پہ بوجھ۔

ندی پار کر کے آئینہ ٹھیک "چاند محل" کے قریب پہنچ گئی۔ درخت اسی طرح سر سبز تھے اور ان کی شاخوں میں پرندوں نے آشیانے تیار کر رکھے تھے۔ یہیں اس کا عیش کدہ تھا۔ جہاں اس نے کتنی حسین راتیں گذاری تھیں۔ اس نے جلدی جلدی "چاند محل" میں داخل ہونا چاہا مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آج تین سال کے بعد وہ اپنے گھر آئی ہے۔ آج وہ اپنے "چت چور" سے ملے گی۔ خوشی سے اسکی آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ اس نے ساڑھی کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا۔ صحن میں مہندی کا درخت اسی انداز سے کھڑا نظر آیا۔ یہ مہندی کا درخت آئینہ نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس "چاند محل" کے در و دیوار میں اس کے کتنے سپنے سانس رہے تھے۔ اس کی ممتا کے کتنے دیپ جل رہے ہیں مگر اس "چاند محل" پر آج اس کا اختیار نہیں۔ محمود یعنی اس کے چت چور نے دوسری شادی رچالی اور اب اس گھر پر اس کی نئی بیاہتا کا راج ہے۔

اسکی ساس اسے پہچان نہ سکی اس نے پوچھا:—

اے لڑکی تو کون ہے؟ کہاں سے آ رہی ہے؟ اس طرح رو رہی۔"

اور آئینہ نے جواب دیا:

کیا بتاؤں میں کون ہوں — ہاں اتنا یاد ہے
کہ جب میں روتی تھی تو تم تڑپ اٹھتی تھیں اور اپنے آنچل
سے میری آنکھیں پونچھتی تھیں۔
مگر اب میری ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں"۔

ساس نے پوچھا۔

تو کیا تم واقعی آئینہ ہو جس کے غم میں روتے روتے میری آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی ہے۔ آؤ میرے پاس آؤ اب تم اپنی دکھی ماں کو چھوڑ کر نہ جاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مگر آئینہ نے خون کا گھونٹ پی کر جواب دیا "نہیں میں اس گھر میں نہیں آؤں گی ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی"۔ اور اتنا کہہ کر آئینہ ناؤ میں بیٹھ گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا:

پنکھ پکھیرو چاند محل کے تم سے اتنا کہنی ہو
اس کو میرے آنگن کی سن گن تک نہ جائے
میرے من کی آشا کیا ہے اتنی سی بس آشا ہے
سکھی رہے چت چور سجن اس بیرا در کیا چاہے

آئینہ بی بی کی ناؤ چل پڑی — بہت دور — یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ اور جب محمود گھر واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ آئینہ سے تلاش کرتے کرتے چاند محل تک آئی تھی اور کسی نے اسکو روکا تک نہیں تو اس کا ذہن مفلوج ہو گیا وہ گھر سے نکل گیا اور پھر واپس نہ آیا +

چندراوتی (سلسلہ صفحہ ۲۶۶)

میں دور کھڑا رہوں گا اور نہ تمہیں مس کرونگا اور نہ پکاروں گا

لیکن مندر کا دروازہ نہیں کھلا۔ جے چندر نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کچھ نظر نہ آیا صرف سامنے مالتی کے پھول کھلے ہوئے تھے ان پھولوں کو اس نے بڑی حسرت سے دیکھا اور کچھ دیر بعد مایوس ہو کر مندر کے دروازے میں یہ چند سطریں لکھ دیں۔

شے شو کا پرستش تومی جو نبر کا لپر ساتھی
اے بچپن اور جوانی کی ساتھی
اپرادھ کھما کرو تومی چندراوتی۔
میرے گناہوں کو معاف کر دو۔

اور یکایک چندراوتی کو ہوش آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا تو مندر کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ مگر باہر بھی کوئی نہ تھا۔ اور جب اچانک اس کی نگاہیں دروازہ پہ پڑیں تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کچھ دیر بعد چندراوتی نے کلسی لی اور ندی کی طرف روانہ ہوئی۔ پہلے وہ اشنان کرنے کے لئے ندی میں اتری۔ ندی میں اترنا تھا کہ ایک حسین نوجوان کی نعش پانی پہ تیرتی ہوئی نظر آئی — وہ جے چندر کی نعش تھی۔ اور اس کے علاوہ نعش کس کی ہو سکتی تھی۔ اس پر جیسے بجلی گر پڑی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی کھویا ہوا خواب دیکھ رہی ہو۔

یونس احمد

چندراوتی

چندراوتی مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ کی رومانی داستان ہے اس کا مصنف ایک گمنام عوامی شاعر نین چاند گھوش ہے۔ پوری کہانی نظم میں ہے اور جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ خالص عوامی اور عام فہم ہے۔

ضلع میمن سنگھ رومانی داستانوں کے لئے بے حد مشہور ہے اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے اس کے کنارے کنارے برہم پترا بہتا ہے۔ جو خطرناک بھی ہے اور رومان پرور بھی۔ اس دریا نے بہت ساری داستانیں جنم دی ہیں۔ مثلاً مہوا ملکا، روپ وتی، کاجل ریکھا اور دیوان مدینہ۔ ان میں مہوا، کاجل ریکھا اور دیوان مدینہ بہت مشہور ہے۔

چندراوتی اپنے آپ میں بھری بھری مستانی تھی۔ اس کے انگ انگ سے آتش سیال کے قطرے ٹپکتے تھے۔ حسن سادہ میں وہ من موہ لینے والی کشش تھی کہ جے چندر اس کا گرویدہ ہو گیا۔ چندراوتی کو پوجا پاٹ سے والہانہ عشق ہو گیا تھا۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی پھولیشوری ندی کنارے پھولوں کے درخت کے پاس پہنچ جاتی اور اپنے پسندیدہ پھول توڑتی اسے اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ کوئی بھونرا اس پر منڈلا رہا ہے۔ ایک دن یکایک چندراوتی کی ساغر یکف نگاہیں جونہی اٹھیں اس نے اپنے سامنے ایک گبرو جوان کو دیکھا وہ نازک شاخ کو پکڑے ہوئے تھا اور چندراوتی پھول توڑ رہی تھی

اس نے ذرا لجاتے اور شرماتے ہوئے جوان سے پوچھا

"شاخوں کو توڑ کر پھول چننے والے نوجوان تم ہو کون؟"

نوجوان ایک سراپا قیامت حسینہ کو ہمکلام ہوتے ہوئے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اس نے جواب دیا۔

"ندی کے اس کنارے میری بھی کٹیا ہے،
لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم صرف مالتی پھول کیوں توڑتی ہو؟"

چندراوتی کی شرم آگیں آنکھیں جھک گئیں۔ بولی۔

"مالتی پھول جن کی خوشبو مجھے بھاتی ہوں اور وہیں پوجا کرتی ہوں"

محبت نامہ چند ملاقاتوں کے بعد جے چندر کا رواں رواں عشق کی آگ میں جلنے لگا اور اس کی بے تابیاں اس حد تک آگے بڑھ گئیں کہ اس نے چندراوتی کے دیئے ہوئے پھولوں کے پتوں پہ ایک محبت نامہ لکھا جس میں اس نے اپنے دل کی دھڑکنیں تک گنا دی تھیں اس نے لکھا تھا۔

"تم گلشن سے کیا گئیں کہ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔
اور تمہارے پھولوں کا یہ ہار بھی تمہاری جدائی میں ماتم کناں ہے۔
دل کی بات زبان تک آتی ہے مگر کہہ نہیں پاتا
اور پھر ساری باتیں کہوں کیسے دل جو بھر آتا ہے
چندراوتی میں تمہارا کیا مقابلہ کروں،
تم تو اس باپ کی بیٹی ہو جس کی عادات و خصائل قابل رشک ہیں
میرے باپ ہے نہ ماں، میں تو ماموں کے گھر رہتا ہوں،
تم سے اپنے دل کی بات کیسے کہوں چندراوتی!۔
جس دن سے میں نے تمہارے چاند جیسے دودھیا لے جسم کو

دیکھا ہے

میرا من اسی دن سے پاگل ہو چکا ہے۔
اگر تم میری ہو گئیں، میں تمہارا غلام بن جاؤں گا۔
کاش تم بھی مجھ پر اپنا خیال ظاہر کر سکو،

دوسرے دن حسبِ معمول پو پھٹنے سے پہلے ہی چندراوتی باغ میں پھول توڑنے گئی۔ پہلے اُس نے دیوتا پر چڑھانے کے لئے جبا یا کسم کے پھول توڑے۔ پھر ہار بنانے کے لئے مالتی پھول توڑے۔ اسی وقت نوجوان بھی آ گیا اس نے پھول نہیں توڑے، صرف اس کی طرف اپنا محبت نامہ بڑھا دیا۔ اور اتنا کہا۔

"نازک شاخوں سے پھول توڑنے والی حسینہ
ذرا میری طرف دیکھو!"

چندراوتی کے تمتماتے ہوئے گال سُرخ ہو گئے اس نے کہا۔

"پھول توڑ چکی، وقت بھی ہو چکا ہے۔
میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں، مجھے رخصت کرو۔
پتاجی شیودیوتا کی پوجا کے لئے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے"

گبرو نوجوان کا دل بھر آیا، اس نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

"اچھا حسینہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہوں شاید پھر ملاقات نہ ہو"

چندراوتی پھولوں کو دامن میں بھر کر مندر آئی اس نے سب سے پہلے گنگا جل سے مندر کو دھویا اور پھر پوجا کرنے کی جگہ پر پھول بچھا دیئے۔ بنگشی بھی آئے اور دھیان گیان میں بیٹھ گئے وہ پوجا کے ساتھ ساتھ چندراوتی کے بر کے لئے دعائیں بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔

میری بچی جوانی کی منزل پر پہنچ چکی ہے،
ہے شنکر اس کے لئے کوئی سامان کر دو،
میں دکھی غریب اور کنگال ہوں میرے کوئی یار و مددگار بھی نہیں

یہ کہہ کر بنگشی نے ایک پھول شیو دیوتا کے چرنوں پر پھینکا تاکہ شادی کا پیامبر جلد آئے۔

اِدھر بھی ہے زیادہ اُدھر کی مجبوری

پوجا پاٹ سے فرصت ملی تو چندراوتی تنہائی میں بیٹھ گئی اور جے چندر کے خط کو پڑھنے لگی۔ خط پڑھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواب میں کیا لکھے۔ دل ہی دل میں کہنے لگی۔

پیش ہیر تیلچھے ایکھُن ہو ئیلم ارکھینی
میری عمر زیادہ ہو چکی ہے میں شادی کے قابل ہوں ـــ
جوبن آئی لو دیہہ جوا بر پانی۔
انگ انگ میں غضب ناک لہروں کی طرح جوانی چھوٹ پڑی ہے۔
کیمن لیکھی لو پتر، پر انیر کاہنیں
میں خط میں اپنے دل کی داستان کیسے رقم کروں
کی متو لیکھی لو پتر باپ ٹپے گھورے
اور پھر پتاجی گھر پر ہیں!۔

چندراوتی کے دل میں جے چندر گھر کر چکا تھا اس کی آنکھوں میں اس کی تصویر تھی اور دل میں اُسی کا ورد اس کے خط کا جواب لکھ ہی ڈالا۔ اور چاند سورج کو گواہ کر کے خط بھیج کر ہی دم لیا۔ اب سے چندراوتی نے پھول توڑنا بھی ترک کر دیا۔ اُس کی زندگی کی ناؤ تخیلات کے سہارے بہہ رہی تھی۔ اسی طرح کتنے دن گزر گئے۔

چندراوتی کی کُٹیا کے پاس بھی پھولوں کے درخت تھے اب وہ ان ہی درختوں سے پھول توڑنے لگی۔ وہ پھول توڑتی اور کہتی جاتی۔

حسین اور نازک پھولو،
تمہیں کو دیکھ کر آنکھوں کو تسکین دے لوں گی۔
یہاں مالتی کے پھول بھی ہیں اور جبا یا کسم بھی"

غرض اس طرح چندراوتی اپنے دل بے تاب کو ڈھارس دیا کرتی۔ ایک دن اس کی کُٹیا میں ایک شخص پہنچا۔ اُس نے چندراوتی کے پتا سے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ "سنا ہے آپ کی بچی بیاہ کے لائق ہو گئی ہے اور آپ اس کے لئے اچھا سا بر ڈھونڈھ رہے ہیں۔ میں شادی کا پیغام لیکر آیا ہوں اگر آپ چاہیں تو"

بنگشی نے پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ وہ کس خاندان سے ہے، کیسا ہے؟ پسند آ گیا تو شادی کی بات پکی سمجھو"

اُس نے بر کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"سندھا ندی کے کنارے اُس کا گاؤں ہے، خاندان چکرورتی ہے

نام ہے جے چندر، دیکھنے سننے میں گبرو جوان، بانکا چھبیلا، حسین جمیل، سورج بھی اس کے آگے سجدہ کرتا ہے۔ آپ کی لڑکی ہمیشہ سکھی رہے گی۔ ذرا پچھم کی طرف دیکھئے، سردیوں کے موسم کے آثار ہیں۔ گنگا میں بھی بھاٹا آگیا ہے اس ماہ شادی کر دیجئے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

جگشی نے کہا۔

"جب خاندان اتنا اعلیٰ ہے اور بر بھی خوبصورت ہے تو شادی کا انکار کیسے کر سکتا ہوں۔"

شادی کا دن مقرر ہو گیا۔

دکھن کی مستانی ہوائیں چلنے لگیں اور کوئل کی کوک سے فضا پر نشہ چھایا ہوا ہے۔ درختوں میں نئے نئے پتے آگئے ہیں اور نئے بیل بوٹے بھی ہیں پان کے بیڑے تقسیم کر کے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عورتوں نے ایک ساتھ مل کر نغموں کی دنیا بسانا شروع کر دیا۔

شادیانے سے فضا معمور ہے۔

پھولوں کے ہار گوندھے جا رہے ہیں

دیوتاؤں کی پوجا ہو رہی ہے — غرض چاروں طرف للسماتی قہقہوں کے بام و در گونج رہے ہیں۔ لیکن اس شادمانی و مسرت کی فضا میں ایک عجیب ناگوار حادثہ در پیش آیا۔ ٹھاکر نے شادی سے دو تین دن پہلے بر کے آباؤ اجداد کے خاندان کی تحقیق شروع کی۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ جے چند کا تعلق نیچ خاندان سے ہے۔ اس بات کا انکشاف ہوتے ہی چندراوتی کے گھر میں شادیانے کہرام میں بدل گئے۔

ٹھاکر نے چندراوتی کے پتا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب قسمت کا دوش ہے بھائی۔"

چندراوتی کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ اس کی سہیلیاں آتیں اور زخموں پر نمک پاشی کر کے چلی جاتیں۔ لیکن چندراوتی پتھر کی مورتی بنی رہی اس کے لبوں پر ہنسی کے فوارے آتے اور نہ آنکھوں میں زندگی کی تڑپ نظر آتی۔ اس کے دل میں آرزوؤں کی نہ جانے کتنی قبریں بن چکی تھیں۔

اسی طرح آہ و شیون میں کتنے دن بیت گئے اور چندراوتی کے حلق کے نیچے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں گیا۔ راتیں آنسوؤں کا سیلاب بہاتے گزر جاتیں، تکئے بھیگ جاتے مگر وہ دل کی بات زبان پر نہ لاتی۔

اس کے حافظہ میں ماضی کی کتنی باتیں ایک ایک کر کے تازہ ہونے لگیں — باغ میں پھول توڑنا جے چند سے چوری چھپے ملاقاتیں، ہنسی قہقہے شرم و حجاب۔ مگر آج اس کی حرماں نصیبی ہے اور وہ خود۔

بیٹی کی اس دردناک حالت کو دیکھ کر باپ کا دل ڈوبنے لگا کہاں کہاں سے شادی کے پیغامات آئے مگر چندراوتی رضامند نہ ہوئی وہ برابر یہی کہتی رہی —

"پتا جی، میں کنواری رہوں گی۔ مجھے شیو پوجا ہی میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

باپ جواب دیتا۔ "ٹھیک ہے بیٹی۔ تم شیو پوجا کرو اور رامائن لکھتی جاؤ۔"

جب چلی سرد ہوا....

چندراوتی دنیا و مافیہا سے الگ ہو کر پوجا پاٹ کی دنیا میں کھو گئی — وہ دراصل جے چند کی یاد کو ہمیشہ کے لئے دل سے بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب آم پکنے کا موسم آیا اور مستانی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں — یکایک ایک دن اسے جے چند کا نامۂ محبت موصول ہوا۔ جے چند نے اس خط میں اپنی بے تابیاں ظاہر کی تھیں۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔

سُن رے پرانیر چندرا الو مارے جانائی

جان من چندرا سننے کو ملا ہے تو سنو

مونیر آگو نے دیہہ پوڑا ہوئے چھو چھائی

دل کی آگ سے سارا جسم جھائیں بن چکا ہے

امرت بھابیا آمی کھائیا پی گرل

امرت سمجھ کر زہر تک کھا لیا

کنٹھ تے لاگیا رہے چھپے کالا ہلاہل

اب تک حلق میں زہر ہلاہل موجود ہے

جانیا کھولیر مالا کالا ساپ گلے

پھولوں کی مالا سمجھ کر گلے میں زہریلا ناگ لٹکائے ہوئے ہوں

مورے ڈاکیا آمی اتا چھی اکالے

اور موت کو آواز دے رہا ہوں

تمی چھاڑیا آمی پوجیل شیو رسا

تلسی کے بجائے سیورا کی پوجا کر رہا ہوں

آپنی ماتھلے لوئی لم دو کھیر لپوا

اور اپنے سر پر دکھ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں

جو لے پیش باتاشے ہیں نادیکھی اُپائے

اب تو پانی اور ہواؤں میں زہر مل گیا ہے، کوئی چارہ نہیں رہا

کھاکور دچندراوتی دھوری تو مار پائے

چندراوتی معاف کر دو مجھے، تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں

ایک بار دیکھی بو تو پائے جنم شیشے دیکھا

تمہیں زندگی کی آخری گھڑی بس ایک بار دیکھوں گا

ایک بار دیکھی بو تو مار نین بھنگی بانکا

(صرف) ایک بار تمہاری نشیلی آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں

ایک بار سونیبو تو مار مدھور بانی

ایک بار تمہاری شہد میں ملی ہوئی آواز سنوں گا۔

نین جوئے بھیجا نیور انگا پا ددی کھائی

آنکھوں کے آنسوؤں سے مہندی لگے ہوئے تمہارے دونوں پاؤں بھگونا چاہتا ہوں

نا چھوئی بو نا دھری بو دورے تھاکا کھاڑا

میں تمہیں ہاتھوں سے مس کروں گا نہ پکڑوں گا، صرف دور سے دیکھوں گا

پُن مکھ دیکھا آمی جوڑائی بو انترا

تمہارا پاک و صاف چہرہ دیکھ کر اپنی روح کو خوش کر لوں گا۔

ایک بار دیکھی پا تو ملتے جھاڑی بو سنسار

تمہیں آخری بار دیکھ کر سنسار تیاگ کر لوں گا۔

کا پالے لیکھائی چھے بیدھی مرن آمار

میری قسمت میں ہجر کی موت مرنا لکھا ہوا ہے۔

جے چندر کا نامۂ محبت پڑھ کر چندراوتی کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں اور بچپن کے سارے واقعات یکے بعد دیگرے دل کے پردے پر لہرانے لگے۔ اس نے خط کو آنکھوں سے لگایا بوسے دیئے اور کئی بار خط کو شروع سے آخر تک پڑھ گئی۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے پتا سے سارا حال بیان کر دیا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ جے چندر نے اسے خط لکھا ہے اور ایک بار ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے اس کے پتا نے جواب دیا۔

سُن گو پرانیر کنیا آمار کتھا دھر

میری بچی، میری بات کو گرہ میں باندھ لو

اک مَنے پوجا توی دیو بیشیشر

اور نہایت ہی شانت ہو کر دیوتا کی پوجا کرو

آنا کتھا اُشھان کنیا نا ہی دیو مونے

دوسروں کی باتوں کو دل میں جگہ نہ دو۔

جیون مرن ہوئی لو جا بار کا سنے

جس کی وجہ سے زندگی بھی موت سے بدتر ہو گئی۔

باپ کا یہ حکم سن کر چندراوتی دیوتا کے سامنے بیٹھ کر دھیان گیان میں محو ہو گئی۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ دنیا کی ہر چیز سے غافل ہو گئی۔ جے چندر کو اپنے خط کا جب کوئی جواب نہ ملا اس کی پریشانیاں پہلے سے زیادہ بڑھ گئیں وہ کسی طرح بھی آخری بار ایک نظر چندراوتی کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ایک دن سچ مچ وہ تمام پابندیوں اور مجبوریوں کو بالائے طاق رکھ کر چندراوتی کے مندر میں آیا اور دروازے تک پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔

دوار کھولو چندراوتی تو مار شود ھائی

دروازہ کھولو چندراوتی، معافی مانگنے آیا ہوں

جن پر شیش تو ملنے ایک بار دیکھا جائی

زندگی میں آخری بار رخِ روشن تو دکھا دو۔

آر نادیکھی بو تو مائے نین چاہی پا

میں تمہیں آنکھیں پھاڑ کر نہیں دیکھوں گا

دورش کھما کرو کنیا شیش بیدائے دیا

پیاری گناہ معاف کر کے مجھے رخصت کر دو

مندر کا دروازہ کھُلا تو۔

چندراوتی دیوتا کی پوجا میں اتنی منہمک تھی کہ اس کے کانوں میں جے چندر کی آواز نہ پہنچی جب مندر کا دروازہ نہیں کھلا جے چندر کی بے تابیاں اور بڑھ گئیں۔ وہ پاگل ہو گیا اور جنون کے عالم میں بکنے لگا۔

دوار کھولو چندراوتی دیکھا دیو آمائے

چندراوتی دروازہ کھول کر اپنا رخِ روشن دکھا دو۔

نا چھوٹی بو نا دھری بو دورے تھاپنا کھڑا

(بقیہ صفحہ ۲۸۹ پر)

یونس احمر

مہوا

لوک کہانیوں میں ہر قوم کی اپنی تہذیب کا پرتو ہوتا ہے۔ ان میں صدیوں پرانی وہ روایات ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ قوموں کا اپنا مزاج بن جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا خالق کوئی بہت بڑا ادیب یا شاعر نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے محسوسات کو سلیقے کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ ان میں نہ فضا کا خیال رکھا جاتا تھا نہ زبان کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ البتہ کہانی کا تسلسل ٹوٹتا نہیں تھا اور جذبات آفرینی بیان کو قدرت کا ملہ تھی۔

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیاں بھی دنیا کی دیگر قوموں کی لوک کہانیوں کی طرح صدیوں پرانی ہیں۔ چھ سات سو سال میں ان گنت انقلابات آئے کتنی حکومتوں کو عروج و زوال ہوا۔ معاشرہ میں کیسی کیسی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ خود بنگالی ادب مختلف ادوار سے گزرا۔ مگر یہ لوک کہانیاں زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہیں۔ ان کو محفوظ رہنا ہی چاہیے کیونکہ ان میں بنگال کی پرانی تہذیب کی روح پوشیدہ ہے۔ ان میں ہمارے قدیم معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے اندر ہمارے جذبات و احساسات کی وہ چنگاریاں ہیں جو آج گلہائے رنگا رنگ بن کر ہمیں دعوت نظارہ دے رہی ہیں اور ہم ان کی مہک سے اپنے دلوں میں طمانیت محسوس کر رہے ہیں۔

بنگال کی لوک کہانیاں جو آج کتابوں میں محفوظ کی گئی ہیں بہت قدیم ہیں لیکن ان کی دریافت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ انکی دریافت میں پیہم کوششوں اور مسلسل تگ و دو کو دخل ہے۔ ادب کے دیوانوں نے گاؤں گاؤں جا کر کھوج لگایا۔ برسوں تحقیقات کی گئیں۔ دراصل ان تحقیقات میں محققین کا خون جگر شامل ہے۔ اگر وہ اپنی تحقیقات میں خون جگر شامل نہ کرتے تو مہوا، ملوا، دیوان مدینہ، فیروز خاں، چندراوتی، کاجل ریکھا اور کفن چور وغیرہ جیسی معرکہ آرا کہانیاں نہ ملتیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر ہمیں اپنی پرانی تہذیب کا علم ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے گاؤں کے اس معاشرہ کا علم ہوتا ہے جو حسن و عشق، محبت و نفرت، دکھ سکھ اور آہ و فریاد سے عبارت ہے۔ ان کہانیوں میں بنگال کی نرم نرم اور سوندھی سوندھی مٹی کا وہ جادو ہے جس نے ہر دور میں اور ہر موسم میں دلوں کو موہ لیا۔ ان میں وہ نغمہ سانس لے رہا ہے جس کی ہر نے تنگ جان کو کاٹ جاتی ہے ان میں گاؤں کی ان کنواری ناریوں کا بانکپن ہے جو شام ڈھلے پنگھٹ پر اپنے دلوں کی دھڑکنیں گنتی تھیں۔ ان میں ان کی نینوں کے وہ تیر ہیں جو محبوب کے دلوں کے پار ہو جاتے تھے۔ ان میں ان کا خلوص ہے جو سادہ ہونے کے باوجود اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے ان میں ان کا وہ جذبۂ دروں ہے جو شدت عشق سے معمور ہے۔

بنگالی لوک کہانیوں کی کثیر تعداد ضلع میمن سنگھ سے دریافت ہوئی۔ ان کہانیوں کو گاؤں کے ان پڑھ شاعروں نے سنا۔ یہ کہانیاں ان کے دلوں پر نقش ہو کر گئیں اور پھر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان مگر جذبات آفریں زبان میں بیان کیا۔ وہ علم و قواعد سے نابلد ضرور تھے لیکن ان کے دلوں میں احساسات و جذبات کے جو چراغ جل رہے تھے انکی لوئیں کہانیوں کو گرمی دے گئیں۔ بنگال کے مشہور نقاد ڈاکٹر دینیش چندر سین لکھتے ہیں کہ گاؤں کے جن شاعروں نے ان کہانیوں کو نظم کیا ہے ان کے آنسوؤں کے سوتے خشک ضرور ہو گئے لیکن سلیقے کے آنسو کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔ مشرقی میمن سنگھ کے دریا اور جھیل، جنگل اور فضاؤں میں پھیلتے ہوئے رنگ برنگ کے طیور، شام کے پنگھٹ کا منظر یہ وہ مناظر ہیں جن کو دیکھ کر ہم دریائے ٹیمس، نٹرڈیم اور روم کے ویٹیکان کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں اینڈرومیکی، میلینڈا، ڈیسڈمنا اور ٹوراجو جذبے پیدا نہیں کر سکتیں وہ ہماری لوک کہانیوں کی ہیروئن مہوا اور ملوا جگا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر دینیش چندر سین کے مذکورہ الفاظ میں بڑی حد تک صداقت

ہو آپ آج بھی میمن سنگھ جائیں تو وہاں کی ہواؤں میں ان کہانیوں کی معطر بیز ساعتیں ملیں گی۔ برہم پترا کی تیز خرام لہریں شاہد ہیں کہ اسی کنارے آج سے سیکڑوں سال پہلے گاؤں کی کنواریاں اپنے دلوں میں محبت کے دیپ جلا کر اپنے من موہن سے چوری چھپے ملاقاتیں کرتی تھیں۔ اسکی لہروں میں نہ جانے ان کے آنسوؤں کے کتنے ان گنت قطرے شامل ہیں۔ یہاں کی شفق میں انکے ہونٹوں کی سرخیاں جذب ہوگئی ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں ان کے وہ گیت آج بھی بال کشا ہیں جو کبھی دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیتے تھے۔

ان کہانیوں کو پڑھ کر ہم پرانے بنگال کی اس دلہن کو دیکھ سکتے ہیں جو سدا سہاگن تھی —— جو کھیتوں میں ہرنوں کی طرح جو کڑی بھرتی قمریوں کے مانند چہکتی اور بلبلوں کی طرح گاتی تھی۔ جسکے کھیتوں میں کبھی کال نہیں پڑتا تھا جس کے گاؤں میں کبھی سیلاب نے تباہی نہیں مچائی۔ جس کے دریا کبھی نہیں ابلے۔ جسکے آسمان نے کبھی غضب نہیں کیا۔ جس کے ہونٹ کبھی بھوک سے نہیں تڑپے۔ جسکی آنکھوں نے رونا نہیں سیکھا۔

یہ سدا سہاگن —— بنگال کی یہ دلہن بڑی ہی شرمیلی تھی۔ اس کے من میں برہم پترا، پدما، میگنا، دھلیشوری اور جمنا کا اضطراب تھا۔ اس کے لبوں میں بلبل ہزار داستان کی مٹھاس تھی۔ اسکی آنکھوں میں نرگس کا خمار تھا۔ اسکے جذبات میں میگھ ملہار کی حدت تھی۔ وہ محبت کے لئے زندہ رہتی اور اسکے لئے جان دیتی تھی۔ وہ کاگا کی کائیں کائیں سن کر ایک دم سے چونک پڑتی اور خوش ہوتی تھی کہ اسکے من کا راجہ آج آنیوالا ہے۔

''مہوا'' مشرقی پاکستان کا نمائندہ عوامی کہانی ہے —— ساڑھے تین سو سال پرانی!

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

عہد قدیم میں گارو پہاڑ کے شمال اور سیمائی پربت کے دامن میں بنجاروں کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس قبیلے کا سردار تھا ایک نہایت ہی بد صورت دیو ہیکل انسان —— ہومرا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ ہومرا نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک گاؤں پر ڈاکا ڈالا، یہیں ہومرا کو چھ ماہ کی بچی ملی۔ اس بچی کو وہ اپنے ساتھ اٹھا لایا۔ اسکی پرورش بڑی ہی نظم سے ہوئی۔ دن گذرتے گئے۔ اب وہ سولہ سال کی ہوگئی تھی۔ اس کا پہلے زیادہ نکھر آیا تھا۔ قبیلہ کے لوگ اسے للچائی آنکھوں سے دیکھتے، اس کا نام مہوا رکھا گیا، اسکے حسن کی تعریف اسطرح کی گئی:

وہ چلتی تو اسکے لمبے لمبے بال اسکے پاؤں چومتے
بولتی تو چمپا کے پھول کھل اٹھتے
آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے آسمان پر تارے جگمگ کر رہے ہوں۔

بنجاروں کا یہ قافلہ کہیں ایک جگہ قیام نہیں کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد مختلف گاؤں دیہات میں ڈیرا جاتا۔ اسی طرح گھومتے پھرتے یہ قافلہ ندیا ضلع پہنچا۔ وہاں کے قریبی گاؤں میں ایک نوجوان ندیر چاند (ندیا کا چاند) رہا کرتا تھا۔ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے پاس دولت بھی کافی تھی۔ وہ ہومرا کا کرتب دیکھنے گیا اور مہوا کو دل دے بیٹھا۔ اس نے ہومرا کو ڈیرا ڈالنے کے لئے زمین دی۔ دراصل وہ مہوا کی خاطر بہت کچھ قربان کرنا چاہتا تھا۔

اب ندیر چاند کی کیفیت دگرگوں ہوتی گئی۔ مہوا کے حسن ضیا پاش کا وہ گرویدہ ہوگیا تھا۔

ایک دن مہوا کرتب دکھا کر غسل کرنے پنگھٹ کے ادھر جا رہی تھی ندیر چاند نے اسے روک لیا اور اس طرح اس نے اظہار عشق کیا:

لڑکی ذرا میرے قریب آ —— کہ میں تجھ سے اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھ سورج ڈھل چکا ہے، چاندنی چھٹکنے والی ہے۔
ایسے سمے تو پنگھٹ کے اور جا رہی ہے۔
میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ تو یوں اکیلی جائے۔
میں بھی جاؤں گا تیرے ساتھ، اور گاگر بھر کر تیری کمر پہ رکھوں گا۔
ذرا یاد کر وہ باتیں جو میں نے کل تجھ سے کی تھیں۔

مہوا۔ تم مرد ہو اجنبی، میں ہوں غیر لڑکی۔ تم سے کچھ کہتے ہوئے لاج آتی ہے مجھے۔

ندیر چاند۔ لڑکی تو پانی بھرتی جا اور مجھ سے باتیں بھی کر کہ ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اچھا یہ بتا کہ اس گاؤں میں آنے سے پہلے تو کہاں تھی —— تیرے ماں باپ کون ہیں؟

مہوا۔ میں لڑکی ہوں بن ماں باپ کی۔ میرا کام دریا کی لہروں کی طرح

بہتا ہے۔ قسمت میں بنجاروں کے ساتھ گھومنا لکھا تھا۔ اپنی ہی آگ میں جل کر راکھ ہو رہی ہوں، یہاں میرا کوئی ہمدرد نہیں کہ اسکو من کی بپتا سناؤں ـــ اور پھر کون ہے جو میرے محسوسات کو سمجھ سکے۔ تم سکھی ہو کہ آباد ہے تمہارا گھر۔

نوبر چاند۔ لڑکی اب تک میں کنوارا ہوں۔ دل تیری اور کھنچ رہا ہے۔

مہوا۔ کتنے سنگدل ہیں تمہارے ماں باپ کہ ایسی چڑھتی جوانی برباد ہو رہی ہے۔

نوبر چاند۔ ہاں سنگدل ہیں میرے باپ ماں اور کٹھور ہے میرا دل۔ پر تجھ جیسی لڑکی مل جائے تو میں اپنا گھر بسا لوں۔

مہوا۔ شرم نہیں آتی تمہیں ایسا کہتے ہوئے۔ ڈوب مرو گلے میں گاگر باندھ کر۔

نوبر چاند۔ لڑکی کہاں سے پاؤں گا میں گاگر اور کہاں ملے گی ڈور۔ تو گنگا بن جا تو ڈوب جاؤں اس میں۔

رفتہ رفتہ دونوں کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی آگ تیز ہو چکی تھی لیکن سومرا کے ہوتے ہوئے انکی امیدیں بر آتی نظر نہ آتی تھیں۔ بالآخر دونوں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔

پھاگن کا مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ چیت کے ابتدائی دن تھے۔ درختوں کی شاخوں پر کونپلیں کو ہو کو ہو کر رہی تھیں۔ سنا تھا دھان سورج کی تمازت میں پک کر تیار ہو گئے تھے۔ ایسے میں آدھی رات کو نوبر چاند نیند سے بیدار ہوا۔ بانسری لی اور بجانے لگا۔

بانسری کی جادو بھری لے سن کر مہوا کا من ایک دم سے پاگل ہو گیا وہ بھی نیند سے بیدار ہو گئی وہ اٹھی اور سوئے ہوئے سنگھٹ کے پاس آئی۔ سنگھٹ کے پاس نوبر چاند موجود تھا۔ اس نے مہوا کو دیکھتے ہی کہا۔ لڑکی تیری خاطر میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں ـــ ماں باپ دھن دولت

مہوا۔ پیارے میں ہوں ناری ننگی اور تم ہو میرے گلے کی مالا۔ بھوں سے تو میں اپنے بالوں سے تمہیں ڈھانک کر رکھتی۔

یہ کہہ کر وہ دونوں چپ چاپ وہاں سے دور نکل آئے۔ راستے میں ایک ندی دکھائی دی اس کے چاروں اور ہرے بھرے جنگل تھے وہ جگہ پسند آئی یہیں انھوں نے ایک جھونپڑا ڈال لیا ـــ بڑے سکون اور اطمینان سے زندگی کے دن گزرنے لگے۔

سومرا سو کر اٹھا تو مہوا لاپتہ تھی۔ اور جب اسکو یہ معلوم ہوا کہ نوبر چاند بھی غائب ہے تو حقیقت آشکارا ہو گئی۔ غصے کے مارے اسکا برا حال تھا اس نے دونوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مدت تک وہ دونوں کی تلاش میں گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا پھرا اور ایک دن اتفاقاً اس جگہ اس نے اپنا ڈیرا ڈال لیا جہاں دونوں موجود تھے۔

گہری اندھیری رات تھی۔:

آسمان پر چاند تارے ٹمٹما رہے تھے۔ اس سمے سومرا ندی کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ یکایک اس نے مہوا کو دیکھا اور اس کے قریب آیا وہ سوئی ہوئی تھی۔ سومرا نے کہا!

"بیدار ہو جاؤ مہوا، دیکھو میں ہوں تیرا باپ۔ سولہ سال تک میں نے تجھ کو پال پوس کر بڑا کیا اور اس کا صلہ یہ دیا تو نے۔"

مہوا چونک اٹھی۔ یہ تو سچ مچ اسکے باپ کی آواز تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سومرا نے پھر کہا:۔

"لے یہ خنجر اور اتار دے اسکے سینے میں"۔

مہوا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تارے بھی بادل میں چھپ گئے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خنجر لے لیا اور نوبر چاند کی طرف بڑھی۔ اسکے سر کے بال پاؤں کو چوم رہے تھے اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں بالآخر دل پر پتھر رکھ کر وہ نوبر چاند کے پاس آئی اور بولی

"بیدار ہو جاؤ اب خواب سے۔ دیکھو تمہارے سامنے بھاگ جلی مہوا کھڑی ہے اور اس وقت میرے ہاتھ میں خنجر بھی ہے۔ سنگدل باپ کا حکم ہے کہ یہ خنجر تمہارے سینے میں اتار دوں۔ ہاں سنگدل ہیں میرے ماں باپ اور کٹھور ہے میرا دل لیکن بتاؤ تو سہی میں تمہیں مار کر تنہا گھر کیسے جا سکوں گی۔ جو چراغ میں نے گھی سے جلایا تھا اب اسکو کیسے بجھا دوں؟"

نوبر چاند نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس پر سکتے کا عالم طاری تھا۔

مہوا پھر بولی:۔

"پیارے کیسے اتار سکتی ہوں یہ خنجر تمہارے سینے میں۔ یہ تو میرے لئے ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے اور اپنے گاؤں پہنچ کر کسی حسین لڑکی سے شادی رچاؤ۔ شہزادے کا گھر نباہ نہیں کر سکتی ہیں۔ میں تو خانہ بدوش ہوں۔

مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

نوذیرچاند۔ میں بھی اپنے ماں باپ کو خدا حافظ کہہ کر آیا ہوں۔ کیسے جا سکتا ہوں تجھے چھوڑ کر۔ تو تو میری کلی ہے اور میں ہوں تیرا بھونرا۔ لے اتار دے خنجر میرے سینے میں۔

ہوا۔ پیارے چلو جہاں ہماری یہ دو آنکھیں لے جائیں۔ ندی کنارے وہ دیکھو میرے باپ کا تازی گھوڑا بندھا ہے اسکی پشت پر سوار ہو کر ہم فرار ہو جائیں یہاں سے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ چاند سورج ہمارے گواہ رہیں گے۔

اور اسکے بعد دونوں گھوڑے پر سوار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ راستے میں کتنے جنگل آئے کتنی ندیاں آئیں مگر دونوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہاں تک کہ ایک چڑھتا ہوا دریا سامنے آیا۔ نوذیر چاند نے لگام کھینچی۔ گھوڑا رک گیا۔ دور سے ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کے دلوں کو اطمینان ہوا۔ دونوں نے اس پر بیٹھ جانے کی ٹھانی۔ کشتی نزدیک آئی تو دونوں نے ماجھی کی منت سماجت کی۔ ماجھی نے ہوا کو دیکھا۔ اسکی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے دونوں کو کشتی پر بٹھا لیا لیکن ماجھی کی نیت خراب تھی اس نے نوذیر چاند کو لہروں کے حوالے کر دیا۔ ہوا کے ہوش ہواس معطل ہو گئے۔ نوذیر چاند کی آواز اسکے کانوں میں آئی

"نہ باپ سے ملاقات ہو سکی، نہ ماں سے مل سکا،
دشمن کے ہاتھوں پھنس کر آخر موت ہی آ گئی۔
لڑکی الوداع! الوداع اب ملاقات نہیں ہو سکتی؟

ہوا۔ جو لہریں میرے نوذیر چاند کو بہا کر لے گئیں
میں بھی انہیں لہروں میں مر جانا چاہتی ہوں"

یہ کہہ کر ہوا دریا میں چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ ماجھی نے اسے پکڑ لیا اور اس کے حسن کی تعریف اس طرح کرنے لگا:۔

ماجھی۔ تیری آنکھیں ہیں سنگترے کے پھانک اور تیرے یہ بال ــــــ
کہ جیسے بادلوں کے قافلے۔

لڑکی دیکھ میری آنکھیں اٹھا کر، سن کہ تیری جوانی سدا بہار نہیں۔
میں تجھے نیلے آسمان جیسی ساری لا کر دوں گا اور ناک کیلئے سونے کا پھول۔

لاؤں گا تیرے سیاہ اور لمبے بالوں کے لیے خوشبودار تیل۔

میرے گھر میں غلام اور باندیوں کی کمی نہیں۔ تجھ کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی وہ تیرے پاؤں دھلائیں گی۔ سنہرے پلنگ پر تیرا بستر ہوگا۔

برف آلود جاڑے کی فکر نہ کر۔ تیرے لئے لحاف تیار ہے کنیزیں ہر دم دست بستہ تیرے حضور میں کھڑی رہیں گی۔ میرے نگر میں ہاتھی گھوڑے اور لاؤ لشکر ہیں۔ تو ملکہ بن کر رہے گی۔

اندر محل کے پھولوں کا حسین باغ ہے۔ ہم دونوں صبح شام اس باغ میں جا کر پھول توڑیں گے۔

تو پان کے بیڑے بنا کے کھلائے گی اور میں تجھے کھلاؤں گا۔

ایسی ساری لا کر دوں گا جسکی قیمت لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی اور تیرے بالوں کے جوڑے میں موتی یوں بھر دوں گا جیسے درخت پھل سے لدے ہوتے ہیں گلے کے لئے چندر ہار بنواؤں گا اور ناک کے لئے نتھ اور پاؤں کیلئے گھنگھرو کہ جب تو چلے گی تو راگ پیدا ہوں"

ماجھی کی باتیں سن کر ہوا نے پان بنایا اور چونے کتھے میں اس نے زہر ملا دیا۔ ماجھی پان کر کھا کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے کہا:

"لڑکی تو نے ایسا پان کھلایا کہ تعریف نہیں کر سکتا۔
جی چاہتا ہے تیرے بازو پر اپنا سر رکھ دوں اور سکون کی نیند سو جاؤں"

ہوا نے جب ماجھی کی یہ کیفیت دیکھی تو مارے ہنسی کے اس کا برا حال ہو گیا۔ اور جب اسکے ہوش و ہواس ایک دم سے غائب ہو گئے تو ہوا نے اسکو دریا برد کر دیا۔

دریا پار کر کے جب خشکی پر آئی تو اس نے نوذیر چاند کو تلاش کرنا شروع کر دیا ــــ وہ تلاش کرتی اور کہتی جاتی تھی!

"دو کس جنگل بن میں میرے سپنوں کا راجہ گم ہو گیا ہے
میں دکھی بھاگ چلی کہاں کہاں اسکو ڈھونڈھتی پھروں!
میں نیارے کی لڑکی اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر بھٹک رہی تھی ــ کہاں سے یہ پردیسی آیا کہ میں سب کو چھوڑ کر بھاگ گئی"

اس طرح ہوا نوذیر چاند کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دور نکل گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک مندر کے پاس آئی۔ سنیاسی نے اسے دیکھا اور وہ بھی سب کچھ بھول گیا اور اسکے گن گانے لگا:۔

"لڑکی آخر تو کس دیس سے بھٹک کر یہاں آئی ہے،

کس راجہ نے بن باس کر دیا تجھے،

اس کمسنی میں تجھ سے کیا پاپ سرزد ہوگیا تھا'

کتنے سنگدل ہیں تیرے ماں باپ کہ تیری خبر تک نہیں لیتے"۔

ہنوا سنیاسی کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی اور اس نے رو رو کر اپنا سارا دکھڑا بیان کیا۔ سنیاسی نے سن کر کہا:۔

جنگل کے یہ پتے توڑ کر تجھ کو دوں گا۔ ان پتوں ہی میں تیرے پتی کی جان ہے۔ تیرا پتی مرا نہیں زندہ ہے۔ وہ یہیں ہے۔ اسی جنگل میں۔

ہنوا جنگل کے پتے لے کر اسکی تلاش میں نکلی۔ سچ مچ وہ اس جنگل میں تھا۔ وہ مل گیا۔ لیکن بھوک پیاس سے نیم جان اور نڈھال ہو رہا تھا ہنوا کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اشارے سے کچھ کھانے کیلئے مانگا۔

کچھ ماہ بعد!

ہنوا نے جھرنا کا پانی پلا کر ان پتوں کے پھل کھلا کر نودیر چاند کو نئی زندگی دی۔ دونوں نے پہاڑوں کے درمیان خیمہ ڈالا اور یہیں رہنے لگے۔

ایک دن کا ذکر ہے'

ہنوا کے کان میں شکاری کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو ہومرا اپنے قافلے کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور غصہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور جب ہومرا قریب آیا تو اس نے ہنوا سے کہا:۔

"لڑکی تو زندہ رہنا چاہتی ہے تو لے یہ خنجر اور اسکے سینے میں اتار دے۔ اس بار تو مجھے دھوکا دے کر بھاگ نہیں سکتی۔ میں اپنے لڑکے سے تیری شادی رچانا چاہتا ہوں۔ چل جلدی اس کا خاتمہ کر کے"

ہنوا۔ نودیر چاند تو میرا پتی ہے۔ کیسے اتار سکتی ہوں اسکے سینے میں خنجر۔ یہ خنجر تو میرے سینے میں اترنے کے لئے ہے۔ پہلے میں اپنا خاتمہ کر دوں۔

ہومرا۔ احمق لڑکی تجھے کیا ہو گیا اسکی داسی بن کر چل میرے ساتھ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ کتنی مشکل سے میں تجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا ہوں۔

ہنوا۔ اپنے پتی کو ہلاک کر کے کیسے جاؤں دیس' میں اسکے ساتھ بیاہ نہیں کر سکتی۔

اور یکبارگی کالا دیو ہومرا گرجنے لگا۔ ہنوا نے خنجر اسکے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے پتی سے کہنے لگی۔

ہنوا۔ میرے سہاگ مجھے الوداع کہو ـــــ آخری بار!

ہومرا کی محبت غالب آگئی اور اس نے کہا:

"چھ ماہ کی بچی تھی تو جب میں تجھے اٹھا کر لایا تھا۔ اب میں تجھے چھوڑ کر اپنے گاؤں کیسے جا سکتا ہوں۔ آنکھیں کھول دیکھ مجھے! میں واپس نہیں جاؤں گا"۔

اتنا کہنے کے بعد ہومرا نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ـــــ "تم لوگ مل کر ایک قبر تیار کرو اور اس میں دونوں کو دفن کر دو"

فوراً ہومرا کے حکم کی تکمیل کی گئی۔ دونوں کو زندہ درگور کر دیا گیا

بہت دن گذر جانے کے بعد یہ آواز فضا میں گونجنے لگی۔

"کب تک سوئی رہو گی' اٹھ بھی جاؤ۔ بنجارے جا چکے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں۔

اٹھ جاؤ اور نودیر چاند' اپنے محبوب کے ساتھ گھر بساؤ۔ دیکھو میں نے تم دونوں کے لئے پھولوں کے ہار گوندھے ہیں اٹھ جاؤ...... اٹھ جاؤ

"جوش نمبر"

ساقی کے "مشرقی پاکستان نمبر" کے بعد "جوش نمبر" شائع ہوگا۔ مشرقی پاکستان کی بڑھتی ہوئی ضخامت کی وجہ سے "جوش نمبر" کی اشاعت میں بھی تاخیر ہو رہی ہے "جوش نمبر" میں جوش صاحب کے جواب الجواب کے علاوہ ان کے خاندانی حالات، بچپن سے لیکر بڑھاپے تک ان کے پوشیدہ حالات، ان کی نجی زندگی حیدرآباد جانے سے پہلے، حیدرآباد جانے کے بعد، حیدرآباد سے نکالے جانے کے بعد، قیام دہلی میں ان کے مشاغل، امراکی دریوزہ گری، افسروں کی کاسہ لیسی، کانگریس کی غلامی، پاکستان بن جانے کے بعد مسلمانوں سے غداری کے صلے میں حکومت کی ملازمت، بدکرداری کی بدنامی، نقوی اور سکندر مرزا سے سودے بازی، اُردو بورڈ میں دھاندلی دیا جانا، اسلام دشمنی پاکستان کا مضحکہ اڑانا اور اسی ملک میں بے غیرتی کی زندگی بسر کرنا۔ شخص اور شاعری کے بے شمار پہلو۔

یونس احمر

نورالنہار

چیت کی مستانہ وار ہوائیں بہہ رہی ہیں اور کوئل کا نغمہ دل رس سنائی دے رہا ہے
ایسی خوشگوار فضا میں اس راستے تم کہاں جا رہی ہو؟
یہ کس کی تمنا لئے ہوئے ہے کہ تم اکیلی محو خرام ہو اور ملک کی نہر دوڑ دل رہی ہے
کیا تمہارے گوشۂ دل میں میری یادوں کے لئے کوئی جگہ نہیں؟
جانِ تمنا! من بڑا ہی بیری ہے - اس کو کسی بندھن میں نہیں باندھ سکتے
شب دیجور میں صرف کروٹیں بدلتا رہتا ہوں، یا سوچتا اور تڑپتا رہتا ہوں!

نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ پل بھر کو چین آرام ہے -
صرف تمہارا خیال ہے، جو مجھے بیکل بنائے رہتا ہے،
آنکھوں سے نیند اوجھل ہو چکی ہے،
یہ لحاف اور توشک بھی تو آرام نہیں پہنچا سکتے -
کتنا خوش بخت ہوں کہ تم اس سے راہ میں اکیلی مل گئیں
دیکھنا! دکھن کی ہواؤں سے تمہاری ساڑھی کا پلو کس طرح لہرا رہا ہے
تمہاری اور دیکھتا ہوں تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے اور
وہ بیتے ہوئے لمحے یاد آنے لگتے ہیں، جب ہم بانس کے درخت کی چھاؤں میں

آن ملتے تھے ــــ کیا خوشی کے دن تھے!
مگر اب تم اتنی سنگدل کیوں بن گئیں تم نے یہ سب یادیں کس طرح بھلا دیں؟"

لڑکی نے یہ سن کر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور گھونگھٹ کاڑھ کر دھیرے دھیرے بولی :-

"تمہاری باتیں میرے من میں روز ہی قیامت ڈھاتی ہیں
(کیسے بھلا سکتی ہوں بھلا) تمہارے دل کے پاس ہی تو میرے دل کی دھڑکن ہے!
پرائے محبوب میرے راستے سے ہٹ جاؤ، خدارا چلے جاؤ تم!
وہ دیکھو کیلے کے درختوں کے جھنڈ کے ادھر میرے باپ کا گھر ہے وہاں تم ایک دن مسافر بن کر آنا!
میں تمہاری خوب اچھی طرح ضیافت کروں گی، دودھ کی کھیر کھلاؤں گی اور اپنے ہاتھوں سے سب کچھ پکاؤں گی -
ماں باپ راضی ہوئے تو ہماری شادی بھی ہو جائے گی -

تو یہ کہانی یوں شروع ہوتی ہے :
کبھی دیانگ پہاڑ کے نیچے ایک دریا بہتا تھا ــــ وہیں ایک نیا جزیرہ نکل آیا جس کا نام "رنگ دیا" پڑ گیا - دیکھتے دیکھتے وہاں لوگ آباد بھی ہونے لگے - درختوں نے سر اٹھانا شروع کیا - زمین بڑی ہی زرخیز تھی - سال میں دو بار دھان پیدا ہوتے تھے - مچھلیاں بھی بکثرت مل جاتی تھیں - غرض زرخیز زمین کی کشش نے بہتوں کو آباد ہونے پر مجبور کر دیا - ان میں ایک ــــ اصغر بھی تھا - "رنگ دیا" میں اس نے اپنا مکان بنایا اور یہیں کاشت کاری شروع کر دی - اس کی ایک لڑکی تھی، نام تھا نورالنہار - جیسے روپ میں واقعی مانند سپیدۂ صبح، حسن میں اس کا جواب نہ تھا - مہ جبیں، موہنی صورت تھی اس کی - اس کا چال کیا تھا، جیسے

چڑھتا دریا۔ وہ کھیت میں کام کرتے کرتے جب اپنی اوڑھنی ڈالتی تو لاج سے دوہری ہو جاتی۔

اسی اثنا میں اس کے بچپن کا ایک ساتھی اس طرف آیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دونوں کے دلوں میں پرانی یادوں کے چراغ روشن ہو گئے ـــــ بچپن کی پریت بھی کیا ہوتی ہے، جیسے لوگوں کی زبان پر ہے:

یہ تو کٹھل کی لیپی ہے، کسی چیز سے لگ جائے تو چھوٹنا مشکل! بچپن کی پریت کوئل کی کوک ہے جو دلوں میں خنجر گھونپتی رہتی ہے

بچپن کی پریت کھوپرے کا تیل ہے
جاڑے کی رات میں جم جاتا ہے پر دھوپ لگتے ہی
پگھل جاتا ہے

بچپن کی پریت افیون کا نشہ ہے!
یہ نشہ کبھی ہرن نہیں ہوتا!

بچپن کی اس پریت نے دو دلوں کو گھائل کیا تھا ـــ لو آج اسکی داستان سناتا ہوں:

نورالنہار کے بچپن کے ساتھی کا نام تھا۔ مالک۔ دیو گاؤں میں اس کا مکان تھا۔ بڑا ہی توی گٹھیلا اور گبرو جوان تھا وہ بازو میں ریشم کی ڈوری سے تعویذ باندھا رہتا تھا۔ لیکن اب تک اسکی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا باپ اپنے گاؤں کا چودھری تھا۔ دیو گاؤں میں اس کی خاص زمینداری تھی۔ نام تھا نازو میاں۔ صوم صلواۃ کا بڑا پابند۔ حافظ قرآن بھی تھا۔ گاؤں والوں کے لڑائی جھگڑے بڑی سمجھ بوجھ سے چکا دیتا تھا۔ اس کے گھر میں کبھی اناج کی قلت نہ ہوتی۔ تالاب ہمیشہ مچھلیوں سے بھرا رہتا۔ گھر کے پچھواڑے ہر قسم کے درخت بھی لگے ہوئے تھے لیکن اس کی قسمت یکایک پلٹا کھا گئی ـــ خوشی و مسرت کا آفتاب بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹیں چھین لی گئیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا ـــ وہ جہاز میں ہزاروں من دھان لے کر روانہ ہوا۔ شومئی قسمت کہ بیچ دریا میں پہنچتے ہی طوفان آ گیا۔ جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ بادبان تار تار ہو گیا۔ موجیں سر اٹھا اٹھا کر اس کے جہاز کو ڈبونے لگیں اس نے بہت دیر تک طوفان کا مقابلہ کیا، لیکن بے سود۔ آخر کار جہاز غرق آب ہو گیا اور اسے بھی موجیں نگل گئیں۔

مالک یتیم ہو گیا۔ ماں کو اس نے دیکھا ہی نہ تھا اب باپ بھی دنیا سے کنارہ کر گیا۔ اس کے گھر میں اسی سالہ دادی کے سوا اب کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اکثر دہاڑیں مار کر روتی اور کہتی جاتی۔

"بیٹے تو نہ جوار کے ساتھ آیا اور نہ بھاٹا کے ساتھ ـــ ہائے کیا جانے کس گھڑیال نے تجھے اپنا لقمہ بنا لیا؟" غرض بیٹے کی جدائی کا زخم اس کے سینے میں اتنا کاری لگا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکی۔

نورالنہار اور مالک کے مکان آمنے سامنے تھے۔ بیچ میں صرف ایک کھیت پڑتا تھا۔ اس حادثے کے بعد اصغر نے اپنے دل سے ساری کدورتیں دھو ڈالیں۔ پچھلی ساری باتیں بھول گیا۔ نور نے بھی اس کی بڑی خدمت کی۔ اکثر اس کے گھر آتی اور کھانا پکا جاتی ـــــ مالک کا دل نور کی اس خدمت سے بہت پسیج گیا بلکہ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ اسکی طرف کھنچنے لگا غنچہ پھول بن چکا تھا، اور دل میں محبت کی چنگاریاں بھڑکنے لگی تھیں۔ نور بھی جھکی جھکی نظروں سے اس کو دیکھتی اور اس کے دل میں بھی تو لوگ کہتے ہیں نیش الفت یوں اتر جاتا جیسے بادل میں بجلی لہرا جائے۔

نور کا حسن واقعی دیدنی تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی باریک تحریر سے اسکے جمال میں جو اضافہ ہوا تھا اس کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔

محبت کی کشش بے پناہ ہوتی ہے، دل قابو میں نہیں رہتا۔ اندیشے دور ہو جاتے ہیں، حجاب حائل نہیں ہوتا ناریوں کے دلوں میں جذبۂ محبت دراصل ایک عطیہ آسمانی ہے!

اور پھر گھر کی زیب، آرائش سب انہیں سے ہے۔
پتوں سے درختوں کا حسن بڑھتا ہے اور پھولوں سے
پتوں کا!
اسی طرح سیندور سے ماتھے کا حسن قائم ہے
اور کانوں کا آویزوں سے!
پہلی محبت ایسی ہے جیسے پیاسے کو پانی
آنکھیں مشتاق دید رہتی ہیں اور کہتے ہیں
دل بڑا دھڑکتا ہے۔

نور النہار کی ماں بھی مالک کو اچھا لڑکا سمجھتی تھی۔ اسے بھینس کا دودھ پلاتی اور گڑ بھی کھلاتی۔ جب مالک کھانے کے لئے بیٹھتا تو نور گھر پر پنکھا کر رکھ کر اٹھتی اور اٹھلاتی، اس کے پاس سے گذر جاتی۔ اکثر دونوں کا ملنا ندی کے کنارے بھی ہوجاتا۔ نور پانی بھرتی اور مالک درخت کے نیچے بیٹھا بانسری بجاتا اور یہ محبت کے متوالے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔

ایک دن قیامت کی آندھی آئی۔ دریا کی غضبناک لہروں نے جھونپڑیوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دھان کے کھیت تباہ ہوگئے۔ کاشت کاروں کی آرزوئیں گھٹ کر مرگئیں، سیلاب میں انسان یوں بہہ رہے تھے جیسے مچھلیاں پانی کی سطح پر تیر رہی ہوں۔ بادل کی گرج سے دل دہل دہل جاتے۔ بجلیاں یوں لہرا کر آتی تھیں جیسے تیر چل رہے ہوں۔ دکانوں اور ہاٹ بازار کا نام و نشان نہ رہا۔ عالموں کی کتابیں دریا برد ہوگئیں۔ امیروں کی دولت بھی پانی میں بہہ گئی۔ بڑے بڑے درخت گر پڑے۔ گائیں بھینسیں بہہ گئیں۔ دھان سونے کے مول بکنے لگے۔ اصغر بھی اس تباہی سے نہ بچا۔ اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ فاقے میں دن کٹنے لگے۔ مالک کا کہیں پتہ نہ چل رہا تھا۔ اصغر اسے تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ جب وہ ہر طرح سے مایوس ہوگیا تو "رنگ دیا" آکر اس نے از سرِ نو زندگی شروع کی۔ پانی کے مول یہاں زمین ملتی تھی۔ اس نے بھی زمین لے لی۔ گائے اور بیل بھی خریدے۔ یہاں کی زمین اتنی زرخیز تھی کہ سال میں دو تین بار دھان پیدا ہوتا۔ غرض اصغر کی زندگی بڑے چین سے گذرنے لگی۔

طرح طرح کے نشیب و فراز سے گذرتا ہوا مالک اپنے گاؤں واپس آگیا۔ مگر اس کے دل میں نور النہار کی یادیں اب بھی قیامت برپا کر رہی تھیں۔ وہ اپنی کٹیا کی اور گیا۔ مگر وہاں تو کوئی نہ تھا۔ ویران اور سنسان کٹیا میں اس کا جی نہ لگا۔ اس نے "مالک جانے کی ٹھان لی ـــ جہاں نور النہار اس کے لئے سراپا انتظار تھی۔ آج اس کے دل کا داغ چراغ بن کر جل رہا تھا۔ شام ہوئی تو اس نے گھر کو روشن کیا لیکن اس کو کسی پہلو قرار نہ تھا ـــ کیونکہ مالک، یعنی اس کے من کا راجہ "مسافر" بن کر اس کے گھر آیا تھا۔ مالک اس کے باپ سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اور وہ دروازے کی دراڑ میں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

اصغر نے مالک کی خوب مہمان نوازی کی۔ مختلف قسم کے کھانے چنے گئے۔ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا۔ اس کے بعد نور حقہ لے آئی ـــ اور پان کے بیڑے بھی۔ بہت دنوں کے بعد نور کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کھا کر مالک کا جی خوش ہوگیا۔ رات زیادہ گذری تو نور نے اس کو سونے کے لئے شیتل پاٹی دی۔ نہ اس کی آنکھوں میں نیند تھی نہ دل کو قرار تھا اس کے ذہن میں ہلچل تھی۔ تنہائی میں وہ گانے لگی:-

"میرے محبوب دکھن کی ہوائیں چل رہی ہیں، اور کوئل کی
کوک سنائی دے رہی ہے
ذرا آکر دیکھو تو میں نے کھوپرے کے تیل سے اپنے
بال کس طرح سنوارے ہیں!
بچپن کی محبت بھلا نہ دینا، میرے محبوب!"

گھر کے چاروں اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ بے خبر پڑے سو رہے تھے ـــ مگر اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ کبھی ایک پاؤں آگے بڑھتا کبھی پیچھے۔ اُدھر مالک بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ یکایک اٹھ بیٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

حن میں نور کو دیکھ کر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس وقت دکھن کی ہوائیں چل رہی تھیں اور آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔

"رنگ دیا" سے کچھ کی اور ایک بہت بڑا دریا بہتا تھا یہ دریا ہمیشہ اپنا رخ بدل دیتا تھا جس کی وجہ سے نئے نئے چر پیدا ہوتے تھے۔ یہاں دریائی ڈاکوؤں کا اڈہ بھی تھا۔ وہ آس پاس کے گاؤوں کو برابر لوٹتے رہے۔ ساری دنیا ان سے دکھی تھی۔ دریا میں ہمیشہ طوفان آتا رہتا تھا مگر یہ ڈاکو طوفان کی ذرا بھی پروانہ کرتے۔

ایک دن یہی دریائی ڈاکو "رنگ دیا" میں بھی آ گئے۔ انہوں نے اصغر کے مکان پر چھاپہ مارا اور جو کچھ تھا سب لوٹ کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے اصغر اور نور النہا کو بھی نہ چھوڑا۔ وہ دونوں کو کندھوں پر ڈال کر لے بھاگے۔ اصغر کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس کی دنیا ویران ہو گئی تھی۔ نور کی ماں بھی بین کر رہی تھی — "ڈاکو میری نور کو کہاں لے گئے — س کا بیاہ کیسے ہوگا؟"

ڈاکوؤں کی کشتی لہروں میں اس طرح ہچکولے کھا رہی تھی جیسے چیل اڑ رہی ہو۔ نور کو کشتی میں باندھ دیا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی چوٹی کھل گئی تھی۔ مالک بھی گھائل ہو چکا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے نور کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔ اور مالک سے خیریت دریافت کی۔ اس نے ہنستے ہوئے نور کی افسردگی کا سبب ان لفظوں میں پوچھا — "اے لڑکی تیرے چہرے کی شگفتگی کیا ہوئی، بتا تیری سسرال کہاں ہے۔ اور کہاں ہے تیرا سیکہ"؟ مالک نے یہ سب سنا لیکن اس کی زبان نہ کھل سکی۔ اسکے بعد ڈاکوؤں کے سردار نے ہاتھ میں کٹاری لی۔ اس سمے یکایک نور نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کشتی کنارے سے آ لگی تھی — بہت سے ملاح مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ ان کی کشتیوں میں لے گئے اور مچھلیاں بھون بھون کر کھانے لگے۔ ملاحوں کو بھی طیش آ گیا اور بالس یا دوسرے ہتھیاروں سے بس ہر کر لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ خوب گھمسان کا رن پڑا۔ ایک بوڑھا ملاح پسی ہوئی مرچیں کہیں سے لے آیا اور اس نے ڈاکوؤں کی آنکھوں میں جھونک دی! سارے ڈاکو بے دم ہو کر گر پڑے اور چیخنے چلانے لگے۔ اور ان ملاحوں نے مل کر ان سب کو خوب مارا۔ مالک نے چیخ پکار کی آواز سنی تو وہ بھی رونے لگا اسکی آواز سن کر ملاح ہاتھ میں مشعل لئے کشتی میں آئے۔ مالک کو بندھن سے آزاد کیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور فوراً نور کی طرف آیا نور کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس بھی رک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مالک کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ سارے ملاح اسے اپنی کشتی میں لے آئے کسی نے اسکے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے کسی نے پنکھا جھلنا شروع کیا۔ مالک کی ہچکی بندھ گئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "ذرا آنکھیں کھولو اور میری طرف دیکھو! چلو ہم "رنگ دیا" چلیں۔ اے پورنماشی کے چاند، مجھے پان بنا کر کون کھلائے گا! اے میرے اندھیرے گھر کی روشنی، بتا تو سہی، مجھے سونے کے لئے شیتل پاٹی کون دے گا۔ اے میری نور آنکھیں کھول دے چل "رنگ دیا" چلیں

ملاح ادھر نور کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہے تھے اور ادھر ڈاکو پھر اٹھ کھڑے ہوئے — اب تو ملاح یہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ڈاکوؤں نے ان کا تعاقب کیا۔ مالک کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس نے نور کو آ کر اٹھایا۔ اب اسکی سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ اس کے جسم کو حرکت بھی ہوئی۔ اور کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مالک نے فوراً اسکو پانی پلایا اور کچھ کھانے کو بھی دیا — سب سے پہلے ہوش میں آ کر اس نے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھا۔ مالک نے ساری داستان بیان کر دی

دوسرے دن سارے ملاح یہیں آ گئے۔ انہوں نے اپنی کشتی میں بادبان اڑائے اور مچھلیوں سے کشتیوں کو بھر دیا۔ سب لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ کوئی بانسری بجا رہا تھا تو کسی کے ہونٹوں سے گیتوں کی پھواریں برس رہی تھیں۔ اور کسی نے "ساری گان" کا شروع کر دیا تھا:۔

اے پوس کے مہینے کی سرد رات
ہم کتنے جزیروں میں گئے اور مچھلیاں پکڑیں
بہت سی مچھلیاں جال سے نکل گئیں اور بہت سی رہ گئیں
اے پوس مہینے کی سرد رات
ہم اکیلے دریا میں کشتی کھے کر پردیس آئے ہیں،
یہاں کی لہروں سے ڈر لگتا ہے!
اے پوس مہینے کی سرد رات،
"سونادیا" کے شمال میں طرح طرح کی ڈھیروں مچھلیاں ہیں
اور ہمارے یہ جال ان کے لئے کافی نہیں"

اس طرح تین دن کے بعد ملاح "زنگ دیا" پہنچے۔ مالک اور نور نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد دونوں گھر آئے۔ اصغر دونوں کو دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگا۔ اسکی آنکھیں ساون بھادوں کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ نور کو اس نے اپنی چھاتی لگایا اور اسکی پیشانی کو چوما۔

اصغر دونوں کی بڑھتی ہوئی محبت کا اندازہ تو کر ہی چکا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے چنانچہ ایک دن مالک کو اپنے پاس بلایا اور بڑی محبت اور شفقت سے کہنے لگا — "بیٹے تمہیں اس راز کا علم نہیں کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو طلاق دی تھی وہ بے چاری میرے پاس آئی۔ اس نے رو رو کر اپنی بپتا بیان کی۔ اس کے آنسو تھمتے نہیں تھے — میں نے اس سے نکاح کر لیا۔ نور تو تمہاری بہن ہے۔ اور بہن کے ساتھ شادی گناہ ہے، میرے بیٹے"!

یہ سن کر مالک کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ گم سم بیٹھا تھا۔ اصغر نے کہا — "چلو اندر چلیں"۔
مالک نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "آپ چلئے میں تھوڑی دیر میں آؤں گا"

لیکن آدھی رات گذر جانے کے بعد بھی مالک اندر نہ گیا تو اصغر اور نور دونوں کو تشویش ہوئی۔ اصغر نے چاروں طرف اسے تلاش کیا اس کا پتہ نہ چلا۔ نور کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ ادھر مالک نصف شب کو دریا کنارے آیا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر کہیں دور — بہت دور — جا چکا تھا۔

نور اداس ہو کر یہ گیت گانے لگی۔
"میرے معبود، نانہ پھول سوکھ گئے پر میرا بھونرا نہ آیا
کیا مجھ بھاگ جلی کو سکھ کے دن دیکھنا نصیب نہ ہونگے
ہائے یہ دنیا میرے لئے اندھیرا ہو گئی۔
اب اس زندگی کا حاصل کیا"؟

چند روز بعد اصغر چیچک کی وبا کا شکار ہو گیا اور اس دنیا سے سدھارا۔ نور بھی اسی مرض کا شکار ہوئی اور — مالک کا نام جپتے جپتے دوسری دنیا میں جا پہنچی۔

مالک نے خوب محنت کی اور بڑا پیسہ کمایا اور پھر ایک دفعہ وہ "زنگ دیا" واپس آیا اور سیدھا نور سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ مگر اس گھر میں تو اب کوئی نہ تھا۔ پڑوسیوں سے سارا حال معلوم ہوا تو اسکی آنکھیں ابل پڑیں۔

دریا کنارے قبریں نظر آئیں۔ وہیں ایک قبر سے لگ کر وہ بیٹھ گیا۔ آدھی رات گذری تو ایک عجیب ماجرا ہوا۔ قبر کی مٹی کھسکنے لگی! جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔ اور اندر سے نور کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی:-
"بھائی میرے، غم نہ کھاؤ
میرے سرہانے ذرا اپنا چہرہ لے آؤ
دیکھو میں نہ تمہیں بھولی نہ تمہاری باتوں کو
محبت کا جو رشتہ تم نے باندھا تھا اسے نہ توڑنا!"

مالک نے یہ بات سنی تو وہ پاگل سا ہو گیا اسے اپنی سدھ نہ رہی نہ اپنے روپیہ پیسہ کی۔ اس کے جسم کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے — اب وہ کسی کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہ نور کی قبر سے لگ کر بیٹھا رہتا اور ہر وقت بڑبڑاتا رہتا ✦

کراچی۔

یونس احمد

کملا

ننداکی (دیہی سلہٹ) سے دس میل آگے بالی پور نامی ایک گاؤں ہے جہاں کافی دھن دولت والا ایک شخص رہتا تھا۔ اس کا نام تھا۔ مانک چاکلادھر زمین اور کھیتی باڑی کے علاوہ اس کے کئی مکانات بھی تھے وہ جتنا مالدار تھا۔ دل کا بھی اتنا ہی سخی اور فیاض تھا۔ روزانہ اس کے گھر پہ کتنے محتاج اور فقیر آتے اور سیراب ہو کر کھا پی کے جاتے لیکن اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی کے سوا تیسرا کوئی نہ تھا لڑکے کا نام تھا سودھن اور لڑکی کا کملا۔ کملا کا حسن بے مثال تھا۔ جیسے سرسوتی سورگ سے دنیا میں واپس آگئی ہو۔ گھر پہ ایک منشی بھی تھا۔ نام تھا نندان وہ جائداد کا حساب کتاب کرتا اور گھر کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔

اسی گاؤں میں ایک نہایت ہی ہوشیار اور جہاں دیدہ گوالن بھی رہتی تھی۔ جب تک وہ ایک سیر دودھ میں تین سیر پانی نہ ملاتی۔ اس وقت تک اس کو چین نہ آتا تھا۔ بھی بڑی ہنس مکھ اور پُرمذاق۔ اس کے پوپلے منہ سے دانت جھڑ چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود سہاگنیں بھی اس کے آگے مات کھا جاتیں تھیں۔ کمر کا لچکا کر چلنا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ گاؤں کی صرف عورتیں ہی نہیں مرد بھی اس کے پاس جاتے تھے۔ کیونکہ اس کے پاس ایسی محروم دوائیں تھیں جن کی مدد سے بگڑے ہوئے کام بھی بن جاتے تھے۔

جب کملا جوان ہوئی!

جب کملا کے روم روم میں جوانی کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں تو اس کا چہرہ چاند کی طرح بلوریں بن گیا۔ اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹ اس طرح کپکپاتے جیسے وہ لمس حیات کے لیے تڑپ رہے ہوں۔ آنکھوں میں نہ جانے کتنے پیمانے آباد تھے۔ وہ جوانی کے بارے اس طرح مستانہ بیخود چلتی تھی جیسے چھالیہ کے درخت آہستہ خرامی کر رہے ہوں۔ آواز میں کوئل کی مٹھاس تھی اور سیاہ لٹیں شانے پہ اس طرح بکھری رہتی تھیں جیسے ساون کے کالے کالے بادل پرواز کر رہے ہوں۔

ایک دن جب وہ!

ایک دن کملا ندی میں اشنان کرنے گئی۔ اس دن اس کی سدا بہار جوانی میں بلا کی کشش تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے مد بھرے نینوں نے کتنے ساغر چھلکائے ہوں۔ اتفاق کی بات پندان بھی ادھر آنکلا۔ شاعر نے کملا کے حسن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

جوڑے تے سندری کنیا بھوٹا پدا پھول	پانی میں پری وش دوشیزہ کے لئے پدما کے پھول پھوٹ پڑے
کنیا رے دیکھا کارکن ہوئی لو آکول	اسے دیکھ کر کارکن (پندان) انگشت بدنداں رہ گیا!
لوکا ٹیا بکو پردا ڈالے ٹیلے چوکھیاس	درخت کی آڑ میں چھپ کر وہ آنکھوں کی پیاس بجھانے لگا!
جتے دیکھے ٹکو تار باڑتی چھے پیاس	جتنا اسے دیکھتا اس کی تشنگی بڑھتی جاتی!۔

جب پندان کو معلوم ہوا کہ گوالن اور کملا میں کافی زیادہ ربط ضبط ہے تو اس نے موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وہ چپکے چپکے اس کے گھر گیا۔ گوالن کی نگاہ جونہی اس پر پڑی۔ اس نے پوچھا "آخر اس غریب خانہ تک تمہاری سواری کیسے آئی۔ یاد کرنے کا سبب؟"

اس نے دل کی بات زبان پہ لاتے ہوئے کہا۔

سنو سنو اد گو چکن گوالیں ـــــ پر مذاق گوالن سنو۔

تومار تو جوبن چھیو جوار پانی ـــــ تمہاری جوانی تو دریا کے جوار کی طرح آئی اور چلی گئی۔

تومی رسیک ناری بھالو کو ئیر اجانو ـــــ تم ہو تو پُر مذاق مگر اچھی طرح جانتی ہو!

جوبنے کیمن کو رے من او چاٹا ن ـــــ جب جوانی آتی ہے تو من کتنا بیاکل ہو جاتا ہے۔

سُنو تومار کاچھے کو تبو مونیر کتھا ـــــ سُنو میں تم سے دل کی بات کہتا ہوں ـــ!

کملا دیکھا بڑو پای مونیر بیتھا ـــــ کملا کو دیکھ کر دل کا اضطراب بڑھ گیا ہے ـ!

یہ سُن کر پہلے تو گوالن نے پنڈا ئن کو دھمکایا۔ کہ اگر یہ بات کملا کے باپ کو کانوں تک پہونچ گئی تو وہ کچھ پوچھے بنا گردن قلم کر دے گا لیکن پنڈائن نے مایوس ہونے کے بجائے یہ عقلمندی کی کہ گوالن کے سامنے ایک سو روپے گن دیئے۔ اور پھر پنڈائن نے کملا کے نام گوالن کی معرفت ایک محبت نامہ بھیجا اس میں تحریر تھا۔

کنیا آرے سُن دیا من ـــــ دوشیزہ ذرا دھیان سے میری باتیں سنو۔!

تومار لاگیے مورو من اوچاٹن ـــــ تمہارے لئے میرا من بے قابو ہو رہا ہے۔!

کرپا کو ئیر اکنیا ایک بار چاؤ مو پانے ـــــ عنایت ہو گی اگر تم ایک نظر ادھر بھی دیکھ لو۔!

پرانے بچاؤ مورے بھرا جوبن دانے ـــــ اپنا سدا بہار شباب دے کر میرے دلِ بیمار کا علاج کر دو

آمار جاآچے تومائے سب کینو دان ـــــ میرے پاس جو کچھ ہے۔ تم پر وار کرتا ہوں!

تومار لاگیا پاری نیچی تے پران ـــــ اور تمہارے لئے سب کچھ تج کرتا ہوں!

تومی آمار دھرم کرم تومی گلار مالا ـــــ تم میری دھرم کرم ہو، گلے کی مالا ہو ـ!

تومارے نہ دیکھیے آمار من ہوئے چے اوتالا ـــــ تمہیں دیکھے بنا میرا من قابو سے باہر ہو جاتا ہے!

ـــ گوالن یہ محبت نامہ لے کر کملا کے پاس گئی ـــ اس وقت وہ پلنگ پر بیٹھی پان کھا رہی تھی ۔ اور اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کے حسین تصور میں کھوئی ہوئی ہو اور جب گوالن پر اس کی نگاہ پڑی وہ شرما گئی۔ اس نے گوالن کو اپنے قریب بٹھا لیا اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ موقع غنیمت جان کر گوالن نے کملا سے کہا۔ اس بھری جوانی میں بیاہ نہ ہوا تو پھر جوانی کی بہاریں کیسے لوٹو گی۔ تمہارے ماں باپ بھی کیسے کٹھور ہیں کہ انہیں تمہاری جوانی پر ترس نہیں آتا۔ پھولوں کا یہ ہار کس کے گلے میں پہنانے کے لئے گوندھ رہی ہو؟ یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ سوکھ جائے گا۔ تمہاری اداسی اور حرماں نصیبی سے میرے دل کو دکھ ہونے لگا۔ تمہیں یہ کیوں محسوس نہیں ہوتا کہ تمہارے اردگرد کتنے بھونرے منڈلا رہے ہیں۔

” گوالن کی یہ باتیں سُن کر کملا نے محسوس کیا۔ جیسے اس کے کوئی گدگدی کر رہا ہے اور وہ پاگل ہوتی جا رہی ہے ۔ اس نے گوالن سے صرف اتنا کہا ۔ میں خود سوچ رہی ہوں کہ یہ ہار کس کے گلے میں پہناؤں گی۔ کیونکہ سنتی ہوں اس دنیا میں میرا جوڑا پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔“

گوالن کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ بولی ” مایوس کیوں ہوتی ہو۔ تمہارا چاہنے والا تو تمہارے بالکل قریب ہے۔ یہ دیکھو اس نے تمہارے نام ایک خط بھی لکھا ہے پہلے بخشش دو پھر خط دوں گی ـــ پتر کھولیا کنیا پڑھی تے لاگیلو ـــ خط کھول کے دوشیزہ پڑھنے لگی۔

پڑھیتے پڑھیتے کنیا کردو دھیتے جاسیلو ـــــ اور پڑھتے پڑھتے اس کی خواہشات بڑھنے لگیں

پشپا بنے تے جیمی لاگیلو آگونی ـــــ جس طرح پھولوں کے باغ میں آگ لگ جاتی ہے

شیرے رکتو اُٹھے کنیار انتر باگونی ـــــ اسی طرح اس کے دل کا خون سر پر آگیا۔

مونہر گو مر کنیا مو سنے لو کا ئیا ـــــ دوشیزہ نے من کی بے کلی چھپا لی ۔

گوالنیر کا جھوکے ہانیسا ہانیسا ـــ	ہنستے ہنستے گوالن نے کہا
سُنو سُنو مونیر کتھا چکن گوالین	گوالن دل کی بات سُنو
آمارلاگید تومی پائی ئے پریشانی	میری وجہ سے تم کو پریشانی اٹھانا پڑی
مدن آگمنے آمی پوڑی راتر دن — آمارلاگیا تومی پائی لے پریشانی	محبت کی آگ میں شب روز میں جل رہی ہوں
تومار کار چیتے آمار پھیر یو شودن	تمہاری کوشش سے میرے لئے اچھے دن آتے ہیں
تو مار مدن بھا کر دیکھیں تے کیمن	یہ بتاؤ محبت کا دیوتا دیکھنے سننے میں کیسا ہے۔
دیکھی نائی کون دن تے چاند بدن	میں نے اس چاند بدن کو شاید کبھی نہیں دیکھا ہے۔

کملا کی بیقراری اور اضطرابی کیفیت کا اندازہ کر کے گوالن نے کہا چاند کی ٹھنڈی اور جادو جگانے والی چاندنی اس کے انگ انگ میں پھوٹتی ہے۔ جس دن سے اس نے تمہیں اشنان کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی دیوانگی بڑھ گئی ہے۔ جانتی ہو وہ ہے کہاں؟ وہ تو تمہارے بالکل قریب ہے۔ اس کا نام پنداتن ہے اتنا سننا تھا کہ کملا آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے گوالن سے کہا۔ کہ اگر تو اپنی عزت چاہتی ہے تو میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جا۔ شرم نہیں آتی کہ تو ایک ملازم سے میرا رشتہ باندھنا چاہتی ہے۔ گوالن اپنا سامنہ لے کر چلی گئی۔ اس نے انعام و اکرام ملنے کا جو سنہرا خواب دیکھا تھا وہ آن کی آن میں فریب ثابت ہوا۔ گوالن کی زبانی پنداتن کو جب ساری باتیں معلوم ہوئیں وہ بھی آگ بگولہ ہو گیا اور اس کے دماغ میں انتقام کی بھٹیاں سلگنے لگیں۔

کملا کا باپ رگھوپور کے دیال نامی ایک بڑے زمیندار کا مقروض تھا۔ پنداتن نے اسے کملا کے باپ کے خلاف خوب بھڑکایا۔ یہاں تک کہ دیال زمیندار نے اس کی ساری جائداد نہ صرف ضبط کر لی بلکہ اسے بن باس بھی دے دیا۔ اب کملا دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی۔ پنداتن جلد سے جلد اپنی مدت کی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دن کملا کے پاس آیا اور بولا "کملا اگر تم مجھ سے شادی کر لیتی ہو تو میری ساری جائداد جس کا اب میں تنہا وارث ہوں تمہاری ہو جائے گی۔ کملا کو ایک بار پھر طیش آ گیا۔ بولی " یہ سچ ہے کہ اب بالکل بے آسرا ہوں۔ لیکن تم جیسے نمک حرام کے ساتھ شادی کر کے میں اپنے خاندانی وقار کو داغ نہیں لگا سکتی۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ کملا کی تیکھی باتیں سُن کر پنداتن چپ چاپ وہاں سے سرک گیا۔

پنداتن کی اس مذموم حرکت سے کملا کو اتنی تکلیف پہنچی کہ وہ گھر سے نکل پڑی۔ وہ ایسی جگہ جانا چاہتی تھی جہاں مردوں کی ہوسناک نگاہیں اس کو دیکھ نہ سکیں۔ گھر تیاگ کرنے کے بعد اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ راستے کے مصائب نے اس کے حساس ذہن پر اور برا اثر کیا۔ اتفاق کی بات کہ ایک گڈریئے سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ سن و سال کے لحاظ سے وہ بالکل بوڑھا ہو چکا تھا کملا نے اس سے کہا " بابا میں بہت مصیبت زدہ ہوں اپنے گھر کے کونے میں جگہ دے سکتے ہو؟ بڑی دیا ہو گی"

گڈریئے نے کہا "تم آؤ گی تو میرے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔ دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے" اور اس طرح کملا کو گڈریئے کے گھر میں پناہ مل گئی اسے اس گھر میں ذہنی اطمینان حاصل ہوا لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ ایک دن ادھر ایک شکاری آ نکلا۔ چہرے بشرے سے شہزادہ معلوم ہوتا تھا ایک دن یکایک اس کی نگاہ کملا کے حسن جہاں تاب پر پڑ گئی۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے اس کی سب سے قیمتی شے گم ہو گئی ہے۔ اس نے گڈریئے سے موقعہ پا کر کہا۔

سو شیال مور کتھا دھر	گڈریئے میری بات سُنو۔
اوگندیا دیو مورے لونیا جائی گھر	اس حسینہ کو میرے حوالہ کر دو میں اسے گھر لے جاؤں گا۔
مونی ملتا دیمو تو مائی دھاماتے ماپیا	اس کے انعام میں ٹوکری بھر کر تمہیں موتی دوں گا۔
چودہ پورا ابھی دیمبو باپے دے کو ہیا	اور اپنے باپ سے درخواست کر کے زمین بھی دلاؤں گا۔

گڈریئے نے شہزادہ کو سارا قصہ سنا دیا کہ کملا کون ہے۔ کیسے ہے۔ اور کس طرح وہ یہاں تک آئی ہے۔ یہ ساری باتیں سُن کر شہزادہ کملا سے خود

(بقیہ صفحہ ۲۷۵ پر)

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔

ڈھاکہ کی ادبی محفلیں

بنگال کی خاک کچھ ایسی دامنگیر ہے کہ ایک بار جو یہاں آگیا یہیں کا ہو رہا۔ شاید اسی کو بنگالہ کا جادو کہا جاتا ہے۔ میں خود آج سے پچیس برس پہلے یہاں آیا تھا اور اب تک یہیں ہوں۔ اس ۲۵ برس میں بہت سے انقلابات آئے اور ڈھاکہ بہت کچھ بدل گیا۔ لیکن ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ بدستور چل رہا ہے۔ خدا غریق رحمت کرے حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب مرحوم کو کہ ان کی زندگی میں یا یوں کہیے کہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے یہاں کی ادبی سرگرمیاں انہی کی ذات سے وابستہ تھیں وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انھیں کی تحریک سے ۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو مرزا ابوجعفر صاحب کشفی کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا فدا علیخان صاحب مرحوم نے صدارت فرمائی۔ پروفیسر فدا علیخان صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی و اردو کے چیئرمین تھے۔ ڈھاکے کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں میں نے شرکت کی۔ مصرع طرح یہ تھا: آفتاب اونچا ہوا اتنا کہ تارا ہوگیا۔ کتنی ہی قابل قدر ہستیاں جو اس بزم کی رونق تھیں آج آغوشِ لحد میں آسودہ ہیں مگر تصور کی آنکھ سے میں آج بھی انھیں چلتے پھرتے ہنستے بولتے دیکھ سکتا ہوں۔

احسن منزل نے ہمیشہ اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اس جلسہ میں بھی دوسرے صاحبان کے علاوہ جناب خواجہ ناظم الدین صاحب اور جناب خواجہ شہاب الدین صاحب نے شرکت فرمائی تھی۔ خواجہ بیدار بخت تو شاعر ہی تھے اور بلکہ سچ پوچھیے تو وہ اکیلے ہی بزم شعراء تھے۔ تفصیل اس کی میں کیا بیان کروں سمجھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے۔ ہاں تو اس مشاعرے میں پہلی بار میں نے بیدار صاحب کو غزل پڑھتے سنا۔ وہ اُستادِ جہاں بلبلِ ہندوستان حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اچھا کہتے تھے اور اچھا پڑھتے تھے۔ داغ کے رنگ کو بڑی کامیابی سے اپنایا تھا۔ ڈھاکے میں رہ کر دلی کی زبان وہ بھی روزمرہ پر قدرت حاصل کرنا یہ انہیں کا حصہ تھا اگلے مہینے ایک اور مشاعرہ ہوا اور پھر تو دس مہینے تک سناٹا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں ۱۸ اگست کو اتوار کے دن پھر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس وقت یاد نہیں کہ یہ مشاعرہ کس کے یہاں ہوا تھا۔ پچھلی چوتھائی صدی میں مشاعروں کا یہاں پہلا دور تھا۔

دوسرا دور نومبر ۱۹۳۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بانی و محرک بھی حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب مرحوم ہی تھے۔ حکیم صاحب نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس کا نام تھا انجمن اُردو مشرقی بنگال و آسام۔ حکیم صاحب خود اس کے سکریٹری تھے۔ مرزا ابوجعفر اور میں تقریباً ہر شام کو حکیم صاحب کے یہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز یہ طے پایا کہ مشاعرہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مشاعرہ انجمن اردو مشرقی بنگال و آسام کے زیر اہتمام ۵ نومبر ۳۵ء کو طبیہ کالج میں منعقد ہوا۔ جلسے کا انتظام حکیم صاحب کی طرف سے تھا۔ مصرع طرح یہ تھا: دل کو کیا ہوگیا خدا جانے۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ترنم سے پڑھنے والوں کی غزل محض ترنم کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ ترنم سے نہیں پڑھ سکتے تھے انھیں کسی کا ترنم سے پڑھنا ناگوار تھا

اس انجمن کو مٹانے کے لئے حکیم صاحب نے یہ قید لگا دی کہ ہر شخص تحت اللفظ پڑھے۔ مگر جو غزلیں اچھی تھیں وہ تحت اللفظ پڑھے جانے کے باوجود بھی کامیاب رہیں۔ جن کی خاطر یہ قید لگائی گئی تھی وہ کچھ فائدے میں نہ رہے۔ اس زمین میں میرا یہ شعر بہت مقبول ہوا۔

زخم دل کے چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

ان مشاعروں میں عموماً بیس کے قریب غزلیں پڑھی جاتی تھیں لیکن شعراء میں ہر مرتبہ کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ پڑھنے والوں میں حضرت بیدار حضرت شرف۔ مرزا فقیر محمد صاحب مرزا ابو جعفر صاحب کشفی اور راقم الحروف کے علاوہ ایک معقول تعداد حضرت بیدار کے شاگردوں کی ہوتی تھی۔ اور حکیم صاحب میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ان کی وجہ سے علماء حضرات بھی شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ مثلاً مولانا سعادت اللہ صاحب سعدی مرحوم استاد اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی، شمس العلماء مولانا محمد امین عباسی صاحب پرنسپل ڈھاکہ اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج۔ مولانا امیر حسن صاحب جو صدر المدرسین مدرسہ حمادیہ ڈھاکہ وغیرہ۔ ان مشاعروں میں دو شخص اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ نمایاں رہتے تھے۔ ایک مصطفےٰ حسین بیڈھب کانپوری۔ مرحوم پہلے ڈھاکے کے ایک تھیٹر میں ڈائرکٹر تھے۔ جب تھیٹریکل کمپنی ٹوٹ گئی تو فوٹوگرافی کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ شعبدہ بازی میں بھی کمال رکھتے تھے بڑی بڑی پارٹیوں میں اکثر ان کی جادوگری کے کرشمے تفریح کا باعث ہوتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور اتنا اچھا پڑھتے تھے کہ سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ دوسرے میرے شاگرد ابو یوسف مرحوم وہ مزاحیہ کہتے تھے اور سب سے آخر میں پڑھتے تھے۔ زبان میں ذرا سی لکنت بھی تھی۔ کچھ اس انداز سے پڑھتے تھے کہ سننے والے لوٹ جاتے تھے مگر خود اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔

ابو یوسف مرحوم کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا ؎

سسرال سے نکالے گئے جب سے دوستو
ہم وہ قلم ہیں جس کا قلمدان نہیں رہا

ڈھاکہ میں ایک مدت تک احباب کی بے تکلف محفلوں میں "قلمدان" کی اصطلاح سے لطف اٹھایا جاتا رہا۔ ابو یوسف کا ہر شعر ایک تیر ہوتا تھا جو کسی نشانے پر مارا جاتا تھا۔ کوئی سوا برس تک یہ ماہانہ مشاعرے بڑی پابندی سے ہوتے رہے اس کے بعد یہ اہتمام نہ ہو سکا مگر سلسلہ برابر جاری رہا۔ آخری مشاعرہ ۱۹۳۸ء میں ہوا تاریخ یاد نہیں خود اپنی غزل بھی میں نے کہیں گم کر دی صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

میں بادہ کش نہیں مگر اس مست ناز نے
ہونٹوں سے جب پلائی تو مجبور ہو گیا

اس مشاعروں میں شریک ہونے والے اب برائے نام ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ بعض ڈھاکہ سے چلے گئے۔ بعض راہی ملک بقا ہوئے بعض نے بیدار مرحوم کی وفات کے بعد کسی وجہ سے شعر پڑھنا چھوڑ دیا۔

۱۳ اگست سنہ ۴۸ء سے ریڈیو پر مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مشاعرے میں ۷-۸ شعراء شریک ہوتے تھے، لیکن سب طرحی غزلیں کہتے تھے۔ چونکہ ریڈیو کے مشاعرے میں ہر شخص شریک نہیں ہو سکتا تھا اس لئے لوگ چاہتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا مشاعرہ ہو جس میں شرکت کی عام اجازت ہو۔ چنانچہ ۱۶ اگست سنہ ۴۸ء کو جناب خواجہ ناظم الدین صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ احسن منزل میں منعقد ہوا، اور بہت کامیاب رہا۔ ۲۹ جولائی سنہ ۴۹ء کو ٹورہا ہاؤس میں جو مشاعرہ منعقد ہوا وہ اس اعتبار سے یادگار ہے کہ بیدار اور شرف دونوں ہی اس مشاعرے میں شریک ہوئے میں غزل میں کبھی مقطع نہیں کہتا لیکن اس مشاعرے کی غزل میں یہ مقطع کہی کہا تھا ؎

بیدار اور شرف کے سوا انتہوعندلیب
ڈھاکے میں اور کوئی سخنداں نہیں رہا

آخر حضرت بیدار بھی ہم سے رخصت ہو گئے اب صرف جناب شرف باقی ہیں ان کا دم غنیمت ہے خدا زندہ رکھے

پاکستان بننے سے پہلے ڈھاکے میں جو مشاعرے ہوتے تھے وہ طرحی ہوتے تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ قید بھی اٹھ گئی، البتہ انجمن ترقی اردو نے یوم اقبال اور یوم پاکستان کی تقریب پر جو عظیم الشان مشاعرے کئے وہ طرحی تھے پاکستان بننے کے بعد ڈھاکہ

بقیہ صفحہ ۳۱۴ پر

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔

راگ، رنگ، شعر

۱۹۲۸ء میں اپنا ڈھاکے آنا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات حالانکہ بتیس (۳۴) برس گذر چکے۔ اس وقت بھی ڈھاکا اگرچہ انیسویں صدی کا ڈھاکا تو نہیں رہا تھا پھر بھی دیرینہ روایات کے مٹے مٹے آثار پائے جاتے تھے۔ کلکتہ کے مقابلے میں ڈھاکا ایک اچھا سا شہر تھا۔ کل ایک لاکھ بیس ہزار آبادی۔ لیکن بعض پرانے خاندانوں میں امارت کے چوچلے نظر بھی آجاتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ڈھاکے کی آبادی نوبت بڑھ گئی لیکن مجلسی اعتبار سے ڈھاکا اب ویسا بھی نہ رہا جیسا چالیس سال پہلے تھا۔ پھر ایک اور انقلاب آیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا۔ پاکستان بنا اور ڈھاکے کو مشرقی پاکستان کی مسند صدارت ملی۔ لاکھوں مہاجر آگئے۔ بڑے بڑے تاجر آئے کتنے ہی صنعت کار آئے۔ حکومت کے چھوٹے بڑے عہدے دار آگئے۔ سماجی ڈھانچے میں پھر ایک بار عظیم الشان تغیر ہوا۔ آبادی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ضرورتیں بڑھیں تو ان کے سامان بھی بڑھے۔ تفریحات اور عیش کوشی کے نئے نئے راستے کھلے۔ چیزیں مہنگی ہوگئیں۔ روپیہ سستا ہوگیا۔ شراب کی ممانعت ہوئی۔ لوگ بطور دوا کے پینے لگے۔ غرض لکشمی دیوی جن پر مہربان ہوئی وہ جی بھر کے دادِ عیش دینے لگے۔ مگر اس دور کی رنگ رلیوں کے متعلق مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ایک مدت سے تقریباً خانہ نشین ہوں۔ یہاں کی نشاط گاہوں اور سرد رکدوں کی صورت میں نے باہر سے بھی نہیں دیکھی۔ ان کے اندر کیا ہوتا ہے خدا ہی جانے۔

اس وقت مجھے آج سے تین چوتھائی صدی قبل کی رنگین صحبتوں کا تذکرہ مقصود ہے۔ میں نے یہ صحبتیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں اور ان کا چشم دید دیکھنے والا آج کوئی موجود نہیں۔ سینہ بسینہ جن بزرگوں تک یہ روایات پہنچی تھیں ان میں سے بھی اکثر رخصت ہو چکے جو باقی ہیں وہ بھی ہر وقت پا بہ رکاب ہیں۔ یہ رنگین حکایتیں انہیں بزرگوں کی زبانی مجھ تک پہنچی ہیں۔ اس کے علاوہ اشعار کی چند بیاضیں اسی عہد کی لکھی ہوئی مجھے ملی ہیں۔ یہ بیاضیں بڑی قیمتی دستاویزیں ہیں۔ سارے شہر کی سماجی زندگی کا حال تو ان سے معلوم نہیں ہوتا لیکن خصوصیت کے ساتھ نواب فیملی کی کامران زندگی کے دلکش مرقعے ان میں مل جاتے ہیں۔

نوابانِ ڈھاکا خود مختار حکمراں نہ تھے۔ زمیندار تھے لیکن خاندان کی نجی اور شہری زندگی میں ان کی حیثیت ہندوستان کے دوسرے والیان ریاست سے کسی طرح کم نہ تھی۔ نواب سر عبدالغنی مرحوم جن کی وفات کو تقریباً پچھتر سال کا زمانہ گزرا چوبیس لاکھ کی ریاست کے مالک تھے پورا خاندان خوشحال اور فارغ البال تھا۔ ہر چیز کی ارزانی اور فراوانی تھی۔ غم دوران کا کسی گھر میں گذر نہ تھا۔ غم جانان البتہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی دامن گیر ہو جاتا۔ اس وقت تک شاعری اور موسیقی دونوں کا تہذیب و شرافت کے لوازم میں شمار تھا چنانچہ خاندان کے اکثر افراد ان فنوں سے بہرہ ور تھے اور بعض ان میں نمایاں دستگاہ رکھتے تھے۔ خاندان میں شاعروں کی تعداد خاصی تھی۔ ان میں خواجہ حیدر جان شائق۔ خواجہ عبدالغفار اختر۔ خواجہ عبدالرحیم صبا خواجہ عطیق اللہ شیدا۔ نواب سر احسن اللہ شاہین۔ خواجہ عبدالرحمٰن ضیا۔ خواجہ امیر اللہ سما۔ مرزا ولی جان قمر اور خواجہ امیر اللہ طنز خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

خوش حالی اور فارغ البالی کا زمانہ فکرِ معاش سے بے نیازی۔ وقت ہی وقت، فرصت ہی فرصت عیش کوشی کے لئے اس سے بہتر محرک اور اس سے زیادہ ساز گار ماحول اور کون ہو سکتا تھا۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر تو ہر کس و ناکس اپنے جی کا ارمان نکال لیتا ہے لیکن یہاں عیش کوشی کے لئے شادی بیاہ کے علاوہ اور بہت سے مواقع پیدا کئے جاتے تھے مثلاً نواب نے شیر کا شکار کیا اور جشن طرب کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس تقریب پر ہولی کھیلی جانے گی۔ طرح طرح کی پچکاریاں آئیں خواتین کے لئے ان کی نسوانیت اور نزاکت کی مناسبت سے ہلکی پھلکی نازک تانبے اور پیتل کی۔ جوانوں کے لئے بڑی بڑی اور بھاری بھاری کچھ دھات کی کچھ بانس کی۔ مانوں، ٹبیلوں، دیگوں میں رنگ گھلا عبیر اور گلال کے بڑے بڑے ٹبے اور ... ہولی کھیلی جانے لگی۔

ہر طرف رنگ کی پچکاریاں چل رہی ہیں۔ رنگین فوارے چھوٹ رہے

ہیں معلوم ہوتا ہے شفق آسمان کے کناروں سے اٹھ کر محل کے صحن پر آجھکی ہے عنبر اڑ رہا ہے ننھے ننھے لاکھوں ستارے ہوا میں ناچ رہے ہیں۔ ساری فضا رنگ و نور سے معمور ہے کسی نے کسی کے سر پر گلال مل دیا چہرے انار سے بن گئے۔ عبیر دار پچکاری تو کے دامن میں آگ لگ جائے کسی کے کسی کے بالوں میں عبیر بھر دیا کالی رات میں ستارے چھٹک گئے۔ رنگ کی بوچھار سے سب لال شہابی ہو گئے ہیں۔ لباس میں شفق پھولوں کی چادریں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف لالہ و گل کے تختے لہک رہے ہیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ ہے کپڑوں سے ٹپک رہا ہے۔ ہوا میں اڑ رہا ہے آسمان سے برس رہا ہے۔ زمین پر بہہ رہا ہے۔ کوئی بھاگ رہا ہے کوئی پچکاری لئے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ کوئی پھسلا اور سنبھل گیا۔ کوئی دوڑا اور دھم سے گرا ہر طرف قہقہوں کا شور ہوا۔ سارا محل گونج اٹھا۔ ہر شخص رنگ کی موجوں میں تیر رہا ہے عجب سرخوشی کا عالم ہے۔ رنگ و نور کا طوفان امنڈ رہا ہے۔ در و دیوار سرخ۔ زمین و آسمان سرخ کپڑے سرخ۔ بدن سرخ۔ فضا سرخ۔ ہوا سرخ۔

جشن کا ایک دور یہاں تمام ہوا۔ سب لوگ نہائے دھوئے۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بہتر سے بہتر لباس پہنا۔ ہر طرح بن سنور کر کھانے پر آ بیٹھے۔ شاندار دعوت ہے۔ ہر قسم کے بہترین کھانے چنے ہوئے ہیں۔ خوشبوئیں اڑ رہی ہیں۔ کھانا بھی ہو رہا ہے۔ خوش گپیاں اور چہلیں بھی ہو رہی ہیں۔ کوئی مسکرا رہا ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے۔ کوئی قہقہے لگا رہا ہے مگر سلیقہ مندی کے ساتھ۔ ہر شخص نشاط و مسرت کے جھولے میں جھول رہا ہے۔ اس سرور فضا میں افسردگی یا غم کا نام نہیں۔ ہر طرف شادمانی ہی شادمانی ہے۔

اب رات ہوئی۔ محفل سرود جمی۔ نغمہ سرائی کے لئے خوش رو اور خوش گلو مراثنیں حاضر ہیں۔ خاندان کے ممتاز شعرا نے تہنیتی غزلیں اور ہولیاں کہی ہیں۔ غزلیں پڑھ پڑھ کر سنائیں۔ ہولیاں مراثنوں نے گائیں۔ آدھی رات کے بعد تک یہ ہنگامہ شادی برپا رہا۔ بالآخر سب کیف و سرور میں ڈوبے ہوئے خوشی و خرمی کو سینوں سے لگائے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئے۔ کل پھر یہی صحبت جمے گی۔ غرض کئی دن تک شبانہ روز یہ بزم طرب برپا رہی۔ ہر چھوٹے بڑے نے دل کھول کے داد عیش دی خاندان کے نامور شعرا اختر اور صبا نے اس منظر کی نہایت دلکش اور دل آویز تصویریں کھینچی ہیں۔ پون صدی گذرنے کے بعد بھی ان کے رنگ ویسے ہی شوخ ہیں اور ان کی آب و تاب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شوق کے کانوں سے سنئے اور تصور کی آنکھ سے دیکھئے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ بھی اس بہشت ارضی میں پہنچ جائیں گے۔

صبا نے اس موقع پر جو غزل لکھی تھی اس کا عنوان بیاض میں اس طرح تحریر ہے۔

"معاملہ جیتا گیا۔ احسن اللہ مرحوم نے شیر مارا۔ نواب دلہن کے پہنچنے کی خبر آئی۔ اسی خوشی میں جو ہولی ہوئی اس کی شبانہ روز سوائے عبیر و گلال اڑانا اور گانا اور خوشی منانا اور کچھ کام نہیں تھا۔ اس میں یہ غزل لکھی گئی۔ از خواجہ عبدالرحیم صبا۔"

اب کے ہولی میں ہیں اس جا کیسے خاص و عام سرخ
جامۂ رنگیں سے ہے ہر فرد کے اندام سرخ
کیا ہوائے عیش آئی جم گیا رنگِ نشاط
ہو گئے سب خانہ و دیوار و صحن و بام سرخ
جوشش رنگِ طرب اس درجے کو پہنچی کہ ہے
آسماں رنگِ شفق سے صبح سرخ اور شام سرخ
اس قدر سرخی نے پایا ہے زمانے میں رواج
بر میں ہے اب حاجیوں کے جامۂ احرام سرخ
کس نے پھیلایا جہاں میں اس قدر رنگِ نشاط
ہو گیا کس واسطے ہے رنگ اتنا عام سرخ
ہے یہ رنگِ عشرت دشمن کشی و شیر افگنی
جس سے محفل کا ہے رنگ آغاز سرخ انجام سرخ
سرخ رو عبدالغنی کو رکھ خدا جب تک کہ ہے
پرتو رنگِ شفق سے چرخ مینا فام سرخ

اس تقریب پر اختر کی گل کاریاں بھی دیکھئے:

ہولی ہے رنگ لاؤ کوئی اب نکال لال
کر دو مکان و اہل مکاں سب کو لال لال
ہولی نے رنگ ایسا جمایا کہ بن گئے
صحرا و باغ و کوہ و دشت و جبال لال
ہے یہ اثر ہوا کا کہ اب دشت و باغ میں
لائے نکال سب یہ شگوفے نہال لال
چھوٹے بڑے کے جامۂ رنگیں ہے بر تن
رنگِ نشاط سے ہے ہر اک فرد لال لال
عبدالغنی کو حق نے کیا ہے جو سرخ رو
اس کا اثر یہ رنگ ہے لایا نکال لال
اور شیر مارا ہے مرے نواب پیارے نے
موذی کے خوں سے آج ہیں دشت و جبال لال

اسی تقریب پر اختر کی دوسری غزل سنئے:

محفلِ نوروز اس جا آج ہے
عیش کا ساماں مہیا آج ہے
ساغرِ جامِ جم پرخندہ زن
بزم رشکِ بزمِ دارا آج ہے
کھیلتے ہوری ہیں یاں عبدالغنی
جوش زن عشرت کا دریا آج ہے
بھر گئے پرنالے ہر سو رنگ سے
سرخ دشت و کوہ و صحرا آج ہے
دشش سے نوارد ں کے جائے شفق
رنگ میں خورشید ڈوبا آج ہے
آسماں تک اڑ کے پہنچی ہے ابیر
چرخ کا چمکا ستارہ آج ہے
نصرتِ بیمانیاس لالہ گوں
کیا کریں یوں امر حق کیا آج ہے

ہوری از اختر:

سانگر بھر رنگ لا ڈر تی
ہوری کھیلت ہیں اب لارے
کیسر رنگ سے بھرں پچکاری
ابیر گلال سلا ڈر ری
نئی آئی رت دیکھے ہیں کھلاڑی
یو رنگ بھنگ اڑا وری
اختر کی اب سنی کوئی ہوری
گا دکھوں کو سنا ڈری

ہوری از خواجہ عبدالرحیم صبا ۔ کافی

جنگل میں کھل رہا بھاگ رے
عبدالغنی صاحب تیرے مدت
گل کی طرح نت سنتے رہو تم
دل پر ہو دشمن کے داگ رے
جیتے رہو تم ہمیشہ خوشی سے
جاگیں سدا تیرے بھاگ رے
جھم جھم آؤ نت نت آؤ
مار و صدا یاں پہ باگ رے
نواب کا یہاں تم بیاہ رچاؤ
ہم سب گا دیں سہاگ رے

اس محل پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس ہولی کا ہندوؤں کے تہوار "ہولی" سے کوئی تعلق نہیں چونکہ ہنود کے یہاں ہولی کے موقع پر رنگ کھیلنے کا دستور ہے اور اس بزم آرائی کے سلسلے میں بھی رنگ کھیلا جاتا ہے اس اشتراک کی بنا پر اسے ہولی سے تعبیر کرتے تھے ۔ اسی طرح دیوالی اور بسنت کے عنوان سے جشن منائے جاتے تھے ۔ عیش و نشاط کے ان جلسوں کے لئے تقریبات خود بخود پیدا ہو جاتی تھیں ۔ مثلاً نواب شکار کے لئے گئے اور شیر مارا ۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اب جلسہ کیوں کر نہ ہو ۔ نیا مکان یا نیا باغ تعمیر ہوا ۔ اس تقریب پر اظہار مسرت ہونا ہی چاہیے ۔ مقدمے میں کامیابی ہوئی ۔ گھوڑ دوڑ میں گھوڑنے نے بازی جیتی ۔ کوئی نیا گاؤں خرید لیا گیا نواب نے دربار کیا ۔ نواب بیگم نے بیماری سے صحت پائی ۔ یہ تو بڑی بڑی تقریبات ہوئیں ان کے علاوہ ۔ ان سے چھوٹی تقریبوں پر بھی دھوم دھام کی دعوتیں اور زور و شور کے جلسے ہوتے تھے اور اس طرح خدا کی دی ہوئی بے قیاس نعمتوں کا جی بھر کے شکر ادا کیا جاتا تھا ۔

نواب زادہ نے قرآن ختم کیا ۔ اس کی خوشی میں خاندان بھر کی دعوت ہوئی نواب نے نیا چاند دیکھا ۔ خاندان کے شعرا نے مبارک بادی بھیجی غزلیں لکھیں اور پڑھ کر سنائیں ۔ نواب زادے نے پہلی مرتبہ ہرن کا شکار کیا ۔ دھوم مچ گئی پھر شیر مارا اور بھی معرکہ ہوا ۔ اس خوشی میں جلسہ ہوا ۔ کھانا ہوا ۔ گانا ہوا ۔ خواجہ عبدالرحیم صبا نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے:

نواب نے کئے ہیں مرے دو ہرن شکار
تحسین و آفرین کی ہے ہر سمت سے پکار
خنداں مثالِ گل ہوئے ہیں غنچہ ہائے دل
شہرے کی اور بدھاوے کی ہے ہر طرف پکار
کوئی کہے ہے آفریں اور کوئی مرحبا
کوئی کہے ہے واہ وا نواب نام دار
منہ چومتا ہے کوئی ۔ کوئی کہتا ہے شاباش
ہاتھوں پہ اس کے کرتا کوئی اپنے کو نثار
نواب کے ہے سر پہ عجب طرح کا ہجوم
مانگے مٹھائی اور کوئی انعام بے شمار
دریا کے ہیں کنارے کھڑے سارے فیل بان

حاجتمند مانگتے ہیں وہ سب تیح مار مار
کہتا ہے مال دیں وہ دے دیجیے گا آپ
وعدہ کیا تھا دینے کا گر ہوں تیرا بر
امّاں یہ کہتی ہیں کہ ضیافت میں دوں گی آج
جو ایک ہم سے مانگے گا دوں گی اسے ہزار
ساس حالی ان کی کہتی ہیں حالی سے تو لگا
نی چاہتا ہے نے کوڑا لوں تجھ پہ وار

نواب احسن اللہ مرحوم ابھی بچے تھے۔ شادی کے قابل سن نہ تھا مگر ماں کے دل میں ارمان تھا کہ بیٹے کا سہرا دیکھیں، وہ چاند سی دلہن لائیں۔ اس وقت کے آنے میں ابھی دیر تھی، ارمان انتظار کی مشکل سے ایک اور راہ نکالی۔ کمسنی کے باوجود نواب زادے کی منگنی ہو چکی تھی۔ بیگم صاحبہ نے دیوالی کے موقع سے ایک پرمطرب آراستگی بیٹے کو دولہا بنایا اور اس کی بھی سنگیز کو دلہن۔ جشن عروسی کا پورا پورا اہتمام تھا۔ دعوت ہمالی رانج تھا سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح شادی کے وقت ہوتا ہے۔ خاندان کے شعرا نے دھوم دھام کی نظمیں لکھیں۔ اختر کی غزل سنیے:

ہم سو آؤ دوالی کا تماشا دیکھو
سنا ہو تو کبھی اور نہ دیکھا دیکھو
کیسے شادی میں ہیں مصروف بنالو تو نے توے
کیا نظر آتی ہے مرے دل کی تمنا دیکھو
نغمۂ شادی سے لبریز ہے ہر ایک ہال
دیکھو دولہا ہے بنا کیا مرا پیارا دیکھو
اس کے شرمانے پہ تم دل کو کرو اپنے نثار
بھولا بھالا ہے یہ کیا چاند سا مکھڑا دیکھو
جسم پر دو ری کیا خوب سلے ہے نوشا
نظر غور سے تم اس کا سراپا دیکھو
وہ بھی دن ہو وے خدا لائے دلہن کو گھر میں
آج اے دوستو شادی کا ہو ما دیکھو
کیا ہی ہے نام خدا دونوں کا جوڑا اچھا
ہے دلہن پیاری تو دولہا بھی ہے پیارا دیکھو

خواجہ عبدالرحیم صبا نے اس موقع پر جو غزل کہی تھی اس کا عنوان بیاض میں اس طرح تحریر ہے:

"چھوٹی خانم صاحبہ نے پیاری جان اور نواب احسن اللہ کو دیوالی کھلایا سو دولہا دلہن کو ایک ساتھ بیٹھا کر بت شادی کیا یہ دستور تان چڑھائی کی ہوئی بڑی دھوم دھام کی دعوت ہوئی۔ سب نے خوشی منایا"۔

از صبا:

عیش و عشرت آج حاطر خواہ ہے
دیکھو شادان ساری خلق اللہ ہے
تخت پر بیٹھا مرا نوشاہ ہے
درد لب ہر ایک کے بسم اللہ ہے
یہ سماں عشرت کا چھایا ہے یہاں
عیش میں ہر کوئی خاطر خواہ ہے
رہ کھلائی ہے دیوالی آج واہ
اور بنائی بیٹے کو نوشاہ ہے
خوش نما ایسی ہیں بن میں ہے دلہن
مہر کے پہلو میں گویا ماہ ہے
سب نے کوئی ہوتی کوئی سہ چوتا
ہر کسی کے لب پہ اب تو واہ ہے
دھوم ہے ہر سو مبارک باد کی
تہنیت گو ساری خلق اللہ ہے
کھیل مت سمجھو اسے یہ ہے شگون
رب خدا چاہے تو ہوتا بیاہ ہے
دوستو جانو نہیں یہ نیک فال
دفتر شادی کی بسم اللہ ہے

پھر جس وقت نواب ماشاء اللہ جوان ہوئے اور وہ وقت آیا کہ حقیقی سکیں تو ماں نے سونے کا حقہ بیٹے کو عنایت کیا نواب سر عبدالغنی نے اپنے سامنے بیٹے کو حقہ پلوایا۔ مبارک سلامت کا شور مچا۔ خواجہ عبدالعلی منصور نے پہلے اٹھ کر نذر دی۔ نواب عبدالغنی نے اسی دن انکی تنخواہ میں دو سو روپیہ ماہوار کا اضافہ کر دیا۔ دھوم دھام کی دعوت ہوئی۔ سارا خاندان مدعو تھا۔ اسرہ میں جو لوگ شاعر تھے انہوں نے تہنیتی اور دعائیہ غزلیں کہیں۔ صبا اور اختر سب سے پیش پیش تھے۔ صبا کی نظم ملاحظہ ہو:

بڑھے نواب کی شان و شوکت
کیا ماں حیا نی نے حقہ عنایت

یہ وہ حقہ ہے جس پر کھلائے ہے گل

ہمیشہ بھرو دمے اور داغ حسرت

مثا کو اس میں ہے ایسا معطر

خجل ہو جس کے آگے گل کی نکہت

صدا آتی یہی ہے آب نے سے

رہے دم پینے والے کا سلامت

پئے تسلیم گردن سرکشوں کی

تیرے آگے ہو خم نیچے کی صورت

دھواں سر سے اڑے دشمن کے تیرے

بندھے ایسی ہوائے جاہ و حشمت

رہیں بدخواہ تیرے پا بہ زنجیر

سدا کھینچا کریں لب آہ حسرت

نہ آوے بیں کبھی تیری جبیں پر

رہو اس طرح سے تم محو عشرت

تمہارے باپ ماں مانند سرپوش

رہیں سر پر سلامت تا قیامت

تیری ماں جانی اس سے اور سو چند

کریں شادی کی تیری روز دعوت

بحق چار یار احمد پاک ✦

بڑھے عمر و حیات و مال و دولت

ایک مرتبہ کھیدا ہوا۔ اس میں دو عظیم الجثہ ہاتھی پکڑے گئے۔ ایسا ہاتھی اس وقت کسی کے پاس نہ تھا۔ نواب صاحب کو بڑی خوشی ہوئی۔ اور اس خوشی میں ایک بزم طرب آراستہ کی گئی۔ دھوم دھام کا جلسہ ہوا۔ شعرا نے مبارک بادیں لکھیں اور پڑھ کر سنائیں ان نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں جسے کھنا ہاتھی کہتے ہیں اسے یہاں کی اصطلاح میں "گنڈا" کہتے تھے۔

صبا: تو گرفتار یہ دو گنڈے مبارک ہوں تجھے

بخت یاور ہے ترا اور ہے زور اقبال

دو کیا دو سو بندھیں ڈیوڑھی پہ تمہاری ہاتھی

ایسے ہی لاکھوں گرفتار ہوں گنڈے ہر سال

وہ بھی دن آئے جوان گینڈوں پہ ہو کے سوار

شیر مارا کرو تم سینکڑوں اور لاکھوں ہال

اختر:۔ صید گنڈوں کا مبارک ہو مرے سردار غنی

خوش رکھے تجھ کو سدا داور دادار غنی

ایک ادنیٰ سا کرشمہ ترے اقبال کا ہے

یہ جو گنڈے ہوئے ہیں آکے گرفتار غنی

ایک غزل کے عنوان میں لکھا ہے کہ نواب سر عبدالغنی نے شیخ ابراہیم کی معرفت بائیس ہزار روپے میں دو گھوڑے خریدے۔ ایک کا نام شہنشاہ تھا اور دوسرے کا نام جیم۔ ایسے نادر گھوڑے اس وقت تک بنگال میں نہیں آئے تھے۔ باپ بیٹے نے ان پر سواری کی ہوا خواہوں نے تہنیت پیش کی۔ شعرا نے اس تقریب پر نظمیں لکھیں۔ نمونہ دیکھئے:

اختر:۔ ہیں عیاں فتح و ظفر ہو اور مدد اللہ کی

اب سواری ہو مبارک تم کو شاہنشاہ کی

بوسہ پا۔۔ یہ۔ پاک جب کہ لیتی تھی رکاب

عرش سے اس دم صدا آتی تھی بسم اللہ کی

صبا:۔ تہنیت کا شور پہنچا چرخ کی اخرگاہ پر

باپ اور بیٹا چڑھے جب جیم و شاہنشاہ پر

زین تھا تخت سلیماں گھوڑے تھے رشک پری

چتر تھا بال ہما کا دونوں عالی جاہ پر

شیر کا شکار، مقدمات میں کامیابی اور نئے گاؤں کی خریداری ایسی تقریبات تھیں جو بار بار واقع ہوتی رہتی تھیں ہر مرتبہ خاندان کی دعوت اور راگ رنگ کے جلسے ہونے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی جلسہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک خاندان کے شعرا اس میں تہنیتی غزلیں پڑھ کر نہ سنائیں یا ان کی لکھی ہوئی مبارکبادیں گائی نہ جائیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کی مجلسی زندگی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شعر کو کتنا اہم مقام حاصل تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس قسم کی تفریحات کے سلسلے میں شعرا جو کہتے تھے وہ محض تفنن طبع کی خاطر کہتے تھے اور اس کا مقصد وقتی تفریح تھا۔ لہٰذا اس قسم کے کلام میں ادب کا بلند معیار تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ یہی حضرات جب اس ارادے سے طبع آزمائی کرتے تھے کہ کوئی ادبی تخلیق وجود میں آئے تو ان کی تخلیقات یقیناً ان تفریحی منظومات سے بدرجہا بلند ہوتی تھیں۔ بایں ہمہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض اوقات یہ سرسری طور پر لکھی ہوئی نظمیں اور غزلیں بھی حسن ادا، خوش آہنگی اور برجستگی کا ایک دلکش نمونہ ہوتی تھیں اور ان سے کہنے والے کی قادر الکلامی

کا پتہ چلتا ہے یہاں میں اس قسم کے صرف دو قطعے ہوئے پیش کروں گا۔
جس وقت نواب حسن اللہ ریاست کے متولی مقرر ہوئے اس وقت
اختر نے ایک قطعہ تہنیت تسبیہ کے انداز میں پیش کی تھی۔ اس کے چند شعر
یہ ہیں:

آئی عجب رنگ سے آج یہاں یہ بہار
غنچۂ خاطر ہوئے جس سے شگفتہ ہزار
دوستو سب کو عید آئی بہار امید
گھر میں ہوئی اپنے عید تازہ ہوا کاروبار
ہے غیرتِ گلشن رشکِ بہارِ چمن
رنگِ رخ دوستاں داغِ دہ لالہ زار
ساری مرادیں حصول سائلِ دلِ کن ملی
رحمتِ حق کا نزول خوب ہوا آشکار
سروری مالکِ جو شکر ہے نواب کو
شکر تو اس کا نہ ہو کہ جس سے ادا ہو نہار
سائل امید ہے راحت کا مدد ہے
ہمسو امید ہے اور تیاں میں صاف کیا

از مرزا دلی صاحب قمر بتقریب اجلاس:-

اے طبع رسا زمزمہ پرداز ثنا ہو
اے فکر سخن گوئی میں تو اور سوا ہو
ہاں شوق تہنیت لو اس بیت سے بیٹھ
بس اور نہ اب آئینہ پرواز حیا ہو
ہاں جوشِ طرب سازِ مسرت کو ذرا چھیڑ
ہاں بابِ مسرت پہ رخِ احباب دا ہو
ہاں ہمنفسو آئی بہارِ طرب دل کی
پھر محفلِ اجلاس میں سرگرم نوا ہو
پھر جوششِ دل حوصلہ مانگے ہے بیاں کو
اے شوقِ غزل خواں رہ بیانِ وفا ہو
ہے زیبِ وہ مسندِ عزت حرا اسرار دار
ہر لب پہ مبارک کی سلامت کی صدا ہو
زہرہ سے کہو ہاتھ میں لے دائرہ ہے
ہاں تہنیتِ جشن میں سرگرمِ نوا ہو

اقبال پکارے کہ یہ دربار غنی ہے
ہاں آؤ کہ چشم کرم و لطفِ خدا ہو
اب مانگو دعا خالقِ اکبر سے تم تم
کب تم سے ادا مرتبۂ وصفِ ثنا ہو
یارب مرا سردار رہے دہر میں قائم
جب تک کہ تنِ دل کو اک اک سا صبا ہو

غرض عشرت و نشاط کا یہ دور ایک زمانے تک اسی طرح چلتا رہا۔ آخر زمانے نے کروٹ لی۔ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ حالات رہے۔ عیش و طرب کی محفلیں خواب و خیال ہوگئیں۔ خوش باشی کی وہ صحبتیں افسانہ بن گئیں۔ وقت کا چکر اسی طرح چلتا رہا اور ہمیشہ اسی طرح چلتا رہے گا آج ہم دوسروں کا افسانہ سناتے ہیں۔ کل ہم خود افسانہ ہوں گے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

ڈھاکہ کی ادبی محفلیں بسلسلہ صفحہ ۳۰۸

ہیں کئی ادبی انجمنیں قائم ہوگئیں۔ جن کی بدولت شعر و سخن کا کچھ نہ کچھ چرچا ہوتا رہتا ہے خصوصاً دائرۂ ادب کے مشاعرے اکثر ہوتے ہیں مگر وہ بھی غیر طرحی۔ اس وقت ڈھاکہ میں شاعروں کی تعداد سو سے کم نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مجموعی طور پر اس وقت اچھا شعر کہنے والے جتنے ڈھاکہ میں موجود ہیں پاکستان و ہندوستان کے کسی ایک شہر میں موجود نہیں۔ حضرت وحشت کلکتوی، حضرت تمنا عمادی پھلواروی۔ حضرت کیفی چڑیاکوٹی۔ حضرت حیدر دہلوی بزرگوں میں اور پروفیسر اشک، مسٹر سلیم اللہ فہمی، مسٹر اقبال عظیم اقبال باہر سے آنے والوں میں اور خواجہ محمد عادل عادل ظہور الحق ظہور السبار کی تعالی اور خالد بنگالی کے شاگرد محمود احمد ساکن بولائی، جواں سال شاعروں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ دو شخص ایسے بھی ہیں جو کبھی کبھی شعر کہتے ہیں مگر شاعر نہیں۔ ایک حضرت فضلی اور ایک یہ خاکسار۔ اللہ بس اور باقی ہوس۔

احسن احمد اشک

الاوّل

بنگالی زبان وادب پر الاوّل کے اثرات گہرے اور دور رس ہیں۔ الاوّل دور متوسطین کا پہلا شاعر ہے جس نے بنگالی شاعری کو فلک کی پنہائیوں سے زمین پر اُتارا اور دیوی دیوتاؤں کی داستانوں کی جگہ عام انسانوں کے سکھ دکھ کے واقعات کو نظم کا جامہ پہنایا اس نے بنگالی شاعری کو نہ صرف نیا روپ نیا رنگ اور نیا آہنگ بخشا بلکہ اسے عوام کے مزاج اور ان کی پسند کے مطابق بنایا۔

متوسطین کے شاعروں میں الاوّل کا مقام بہت ہی اونچا ہے بیک وقت سنسکرت، ہندی، بنگالی، عربی اور فارسی زبانوں کا عالم تھا یہی وجہ ہے کہ اس کے ہمعصر شعرا علمیت میں اس کے مقابل نہیں ٹھہر سکتے۔ مختلف زبانوں کے علاوہ بہت علوم وفنون سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔ یوگ تصوف، جنسیات، موسیقی، سنگیت اور شہسواری پر استادانہ اور ماہرانہ عبور رکھتا تھا اس کی تصنیفات میں جگہ جگہ اس کے مشاہدات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔

فارسی زبان کے مشہور شاعر نظامی گنجوی کی مثنویاں سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے علاوہ اس نے یوسف گدا کی مثنوی "تحفہ" کو بنگالی شاعری کا جامہ پہنایا ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی سے بنگالی میں منتقل کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ قاضی دولت کی نامکمل منظوم کہانی "ستی مینا اور لور چندرانی" کو بھی الاوّل نے تکمیل تک پہنچایا اور پھر سیف الملوک بدیع الجمال بھی اسی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دور متوسطین میں ایسی کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی جس کا موازنہ الاوّل کے علمی یا اس کی تصنیف وتالیف سے کیا جاسکے۔

الاوّل نے ویشنب مت کا پرچار کرنے والے شاعروں کے رنگ کی چیزیں بھی لکھی ہیں۔ رادھا اور نندوسی کی نوک جھونک مشہور ہے الاوّل نے اسے بڑے دلکش اور شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے ——— رادھا پانی بھرنے کی غرض سے صبح تڑکے جمنا کے کنارے پہنچتی ہے۔ وہاں کرشن کنہیا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگتی ہیں اور شام ہوجاتی ہے، مانگ کا سیندور آنکھ کا کاجل سب اتر جاتا ہے، جسم پر جابجا ناخن کی خراشیں محبت کی بیش دستیوں کی گواہی دیتی ہیں گھر واپس لوٹتی ہے۔ نندوسی یہ حال دیکھ کر سب کچھ سمجھ جاتی ہے پھر بھی رادھا سے شام ڈھلے گھر لوٹنے کا سبب پوچھتی ہے رادھا کا شاطرانہ جواب، اس کی شوخی اور اس کا لہجہ الاوّل کی شاعرانہ عظمت کے آئینہ دار ہیں۔

نندوسی رادھا کو کن الفاظ میں خطاب کرتی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

"دنیا جہاں کا دل بہلانے والی گھر نشین ناری
صبح تڑکے پانی بھرنے گئی تھی
سر پہ رات آچکی تو گھر واپس آئی ہے
وقت کہاں پہ گنوا رہی تھی؟"

رادھا کا جواب بھی سُن لیجئے؟ —

"صبح ایک کھلے ہوئے کنول کو دیکھ کر
میرا دل للچا اٹھا میں اسے لینے کے لئے پانی میں کود پڑی
اس وقت ایک بھنورا بھی کنول کا رس چوسنے کے لئے اس پر ٹوٹ پڑا
کنول کے کانٹوں میں میرا کنگن الجھ کر پانی میں گر گیا۔
غوطے لگا لگا کر تمام دن کنگن تلاش کرتی رہی
مانگ کا سیندور آنکھ کا کاجل سب پانی میں بہہ گیا۔
اور کنول کے کانٹوں نے میرا تمام جسم لہولہان کردیا۔

الاوّل کے خلاف اگر کوئی بات کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ کہ ترجموں کے مقابلے میں اس کی تخلیقی شاعری کا سرمایہ بہت کم ہے مگر دور متوسطین کے بنگالی شاعروں میں کتنے ہیں جو اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں الاوّل مترجم

بہی مگر اس کے ترجموں پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ترجمے کہیں بھی پھیکے اور بے جان محسوس نہیں ہوتے اس مشکل کام کو اس نے اس خوبی سے انجام دیا ہے اس کے لیے یقیناً وہ تعریف کا مستحق ہے اس کے ترجموں میں تاثیر کے علاوہ خالص ادبی زبان کا استعمال پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ پدماوتی سے کچھ اقتباس سنئے خدا کی کتنی بھرپور تعریف کی ہے۔

تعریف اس خدا کی

سب سے پہلے میں اس خالق کی تعریف کرتا ہوں
جس کی بدولت یہ دنیا وجود میں آئی
جس نے کوہ گراں بنائے اور روشن آفتاب کو پیدا کیا
آگ ہوا پانی اور مٹی ــــــ یہ چاروں عناصر جس نے تخلیق کی
جس نے مختلف رنگوں سے موسموں کو سنوارا
مختلف جگہوں پر مختلف چیزیں پیدا کیں۔
جس نے یہ زمین اور سات طبق آسمان بنائے
جس نے چاند سورج دن اور رات پیدا کئے
جگمگاتے ہوئے تاروں سے نیلے آسمان کو سجایا
ٹھٹھرا دینے والی سردی اور جھلسا دینے والی گرمی پیدا کی
کالی گھٹاؤں میں چنچل بجلیاں بھردیں
جس نے سمندر بنائے
اور سمندر میں مچھلیاں اور صدف میں انمول موتی پیدا کئے
ریگستان اور جنگل بنائے درخت اور پودے اگائے
مختلف بیماریاں پیدا کیں
اور پھر ان کے علاج بھی پیدا کئے
جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اشرف المخلوقات بنایا
اس کے لئے غذا اور خوراک سامان بھی پیدا کیا
حکمراں بھیجے تاکہ دنیا میں امن قائم ہو
انسان کو مختلف اوصاف سے نوازا
کسی کو تونگر بنایا اور کسی کو محتاج
کسی کا دامن مسرتوں سے بھر دیا

ـ ـ ـ

کسی کو اپنی مہربانیوں سے نوازا اور کسی پر اپنا عتاب نازل کیا
کسی کو دانشمند بنایا اور کسی کو مفلس
کسی کو کمزور بنایا اور کسی کو طاقتور
اور پھر خوف ڈر کے لئے موت کو پیدا کیا۔
خوشبوئیں اور بدبوئیں پیدا کیں
تاکہ جنت اور جہنم کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے
مٹھاس کو رحم و کرم اور تلخی کو غیظ و غضب بتایا۔
پھولوں میں شہد پیدا کیا
اور پھر بھونروں کو ان پر فریفتہ کیا۔

وہ خشک و تر اور زمین و آسمان کا خالق ہے
اس کی دولت اور سخاوت کی کوئی انتہا نہیں
اس کے خزانے کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے
اور پھر بھی اس کا خزانہ خالی نہیں ہوتا۔
کمزور چیونٹی ہو یا طاقتور ہاتھی سب کو روزی پہنچاتا ہے
وہ کتنا رحم اور کرم کرنے والا ہے
خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے
اس نے دلوں میں امیدیں پیدا کیں تاکہ انسان زندہ رہے
وہ لوگوں کی امیدیں پوری کرتا ہے۔
لیکن اس کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں

وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو غبار بنا دیتا ہے
کمزور چیونٹی ہاتھی کے لئے موت بن جاتی ہے
وہ جو چاہتا ہے کرگزرتا ہے
وہ بناتا بھی ہے اور مٹاتا بھی ہے
وہ ایسا بھید ہے جو ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی
نیک انسان کو وہ ہر ذرے میں نظر آتا ہے۔
گنہگار اسے نہیں دیکھ سکتے
اس کے ہاتھ نہیں مگر وہ کام کئے جا رہا ہے۔

پاؤں نہیں مگر چل رہا ہے
کان نہیں مگر سب کچھ سن رہا ہے
آنکھیں نہیں مگر منزلیں طے کر رہا ہے
پنکھ نہیں مگر اُڑ رہا ہے
دل نہیں مگر جانتا سب کچھ ہے ــــ ماضی ہو یا مستقبل
بے جان اور جاندار ــــ سب کی رکھوالی کر رہا ہے
رنگ اور روپ میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا
اس کا کوئی خاص گھر نہیں وہ ہر جگہ ہر مقام پہ ہے

اس نے اپنے بندوں کو ہیرے جواہرات سے مالا مال کیا
کم عقل جن کی قیمت سے واقف نہیں
اس نے آنکھیں دیں تاکہ ہم اسے دیکھ سکیں
زبان دی تاکہ ہم اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں
اور چیزوں کا ذائقہ معلوم کر سکیں
سماعت دی تاکہ ہم سُن سکیں
ہر ایک کو کسی نہ کسی خوبی سے نوازا
لیکن کتنے ہیں جو اس کا احترام کرتے ہیں۔
غریب اور فاقہ کش ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔
جوانی کا لطف انسان پیری میں سمجھتا ہے۔
صحتمندی اور تندرستی کی برکتوں سے بیمار ہی واقف ہو سکتا ہے۔
مصیبت جھیلے بغیر آسائش کی قیمت معلوم نہیں ہو سکتی۔
یہ لامتناہی دُنیا، یہ زمین و آسمان یہ شجر و حجر، یہ پہاڑ اور تارے
ان سبھوں کی اسی نے تخلیق کی
کہاں تک اس کی تعریف بیان کی جائے
زندگی کی سانسیں اس کی تعریف کرنے سے قاصر ہیں
اس کی خوبیاں گننے بیٹھو تو صدیاں بیت جائیں
اور اس کی خوبیوں کا ایک حصہ بھی مکمل نہ ہو
پدماتی کا روپ ملاحظہ ہو۔
پدماتی کا روپ میں کیا بیان کروں پیارے

چہار دانگ عالم میں اسے کس سے مثال دوں
کستوری کی طرح مہکتے ہوئے اس کے پاؤں تک لمبے لمبے بال
جن کی سیاہی اور چمک کے آگے
بھونرا کوئل ناگن اور گھٹا ماند پڑ جائے
دُنیا کو موہنے والی لٹیں جن کی مختلف صفتیں ہیں
مگر دُنیا کو خاکستر بنانے کیلئے جن کا ایک بار ڈس لینا ہی کافی ہے
بال میں اڑسے ہوئے پھُول ــــ پروئے ہوئے موتی
برسات کے بادلوں میں جیسے چمکتے ہوئے تارے
سیدھی مانگ ــــ جیسے تیز کٹاری، جیسے کہکشاں
ابر میں جیسے خاموش چاند
گھنے جنگل میں جیسے پتلی پگڈنڈی
اور پھر سیاہی کے پہلو میں خون کی سُرخی
کسوٹی پر جیسے سونے کی لکیر
جمنا کے بیچ میں جیسے گنگا کی لہر
چاند سے مکھڑے پر بڑی بڑی آنکھیں
سورج کو دیکھ کر جیسے تاریکی کا سینہ پھٹ گیا ہو
اس خون آلود تلوار پر، اس پگڈنڈی پر
کون چل سکتا ہے
اگر کوئی ہمت سے کام بھی لے
تو زلفوں کے جال میں اس کا دل پھنس کر رہ جائے
چمکتی ہوئی پیشانی ــــ پرنیماسی کی چاندنی
قسمت کا گہوارہ ہے
میں اس پیشانی کو کس چیز سے تشبیہ دوں
چاند تو داغدار ہے مہاراج

الاول کی زندگی کے بہت سے واقعات ہمیں اس کی تصانیف میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ الاول کا باپ فتح آباد پرگنہ کے حکمران مجلس قطب کا وزیر تھا۔ الاول اپنے باپ کے ساتھ کشتی پر سفر کر رہا تھا، پرتگالی ڈاکوؤں نے کشتی پر حملہ کر دیا باپ ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا الاول بچ نکلا اور ارکان کے دربار میں حاضر ہوا وہاں اسے کوئی اچھی ملازمت نہیں ملی

مگر پھر بھی راجہ کے خاص شہسواروں کے دستے میں تقرر ہو گیا۔ ارکان کے باشندے اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ وہ امرا کے گھر جا جا کر ڈرامہ، موسیقی اور سنگیت کا درس دیا کرتا۔ اس نے اپنی بیشتر کتابیں زندگی کے اسی دور میں تصنیف کیں۔ اس کے دن مزے میں گزر رہے تھے۔ اسی زمانے میں شاہ شجاع کو بنگال سے بھاگ کر ارکان کے دربار میں پناہ لینی پڑی مگر بہت جلد ایک گھناؤنی سازش نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے الاول پر الزام دھرا اور وہ قید میں ڈال دیا گیا۔ سیف الملوک بدیع الجمال میں اس نے اپنی قید کی مدت پچاس دن بتائی ہے۔ قید سے رہا ہونے کے بعد اس کی زندگی کے دن پریشانیوں میں بسر ہوتے رہے۔ اس زمانہ میں سلسلہ قادریہ کے ایک بزرگ سید مسعود شاہ کے ہاتھ اس نے بیعت بھی کی۔ شاہ شجاع کے قتل کے نو سال بعد الاول نے سیف الملوک بدیع الجمال کو مکمل کیا۔ تقریباً گیارہ سال پریشانیاں جھیلنے کے بعد ارکان کے نئے راجہ کی بدولت اس کی قسمت ایک بار پھر چمک اٹھی۔

شاہ شجاع ۱۶۶۱ء میں ارکان پہنچا تھا۔ الاول کی تحریر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس واقعہ کے گیارہ سال بعد بھی وہ بقید حیات تھا۔ اپنی نظموں میں جگہ جگہ اس نے ضعیفی کی شکایتیں کی ہیں۔ سیف الملوک میں ایک جگہ کہتا ہے "بڑھاپے میں تصنیف و تالیف کا کام زیب نہیں دیتا۔" سکندر نامہ میں لکھتا ہے "پھر بھی ضعیفی کے باوجود لکھ رہا ہوں۔" اور ہفت پیکر میں کہتا ہے "میرا ذہن بیدار ہے اگرچہ قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔" ان تمام تحریروں سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اس نے طویل عمر پائی تھی۔

الاول کا باپ مجلس قطب کا وزیر تھا۔ بہارستان غیبی میں مجلس قطب کا ذکر ملتا ہے۔ بنگال کے صوبہ دار اسلام کے حکم پر حبیب اللہ خاں نے مجلس قطب کی ریاست فتح آباد پر دریائی راستے سے حملہ کیا۔ بھوشنا کا زمیندار ستر جیت اس حملے میں اس کے ساتھ تھا مگر اس کے باوجود مغل فوجیں فتح آباد پر قبضہ نہ کر سکیں۔ اسلام خاں نے حبیب اللہ اور اس کی معیت میں راجہ ستر جیت اور دیگر سپہ سالاروں کو ایک بڑی فوج کے ساتھ دوبارہ جلال پور کی سمت روانہ کیا۔ مجلس قطب نے بےبسی کے عالم میں اسلام خاں سے جان کی امان چاہی۔ اسلام خاں نے نہ صرف اس کی درخواست کو منظور کیا بلکہ جاگیر کے طور پر اس کی ریاست بھی واپس کر دی۔

SEBASTIAO GONSALVES TIBAN ارکان راج میں امیر البحر کے عہدے پر مامور تھا۔ الاول نے اس پرتگالی کا نام گنج لیش لکھا ہے۔ اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس کی وجہ سے اسے دربار میں کوئی اونچی جگہ نہیں مل سکی۔ گنج لیش نے بعد کو دربار سے بغاوت بھی کی تھی اور سندیپ پر قابض ہو بیٹھا تھا۔ الاول شاید ۱۶۱۰ء میں ارکان پہنچا تھا۔ گنج لیش اس وقت تک دربار سے منسلک تھا۔ اس لحاظ سے الاول کا سال پیدائش ۱۵۹۲ء اور وفات ۱۶۷۳ء ہے۔

الاول کی شاہکار تصنیف پدماوتی ہے۔ یہ دراصل ملک محمد جائسی کی ہندی پدماوت کا بنگالی زبان میں منظوم ترجمہ ہے۔ جائسی نے پدماوت ۱۵۴۰ء میں تصنیف کی تھی اور الاول نے اس کا ترجمہ ۵۲-۱۶۴۵ء میں کیا۔

خود الاول کی تحریر کے مطابق اس کی دوسری کتاب سیف الملوک بدیع الجمال ہے۔ ۱۶۵۸ء میں ماگن ٹھاکر کی ایما پر اس نے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا تھا مگر ماگن کی موت کی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکا۔ کتاب ایک مدت تک یونہی پڑی رہی۔ ۱۶۶۷ء میں سید موسیٰ نامی ایک ادیب دوست امیر کی سرپرستی میں اسے مکمل کیا۔ کتاب کا موضوع شہزادہ سیف الملوک اور پریوں کی شہزادی بدیع الجمال کی محبت ہے۔

الاول کی تیسری تصنیف "ستی میناء" اور "چندر رانی" ہے۔ شمالی ارکان کے راجہ شود دھرما کے عہدِ حکومت (۳۸-۱۶۲۲ء) میں دولت قاضی نامی ایک شاعر نے یہ منظوم کہانی لکھنی شروع کی تھی مگر موت نے اسے مکمل کرنے نہیں دیا۔ ماگن ٹھاکر کے بعد الاول سلیمان کے دربار سے منسلک ہو گیا تھا۔ اسی راجہ کی سرپرستی میں دولت قاضی کی تصنیف کو ۱۶۵۹ء میں تکمیل کا جامہ پہنایا۔ کتاب کا موضوع رانی میناوتی، راجہ لور اور راجکماری چندر رانی کی محبت ہے۔ الاول کی چوتھی کتاب ہفت پیکر فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی کا ترجمہ ہے۔ سن تصنیف غالباً ۱۶۶۰ء ہے۔ ہفت پیکر کی کہانی ایرانی شہنشاہ بہرام اور اس کی سات رانیوں سے متعلق ہے۔ الاول کی پانچویں تصنیف "تحفہ" ہے۔ یوسف گدا نے یہ کتاب ۱۳۹۳ء میں تصنیف کی تھی۔ الاول نے اس کا ترجمہ ۱۶۶۳ء میں شروع کیا تھا اور ۱۴ شعبان ۱۰۷۴ ہجری میں اسے مکمل کیا۔ کتاب مذہبی ہدایات، اخلاقیات اور پند و نصائح کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ الاول کی چھٹی کتاب سکندر نامہ ہے۔ یہ بھی نظامی گنجوی کی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ کتاب کا موضوع ایرانی شہنشاہ دارا اور سکندر اعظم کی جنگ ہے۔ ان تصنیفات کے علاوہ الاول نے کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔

احسن احمد اشک

مشرقی پاکستان کی عوامی کہاوتیں

کہاوتوں کا تعلق براہِ راست انسانی جذبات سے ہے محبت، نفرت، فراق، حسد، لالچ ۔ غرض انسانی فطرت کے جتنے بھی پہلو ہو سکتے ہیں ان سب پر کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں کہاوتیں موجود ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بھی عوامی کہاوتوں کا نہ جانے کب سے ایک سلسلہ جاری ہے۔ پروفیسر سوشل کمار نے "بنگلا پرواد" کے نام سے جو کتاب ترتیب دی ہے وہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں نو ہزار ایک سو سے زیادہ کہاوتیں درج ہیں۔ مگر اس پر بھی یہ کتاب بنگلا کہاوتوں کی کل کائنات نہیں۔ مشرقی پاکستان کے ساٹھ ہزار دیہاتوں میں بے شمار ایسی کہاوتیں لوگوں کی نوک زبان پر ہیں جنھیں اگر یکجا کیا جائے تو وہ ہزاروں صفحات اور متعدد جلدوں پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ بنگالی اکاڈیمی اور بنگالی زبان و ادب کے دیگر ماہرین اس طرف سے غافل بھی نہیں ہیں۔

مشرقی پاکستان حسن اور رومان کا گہوارہ ہے فطرت نے اس خطۂ زمین کو حسن اور رومان سے سنوارنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے دھان اور پٹ سن کے لہلہاتے ہوئے سرسبز اور شاداب کھیت، بے شمار پیچ و خم کھاتی ہوئی چھوٹی بڑی ندیاں اور ان کے سینوں پر تیرتی ہوئی نیلے، پیلے اور اودے بادبانوں کی کشتیاں، ناریل کے سڈول درختوں کی قطاروں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی صاف ستھری جھونپڑیاں سدا بہار جنگلات کی اور بانس کی گھنیری جھاڑیاں اور پھر ستم بالائے ستم بنگال کی جنوں انگیز برساتیں اور ان کی سرمستیاں دلوں کی دنیا میں جو بھی جادو جگائیں کم ہے۔

انسانی جذبات میں محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو عالم گیر ہے۔ لسان الغیب حافظ شیرازی کے دیوان کا پہلا مطلع اسی جذبے سے متعلق ہے اور اس مطلع کا دوسرا مصرع۔

که عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا۔

ضرب المثل بن کر آج بھی لوگوں کی زباں پر ہے

محبت سے متعلق بنگلا کہاوتوں کی ایک بہت بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں بھی موجود ہے ظاہر ہے کہ یہ تمام کی تمام کہاوتیں اچھی نہیں ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو سوقیانہ ہیں اور تہذیب کے دائرے سے گری ہوئی ہیں۔ مگر ان سب میں زندگی کی وہ بھرپور تصویر نظر آتی ہے، جو شہر کی آبادی سے دور گاؤں اور دیہاتوں میں رواں دواں ہے وہ حسن سادہ جو دیہات کی کھلی ہوئی خاموش فضا میں پروان چڑھتا ہے اور وہ محبت جو اس حسن کو دیکھ کر دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے کے بعد بے ساختہ زبانوں پر چلی آتی ہے۔ وہی درحقیقت کہاوتوں کا روپ دھار لیتی ہے۔

عام طور سے عورت حسن کا سرچشمہ مانی گئی ہے عورت کے ظاہری اور باطنی حسن پر ہی مرد کی محبت کا دار و مدار ہے۔ تمام عورتیں ایک جیسی صفتوں کی حامل نہیں ہوتیں، فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اسی موضوع پر بنگلا میں ایک کہاوت ہے۔

" ایشٹو کا لو شٹیما ناری بوٹ چھایا کے کوپ باری

دن دا، عورت نہ صرف اینٹ کی ایک مضبوط عمارت ہے بلکہ برگد کے سایہ میں ایک ٹھنڈا آنگن بھی ہے۔

کتنی معنویت اور کتنی گہرائیاں اس معمولی سی کہاوت میں پنہاں ہیں۔

انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے:-

love is blind. ———— محبت اندھی ہوتی ہے اسی حقیقت کی طرف اردو کے ایک شاعر نے بھی ایک اشارہ کیا ہے۔ شعر معیاری نہیں مگر پھر بھی مشہور ہے:- ؎

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کا اور ہی ڈھنگ ہے

بنگالی زبان میں بھی ایک کہاوت ہے:-

رانی پرتیبر پاگلا ناؤ
جس بھی ارڈا اڈگانے چولے
پریم کی باذلی ناؤ خشکی پر بھی چلتی ہے۔

فارسی کا مشہور شعر ہے:-

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

محبت میں محبوب کی ہر ادا، ہر انداز اور ہر بات بھلی لگتی ہے اسی بھلا لگنے کا نام ہی تو محبت ہے ایک کہاوت ہے:-

جا شونگے بھاب ۔ تار موکھ دیکھیلے والا بھو

جس سے محبت ہوتی ہے اسکی صورت دیکھنے ہی میں فائدہ ہے۔

اسی طرح ایک اور کہاوت ہے:-

جار شونگے جیسے مون سے تی آمار آپون جون
جار شونگے جار جیسے مون کی باہاڈی کی بات دم

جس کے من سے من مل جائے وہی درحقیقت اپنی ہے خواہ وہ ڈومنی ہو یا مہترانی۔

محبوب کی بے وفائی کا گلہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری اور ادب میں موجود ہے۔ بنگلہ زبان میں بھی ایک کہاوت ہے:-

جے تامے پریم سیکھالے
تا سے توہی کھوب دکھالے

کہاوت کے انداز بیان میں جو بانکپن ہے وہ ترجمہ میں ممکن نہیں پھر بھی ملاحظہ ہو:-

"جس نے تمہیں محبت سکھائی تم نے اسے کیا خوب بدلہ دیا"

عورت عام طور پر گھر کی لکشمی سمجھی جاتی ہے۔ وہی درحقیقت گھر کی رونق ہوتی ہے۔ وہ اگر وفادار ہے تو گھر رشک جنت ہے اور اگر بے وفا ہے تو دوزخ سے بھی بدتر ہے۔

اسی موضوع پر ایک کہاوت ہے۔

راجا پاپے راج نوشٹو لکھی پالائے دورے
استری رودشے شامیر کوشٹو بھاتنے نی گھورے

"راجہ اگر پاپی ہے تو ملک سے امن و عافیت کا رخصت ہونا لازمی ہے عورت کی بدچلنی شوہر کی عافیت کے حق میں زہر ہے اور گھر میں چولہے کا ٹھنڈا رہنا یقینی ہے۔

اسی موضوع پر ایک کہاوت سنیے:-

بیاز دھوم، نوشٹو ناری — تھو کھے آنے اشرو باری
پیاز دھواں اور بری عورت — آنکھوں کو اشکبار کر دیتی ہے

کس عورت سے محبت کرنی چاہیے اور کس سے پرہیز اس موضوع پر مشرقی پاکستان میں بہت سی کہاوتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب تجربات کی روشنی میں کہی گئی ہیں۔ ایک مشہور کہاوت ہے

"دکھٹ مٹائے ہاٹے ناری کوٹ موٹائے جائے
ماشک دھا نیر بھیتور تار سینیتر سیندور جائے

تیز نظروں سے گھورنے والی اور بے باکانہ انداز سے چلنے والی عموماً خطرناک ہوتی ہے۔

مصلحت اسی میں ہے کہ ایسی عورت سے محبت کی پینگ نہ بڑھائی جائے۔

مرد کے لئے عورت ایک "گم شدہ لال" ہے۔ بنگالی میں اسی موضوع پر ایک کہاوت ہے۔

"دکھو جی کھو جی ناری جے نئے تاری"

ہر مرد اس گم شدہ لال کی تلاش میں ہے جو اسے ڈھونڈ نکالے وہی اس کا مالک ہے

عورت کے دل میں جگہ پانا کوئی آسان کام نہیں ہے عورت کے دل کو جیتنے کے لئے مرد زندگی بھر کوشاں رہتا ہے عورت کا حسن

زمانہ قدیم میں بڑی بڑی سلطنتوں کی تباہی و بربادی کا باعث رہ چکا ہے ــــ قلو پطرہ، ہیلن اور سیتا کی وجہ سے انسانی خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں مگر بڑے بڑے جابر حکمراں دنیا جن کے نام سے لرزاں براندام تھی۔ اکثر حسن کی سرکار میں نگاہِ ناز کی بھیک مانگتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ انٹونیو، قلو پطرہ کے خد و خال پر فریفتہ تھا۔ رام، سیتا کے حسنِ معصوم کا پجاری تھا اور جہانگیر نورجہاں کی حاضر جوابی اور ذوقِ سلیم پر جان چھڑکتا تھا۔ غرض ان میں سے ہر ایک کا مقصدِ حیات عورت کے دل کو جیتنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

داشی کیوت لیکھے دی کے پوڑے جو دی پائے
تو بود نا سیرسون پورو سنے کی پائے،

عورت کے دل کو جیتنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے عورت کی نفسیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ مرد کی محبت کے صرف تصور ہی سے آخر عورت کا دل سینے میں کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ محبت کی ایک بھرپور نظر آخر اسے سہما کیوں دیتی ہے۔ اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔ ایک کہاوت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

پورد شیر بھالو بھاشا۔ سلا دمرگی پوٹ شلا کی مرغی پالنا اور مرد کی محبت دونوں برابر ہے۔

سماج اور سماجی زندگی کی فلاح و بہبود کا انحصار افراد پر ہے۔ سماج اور افراد دونوں پر الگ الگ ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ سماج کا ہر فرد اگر ایک دوسرے کا خیال نہ کرے تو سماجی نظام میں ابتری کا پھیلنا لازمی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محبت محبت کی طلب گار ہوتی ہے شوہر بیوی پر جان چھڑکتا ہے۔ بیوی کی ہر چیز اسے پسند ہے۔ مگر اس گرانی کے زمانہ میں اگر وہ اپنے بچوں کی فوج سمیت سسرال پر حملہ بول دے اور مہینوں وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لے تو سسرال والوں پر جو قیامت گذرے وہ آپ سمجھ ہی سکتے ہیں۔ یہ تو خیر اس دور کی بات ہوئی مگر اس دور سے بہت پہلے جب زندگی واقعی آسان تھی،

اس وقت بھی اہلِ دانش کی نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی۔ ایک مشہور کہاوت ہے شوشور باڑی سودھور ہانڈی ... تین دن پورے جھانٹار باری سسرال شہد کی ہانڈی ہے، مگر چند دنوں کے بعد داماد کی قسمت میں جھاڑو کے سوا کچھ نہیں۔ عورت اور مرد کا رشتہ نازک ہوتا ہے۔ اور جب محبت درمیان ہوتی ہے تو یہ اور بھی نازک تر ہو جاتا ہے۔ ایک کہاوت ہے۔

آگون نیر کاچھے گی　　　پورو شیر کاچھے استری
آگ کے پاس گھی اور مرد کے پاس عورت

اس قسم کی ایک اور کہاوت

عقلے شوکول بوندی	جالے بوندی ماچھ
استری کاچھے پورونش بدی	جالے بوند گا چھ
سب عقل کے زندانی ہیں	مچھلیاں جال میں گرفتار ہیں
عورت مرد کو قید کئے ہے	بیل درختوں سے لپٹی ہوئی ہے

پروفیسر عطاء الرب صدیقی

مشرقی پاکستان پکارے

مشرقی پاکستان کو قدرت نے تمام قدرتی نعمتوں سے نوازا ہے
یہاں اگر ٹھنڈے بڑے دریا ہلورے لیتے ہیں۔ وہیں پاٹ، دھان اور
چائے کے پودے فضاؤں میں جھومتے ہیں۔ آم کے جھرمٹ بانس
کی جھنڈیاں، تاڑ اور ناریل کے خوشنما درخت اپنی بہار دکھاتے ہیں مختلف
قسم کے کیلے ناپائی ہوئی نظر ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دو بڑی جان بخش
ندیاں — پدما اور برہمپتر مشرقی پاکستان کے عریض و وسیع علاقوں
کو سیراب اور سرسبز و شاداب کرتی گزرتی ہیں۔ چونکہ یہ ندیاں کوہ
ہمالیہ سے نکلتی ہیں اس لئے گرمی میں بھی خشک نہیں ہوتیں۔ بلکہ
تمام سال موجزن رہتی ہیں

آئیے۔ آپ کو مشرقی پاکستان کی سیر کرائیں۔ زمانہ راکٹ
سے جلدی کیجئے اس سیر میں آپ میر کے اس شعر پر کاربند ہوتے
چلئے ؏

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

آغاز سفر ڈھاکہ سے کیجئے۔ جو گوناگوں قدرتی مناظر سے
بھرپور ہے۔ ڈھاکہ ۱۶۰۸ء میں آباد ہوا۔ مغل صوبیدار اسلام خان
کو اس کے آباد کرنے اور بنانے کا فخر حاصل ہے۔ دریائے بوڑھی گنگا
پر بڑے آن بان سے ڈٹا ہوا ہے۔ چونکہ یہ شہر جہانگیر کے وقت
میں آباد ہوا تھا اس لئے اسلام خان نے شہنشاہ وقت کے خوش
کرنے کے لئے اس کا نام جہانگیر نگر رکھا۔ ململ ریشم اور سوتی
چیزوں کی وجہ سے اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی
تھی اس کی ململ یورپی ممالک میں بہت مقبول تھی۔ اور اس کی
مانگ بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ پریوں نے
ہوائی تار سے اسے بُنا ہے۔ قلب شہر میں سولہویں صدی کی

عمارتیں ہوئی ہیں۔ لال باغ کی عمارتیں اور دوسری یادگاریں قابل
ذکر ہیں ایک سیاح ان عمارتوں کا دو تاثر لے سکتا ہے۔ اوّل
اس کی شکستہ عمارت سے دنیا کی بے ثباتی کا منظر آنکھوں کے
سامنے پھر جاتا ہے۔ دوسرے گذشتہ دور کے فن معماری کے
نادر نمونوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ابھی تک مغل زمانے کے باقیات
صالحات ٹوٹے پھوٹے شکل میں زندہ ہیں۔ عہد مغلیہ کے بہت سے
نادر نمونے گردش ایام سے نابود ہو چکے ہیں مگر جو کچھ باقی رہ گئے
ہیں ان سے اس زمانے کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے ؏

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ہم تصور کی آنکھوں سے اس زمانہ کی ایک ہلکی سی جھلک
دیکھ سکتے ہیں

یارب یہ کسی مشعل کشتہ کا دھواں ہے ٭ یا گلشن بربادکی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے ٭ یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دور گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے ٭ بانئ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

پرانا شہر چوک ہے۔ اب بھی یہ تھوک فروشی کی منڈی ہے
پرانے مساجد اور درگاہ بہت کثرت سے اس شہر میں پھیلے ہوئے ہیں
خاص شہر سے دو میل دور دریائے بوڑھی گنگا کے کنارے ست گنبد
مسجد ہے۔ جو شائستہ خان کے وقت میں تعمیر ہوئی تھی۔ اپنے وقت
کے فن تعمیر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس مسجد کے دیکھنے سے اس
کے جلال کا سکہ دل پر بیٹھتا ہے۔ نواب کے محل اور باغات دلچسپی
اور دلکشی کا باعث ہیں۔

پرانا شہر سیاحوں کو مختلف و متنوع مناظر پیش کرتا ہے
تاریخی اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے

کو ہے۔

نئی عمارتوں میں آدم جی کورٹ D.I.T کی عمارت. یونیورسٹی۔ ہائی کورٹ قصرِ گورنر اور نیو مارکٹ وغیرہ شامل ہیں۔

نرائن گنج دریائے سیتا لکھیا کے کنارے بسا ہوا ہے اس کی آبادی ستر ہزار کے قریب ہے۔ ڈھاکہ سے ریلوے لائن اور سڑک دونوں سے منسلک ہے۔ آزادی کے بعد نرائن گنج ایک بڑا صنعتی مرکز بن گیا ہے۔ سیتا لکھیا کے دونوں کناروں پر جوٹ اور کپڑے کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں۔ آدم جی جوٹ ملز جو ایشیا کا سب سے بڑا جوٹ مل ہے یہیں ہے۔ بابو رہاٹ جسے بنگال کا مانچسٹر کہا جاتا ہے یہاں سے بہت قریب ہے۔

سونار گاؤں۔ نرائن گنج کے شمال مشرقی سرے پر تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے یہ پال خاندان کا پایہ تخت سنہ ۱۲۹۶ء کا پایہ تخت تھا۔ شہر کا دروازہ ابتک دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی عمارتوں سے اس زمانہ کی اعلیٰ دستکاری اور فن معماری کا پتہ چلتا ہے۔ پتھر پر کندہ کاری کے اعلیٰ نمونے یہاں ملتے ہیں۔

جے پور، راجندر پور اور سری پور کا ایک چکر آپ کی واقفیت میں اضافہ کرے گا۔ سیاحوں کی ضرورت کی تمام اشیا مہیا ہیں۔ اور وہ یہاں جنگل کی خوبصورت عمارت میں بہ آسانی اور بہ فراغت کئی ایک دن گزار سکتے ہیں مقام کی فرحت انگیزی دامن دل کو کھینچتی ہے۔

سلہٹ: اگر آپ چمک دمک کے دلدادہ نہیں ہیں اور سادگیٔ حسن کے شیدائی ہیں تو سلہٹ نہ جا کر آپ گھاٹے میں رہیں گے۔ یہ مشرقی پاکستان کے مشرق ترین حصہ پر واقع ہے (سطح سمندر سے ۵۵ فیٹ بلند ہے) حضرت شاہ جلالؒ کا مزار قابل دید ہے۔ حضرت شاہ جلال یمنیؒ سنہ ۱۳۰۳ء کے قریب یہاں تشریف لائے۔ سری ہاٹ کے راجہ گر گوبند کو شکست دے کر یہیں بس گئے۔ اور تبلیغ اسلام میں اپنی تمام زندگی گزار دی۔ درگاہ اب بھی مرجع خلائق ہے۔ سلہٹ پاکستان کا چائے پیدا کرنے والا علاقہ ہے۔ حسین چائے کے باغات دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ چائے کے باغات کا ایک علیحدہ ہی حسن ہے۔ چائے کی پتیاں توڑنے والیاں بڑی چابکدستی سے پتیاں توڑتی نظر آتی ہیں۔

مینامتی: سلہٹ کے بعد آپ مینامتی تشریف لائیں۔ مینامتی کی کھدائی سے ان خاندانوں کا پتہ چلتا ہے۔ جنہوں نے اس سرزمین پر حکومت کی اور امتدادِ زمانہ سے ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ کومیلا ریلوے اسٹیشن کے بہت ہی قریب ہے۔ مشہور راجہ مانک چند نے اپنی محبوب رانی کے نام پر اس شہر کا نام رکھا تھا۔ کچھ استوپ دریافت ہوئے ہیں۔ صرف استوپ ہی نہیں بلکہ پوری بودھی تہذیب کا کھوج ملتا ہے۔ مناظرِ قدرت کی رنگا رنگی بھی آپ کو یہاں ملیگی۔

چاٹگام اور پہاڑی چاٹگام حقیقت میں "ارم سیاحان" ہے خواہ کتنا ہی کم وقت کسی سیاح کی دسترس میں کیوں نہ ہو اسے دیکھے بغیر اس کی سیاحی مشرقی پاکستان کی عبث رہے گی۔ جن جن چیزوں کی اس کی آنکھیں متلاشی ہوں وہ تمام کی تمام چیزیں یہاں ملیں گی۔ اگر وہ شکاری ہے یا علم الحیوانات سے دلچسپی رکھتا ہے تو فٹک چاری رام گڑھ، میں مکھ، گبھائے چاری اور رنگامٹی کے جنگل اسے مایوس نہ کریں گے۔ اور وہ اپنی دلچسپی کا سامان ان جنگلات میں ضرور پالیگا اگر وہ کھوجی ہے تو اپنا سامان شغف سیتا کنڈ، ستھ ہزاری، دو ہزاری بند راہن اور دوسرے ساحلی علاقے میں پالے گا۔ اگر وہ علم النسانیات کا رسیا ہے تو اسے اپنے مواد کا افراط چاروں طرف بکھرا نظر آئے گا خصوصاً پہاڑی قبیلوں کے اندر اسے اپنی دلچسپی کا سامان بفراہم نظر آئے گا۔

چاٹگام: چاٹگام کا دوسرا نام اسلام آباد بھی ہے مغل صوبیدار اسلام خاں کے نام پر اس کا نام رکھا گیا تھا۔ یہ دریائے کرنافلی کے کنارے پر آباد ہے۔ یہاں دلچسپی کے مقامات شائستہ خان کی بنائی ہوئی شاہی جامع مسجد ہے (سنہ ۱۶۶۷ء) حضرت بایزید بسطامیؒ کا چلہ، حضرت بدرالدین علامہ اور حاجی امانت شاہ کی درگاہ اور قدم مبارک مسجد ہے۔ چاٹگام مشرقی پاکستان کا نظر فریب مقام ہے یہاں آپ کو دلکش دریائی مناظر، سمندر، پہاڑیاں، سطح مرتفع اور استوائی پیڑ پودے ملیں گے۔ یہاں کے دیہی علاقے سدا بہار ہیں۔ پتنگا کے ساحلی علاقہ کا سفر زندگی کا ایک یادگار سفر ہو سکتا ہے۔ پکنک منانے والوں کا یہ ایک خاص مقام ہے۔ پکنک یا سیر سپاٹے کے لئے آپ سیتا کنڈ تک جا سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رام اور سیتا کا بن باسی کے دوران اسی مقام سے گزر ہوا تھا۔ اس جگہ کا نام اس گرم جھرنے کے نام پر پڑا ہے جس میں سیتا نے غسل کیا تھا۔

کاکس بازار: چاٹگام سے [illegible] میل دور کاکس بازار ہے

جسے مشرقی پاکستان کا صحت مند ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔ کام سے تھکن مٹانے اور چین اور اطمینان سے زندگی کی چند گھڑیاں گزارنے کے لئے اس سے بہتر مقام نہیں۔ اس کے لشا ندار ساحلی علاقے ذہن و دل کو کھینچتے ہیں اس کے دلکش ساحلی علاقے میں زندگی کے چند لمحے گزارنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ ایک شخص کھاٹے میں نہیں رہتا۔ اسے اس مقام پر چند لمحے گزارنے کا افسوس ہوتا ہے نہ روپے پیسے کے ضیاع کا ماتم بلکہ وہ سمجھتا ہے اسے پیسوں کی قیمت پائی پائی کر کے وصول ہو گئی۔ ارد گرد کی صاف و پر سکون فضائیں دلکش نظارے، غروب آفتاب کا شاندار سماں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب موجوں پر رقص کناں ہے ——— ایسے مناظر ہیں کہ انسان بھلائے نہیں بھولتا۔ کاکس بازار چاٹگام سے بذریعہ ہوائی جہاز سڑک اور سمندر منسلک ہے۔ حال ہی میں مشرقی پاکستان کی حکومت نے سیاحوں کے لئے ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس تعمیر کیا ہے۔ دلچسپی کے نزدیکی مقامات ہم چاری، رامو، دولا ہزاری اور جزیرہ سینٹ مارٹن وغیرہ ہیں۔

چندر گھونا۔ چاٹگام سے کچھ ہی فاصلے پر دریائے کرنافلی کے کنارے چندر گھونا آباد ہے۔ یہ ایشیا کا سب سے بڑا کاغذ کا مل ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہ بارہ ملین ڈالر کے صرفہ سے قائم ہوا ہے۔ بانس اور دوسری لکڑیاں جو یہاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں اور خام اشیاء کا کام دیتی ہیں۔

کپتائی۔ چاٹگام سے چھتیس میل دور ہے۔ یہ بھی کرنافلی ندی پر آباد ہے۔ پہلے غیر آباد علاقہ اس لحاظ سے قدرے چکا تعمیدی کے اکا دکا مکان ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے مگر اب یہاں پانی ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ قائم ہو گیا۔ یہ عظیم الشان پروجیکٹ آزادی کا تحفہ ہے اور اس بات کا مظہر ہے کہ ملک نے آزادی کے بعد کتنی ترقی کی ہے۔ اور کس تیزی سے بڑھا ہے اس عظیم کثیر المقاصد منصوبے پر اکیاون کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اس پر اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کام شروع ہوا اور ۱۹۶۲ء میں کام ختم ہو گیا ۲۶ مارچ ۱۹۶۲ء کو صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے بٹن دبا کر بجلی گھر کے چرخاب چلائے اور صوبے کے لوگوں کے لئے ترقی کا دروازہ کھول دیا۔ دریا پر پل گودی سے ۸۴ فیٹ اونچا ہے

مربع میل کی ایک جھیل بناتا ہے۔ جس کی گہرائی ساٹھ فیٹ ہے۔ یہ اسی ہزار کلو واٹ بجلی تیار کرے گا۔ جو کثیر المقاصد منصوبوں پر خرچ ہوگی۔

پہاڑی چاٹگام :- پہاڑی چاٹگام سیاحوں کے لئے نئی نئی دلچسپیوں کا سامان فراہم کرتا ہے۔ رنگامٹی حسین و جمیل جنگلی پھولوں سے بھر میدان کے درمیان اور پہاڑیوں کے قلب میں واقع ہے۔ یہ دلربا مقام کرنافلی پر چاٹگام سے ۲۵ میل دور ہے۔ ندی اور سڑک دونوں ذریعوں سے یہاں آیا جا سکتا ہے۔ سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے سرکٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ پہاڑی چاٹگام قدرتی مناظر سے بھرپور ہے۔ یہاں کے قبائلی جنگلی جانوروں کے درمیان اونچے مچانوں پر رہتے ہیں جو بانسوں سے بنائے جاتے ہیں۔ جاڑوں میں جنگلوں سے ہاتھی پکڑے جاتے ہیں۔ ہاتھی پکڑنے کے طریقے کو "کھیدا" کہا جاتا ہے۔ کھیدا دیکھا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے پہلے سے انتظام کرنا پڑتا ہے۔ دور کے علاقوں میں موبنی اور کاسالونگ خوبصورت مقامات ہیں جنگل کے ریسٹ ہاؤس ہر پندرہ بیس میل پر بنے ہوئے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت بسیں اور موٹر نہیں بلکہ خچر ہیں۔ سیاح عموماً پیدل ہی چلتے ہیں۔ یہاں کے لوگ سادہ اور ملنسار ہیں انہیں بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ یا کمہاری سامان تجارت نزدیک کی منڈی میں لے جاتے دیکھا جاتا ہے شہروں کی طرح ؎

ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد

کا کیفیت یہاں کے لوگوں پر سوار نہیں ہے بلکہ زندگی آہستہ محو خرام ہے ہر کام آہستگی سے ہوتا ہے جلد بازی کا نام نہیں ہنسنے اور بولنے کا کافی وقت ہے۔ آپ ہر ہر مقام پر حسن سے دوچار ہوں گے۔ مرغان صحرا جنگلوں کو اپنی خوش الحانی سے رشک ارم بنائے ہوئے رکھتے ہیں۔ "کھیدا" دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ یہ پہاڑیاں نہ صرف شہری ہنگاموں کی جائے پناہ ہے۔ جہاں ہم اپنے دکھ درد کو بھول جاتے ہیں، بلکہ شکاریوں کی بھی جنت ہے۔ اب واپس ڈھاکہ آئیے اور شمالی اضلاع اور سندربن کے لئے رخت سفر باندھئے۔

میمن سنگھ۔ جنہیں دور گذشتہ کی سطوت سے دلچسپی ہے میمن سنگھ میں قیام کر سکتے ہیں۔ راجاؤں کے محل اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میمن سنگھ سے نزدیک ہی ایک مقام موضع پور گڑھ ہے۔

سیاحوں اور افسروں کے لئے جنگلوں میں ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے مدھوپور اور مہمن سنگھ کے درمیان اکیس میل لمبی رواں اور صاف شفاف سڑک ہے۔ سڑک بل کھاتی ہوئی جنگلوں اور رنگا رنگ خوبصورت پھولوں کے درمیان سے آہستہ خرام گزرتی ہے۔ راستہ بھر خوش الحان مرغ کی الاپ آپ کا انتظار کرے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرستان سے گزر رہے ہیں۔ اب کسی پری سے دوچار ہوئے کہ اب۔ کسی بھی لمحہ پری سے آپ کی مڈھ بھیڑ ہو سکتی ہے

راج شاہی :۔ راجشاہی میں آپ کو زیادہ دیر تک ٹھہرنا نہیں ہوگا یہاں وریندرا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا عجائب خانہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے شمالی اضلاع کے نوادرات یہاں جمع کرکے رکھے گئے ہیں عجائب خانہ سے لگا ہوا ایک ریسٹ ہاؤس بنایا گیا ہے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے یونیورسٹی جاکر دیکھ سکتے ہیں

پہاڑپور :۔ پہاڑپور جمال گنج ریلوے اسٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے ساتویں تا بارھویں صدی عیسوی میں کافی ترقی کی تھی پال خاندان کے عہد میں اس جگہ کو بہت شہرت حاصل تھی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی رہنمائی میں جو کھدائی ہوئی ہے اس کے نتیجہ میں بہت سے قیمتی اور دلچسپ باقیات پائے گئے ہیں۔ سیاحوں اور آثار قدیمہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے ایک ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے

مہاستھان گڑھ :۔ بوگرا کے شمال میں اینک کی دریافت کے مطابق بنگال کا سب سے پرانا دارالسلطنت ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے چند نادر چیزیں یہاں دریافت کی ہیں۔ مہاستھان کے ساتھ پندرا پردھان یا پندرانگر کا گھرانا ہے جو تیسری صدی قبل مسیح ایک خوش حال علاقہ تھا۔

شیرپور :۔ شیرپور ہندوستان کے مشہور بادشاہ شیرشاہ کے نام پر آباد ہے۔ اس کی بھی کم اہمیت نہیں بوگرا سے ۱۶ میل جنوب میں ہے۔ ۱۵۹۵ء میں راجہ مان سنگھ نے ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کا نام اکبر کے فرزند ارجمند شہزادہ سلیم کے نام پر سلیم نگر رکھا گیا ہے اس جگہ کو شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ شیرپور کے ویرانے میں پرانے مزار درگاہ مسجدیں اور مسلم دور کے بہت سے تاریخی یادگاریں مدفون ہیں۔ خارن، بندیگی اور ہرن مسجدیں شیرپور کی باقیات

صالحات میں سے ہیں اس مقام کا نام اس مسجد کے نام پر ہے

ست گمبج۔ ست گمبج سڑک سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ست گمبج کھلنا باگرہاٹ ریلوے لائن پر ہے اس مقام کا نام اس مسجد کے نام پر ہے۔ اس مسجد کو حضرت خان جہان نے پندرھویں صدی عیسوی میں بنوایا تھا۔ ست گمبج کے معنی ہیں ساٹھ گنبد کے مگر اس بڑی مسجد میں چھپتر گنبد ہیں۔ جنہیں ساٹھ ستون سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ لمبائی میں یہ ایک سو ساٹھ فیٹ چوڑائی میں ایک سو چالیس فیٹ اور اونچائی میں بائیس فیٹ ہے۔

کھلنا :۔ اب کھلنا تشریف لائیے۔ کھلنا مشرقی پاکستان نہیں بلکہ پاکستان کا ایک اہم بندرگاہ ہے۔ ایشیا کا سب سے بڑا ڈاکیارڈ کھلنا ہی میں۔ کھلنا میں نیوز پرنٹ کا کارخانہ بھی قائم کیا گیا ہے جس سے پاکستان کا کافی زرمبادلہ بچ جاتا ہے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد یہاں سے غیر ممالک کو نیوز پرنٹ برآمد کیا جاتا ہے۔ پہاڑی چاٹگام کے بعد کھلنا مشرقی پاکستان کا دوسرا جنگلاتی علاقہ ہے۔

سندربن :۔ سندربن کے تعارف کی احتیاج نہیں۔ اپنی فطری دلکشی اور دلفریبی کے علاوہ رائل بنگال ٹائیگر کے لئے یہ علاقہ یوروپی ممالک تک میں مشہور ہے۔ سندربن دو بنگال الفاظ کا مرکب ہے۔ سندر اور بن۔ سندر کے معنی ہیں خوبصورت اور بن کے معنی ہیں جنگل۔ چونکہ یہ علاقہ دریائے گنگا کے ڈیلٹا میں پڑتا ہے اس لئے اس کا منظر حسن سوئٹزرلینڈ کے جھیل والے علاقے سے مشابہ ہے شکاریوں، سیاحوں، شاعروں اور فوٹوگرافروں کے لئے یہ مقام جنت ہے۔ یہ جگہ فخر مشرقی پاکستان ہے۔ ساحل سمندر پر قدرتی حسن کے درمیان غسل کرنا ایسا منظر ہے جسے ایک آدمی اپنی زندگی میں تو بھول ہی نہیں سکتا۔ یہاں کا چیتا حقیقی معنوں میں رائل اور شاندار ہے یہ اس کی جائے رہائش اور اس کا مسکن ہے۔ چیتکبرے ہرن جو نیل کمل اور کٹکا علاقے میں پائے جاتے ہیں ان کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی جنگلی ہرنوں کا شکار بھی ایک خاص اہتزاز بخشتا ہے۔ ماہی گیری خواہ جال سے ہو یا بنسی سے یہاں کی بڑی انڈسٹری ہے۔

آپ کھلنا سے جیسور جاکر بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ کو

واپس ہو سکتے ہیں۔ یا دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ دوسرا راستہ اسٹیمر کا ہے۔ باریسال چاندپور اور نرائن گنج ہوتے ہوئے باریسال بھی اپنا ایک حسن رکھتا ہے۔ اسے ایک جزیرہ کہہ سکتے ہیں مشرقی پاکستان میں یہی ایک ضلع ہے جہاں ابتک کوئی ریلوے لائن نہیں بچھائی گئی ہے حکومت کے پیش نظر ایک اسکیم ہے جس کی رو سے فریدپور اور باریسال کو بذریعہ ریل ملایا جائے گا باریسال اپنے ناریل اور سپاری کے باغوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے اسے مشرقی پاکستان کا وینس کہتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صرف بتلائی ہوئی جگہ کو دیکھنا ذہنی طور پر اذیت بخش ہے۔ اپنے دل سے جہاں جا لگے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے پہلی بار آپ ٹورسٹ گائیڈ کا سہارا لیں دوسری دفعہ آپ بخود ان جگہوں کو دیکھیں جن کا تذکرہ گائیڈ میں نہیں ہے

مندرجہ بالا راستے کا نقشہ ریلوے لائن کے سلسلے کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ بس اور موٹر لانچ کے راستے آہستہ آہستہ ترقی کر رہے ہیں پرانی بسوں اور لانچوں کو جن کی رفتار بہت سست تھی بدلا جا رہا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں سیاحوں کے لئے تیز رفتار بس اور لانچوں کی خدمت حاصل ہوگی۔

مشرقی پاکستان آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کو آواز دے رہا ہے۔ مشرق کی اپنی خاص دلفریبی ہے۔ اس کی یہ دلفریبی آپ کو قریہ و دیہات اور سارے علاقوں میں بھی ملے گی جہاں تہذیب و تمدن کی پرچھائیاں نہیں پڑی ہیں۔ اور جہاں حیات سہل۔ آسان اور سادہ ہے جسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کی دلفریبی سراسر مشرقی ہے۔

مشرقی پاکستان کا حسن قدرتی ہے۔ یہ مرہون منت غازہ و پوڈر نہیں۔ سائنس اور ٹکنولوجی نے اس کے حسن کو نہیں بگاڑا ہے۔ یہاں اب بھی سادہ اور نیچرل زندگی پائی جاتی ہے۔ یہاں کی زمین کی زرخیزی ایک سیاح کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور یہاں کی مسحور کن کیفیت یہاں رس بس جانے پر اکساتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بنگال میں آنے کے بہت سے راستے ہیں مگر جانے کا ایک بھی راستہ نہیں ہے جو بھی یہاں آیا اسی کا ہو رہا۔

شاعر، آرٹسٹ، فلاسفی، فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے اور وہ حضرات جنہیں حسن سے تعلق ہے مشرقی پاکستان کو اس لطف سے بھرپور پائیں گے۔ جس کی انہیں اس سے امید ہے۔ زندگی تیرتی نظر آتی ہے۔ جس کی رو آہستہ ہے مگر دھڑکتی ہوئی، موذن کی اذان، مندر کی گھنٹی کی ٹن ٹن۔ آدھی آدھی رات تک جشن مناتے ہوئے ڈھولک کی تھاپ، گلے کے ڈکارنے کی آواز، کوئل کی کوک پپیہا کی پی کہاں سب مل کر ایک طلسماتی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ایک سیاح یہاں کبھی منغص ہو ہی نہیں سکتا اور نہ گھبرا کر بھاگ سکتا ہے

قدرتی حسن کے پرستار کے لئے مشرقی پاکستان قدرتی لطافتوں کی ایک دنیا آباد کئے ہوئے ہے، دلفریب مناظر، زرخیز مٹی جنگلات دھوپ چھاؤں ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی اٹھلاتی کتراتی ندیاں گنگا اور برہم پتر کے شاخسانے دیکھنے کے قابل ہیں۔

آرٹ اور فن معماری کے رسیا مشرقی پاکستان میں پرانی مسجدوں اور درگاہوں کو اپنے خیالات کا مرکز پائیں گے۔ باقیات صالحات کا ایک اچھا ذخیرہ یہاں وہاں بکھرا ملے گا۔ ان میں سے کئی ایک کئی صدیاں پرانی عمارتیں ہیں۔ پہاڑپور اور مینامتی کے بودھی کھنڈرات ڈھاکے میں مغل عہد کی یادگاریں اور مساجد نمونہ از خروارے کی مثال رکھتے ہیں۔

شکار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشرقی پاکستان زرخیز اور غیر محدود مواقع فراہم کرتا ہے۔ بڑے بڑے شکار یہاں مارے جا سکتے ہیں۔ آپ یہاں مشہور جہاں رائل بنگال ٹائیگر شاندار اور ہیبت ناک زرد دھاری دار مخلوق سے سندربن کے جنوب اور پہاڑی چاٹگام کے گھنے جنگلوں میں دو دو ہاتھ کر سکتے ہیں۔ سندربن کے ہرن اور ڈیلٹائی علاقوں میں گھڑیال کا شکار کیا جا سکتا ہے جنگلی ہاتھی کو مارا نہیں زندہ گرفتار کیا جاتا ہے تقریباً ہر سال کھیدا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جو اتنا دلچسپ اور اہتزاز کن ہوتا ہے کہ ہالی ووڈ کے فلم بنانے والے تک اسے دیکھنے آتے ہیں۔ بائسن اب ناپید ہے مگر جنگلی سور کثرت سے ملتے ہیں leopard بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی شہر سے کچھ ہی دور پر مچھلی کے شکار سے رغبت رکھنے والوں کے لئے ان کا چارہ بیکار نہیں جائے گا۔ حیوانات اور نباتات کی افزائش اور زرخیزی کی بنا پر مشرقی پاکستان کی شہرت مبنی بر صداقت ہے۔ بندوق کے

شکاری سلہٹ کی جھیلوں پر کناڈین ہنس سے لیکر جنوب میں (سمندر کے نزدیک تک) بے شمار چہے اور دوسرے پرندوں کا شکار کر سکتے ہیں۔

علم الانسانیات اور ماہر عمرانیات کے لیے، قبائلی علاقے مطالعے کے لیے بہت قیمتی مواد فراہم کرتے ہیں۔ موگ، مونگ، چکما ٹیپرا اور سونتھال دلچسپ قبائل ہیں۔ یہ قبائلی اب تک اپنے پرانے رسم و رواج، مذہب اور روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں مگر اب ان میں سے بہت لوگ علیحدگی کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ باہری دنیا کی بھی انھیں خبر ہے۔ پہاڑی میں یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ ابھی تک جنگلوں کے اندر ایسے قبائل بھی ہیں جنہوں نے موجودہ دور کی تہذیب کو نہ سنا نہ دیکھا۔

مشرقی پاکستان کے دیہات کے لوگ اپنی سادگی اور گرمجوشی کی بدولت مشہور ہیں۔ مذہب سے گہری عقیدت رکھتے ہیں بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ دیہات کی فضا بڑی مسحور کن ہے۔ یہاں آپ ملاحوں کے راگ اور چرواہوں کو بانسری بجاتے سنیں گے۔ سر پر نیلا آسمان اور زمین پر آپ کسانوں کو دیکھیں گے جو یا تو بند کے پاس ہوں گے۔ یا کشتی پر ہوں گے۔ جو ندی کے سینے کو چیرتی نظر آئے گی۔

مشرقی پاکستان کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔ گرمی میں اس کا اوسطاً درجۂ حرارت ۹۸ سے ۱۰۲ ڈگری تک اور جاڑوں میں ۵۵ سے ۷۰ ڈگری تک رہتی ہے۔ موسم کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کو تین بڑے حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں

(۱) موسم سرما — اکتوبر سے فروری تک

(۲) اواخر مارچ سے جون تک — موسم گرما۔

(۳) برسات — جولائی سے ستمبر تک

موسم سرما بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ اور یہی موسم مشرقی پاکستان کا سفر کرنے کا ہے ... برسات کا موسم جولائی سے ستمبر تک رہتا ہے۔ اس میں اوسطاً ... بارش ہوتی ہے برسات کا موسم بیان میں نہیں آ سکتا۔ بارش مشرقی پاکستان کے آرٹ اور ادب اور موسیقی کو تحریک دیتی ہے اور اچھے اچھے فن پارے اسی دور میں تخلیق ہوتے ہیں۔

آپ یہاں کی رنگین قدرتی دلفریبی میں ڈوب جائیں گے جہاں کہیں بھی آپ جائیں "رہزن تمکین و ہوش" سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔ مشہور چینی سیاح نے بنگال کے متعلق اپنے سفرنامے میں لکھا تھا "حکومتِ بنگالہ ایک عظیم ملک ہے۔ اس کی پیداوار بے انتہا ہے۔ اس کی آبادی بھی کافی ہے۔ بہت سے لوگ تجارت میں منہمک ہیں۔ بہت سے کاشتکاری کے پیشہ میں مگن ہیں کچھ لوگ دستکاری اور میکینک کا کام کرتے ہیں۔ چینی سیاح نے آج سے پانچ سو سال قبل جو بات کہی تھی — آج بھی حرف بحرف صحیح ہے۔

افسر ماہ پوری

بھوّیا مشرقی پاکستان کا ایک لوک گیت

اگر کوئی یہ پوچھے کہ مشرقی پاکستان کی تعریف کم سے کم لفظوں میں کیا ہو سکتی ہے تو میرے نزدیک اس کا سب سے اچھا جواب یہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان محبت اور پریت کا دیس اور سبزہ و نغمہ کی سرزمین ہے۔

گیت اور پریت کے جنم لینے اور پروان چڑھنے کا جتنا سامان مشرقی پاکستان میں موجود ہے اتنا ملک کے کسی اور حصے میں شاید ہی نظر آئے۔ یہاں کے دیہاتوں میں قدرتی مناظر کی رنگینیاں اور [illegible] ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب گاؤں والوں کے دل میں پریت کی آگ دہکتی ہے تو ان کی آہ و کراہ گیتوں کا روپ دھار کر فضا میں بکھر جاتی ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کا دامن لوک کہانیوں، لوک گیتوں اور لوک سنگیتوں سے اس قدر مالا مال ہے کہ پاکستان کا کوئی اور علاقہ اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیت حقیقت میں یہاں کے گاؤں والوں کے سیدھے سادے خیال کے ترجمان اور ان کے گونگے جذبوں کی زبان ہیں۔ اس لئے ان کی گھما گھمی اور رنگا رنگی مشرقی پاکستان کے ہر گوشے میں یکساں پائی جاتی ہے۔ البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مشرقی پاکستان میں بعض خاص لوک گیت بعض خاص علاقوں ہی میں مقبول و محدود ہیں۔ وہ پورے مشرقی پاکستان میں نہیں گائے جاتے۔ مثلاً یہاں مشرقی پاکستان کے پوربی علاقے میں جاری، ساری، گھاٹو وغیرہ عوام میں مقبول ہیں وہاں اس کے شمالی خطے میں گمبھیرا جاگ اور بھوّیا نہایت لہک لہک سے گائے جاتے ہیں اور عوام میں انہی کا دور دورہ ہے۔ بھوّیا اپنے رنگ و آہنگ کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کے اور لوک گیتوں سے علیحدہ بھی ہے اور ممتاز بھی۔

بھوّیا مشرقی پاکستان کے شمالی علاقے کا مخصوص گیت ہے اور عوام میں اسے جو مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہے وہ کسی اور لوک گیت کے حصے میں نہیں آئی۔ بھوّیا نے جن حالات میں نشو و نما پائی اور عوام میں مقبولیت حاصل کی ان کو اس کی نوعیت و خصوصیت سمجھنے کے لئے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

مشرقی پاکستان کے ایک شمالی ضلع "رنگ پور" کو بھوّیا کی جائے پیدائش سمجھا جاتا ہے۔ رنگ پور کے اس علاقے میں جو کوچ بہار کی طرف مغربی بنگال سے ملا ہوا ہے کسی زمانے میں راج بنسی یا 'باہے' فرقہ آباد تھا اور آج بھی بڑی حد تک ہے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو چھتری کہتا اور اپنی نسلی بزرگی پر فخر کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ فرقہ 'کوچ' قوم کی ایک شاخ ہے مگر بعض لوگ انہیں تبتی بولنے والوں میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ 'باہے' لوگ دکھن کی طرف سے آئے اور مشرقی پاکستان کے شمالی حصے میں آباد ہوگئے۔ ان کی سماجی اور تہذیبی زندگی مقابلتاً زیادہ ترقی یافتہ تھی چنانچہ انہوں نے اس نئی فضا میں اپنی سماجی اور تمدنی زندگی شروع کی تو کچھ عرصے کے بعد خود ایک لوک ادب پیدا ہوگیا جس کا ایک پہلو بھوّیا جاگ گیت جوگی اور جاترا کے روپ میں عوام کے سامنے آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے عوامی گیتوں کی طرح بھوّیا گیت کو بھی امیروں اور رئیسوں کی سرپرستی کبھی حاصل نہیں ہوئی لیکن اس سے اس کی ترقی اور مقبولیت میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ یہ گیت چونکہ عوام کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے اور عوام کے دکھ سکھ کو بیان کرتا ہے اس لئے وہ روز بروز خود رو پودے کی طرح بڑھنے اور پھیلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں میں ایک مستقل اور ممتاز جگہ حاصل ہوگئی۔

مشرقی پاکستان کے شمالی اضلاع میں دوتارے کے گیت بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ دوتارے کے گیت سے مراد وہ لوک گیت ہیں جو عوام دوتارے پر گاتے ہیں۔ دوتارے کے گیتوں میں بھوّیا گیت کو سب سے زیادہ اہمیت و مقبولیت نصیب ہے۔ دوتارے کی دھیمی دھیمی دردناک آواز بھوّیا کے مدھر بولوں میں بجلی بھر دیتی ہے کبھی کبھی ایسا سماں بندھتا ہے کہ بھوّیا سننے والوں کو

آنکھیں چھلک چھلک اٹھتی ہیں۔

بعض مصنفوں نے کیرتن وغیرہ کو سنسکرت سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس پر اب تک کوئی ایک رائے مقرر نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں بھویا اور دوسرے لوک گیتوں کا ڈانڈا بھی سنسکرت سے ملانے کی اپج کی گئی ہے مگر سچ تو واقعہ یہ ہے کہ بھویا اور دوسرے لوک گیت مثلاً "نوسو" جھومر - بھاکو - بھادو - بگھیرا - جھنکا - جاری - ساری گھاٹو گھیٹو وغیرہ خالص مقامی بولیوں کے لفظ ہیں اور ان پر سنسکرت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے۔ میرے اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ گیت بنگال سے باہر بھی انہیں ناموں سے جانے جاتے ہیں یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں میں رادھا اور کرشن کا ذکر بھی اکثر جگہوں پر ملتا ہے۔ مگر بھویا ہی وہ تنہا گیت ہے جو اس سے قطعی خالی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھویا گیت ٹھیٹ مقامی رنگ آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اس پر باہری روایت کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بھویا گیت عام طور پر دو تارے ہی پر گایا جاتا ہے۔ کہیں دوتارے کی قید ہمیشہ نہیں برتی جاتی بیل گاڑی ہانکنے والے اور مانجھی بھی اپنے سفر کو دلچسپ اور گوارا بنانے کے لئے بھویا کی تانیں چھیڑ دیتے ہیں۔ جب کسی چوپال میں گاؤں والے جمع ہوتے ہیں تو اس سے وہ جی بہلاتے ہیں بھویا کی خصوصیتوں میں محبت کی ناکامی اور فراق کی تمنا کی نمایاں ہے۔ عام طور پر کوئی برہا کی ماری عورت اپنے محبوب کی مفارقت اپنی روح کے کرب اور اپنے انتظار کے درد کا ذکر کچھ ایسے سادہ موثر اور من موہ لینے والے انداز میں کرتی ہے کہ سننے والے بھی اپنے دل میں وہی چبک ٹیک محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس فرقت زدہ عورت کے ساتھ آنسو بہانے لگتے ہیں۔ چنانچہ ایک بھویا گیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) ابتدائے جوانی میں میرا بیاہ نہیں ہوا
میں اور کتنے دن یوں ہی تنہا گھر میں بیٹھی رہوں گی

اے بے رحم خدا!

(۲) ہائے ایسی آندھی چلی کہ میرا جوبن ڈھل گیا
میرے باپ ماں ہی میرے دشمن نکلے، میرا ٹھکانہ کسی اور گھر نہ لگایا۔

اے بے رحم خدا!

(۳) نہ تو میں ماں سے کچھ شرم کے مارے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ باپ سے
ہوس کی دھیمی دھیمی آگ سارے جسم میں جل رہی ہے۔

اے بے رحم خدا!

(۴) پیٹ پھٹتا ہے مگر منہ نہیں پھٹتا، شرم لاج کے مارے
دل کی بات کھول کر بیان کر دوں تو کٹی جلی سنوں

اے بے رحم خدا!

(۵) میرا دل ایسا بنا کر، میرا دل ایسا بنا کر
وہ گھبرو اس طرح ایسا گھبرو، مجھ سے بھاگتا ہے

اے بے رحم خدا!

(۶) اے بدبخت میرا کوئی نقصان نہیں
شوہر کے ساتھ دل کی آرزو وابستہ کرتے ہیں

اے بے رحم خدا!

اس گیت میں ایک دوشیزہ کی روح کی آواز ہے ایسے دل کا غم ہے جو محبت کا پیاسا ہے۔ اس میں ماں باپ کی بے حسی کا بھی ذکر ہے اور قدرت کی ستم ظریفی کا بھی۔ سادگی و پرکاری بھویا کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اب بھویا کا ایک منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

مایوسیوں سے سہمی، دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو
آئی ہوں گھاٹ پر میں، دریا کو پار کرنے کو جانتی نہیں ہوں
مانجھی کا نام کیا ہے کیونکر اسے بلاؤں کیسے اسے پکاروں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو
گھڑیال بالا کالا دریا سے لو وہ نکلا دل کس قدر ہے مضطر
کس وقت وہ پکڑ لے یکبارگی جھپٹ کے لگتا کس قدر ڈر
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو

(بقیہ صفحہ ۳۴۳ پر)

افسر ماہ پوری۔

قاضی نذر الاسلام کی افسانہ نگاری

قاضی نذر الاسلام کی زندگی ہیرے کی مانند ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں جو جگمگاتے ہیں۔ انہوں نے بنگلہ ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا ہے۔ قاضی صاحب اگرچہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعری کی حیثیت سے انہیں سب سے زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہوئی لیکن بنگلہ نثر و ادب کے دوسرے شعبوں میں بھی انہوں نے کارنامے انجام دئے ہیں وہ اپنی نوعیت و حیثیت کے اعتبار سے اس قدر وقیع ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے انقلابی نغموں کی گھن گرج اور ان کے باغیانہ ترانوں کی گونج اتنی تیز رہی ہے کہ ادب کی دوسری صنفوں میں ان کے کمالات منظر عام پر آتے آتے گویا ان کی حیثیت ثانوی سی رہی کہ یہی عالم ہے کہ "جس کو وہ چھوتے گئے وہ سونا بنتا گیا" اس ضمن میں ان کی افسانہ نگاری بھی آتی ہے۔

قاضی نذر الاسلام بنگلہ کے غالباً پہلے فنکار ہیں جن کی زندگی میں بیک وقت انقلاب و سکون، لطافت و ملاحت، شعلہ و شبنم، آب و آتش اور محبت و نفرت کا ایسا مربوط و دلکش سنگم نظر آتا ہے جس کی مثال بنگلہ زبان و ادب میں مشکل سے ملے گی۔ ان کے اس مزاج کی چھاپ ان کے افسانوں میں بھی بدرجۂ اتم ملتی ہے مگر ان کے اس مزاج کے بنانے اور سنوارنے میں بعض تاریخی قوتوں اور عوامل نے حصہ لیا ہے اور جب تک ان کے پس منظر کو سامنے نہ رکھا جائے ان کے افسانوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔

جس زمانے میں قاضی صاحب کی ادبی زندگی کی نشوونما ہوئی وہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اس جنگ عظیم کے ردعمل کی صورت میں حیات و کائنات کی پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ نئی قدریں اپنے قدم جما رہی تھیں۔

قاضی صاحب خود بھی ایک سپاہی کی حیثیت سے جنگ میں شریک تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جہاں ممالک بھی دیکھے جنگ کی ہولناکیوں سے بھی گذرے اور انسان کی مظلومیت و مجبوری کا بھی مشاہدہ کیا۔ زندگی کے ان تند و تلخ تجربوں نے ان کی شاعری کو شعلہ بنا دیا۔ ان کے گیتوں میں ایک نیا رنگ اور ان کے نغموں میں ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا اور ان کی بانسری کی نرم و لطیف لے صور اسرافیل بن گئی۔ ہندوستان اپنی صدیوں کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے برطانوی استعمار سے ٹکرا رہا تھا۔ ملک کے ہر ذہن میں وطن پرستی آگ بن کر دہک رہی تھی۔ قاضی صاحب کا دل جنگ کی تباہ کاریوں سے پہلے ہی زخمی تھا۔ برطانوی تشدد اور حریت پسندوں کی جانفروشی نے ان کے جذبۂ حب الوطنی کو اس قدر انگیز کیا کہ ان کے گیت نعرۂ انقلاب اور ان کے نغمے تلوار کی جھنکار بن گئے اور بنگلہ شعر و شاعری میں ایک نیا جوش و خروش اور ایک نئی طاقت و توانائی پیدا ہو گئی۔

چنانچہ قاضی صاحب کے انقلابی مزاج اور باغیانہ رجحان کا سب سے زیادہ اظہار ان کی شاعری میں ہوا اور اسی بنا پر وہ بنگلہ کے سب سے بڑے باغی شاعر کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ جہاں تک ان کے عشقیہ جذبات کا تعلق ہے ان کے ناول ان کے انقلابی اور رومانی ملے جلے جذبات کے آئینہ دار ہیں اور ان کے خالص رومانی تاثرات و واردات کی نمائندگی ان کے افسانے کرتے ہیں۔ دراصل جہاں ان کی شاعری انقلاب کی نقیب ہے، وہاں ان کے افسانے محبت کے ترانے ہیں۔ ان کے نغمے زیادہ تر ان کے افکار کے ترجمان ہیں اور ان کے افسانے ان کے تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے افسانوں میں بھی انسان اور سماج کے وہی مسائل ملتے ہیں جن کی بنیاد پر ان کی شاعری کی عمارت استوار نظر آتی ہے، لیکن

یہی سائل اُن کے افسانوں میں داخل ہوکر آنکھوں کی گفتگو اور دلوں کی آنند بن جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کے دل کی دھڑکنیں جتنی صاف ان کے افسانوں میں سنائی دیتی ہیں اتنی کہیں اور سنائی نہیں دیتیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے اٹھارہ افسانوں میں چودہ افسانے خالص حسن و عشق کے واقعات و واردات پر مشتمل ہیں۔ حسن و محبت کا ذرا اور وسیع تصور قائم کیا جائے تو دو اور افسانے اس زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اب لے دیکے صرف دو افسانے ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن پر "داستان محبت" ہونے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قاضی صاحب کے افسانوں کی یہ عام خصوصیت ان کے بعض اہم افسانوں کے تجزئے سے واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

"کوشو بادوبی کمل" (   ) حسن و عشق کی ایسی دردانگیز داستان ہے کہ پڑھتے پڑھتے قاری کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امنڈنے لگتے ہیں۔ جہاں تک غم ناکی و اثر آفرینی کا تعلق ہے یہ افسانہ قاضی صاحب کے افسانوں میں سرِفہرست ہے۔ اگرچہ ترتیب و تدوین بہت فنکارانہ نہیں ہے لیکن اس سے "کوشو بادوبی کمل" کی دل تڑپا دینے اور روح برما دینے والی کیفیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

"راج بدیر چیٹھی" (شاہی قیدی کی چٹھی) "شاہی ہارا" (بیوہ) "بادوڈ برآتو" کہانی (بگولے کی حکایتِ جاں) "راکھو نتی" (راکھشنی) اور "شیولی مالا" (ہارسنگھار) کو چھوڑکر باقی تمام افسانوں میں قاضی صاحب نے محبت کو شاد کام و بامراد دکھلایا ہے۔ مگر "بے تھاردان" (ددیعتِ دشنہ) "رکنیر بے دَون" (دردِ خوں) "گھومیر گھرے" (شبستانِ خواب) اور "حنا" ایسے افسانے ہیں جنکی تان ناکامی و نامرادی پر ٹوٹتی ہے اور جو "المیہ" کے تحت شمار کئے جاتے ہیں۔ ان تمام افسانوں کا مرکزی خیال فرض و محبت کی شدید کشمکش سے عبارت ہے یعنی ہیرو کے سامنے ایک طرف محبت کی دعوت ہے اور دوسری طرف ملک کی پکار۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ محبت کے لئے جام اٹھائے یا ملک کے لئے تلوار۔ ان افسانوں میں قاضی صاحب نے گو عورت کی محبت پر وطن کی محبت کو ترجیح دی ہے مگر ان پر دو دلوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوا تھا اسکی شکست کا غم اخیر اخیر تک مستولی رہتا ہے۔ "رکنیر بے دَون" (دردِ خوں) کا ہیرو اس باب میں اس قدر غلو سے کام لیتا ہے کہ وہ اپنی قید کو حقیقی رہائی سمجھنے لگتا ہے۔ مثالی کردار کے لحاظ سے قاضی صاحب کا یہ افسانہ کافی جاندار ہے۔

"گھومیر گھرے" (شبستانِ خواب) میں ہیرو ایک عجیب روحانی عذاب میں مبتلا ہے۔ ایک طرف اس کے لئے اپنی محبوبہ کی مفارقت ناقابل برداشت ہے اور دوسری طرف وطن اسے اپنی سمت آواز پر آواز دے رہا ہے۔ آخرکار وہ وطن کی پکار پر لبیک کہتا ہے اور یوں فرض محبت کو شکست دے دیتا ہے۔ ہیرو اپنی محبوبہ کو ایک دوست کے سپرد کرکے مادرِ وطن کی خدمت کے لئے نکل پڑتا ہے لیکن محبت سے فرض تک پہنچنے میں اسے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کس کس عنوان سے کرنا پڑتا ہے یہ ایک دل ہلا دینے والی داستان ہے۔ "حنا" کے مرکزی کردار کے سامنے بھی یہی مرحلہ آتا ہے۔ محبت اور فرض کی کشمکش یہاں بھی نظر آتی ہے مگر زیادہ شعور لیے۔ چنانچہ "حنا" کا ہیرو بھی انجام کار اپنی محبوبہ کی چاہت سے منہ موڑ کر مادرِ وطن کے قدموں میں جا گرتا ہے لیکن اس کے اس عمل میں ایک واضح شعور اور جاگرن کا احساس ہوتا ہے اور بلاشبہ یہ قاضی صاحب کی سماجی بیداری کی علامت ہے اور اس اعتبار سے بیانانہ خاصہ اہم ہے۔ "بے تھاردان" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حقیقی معنوں میں غم و اندوہ کی روداد ہے طویل بھی اور جانگسل بھی۔ اس افسانے میں ہجر و فراق اور غم واندوہ کی لے اس قدر موثر ہے کہ پڑھنے والی کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ "بے تھاردان" کا ہیرو دارا احساس فرض سے مجبور ہوکر اپنی محبوبہ بدرہ سے منہ موڑ لیتا ہے اور جنگ پر چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد بدرہ پر طرح طرح کی مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں یہاں تک کہ سیف الملک کے ظالم ہاتھوں اسکی دولت عصمت بھی لٹ جاتی ہے۔ اس صورت حال میں ہمارا سماج ہیرو اور ہیروئن کے دوبارہ ملنے کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر قاضی صاحب انسانی فطرت کی لغزشوں اور کمزوریوں کے باب میں ہمدردانہ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں چنانچہ انہوں نے اس رکاوٹ کو سیف الملک کی پشیمانی کے ذریعہ دور کر دیا۔ "بے تھاردان" بہت پہلے اُردو میں "لغاں" کے عنوان سے مقبولِ خاص و عام ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ ملک کے مشہور مترجم و ادیب جناب یونس احمر کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں اصل کی رعنائی و توانائی اور سوز و گداز کو پورے طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔ "شاہی ہارا" (بیوہ) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک بیوہ کی نہایت عبرت ناک کہانی ہے وہ اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں شمع کی طرح عمر بھر جلی اور اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گئی مگر اسکی نظر کسی اور طرف نہ اٹھی۔ "بادل برد توتے" ایک سیاہ فام لڑکی کی داستانِ نغمگی ہے جو محبت سے محروم ہونے کے باوجود محبت سے محروم نہ رہی۔ "مہر نگار" میں قاضی صاحب نے ایک طوائف لڑکی "گلشن"

(بقیہ صفحہ ۳۴۳ پر)

وفا راشدی

مشرقی پاکستان کے لوک ڈرامے

مشرقی پاکستان کے لوک ڈرامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کھیل کے اکثر حصے گیتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور مکالمے نظموں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ گیت کہیں کہیں "سانیٹ" کے طرز پر بھی تشکیل پاتے ہیں۔ بنگالی لوک ناٹک کی یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور ناٹک میں نہیں پائی جاتی۔ لوک کھیل کو اہل بنگال اپنی مقامی زبان میں "لوک ناٹک" یا "جاترا" کہتے ہیں۔ "جاترا" کا رواج بنگال میں سینکڑوں سال قدیم ہے۔ یہ جاترا یا لوک ناٹک زیادہ تر اسٹیج کی دنیا تک محدود رہا۔ اور کتابوں کے اوراق میں بہت کم محفوظ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال کے بڑے بوڑھے لوگ قصے کہانیوں کی طرح لوک کھیل اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں اور وہ اس طرح سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں اور بہت کم کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن ادیبوں اور مصنفوں نے لوک کھیل کو اسٹیج میں نمائش کیلئے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کتابی شکل میں محفوظ کیا ان میں گریش چندر کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ گریش چندر سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور اور جسیم الدین تک ہر دور کے پڑھے لکھے مصنفوں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پیش رو سے بہتر لوک کھیل لکھے اور اپنے اپنے طور پر اس کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی چنانچہ ٹیگور سے جسیم الدین تک کے زمانے میں جتنے لوک کھیل لکھے گئے ان میں پلاٹ، کہانی، گیت اور دوسرے اجزاء کے علاوہ علم و ادب اور فنی زبان کی چاشنی اور دیگر خوبیاں بھی پائی جانے لگیں۔ شروع میں جو لوک کھیل اسٹیج ہوئے یا لکھے گئے وہ محض عوام کی دلچسپی اور تفریح طبع کے لئے تھے دراصل اس زمانے کے ناٹک کا یہی نصب العین تھا۔ سب سے پہلے لوک کھیل کو عوامی ادب کی قیمت عطا کرنے کا سہرا بنگال کے مشہور و معروف عوامی شاعر "مکند داس" کے سر ہے۔ اس نے لوک کھیل کی توسیع و ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی اس نے اپنی ایک لوک ناٹک کی منڈلی بنائی تھی جو بنگال کی تمام دیہات یا گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں جاترا یا لوک کھیل کی نمائش کیا کرتی۔ ان کھیلوں کا چرچا آج بھی بنگال کے ہر طرف ہے۔ ان ناٹکوں میں عام طور پر راجاؤں کے قصے پیش کیے جاتے اور رعایا کی عام زندگی کا نقشہ کھینچا جاتا۔ اس طرح کھیلوں کے راجا اور پرجا اپنے کو ایک دوسرے سے بہت قریب محسوس کرتے۔ مکند داس کے لکھے ہوئے کھیلوں کی انتہائی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کھیلوں میں جو گانے اور گیت وغیرہ ترتیب دیئے تھے انہیں کلیات کی بنیاد پر شاعر اعظم قاضی نذر الاسلام نے اپنے متعدد گیتوں کا کلس بنایا تھا۔

موجودہ دور میں لوک ڈرامے کی تحریر میں سب سے زیادہ دلچسپی عوامی شاعر جسیم الدین نے لی۔ انہوں نے بعض کھیلوں کو جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا جدید انداز اور نئے اسلوب میں پیش کیا۔ ان میں "آسمان سنگھ" اور "مدھو مالا" نے جہاں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی وہاں مشرقی پاکستان کے عوامی ادب میں زندۂ جاوید حیثیت اختیار کرلی ہے۔ "آسمان سنگھ" سے متعلق جسیم الدین اپنی بنگلہ کتاب "مدھو مالا" صفحہ ۹۲ میں رقم طراز ہیں: "میں نے آسمان سنگھ آج سے پچیس سال قبل لکھا تھا لیکن اب تک اس کی اشاعت کا موقع نہیں ملا"۔

۱؎ اس مضمون کی تحریر میں جسیم الدین کے ایک بنگالی مقالہ سے استفادہ کیا ہے۔ (و۔ ر)

"مدھومالا" بہت دلکش اور پرکیف ناٹک ہے اسکے متعلق جسیم الدین اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰۱ میں کہتے ہیں -

"یہ ناٹک میں نے بچپن میں اپنے دادا جو والد کے چچا تھے سے باربار سنا کرتا تھا اور ہر بار اس میں نیا پن محسوس کرتا تھا جب وہ اس کہانی کے گیتوں کو اپنی خاص لے اور سُر سے گاتے تو مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی اور میں ایک سرور کی دنیا میں کھو جاتا یہاں تک کہ یہ کہانی سنتے سنتے دادا کی گود میں نیند آجاتی اور اکثر سپنے میں مدھومالا اور مدن کمار کو پیار کے جھولے میں دیکھا کرتا - آج جب کہ میں نے اس کہانی کو نئے روپ میں پیش کیا ہے - کاش! میرے نابینا دادا زندہ ہوتے وہ اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوتے "

جسیم الدین کے ان تاثرات سے لوک کھیلوں کی دلچسپی، دلکشی، دلفریبی، اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے - "آسمان سنگھ" اور "مدھومالا" کے علاوہ "بیلی بودھو" (گاؤں کی بہو) "پدا پار" (پدما ندی کے اس پار) "بہیدیہ" (ماجھی کی لڑکی) ایسے لوک ڈرامے ہیں جنکی وجہ سے جسیم الدین کا نام مشرقی پاکستان کے گاؤں گاؤں میں پہنچ چکا ہے قدیم کھیلوں میں پوشپو مالا، کرشن جاترا، کھولنا جاترا، آسمان تارا، بہر جا نار گونئے سندری اور ایمان یودد وغیرہ بہت مشہور ہیں - جو عموماً سینکڑوں سال پہلے کی کہانیوں پر مشتمل ہیں الاکبر لویقے، نوبانو، کیرانی جیون وغیرہ میں سماج کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئیں ہیں دور حاضر میں سراج الدولہ اور میر قاسم جیسے ڈرامے لکھے گئے جن میں شجاعت و جانبازی کے جوہر دکھائے گئے ہیں اور جن میں نا پختہ کارنامیوں کی روح کا عرفا ہے

حال ہی میں ایک نوجوان شاعر و ادیب قاضی غلام احمد کا ایک لوک ڈرامہ "عصور ٹیر پور" یعنی (آندھی کے بعد) ڈھاکہ میں اسٹیج کیا گیا تھا اس ڈرامے میں تخلیق پاکستان کے فوراً بعد کی ثقافت، تہذیب اور سماجی مسائل کے گوناگوں پہلوؤں پر نہایت واضح و موثر انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے - یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے نئے لکھنے والے لوک ڈرامے کی اہمیت و روایت سے باخبر ہیں اور آئے دن انکی تخلیقات منظر عام پر آتی رہتی ہیں یہ رجحان مستقبل کے لئے بڑا ہمت افزا اور قابل ستائش ہے - +

(بھوتیا لبیلہ ص ۳۲۹)

سایہ کی جستجو میں برگد کے نیچے آئی لیکن وہ پیڑ بوڑھا
دیتا نہیں ہے سایہ، پھلوں کا اپنے آخر بدلہ یہی ہے پایا
مایوسیوں سے سہمی دریا کنارے بیٹھی آنسو بہا رہی ہوں
ایسے میں کون دیکھوں کرتا ہے یاد مجھ کو

<—+—>

اس گیت میں بھی عورت کی بے چارگی کی نہایت موثر تصویر کھینچی گئی ہے جسکی ہر لکیر سے سچائی جھلکی پڑتی ہے اور بھوتیا کا یہی وہ جادو ہے جو عوام کا دل موہ لیتا ہے -

نذر الاسلام کی افسانہ نگاری لبیلہ ص ۳۳۱

کی داستان محبت بڑے حسن اور بڑی دلسوزی کے ساتھ بیان کی ہے - طوائف زادی ہونے کے لحاظ سے اسے کسی سے محبت کرنے کا حق نہ تھا اس لئے وہ خودکشی کر کے سماج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی - قاضی صاحب نے سماج کے اس رویہ کی سخت مذمت کی ہے -

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قاضی صاحب کے افسانے بہت دلکش اور جاندار ہیں مگر ان کے افسانوں میں اس فنی پختگی و عظمت کا احساس نہیں ہوتا جو کسی افسانہ نگار کی تخلیقات میں رچی بسی ہوتی ہے - اسکی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاری اس وقت شروع کی تھی جب یہ فن یہاں نیا نیا آیا تھا اور یہ کہ انہوں نے اس فن کو سنوارنے اور نکھارنے پر زیادہ ریاض نہیں کیا - پھر بھی یہ افسانے ہمارے عہد ہمارے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور انہیں بنگلہ زبان کے افسانوں میں ایک خاص امتیاز دیتے ہیں -

وفا راشدی

حضرت شاہ جلالؒ

کیا داستاں تھا سلہٹ در و دیوار سے پوچھ
کون آیا تھا یہاں کس کی آوازیں گونجیں

خطۂ سلہٹ کے بانیٔ اسلام شیخ المشائخ حضرت شاہ جلال یمنیؒ سے منسوب ہے۔ حضرت جلالؒ نے سلہٹ[1] کی دنیائے کفر کو شمع اسلام سے روشن کیا۔ ہزاروں انسانوں کو الحاد و گمراہی کے بجائے حق و صداقت کی راہ دکھائی[2]۔ سلہٹ میں حضرت شاہ جلالؒ کے ورود مسعود کے سن و سال کے سلسلے میں مورخوں کے بیانات مختلف ہیں۔ کوئی ۱۳۸۴ء بتاتا ہے اور کسی کے نزدیک ۱۳۰۳ء ہے لیکن تحقیقات کے آئینہ میں ۱۳۰۳ء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سلہٹ میں حضرت شاہ جلالؒ کی آمد کی داستان بڑی دلچسپ اور سعادت سے لبریز ہے۔ آج سے چھ سو سال پہلے جب حضرت شاہ جلال سلہٹ تشریف لائے، اس وقت اسلام کا نام ہوا، واحد بندۂ خدا برہان الدین نامی ایک شخص تھا جو یہاں کے راجہ گور گوبند کے ظلم و ستم کا شکار رہتا۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ برہان الدین کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا اس نے اس کی ولادت کی خوشی اللہ تبارک تعالیٰ کے نام پر ایک گائے بطور صدقہ ذبح کی۔ راجہ نے اس بات پر اس کے لخت جگر اور نور چشم کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا اور برہان کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا۔ راجہ گوبند کے تشدد کی خبر دور دور تک پھیل گئی جب یہ روح فرسا خبر دہلی کے بادشاہ وقت علاؤالدین خلجی کے کان تک پہنچی تو اس نے اپنے بھانجے سکندر شاہ غازی کی کمان میں راجہ کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی۔ سکندر غازی نے راجہ پر دو بار حملے کیے اور ہر بار اسے شکست ہوئی۔ شاید قدرت کو اس کفرستان میں آفتاب اسلام طلوع ہونے کے لئے ایک مردِ مجاہد کا انتخاب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے پیر حضرت شاہ جلالؒ کفرستان کی ظلمت میں کرامات مینہ برساتے ہوئے مکہ معظمہ سے دریائے برہم پتر تک پہنچے۔ حضرتؒ کے ہمراہ تین سو ساٹھ (۳۶۰) اولیائے کرام تھے جو حضرتؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ حضرت جلالؒ نے اپنے مصلے کو دریا میں ڈالا۔ اللہ کا نام لے کر اس پار سلہٹ کی وادیوں میں پہنچے حضرت جلالؒ اور ان کے ساتھیوں کا راجہ گور گوبند سے مقابلہ ہوا گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ راجہ گوبند کو زبردست شکست ہوئی اور جنگل کی طرف فرار ہو گیا۔ حضرت جلالؒ نے سکندر غازی کو حکومت کی باگ ڈور سونپ دی اور خود یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے[3]۔ اس طرح حضرت جلالؒ کے دم قدم سے نہ صرف سلہٹ بلکہ سارے بنگال میں پرچم اسلام بلند ہوا۔ ایمان کی تلوار کو مصنوعی خداؤں کے بت ڈھا دیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علاؤالدین خلجی پایۂ تخت دہلی پر رونق افروز تھے اور بنگال کی عنانِ حکومت سلطان شمس الدین کے ہاتھوں میں تھی۔

حضرت شاہ جلال الدین[4] کے آبا و اجداد یمن کے رہنے والے تھے حضرتؒ کے والد ماجد حضرت محمد بن ابراہیم برگزیدہ ہستیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت موصوف بخارا کے قریب قونیا (کنیا) نامی ایک گاؤں

---

[1] سلہٹ گہوارۂ اسلام (بنگالی نسخہ) از مفتی اظہار الدین احمد صدیقی

[2] Memoirs of Gour and Pandua By Abid Ali Khan.

[3] حالاتِ زندگی شاہ جلال مولانا مفتی اظہار الدین احمد صدیقی

میں اقامت پذیر تھے۔ حضرت جلالؒ اپنے والدین کی طرف سے قریشی
الاصل تھے۔ حضرتؒ کے ننھیالی سلسلہ اہل سادات سے جاملتا ہے۔ حضرت
کمسنی ہی میں پدر بزرگوار کی شفقت و محبت سے محروم ہوگئے۔ حضرتؒ کے ماموں
حضرت سید احمد کبیر الدین حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ نے حضرتؒ
کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ حضرت سید احمد کبیرؒ اپنے وقت کے
صاحب علم وعرفان اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ حضرت جلالؒ
نے آپؒ کے حلقۂ طریقت میں رہ کر حقائق و معارف کے درس حاصل
کیے اور معرفت و تصوف کے نکات سے بہرہ ور تھے۔ حضرتؒ اپنے ماموں
موصوف کے ساتھ مکہ معظمہ میں حجرہ نشین تھے کہ ایک روز ایک ہرنی نے
شیر کے ظلم سے تنگ آکر حضرت احمد کبیرؒ سے اپنی زبانِ بے زبانی سے فریاد
کی۔ آپؒ نے اپنے بھانجے اور مرید حضرت جلال سے فرمایا ۔۔۔ "تم اس
معاملہ کا فیصلہ کردو"۔ حضرت جلالؒ نے جب شیر کی تلاش میں جنگل کی راہ
لی تو حضرت کبیرؒ کے دل میں خیال آیا کہ اگر اس درندے کو داہنے ہاتھ کی
تین انگلیوں سے اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے طمانچہ مارا جائے تو
اسکی یہ سزا کافی ہوگی۔ حضرت جلالؒ کو کشف کے ذریعہ اپنے پیر و مرشد
کے اس خیالِ پاک کا علم ہوگیا۔ چنانچہ حضرتؒ نے ایسا ہی کیا جب حضرتؒ
اپنے ماموں کی خدمت میں واپس تشریف لائے اور احوال بیان فرمایا تو حضرتؒ
کے مرشد بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا :۔

"تم اب واقف اسرار و رموز ہو۔ جاؤ! اور سرزمین ہند
میں جاکر وحدانیت حقہ کے چراغ جلاؤ اور دین حق کی تبلیغ کرو"
پھر اپنے حجرۂ مبارک کی تھوڑی سی مٹی اپنے دست مبارک سے
اپنے ہمشیرزادے کو عنایت فرمائی اور ہدایت فرمائی کہ۔

"اس مقام پر سکونت اختیار کرو جہاں کی مٹی اس مٹی کی رنگ
و بو اور ذائقہ سے مشابہت رکھتی ہو"۔

حضرت اپنے پیر و مرشد کے حسب ہدایت عازم سفر ہوئے تھے
کہ راستہ میں سکندر غازی کی فوج کے ساتھ ہولیے اور سلہٹ کا رخ کیا
جس کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ حضرتؒ کے مزار مقدس کی
زمین کی مٹی میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جنکی طرف حضرتؒ کے ماموں حضرت
سید احمد کبیرؒ نے اشارہ فرمایا تھا۔

حضرت جلالؒ کے کشف، کرامات اور فیوض و برکات کے واقعات
تو تاریخ کے بیشتر اوراق میں ملتے ہیں۔ یہاں صرف دو واقعات پیش کئے جاتے ہیں
مولوی اظہر الدین صدیقی اپنی کتاب "حضرت شاہ جلال" (جو بنگالی زبان
میں ہے) تحریر فرماتے ہیں۔

"جب حضرت شاہ جلال شہر دہلی میں پہنچے تو حضرت نظام الدین
اولیاؒ کے ایک مرید نے حضرتؒ کے ولایت کی مخالفت میں کچھ باتیں حضرتؒ
سے کہیں۔ جب نظام الدین اولیاؒ نے یہ باتیں سنیں تو آپؒ نے کشف کے
ذریعہ ان کی حقیقت معلوم کی چونکہ یہ باتیں غلط ثابت ہوئیں اس لئے
آپ نے اپنے مرید کو اس خیالِ بد سے روکا۔ اور دو آدمی حضرت جلال
کی خدمت میں روانہ کیے ان کے ذریعہ اپنا سلام بھیجا۔ جب یہ دونوں حضرت
جلالؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر حضرت نظام الدین اولیاؒ کا سلام پہنچایا
تو آپ نے ان کو ایک ڈبہ دیا جس میں جلتا ہوا کوئلہ اور مختصر سا روئی کا
ٹکڑا تھا۔ جب یہ دونوں ڈبہ لے کر اپنے پیر کے پاس پہنچے اور انھوں نے
اسکو کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس میں آگ دہک رہی ہے مگر روئی
جیسی کی تیسی رکھی ہے۔ آگ کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا تو آپؒ اس امر کو سمجھ
گئے کہ یہ تکلی روئی آدمی کی مشابہت رکھتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ
انسان میں برائی کی آگ ہمیشہ بھڑکتی ہے مگر روحانیت انسان پر کچھ اثر
انداز ہونے نہیں دیتی۔ اس واقعہ کے بعد نظام الدین اولیاؒ نے اس
ڈبے کے بدلے میں ان کو دو کبوتر بھیجے جن کی نسل اس وقت بھی خصوصاً درگاہ
شریف کی مسجد کی چھت پر اڑتی پھرتی نظر آتی ہے اور عموماً ضلع اور اس
کے اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی ہے"۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ راجہ گوڑ گوبند شکست کھاکر
جنگل کی طرف فرار ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ایک روز شاہ جلال کا حال
معلوم کرنے کی غرض سے ایک سپیرے کی ٹوکری میں چھپ کر حضرت
جلالؒ کے دربار میں پہنچا۔ سپیرے نے آپ سے سانپ کا تماشا دکھانے
کی خواہش ظاہر کی تو آپؒ کو اس بات کا غائبانہ طور پر علم ہوگیا اور آپ
نے اس ٹوکری کی طرف جس میں راجہ گوبند چھپا بیٹھا تھا اشارہ کر
کے حکم دیا۔
"اسے کھولو"

- پیرا شکست ہو گیا اور جان کی امان چاہی۔ گوبند گڑی سے باہر نکل کر حضرتؒ کے قدموں پر گر پڑا اور اطاعت قبول کی۔

حضرت جلالؒ نے سلہٹ میں ابتدائی دو سال سلطنت کے نظم و نسق میں صرف کیے۔ باقی پچیس سال خدمت خلق اور ریاضت و عبادت میں گزار دیے۔ حضرتؒ نے بروز جمعرات ۲۰ ذیقعدہ ۷۴۰ھ کو وصال فرمایا۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں مراکش سے ہندوستان آیا تھا۔ اسی نے بنگال کی سیر و سیاحت بھی کی تھی۔ اس زمانے میں اس نے حضرت جلال کی خدمت میں بھی شرف باریابی حاصل کیا تھا۔ آپ کے متعلق سفرنامے میں بہت دلچسپ حال قلمبند کیا ہے جس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے :-

"متواتر چالیس سال سے آپ صائم الدہر رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صرف دسویں دن روزہ افطار کرتے تھے۔ آپ کے پاس ایک گائے تھی جس کے دودھ سے روزہ کھولتے تھے۔ آپ قائم اللیل تھے۔ اس وقت آپ کا قد بلند دبلا تھا اور رخساروں پر بہت کم بال تھے ان پہاڑوں کے باشندے آپ کے دست حق پرست مسلمان ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ انہیں لوگوں کے درمیان رہنے لگے تھے۔"[1]

سلہٹ کی زیارت گاہوں اور قابل دید عمارتوں میں شیخ المشائخ حضرت شاہ جلالؒ سلہٹی یمنی کی درگاہ شریف کو مادیت و روحانیت دونوں اعتبار سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ درگاہ کی نسبت سے اس علاقہ کا نام درگاہ محلہ پڑ گیا۔ یہاں چشمۂ فیض و برکت ہر مذہب و ملت کے لئے جاری ہے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ، کیا عیسائی سبھی اس درگاہ مبارک کی زیارت سے اپنی روح میں تازگی محسوس کرتے ہیں جذبۂ روحانیت سے ہمکنار ہوتے اور عظمت اسلام کا نشان پاتے ہیں۔ درگاہ کی شاندار عمارت پہاڑوں پر واقع ہے۔ درگاہ کا جو بہ صورت حضرت جلالؒ کے جاہ و جلال کا پتہ دیتا ہے۔ درگاہ کی عمارت چار بڑے بڑے ستون پر کھڑی ہے۔ مزار پر نور پر چھتری ہے۔ درگاہ کے مشرقی جانب خوبصورت مسجد ہے اس مسجد کو شاہ جہاں بن صوبۂ بنگال کے فوجدار نواب اسفندیار خاں نے دوبارہ توڑ کر بنوانا شروع کیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد کے حاکموں نے اپنے اپنے طور پر اس مسجد کی تکمیل کی۔ درگاہ اور مسجد کی در و دیوار پر جا بجا عربی و فارسی زبانوں میں کتبے نظر آتے ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ماضی کے ہر دور کے حکمرانوں نے حضرت جلالؒ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا اور کتبوں کی شکل میں اپنی روحانی یادگار چھوڑی۔

حضرت جلالؒ کے مزار مبارک کے آس پاس ان شیدائیان اسلام کے مقبرے ہیں جو آپ کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے تھے مزار کے باہر درگاہ کے احاطہ میں ایک بہت بڑا دیگ محفوظ ہے جو آپ کے دور کی یادگار ہے۔ درگاہ کے باہر ایک تالاب ہے جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مچھلیاں خرید کر ان کی خوراک مہیا کرتے ہیں۔ ان مچھلیوں کو کوئی نہیں مارتا اور نہ کبھی وہ تالاب سے باہر نکالی جاتی ہیں۔ درگاہ کے جنوبی حصے میں ایک نہایت شفاف چشمہ ہے اسے شاہ جلال کا چشمہ کہتے ہیں اس میں رنگ برنگ کی ننھی منی مچھلیاں اچھلتی کودتی بھلی معلوم ہوتی ہیں روایت ہے کہ یہ چشمہ حضرت کے زمانہ میں جاری ہوا اور آج تک بے شمار امراض کا درماں ہے۔

حضرت جلالؒ مجرد تھے آپ کے ہمراہ جو اللہ والے تھے ان کے خاندان کے بیشتر افراد درگاہ محلہ میں آباد ہیں اس محلہ کے ایک صاحب دین اور صاحب علم و فضل بزرگ مولانا اظہر الدین احمد صدیقی کے جد امجد کا تعلق بھی انہیں اسلاف سے تھا۔ حضرت جلالؒ کی وہ تلوار جس نے شجر کفر کو جڑ سے کاٹ دیا تھا وہ کھڑاؤں جو آپ کے پائے مبارک کی زینت بنی تھی اور آپ کے کھانے کی مٹی اور کانسے کے برتن، یہ سب چیزیں آپ کے تبرکات میں سے ہیں جو مولانا اظہر الدین صدیقی کے صاحبزادے مولانا نحرالدین صاحب ایڈووکیٹ کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی زیارت سے حضرتؒ کی شجاعت سادگی اور درویشانہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

(۱) Ibne Batuta's Travel in Asia and Africa Translated by Prof: H.R. Gibb

اظہر قادری

مشرقی پاکستان میں اُردو

مشرقی پاکستان میں اُردو کبھی بھی اجنبی نہیں رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم سے پہلے بنگال کی بیشتر سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی تحریکوں اور سرگرمیوں کا مرکز کلکتہ تھا اور اس لئے کلکتہ میں جو تحریک بھی اٹھتی تھی اس کا اثر سارے بنگال پر پڑتا تھا۔ انگریزوں کی آمد اور اسکے لازمی نتیجے میں دہلی اور لکھنؤ کی سلطنتوں کے زوال کے بعد کلکتہ اور لاہور اُردو کا مرکز ٹھہرے۔ انگریز امراء کے ایما اور کوششوں سے لاہور میں جدید اُردو شاعری اور کلکتہ میں جدید اُردو نثر کی بنیاد پڑی اور یہ دو تحریکیں دیکھتے دیکھتے سارے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ وقت کی کمی اور اختصار کی مصلحت تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتی اسلئے اجمالی طور پر میں بنگال اور خاصکر مشرقی بنگال میں اُردو شعر و ادب اور زبان کی ترقی اور فروغ سے بحث تک اپنے مضمون کو محدود رکھوں گا۔

ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد انگریزوں نے پہلے کلکتہ کو اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا اور کلکتہ ایک عرصے تک ہندوستان کا مرکز رہا۔ اور اس لئے اس کا اثر بنگال کے مختلف اضلاع پر پڑا۔ انگریزوں کی آمد سے جدید خیالات زندگی سے متعلق مختلف نئے نقاطِ نظر کلکتہ سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پھیل گئے۔ بنگال میں کلکتہ کے بعد مرشدآباد اور ڈھاکہ مختلف، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ ڈھاکہ میں شرف بیتی شرف (جن کا انتقال ابھی حال میں ہوا ہے) اسماعیل ذبیح، خواجہ عادل، حبیب الرحمٰن وغیرہ کے نام سے ادبی سرگرمیاں جاری تھیں اور ادبی نشستیں اور مشاعرے بڑی پابندی سے منعقد ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی بھی ملازمت کے سلسلے میں ڈھاکہ آئے اور ایسے آئے کہ یہیں ہو کر رہ گئے۔ ادبی محفلوں میں ڈاکٹر شادانی نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی خدمات ہر طرح سراہنے کے لائق ہیں۔ اس دور کے لوگوں میں اس وقت ڈاکٹر شادانی تنہا رہ گئے ہیں اور اس دور کی یادگار سمجھے جاتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد انگریزی سیاست اور مصلحت نے بنگال کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ مغربی بنگال کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا اور مشرقی بنگال پاکستان کے حصے میں آیا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کا مرکز ڈھاکہ قرار پایا۔

جب آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آیا تو ان میں سے کچھ مغربی پاکستان ہجرت کر گئے اور کچھ مشرقی پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں جب دوبارہ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو اسد قہ کلکتہ، بہار، یو پی، سی پی، حیدرآباد دکن، دہلی اور مشرقی پنجاب تک سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آ بسی۔ ان نئے آنے والوں میں جہاں ڈاکٹر، انجینیر اور مختلف حرفتوں کے ماہرین تھے، وہاں ادیبوں کی بھی ایک خاصی جماعت تھی۔ یہ وہ ادیب تھے جو اپنا سارا اثاثہ پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن اپنی پیاری اُردو زبان، تہذیب و تمدن اور رہن سہن کا سرمایہ ساتھ لیتے آئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ میر و غالب، آتش و مومن، اور وحشت و حسرت کی شاعرانہ روایت بھی اپنے ساتھ لائے۔

ابتدا میں نئے ماحول، نئی زندگی، نئی طرزِ معاشرت نئے حالات اور نئے لوگوں سے نباہ کرنے اور ان سے رشتہ قائم کرنے میں جن مشکلات کا انہیں سامنا کرنا پڑا، وہ پڑا۔ یہ بڑے دل گردے والوں کے لئے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھیں۔ لیکن جو باشعور ادیب تھے وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اپنی مشکلات پر قابو پانے کی ترکیبوں اور طریقوں پر سوچ بچار کرنے لگے۔ نتیجے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی اور انہوں نے اپنے ترقی یافتہ سماجی شعور سے کام لے کر اسکا اصل نکالا جینے بڑی کٹھن گھڑیوں میں بھی ان کے اندر مایوسی نہیں پیدا ہونے

دی۔ اور انہوں نے یہاں کی زندگی، معاشرت، تہذیب سے سمجھوتہ کرنے اور یہاں کے لوگوں میں شیر و شکر ہو کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اتنا صحیح اور صحت مند تھا کہ اس نے بڑی حد تک ان کے وطن کی یاد کو ان کے دل سے تقریباً محو کر دیا۔ اور ترک وطن کے غم میں ان کے دل پر جو داغ پڑے تھے بالآخر وہی ان کے لئے چراغِ رہ بن گئے اور فرقِ ادب پر ماہ و انجم بن کر چمکنے لگے۔ لیکن وہ ادیب و شاعر جو یہ سمجھتے رہے کہ یہاں کی زندگی اور حالات سے ربط پیدا کرنے کا مطلب اپنے کلچر اور تمدن کو برباد کرنا ہے انہوں نے حتی الامکان یہاں کی فضا اور لوگوں سے اپنے کو الگ رکھنے کی کوشش کی اور ہندوستان سے لائے ہوئے کلچر کے تحفظ کے لئے اسے سات پردوں میں چھپائے رکھا۔ وہ اب تک اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہے ہیں اور جب تک وہ اپنے اس خود غلط رجحان میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے اور یہاں کی زندگی سے ربط پیدا نہیں کرتے مشکلات کا سامنا کرتے رہیں گے۔ لیکن یہ باعثِ مسرت ہے کہ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن جن شاعروں اور ادیبوں نے یہاں کی زندگی، معاشی، معاشرتی حالات اور تہذیب و تمدن کو سمجھنے کی کوشش کی اور یہاں کی جمہوری تحریکوں اور عوامی زندگی سے رابطہ قائم رکھا آج وہی یہاں کے اچھے ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ ادیب اور شاعر ہیں جنہوں نے اپنی روایات اور اپنی تہذیب اور یہاں کی تہذیب اور یہاں کی روایات میں ایک ایسا اٹوٹ رشتہ قائم کیا ہے جس سے اردو زبان و ادب کو آگے بڑھنے، پھولنے پھلنے اور فروغ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہی وہ نظریہ اور رجحان ہے جس کی بنا پر بنگالی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے قدم بھی مشرقی پاکستان کی سرزمین میں روز بروز جمتے جا رہے ہیں۔ اور یہاں کی زندگی کا گرم گرم خون اردو کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور یہی اس کی بقا کی ضمانت ہے۔

مئی ۱۹۵۰ء میں علامہ رضا علی وحشت مرحوم حالات سے مجبور ہو کر ہندوستان سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آ گئے۔ ان کی تشریف لانے سے یہاں کی ادبی تحریک میں غیر معمولی تقویت پیدا ہو گئی۔ اور ان کی رہنمائی میں ترقی کی راہ پر اردو زبان و ادب کے قدم تیز سے تیز تر ہو گئے۔ چاٹگام میں حکیم ناطق لکھنوی مرحوم کی موجودگی چاٹگام کے اردو ادیبوں کے لئے فالِ نیک ثابت ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں ان بزرگوں کی آمد سے اردو کو جو فائدہ پہنچا ہے اس سے انکار ایک ادبی ناانصافی ہوگی۔

ان لوگوں کے بعد یہاں کے بزرگوں اور اردو زبان و ادب کے سرپرستوں میں مولانا منتؔ عمادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مولانا آصف بنارسی اور سلیم اللہ فہمی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان لوگوں کے دم سے مشرقی پاکستان میں اردو کی صحت مند روایات زندہ ہیں۔ ان کے علاوہ جن ادیبوں اور شاعروں نے یہاں کی زندگی کو اپنے ادب کا موضوع بنایا ہے اور جو یہاں کی جمہوری تحریکوں کو آگے بڑھانے میں حصہ لے رہے ہیں ان میں احسن احمد اشک، عارف ہوشیارپوری، حبیب رتی، اشتیاق احمد شوق، منیر غازی پوری، رفیع احمد فدائی، شمس بصیروی، پرویز، عصمت علی عصمت، شفیق احمد شفیق، انیس عماری، ظفر عظیم، ایاز عصمی، اختر پیامی، عابد دانا پوری، افسر ماہ پوری، نوشاد نوری، فرد شاکری، شوقی شاکری، یوسف علی لائق، جبار لطیفی، قدوس صدیقی، اسد رضا چودھری، شفیع اقبال، ولیل ناطقی، شہناز، نور فیضی، عطاء الرحمن جمیل، ادیب سہیل، اختر لکھنوی، مسعود کلیم، انور فرہاد، شاد آصفی اور صلاح الدین محمد قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ مذکورۂ بالا ادیبوں کے علاوہ یہاں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جو ادب میں جمہوریت اور سماجی اقدار کے قائل نہ ہونے کے باوجود یہاں کی ادبی زندگی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اور رومانی شاعری میں جدید رنگ کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کی فہرست سختی کے ساتھ بغیر کسی رواداری کے ترتیب دی جائے تو ان میں، اقبال عظیم، قاری اخلاق احمد، مبارک مونگیری، محسن عظیم آبادی، اختر پیشاوری، رضا بزاہی، وحید قیصر ندوی، ارشد کاکوی، نظیر صدیقی، افضل عشروی، انجم شفیقی، رشید الزماں خلش، عطا آصفی، شاعر صدیقی، مظہر سلیم آبادی، مظہر صدیقی، گوہر فیض آبادی، سرور بارہ بنکوی اور یوسف قدیری کے نام چھوڑے نہیں جا سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی پاکستان میں شاعروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ یہاں نثر لکھنے والوں کی کمی ہے۔ اگر نثر لکھنے والوں کی تعداد گنانے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لئے بھی ایک لمبی فہرست درکار ہوگی۔ میں یہاں صرف ان لوگوں کا ذکر کروں گا جن کو انصاف کی نظر کسی طرح چھوڑنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

نثر لکھنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کا رجحان فکر ادبی تنقید کی طرف ہے۔ اور جنہوں نے جدید ادبی تنقید میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اس میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں ڈاکٹر شادانی،

آفتاب احمد صدیقی، احسن احمد اشک، اقبال عظیم، ارشد کاکوئی، نظیر صدیقی اور حنیف فوق قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شادانی، آفتاب احمد صدیقی، اقبال عظیم، ارشد کاکوئی اور نظیر صدیقی کا اندازِ تحریر بیشتر کلاسیکی ہے۔ ڈاکٹر شادانی نئے ادبی رجحانات پر بہت کم قلم اٹھاتے ہیں۔ کلاسیکی ادب، زبان و بیان اور تحقیق و تفحص ان کا خاص موضوع ہے۔ آفتاب احمد صدیقی کا بیشتر کام شبلی مرحوم کی خدمات سے متعلق ہے۔ انہوں نے مینائے غزل اور گلہائے داغ کے نام سے دو کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ جن میں امیر اور داغ کے کلام پر تنقید و تبصرہ کے علاوہ ان کا انتخابات بھی پیش کیا ہے۔ اقبال عظیم نے ایک کتاب "مشرقی بنگال میں اُردو" کے نام سے شائع کی ہے جس میں مشرقی پاکستان کے اُردو شاعروں کے حالات کے علاوہ ان کے کلام پر تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب کا انداز پرانے تذکروں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس میں جدید تنقید کے اصولوں سے کام نہیں لیا گیا ہے اس کوتاہی اور کمی کے باوجود یہ کتاب ایک بار ضرور پڑھنے کی چیز ہے۔ ارشد کاکوئی ادب کے نئے رجحان سے واقف تو ضرور ہوں گے لیکن ان کی تنقید کا انداز مکمل طور پر جدید نہیں۔ نظیر صدیقی پر حسن عسکری کا رنگ غالب ہے۔ ان کی نثر سادہ تو ضرور ہے لیکن بہت زیادہ لیبرڈ (LABOURED) معلوم ہوتی ہے حنیف فوق شاعر سے زیادہ نقاد معلوم ہوتے ہیں اور ان کا رجحان بھی تنقید کی طرف زیادہ ہے۔ جدید تنقیدی اصول سے واقف ہیں اور انداز بھی جدید ہے لیکن اکثر موقعوں پر ان کی نثر ضرورت سے زیادہ مبہم ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے کھیل رہے ہیں۔ تنقید کی زبان بہت سنجیدہ اور متین ضرور ہوتی ہے لیکن سنجیدگی و متانت ایک بات ہے اور ابہام اور ایچ پیچ دوسری بات ہے جو قابل قبول نہیں۔ احسن احمد اشک بنگالی کے باغی شاعر نذر السلام سے بہت زیادہ متاثر ہیں ان کی شاعری میں اکثر وہی باغیانہ انداز ملتا ہے جو نذر السلام کی شاعری کے معتدبہ حصہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے نذر السلام کی شاعری اور حالات سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے لیکن یہ اب تک سمجھ میں نہ آسکا کہ کون سی مصلحت یا دشواری اسکی اشاعت کی راہ میں سدّ راہ بنی ہوئی ہے۔ اشک بڑی سادہ صاف اور سلیس نثر لکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔

نثر لکھنے والوں کی دوسری جماعت افسانہ نگاروں کی ہے ان میں وہ بھی ہیں جو ایک عرصے سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور افسانے کی جدید تکنیک اور بنیادی اصول سے اچھی طرح واقف ہیں اور وہ بھی ہیں جنھوں نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے۔ مشاق اور پختہ کار افسانہ نگاروں میں زینب تسنیم، اختر ماہ پوری اور ایاز عظمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زینب تسنیم نے بعض بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں لیکن ایک مدت سے وہ خاموش ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے دوسرے مسائل ان کی افسانہ نگاری کی راہ میں حائل ہیں۔ اختر ماہ پوری شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اندر اچھا شعر کہنے کی صلاحیت ہے لیکن افسانہ نگاری میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔ ایاز عظمی صرف افسانہ لکھتے ہیں اور اپنے افسانوں کے لئے آس پاس کی زندگی سے مواد حاصل کرتے ہیں جسکی بنا پر ان کے افسانے صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ انداز تحریر صاف، سادہ اور جدید ہے۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے، لیکن جن میں سے بعض کی اٹھان اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اگر انہوں نے لکھنے کی مشق جاری رکھی اور ساتھ ساتھ مطالعہ بھی کرتے رہے تو آگے چل کر ان کا شمار اچھے افسانہ نگاروں میں ہو سکتا ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں داؤد نظامی، غلام محمد، زین العابدین، رشیدہ ابراہانی، ام عمارہ اور بانو اختر شیہود کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے کچھ اچھے افسانے لکھے ہیں جن کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اندر لکھنے کی صلاحیت ہے اگر انہیں صحیح رہنمائی ملی تو وہ مشرقی پاکستان کے ادبی حلقے میں اپنا مقام بنا سکتے ہیں۔

طبع زاد افسانہ لکھنے والوں کے علاوہ یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بنگالی شہ پاروں کو اُردو میں منتقل کرنے کے فرائض نہایت تندہی اور چابکدستی سے ادا کر رہے ہیں اس سلسلے میں سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، رفیع احمد فدائی اور یونس احمر (جو آجکل کراچی میں ہیں) احمد سعدی اور سعد منیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں میں سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، رفیع احمد فدائی اور یونس احمر نے خاص طور پر بنگالی ادب اور زبان کا مطالعہ کیا ہے اور اسی لئے بنگالی ادب کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یونس احمر اور احسن احمد اشک نے نذر السلام کی بہت ساری چیزیں اُردو میں منتقل کی ہیں رفیع احمد فدائی کی مادری زبان اُردو ہے لیکن یہاں آکر انہوں نے بنگالی یا اس طرح سیکھی کہ اب اس پر ان کو بڑی حد تک عبور حاصل ہو گیا ہے اب وہ نہ صرف بنگالی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ بنگالی

زبان لکھنے پڑھنے پر بھی ایک حد تک قادر ہیں۔ یہ بات کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ رفیع احمد فدائی نے اُردو داں کے لئے "بنگلا تعلیم" کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جسکو پڑھ کر بنگالی زبان بڑی آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے نذر الاسلام کے ایک ناول "مرتیو کھودا" موت کی بھوک کا ترجمہ "موت کی بھوک" کے نام سے کیا ہے جسکو اقبال نذر الاسلام سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعر جسیم الدین کے افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ ابھی حال میں "جھمکا" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ پرنسپل ابراہیم کے ناول ہو سکم کا ترجمہ بھی فدائی نے کیا ہے جسے رائٹرس گلڈ شائع کر رہا ہے۔ شاعر غلام مصطفےٰ کی کتاب "دشوہی" کا بھی ترجمہ کیا ہے جو زیر طبع ہے اس کے علاوہ فدائی نے بنگالی کے بیشتر اچھے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جن میں سے کچھ مختلف اُردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ فدائی کی زبان نہایت صاف و سلیس ہے۔ اُردو ترجمے کا انداز اتنا اچھا اور بہتا ہوا ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

یہاں بنگالی اور اُردو کے ادیبوں میں جو اتحاد اور یگانگت ہے اور ایک دوسرے کے ادب، زبان، کلچر کو سمجھنے کی جو کوششیں جاری ہیں اس کا ایک بڑا اہم ثبوت یہ ہے کہ جہاں اُردو ادیب بنگالی ادب سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے شہ پاروں کو اُردو زبان میں ڈھال رہے ہیں وہاں خود بنگالی ادیب بھی اُردو ادب سے واقف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے اب تک جو کام کیا ہے وہ ہر طرح سراہنے کے لائق ہے۔ غلام مصطفےٰ نے اقبال کے کلام کا خاصہ حصہ بنگالی زبان میں منتقل کیا ہے۔ اطور رحمٰن نے اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں مثلاً کرشن چندر، منٹو، غلام عباس، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، عصمت چغتائی، قرت العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے افسانوں کا بنگالی زبان میں ترجمہ کر کے دو مجموعے ترتیب دیئے ہیں۔ نرلش داس گپتا نے فیض احمد فیض کی بیشتر نظموں اور غزلوں کا بنگالی میں ترجمہ کیا ہے اور کوشش کر رہے ہیں کہ اسے کتابی شکل میں شائع کر دیں۔ اس مجموعے کی کچھ چیزیں بنگالی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اتحاد اور مل جل کر کام کرنے کی خواہش نے مشرقی پاکستان کے بنگالی اور اُردو ادیبوں کو قریب سے قریب تر کر دیا۔ یہاں کی ادبی اور جمہوری تحریکوں کو آگے بڑھانے میں دونوں یکساں طور پر کوشاں ہیں جسکی وجہ سے یہاں کی ادبی فضا میں ایک ہم آہنگی اور نظریاتی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ شعور بنگالی اور اُردو کے ادیبوں کے باہمی تعلق، اتحاد اور یگانگت کے ادبی ماحول کو اس طرح نکھار دیا ہے جس طرح بادل گھٹاؤں کے برس کر گزر جانے کے بعد ہلکی سی دھوپ نکل آتی ہے اور فضا دھل کر اور صاف و شفاف ہو کر نکھر جاتی ہے۔

یہاں اتنے سارے ادیب اور شاعر ہوں گے وہاں ادبی انجمنوں کا وجود لازمی ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں چھوٹی چھوٹی اتنی ساری انجمنیں ہیں کہ ان کا نام گنانا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن ان میں کچھ انجمنیں ضرور ایسی ہیں جن کا ذکر ناگزیر ہے اس لئے کہ ادبی تحریکوں کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے کے لئے ادبی انجمنوں کا قیام ضروری ہے۔ کچھ انجمنیں تو ایسی ہیں جن کا واحد مقصد ماہانہ طرحی مشاعرے منعقد کرنا ہے۔ مشاعرے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کلاسیکی عہد میں مشاعرے نے اُردو شاعری کو مقبول بنانے اور فروغ دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مشاعرہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آج جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور اساتذہ سے کلام پر اصلاح لینے کی جگہ بحث و مباحثہ نے لے لی ہے یعنی آج جب ادیبوں میں سر جوڑ کر بیٹھنے اور ادبی مسائل پر بحث و تبصرہ اور تنقید کر کے راہ نکالنے کا رواج عام ہے۔ صرف مشاعرے اور مشاعرے کی واہ واہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اب مشاعرے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ مشاعرہ آج بھی اہم ہے لیکن اسکی نوعیت بدل چکی ہے آج سیاسی، سماجی اور اقتصادی تغیرات جہاں زندگی کو نئے سانچے میں ڈھال رہی ہیں، وہاں ادب اور ادبی نشستوں کے طریق کار پر بھی اپنا اثر ڈال رہا ہیں۔ آج مشاعرے ایسے ہونا چاہیں جو مختلف نظریات رکھنے والے ادیبوں کے لئے ایک ادبی پلاٹ فارم کا کام دے سکیں اور جو مخصوص ہونے کے بجائے عوامی حیثیت کے مالک ہوں۔ اب اس قسم کے مشاعرے کلکتہ اور احمد آباد وغیرہ میں ہوتے ہیں جہاں خواص کے علاوہ عوام پچیس تیس ہزار کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے ڈھاکہ میں کچھ انجمنیں ایسی ہیں جو پرانی طرز کے مشاعرے منعقد کرتی ہیں اور اسی کو ادبی خدمات سمجھتی ہیں۔ ایسی انجمنوں میں بزم آصفی، غنچۂ ادب، بزم شاکری، بزم ملامت و الرحمٰن اور حریم ادب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں

ایسی انجمنیں بھی ہیں جن کا مقصد صرف شاعرہ بازی نہیں بلکہ جو ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ نشستیں کرتی ہیں۔ جن میں لوگ اپنی نظمیں، غزلیں، افسانے اور تنقیدی مضامین پڑھتے ہیں اور پھر ان پر بحث و تبصرہ ہوتا ہے۔ بحث و تبصرہ سے ادب میں نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور اس لئے ایسی انجمنوں کا قیام ادب کے لئے فال نیک ہے۔ اس قسم کی انجمنوں میں مرکز ادب مشرقی پاکستان ڈھاکہ، انجمن ادب، دبستان فکر و نظر، بزم احباب تو قابل ذکر ہیں۔ چاٹگام میں حکیم ناطق لکھنوی کے صاحبزادے رشید احمد رشید کی کوششوں سے انجمن تعمیر پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا جسنے وہاں کی ادبی تحریکوں میں جمہوری اقدار پیدا کرکے انہیں صحیح سمت عطا کی۔ رشید احمد رشید نے چاٹگام کے ادیبوں میں جو شعور پیدا کیا ہے اسکے لئے وہ ہر طرح قابل مبارکباد ہیں۔

اب سے چھ سات سال پہلے انجمن ترقی اردو ڈھاکہ کچھ تاجروں اور ان کے کاسہ لیسوں کے ہاتھ میں تھی جو اسے کچھ کلب اور کچھ اپنے تجارتی مفاد کو آگے بڑھانے کا ذریعہ سمجھ رہے تھے۔ یہاں کے کچھ سر پھرے ادیبوں نے انجمن کو اسکی صحیح ادبی شکل دینے کے لئے جمہوری طریقے اختیار کئے اور انجمن کو تاجروں سے نجات دلاکر اسے ادیبوں کی انجمن بنا دیا۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں انجمن کے قوائد و ضوابط کے علاوہ اسکی پالیسی میں بھی بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا پڑیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے ادبی رہنمائی کی فکر میں انجمن میں پھر رخنہ پیدا کردیا اور ابتک انجمن چند لوگوں کے ہاتھ میں رہ گئی ہے اور چونکہ اسکو یہاں کے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد کا تعاون حاصل نہیں ہے اس لئے اس کا دائرۂ عمل بہت محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ جن ادیبوں نے انجمن کو نئی شکل دینے میں شدید مخالفت کا سامنا کیا اور غیر ادبی قسم کے لوگوں کی چودھراہٹ سے نجات دلائی اب انہیں لوگوں کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن ترقی اردو کے موجودہ کارکنوں کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کی ادبی انجمنیں جس قدر براڈ بیڈ (Broad Based) ہوں گی اسکی ترقی اسی قدر روز افزوں ہوگی۔ انجمن اور اسکی ممبری کو محدود کردینا انجمن کی بقا کی نہیں بلکہ اسکی موت کی دلیل ہے۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے آدر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے یہاں اردو شاعروں کی بہتات ہے جن میں لازمی طور پر اچھے بھی ہیں اور برے بھی صرف ڈھاکہ میں شاعروں کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ غزل کہنا جس قدر آسان ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی رات بھر کا شاعرہ کرنا چاہے تو خطیب سہسوانی، زاہد عظیم آبادی، راز کلکتوی، جنون۔ نسیم ردولوی، قدسی ناگپوری، عبدالرحمٰن مجاہد، ضمیر عمادی، اختر چھپروی، وحیدالدین ہنٹر، شہر جعفری، اور صغیر بنارسی وغیرہ کو مدعو کرنا ضروری ہے۔ بڑے شاعروں میں ان لوگوں کی موجودگی صحیح معنوں میں سامعین کے لئے تفریح کا باعث ہوتی ہے لیکن مخصوص نشستوں میں ان کی موجودگی توازن قائم نہیں رہنے دیتی۔

کرنا پھلی (بسلسلہ صفحہ ۳۶۶)

ہزاروں فیٹ کی بلندی پر سے دریائے کرنا پھلی میں چھلانگ لگائے گا۔

بادشاہ رات بھر نہ سو سکا۔ سوچتا رہا کہ وہ کس مخمصے میں پھنس گیا۔ سوچتے سوچتے آخر شب آنکھ لگ گئی۔ دیکھا ایک بوڑھی عورت آئی ہے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ بولی "نہ گھبراؤ، بادشاہ۔ اس لڑکے کو کچھ نہ ہوگا۔ تم چار بڑے بڑے تکیے۔ ان میں خوب اچھی طرح روئی بھر کے۔ شہزادہ کے جسم میں لپیٹ دو۔ پھر اسے ایک بڑی سی کھلی ہوئی چھتری دو۔ وہ پہاڑ پر سے چھلانگ لگائے گا۔ دھیرے دھیرے پانی میں اتر آئے گا۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ وہ تیر کے دریا عبور کرے گا۔" اسی اثنا میں ایک مرغ نے بانگ دی۔ بادشاہ اٹھا۔ وہ بوڑھی عورت جیسے فضا میں تحلیل ہوگئی۔

صبح کے وقت پھر لوگ دور دور سے تماشا دیکھنے کے لئے آئے۔ بادشاہ نے شہزادہ کے جسم میں چار بڑے بڑے تکیے لپیٹ دیئے اسے ایک بڑی سی کھلی چھتری دی۔ شہزادہ بے خوف و خطر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اوپر سے چھلانگ لگائی۔ تو دھیرے دھیرے پانی میں اتر آیا۔ لوگ متحیر رہ گئے۔ وہ تیرتا ہوا دریا عبور کر گیا۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ نے فوراً اس سے اپنی بیٹی کو بیاہ دیا۔ اور اسے اپنی سلطنت کا ولی عہد مقرر کیا۔

وہ پہاڑ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ چکما زبان میں 'جامائی مرونی' یعنی "شوہر کا قاتل" کہلاتا ہے۔ یہ دریائے کرنا پھلی کے کنارے "چیموران" پر واقع ہے۔ اب "سیتا پور" فارسٹ ریزرو، کا ایک حصہ ہے۔

نسیم احمد

مشرقی پاکستان میں ماہی گیر

قدرت نے مشرقی پاکستان کی زمین کو اگر زرخیز بنایا ہے تو اس کے دریاؤں اور تالابوں میں بھی دولت بھر دی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشرقی پاکستان جانے والوں کو اس کے پھل پھول، ہریالی، سبزہ اور قدرتی مناظر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں لیکن اس کے دریاؤں اور تالابوں میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو پانی کے نیچے خزانہ نظر آئے گا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ قدرت نے مشرقی پاکستان کے دریاؤں اور تالابوں کو اشرفیوں سے بھر دیا ہے ——— جن کو گننا انسان کی بس کی بات نہیں۔

دھان اور پٹ سن کی کاشت کی طرح مشرقی پاکستان میں مچھلیوں کی پرورش بھی اہمیت رکھتی ہے۔ بنگال کے مانجھی اور ماہی گیر تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جس طرح مانجھی آسمان کو دیکھ کر طوفان کی آمد کا پتہ دے سکتا ہے اسی طرح ایک ماہی گیر پانی کی لہروں اور ندی کی چوڑائی سے مچھلیوں کے ہونے نہ ہونے کا اندازہ بھی لگا سکتا ہے ——— دونوں اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ چاول اور مچھلی مشرقی پاکستان کی مرغوب غذا ہے۔ کسان ایک طرف زمین کا سینہ چیر کر دھان پیدا کرتے ہیں تو دوسری جانب ماہی گیر گہرے دریاؤں کو کھنگال کر مچھلیاں حاصل کرتے ہیں۔ دھان اگانے کی نسبت مچھلیاں پکڑنا زیادہ خطرناک اور ہمت کا کام ہے۔ ماہی گیر بپھری ہوئی موجوں میں کشتی ڈال دیتے ہیں اور ساری ساری رات مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ اس اثنا میں طوفان سے بھی پالا پڑتا ہے لیکن وہ ہمت کا دامن نہیں چھوڑتے۔

پاکستان میں مشرقی پاکستان ہی ایسی جگہ ہے جہاں کم و بیش پندرہ بڑے بڑے دریاؤں کے علاوہ صرف تالابوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے کھال اور ندی نالوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ برسات کے دنوں میں تمام ڈھلوان علاقوں میں پانی بھر جانے کی وجہ سے اَن گنت مصنوعی جھیلیں اور تالاب بن جاتے ہیں۔ پانی کی یہ فراوانی مشرقی پاکستان کو ہمیشہ سرسبز رکھتی ہے اور خزاں میں بھی بہار کا سماں رہتا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان تالابوں اور دریاؤں سے صرف ہاتھ کے بنے ہوئے جال سے سالانہ تین کروڑ سولہ ہزار من مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ اگر نئے طریقوں پر شکار کیا جائے تو یہ تعداد دس گنا بڑھ جائے گی۔ یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ مشرقی پاکستان میں مچھلیوں کی کل کتنی قسمیں ہیں لیکن ماہی گیروں کا کہنا ہے کہ اب تک سوا چار سو قسم کی مچھلیاں مل سکتی ہیں۔ ان میں مانگر، سدھو، سیلن، قتلا، بھیٹکی، کال باؤس، کوئی، مورالا اور بالنق یا تار بہت مشہور ہیں۔ انکو بیسیوں طرح بھون کر یا رکا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ میٹھے پانی کے علاوہ کھاری پانی میں بھی مچھلیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ سندربن اور کھلنا کے علاقے میں کھاری پانی کی مچھلیوں کا خوب شکار ہوتا ہے۔ اس پانی میں ایک سو بیس قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ بارش کے دنوں میں جب ندی نالے اُبل پڑتے ہیں تو بے شمار مچھلیاں بہہ کر دھان اور پٹ سن کے کھیتوں میں پہونچ جاتی ہیں۔ اس وقت گاؤں کے بچے مٹی ڈال کر کھیت کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ بچے ان مچھلیوں کو بھون کر کھاتے ہیں اور بہت خوش ہوتے ہیں ——— یہ اُن کے لئے ایک طرح کی پکنک ہے۔

مشرقی پاکستان میں کُل سترہ ضلع ہیں۔ ہر ضلع میں نہ صرف مچھلی کے شکار کا طریقہ الگ الگ ہے بلکہ جال کے نام بھی جدا جدا ہیں۔ ایک ہی جال کا نام دوسرے ضلع میں بدل جاتا ہے۔ ہر جال خاص قسم

کی مچھلی کے شکار کیلئے ہوتا ہے اور سال کے مخصوص مہینے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جال کی قسمیں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں آٹھ چھوٹے چھوٹے بھالے اور تیر جیسے اوزار بھی شامل ہیں جن سے مچھلی پر نشانہ لگا کر شکار کیا جاتا ہے اس شکار میں بڑی مہارت اور مشق کی ضرورت ہے، جھیل کنارے شکاری اوزار لیکر تاک میں کھڑا رہتا ہے، جونہی مچھلی پانی کی سطح کے قریب آتی ہے شکاری فوراً حملہ کرتا ہے اور مچھلی اس میں پھنس جاتی ہے۔ اس قسم کا شکار بہت کم ہوتا ہے عام طور پر جال سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ اسکی لمبائی اور چوڑائی مختلف ہوتی ہے۔ سب سے بڑا جال پانچ ہزار فٹ لمبا ہوتا ہے بعض اوقات اس میں چھوٹے چھوٹے جال جوڑ کر اور بھی بڑا بنا لیا جاتا ہے۔ ایسے جال کو گوگن جال بھی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی لمبائی کے لحاظ سے مہا جال یعنی بڑا جال بھی کہتے ہیں۔ اسے بڑے بڑے دریاؤ مثلاً میگھنا، پدما اور برہم پترا میں استعمال کرتے ہیں۔ دریا کی گہرائی کا اندازہ کرکے اس کی چوڑائی بڑھالی جاتی ہے تاکہ دریا کی تہہ تک جال کا پھیلاؤ جاسکے۔ رات کے وقت جب ندیوں اور دریاؤں میں اسٹیمروں اور کشتیوں کی آمد و رفت بالکل کم ہوجاتی ہے اور ہر طرف سکون ہوجاتا ہے تو جال کو پانی میں ڈال کر اسکے چاروں کونوں کو کشتیوں میں باندھ دیتے ہیں نچلے حصے کی رسی بہت لمبی ہوتی ہے تاکہ جال تہہ تک جاسکے۔ کشتیاں دھیرے دھیرے چلتی رہتی ہیں اور ماہی گیر جال کو دیکھتے رہتے ہیں۔ رات بھر یہ شکار جاری رہتا ہے اس اثناء میں بیشمار مچھلیاں پھنس جاتی ہیں۔ صبح سویرے جب ماہی گیر جال کھینچتے ہیں تو مچھلی کو دیکھ مچھلیاں دیکھ کر ان کا جی خوش ہوجاتا ہے لیکن انکو یہ خوشی بڑی محنت کے بعد ملتی ہے۔ اکثر اوقات شکار کے دوران اچانک طوفان آجاتا ہے تو ناؤ ڈولنے لگتی ہے۔ اس وقت جان بچانا مشکل ہوجاتا ہے۔ مچھلی کا شکار کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے لیکن ماہی گیروں نے تجربہ سے یہ بات معلوم کرلی ہے کہ رات کا وقت بہت مناسب ہے کیونکہ اس وقت پانی کی سطح پر ٹھہراؤ ہوتا ہے لہذا ساری مچھلیاں اوپر آجاتی ہیں۔

ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، پبنا، راج شاہی اور بوگرہ میں دوشن جال کا استعمال ہوتا ہے۔ اسکی لمبائی تین سو فٹ سے ڈیڑھ ہزار فٹ تک ہوتی ہے، ٹھنگرا، کاشی باؤلی اور ہالسنی پاتا کا شکار اسی سے ہوتا ہے۔ کھرچی جال سے صرف باقر گنج میں ستمبر سے فروری تک بھیٹکی اور پودا کا شکار کیا جاتا ہے۔ گھوچو میں جال بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے عموماً بچے استعمال کرتے ہیں اور بڑی آسانی سے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ چالنش جال کھلنا میں نومبر سے جون تک مختلف قسم کی مچھلیوں کے شکار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح خیتگالیہ، جھاؤ پاتا، موٹیا، آنگنتا اور دوسرے بہت سے جالوں کو ماہی گیر خاص وقت میں استعمال کرتے ہیں۔ جال کے علاوہ تنکوں کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ڈبکس اور ٹوکریوں سے بھی مچھلی کا شکار کیا جاتا ہے۔ تنکے کے جال کی چھبیس ۲۶ قسمیں ہیں۔ ان میں جھانگا، پادڑ اور سنگھی چھائی بہت مشہور ہیں۔ سنگھی چھائی لمبے ڈھول کی طرح ہوتی ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی مچھلی "سنگھی" کا شکار کیا جاتا ہے۔ ماہی گیر رات بھر کی محنت سے جو مچھلیاں شکار کرتے ہیں ان کو صبح گاؤں کے بازار میں لے جاکر بیچ دیتے ہیں یہی مچھلیاں پھر شہر کے بازاروں میں آجاتی ہیں —

پچھلے کئی برسوں سے مچھلیوں کی باضابطہ پرورش ہو رہی ہے اور غیر ملکوں سے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں منگا کر تجربے کئے جا رہے ہیں۔ حال میں سنگاپور اور تھائی لینڈ سے تین قسم کی مچھلیاں پرورش کرنے کیلئے منگوائی ہیں۔ ان میں تلاپیہ مچھلی کو مشرقی پاکستان کی آب و ہوا راس آگئی ہے۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ ایک جوڑا تلاپیہ مچھلی سالانہ کم از کم دس ہزار مچھلیوں کا اضافہ کرسکتی ہیں۔ اگر تلاپیہ کے ایک لاکھ جوڑے پانی میں ڈال دیئے جائیں تو سال بھر میں ایک ارب مچھلیاں پیدا ہوں گی — اس طرح مچھلیوں کی نسل میں حیرت ناک اضافہ ہوجائے گا —

نسیم احمد۔

مشرقی پاکستان کے میلے

مشرقی پاکستان آب و ہوا، رنگا رنگ موسم نے یہاں کے لوگوں کو سادہ لوح و خوش مزاج بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ کسی ملک کے کھیل کود اور میلوں ٹھیلوں میں وہاں کے باشندوں کی طبیعت کو دخل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے میلے جدا جدا ہوتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے خوبصورت مناظر، حسین پھولوں کی طرح وہاں کے میلے بھی رنگین اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دریاؤں اور ندیوں کے اس دیس میں ہر شام کو میلہ لگتا ہے یہ سچ بھی ہے۔ شام کے وقت گھاٹوں میں رنگ برنگ کی سینکڑوں کشتیاں ایک قطار میں نظر آئیں گی، ان کشتیوں میں ناریل کیلے انناس، سبزیاں، کھلونے، بانس اور دنیا بھر کا سامان لدا نظر آتا ہے، بازار لگتا ہے ریل پیل ہوتی ہے لوگ خرید و فروخت میں مصروف نظر آتے ہیں، کھیل تماشے اور کرتب سب کچھ دیکھنے کو ملتے ہیں،

یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ مشرقی پاکستان میں کل کتنے میلے ہوتے ہیں اور کون سا میلہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ میمن سنگھ، رنگ پور، ڈھاکہ، چاٹگام، بوگرہ، نواکھالی، راج شاہی اور باقر گنج کے میلے مشہور ہیں، یہ میلے سال کے بارہ مہینے کسی نہ کسی شکل میں ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو ہفتوں جاری رہتے ہیں، موسم کے اعتبار سے بھی میلے ہوتے ہیں۔ ہر موسم میلوں اور خوشیوں کا پیغام لیکر آتا ہے، غلہ ہارے کسانوں اور ماہی گیروں کے گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، سب سے زیادہ خوشی بچوں کو ہوتی ہے کیونکہ انہیں نئے نئے کھلونے ملتے ہیں، میلے کا دن جوں جوں نزدیک آتا ہے خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ تیلی اور سادہ سا سامان بنانے والے طرح طرح کی چیزیں بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، سب سے زیادہ کمہار کو کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ مٹی کے کھلونوں کی مانگ بہت ہوتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے میلے کا دن قریب آ جاتا ہے۔ گاؤں کے ہرے بھرے میدانوں میں یا دریاؤں کے کنارے میلہ لگتا ہے، چہل پہل اور رونق کا کیا کہنا! اس سرے سے اس سرے تک دکانیں سجی ہیں۔ روزانہ استعمال کے گھریلو سامان اور سجاوٹ کی دلچسپ چیزیں بڑی کثرت سے فروخت ہوتی ہیں۔ کھلونے تو اتنے ملتے ہیں کہ بس مت پوچھئے، گڑیاں، شیر، ہاتھی، گھوڑے، پولیس اور سفید بالوں والا بڈھا ماجھی کے یہ سارے کھلونے بچوں کی نظریں اپنی جانب موڑ لیتی ہیں۔ کھیل تماشے بھی ہوتے ہیں۔ بنگال کے جادو کے بارے میں تو سنا ہوگا، ان میلوں میں سچ مچ کا جادو بھی دکھایا جاتا ہے۔ جادوگر اپنے جادو دکھا کر چھوٹے بڑوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے ہر ضلع کا میلہ اپنی قسم کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے وہاں بعض میلے ایسے ہیں جو پورے مشرقی پاکستان میں یکساں ہیں۔ مثلاً کشتی رانی کا مقابلہ ــــ یہ ایک طرح کا میلہ ہوتا ہے۔ سردی کے شروع دنوں میں جب دریاؤں کا زور تھم جاتا ہے اور لہروں کی روانی میں نرمی آجاتی ہے تو مشرقی پاکستان کے کونے کونے سے ماہر ملاح آکر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ کیلئے میگھنا، برہمپترا، دھلیشوری یا بوڑھی گنگا کا انتخاب ہوتا ہے اور پھر ملاح اپنی قوت اور فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، دریا کی لہروں پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بجلی کی طرح سنسناتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ ساحل سے ہزاروں لوگ قوت اور بہادری کا یہ منظر دیکھتے ہیں۔ اول آنیوالے کو انعام اور تحفوں سے

نوازا جاتا ہے۔

سال میں دو بار دھان کی فصل کٹتی ہے۔ فصل کٹنے کے بعد میلہ لگتا ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خاص طور سے نیا چاول فروخت ہوتا ہے جس کی کھیر بہت لذیذ ہوتی ہے اور لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ برسات کے موسم میں جب چاروں طرف جل تھل ہوتا ہے تو رتھ پوجا کا تہوار منایا جاتا ہے، اس دن بہت بڑا میلہ لگتا ہے لوگ بارش میں بھیگ کر میلے میں جاتے ہیں۔ اس موسم کے لحاظ سے میلے میں دوسری چیزوں کے علاوہ پھل اور پھول کے پودے کثرت سے فروخت ہوتے ہیں۔ برسات کا موسم پودوں کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ ایک بالشت زمین کھود کر پودا دبا دیجئے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے پھل پھول آنے لگتے ہیں، رتھ پوجا کے علاوہ درگا پوجا اور ہندوؤں کے دوسرے تہواروں میں بھی بڑے بڑے میلے لگتے ہیں۔ عیدالفطر عید میں تو میلوں کا کوئی شمار نہیں ہوتا پورا مشرقی پاکستان میلے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے

چاٹگام میں ایک جگہ ہے رنگونیہ۔ چیت کے مہینے میں یہاں بدھ مذہب کے ماننے والوں کا بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ اس میلہ کا نام ہے راجیا رہاٹ میلہ، جو کئی دنوں تک جاری رہتا ہے مشرقی پاکستان کے ہر حصے سے بدھ مذہب کے لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں اور خوب خوشیاں مناتے ہیں، اس کے چند دنوں کے بعد ہی ابوتراب میں کشتی لڑنے والوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اکھاڑہ سجایا جاتا ہے۔ دور دور سے پہلوان آتے ہیں اور دو دو ہاتھ کشتی کے ہوتے ہیں پھاگن اور ماگھ کے مہینے میں کشتیا ضلع میں زرعی میلہ دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ یہ میلہ آمول میلہ کہلاتا ہے۔ اس میں مویشیوں کی نمائش بھی ہوتی ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔ اس نمائش میں حصہ لینے والے مہینوں پہلے سے مویشیوں کی خاص طور پر خدمت کرتے ہیں اور کھلا پلا کر موٹا تازہ بنا دیتے ہیں ــــــ دلہن کی طرح سجی سجائی گائیں، عربی نسل کے گھوڑے اور موٹے تازے بیل نمائش میں پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے مالکوں کو انعام ملتے ہیں ــ

ہر سال عید کے دوسرے دن راج شاہی میں راج پور کاشا نذار میلہ لگتا ہے، اس میلے کی تیاریاں رمضان کا چاند دیکھنے کے بعد ہی شروع کر دی جاتی ہیں۔ رمضان کا پورا مہینہ اس کی تیاریوں میں گذر جاتا ہے ــــ عید کے دوسرے ہی دن صبح سویرے لوگ اپنے گھروں سے چل پڑتے ہیں ــــ دوسرے ضلعوں سے بھی ان گنت آدمی میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ تجارت کی غرض سے اور کچھ سیر و تفریح کیلئے آتے ہیں۔ شہر کے لوگ اس میلے کو عید ملن کا میلہ بھی کہتے ہیں

رنگ پور ضلع میں ایک جگہ ہے لال منیر ہاٹ' کارتک کا مہینہ آتا ہے تو مقامی لوگ میلہ سجاتے ہیں ــ اس کا نام بودری میلہ ہے اس میلے میں رات کے وقت جب لوگوں کا ہجوم کم ہو جاتا ہے، تو ایک چھوٹے سے اسٹیج پر ڈرامہ میں حصہ لینے والے کسان اداکاری کیر ہوتے ہیں لوگ آدھی آدھی رات تک دلچسپی کے ساتھ ڈرامہ دیکھتے ہیں، غرض یہ کہ مشرقی پاکستان میں کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا جب میلہ نہ لگتا ہو +

گھومی (بسلسلہ صفحہ ۲۶۴)

ساتھ رکھتے ہیں۔ کھلاتے پلاتے ہیں۔ پھر مار ڈالتے ہیں۔ یا بھگا دیتے ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے یہ لوگ بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں حلف اٹھانے کا دستور بہت دلچسپ ہے۔ گھٹنے بھر پانی میں اتر کے پانی پی کر۔ کسی جانور کا خون ملاتے ہیں۔ اسے شراب کے ساتھ غٹ غٹ پی جاتے ہیں حلف اٹھاتے ہیں کہ مرتے مر جائیں گے۔ لیکن قبیلہ کا راز کسی کو نہ بتلائیں گے اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے۔ راز دار اس قدر ہوتے ہیں کہ منہ سے بھاپ تک نہیں نکلنے دیتے۔

نسیم احمد

مشرقی پاکستان کی لوریاں

گذشتہ چودہ پندرہ سال میں مشرقی پاکستان کے ادب میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں - نئے نئے ادیب شاعر ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگانے لگے۔ نئی پود کے لکھنے والوں نے اپنے لئے بالکل جداگانہ راہ نکالی پرانے اور فرسودہ خیالات سے نئے اور انقلاب انگیز تصورات نے جنم لئے۔ گل و بلبل کی ہزاروں داستانوں کی جگہ عوامی زندگی کی داستان نے لے لی - جدید بنگالی ادب کا مطالعہ کرتے وقت ہم عوام سے باتیں کرنے لگتے ہیں اور ہماری آنکھوں میں ان کی زندگی کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں - نئے ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کے ادب میں بھی خوشنما گل بوٹے کھلائے - زیر نظر مضمون میں مشرقی پاکستان کی لوریوں کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔

لوریوں کے بول کم و بیش ہر ملک میں یکساں ہوتے ہیں البتہ ماحول اور فضا کے لحاظ سے تھوڑی بہت تبدیلی ہوتی ہے مثلاً مشرقی پاکستان میں لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں - پٹ سن اور بانس کے جھنڈ ہیں دریا ہیں اور ندی نالوں کا جال بچھا ہوا ہے گھنے گھنے خوفناک جنگل ہیں اور ان جنگلوں میں خونخوار جانوروں کا ڈیرا ہے شیتل میٹھے گیت سنانے والی چڑیاں ہیں - جھیلیں اور دلدلیں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی لوریوں میں ماحول کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہاں کی مائیں جب اپنے بچوں کو نیند کی وادیوں میں لے جانے کے لئے لوریاں سناتی ہیں تو ان لوریوں میں کھیتوں، دریاؤں، جنگلوں، جانوروں اور طوفانوں کا ذکر آجاتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے مثلاً ایک لوری کا ترجمہ ملاحظہ ہو ---

آنکھ کا تارا سو جا!
سو جا کل تو راج کرے گا
[illegible] کا تو مہاراج بنے گا
سب کے دکھ درد مٹا کر
دل کا سہارا سو جا!
طوفان تیرا ساتھی ہوگا
جس پر تیری سواری ہوگا
شیر ببر اور ہاتھی گھوڑے
کھڑے رہیں گے ہاتھ کو جوڑے
راج دلارا سو جا!
پدما، جمنا، بوڑھی گنگا،
بل کھاتا، لہراتا بہنا
پٹ سن اور یہ دھان کے خوشے
تو ان کا، وہ تیرے ہوں گے
میرا پیارا سو جا!

لوری میں ماں اپنی دل کی آرزوؤں کا بھی اظہار کرتی ہے مثلاً ایسے پیارا ... کیا ہے۔ پرانے زمانے کی لوریوں میں ہر ماں کی تمنا یہ ہوتی تھی کہ اس کا لال بڑا ہو کر بادشاہ بنے اور ملک پر راج کرے - لیکن زمانہ بدلا۔ تبدیلی کے ساتھ ساتھ جہاں اور بہت سی چیزیں بدلتی رہتی ہیں اسی طرح لوریوں کے بول بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں - جب ہم آزاد نہیں ہوئے تھے تو ہماری مائیں اپنی لوریوں میں اپنے ننھے سے بچے سے کہتی تھیں کہ تم بڑے ہو کر اپنے وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرنا! مشرقی پاکستان کے دیہاتوں کی لوریوں میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے خوفناک جانوروں، کھیتوں، جنگلوں اور دریاؤں وغیرہ کا ذکر آتا ہے

باقی صفحہ

آجاتا ہے - ان کی مثال مندرجہ ذیل لوری میں ملے گی ــــ

پان کوڑی، پان کوڑی، نیندیں لیکر آ
میری بیٹی، میری پیاری گڑیا کو سلا
میرے گھر میں دانے بھی ہیں انے آ کر کھا
پان کوڑی، پان کوڑی نیندیں لیکر آ

پریوں کے تو دیس میں جا کر
ان کی خوشبوئیں بھر لاکر

بانس کے بن میں اڑ کر تیل آکاش پہ گا
پان کوڑی، پان کوڑی نیندیں لیکر آ

تھپیڑ طوفان سے ٹکر لے کر
دشمن کو تو چکمہ دے کر

چندا کے اس دیس میں جا کر
پان کوڑی، پان کوڑی نیندیں لیکر آ

پان کوڑی پانی میں رہنے والا ایک جانور ہے جو مشرقی پاکستان کے بچوں کا بڑا ہی محبوب دوست ہے - لوریوں کے علاوہ بھی مشرقی پاکستان میں آج کل جو نظمیں لکھی جا رہی ہیں ان میں پان کوڑی کا ذکر ضرور آتا ہے اس کے علاوہ اور بھی دوسرے بہت سے پالتو جانور اور پرندے ہیں جن کا تذکرہ نظموں اور لوریوں میں ہوتا ہے۔

لوری سناتے وقت مائیں اپنے بچوں کے دلوں میں ڈر اور خوف پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں کیوں کہ اس طرح بچے بزدل ہو جاتے ہیں وہ ان کی ہمت بندھاتی ہیں - انہیں بہادروں اور جوانمردوں کی باتیں بتاتی ہیں اور ان کی شجاعت اور دلیری کی کہانیاں سناتی ہیں، مثلاً اس لوری میں بنگال کی ماں اپنے بچے کے ساتھ کیسی الفت و محبت کا اظہار کرتی ہے ـــــ

سو جا، میرے راج دلارے، سو جا میرے چاند
نکلے ہیں آکاش پہ دیکھو کتنے تارے چاند
چیخ رہا ہے کیوں میرا منا، رونا دھونا کیسا
چندا ماموں کیسا سندر جیسے اس کا چہرا
سو جا میرے پیارے بچے ماں کی گود میں سو جا
کیوں اٹھا ہے چونک کے ایسے سو جا ننھے سو جا
سو جا میرے راج دلارے، سو جا میرے چاند
نکلے ہیں آکاش پہ دیکھو کتنے تارے چاند

سو جا میری گود میں پیارے، سو جا میرا ننھا
کیوں ڈر لے گی دھرتی اپنی کیوں ڈولے گا چندا
سزا اسی کو ہو گی منے جس نے کئے ہیں پاپ
میرا منا نیک ہے کتنا کیوں کاٹے گا سانپ

سو جا میرے راج دلارے سو جا میرے چاند
نکلے ہیں آکاش پہ دیکھو کتنے تارے چاند

بنگالی ادب میں لوریوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اگر مشرقی پاکستان کے گاؤں اور دیہاتوں میں گھوم کر لوریاں جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائیگی - ایسی لوریوں کے خالق نامعلوم کسان اور مانجھی ہوتے ہیں - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص گنگناتے گنگناتے مصرعہ بن جاتا ہے - جب یہ مصرعہ دوسرے کے کانوں میں پہنچتا ہے تو وہ بھی گنگناتا ہے اور خود بخود مزید مصرعوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اس طرح قلیل وقت میں ایک لوری کی تخلیق ہو جاتی ہے اس کے الفاظ بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں، ایسی لوریاں عموماً گاؤں میں پسند کی جاتی ہیں - اس قسم کی لوریوں کو ہم قدیم لوریوں میں شمار کریں گے کیوں کہ ان میں شاعری کے قوانین کا خیال نہیں رکھا جاتا، آج کل جو لوریاں لکھی جا رہی ہیں وہ اصول شاعری کی مکمل پابند ہوتی ہیں - ان میں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر ایسے خیالات کا پرچار کیا جاتا ہے جو بچوں کے کردار کی تعمیر میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں - دیہات اور شہر کی لوریوں میں یہی فرق نمایاں ہے، عموماً گاتے وقت موسیقی کا سہارا نہیں لیا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ لوری میں قدرتی طور پر موسیقی شامل ہوتی ہے اور سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گانیوالا ساز کے ساتھ گا رہا ہے، لیکن آج کل ڈھاکہ، چاٹگام اور دوسرے شہروں میں ہلکے پھلکے سازوں کی دل آویز دھنوں کیساتھ لوری گائی جاتی ہے، اس کے سننے والوں پر خواب کا سایہ لہرانے لگتا ہے، صرف بانسری کے جادو بھرے

نسیم احمد۔

مشرقی پاکستان کے موسم

مشرقی پاکستان کے موسم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں سال کے چھ مہینے صرف بارش ہوتی ہے۔ حقیقت میں ہے اپریل کے آخری ہفتے سے آندھیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ادھر دھیرڈھیلی اُدھر آسمان پر کالے کالے بادل جمع ہونے لگے۔ اور پھر ایسی زور کی بارش ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہ سلسلہ اکتوبر کے وسط تک رہتا ہے۔ جب ہی تو کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان بارش کا دیس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا یہ بازو نچلی علاقہ پر آباد ہے۔ اس کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ ہے جس کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے جس کی پگھلتی ہوئی برف کا پانی پہاڑ کی بلندی سے اُتر کر مشرقی پاکستان کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے پانی سے مٹی میں نمی پیدا ہوتی ہے اور سال کے بارہ مہینے ہریالی قائم رہتی ہے

مشرقی پاکستان میں موسم کے تین دور ہیں — جاڑا گرمی اور برسات ہر موسم چار چار مہینے کا ہوتا ہے لیکن مقامی لوگوں نے اپنی آسانی کے لئے، جاڑا گرمی اور برسات کو چھ حصوں میں تقسیم کر لیا ہے (۱) گریشو یعنی گرمی (۲) برشا یعنی برسات (۳) شرت کال یعنی فصل بونے کا زمانہ (۴) ہیمنت کال یعنی فصل کاٹنے کا زمانہ (۵) شیت یعنی جاڑا (۶) بسنت یعنی بہار۔ بنگالی سال کا آغاز گریشو یعنی گرمی سے ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کی ابتدا پھاگن چیت ہی میں ہو جاتی ہے۔ ان دو مہینوں میں تالاب کے پتے گر جاتے ہیں اور جیٹھ کے آتے آتے سورج کی حدت بڑھ جانے سے سارا بنگال جھلسنے لگتا ہے۔ ہوا کی شمبک۔ رفتاری بند ہو جانے سے حبس کا عالم ہوتا ہے۔ لوگ خدا سے مینہ اور پانی کی دعا مانگتے ہیں۔ مثلاً "اللہ مینہ دے پانی دے" خشک سالی کے موقع پر یہ دعا بنگال کے ہر علاقے میں مانگی جاتی ہے۔ اس موسم میں خوفناک طوفان بھی آتے ہیں، مکانوں کی دیواریں اور چھتیں تیز جھکڑ کی تاب نہ لا کر اڑ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ میگھنا، پدما اور بوڑھی گنگا میں پانی کا زور بڑھ جاتا ہے کالے کالے بادل خلیج بنگالہ سے اپنے دامن میں پانی لیکر اٹھتے ہیں اور آسمان پر چھا جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سنہرا دیس بنگال جل تھل بن جاتا ہے، سخت زمین نرم ہو جاتی ہے اور چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے

گرمی کا موسم جہاں اپنے ساتھ طوفان اور بارش لاتا ہے وہاں اپنی جھولی میں مزے مزے کے رنگ برنگ کے پھل پھول بھی لاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ پھل گرمی ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ آم، لیچی، کٹھل، اور بازار پھلوں سے بھر جاتے ہیں۔ کیلے ہر موسم میں ملتے ہیں لیکن گرمی میں اس کی پیداوار بڑھ جاتی ہے یہاں کے مشہور کیلے امرت ساگر اور سفری اسی موسم میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی مٹھاس اور خوشبو بہت تیز ہوتی ہے اور پورے بنگال میں مشہور ہیں۔ شادی اور بیاہوں میں پھلوں کے جو تحفے بھیجے جاتے ہیں ان میں امرت ساگر اور سفری کا ہونا ضروری ہے۔ کٹھل اور انناس یہاں کے خاص پھلوں میں شمار ہوتے ہیں، انناس کا شربت امرت رس سے کم نہیں ہوتا۔ پھلوں کیساتھ پھولوں کی پیداوار میں بھی حیرت ناک اضافہ ہو جاتا ہے۔ بیلا۔ شیفالی، چمپا، جارل اور رجنی گندھا باغوں میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے اندھیری رات

میں تحصیل مل کرتے تاہے۔ گرمی کے موسم میں ماجھی کو بڑا کام کرنا پڑتا ہے وہ پرانے جالوں کو مرمت کیا تھ نئے جال بُننے میں مصروف ہوجاتے ہیں کیونکہ گرمی کے بعد ہی برسات کی آمد آمد ہوتی ہے۔

اساڑھ کے شروع ہوتے ہی خاموش اور پرسکون ہلچل بڑھنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی چڑھ جاتا ہے، جدھر نگاہ اٹھتی ہے پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بنگال کا اصل روپ دیکھنا ہو تو برسات کے موسم میں مشرقی پاکستان کی سیر کیجئے۔ دن رات کی جھڑی ہوتی ہے۔ کالے بادل آتے ہیں اور پانی برسا کر چلے جاتے ہیں، ندی نالے دریا اور پوکھر سب اُبل پڑتے ہیں۔ میگھنا اور پدما کا زور بڑھتا ہے تو اسکی خوفناک لہریں ساحل کو توڑتی ہوئی میلوں دُور نکل جاتی ہیں۔ راستے میں سینکڑوں جھونپڑیاں، درخت کھیت اور باغ سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ہر سال برسات میں سینکڑوں کی تباہی ہوتی ہے لیکن پانی کے اُترتے ہی انسان پھر آباد ہونے لگتے ہیں، شرت کال یعنی بھادوں اور آسن کے آتے ہی خالی کھیتوں میں بیج بوئے جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی پھر مسکرانے لگتی ہے۔ کسان دھان کے لہراتے خوشوں کو دیکھتے ہیں تو اپنا سارا دکھ درد بھول کر خوشی کے گیت گانے لگتے ہیں، ہمنت کال یعنی کاتک اور اگھن میں ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ ان مہینوں میں کسان فصل کاٹتے ہیں اور کھلیان کو اناج سے بھر دیتے ہیں۔ نئے دھان کے چاول سے فیرنی کھیر اور طرح طرح کے پکوان پکا کر گاؤں بھر میں تقسیم کرتے ہیں اور خوب خوشیاں مناتے ہیں مشرقی پاکستان کے کسان اسے نبّو یعنی نیا دھان کہتے ہیں۔ یہ پُرانی رسم سینکڑوں سال سے چلی آ رہی ہے۔

اس کے بعد شیت یعنی جاڑا آتا ہے۔ پوس کی سردی گلابی ہوتی ہے۔ لیکن ماگھ کے آتے ہی اس میں تیزی آجاتی ہے، چونکہ یہ جاڑے کا آخری مہینہ ہوتا ہے اس لئے کبھی کبھی اچانک چھینٹے پڑ جانے سے سردی میں ایکدم سے اضافہ ہو جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ ماگھ کی اس سردی سے باگھ یعنی شیر ببر بھی ڈر جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی سردی اتنی شدید نہیں ہوتی کہ برداشت سے باہر ہو۔ سردی کے دنوں میں اکثر اوقات موسم اتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ سردی کا گمان تک نہیں ہوتا ——— یہاں تک کہ پھاگن سے بسنت رُت آجاتی ہے۔ بہار کے آتے ہی مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں جیسے کوئی جادو پھونک دیتا ہے۔ بلکے، ماندے لوگوں کے چہروں پر تازگی آجاتی ہے۔ دلوں دلوں میں نئے نئے ولولے پیدا ہونے لگتے ہیں ——— اور لوگ نئے سرے سے محنت و مزدوری میں لگ جاتے ہیں۔

لوریاں (بسلسلہ صفحہ ۳۴۷)

(بسلسلہ صفحہ ۳۴۷)

سُروں کے ساتھ یہ لوری گائی جاتی ہے، مشرقی پاکستان کی ایک اور لوری کا ترجمہ ملاحظہ ہو ———

ننھے دیکھو پھول!
ننھا اس کو دیکھے گا　　دیکھے گا مُسکائیگا
ننھے دیکھو چاندا!
چندا کتنا روشن ہے　　دل میں کیسی دھڑکن ہے
دیکھو اسکو پیار سے　　کرتا ہے اشارے
ننھے دیکھو خواب!
دھیرے دھیرے سو جاؤ　　ہولے ہولے سو جاؤ
رات ہے کتنی اندھیاری　　نیندیں جھولے نیا ہیں
سو جا میرے لال
سو جا میرے لال

نسیم احمد

مشرقی پاکستان کے جنگلات

جنگلوں سے انسان کی زندگی کا گہرا تعلق ہے آج سے ہزار سال پہلے جب تہذیب کا چراغ روشن نہیں ہوا تھا انسان جنگلوں ہی میں رہتا تھا جنگلی جانوروں کا گوشت اور جنگلی پھل اس کی خوراک تھے جانوروں کی کھالیں تن ڈھانکنے کا کام دیتی تھیں اور پتھروں کی رگڑ سے لکڑیوں کو جلا کر آگ حاصل کی جاتی تھی۔

آج کے تہذیب یافتہ دور میں انسان جنگلوں میں تو نہیں رہتا لیکن اس کی ضروریات زندگی کا بہت سامان جنگل ہی کی بدولت حاصل ہوتا ہے مثلاً کاغذ ماچس وغیرہ جیسی ضروری چیزوں کے لئے لکڑیاں جنگل ہی سے دستیاب ہوتی ہیں ان کے علاوہ ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح جنگلوں سے ضرور ہوتا ہے۔ زنجیریں کو لیجئے، لکڑی نہ ہوتی تو آج خوبصورت میز پلنگ اور کرسیاں کیسے بنتیں۔ ملک کی ترقی اور تعمیر کے لئے جنگل کا ہونا ضروری ہے۔ ترکی کے مرد غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جنگل کے بغیر ملک صحیح معنوں میں مادر وطن نہیں کہلا سکتا۔

ہمارے مادر وطن کا مشرقی بازو اس لحاظ سے بہت دولت مند ہے۔ دریاؤں اور ندی نالوں کی طرح وہاں جنگل بھی کثرت سے ہیں مشرقی پاکستان ۵۴ ہزار مربع میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں تقریباً ۹ ہزار میل تک گھنے جنگل ہیں جنگلوں کے اتنے طول طویل رقبہ کا سب سے بڑا حصہ چاٹگام کے علاقوں میں ہے جو ساڑھے پانچ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ بقیہ حصے ضلع کھلنا، میمن سنگھ، سلہٹ اور ڈھاکہ میں ہیں۔ یہ تو ہوئے گھنے جنگلوں کے خاص خاص علاقے جہاں دن کے وقت سورج کی روشنی بھی نہیں پہونچتی۔ ایسے ہی ایک جنگل سندر بن میں بنگال کے مشہور رائل ٹائیگر پائے جاتے ہیں جن کی لمبائی ۹ فٹ تک ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جنگل باخر بریسال، دیناج پور، راج شاہی، رنگ پور اور ٹپرہ میں بکثرت ہیں جو خونخوار جانوروں سے پاک ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے آس پاس انسانوں کی گھنی آبادی ہے۔ جنگلوں کے قریب بسنے والوں کی روزی کا سہارا یہی جنگل ہیں۔

پٹ سن کے بعد مشرقی پاکستان کی آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ وہاں کے جنگل ہیں۔ چند سال پہلے چاٹگام میں کاغذ سازی کا بہت بڑا کارخانہ تعمیر کیا گیا۔ کاغذ بنانے کے لئے لکڑیاں چاٹگام کے جنگلوں ہی سے لائی جاتی ہیں۔ آج کرنافلی ملز ملکی ضرورت سے زیادہ کاغذ تیار کر رہی ہے۔ ان ہی جنگلوں کی بدولت کھلنا میں اخباری کاغذ سازی کا کارخانہ بھی بنایا گیا۔ اخباری کاغذ بنانے کے لئے خاص قسم کی لکڑی کھلنا کے جنگلوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ آج ان دونوں کارخانوں کی بدولت سالانہ کروڑوں روپے کی بچت ہو رہی ہے۔ جنگلوں کی حفاظت اور ترقی کا کام ایک خاص شعبے کے ذمہ ہے جو ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے دن رات مصروف ہے۔ تحقیقات اور ریسرچ کے لئے انسٹی ٹیوٹ کھولے جا رہے ہیں۔ ابھی حال میں احمد پور، سری رام پور اور مدھو پور کے جنگلوں سے ایک خاص قسم کا پتہ حاصل کیا گیا ہے جس کا نام کمبھی ہے، یہ بیڑی بنانے کے کام آتا ہے بیڑی بنانے کا پتہ اب تک باہر کے ملکوں سے خریدا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں اب عام طور پر کمبھی پتے کی بیڑی بننے لگی ہے۔ ہمارے یہاں پان کا رواج عام ہے۔ لیکن پان میں لگانے کے لئے کتھا بیرون سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق اور تجسس کے بعد چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کے گھنے جنگلوں میں ایک ایسے درخت کا پتہ چلا ہے جس کے عرق سے بہترین قسم کا کتھا بنایا جا سکتا ہے۔ سلہٹ اور چاٹگام کے جنگلوں میں ایسے درخت تو نہیں ہیں جن سے ربر حاصل کیا جا سکے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ ربر حاصل کرنے کے لئے ان میں پودے لگا دیئے جائیں تو بڑی آسانی سے ربر کی کاشت کی جا سکتی ہے۔ کچے چمڑے کو پکانے کے لئے ایک خاص قسم کی چھال کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ چھال میمن سنگھ کے جنگل میں ملتی ہے۔ سلہٹ کے جنگل میں لمبی گھاس کا پتہ لگا ہے جس سے عمدہ قسم کا کاغذ بنایا جا سکتا ہے۔ جڑی بوٹیوں کی کھوج کے لئے الگ جماعت کام کر رہی ہے اسی طرح ایک اور جماعت شہد اکٹھا کرنے کا کام کرتی ہے۔ دیناج پور، راج شاہی اور رنگ پور کے جنگل "سال" کے درختوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سال سے سولہ جی کہتے

(الف ص ۳۵۶ بر ۲)

سوزوکی تاکشی

۲ ہفتے مشرقی پاکستان میں

بیسویں صدی میں ایک ملک سے دوسرے ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا، کوئی انوکھی بات نہیں رہی۔ سچ پوچھئے تو یہ بات کسی دور میں بھی غیر معمولی نہ تھی۔ مگر حقیقی طالب علم ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے طالب علم جو محبت بھرے دل اور کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کسی دوسرے ملک کے حالات و مسائل کا مطالعہ کرسکیں۔

سوزوکی تاکیشی ... سچ مچ طالب علم ہیں۔ دو سال پہلے وہ پاکستان آئے تو لوگوں نے انہیں بیگانہ جانا۔ مگر سوزوکی کو اس دیس اور یہاں کے لوگوں نے کہیں اجنبی پن نظر نہ آیا ــــ اُن کی آنکھوں میں بیگانگی کبھی نہ تھی، تجسس اور محبت تھی ــــ اور آج دو سال کے بعد پاکستان میں کم و بیش دو ہزار آدمی ایسے ضرور ہیں جو سوزوکی کے بارے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ جاپانی طالب علم، پاکستانی نہیں ہے اور جلد ہی اسے اپنے وطن واپس جانا ہے۔

سوزو تاکیشی نے جاپان میں اُردو کی معقول تعلیم حاصل کی اور پھر وہ حکومت پاکستان کے وظیفہ پر کراچی آئے تاکہ یہاں اپنے علم کو وسعت دیں، اپنے تلفظ پر صحت کی دھار رکھیں اور اُردو زبان کے ماحول اور ذہنی فضا سے اپنا رشتہ استوار کرسکیں۔ سوزوکی نے دو سال اس لگن کے ساتھ یہاں گزارے کہ گل کرسٹ اور گراہم بیلی کی لگن کی یاد تازہ ہوگئی ــــ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اُردو کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کر لیا ہے اور اب وہ جاپان جا کر ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو کا درس دیں گے۔

دو سال کے قیام پاکستان کے دوران سوزوکی صاحب نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے بہ مقام ذکر تمام اور تہذیبی و صنعتی مرکزوں کی سیر کی، جس کا اندازہ آپ کو ان کی اس پیاری تحریر سے ہوسکے گا۔

وہ اُردو میں تقریباً سارے مطالب پر پوری طرح قادر ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہی مضمون ہے۔

---

۸ فروری ۱۹۶۳ء کی رات کے گیارہ بجے میں پی۔آئی۔اے کے سپر کانسٹیلیشن پر سوار تھا۔ یہ محض ایک عام ہوائی سفر نہ تھا بلکہ میں اپنے ایک پرانے اور پیارے خواب کی تعبیر کی تلاش میں مشرقی پاکستان کے سفر پر جا رہا تھا۔ سپر کانسٹیلیشن ٹھیک مشرق کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ اب تک میں بہت سے دوستوں سے مشرقی پاکستان کی تعریفیں سن چکا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے دماغ میں پہلے سے اس کی ایک تصویر کھینچ لی تھی۔ میرے خیال میں مشرقی پاکستان کو سرسبز اور خوبصورت سرزمین ہونا چاہئے تھا۔ وہاں کے لوگوں کو مہمان نواز اور محنت پسند ہونا چاہئے تھا۔ میں نے تو اپنے تصورات میں مشرقی پاکستان کو اپنے وطن جاپان جیسی جگہ قرار دے لیا تھا۔ اب میں اس سرزمین کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے جا رہا تھا۔ چاہے میرا خیال غلط نکلے یا صحیح اس سفر کے دوران میری طبیعت کا یہ عالم تھا کہ چار انجنوں والا یہ جدید قسم کا ہوائی جہاز بھی مجھے بہت سست رو محسوس ہو رہا تھا۔

۹ فروری کی صبح ساڑھے پانچ بجے ہمارا سپر کانسٹیلیشن ڈھاکہ

کے ہوائی اڈہ پر اُترا۔ ہوائی اڈے پر ہلکا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میرے پاس اپنے ایک دوست کے گھر پہنچانے کے لئے ایک تھیلے اور اپنے اسٹریچ کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا اس لئے میں دوسرے مسافروں سے پہلے ہوائی اڈے سے باہر نکل آیا جہاں میں نے اپنے دوست کے والد صاحب اور بہنوئی صاحب کو اپنے استقبال کے لئے موجود پایا۔ وہ دونوں اتنی صبح سویرے ایک اجنبی کو خوش آمدید کہنے کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ میں ان لوگوں کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا لیکن بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ تو ان کی مہمان نوازی کی صرف ابتدا تھی۔ میرے دوست کے بہنوئی صاحب کا نام حافظ محمد حسن صاحب تھا۔ اب ہم ان کے گھر جا رہے تھے جوں جوں کار آگے بڑھتی گئی سرسبز درختوں کی قطاریں پیچھے گزرتی گئیں۔ پچھلی رات کو بارش ہوئی تھی۔ اور درختوں کی ہریالی آنکھوں میں سمائی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سبز پوش حسینوں کا جلوس دریا میں غسل کے بعد واپس آ رہا ہے۔

حافظ صاحب کا گھر دھن منڈی میں تھا۔ میرے لئے ایک آراستہ کمرہ مخصوص تھا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر میں نے اپنے آپ کہا۔ اب تم واقعی مشرقی پاکستان آ گئے ہو۔ اور جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔

جب جاگا تو ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ دو ہفتوں میں زیادہ سے زیادہ جگہوں کو دیکھنے کے لئے وقت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ سوچتے ہی میں فوراً شہر کی سیر کو نکلا۔ میری دلچسپی سب سے زیادہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے تھی۔ لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ اندر جانے کا راستہ فوج اور پولیس نے بند کر رکھا ہے۔ مجھے اس بات سے بے خبر تو نہیں تھا کہ سابق وزیر اعظم سہروردی کی گرفتاری کے سلسلے میں یہاں کچھ ناخوشگوار واقعے پیش آئے ہیں۔ لیکن اب فوج اور پولیس والوں کے دستے کو سامنے دیکھ کر مجھے اس ملک کے مخصوص مسئلہ کا اندرونی حال ہوا۔ مشرق اور مغرب میں ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع دو علاقوں کو جن کی زبانیں۔ رسم و رواج۔ عادات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک مذہب۔ مشترک تاریخ اور روایات کی بنا پر ۱۹۴۷ء میں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ یہی پاکستان ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ویسے تو بہت کچھ مشترک ہے لیکن فی الوقت بعض سیاسی الجھنوں نے فاصلہ اور ذہنی دوری پیدا کر دی ہے۔ پاکستان کی ترقی اور عظمت کے لئے ضروری ہے کہ دونوں بازوؤں کے رہنے والے اپنے مشترک عناصر کو زیادہ مضبوط بنا کر ایک ساتھ روشن مستقبل کی طرف بڑھیں۔ بہرحال یونیورسٹی دیکھنے کا ارادہ تو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑنا پڑا۔

نیو مارکیٹ ڈھاکہ کے شہریوں کی خریداری کا مرکز ہے۔ اس صاف ستھری مارکیٹ میں کتابوں کی تیس چالیس دکانیں نظر آئیں تو میں سیدھا اس طرف بڑھا اور ایک دکان میں داخل ہوا۔ دیکھا تو ساری کی ساری بنگالی کتابیں ہیں۔ رسالے۔ افسانے۔ ناول۔ علمی کتابیں ہیں۔ بائنڈنگ اور چھاپہ دونوں بہت عمدہ ہیں۔ خوبصورتی میں اردو کتابوں سے کسی طرح کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ کتابوں کی اشاعت کا معیار کسی ملک کی ثقافتی ترقی کا پیمانہ اور مقیاس ہے۔ اس اصول کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی پاکستان (جسے بنگالوں کا بھی کہا جا سکتا ہے) ثقافتی معیار کافی بلند ہے۔ یہ بنگالی ادب کی فوقیت پر بحث کرنے کا موقع نہیں۔ ہمارے لئے رابندر ناتھ ٹیگور اور نذرالاسلام کا نام لینا ہی کافی ہوگا۔ میں کافی متاثر ہو کر مارکیٹ سے باہر آیا اور میری بغل میں ایک بنگالی لغت تھی۔

مارکیٹ سے سیدھا ڈھاکہ میچ فیکٹری کا رخ کیا۔ وہاں اٹھتر برس کی عمر کے ایک جاپانی انجینیر صاحب کام کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی دوسرے جاپانیوں کے حالات سے آگاہ کیا جو اس دوست ملک کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں۔

جس وقت ڈھاکہ میچ فیکٹری سے رخصت ہوا سورج کی آخری کرن بوڑھی گنگا کے پانی پر چمک رہی تھی۔

اگلی صبح چھ بجے اٹھا۔ اس دن میں چندر گھونا میں کاغذ سازی کا کارخانہ دیکھنے جانے والا تھا صبح سات بج کر چالیس منٹ پر ہمارا ڈی سی۔ ۳ ہوائی جہاز ڈھاکہ کے ہوائی اڈے سے اُٹھا اور چالیس منٹ کے بعد چٹاگانگ پہنچا۔ مشرقی پاکستان کا دوسرا بڑا شہر چٹاگانگ روشن صبح کی مہربان روشنی میں چمک رہا تھا۔ پہاڑیوں، دریاؤں اور سمندر سے گھرا ہوا یہ خوبصورت شہر مشرقی پاکستان کی اہم بندرگاہ بھی ہے۔ مشرقی پاکستان کی کم و بیش تمام بین الاقوامی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔

شہر کی سیر کے بعد سہ پہر کو ہم جیپ کار میں چندر گھونا روانہ ہوا۔ وہاں دریائے کرنافلی کے کنارے کاغذ سازی کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ ۸ کروڑ روپے سے قائم شدہ اس کارخانے کو ایشیا میں اس قسم کے سب سے بڑے کارخانوں میں شمار کیا جاتا ہے اس جدید ترین قسم کی مشینری سے آراستہ کارخانہ کو دیکھنے سے پاکستان کی ملکی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کارخانہ کے قیام کا سہرا

[redacted]

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کے سر ہے۔ فی الحال یہ کارخانہ روزانہ ایک سو ٹن کاغذ تیار کر سکتا ہے۔ کارخانے کے ساتھ یہاں کام کرنے والوں کے لئے رہنے کا بہت عمدہ انتظام بھی ہے۔ مزدوروں کے گھر۔ ان کے بچوں کے لئے اسکول وغیرہ سب موجود ہیں۔

شام کے ریسٹ ہاؤس کے باغ سے کافی فاصلے پر مزدوروں کی بستی کو دیکھا۔ ہر گھر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شام کا کھانا پکایا جا رہا تھا اور دھواں مجھے ان لوگوں کی خوشحالی کا سانس سا نظر آیا۔

گیارہ تاریخ کو صبح سویرے میں نے کپتائی کا رخ کیا۔ پہاڑی کی ٹھنڈی ہوا میں ساری دُنیا ترو تازہ تھی۔ ہماری کار دریائے کرنافلی کے کنارے کنارے چل رہی تھی اور میں اپنے آپ کو گویا جاپان کے کسی پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ وطن کی یاد بھی کتنی ظالم اور مہربان ہوتی ہے۔ کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور مانوس مناظر کے ساتھ کسی بُھلا؟؟ چوٹ کی طرح تازہ ہو جاتی ہے۔ بانس کے جنگل۔ کسانوں کے گھر۔ خوبصورت دریا۔ گھنے درخت یہ مناظر میں نے اپنے وطن میں ضرور دیکھے تھے۔ واقعی دونوں میں کتنی مشابہت تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد کپتائی بند پہنچا۔ بند کا تعمیری کام گرم جوشی سے جاری تھا۔ کیونکہ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے بجلی کی سخت ضرورت ہے اس لئے اس میں شک نہیں کہ اس بند کی تکمیل کے بعد ایک لاکھ چالیس ہزار کلو واٹ بجلی فراہم ہونے سے صنعتی ترقی میں زبردست اضافہ ہوگا۔

فائر گٹر صاحب نے باتوں باتوں میں کہا کہ یہاں کام کرنے والے مزدوروں میں اسی فی صد بودھ مت والے ہیں یہ حقیقت ہے کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں بودھ مت والے بھی جو کہ اقلیت میں ہیں ملک کی ترقی کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستانیوں کی بے تعصبی کا ثبوت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟۔ بودھ مت کی ترقی اور پرانے آثار کی حفاظت کے علاوہ مشرقی پاکستان کی حکومت ہر سال کم و بیش تین لاکھ روپے کے وظائف بودھ طالب علموں کو دیتی ہے۔

پاکستان کی صنعتی طاقت کی اس عمدہ نمونہ سے کافی متاثر ہو کر میں پانچ بجے شام کو اس خوبصورت کوہستانی علاقے سے رخصت ہوا۔

پی۔ آئی۔ اے کا دفتر چٹاگانگ میں نور علی روڈ پر ہے۔ اگلے دن صبح کے دس بجے میں اس دفتر سے کمپنی کی بس میں ہوائی اڈے سے روانہ ہوا۔ آج کی منزلِ مقصود کاکس بازار تھی۔ اٹھائیس مسافروں والی ائیربس نے چٹاگانگ سے کاکس بازار کے فاصلہ کو صرف تیس منٹ میں طے کر کے ساڑھے گیارہ بجے مجھے ساحل سمندر کے چھوٹے سے ہوائی اڈے پر پہنچایا۔ وہاں سے پیدل دس منٹ کے فاصلے پر سمندر کے رخ ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس موجود تھا۔ ڈائننگ ہال میں "انگریزی کھانا بارہ روپے۔ پاکستانی کھانا نو روپے یومیہ" کا اشتہار لگا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ یہاں آنے والوں میں غیر ملکی سیاحوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔

سمندر کا لمبا کنارہ۔ پرسکون موجیں۔ چمکتی ہوئی ریت اور اس پر بے شمار لال کیکڑے۔ ایسے ماحول میں ہر آدمی کے دل میں قدرت کی قدر اور مسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک طرف سیاستداں دُنیا کے اُفق پر جنگ کے بادل پھیلا رہے ہیں اور دوسری طرف فطرت آج بھی مسکرا رہی ہے موجیں آکر زمین کے قدم چومتی ہیں۔ چاند اپنی کرنوں کی کنگھی سے زمین کے بالوں کو سنوارتا ہے۔ کاش دنیا ابدی امن کا گہوارہ بن جائے اور انسان فطرت سے محبت اور امن و آشتی کا سبق سیکھے۔

شام کو ڈائننگ ہال میں لاہور کے رہنے والے ایک صاحب کی طرف سے چائے کی دعوت میں شامل ہوا۔ لہروں کی دھیمی آواز کھانے کے کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔

کاکس بازار سے ائیربس میں ڈھاکہ واپس آیا اور ایک دن آرام کرنے کے بعد پندرہ تاریخ کو صبح کے دس بجے میں پھر ائیربس میں سوار ہوا اس دفعہ راجشاہی میری منزل مقصود تھی۔ کئی دنوں سے میرے دل میں راجشاہی یونیورسٹی دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اب اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جا رہا تھا۔ ائیربس براہ راست راجشاہی تو نہیں جاتی۔ صرف ایشر ڈی تک جاتی ہے۔ راجشاہی تک ریل میں پونے دو گھنٹے کا سفر ہے۔ جب میں راجشاہی اسٹیشن پر اترا تو باہر رکشا کے سوا کوئی دوسری سواری نظر نہیں آئی۔ چنانچہ میں بھی رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والے نے اپنی عجیب اُردو میں میرے سوال کا جواب دیتے دیتے بیس منٹ کے بعد مجھے یونیورسٹی پہنچایا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ اُردو نے جو مجھے جاپانی زبان کے بعد دُنیا کی ہر زبان سے زیادہ عزیز ہے یہاں بھی میری مدد کی۔ میں ہندوستان کا دورہ کر چکا ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے سہارے کوئی مسافر پاکستان اور ہندوستان کے ہر علاقے

میں اپنا وقت دلچسپی کے ساتھ گذار سکتا ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اسے بجا طور پر یونیورسٹی کو [illegible] speech of کہا تھا اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔

یونیورسٹی ابھی زیر تعمیر تھی اور چھٹی کی وجہ سے استاد صاحبان اور طالب علم موجود نہ تھے۔ میں عمارت کے اندر داخل ہوا اور ہر شعبہ کا معائنہ کیا۔ کافی اچھی یونیورسٹی معلوم ہوئی۔ اس وقت کوئی ساڑھے تین سو طلباء زیر تعلیم تھے۔ یقیناً وہ دن دور نہیں ہے جبکہ اس یونیورسٹی کے سند یافتہ نوجوان ملک کی ترقی کے لئے اہم کردار ادا کرنے لگیں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملک کی ترقی اور تعلیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے حکومت ملک میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ راجشاہی یونیورسٹی کا قیام بھی اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ زیر تعمیر عمارت میں ملک کی آئندہ عظمت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

راجشاہی سے پھر ایشرڈی آکر وہاں سے چلتا ہوتا ہوا سولہ فروری کے ایک بجے دوپہر کو ڈھاکہ واپس آگیا۔ اس عرصہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی راہ لی۔ ڈھاکہ ہال کے بغل والے دروازے سے داخل ہوا اور ڈھاکہ ہال۔ اقبال ہال۔ کنون ہال۔ فضل الحق ہال وغیرہ کا معائنہ کیا۔ کراچی میں میرے بہت سے دوست اس یونیورسٹی سے آئے ہوئے ہیں اس لئے مجھے یہ یونیورسٹی بہت عزیز ہو گئی تھی۔ متعلقہ افراد کی وجہ سے عزیز ہوتے ہیں۔ لوگوں اور عزیزوں کی نسبت سے پتھروں اور اینٹوں میں دل کی دھڑکن سنائی دینے لگتی ہے۔ بہرحال کا نام بھی مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ اب ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں مسافر ہوتے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں سے پیدل چل کر سلیم اللہ ہال گیا۔ یہ کیا شاندار ہوسٹل ہے۔ شاید ہی اتنا خوبصورت اور عمدہ ہوسٹل اور کہیں ملے گا۔ اس میں مقیم چار سو طلباء کو واقعی خوش قسمت قرار دینا چاہیے۔ مجھے جاپان کی سرکاری یونیورسٹیوں کے ہوسٹلوں کا حال یاد آیا۔ ہمارے ملک میں پرانے زمانے سے یہ خیالات عام ہیں کہ قوت برداشت کو زبردست خوبی سمجھا جاتا ہے۔ سخت ماحول میں محنت کر کے ہی آدمی اپنے آپ کو تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ نہ معلوم ان خیالات کو ہماری سرکاری یونیورسٹی کے ہوسٹل سے کیسے متعلق کر دیا گیا ہے۔ ہمارا ہوسٹل اپنی شان و شوکت میں پاکستانی مہاجرین کی جھونپڑیوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ میں نے سلیم اللہ ہال کی چند تصویریں کھینچیں مجھے یقین ہے کہ جاپان جانے کے بعد جب میں وہاں کے طلباء کو تصویریں دکھاؤں گا تو کوئی پہچان نہیں سکے گا کہ یہ ایک ہوسٹل ہے۔ بلکہ وہ شاید یہ سمجھیں گے کہ یہ عمارت عجائب خانہ ہوگی یا کوئی شاندار سرکاری دفتر۔ بہر کیف اس میں شک نہیں کہ سلیم اللہ ہال ایک قابل فخر ہوسٹل ہے۔ ایسے ماحول میں رہ کے حصول تعلیم میں حتی الامکان کوشش کرنا طلباء کا فرض ہوتا ہے۔

سلیم اللہ ہال سے نکل کر میں گلستان کی طرف چل دیا۔ بارونق اور صاف ستھری سڑک ڈھاکہ میں میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔ کافی گھوما۔ گھومتے گھومتے رات ہو گئی۔

اگلے دن سترہ تاریخ کو اس سفر کی ایک اہم منزل مقصود فینچوگنج کے دورے پر نکلنا تھا۔ اس دفعہ میں اکیلا نہیں تھا بلکہ ایک ساتھی اپنے ہمراہ تھا۔ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کوموگوچی صاحب تھے۔ وہ بھی میری طرح پاکستانی حکومت کے وظیفہ سے یہاں علم جغرافیہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ دن میں ہم نے اپنے قونصل خانہ سے ضروری اطلاعات حاصل کیں۔ رات کو آٹھ پچاس پر سلہٹ ایکسپریس ڈھاکہ کے اسٹیشن سے روانہ ہوتی ہے۔ جس وقت ہم اسٹیشن پہنچے اس وقت انٹر کلاس میں کافی بھیڑ تھی۔ مجبوراً غسل خانہ کے سامنے فرش پر بستر لگا لیا۔ جلدی تمام مسافروں کی نظریں ہمارے اوپر جم گئیں۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہم جاپانی ہیں تو انہوں نے فوراً خود سمٹ سمٹا کر ہمارے لئے بیٹھنے کی گنجائش نکال دی۔ شکریہ ادا کرکے ہمارے بیٹھتے ہی سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کا نام کیا ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟۔ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟ مشرقی پاکستان کیسا لگا؟ وغیرہ وغیرہ سوالوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور گاڑی بھی برابر چلتی رہی۔

اٹھارہ تاریخ کی صبح چھ بجے کر پچیس منٹ پر گاڑی میج گاؤں اسٹیشن پر پہنچی۔ کوبے اشٹیل کمپنی کی طرف سے ایک جیپ کار ہمارے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھ کے کھاد ساز کارخانے کی طرف روانہ ہوئے۔ پہاڑ کی خنک اور تازہ ہوا میں سفر کی تھکاوٹ جلدی سے دور ہو گئی۔ دست صبا میں محبوب کے ہاتھوں کی نرمی ہوتی ہے۔

کوئی دس منٹ کے سفر کے بعد سامنے میدان میں فینچوگنج کھاد کارخانے کی بلند اور شاندار عمارت نظر آنے لگی۔ یہ کتنا بڑا کارخانہ تھا

اس کو بجا طور پر جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے بڑا اور جدید ترین کارخانہ کہا جا سکتا ہے۔ پانچسو جاپانیوں اور ہزاروں پاکستانیوں کی تین سال آٹھ مہینوں کی محنت سے اب یہ کارخانہ وجود میں آگیا ہے۔ دونوں ملکوں کے تعاون کا شاندار پھل اب ہمارے سامنے تھا۔ ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کارخانہ کے لئے سوئی گیس ہری پور سے فراہم کی جاتی ہے یہ گیس جس کو چار ہزار فٹ گہری زمین سے لیا جاتا ہے چھیانوے فی صد کے C_2H_2 پر مشتمل ہے۔ C_2H_2 اور امونیم کے کیمیائی ملاوٹ سے UREA تیار کیا جاتا ہے۔ فی الحال اس کارخانے میں ہر روز دو سو ٹن امونیم اور تین سو تینتیس ٹن UREA تیار کئے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کھاد کے ذریعہ آئندہ اس ملک کی زراعتی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ کیونکہ پٹ سن۔ روئی۔ چائے۔ چاول (جو کہ پاکستان کی اہم برآمدی اشیا ہیں) کی پیداوار کے لئے عمدہ قسم کی کھاد کی سخت ضرورت اور مانگ ہے۔ اس مانگ کے پیش نظر حکومت نے جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے بڑا کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا ہمیں حکومت کی دوراندیشی اور عمدہ زراعی پالیسی کی داد دینی چاہیئے۔ اس کارخانے کی تعمیر کے سلسلے میں خاص اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ یہ مقررہ وقت سے پہلے قلیل عرصہ میں مکمل ہو گیا۔ یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ متعلقین کی مکمل مفاہمت تعاون اور محنت ہی اس کو ممکن بنا سکتی ہے۔ اس سے پہلے ملتان میں غیر ملکی تعاون سے کھاد سازی کے ایک کارخانے کا تعمیری کام شروع ہوا تھا مگر اب تک اس کا پہلا مرحلہ بھی طے نہیں ہوا اور یہ کارخانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

جاپانی اسٹاف کے منہ سے پاکستانی انجینئروں اور مزدوروں کی قابلیت اور جفاکشی کی تعریف سن کر مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ گویا میری تعریف کی جا رہی تھی۔

شام کو سلہٹ کے چائے کے مشہور باغات دیکھنے نکلا۔ راستہ کے دونوں طرف چائے کے باغ ہی باغ نظر آئے۔ سنا ہے کہ یہاں کوئی ایک سو بیس باغات ہیں۔ چائے پاکستان کی اہم برآمدی اشیا میں سے ایک ہے۔ اس کی برآمد کو فروغ دینے کے لئے پیداوار میں مزید اضافہ ہونا ضروری ہے۔ اور اس مقصد کے لئے امونیم کھاد کی بہت مانگ ہے۔ چائے کی برآمد سے جو منافع حاصل ہوگا اس کو دوسری صنعتوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح چائے کا ایک پتہ بھی ملک کی ترقی سے تعلق رکھتا ہے۔

رات کو ریسٹ ہاؤس کے جاپانی حمام[1] میں نہایا۔ حمام کے پانی میں چاند کی نرم کرنیں بھی میرے ساتھ ہی غسل کر رہی تھیں۔ مجھے وطن کی یاد آ رہی تھی۔

بیس تاریخ کو صبح نو بجے فراتن گنج کی سیر کرنے نکلا وہاں مشہور آدم جی جوٹ ملز موجود ہے۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ مل جوٹ بافی کے سلسلے میں دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو میں اپنی حیرانی کو نہیں روک سکا۔ وہ غیر متوقع طور پر وسیع پیمانے کا کارخانہ تھا۔ کارخانہ کیا یہ ایک پوری بستی تھی۔ اس کا نام آدم جی نگر ہے اور آبادی ایک لاکھ ہے۔ اسکول۔ ہسپتال۔ بینک۔ ڈاک خانہ۔ پولیس کی کچہری جتنے انتظامات ایک شہر کے لئے درکار ہیں وہاں سب موجود ہیں۔ واقعی اس بستی کو دنیا کی قابل فخر اور مثالی صنعتی بستیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ آدم جی جوٹ ملز کی عظمت کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ باہر سے جتنے سرکاری مہمان اس ملک کے دورہ پر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی ملز کا معائنہ ضرور کرتے ہیں۔

اپنے اسی دورے کے دوران مجھے تین بڑے کارخانوں یعنی چندر گونا کا کاغذ سازی کا کارخانہ۔ فنچو گنج کا کھاد سازی کا کارخانہ اور آدم جی جوٹ ملز کو دیکھنے کا موقع ملا میں ان کارخانوں کو دیکھ کر اس ملک کے صنعتی مستقبل کی عظمت پر ایمان لا چکا تھا۔ یہ تین کارخانے ہر لحاظ سے دنیا کے کسی دوسرے کارخانوں کے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہر پاکستانی کو ان پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔

نرائن گنج کی سڑکوں پر جگہ جگہ استقبالیہ محراب بنے ہوئے تھے جن پر "پاکستان اور جاپان کی دوستی زندہ باد" کی دل فریب عبارت درج تھی۔ یہ کچھ دنوں پہلے ہی جاپان کے ولی عہد شہزادے اور شہزادی کے دورے کے موقع پر بنائے گئے تھے: "پاکستان اور جاپان کی دوستی زندہ باد" یہ لفظ صرف ہمارے شاہی جوڑے کے

[1] جاپانی حمام۔ ایک بڑے حوض میں گرم پانی بھر دیا جاتا ہے کمرے کی بناوٹ کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ لوگ نہاتے نہاتے چاروں طرف مناظر فطرت سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

استقبال کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ یہ ہر پاکستانی کی سچی پکار اور ہر جاپانی کی خواہش بھی ہے۔

اسی رات کو میں نے جاپانی انجینیروں کے ساتھ جو کہ ٹیکنیکل تعاون کے سلسلہ میں اس ملک میں آتے رہتے ہیں مفصل بات چیت کی۔ یونہی سے کہ باتیں کرتے ہوئے فروری کی بیس تاریخ اکیس تاریخ میں بدل گئی۔

صبح ہو گئی۔ اب تک چودہ روز گزر چکے تھے۔ ڈھاکہ۔ چاٹگام، چندر گھونا۔ کپتائی۔ کاکس بازار۔ راجشاہی۔ ایشرڈی۔ پبنا۔ منجو گنج۔ سلہٹ اور نرائن گنج کے دورے کے بعد اب میرا دورہ گویا ہی مکمل ہو چکا تھا۔

پی۔ آئی۔ اے کا بوئنگ ۷۰۲ جٹ ہوئی جہاز مقامی وقت کے مطابق ڈھائی بجے تیسرے پہر کو اڑنے والا تھا۔ میں نے آخری بار اس زرخیز اور سرسبز زمین کو سلام کہا۔ الوداع خوبصورت زمین۔ الوداع عزیز لوگو۔

میں جاپان چلا جاؤں گا مگر آب رواں کی اس حسین زمین کے نقوش ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہیں گے۔ سلیم اللہ ہال کی تصویریں اپنے ساتھیوں کو دکھاتے ہوئے ہمیشہ مجھے یہ دیس یاد آئے گا۔ اپنے پاکستانی دوستوں کو خط لکھتے ہوئے چندر گھونا کے کاغذ سازی کے کارخانے کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ شام کو ٹوکیو میں چائے پیتے ہوئے میں تصور ہی تصور میں سلہٹ کے چائے کے باغات میں گھومنے لگوں گا۔ جاپان کے پہاڑی علاقے کپتائی کے سفر کی یاد تازہ کریں گے۔ جب کبھی اپنی شام ساحل سمندر پر گزاروں گا تو کاکس بازار کا ساحل اپنی تمام دل آویزیوں کے ساتھ میرے سامنے آجائے گا۔

مگر مجھے یقین ہے کہ میں یہاں بار بار آؤں گا۔ بار بار نہیں تو ایک بار ضرور آؤں گا۔ شاید اس وقت جب میرے سر کے بالوں پر سفیدی کا غلبہ ہوگا، میرا بیٹا اور میری بیٹی ساتھ ہوں گی اور میں انہیں پاکستان کی محبت اپنے ورثے کے طور پر دے سکوں گا۔ ایک باپ اس سے بڑا تحفہ اپنے بچوں کو اور کیا دے سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے جنگلات (بسلسلہ صفحہ ۳۵)

ہیں، اس کی بید عام طور پر گرمیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ سال بے شمار کام میں استعمال ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے غیر مسلم پوجا اور شادی بیاہ کے موقعوں پر اس کے ہار اور گلدستے بناتے ہیں، سال کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے زیورات عجب خوشنما ہوتے ہیں۔

سندربن کے نام سے کون نہیں واقف ہوگا، یہ جنگل اتنا خوبصورت ہے کہ اس کا نام سندربن پڑ گیا، مختلف جانوروں کے شکار کے لئے یہاں بڑی سہولتیں فراہم ہیں۔ اس جنگل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے درمیان سے دریا اور نہریں گذرتی ہیں۔ جگہ جگہ خوبصورت جزیرے ہیں۔ ان جزیروں کا ایک بڑا حصہ جوار کے وقت پانی میں ڈوب جاتا ہے اور بھاٹا کے وقت پھر ابھر آتا ہے۔ سندربن کے بعض علاقے بالکل تاریک ہیں جہاں رائل بنگال ٹائیگر کی حکومت ہے ہرن، جنگلی سور اور پرندوں کی کثرت ہے، سندربن میں ۹ قسم کی لکڑیاں پائی جاتی ہیں۔

شہتیر بڑی ہی کارآمد چیز ہے۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کے جنگل اس کے لئے مشہور ہیں یہاں سے سالانہ ہزاروں ٹن شہتیر کاٹے جاتے ہیں۔ یہ شہتیر مکان بنانے اور بجلی اور ٹیلیفون کے کھمبے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ نرم لکڑیوں سے پلائی ووڈ کی چادریں بنتی ہیں، ان چادروں سے چائے کے بڑے بڑے بکس اور دوسری ضروری چیزیں بنتی ہیں، لکڑیاں کاٹنے اور شہتیر حاصل کرنے کے کام میں کم و بیش بیس ہزار آدمی جنگلوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سائنس داں بھی ہیں، مزدور بھی اور تحقیق کرنے والے طالب علم بھی۔

مشرقی پاکستان کے جنگل سچ مچ دولت سے بھرے ہوئے ہیں آئندہ چند برسوں میں جب آری مل، فرنیچر بنانے، لکڑی کے برادے سے گتہ بنانے اور لکڑیوں سے گوند نکالنے کے کارخانے تعمیر ہو جائیں گے تو اس وقت ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ مشرقی پاکستان کے جنگل دولت پیدا کرتے ہیں۔

سید شمیم احمد

بنگال میں صوفیائے کرام کی سرگرمیاں

برعظیم ہند و پاک کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال میں بھی اسلام کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے کرام کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں نے خود کو دین محمدی کی تبلیغ اور اس کے ذریعہ مخلوق خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ لوگ تمام دنیاوی آرام و آسائش کو ترک کر کے راہ خدا میں چل نکلتے اور جگہ بہ جگہ لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف رخ اختیار کرنے کی تلقین کرتے۔ بنگال ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ قدم قدم پر خوفناک دریاؤں جنگلوں اور دیگر مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی جبکہ مواصلات و ٹرانسپورٹ کا جال بچھا ہوا ہے بنگال یا مشرقی پاکستان کے بہت سے علاقوں تک پہنچنا آسان نہیں تو آج سے چھ سات سو سال قبل کا کیا حال ہوگا۔ جبکہ نہ پختہ سڑکیں تھیں نہ ریلیں اور بسیں۔ اسٹیمر اور لانچ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اور ہوائی جہاز تو کسی کے تصور میں بھی نہ تھا۔ مواصلات و سفر کے ذرائع کی کمیابی اور غیر مسلموں سے بھرا ہوا ملک لیکن اس عالم میں بھی خدا کے یہ برگزیدہ بندے چاٹگام۔ سلہٹ چاٹگام پہاڑی علاقہ اور اراکان و اکیاب تک جا پہنچے اور اسلام کی شمعیں روشن کیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ چاٹگام کے علاقہ میں عرب تاجروں اور سیاحوں کی بدولت نویں صدی عیسوی میں اسلام داخل ہو چکا تھا اور ایک اسلامی ریاست بھی قائم ہو چکی تھی جسے ۹۵۳ میں اراکان کے راجہ نے اپنی یلغار سے ختم کر دیا۔ لیکن چاٹگام میں اسلام کی زیادہ تبلیغ و اشاعت نہ ہو سکی اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بختیار خلجی کی فتوحات سے قبل ہی صوفیائے کرام نے مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان میں تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ روایت مشتبہ ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ صرف زبانی روائتیں مشہور ہیں۔ جو حقائق کی روشنی میں غلط معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال بختیار خلجی نے [illegible]ء میں ندیا پر قبضہ کر کے بنگال میں اسلامی پرچم لہرایا تو صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی یعنی آٹھویں صدی ہجری میں ان کی سرگرمیاں بڑی تیز ہو گئیں۔ اور بنگال اور مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام جلیل القدر اولیائے کرام اسی صدی میں گذرے ہیں۔ ویسے ساتویں صدی ہجری اور نویں صدی ہجری میں بھی ان کی خدمات کم نہ تھیں۔ دین کی تبلیغ و اشاعت میں بنگال کے حکمرانوں نے بھی صوفیائے کرام کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ خصوصاً سلطان شمس الدین فیروز شاہ دہلوی۔ سلطان فخر الدین مبارک شاہ، سلطان غیاث الدین اعظم شاہ اور سلطان سید علاء الدین حسین کی معاونت نے صوفیائے کرام کے مشن کو کامیاب بنانے میں زبردست کام کیا۔

بنگال اور مشرقی پاکستان میں جن بزرگوں نے تبلیغ و اشاعت کی ان میں حضرت جلال الدین سہروردی تبریزی متوفی ۱۲۴۴ء شاہ جلال سلہٹی متوفی ۱۳۴۷ء۔ حضرت شرف الدین توامہ متوفی ۷۸۶ھ، حضرت عثمان اخی سراج متوفی ۱۳۵۷ء حضرت راجا بیابانی متوفی ۱۳۵۴ء، پیر بدر عالم زاہدی، حضرت علاء الحق پنڈوی متوفی ۱۳۹۸ء حضرت نور قطب عالم پنڈوی متوفی ۱۴۱۶ء اور حضرت علی بغدادی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بزرگان سہروردیہ، قادریہ، چشتیہ، زاہدیہ اور دوسرے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں دہلی کے بعد مشرقی ہندوستان میں جونپور۔ بہار شریف۔ گوڑ۔ پنڈوہ۔ سونار گاؤں اور چاٹگام اسلامی تہذیب و ثقافت کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ صوفیائے کرام اور مبلغین اسلام کی جماعتیں حجاز، عراق، تبریز اور خراسان سے لاہور اور ملتان ہوتی ہوئی دہلی پہنچتیں۔ پھر وہاں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی طرف پھیل جاتیں سلاطین کی فوج کشی سے ممالک تو فتح ہو جاتے تھے مگر وہاں کے عوام کے دل و دماغ پر غلبہ پانے نیز مسلمان امراء سلاطین کے اخلاق و کردار میں سدھار اور توازن پیدا کرنے کے لئے انہیں بزرگان دین کی تلقین و ہدایت کا سہارا

لینا پڑتا تھا۔ مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان میں صوفیائے کرام کے کارناموں اور ان کی شخصیتوں کا ذکر کرنے سے پہلے بختیار خلجی کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا کیونکہ اسی اولوالعزم فاتح کی بدولت اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کو داخل ہونے اور قدم جمانے کا موقع ملا۔

بختیار خلجی

ہندوستان کا یہ سورما ترکوں کے خلجی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ۵۹۱ھ میں رزق کی تلاش میں ہندوستان پہنچا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات برعظیم ہندوستان کے بیشتر شمالی و مشرقی علاقوں پر نہ ہو سکی تھی۔ بہار سے متصل مشرقی یوپی۔ بہار، مغربی بنگال۔ کوچ بہار، مشرقی پاکستان اور آسام کے علاقے آزاد و خود مختار تھے۔ بختیار خلجی تلاش رزق کے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا حاکم بدایوں ملک ہزبر الدین کی ملازمت میں داخل ہوا جس زمانہ میں وہ حاکم بدایوں کی سرکار سے وابستہ تھا۔ بہار اور یوپی سے متصل علاقوں پر حملہ کرتا رہتا اور عموماً ہر حملہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا۔ اس کی اس کامیابی سے خوش ہو کر اودھ کے گورنر حسین الدین نے ۱۱۹۶ء میں اسے مرزا پور میں کچھ جاگیر عطا فرمائی۔ چند سال کے اندر ہی بختیار خلجی نے اپنی جرأت و بیباکی سے لوگوں کو کافی متاثر کر لیا۔ اس کے حوصلے جوان تھے۔ دل میں ولولے اٹھ رہے تھے۔ اس کے سامنے مشرقی ہندوستان کا وسیع خطہ نظر آ رہا تھا۔ بہار اور یوپی کے سرحدی علاقوں پر حملے کر کے وہ اپنی طاقت کا اندازہ لگا چکا تھا اور آخر ایک روز ۵۹۳ھ (مطابق ۱۱۹۷ء) میں اس نے بہار کی ایک ریاست منیر پر حملہ کر دیا اور اس پر قابض ہو گیا۔ اس حملہ میں مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری کے جد اعلیٰ حضرت امام تاج فقیہہ بھی شامل تھے۔ منیر پر تسلط جمانے کے بعد ۱۱۹۹ء میں صوبہ بہار کی راجدھانی اُڈنت پوری یعنی موجودہ بہار شریف پر حملہ کیا اور صرف دو سو سواروں سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ منیر۔ بہار شریف اور نالندہ وغیرہ پر غلبہ پانے کے بعد جنوری ۱۲۰۰ء میں بنگال کے راجہ لکشمن سین کو شکست دے کر ندیا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۲۰۱ء میں گوڑ کو قبضہ میں لایا اور اسے مسلم بنگال کا دارالحکومت قرار دے کر کوچ بہار اور آسام تک اپنی فتوحات وسیع کرتا گیا۔ اس کی اولوالعزمی نے اس پر قناعت نہ کی۔ آگے بڑھ کر تبت پر حملہ آور ہوا۔ اس مہم میں اسے کافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اجنبی ملک دشوار گزار راستے اور نامناسب آب و ہوا کی وجہ سے اس کے سپاہیوں کو شدید مصائب و بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مہم سے واپس لوٹ کر دیوکوٹ میں علالت کے دن گذار رہا تھا کہ اگست ۱۲۰۶ء میں علی مردان خلجی نے اسے قتل کر ڈالا۔ لاش بہار شریف لے جائی گئی۔ وہاں محلہ عماد پور میں اس کا مقبرہ ہے۔

بختیار خلجی کی حاکمانہ حیثیت کے متعلق تاریخ کے اسکالروں میں دو خیال کے لوگ ہیں ایک طبقہ کا خیال ہے کہ وہ قطب الدین ایبک کے مساوی اختیارات کا حامل تھا اور براہ راست سلطان شہاب الدین غوری کے سامنے ذمہ دار تھا۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ بختیار خلجی قطب الدین ایبک کے ماتحت تھا۔ اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ بہار و بنگال کی فتوحات کے بعد اس نے جنوری ۱۲۰۳ء میں قطب الدین ایبک سے بدایوں میں ملاقات کی اور اسے نذرانے و تحائف خراج کا مال پیش کیا۔ بہرحال قطب الدین ایبک کے سوا اور کوئی جنرل یا حاکم بختیار خلجی سے اوپر نہیں تھا۔ منیر۔ بہار شریف اور بنگال و آسام کے شہروں کی فتوحات تک وہ قطب الدین ایبک کے سامنے ذمہ دار نہ تھا۔ یہ تمام مہمیں اس نے اپنی مرضی سے سر کی تھیں البتہ بہار اور بنگال کی گورنری کے دور میں سلطان شہاب الدین غوری نے اسے سلطان قطب الدین ایبک کے سامنے ذمہ دار کر دیا کیونکہ قطب الدین ایبک پر سلطان کو اپنے تمام جنرلوں سے زیادہ اعتماد تھا اور ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔

بختیار خلجی نے دین کی ترویج و اشاعت میں کس حد تک حصہ لیا اور مبلغین کی سرگرمیاں اس کے عہد میں کیسی تھیں ان امور پر روشنی نہیں پڑتی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گوڑ میں ایک مسجد بنوائی تھی اور کوچ بہار کے راجہ نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اور اسی کی رہنمائی میں بختیار خلجی نے تبت پر فوج کشی کی تھی۔ اس کے علاوہ منیر کے حملہ کے دوران اس کے ساتھ حضرت امام تاج فقیہہ اور ان کے ساتھیوں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ وہ صوفیائے کرام کا معتقد تھا۔ اور یقیناً اس نے انھیں تبلیغی کاموں میں امداد بہم پہنچائی ہوگی اور بہار شریف میں بھی مسجد تعمیر کرائی ہوگی۔

صوفیائے کرام کے حالات بیان کرنے سے قبل بنگال میں مسلمانوں کی فتوحات اور مسلم بنگال کی حدود و وسعت کا مختصر جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ بختیار خلجی کی فتوحات مغربی بنگال اور آسام تک محدود رہی۔ لیکن بعد کے گورنروں نے اس میں اضافہ کیا۔ شہنشاہ بلبن کے زمانہ میں بنگال کے گورنر طغرل نے بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کے لئے شہنشاہ کو خود بنگال آنا پڑا۔ اور وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا مشرقی پاکستان کے حدود میں داخل ہو گیا سونار گاؤں کے راجہ دنوج رائے نے اسی زمانہ میں شہنشاہ کے سامنے

حاضر ہو کر اظہار اطاعت کیا۔ اس کے بعد گوڑ کے سلطان شمس الدین فیروز شاہ دہلوی نے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کرنے کی مہم شروع کی۔ اسی کے زمانہ میں سلہٹ پر حملہ ہوا۔ شمس الدین فیروز دہلوی آزاد و خود مختار سلطان تھا۔ اس کی حدود سلطنت میں بہار، مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان کے وسیع علاقہ کے علاوہ آسام کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ فیروز شاہ دہلوی نے ۱۳۰۱ء سے ۱۳۲۲ء تک اس وسیع مملکت پر دہلی کے شہنشاہ کے حدود اختیارات سے باہر رہ کر ایک خود مختار سلطان کی حیثیت سے حکومت کی۔ تغلق خاندان کے دور حکومت میں بنگال تین مملکتوں میں تقسیم ہو گیا۔ شمال و مشرقی بنگال سے لے کر ترہٹ تک کا علاقہ سلطان شمس الدین الیاس کے قبضہ میں تھا۔ اس کا صدر مقام گوڑ سے پنڈوہ منتقل ہو گیا تھا۔ مشرقی اور جنوبی بنگال پر علاؤ الدین علی کو خود مختارانہ حیثیت حاصل تھی۔ ہوگلی کے نزدیک ست گاؤں اس کی مملکت کا صدر مقام تھا۔ اور مشرقی بنگال میں سلطان فخر الدین مبارک شاہ کا سکہ و خطبہ جاری تھا سونار گاؤں اس کا دار الحکومت تھا۔ انہیں مملکتوں کے شہر گوڑ۔ پنڈوہ ست گاؤں۔ سونار گاؤں اور چاٹگام تھے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرکز تھے یہیں سے صوفیائے کرام دور افتادہ علاقوں میں پہنچ کر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بنگال کے تمام بزرگان دین کا ذکر اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے اور نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ یہاں پر صرف مشہور اور ان بزرگوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن کے مشن نے نمایاں کام انجام دیئے اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔

مشرقی پاکستان یا مغربی بنگال کے ابتدائی دور کے اولیائے عظام کے متعلق تاریخی حالات نہیں ملتے۔ ان کے سلسلہ میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں یا جو کرامات منسوب کی جاتی ہیں اور ان کا جو زمانہ متعین کیا جاتا ہے وہ محض روایتی ہے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صحیح بیان کہیں نہیں ملتا۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا آدم شہید پہلے بزرگ ہیں جو بنگال تشریف لائے۔ آپ کا مزار منشی گنج سب ڈویژن (ڈھاکہ) میں رام پال نامی ایک مقام پر ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے بکرا پور کے راجہ بلال سین سے جنگ کی۔ راجہ مارا گیا۔ گوڑ کے سلطان جلال الدین فتح شاہ کے خواجہ سرا ملک کافور نے ۱۴۸۳ء میں آپ کے مزار کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جو آج کل محکمہ آثار قدیمہ کے زیر حفاظت ہے۔ ابتدائی دور کے ایک دوسرے صوفی حضرت محمد سلطان رومی اور حضرت سلطان محمود ماہی سوار بیان کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر کی درگاہ بگرا شہر سے کوئی چھ میل دور مہا استھان نام کے ایک مقام پر ہے اور آخر الذکر کا روضہ جزیرہ سندیپ میں ہے۔ اسی زمانہ میں پرگنہ بھوم مغربی بنگال میں خواجہ غریب نواز کے ایک مرید حضرت عبداللہ کرمانی نے تبلیغ کی۔ آپ ۱۱۴۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۶ء میں انتقال فرمایا۔ بردوان ضلع میں بمقام منگل کوٹ ۱۲۰۲ء میں مخدوم شاہ محمد غزنوی عرف راہی پیر تشریف لائے الغرض تیرہویں صدی عیسوی میں بنگال کے مختلف مقامات پر صوفیوں کا تبلیغی سلسلہ جاری تھا۔ اس عہد کے سب سے عظیم المرتبت صوفی شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔

جلال تبریزی:- حضرت جلال تبریزی مشائخ سلسلہ سہروردیہ میں ممتاز حیثیت کے مالک گذرے ہیں اور برعظیم ہند و پاک کے صوفیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ شیخ الشیوخ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور حضرت ابو سعید تبریزی کے مرید تھے تبریز و اصفہان کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ ایک عرصہ تک ملتان میں قیام کیا۔ حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی اور دوسرے مشائخ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہاں سے دہلی میں نزول فرمایا۔ کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد بنگال تشریف لے آئے۔ بنگال میں سہروردیہ سلسلہ کو آپ ہی کی وجہ سے فروغ ہوا۔ کافی عمر پائی۔ مشہور مراکشی سیاح ابن بطوطہ جس نے ۱۳۴۶-۱۳۴۵ء میں بنگال کی سیاحت کی تھی کامرو میں آپ سے ملا تھا۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ "عجائب الاسفار" میں آپ سے ملاقات کا ذکر بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے اور آپ کے اخلاق و کردار سے کافی متاثر معلوم ہوتا ہے۔ وہ حضرت جلال کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ وہ لانبے قد کے دبلے پتلے بدن کے آدمی ہیں ایک غار میں پڑے یاد الہی میں غرق رہتے ہیں۔ گذشتہ ۴۰ سال سے وہ روزہ رکھتے ہیں اور دسویں دن افطار کرتے ہیں۔ ایک گائے ان کی ملک ہے۔ ان کی بدولت اس علاقہ کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے وہ لکھتا ہے کہ حضرت جلال تبریزی نے مجھے بتایا کہ وہ زوال بغداد کے اور خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے قتل کے وقت بغداد میں موجود تھے۔ اس طرح آپ نے تقریباً ڈیڑھ سو سال عمر پائی۔ ابن بطوطہ نے حضرت جلال سے جس جگہ ملاقات کی تھی وہ موجودہ سلہٹ ہے۔ جب وہ بنگال کا دورہ مکمل کر کے چین گیا تو وہاں اسے حضرت جلال کے انتقال

کی خبر ملی حضرت جلال تبریزی کا انتقال ۱۳۴۷ء میں ہوا۔ سلہٹ میں آپ کی پُرعظمت اور فیض بخش درگاہ ہے۔ اور مغربی بنگال میں مقام پنڈوہ میں چلہ گاہ ہے لیکن وہ بھی مقبرہ کے اندر ایک قبر بنی ہوئی ہے

شاہ جلال سلہٹی :- حضرت جلال الدین تبریزی اور حضرت شاہ جلال سلہٹی کے بارے میں اب تک یہ اختلاف ہے کہ آیا دونوں ایک ہی بزرگ ہیں یا دو جدا گانہ شخصیتیں ہیں اور ابن بطوطہ نے کامروپ کے علاقہ میں جن بزرگ سے ملاقات کی تھی وہ کون تھے۔ جہاں تک ابن بطوطہ کا تعلق ہے وہ صاف الفاظ میں جلال تبریزی لکھتا ہے۔ لیکن اس پر اختلاف رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ابن بطوطہ کی ملاقات شاہ جلال سلہٹی سے ہوئی تھی چونکہ جلال تبریزی کی شخصیت بہت نامور گذری ہے۔ اس لئے اس کو دھوکا ہوا اور اس نے جلال سلہٹی کو جلال تبریزی لکھ دیا ہے۔ اس خیال کے لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت جلال تبریزی کا انتقال تیرہویں صدی میں بمقام پنڈوہ میں ہوا اور وہیں ان کا مقبرہ بھی ہے۔ اور سلہٹ والے شاہ جلال چودھویں صدی کے بزرگ تھے۔ جن کی ہدایت کے مطابق گوڑ کے فرمانروا سلطان شمس الدین فیروز شاہ دہلوی کے زمانہ میں سلہٹ کے راجہ گور گوبندا پر ۷۰۳ھ میں فوج کشی کی گئی۔ اس مہم میں شاہ جلال بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شریک جہاد تھے ان کے بعض رفقاء کے نام یہ ہیں۔ علی شہزادہ یمنی۔ سید عمر سمرقندی سید محمد غزنوی، زکریا عربی۔ سید علاء الدین بغدادی شاہ کمال یمنی شاہ تیر افغانی۔ شاہ جنید گجراتی۔ عارف ملتانی۔ شاہ داؤد قریشی مخدوم جعفر غزنوی۔ شاہ حسیم الدین نارنولی حسین الدین بہاری۔ سید قاسم دکنی۔ نظام الدین بغدادی نظام الدین کرمانی۔ شاہ شمس الدین بہاری۔ شریف اجمیری وغیرہ۔

حضرت شاہ جلال سلہٹی کے بارے میں پہلے مورخین کا خیال تھا کہ یمن کے رہنے والے تھے مگر حال میں درگاہ سے ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قونیہ کے رہنے والے تھے قونیہ ترکی کا ایک شہر تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت شہاب الدین سہروردی۔ حضرت ابوسعید تبریزی۔ خواجہ شمس تبریزی اور مولانا جلال الدین رومی وغیرہ بھی عرصہ تک قونیہ میں رہے تھے۔ قونیہ اس علاقہ کا دارالحکومت تھا۔ اور وہاں علماء و مشائخ کی بڑی قدر تھی۔ لہذا ممکن ہے کہ جلال تبریزی اور جلال سلہٹی جو قونیہ کے تھے ایک ہوں۔ تبریز اور قونیہ یوں بھی ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اس زمانہ میں ایران اور ترکی کا جغرافیہ آج سے مختلف تھا۔ بہرحال حضرت جلال کو مغربی اور مشرقی بنگال میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔ پنڈوہ اور سلہٹ دونوں جگہوں کی درگاہیں ہر زمانہ میں مرجع خاص و عام رہی ہیں۔

شرف الدین توالہ :- حضرت مخدوم شرف الدین توالہ بخاری تیرہویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں دہلی سے سونارگاؤں تشریف لائے۔ آپ ایک بلند پایہ عالم اور بزرگ صوفی تھے۔ سونارگاؤں میں حضرت شرف الدین توالہ کا مدرسہ بہت مشہور تھا جہاں دور دراز سے شائقین علم فیض یاب ہوتے تھے۔ حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی حضرت شرف الدین توالہ تقریباً ۶۶۷ھ ہجری میں سونارگاؤں آئے۔ دہلی سے آتے ہوئے آپ نے کچھ مدت منیر میں بھی قیام کیا جب وہاں سے آنے لگے تو حضرت مخدوم شرف الدین بہاری کو ساتھ لیتے آئے اور تمام مروجہ دینی علوم سے آراستہ کر کے ایک مرد کامل بنایا۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کی شادی بھی مخدوم الملک سے کر دی۔ حضرت شرف الدین توالہ کی تصانیف میں ایک منظوم رسالہ نام حق بہت مشہور ہے جس میں فقہی مسائل بیان کئے گئے تھے۔ دس بیس سال قبل تک گلستان۔ بوستان۔ کریما اور مامقیماں کے ساتھ نام حق بھی طلبا کو پڑھایا جاتا تھا اس رسالہ کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

حضرت شرف الدین توالہ کا انتقال ۶۸۴ھ میں سونارگاؤں میں ہوا۔ موگرا پاڑہ سونارگاؤں میں آپ کا روضہ ہے۔ ہر سال شعبان کے مہینہ میں عرس ہوتا ہے۔ مخدوم الملک شرف الدین بہاری ۶۶۷ھ سے ۶۹۰ھ تک سونارگاؤں میں رہے۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگال میں تعلیم کا دور تصوف کی ترویج و اشاعت کا عہد بن گذرا ہے۔ چاٹگام سے ست گاؤں تک مشائخ اور علماء اپنے مشن میں مصروف تھے۔ دہلی اور بہار کی طرح بنگال میں بھی بکثرت اولیاء اللہ گذرے ہیں۔ اس کا اندازہ مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک مکتوب سے

ہوتا ہے جو انہوں نے جون پور کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو ۱۴۱۵ء میں لکھا تھا۔ اس مکتوب سے بنگالی بزرگانِ دین اور ان کے مختلف سلسلوں پر جھلک پڑتی ہے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر لکھتے ہیں۔ "سرزمین بنگال بھی کتنی عمدہ سرزمین ہے۔ جہاں مختلف مقامات سے بے شمار مشائخ اور فقراء آئے۔ جنہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا۔ مثال کے طور پر دیوگاؤں کو لیجئے جہاں شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے ستر ممتاز مرید ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سلسلہ سہروردی کے کئی اور ممتاز بزرگ مہسی میں مدفون ہیں۔ یہی حال دیوتلہ میں سلسلہ جلیلہ کے بزرگوں کا ہے۔ ناکوٹی کے مقام پر بھی شیخ المشائخ اور شیخ احمد دمشقی کے بعض بہترین رفقاء کے مزاروں کا پتہ چلا ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بارہ بزرگوں میں سے ایک حضرت شیخ شرف الدین توامہ کا مزار سونارگاؤں میں ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین منیری ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بعد حضرت باد عالم اور حضرت بدر عالم زاہدی گذرے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کے شہروں کا تو کیا ذکر کوئی قصبہ یا قریہ ایسا نہ تھا جہاں بندگانِ دین نہ پہنچے ہوں اور آباد نہ ہوئے ہوں۔"

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی خود باوقار صوفی گذرے ہیں۔ آپ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدا میں سلسلہ سہروردیہ کو بنگال میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ قادریہ، چشتیہ اور زاہدیہ سلسلہ کے مشائخ بعد میں پہنچے چشتیہ سلسلہ کی اشاعت کی اولیت کا سہرا حضرت عثمان اخی سراج کے سر ہے۔

عثمان اخی سراج۔ حضرت عثمان اخی سراج چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے ممتاز خلیفہ اور مرید تھے۔ آپ ہی کے مشورہ سے دہلی سے گوڑ تشریف لائے۔ سلطان فیروز شاہ دہلوی بنگال کا حکمران تھا۔ حضرت عثمان اخی سراج کی گوڑ میں کافی قدر و منزلت تھی۔ ۱۳۵۷ء میں وہیں انتقال فرمایا۔ حضرت عثمان اخی سراج کے معاصرین میں ایک بزرگ شیخ بیابانی تھے۔ سلطان شمس الدین الیاس آپ کا بہت معتقد تھا۔ "ریاض السلاطین" میں درج ہے کہ جس زمانہ میں شہنشاہ فیروز شاہ تغلق سلطان الیاس کا اکدالہ کے قلعہ میں محاصرہ کئے ہوئے تھا ۱۳۵۴ء میں شیخ راجا بیابانی کا وصال ہو گیا۔ چونکہ سلطان کو انتہائی عقیدت تھی اس لئے فقیر کا بھیس بنا کر قلعہ سے نکلا اور گوڑ جا کر شیخ راجا بیابانی کے نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کی اور پھر قلعہ میں واپس آ گیا۔ دیناج پور کے علاقہ میں مولانا عطا نام ایک صوفی کا کافی اثر تھا۔ آپ کی تبلیغ کا زمانہ ۱۳۰۰ء سے ۱۳۵۵ء تک۔ سلطان الیاس شاہ کے لڑکے سلطان سکندر شاہ نے دیوی کوٹ میں آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔

چاٹگام میں شیخ بسطامی کا ایک چلہ ہے۔ اس چلہ گاہ میں ایک مصنوعی مزار بنا ہوا ہے۔ چاٹگام کے تمام عوام و خواص اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ درگاہ کی عمارت ایک پہاڑی پر ہے۔ مسجد، مسافر خانہ اور تالاب وغیرہ کی موجودگی سے یہاں کا منظر بڑا پُرکشش ہے۔ شیخ بسطامی کے حالات لوگوں کو معلوم نہیں۔ کب چاٹگام پہنچے اس کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کا مقبرہ بہار شریف ضلع پٹنہ میں ہے۔ شیخ بسطامی نام کے ایک بزرگ شہنشاہ غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں دہلی میں موجود تھے۔ شیخ جمال الدین بسطامی کے نام سے تذکروں میں آیا ہے۔ شیخ زادہ بسطامی آپ کے لڑکے تھے جن کی شادی شہنشاہ غیاث الدین تغلق کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ شہنشاہ محمد تغلق نے شیخ زادہ بسطامی کو مانکپور کڑا کا حاکم مقرر کیا تھا۔

پیر بدر عالم زاہدی۔ بہار و بنگال کے مشائخ میں پیر شاہ بدر عالم زاہدی کی شخصیت بڑی ارفع و اعلیٰ اور پُرکشش گذری ہے۔ پیر بدر عالم خاندانی صوفی اور عالم تھے۔ آپ کے بزرگوں میں حضرت خواجہ شہاب الدین امام زاہدی سب سے پہلے مکہ سے ہندوستان تشریف لائے۔ میرٹھ میں قیام فرمایا۔ خواجہ شہاب الدین امام کعبہ زاہدی متوفی ۶۵۸ھ اور آپ کے لڑکے خواجہ فخر الدین خداداد بزرگ زاہدی متوفی جمادی الثانی ۶۶۵ھ کے مزارات میرٹھ میں ہیں۔ حضرت فخر الدین خداداد بزرگ زاہدی کے لڑکے خواجہ شہاب الدین حق گو شہید زاہدی دہلی میں رہنے لگے۔ شہنشاہ محمد تغلق نے شہید کروا دیا روضہ مبارک تغلق آباد دہلی میں قلعہ کی فصیل کے نیچے ہے۔ آپ کے صاحبزادے خواجہ فخر الدین ثانی زاہدی کا زمانہ بھی دہلی میں گذرا۔ دہلی میں حوض شمسی پر مزار ہے۔

پیر بدر الدین بدر عالم زاہدی آپ ہی کے صاحبزادے تھے پہلے بہار شریف پہنچے پھر وہاں سے بنگال آئے اور چاٹگام کو مرکز قرار دیکر

رشد و ہدایت شروع کی۔ جس زمانہ میں پیر بدر عالم بنگال آئے فخرالدین مبارک شاہ (۴۹ - ۱۳۳۶) کا عہد تھا۔ سلطان مبارک شاہ آپ کا بہت معتقد اور غالباً مرید بھی تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان فخرالدین مبارک شاہ نے پیر بدر عالم کی ہدایت کے مطابق چاٹگام پر حملہ کیا تھا۔ آپ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیدا ہوئے ۱۳۳۶ء اور ۱۳۳۹ء کے درمیانی زمانہ میں بنگال پہنچے۔ تقریباً چالیس سال تک بنگال کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتے رہے۔ بعد ازاں مخدوم الملک شرف الدین بہاری کی رحلت کے چند ماہ بعد بہار شریف چلے گئے اور وہیں چودہویں صدی کے آخری سالوں میں وصال فرمایا۔ بہار شریف میں آپ کا آستانہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ چاٹگام میں بمقام بدر پٹی روڈ آپ کا چلہ ہے۔ آپ نے مغربی بنگال میں بھی تبلیغ کی تھی۔ پنڈوہ کے قریب بردوان ضلع میں کالنا میں بھی آپ کا ایک چلہ ہے۔

پیر بدر عالم زاہدی کا بنگال کے عوام کے دل و دماغ پر زبردست غلبہ ہے۔ خصوصاً ملاحوں کے محافظ سمجھے جاتے ہیں جب کوئی ملاح اپنی کشتی دریا میں ڈالتا ہے اور لنگر کھولتا ہے تو اللہ نبی کا نام لے کر "بدر بدر" کا نعرہ لگاتا ہے۔ چاٹگام کے دیہاتوں میں پہلوان کشتی کے مقابلہ کو جائیں گے تو پہلے پیر بدر کو یاد کر لیں گے۔ چاٹگام میں آپ کے چلہ پر جو ایک شاندار پختہ درگاہ بنی ہوئی ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت سب حاضر ہوتے ہیں چاٹگام سے آگے۔ اراکان۔ اکیاب۔ تیز برما اور ملایا تک پیر بدر کا نام لیا جاتا ہے۔ اراکان۔ اکیاب اور چاٹگام میں متعدد مقامات جیسے بدر پٹی روڈ۔ بدر کنواں بدر کھالی۔ بدر مکان وغیرہ آپ سے منسوب ہیں اس بزرگ کے نام میں نہ معلوم کون سی کشش ہے کہ صدیوں گذر جانے کے بعد آج بھی لوگوں کو وہی عقیدت ہے۔ چاٹگام اور کالنا کے علاوہ ڈھاکہ کے نزدیک سونار گاؤں میں "پانچ پیر بدر" کی ایک درگاہ ہے۔ جہاں پیر بدر کے مریدوں کے مزارات ہیں۔ بنگال کے مشائخ میں پیر بدر اور شاہ جلال جیسی مقبولیت کسی اور کو نہ ہوئی۔ بہار میں بھی پیر بدر کو وہی درجہ حاصل ہے۔ بہار کے صف اول کے مشائخ میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ چاٹگام سے مع متعلقین بہار شریف تشریف لے گئے وہاں آپ کی نسل صوبے کے مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور سادات بہار میں زاہدیوں کو معیاری رتبہ حاصل ہے۔ پیر بدر عالم کی دو شادیاں ہوئیں جن سے کئی اولادیں ہوئیں اور سلسلہ نسل چلا۔ اس برگزیدہ صوفی کے سینہ پر بال کچھ اس طرح کے تھے کہ کلمہ طیبہ بنتا تھا۔ لحمیات سے پرہیز رکھتے تھے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کے صاحبزادہ شاہ سلطان زاہدی نے سلسلہ زاہدیہ کی بہار میں سجادگی سنبھالی۔ بنگال کا بچہ بچہ پیر بدر کا نام اسی طرح لیتا ہے جس طرح حضرت غوث پاک کا۔

نور قطب عالم:- پیر بدر عالم کے ہم زمانہ بزرگوں میں پنڈوہ کے شیخ علاء الحق اور نور الحق ممتاز صوفیا تھے حضرت شیخ علاء الحق شیخ اسد لاہوری کے فرزند تھے۔ چودہویں صدی کے اوائل میں حضرت اسد لاہوری بنگال پہنچے۔ حضرت علاء الحق شیخ عثمان اخی سراج کے مرید و خلیفہ تھے۔ بہت شاہ خرچ تھے۔ آپ کو ایک مرتبہ گوڑ کے سلطان نے اپنی مملکت سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اس زمانہ میں آپ سونار گاؤں چلے آئے۔ پھر کچھ مدت بعد واپس گئے اور ۱۳۹۸ھ میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک پنڈوہ میں ہے آپ سے زیادہ شہرت آپ کے صاحبزادے حضرت نور الحق عرف نور قطب عالم نے حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندو راجہ گنیش کے ظلم و جور کے خلاف جون پور کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو اس کی سرکوبی کیلئے مدعو کیا۔ اور راجہ گنیش کے بیٹے نے انھیں کے اثر سے اسلام قبول کیا تھا اور راجہ گنیش کے بعد جلال الدین فتح شاہ کے لقب سے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ حضرت نور قطب کا وصال ۱۰ ذیقعدہ ۸۱۸ھ مطابق ۱۴۱۵ء میں ہوا۔ پنڈوہ میں دونوں باپ بیٹا حضرت علاء الحق اور نور قطب عالم کا شاندار مقبرہ ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی حضرت علاء الحق ہی کے مرید تھے۔ وہ مخدوم الملک شرف الدین بہاری کا شہرہ سنکر ان سے شرف بیعت حاصل کرنے بہار شریف پہنچے۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا بجائے بیعت کے آپ کو مخدوم الملک کے جنازہ کی نماز پڑھانی پڑی وہاں سے اسی سال یعنی ۷۸۲ھ میں پنڈوہ پہنچے اور شیخ علاء الحق کے مرید ہوئے۔ پیر بدر عالم زاہدی اور شیخ علاء الحق پنڈوہ کے دور کے دوسرے بزرگوں میں شاہ محسن اولیا (چاٹگام) متوفی ۷۹۱ھ پیر شاہ راستی (رپڑہ) ۸۸-۱۳۵۱ء) شاہ فضل نرفرد (بوگی) متوفی ۱۳۷۵ء وغیرہ قابل ذکر گزرے ہیں۔

اس کے بعد پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے مشائخ میں مولانا برخوردار (گوڑ) متوفی ۱۴۸۶ء الشیخ جلال الدین دکنی متوفی ۱۴۷۶ (موتی جھیل ڈھاکہ) سید ابراہیم دانشمند (مگرا پاڑہ سنار

گاؤں) حضرت نعمت اللہ کرونبت شکن، ملک پیرنمی متوفی ۹۱۵ھ (ڈھاکہ) شاہ علی بغداد (میرپور ڈھاکہ) حاجی بابا صالح (بندر نرائن گنج) شاہ علی ترمذی (ڈھمرائی ڈھاکہ) مولانا شاہ معظم دانشمند عرف شاہ دولہ (باگھ پٹنہ) سید جلال الدین عاملی سیتگرام متوفی ۱۵۳۱ھ وغیرہ گزرے ہیں۔ ان میں سے حضرت علی بغدادی کی درگاہ ڈھاکہ کی مہاجر بستی میرپور میں ہے حضرت علی بغدادی کو ڈھاکہ کے قطب کی حیثیت حاصل ہے۔ ہر سال عیدالاضحیٰ کے مہینہ میں بہت شان کے ساتھ عرس ہوتا ہے۔ شہر کے عوام اور تاجر طبقہ کو آپ سے گہری عقیدت ہے۔ حضرت شاہ بغدادی کے والد کا نام شاہ فخر الدین بغدادی تھا۔ بڑے بھائی شاہ بہاء الدین بغدادی تھے۔ دہلی سے بنگال آئے اور میرپور میں اسی جگہ جہاں پر درگاہ ہے ایک مسجد میں قیام فرمایا ۱۴۸۰ء میں انتقال ہوا۔ درگاہ پختہ اور گنبددار ہے۔ سونار گاؤں میں حضرت سید ابراہیم دانشمند کا مقبرہ ہے جس میں آپ کے علاوہ آپ کے صاحبزادے حضرت سید محمد اہل العلم اور سید محمد کے صاحبزادے حضرت یوسف اہل العلم کے مزارات ہیں۔ یہ مقبرہ مغلوں کے قبل کا تعمیر شدہ ہے۔ حضرت سید ابراہیم دانشمند سلطان سید علاء الدین حسین شاہ کے عہد میں آئے تھے۔

بنگال کے مشائخ کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خواجہ جہاں علی کا ذکر نہ کیا جائے۔ خواجہ جہاں علی کون تھے۔ یہ اب تک تحقیق نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی فوجی افسر یا حکمراں تھا جس نے آخر وقت میں درویشی اختیار کر لی۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ رفاہ عامہ کے کام کرنے لگا۔ جیسور۔ فریدپور اور کھلنا کے اضلاع میں اس نے متعدد تالاب اور کنوئیں کھدوائے۔ سرائیں بنائیں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کا سب سے شاندار کارنامہ باگرہاٹ کھلنا کی ساٹھ گنبد والی مسجد ہے۔ یہ مسجد دہلی اور شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں کی مساجد کے نمونہ پر ہے۔ اس میں ۷۷ قبے۔ چاروں کونوں پر مخروطی طرز کے دو منزلہ مینارے اور سامنے کی طرف گیارہ دروازے ہیں۔ درمیانی دروازہ نسبتاً بڑا ہے۔ عمارت کا اندرونی حصہ سات دالانوں پر مشتمل ہے یہ مسجد ۱۴۴۹ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس سے کچھ دور خواجہ جہاں کی درگاہ ہے۔ اس نے اشاعت اسلام میں بھی حصہ لیا۔ رنگپور کے شہید اسمٰعیل غازی ۱۴۷۴ء اور باقرگنج ضلع کے سید العارفین بھی خواجہ جہاں کی طرح فوجی افسران تھے جنہوں نے اسلام کی اشاعت میں بھی حصہ لیا تھا جس کی وجہ سے آج انہیں بھی لوگوں نے بزرگوں کی صف میں شامل کر لیا ہے اور ہر سال ان کے مزارات پر عرس ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں بنگال کے سلاطین کے مذہبی رجحانات بھی لائق ستائش ہیں۔ ہر زمانہ میں حکمرانوں نے علماء اور صوفیاء کو اشاعت دین کے کاموں میں ممکن سہولتیں پہنچانے کی کوششیں کیں۔ یہ سلاطین مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کراتے۔ لنگر خانے کھولتے۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے علماء اور مشائخ کو بلاتے اور ان کی سرپرستی کرتے بیان کیا جاتا ہے کہ ۲۸۸ھ میں گوڑ قلندریہ سلسلہ کے درویشوں کا مرکز تھا۔ طغان الدین طغرل نے اسی فرقہ کے ایک سردار کے مشورہ سے شہنشاہ بلبن کے خلاف بغاوت کی تھی۔ سلطان فخر الدین مبارک شاہ درویشوں کا بہت عقیدت مند تھا اس نے ایک درویش شیدا کو چاٹگام کا گورنر کیا تھا۔ شیدا نے بغاوت کی کوشش کی۔ سلطان کے لڑکے کو قتل کر ڈالا۔ آخر میں پکڑا گیا اور مارا گیا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ بنگال میں صوفیوں کی تقریباً ڈیڑھ سو گدیاں قائم تھیں۔ اس کا بیان ہے کہ سلطان فخر الدین مبارک شاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ سونار گاؤں آنے والے درویشوں سے کشتیوں کا کرایہ نہ لیا جائے۔ اس کے علاوہ درویشوں کے قیام و طعام کے لئے خانقاہیں اور لنگر خانے تھے۔ سونار گاؤں شہر میں داخل ہونے پر انہیں سلطان کی طرف سے نذرانہ بھی ملتا تھا۔ سلطان فخر الدین نے درویش پیر بدہ عالم زاہدی کی دعوت پر چاٹگام پر حملہ کیا تھا۔

سلطان فیروز شاہ دہلوی۔ سلطان فخر الدین مبارک شاہ سلطان حاجی شمس الدین الیاس سلطان غیاث الدین اعظم شاہ اور سلطان سید علاء الدین حسین شاہ جیسے عظیم اور نامور حکمراں درویشوں۔ فقراء۔ علماء اور مشائخ کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے۔ مولف ریاض السلاطین کے بیان کے مطابق پنڈوہ میں حضرت جلال الدین تبریزی اور شیخ نور قطب عالم کے آستانے پر سلطان سید علاء الدین حسین شاہ اور دوسرے سلاطین زیارت کے لئے حاضر ہوتے۔ حضرت جلال تبریزی۔ شاہ جلال سلہٹی۔ حضرت عثمان اخی سراج۔ پیر بدہ عالم زاہدی۔ شیخ علاء الدین اور نور قطب عالم کا عوام و خواص پر زبردست اثر تھا۔ ان کی ہدایت پر سلاطین فوج کشی تک کرتے تھے۔ انہیں بزرگان دین کے اخلاق عالیہ و معارف

محمد عیسیٰ
ترجمہ:۔ غلام محمد

کھومی

کھومی قبیلہ بندربن میں رہتا ہے۔ بندربن میں چاٹگام کے پہاڑی علاقے کا ایک سب ڈویژن ہے یہ لوگ دریائے سانگو۔ اور دریائے ماتھاموہری کے کنارے کنارے ایک بہت بڑی تعداد میں رُوما اور رِلاما پولیس اسٹیشن میں آباد ہیں۔ مرد ننگے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تکلفاً ایک لنگوٹی اور پگڑی باندھ لیتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ہاں بڑے مہذب سمجھے جاتے ہیں۔ اور جیکٹ پہنتے ہیں وہ لوگ اپنے سر کے بال ذرا نہیں تراشتے۔ زلفیں رکھتے ہیں۔ سر میں بائیں جانب اپنی زلفوں میں گرہ ڈالتے ہیں۔ کنوارے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ اپنی زلفوں میں تازہ پھول یا چاندی کے کنگھے سجاتے ہیں۔ کان چھیدتے ہیں۔ چاندی کی موٹی موٹی بالیاں پہنتے ہیں۔ کوئی کوئی مونچھ رکھتا ہے۔ لیکن ڈاڑھی کوئی نہیں بڑھاتا۔

عورتیں گھر میں بُنے ہوئے کپڑوں، کا ایک، چھوٹا سا سُرخ لباس پہنتی ہیں۔ جو ان کی کمر کے گرد ہوتا ہے۔ باقی کولھے پر لباس کھلا ہوتا ہے لباس اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ مشکل سے ان کے کولھے چھپتے ہیں۔ کمرے اُوپر ان کا جسم ننگا ہوتا ہے کچھ نہیں پہنتیں۔ چاندی کی زنجیر یا چاندی کے سکے ان کی کمر میں بندھے ہوتے ہیں۔ گلے میں وہ کوڑیوں کے سچل ہار پہنتی ہیں۔

مرد اور عورت دونوں ہی جڑی بوٹی استعمال کر کے اپنے دانت سیاہ کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں سیاہ دانت حُسن کی علامت ہیں۔ ان کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

یہ لوگ اپنا راز کسی سے نہیں کہتے۔ فطرتاً بڑے بات چھپانے والے اور الگ تھلگ رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنی بولی نہیں سکھاتے۔ اور جب کوئی شخص از خود ان کی بولی سیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی تشویش اور غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔

کھومی پہاڑیوں پر دریا کے کنارے کنارے بانس کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ جھومی کاشت کرتے ہیں۔ یعنی چلتے چلتے ایک جگہ ٹھہر گئے کھیتی باڑی کی۔ اناج پیدا کیا۔ پھر آگے بڑھ گئے۔ عموماً خزاں کے دنوں میں چلتے وقت چھوڑی ہوئی چیزیں جلا دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جھومی کاشت کرنے کے سات برس تک۔ اس زمین پر کاشت نہیں کی جا سکتی۔ وہ نمک۔ اور مٹی کے تیل کے علاوہ تیسری کوئی چیز نہیں خریدتے۔ یہ خانہ بدوش لوگ ہیں ایک جگہ نہیں ٹھہرتے۔ چلتے رہتے ہیں۔ چند ہی ایسے لوگ ملیں گے۔ جو کسی جگہ آباد ہو گئے ہیں۔ باقی پورے علاقے میں "جھومی" کاشت کرتے پھرتے ہیں۔

عورتیں لکڑیاں چیرتی ہیں۔ کھانا پکاتی ہیں۔ دریا۔ یا تالاب سے پانی بھرتی ہیں۔ دھاگے رنگتی ہیں۔ کپڑے بُنتی ہیں۔

دوسرے قبائل کے برعکس کھومی بڑے جرم پسند ہوتے ہیں گزشتہ جنگ عظیم کے اختتام کے موقع پر جاپانی اور برطانوی فوجیوں کے گودام سے قسم قسم کے ہتھیار ان کے ہاتھ لگے۔ ان لوگوں نے ڈاکہ ڈالنے کی خاطر، رام داؤ، تلواریں۔ اور، بندوقیں جمع کر رکھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں چھوٹے چھوٹے بم بھی پائے جاتے ہیں۔ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے ڈاکہ ڈالنے کا طریقہ کچھ عجیب سا ہے۔ مثلاً جس گھر میں ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ داخل ہوتے ہی باہر بہت نوکیلے کانٹے بچھا دیتے ہیں۔ جنہیں ٹوکری یا تھیلی میں بھر کے اپنے ساتھ لاتے ہیں تاکہ کوئی مدد کے لئے نہ آ سکے۔ نہ کوئی بھاگ سکے۔ لُوٹتے ہیں۔ قتل و غارت کرتے ہیں۔

وہ لوگ اکثر پولیس یا فوجی وردی میں آتے ہیں۔

کھومی، مال و دولت، گہنے پاتے، اور، افیون کے بڑے رسیا ہیں۔ اس کے علاوہ تیل۔ مسالہ۔ سوکھی یا نمکین مچھلی۔ چاول۔ دال وغیرہ کے لئے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور جب چیزیں بہت زیادہ اکٹھی ہو جاتی ہیں تو کچھ لوگوں کو پکڑے جاتے ہیں۔ تاکہ ان سے سامان لے جانے، لانے کشتی کھینے یا کھانا پکانے کا کام لے سکیں۔ انہیں اپنے

(بقیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

محمد عیسیٰ
ترجمہ غلام محمد

شیر کے ایسے لوگ

سالوٹیکر (واقع سلہٹ) میں شیر کو جال پھینک کے پکڑتے ہیں ہرن۔ یا خرگوش کے ایسے جانور تو جال پھینک کے پکڑے جاسکتے ہیں۔ انگریزی فلمیں دیکھیے۔ افریقہ کے جنگلات میں بڑے بڑے شکاری ایسا شکار پکڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ لیکن سالوٹیکر کی مثال شاید دنیا کے کسی خطہ میں نہیں ملتی۔ عجیب سنسنی خیز قسم کا کھیل ہے۔ لوگ اسے کھیل ہی تو سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اب سے کوئی دس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میں سالوٹیکر کے سٹلمنٹ کیمپ میں تربیت حاصل کر رہا تھا۔ سنا کہ باگھمارا میں لوگ شیر پکڑ رہے ہیں۔ بہت خوش ہوا۔ ہم ۵ دوستوں کو ساتھ لیا۔ سردی کا موسم تھا صبح کے تین بجے چل پڑا۔ سلہٹ کی سردی مشہور ہے۔ دانت بج رہے تھے۔ میلوں اندھیرے میں کھیت کی پتلی پتلی کیاریوں پر کوٹ کے کالر اٹھائے چلتے رہے۔ دفعتاً بڑی مدھر بانسری سنی۔ سورج نکل آیا تھا۔ دیکھا ایک جگہ بچے اچھلتے کودتے ہیں۔ کھلونے بک رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ میلہ کا ایسا سماں ہے۔ لوگ بانسری بجا رہے ہیں۔ زرق برق لباس پہنے عورتوں بچوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں ہم تقریباً کھو گئے۔ بھول گئے کہ ہم لوگ کہاں اور کس لئے آئے تھے؟ بھوک لگی۔ تو خیال آیا کہ نہیں۔ ہم لوگ اس تفریح کے لئے نہیں آئے تھے۔

فوراً آگے بڑھے۔ دیکھا۔ کچھ سن رسیدہ لوگ آپس میں سر جوڑے بیٹھے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے کسی مسئلہ پر گفت و شنید کر رہے ہیں ہم لوگ بھی وہیں جا بیٹھے۔ لوگ یہ طے کر رہے تھے کہ کس طرح سے شیر پر آخری حملہ کرنا چاہیے۔ تھوڑی بہت بحث و مباحثہ کے بعد طے کر لیا۔ پھر سبھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ فتح کے لئے دعا مانگی۔ پورا ماحول انتہائی سنجیدہ۔ بلکہ ایک عبادت کا سا جیسا تھا۔ لوگوں کے چہرے پر ایک چمک تھی پھر وہ لوگ معائنہ کے لئے نکلے۔ سب سے بوڑھے آدمی نے قیادت کی۔ لگتا تھا۔ جیسے کمانڈر انچیف اپنے بریگیڈیر کمانڈر کے ساتھ معائنہ کے لئے نکلا ہے۔ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے سپاہیوں نے کیسی قلعہ بندی کی ہے؟ بانس کے چھوٹے چھوٹے چھپر بانس کے ستونوں پر استادہ ذرا ذرا فاصلہ پر سنتری پوسٹ، کی مانند واقع تھے۔ ادھ جلی مشعلیں جو بانس پر پرانے کمبل یا بوسیدہ لپیٹ کے بنائی گئی تھیں، بکھری پڑی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں نے رات بھر جاگ جاگ کے پہرہ دیا ہے۔ مگر اس وقت دن تھا۔ پہرے کچھ رات ہی کے انداز سے لگے ہوئے تھے لوگ ہاتھ میں بھالے لئے کھڑے تھے۔ سامنے جال کا ایک سلسلہ تھا۔ کوئی پانچ چھ فٹ اونچا تھا۔ ایک دائرہ کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ جال کے دائرہ میں زمین کا وہ حصہ محیط تھا۔ جس پر گھاس کے ہرے ہرے تختے تھے۔ بوڑھے نے اشارہ کیا تو ایک نوجوان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ خدا کا نام لیتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر اس بانس کی ہلکی ہلکی حرکت سے جال کو اندر کی طرف کھینچنا شروع کیا جو نیچے جال سے بندھا ہوا تھا۔ قد آدم ہاتھی گھاس کو گرا دیا۔ جال کو بیچ میں سے بند کر دیا۔ شیر کے گرد و پیش پھیلا ہوا قدرے وسیع و عریض احاطہ ہر لمحہ تنگ ہوتا گیا۔ لوگوں نے آہستہ آہستہ شیر کو شکنجے بند ہونے والے دروازے کی طرف ہانکنا شروع کیا۔ جس کے راستہ وہ پھیلے ہوئے جال میں آکے پھنس جائے۔ کچھ لوگ موسیقی کی دھن پر قسم قسم کے نغمے بکھیر رہے تھے تاکہ شیر ڈرے، گھبرائے، الجھے، پریشان ہو۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ پیچھے مڑ کے لوگوں پر حملہ کر دے۔ ایسے موقع پر لوگ بھالے سے سنبھال لیتے ہیں۔ مگر ایک بات بڑی اہم ہے۔ شیر جب بھاگتا ہے تو کوئی اس پر پیچھے سے حملہ نہیں کرتا۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آئندہ کبھی اس قسم کے شکار میں شریک نہیں کیا جاتا۔ لوگ بھاگتے ہوئے شیر پر حملہ کرنا بزدلی سمجھتے ہیں۔

ہاں۔ شیر کو آہستہ آہستہ دروازے کی طرف ہانکتے میں ماں دفعتاً میں موسیقی کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ شیر دروازے کے آگے کھلی

(بقیہ صفحہ ۳۹۲ پر)

محمد علسی
ترجمہ۔ غلام محمد

کرناپھلی

کرناپھلی مشرقی پاکستان کا ایک بڑا اہم دریا ہے۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں بہتا ہے۔ اس دریا پر پاکستان کا عظیم ترین ڈیم بنا ہے۔ جو کپتائی میں واقع ہے۔ آج کپتائی دل کی مانند دھڑکتا ہے۔ دن کو چاندی اور رات کو ہیرے کی طرح چمکتا ہے۔ ایسے من چلے دریا کے نکیل ڈالنا۔ شاید پاکستان کی تاریخ میں انسان کی بہت بڑی فتح ہے۔

اس دریا سے متعلق کئی روائتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ آج سے بہت پہلے موجودہ چاٹگام کا ایک مسلمان حکمران ایک دن دریا کی سیر کر رہا تھا۔ ہاتھ میں اس کی محبوبہ کے کان کا کرن پھول تھا۔ جو اتفاق سے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر پڑا۔ حکمران بہت پریشان ہوا کرن پھول کو ڈھونڈھ نکالنے کی خاطر اس نے دریا میں چھلانگ لگادی۔ لیکن کرن پھول ملنا تھا نہ ملا۔ یہ بے چارہ حکمران اس کی تلاش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ شاید اسی سانحہ کے بعد، اس دریا کا نام کرناپھلی پڑ گیا۔ سنسکرت میں کرنا کان کو کہتے ہیں اور پھلی پھول کو۔

اس سے پہلے اس دریا کا نام "کا نتسا کھیرنی" تھا۔

بعض کتابوں میں اس دریا کا نام "کا نتسا کھیبنگ" بھی لکھا ہے دوسری روایت ہے جسے نذر احباب کرتا ہوں۔ دورِ مغلیہ میں چاٹگام کے وزیر کی بیٹی ایک دن اس دریا پر تفریح کرنے کو گئی۔ بہتے دریا۔ ہرے بھرے درختوں اور خوبصورت اونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھا۔ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے اپنا کرن پھول اتار کے اس دریا میں ڈال دیا۔

کرناپھلی سے بڑی بڑی کہانیاں وابستہ ہیں اس دریا کے پانی میں ایک نوجوان عاشق نے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے ہزاروں فیٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائی تھی۔ بڑی المناک داستان ہے۔ کیسے کیسے خوبصورت نوجوان آئے تھے۔ چھلانگ لگائی۔ ہزاروں فیٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائی۔ پاش پاش ہوگئے۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا۔ جس کے ایک ہی بیٹی تھی۔ دوسری کوئی اولاد نہ تھی۔ بادشاہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ ایک دن بڑی ہو جائے گی۔ بیاہی جائے گی۔ اپنے شوہر کے گھر چلی جائے گی۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب اس کی بیٹی جوان ہوئی تو وہ اسے گھر میں بھی بٹھا کے نہ رکھ سکتا تھا۔ نہ اس سے جدا ہونے کی سوچ سکتا تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ آخر کار بادشاہ کو ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے منادی کرادی کہ جو شخص پہاڑ کی بلندترین چوٹی سے دریا میں چھلانگ لگا کے تیرتا ہوا دریا عبور کرے گا۔ بادشاہ اسی شخص سے اپنی بیٹی کو بیاہ دے گا۔ کیسے کیسے خوبصورت نوجوان آئے۔ چھلانگ لگائی۔ ہزاروں فیٹ کی بلندی سے نیچے گرے۔ پاش پاش ہوگئے۔ بڑی کٹھن آزمائش تھی۔ کوئی پورا نہ اترتا تھا۔ مگر شہزادی اتنی خوبصورت تھی کہ نوجوان آتے تھے شہزادی کو دیکھتے تھے۔ جان دے دیتے تھے

ان ہی دنوں ایک شہزادہ آیا۔ بادشاہ سے بولا کہ وہ شہزادی کے لئے اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے شہزادہ کو دیکھا۔ دل بھر آیا۔ بیقرار ہوگیا۔ ایسا خوبصورت نوجوان نہ دیکھا تھا۔ یہ بیچارہ بھی شرط کے مطابق ہزاروں فیٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائے گا۔ نیچے گر کے پاش پاش ہو جائے گا۔ بادشاہ نے اسے بہت روکا۔ کہا جاتا ہے کہ خود شہزادی سے رہا نہ گیا۔ آئی۔ بولی۔ "دیکھو۔ شہزادے، ضد نہ کرو۔ واپس چلے جاؤ۔" اس کی کنول کی ایسی آنکھوں میں شبنم جیسے آنسو کے قطرے تیرنے لگے۔ مگر شہزادہ نے بڑے ہی فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "نہیں میں اپنی قسمت آزماؤں گا۔" سب لوگ سمجھاتے سمجھاتے تھک ہار گئے۔ لیکن شہزادہ نہ مانا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ اگلی صبح پہاڑ کی

(بقیہ صفحہ ۳۹۱ پر)

محمد عیسیٰ
ترجمہ: غلام محمد

مورو کا گناہ

چاٹگام کے پہاڑی علاقے میں روما پولیس پوسٹ سے کوئی ۱۶ میل دور تقریباً ۸۰۰ فیٹ کی بلندی پر ایک مستطیل سی جھیل ہے۔ تین طرف پہاڑیوں سے گھری یہ جھیل مشرق کی جانب کھلی ہوئی ہے۔ یہ "بڑو گا کاٹن" کہلاتی ہے اس کے صاف شفاف آئینے کے لیے پانی پر درختوں کا خوبصورت عکس دیکھئے لگتا ہے جیسے یہ پانی کے درخت ہیں۔ جھیل کے اندر پھلتے پھولتے ہیں اوپر کی بجائے نیچے کو بڑھتے ہیں۔ جنگلی بطخیں اور دوسری آتی جاتی آبی چڑیاں رک جاتی ہیں۔ کاٹن کی نقرئی سطح پر تیرتی ہیں، نقش بنتا ہے، مٹتا ہے

اس جھیل میں کوئی نہیں نہاتا۔ چند چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے علاوہ دوسرے آبی جانور وغیرہ نہیں پائے جاتے۔ اس کی گہرائی ۱۹۸ فیٹ ہے۔

کہتے ہیں کہ برس میں ایک دن جھیل کا پانی رنگ بدلتا ہے اس کا پس منظر ایک بڑی دردناک کہانی ہے۔

اب سے ہزاروں۔ ہزاروں برس پہلے ٹھیک اسی مقام پر جہاں آج یہ مستطیل ۱۹۸ فیٹ گہری جھیل واقع ہے۔ ایک قبیلہ رہتا تھا مورو کہلاتا تھا۔ یہ لوگ بڑے نیک اور امن پسند تھے۔ کم بانی کرتے تھے۔ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی طرح کا غم تھا نہ خوف۔ نہ خطرہ۔ کوئی اپنے دروازہ پر قفل نہیں ڈالتا تھا۔ ان کے مویشی قرب و جوار کے پھیلے ہوئے ہرے بھرے میدانوں میں چرتے۔ مگر ایک دن مویشیوں کی ایک بہت بڑی تعداد غائب ہو گئی۔ سب لوگ پریشان ہوئے۔ اس سکھ نگری میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ جانور کیا ہوئے؟ کہاں گئے؟۔

لوگوں نے اسے محض اتفاق سمجھا۔ رو پیٹ کے صبر کر لیا۔ مگر اسی نوعیت کا ایک واقعہ پھر ہوا اس کے بعد متواتر یہی ہونے لگا تو سارے قبیلہ میں پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے عبادتیں کیں۔ اپنے خداؤں کے لئے قربانیاں چڑھائیں۔ گناہوں کی معافی چاہی۔ مگر کھوئے ہوئے مویشی واپس نہ آئے بلکہ مویشی غائب ہوتے رہے۔

اُن ہی دنوں نزدیک کے کاروباری گاؤں کے ایک شخص کا لڑکا غائب ہو گیا۔

پریشانیاں بڑھیں۔ بڑھتی گئیں۔ صورت حال یہ تھی کہ اب لوگ محض دعاؤں پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ سب لوگ آپس میں سر جوڑ کے بیٹھے۔ صلاح مشورہ کیا کہ نہیں بھائی۔ کوئی بات ضرور ہے اس کا سراغ لگانا چاہیئے۔ ورنہ ہمارے گاؤں کے گاؤں ویران ہو جائیں گے اور ہم بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں گے نہیں کچھ بڑے بوڑھے لوگ چنے گئے۔ کہا گیا کہ وہ لوگ جائیں۔ دیکھیں کیا ماجرا ہے؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

گئے۔ دیکھا۔ ایک غار میں ایک بہت بڑا اژدھا بیٹھا ہے گھبرائے۔ پریشان پریشان واپس آئے۔ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ سبھوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تو یہی وہ دوزخ ہے کمبخت۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس اژدھے کا کیا کرنا چاہیئے؟ ایسا چھوٹا سا جانور تو نہیں ہے کہ دو چار لوگ جائیں اور اسے مار ڈالیں۔ اتنے بڑے خونخوار جانور کو کیسے پکڑنا چاہیئے؟ ذرا سی غلطی سارے گاؤں کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔ اسے چھیڑنا تباہیوں کو دعوت دینا ہے۔ وہ چھوٹے بڑے تمام لوگوں کو نگل لے گا۔ چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ "جھوم" کپاس کی ایک بہت موٹی اور مضبوط رسی تیار کی جائے جو اژدھے کیا۔ ایک پہاڑ کا کھنچاؤ برداشت کر سکے اور ہاں۔ بندربن کے لوہار کے ہاں سے ایک بڑی سی ہک بنوائی جائے۔ لوگوں نے چندہ دیا۔ ہر شخص اپنی بساط بھر محنت کرنے لگا۔ کام شروع ہو گیا۔

آخر کش وہ دن بھی آ پہنچا جب لوگوں نے اژدھے سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ ایک موٹا تازہ سؤر ذبح کیا گیا بھونا گیا۔ جھوم کپاس کی رسی میں ہک باندھی گئی اور ہک میں گوشت لگا کے گوشت غار کے منہ پر ڈال دیا گیا۔ ادھر تمام لوگ رسی پکڑے کھڑے تھے۔ انتظار کر رہے سبھوں کے چہرے پر جذبات کی کشمکش ہویدا تھی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی محسوس ہوتا تھا۔ بڑی دیر تک کچھ نہ ہوا۔ لوگ منتظر رہے۔ دفعتاً

اژدہے کے حرکت کرنے کی آہٹ سنائی دی۔ سب لوگ تیار ہو گئے۔ اژدھا رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ بجلی کی سرعت سے پھنا ہوا سوراخ نکل گیا۔ تو لوگوں نے رسی کھینچنا شروع کی۔ لوگ اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اژدھا اپنی طرف کھینچتا تھا۔ چیختا تھا۔ اچھلتا کودتا تھا۔ سخت کھینچا تانی ہوئی۔ ہوتی رہی۔

اژدھا تھک گیا۔ ہانپنے لگا۔ تو لوگوں نے زمین پر اپنے قدم جمائے۔ خوب زور سے کھینچا۔ اژدہا، بہت بڑا تھا۔ اسے باہر کھینچ نکالنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ کچھ لوگ ہتھیار لے کے گئے۔ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے زخمی کیا۔ پھر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ٹکڑے کو فوراً باہر نکالا۔ فتح و ظفر کی خوشی میں پاگل ہو گئے۔

اس فتح و ظفر کی یاد میں ان لوگوں نے ایک بڑی حسین تقریب منعقد کی۔ جس کے لئے خاص طور پر شراب تیار کی گئی زمین کھود کے ایک بڑا سا چولہا بنایا گیا۔ اُس پر اژدہے کا گوشت بھونا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اسی کے بعد سے آفتیں نازل ہونا شروع ہوئیں۔

اسی گاؤں میں ایک گھر تھا جس میں بوڑھے میاں بیوی رہتے تھے۔ غریب تھے۔ اس قابل نہ تھے کہ جھوم کپاس کی رسی یا بندرین کی ہوک کے لئے چندہ دے سکتے انہوں نے جب یہ سنا کہ لوگوں نے اژدہے کو مار ڈالا ہے تو وہ ایک دن ان جانے خوف سے کانپ اٹھے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ نہیں یہ اچھا نہیں ہوا۔ اس کے نتائج بُرے ہوں گے۔ اسی رات کو انہوں نے خواب میں اپنے خداؤں کو دیکھا جو بہت ناراض تھے۔ لوگوں کی اس حرکت پر شدید غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے کہتے تھے کہ لوگ اس اژدہے کا گوشت نہ کھائیں ورنہ بہت پچھتائیں گے۔ میاں بیوی خوف سے بیدار ہوئے۔ کانپنے لگے گھر گھر جا کے خداؤں کا پیغام سُنایا۔ مگر کون سُنتا تھا؟ کسے فرصت تھی؟ لوگ مست تھے۔ ناچتے گاتے تھے۔ انہیں پاگل سمجھ کے بھگا دیا۔

یہ بیچارے غم کے مارے گاؤں چھوڑ کے چلے گئے۔

جشن کی رات لوگ اپنے وجود سے بے خبر تھے۔ راگ۔ رنگ کے سمندر میں غرق تھے۔ ناچتے گاتے تھے۔ شراب لنڈھاتے تھے۔ دفعتاً ان کے قدموں تلے زمین جنبش کرتی محسوس ہوئی۔ بہت خوش ہوئے۔ جشن کی شدت بڑھ گئی۔ ہاں۔ اب ہمارے خدا بھی ہمارے ساتھ ناچ رہے ہیں۔ ساری کائنات ناچ رہی ہے اب آسمان سے ابر باراں برسے گا۔

ہر سُو دھواں اُٹھا، چھا گیا۔ آسمان سے آگ برسنے لگی لال لال انگاروں کے ایسے پتھر تھے، برس رہے تھے۔ سب لوگ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ زمین شق ہوئی عجیب عجیب آوازیں سنائی دیں۔ سب لوگ زمین کے اندر سما گئے۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا

صبح کو ٹھیک اسی مقام پر جہاں یہ قبیلہ رہتا تھا۔ ایک مستطیل ۱۹۸ فیٹ گہری جھیل دیکھی گئی۔ پانی صاف شفاف آئینہ کا ایسا ہے۔ جھیل تین طرف پہاڑوں سے گھری مشرق کی جانب کھُلی ہوئی ہے۔ اس کا نام "سٹوگا کاٹن" یعنی اژدہے کی جھیل پڑ گیا۔ رومالپس پوسٹ سے کوئی ۱۶ میل دور تقریباً ۱۸۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

"ترپیوا" یہیں ملا کرتے ہیں۔ لوگ ان کے درشن کو آتے ہیں۔ "ترپیوا" اُن بوڑھے میاں بیوی کی نسل سے ہیں۔ جو گاؤں چھوڑ کے چلے گئے تھے۔

شیر کے ایسے لوگ (سلسلہ ص ۳۶۵)

زمین دیکھتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اُدھر سے نکل جائیں گے، چنانچہ گھبرا کے بھاگنے کے لئے وہ جیسے ہی دروازے میں داخل ہوتا ہے۔ گیٹ کھٹ سے بند کر دیا جاتا ہے۔ چاروں طرف سے جال اُٹھائے جاتے ہیں۔ شیر اُلجھ جاتا ہے۔ اُچھلتا ہے، چنگھاڑتا ہے، لیکن سب بے سُود۔ جدھر سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ بھالے چبھوتے ہیں۔

۱ گھنٹوں یہ کھیل جاری جاری رہتا ہے تا آنکہ شیر تھک جاتا ہے اور بیٹھ کے ہانپنے لگتا ہے ــــ

پھر اس کے بعد ایک معزز مہمان بُلائے جاتے ہیں۔ یہ صاحب شکاری کی وردی پہنے بندوق لے آتے ہیں۔ اَدھ موئے شیر کی جانب بندوق کی نالی درست کرتے ہوئے وہ تقریباً کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے لبلبی دبا دیتے ہیں۔

غلام محمد

چائے کی کومل کلیاں

چِکلا پونجی ٹی اسٹیٹ، شالستہ گنج ڈسٹرکٹ سے کوئی ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ راستہ کی دونوں جانب جل تھل کھیت ہیں۔ کھیتوں میں کسان دھان کے پودے بوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں خوب پانی برسا۔ سوکھے ہوئے کھیتوں میں جان پڑ گئی۔ ورنہ شاعیل فصل تباہ ہو جاتی۔ چنانچہ دیکھئے۔ تو دھان کے ہرے ہرے پودے لہلہاتے ہیں۔ ہلکی بسنتی بالیاں جھومتی ہیں۔ لہراتی ہیں۔ زندگی ہے۔ کھیتوں پر بکھری ہوئی ہے۔ کسانوں کی بانس اور پھوس سے بنی ہوئی جھونپڑیاں چمپا کلیوں کے حصار میں ایک مصور کے خواب جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ بچے گھٹنوں تک پانی میں اتر کر کیچڑ میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ خوش فعلیاں کرتے ہیں۔ جوان لڑکیاں نیلی ساڑھی پہنے اُچک اُچک کے امرود توڑتی ہیں۔ پھر اسے چباتی ہوئی اٹھلاتی، بل کھاتی جھونپڑیوں کی جانب چلی دیتی ہیں۔ جھکتے ہوئے رو پہلو تالاب پر کوئی مچھلیاں پکڑتا ہے۔ تو کوئی ہرے بھرے کھیتوں میں سانپ جیسی لہراتی ہوئی سڑکوں پر ہل جوا لئے ہُر ہُر بیلوں کو ہانکتے ہوئے بڑھتا جاتا ہے۔ کہیں خواب سُپاری کھجور کے درختوں کے جزیرے ہیں تو کہیں کھلے ہوئے میدان۔ تقریباً دس میل تک یہی سلسلہ دیکھا پھر بانس کے اونچے درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ بانس کی نوکیلی پتیوں کی گھنی چھاؤں میں چھوٹے چھوٹے درخت ہوتے ہیں جیسے میں مویشی چرتے ہیں۔ چڑیاں چہکتی ہیں۔ ڈالیوں پر پھدکتی پھرتی ہیں۔ جیپ پہاڑوں اور بانس کے اونچے اونچے درختوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی ۳۰ میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ کبھی کبھار بکری بنگالی یا بیل راستے میں آجاتے بیٹھ جاتے یا سر جھکائے ہوئے یا سر اٹھائے ہوئے خراماں خراماں ٹہلتے لیکن جیپ کا ہارن سنتے ہی سرپٹ بھاگتے تھے پھر مخمل کے ایسے ہرے ہرے تختے نظر آئے جو پہاڑوں کے اُوپر نیچے ہوتا تلے پھیلے ہوئے تھے یہی چائے کے باغات ہیں۔ پُرشکوہ منظر حسین کرنے میں آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں چائے کے پودے ۲۴ سے ۳۶ انچ تک اُونچے ہوتے ہیں ہر ہفتہ پتیاں چنی جاتی ہیں جڑ کے پاس سے شاخیں پھوٹتی ہیں ۶ انچ تک پودے کا حصہ قلم کر دیا جاتا ہے تاکہ شاخیں زیادہ شدت سے پھوٹ سکیں اور پھیل سکیں۔ ۹۰ انچ بارش ضروری ہے۔ پہاڑوں پر جو پودے ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ پودے جتنی بلندی پر لگتے ہیں۔ چائے میں خوش بُو اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ پتیاں[1] جن کے ہمراہ نئی پتیوں کی کونپل نہیں ہوتی۔ پودے کی نشوونما کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں۔ فوراً ضائع کر دی جاتی ہیں۔

۱۴ میل کی مسافت کے بعد ہم لوگ ساڑھے بارہ بجے دن چکلا پونجی پہنچے۔ ایک بہت بڑے احاطہ میں دفاتر۔ مزدوروں کے کوارٹرز۔ اسکول۔ فیکٹری اور ہسپتال واقع ہیں۔ مترجی ہاف پینٹ اور شرٹ پہنے، ہات میں ایک خوبصورت اسٹک لئے باہر ٹہل رہے تھے۔ وہ اس باغ کے مالک اور منیجر ہیں۔ عمر ۴۵ کے لگ بھگ ہوگی۔ اچھا مضبوط جسم پایا ہے۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد گویا ہوئے چلئے آپ کو باغ کی سیر کراتے ہیں۔ باہر نکلے۔ دیکھا۔ ۱۵-۲۰ جوان تندرست سنتھال لڑکیاں کھڑی ہیں۔ پیٹھ پر ٹوکری بندھی ہوئی ہے۔ لہنگا اور بلاوز پہنے ہوئے ہیں۔ کان میں بالیاں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ بے ترتیب لہنگا اور بلاوز کے درمیان کوئی پون بالشت ان کا کھلا ہوا پیٹ نظر آیا مترجی کو دیکھ کر وہ کھسک گئیں۔ مترجی نے ہمیں دیکھا مسکرائے۔ اپنے سر کو جنبش دی۔ کہا۔ بچ۔ بہت کام چور ہیں۔ اب جا رہی ہیں پتیاں چننے۔

امسال بارش ۶۹ انچ ہوئی ہے۔ چائے کی پیداوار کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ایسی بے انتہا پتیاں نکلیں۔ جن کے ہمراہ نئی پتیوں کی کونپل نہ تھی۔ پھر انھوں نے ایک پہاڑ کی طرف اپنے اسٹک سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھئے۔ وہ مٹی کے پہاڑ ہیں ان پر کاشت ہوتی ہے۔ ہرے ہرے تختے پہاڑوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ تتلیوں جیسی سنتھال لڑکیاں پیٹھ پر ٹوکری باندھے پتیاں چن رہی تھیں۔ سینے پر جیسے دو چراغ جلتے تھے

---

[1] نیجی کہلاتی ہیں۔

ان کے ساتھ ایک مرد تھا۔ اس کے ذمے نگرانی کرنا تھا۔ لڑکیاں آپس میں بات چیت کرتیں۔ تو وہ بہت زور سے ڈانٹتا تھا۔ لڑکیاں بڑی سرعت سے پتیاں چن رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے اُڑ اُڑ کے ایک پودے سے دوسرے پودے تک پہنچتی ہیں۔

وہاں سے نرسری (NURSERY) گئے۔ جو ایک پہاڑ کی ترائی میں واقع ہے۔ یہاں چائے کے پودے بڑے ہوتے ہیں۔ پودے چھ برس میں کاشت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کاشت اپریل سے دسمبر تک ہوتی ہے۔ جنوری سے مارچ تک پودے نئی کاشت کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ ایک ایکڑ زمین پر کوئی دس من چائے کی کاشت ہو سکتی ہے۔

اس باغ کے گرد وپیش گھنے جنگلات ہیں طرح طرح کے جانور رہتے ہیں۔ مثلاً جنگلی کتے۔ جنگلی مرغیاں۔ سور۔ گوجی (جنگلی گائے جو نیل گائے سے مختلف ہوتی ہے) جنگلی بکریاں۔ ہرن۔ شیر۔ چیتے۔ ریچھ۔ ہاتھی وغیرہ۔ ۱۹۵۱ء تک یہاں شیر چیتے۔ ریچھ وغیرہ دن دھاڑے نکلتے تھے۔ لوگ بہت محتاط ہو کے راستہ چلتے تھے۔ ویسے ان دنوں یہ جگہ بہت پُرسکون ہے۔ یہ جانور اب بھی عموماً جاڑے کے موسم ہی میں نکلتے ہیں۔ اوس برداشت نہیں کر سکتے۔ بے چین ہو جاتے ہیں۔ گھبرا گھبرا کے نکل آتے ہیں۔ وسیع و عریض نیلے آسمان کو دیکھ کر نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ تو ان ہرے بھرے باغات کو دیکھ کے روح کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔ ڈھاکہ کے ۲۴ گھنٹے مصروف مشینی زندگی بسر کرنے والے لوگ یہاں آتے ہیں یہ مناظر دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ نہیں صرف بڑے بڑے دل کی مانند دھڑکتے ہوئے کارخانے ہی زندگی نہیں۔ زندگی کے بڑے حسین رومانی پہلو بھی ہیں ان ہی پر یا ان ہی امید پر زندگی قائم ہے۔ ڈھونڈیئے تو کیتائی نالہ بن بلا۔ شالت نالہ گنج۔ واکس بازار وغیرہ میں جہاں فطرت کی نکہت ہے۔ پھیلے ہوئے ملیں گے نارنگی۔ سیب۔ اناس اور ناشپاتی کے درخت ہیں۔ یہ اور بانس کے گھنے جنگلات ہیں۔ سیاہ کی درختوں کے پیڑ ہیں۔ سورما کرنافلی۔ میگنا کشیا۔ ندیاں ہیں ہری بھری بیلیں درخت پودے جو کہ جھک کے پانی میں اپنی تصویر دیکھتے ہیں اور بہتا پانی ہے کہ کشتیوں۔ چپوؤں۔ پھولوں۔ اور کلیوں کو چومتا ہے۔ ملاح گیت گاتے ہیں۔ ندی بہتے کل بھاتے اور گاتے

ایسی وہ ندیا کیھلا۔

سلہ ندی کا یہ کنارا ٹوٹتا ہے تو وہ کنارا بنتا ہے۔ یہی تو ندی کا کھیل ہے۔

۱/۲ ۱ بجے مسٹر چی نے کہا کہ اب پتیاں وزن کی جائیں گی۔ چلیے وہاں چلتے ہیں۔ دیکھیں۔ انھوں نے گھنٹہ بجوایا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکیاں جوق در جوق آنے لگیں پیٹھ پر ٹوکریاں کسی ہوئی تھیں۔ کسی کسی کے بلاؤز کے ایک آدھ بٹن کھل گئے تھے۔ سینہ کا ابھار اور زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بے پروا حسینائیں ہنستی کھیلتی آتی تھیں۔ پتیاں وزن کراتیں آپس میں چہلیں کرتی چلی جاتی تھیں — یہ کیسی مسرت ہے؟ کیا اُن کا مانگ جوڑ جیسا محبوب بے چین ہے؟ چائے کے باغ میں انتظار کر رہا ہے؟ کہے گا۔ دیکھ ری ہرمیو تو نے بہت انتظار کرایا۔ سُن۔ تو جائے کا پھول ہے۔ نہیں نہیں — تو کلی ہے۔ تو میری ہے اور میں تیرا۔ بھرنگے چھپا کے اُڑ جائیں گے۔ پودوں پر سرسراہٹ ہو گی۔ جیسے ایک سانپ پھن اٹھائے ہوئے گذر گیا۔ یہ حسین لمحات پھیل کے صدیوں پر محیط ہو جائیں گے۔ پھر انتظار ہے گا۔ روحیں پلٹ آئیں گی۔

چائے کی پتیاں سوکھنے کے لئے ایک کمرہ میں پھیلا دی جاتی ہیں۔ نمی خشک ہو جاتی ہے۔ (جس کے لئے ایک دن درکار ہے) تو وہ ٹوکریوں میں بھر بھر کے رولنگ مشین میں ڈالی جاتی ہیں۔ انھیں چور کہا جاتا ہے۔ چور کرنے کے بعد فارمنٹنگ کے لئے ایک کمرہ میں لے جاتے ہیں۔ پھر رولنگ کے لئے لاتے ہیں۔ رولنگ۔ فارمنٹنگ اور رولنگ کا وقفہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے ہونا چاہئے۔ ورنہ پتیوں کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آخری رولنگ کے بعد ۳-۴ مشینوں سے گذر کے پتیاں سیاہ نظر آتی ہیں۔ خوشبو عموماً ٹِن میں پیک کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھتے شام ہو گئی ہم لوگ جیپ پر بیٹھے چلنے کے لئے ... آگے بڑھے تو دیکھا ... پہاڑی لڑکیاں جو چائے کی کومل ... کی ... ہیں اپنی جھونپڑیوں میں رہتی ہیں ویسے ہی ... اور ... جیسے ... چراغ جلائے دوڑتی بھاگتی ... ٹولیاں ... اٹھکیلیاں کرتی ہیں۔ دن بھر کی ... مشقت کے بعد ... یہ ان کے اپنے لمحات ہیں۔ ... وہ لوگ ... جیپ کو آتے دیکھ کے وہ رک گئیں۔ ایک ... کی بات ان کا ترنم ... اٹھانا۔ ترچھی نظروں سے دیکھ ... مسکرانا۔ جیسے ... رگوں میں اترتا چلا گیا شعر ... یہ چائے کی کومل کلیاں جیسی شوخ، من چلی ہیں —!

حسین کاظمی

بہتی چاندی

سنہرا بنگال بہتے ہوئے آئینوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کی کوئی بستی ایسی نہیں جہاں جھیلیں اور تالاب نہ ہوں۔ یہ فردوسی چشمے حیوانی زندگی کے لئے نہایت سودمند اور سیر و تفریح کے زبردست مرکز سمجھے جاتے ہیں اور پو پھٹنے سے پہلے ہی زندگی کے نغموں سے گونجنے لگتے ہیں۔ پرندوں چوپایوں اور آدمیوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ ان تالابوں سے پینے اور دوسری ضرورتوں کے لئے پانی فراہم کیا جاتا ہے اور بہترین قسم کی مچھلیاں بھی۔ ان تالابوں میں مچھلیاں بڑے اہتمام سے پالی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زیادہ لذیذ مچھلیاں دستیاب نہ ہو سکتیں۔ مچھلی یہاں کے باشندوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ صرف معاشی اور طبعی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ پانی کی پاکیزگی کے لئے بھی مچھلیوں کا تالابوں میں ہونا نہایت ضروری ہے اور پانی کے یہ خزانے اس غذائی نعمت سے مالا مال ہیں۔ بارش کی افراط اور دریاؤں میں سیلابوں کی زیادتی کی وجہ سے کاشت کی بربادی اور اناج کی کمی نے ان کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے اور یہاں کے ماہی گیروں کے لئے مچھلیاں دولت کے بڑے خزانے بھی ہیں اور زندگی کا سرمایہ بھی۔

پاک بنگال کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی ماہی گیر ضرور ہوتے ہیں۔ یہاں تقریباً پانچ لاکھ باشندے ایسے ہیں جو کھانے اور فروخت کرنے کے لئے مچھلیاں شکار کرتے ہیں۔ ان میں ہندو ماہی گیر بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ہندوؤں میں "جھیلے" ماہی گیر اور مسلمانوں میں بگدی۔ نکاری۔ جیونی اور ماہی فروش قابل ذکر ہیں۔ بگدیوں میں پندرہ فی صدی ایسے ہیں جو پیشہ ور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی غذائی کشتی کے یہ کھیون ہار اپنے چھریرے بدن، دلیری، پھرتی اور چستی کے لئے بہت مشہور ہیں۔ یہ لوگ سنہرے بنگال کی الھڑ جوانی کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ اور دوسرے کمزور شہریوں کے لئے قابل رشک۔

یہاں کے منچلے نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسی بھی ہے جو وقت گذاری اور تفریح طبع کے لئے مچھلیوں کا شکار کرتی ہے۔ مچھلی کا شکار یہاں کے باشندوں کا ایک بہت ہی عام اور ہر دلعزیز تفریحی مشغلہ ہے۔

یہاں کے بیشتر علاقے ایسے ہیں جہاں ہر گھر میں کم از کم ایک کشتی اور ایک جال ضرور ہوتا ہے۔ برسات میں جبکہ بادل امڈتے ہیں اور دریاؤں کے آئینوں میں رنگا رنگ تصویریں جھلکنے لگتی ہیں تو سانولے مچھیرے چوڑے چوڑے سینے تانے، بازوؤں کی مچھلیاں ابھارے کاندھوں پر جال ڈالے کشتیاں چلاتے، دریاؤں کے چکنے اور چمکیلے سینوں پر تیرنے لگتے ہیں، بپھری ہوئی موجوں ابلتے ہوئے چشموں اور چنگھاڑتی ہوئی ہواؤں سے ہنستے کھیلتے اپنی سنہری بستیوں سے دور نکل جاتے ہیں۔ مچھلیاں ان کے مضبوط اور باریک جالوں میں چاندی کے خزانے بھرتی ہیں۔

دریاؤں کے کنارے، سنہرے ریشے اور دھانوں کے لہلہاتے کھیت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فطرت نے سینکڑوں آئینے رنگ برنگ فریموں میں جڑ دئے ہوں۔

اور وہ ایسے بھی تھل کھلتے ہوئے دریاؤں کی روپہلی سطح پر لہراتے، تڑپتی، مچلتی اور چمکتی ہوئی ہزاروں مچھلیوں سے بھرے ہوئے جال کشتیوں میں بکھیر دیتے ہیں جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور موسلا دھار برکھا میں ان کے لئے دھن برسا ہو۔

برسات کے موسم میں جب ساری بستیاں پانی سے گھر جاتی ہیں فطرت کی گود میں پلا ہوا یہ زندہ دل بنگالی دو عنصری زندگی گذارتا ہے کبھی زمین پر اور کبھی پانی میں۔ ہزاروں چھوٹی بڑی ندیوں کا جال سا بن جاتا ہے۔ یہی آبی سڑکیں آمد و رفت کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں رنگا رنگ بادبانی کشتیاں تتلیوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگتی ہیں۔

بستیوں والے غول در غول اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں جال بھر بھر کر من بھر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور جب تک جی بھر نہ جائے گھروں کی طرف رُخ نہیں کرتے۔ اس زمانے میں مچھلی ہی ان کی زندگیوں کا سہارا ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے دریاؤں، گہرے اتھلے تالابوں اور [illegible] جوہڑوں کی مناسبت سے اور موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ یہ ذہین اور جفاکش مچھیرے مختلف قسموں کے جال استعمال کرتے ہیں۔ ان جالوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بڑے، چھوٹے، لمبے، گول [illegible] کے جال کھینچنے والے، پھینکنے والے، بہنے والے اور [illegible] قسم کے جال، ہر جگہ پانی میں تیرتے، [illegible] نظر آتے ہیں۔

بانسوں سے بنے ہوئے جال "[illegible]" [illegible] جال [illegible] ہیں۔ ان کے ذریعہ تالابوں میں چھوٹی [illegible] پکڑی جاتی ہیں۔

جھلکی۔ [illegible] اور گلتی ... گول جال ہوتے ہیں۔ [illegible] کنارے یا کشتیوں پر کھڑے ہو کر ان جالوں کو [illegible] جاتا ہے اور پھر سب سے پاتھ سے سر کے [illegible] پانی میں زور سے پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ جال پانی میں دائرہ بنا کر [illegible] ان کے کناروں پر بندھی لوہے کی گولیاں [illegible] اور یہ جال بیٹھتا چلا جاتا ہے۔ ڈور کو آہستہ آہستہ کھینچ [illegible] جال کی گرفت سخت کر دی جاتی ہے اور [illegible] کوئی ایک بھی مچھلی جال سے باہر نہیں نکل پاتی۔

کرلی جال [illegible] دریاؤں میں کام آتا ہے۔

گلگبر جال [illegible] طور پر دریا سے [illegible] میں استعمال کئے جاتے ہیں [illegible] ان کو ایک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ [illegible] ہوتا ہے۔

کھینچے والے جالوں میں [illegible] جال [illegible] ہے۔ کھاڈا جال بھی اسی قسم کا ہوتا ہے اور [illegible] اتھلے پانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں [illegible] مشہور ہے۔ اور وہ یہ کہ جو ماہی گیر بہت ہی غریب اور [illegible] اور زیادہ خوراک کے لئے چیختا ہے۔ وہ ہمیشہ مچھلیاں پکڑنے کے لئے جوڑا کھاڈا جال اٹھائے پھرتا ہے۔

"چندی" جال بہت بڑا جال ہوتا ہے اس سے دریاؤں میں پکڑی جاتی ہیں۔ [illegible] بھاگیرتی میں "ہلسا" مچھلی اسی جال سے شکار کی جاتی ہے۔ برسات [illegible] طور پر اس جال کے بغیر "ہلسا" کا شکار بہت ہی مشکل ہوتا ہے [illegible] جال کے ذریعہ ہلسا بہت آسانی اور افراط کے ساتھ پکڑی جاتی ہے۔ یہ جال "شیرا" اور "چندی" جالوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس میں [illegible] خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کے بنانے میں کم [illegible] تک کی لاگت آجاتی ہے۔

[illegible] تو ... بانسوں کے جال ہوتے ہیں۔ اتھلے پانی میں [illegible] پوتو جال بہت عام ہے۔

[illegible] بیساکھ کے مہینوں میں کوئی [illegible] تو [illegible] شکار کی جاتی ہیں۔

[illegible] رسی بھی استعمال کی جاتی ہے۔

[illegible] ہتھیار بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ بانس کی [illegible] نوکیلے تول چڑھائے جاتے ہیں [illegible] اور [illegible] مچھلیوں کو چھید لیتے ہیں۔

[illegible] مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ اندھیرے میں روشنی [illegible] اور وہ "[illegible]" کے ذریعہ شکار کر لی جاتی ہے [illegible] بھی مچھلی آواز کی طرف متوجہ ہو [illegible] آسانی سے ہاتھ [illegible]۔

[illegible] دھاگوں سے [illegible] دھاگوں اور [illegible] کے بعد سیاہ۔

[illegible] جال تو [illegible] ان کی عورتیں بھی ماہر [illegible] کمال ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے [illegible] کے ساتھ وہ آپس میں [illegible] ایک دوسرے [illegible] تیزی کے ساتھ ان کے ہاتھ بھی چلتے رہتے ہیں۔

ویسے تو کم و بیش پورا سال ہی مچھلیاں پکڑتے اور کھاتے گذر جاتا ہے لیکن چیت بیساکھ میں جبکہ مچھلی پورے شباب پر ہوتی ہے مچھیروں کی زندگیوں میں خصوصیت کے ساتھ جوش و مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں عجیب گہما گہمی کا عالم ہوتا ہے۔ نرالی مصروفیات ہوتی ہیں۔ خرید فروخت شروع ہو جاتی ہے۔ رسیاں۔ بانس۔ جال۔ کانٹے کشتیاں اور دیگر ضروریات کی اشیاء ادھر ادھر بکنے لگتی ہیں۔ اگر کوئی غریب ماہی گیر اس قابل نہیں ہوتا کہ نقد خرید سکے تو اگلے موسم تک کے لئے قرض لے لیتا ہے۔

منڈیاں کھل جاتی ہیں۔ میلے لگنے ہیں کشتیوں کی مرمت اور فروخت کرنے والے، جال بننے اور بیچنے والے دکانیں لگا کر بیٹھتے ہیں۔ بانسوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔

بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے ندیوں اور دریاؤں کو سجاتا ہے۔ بیسیوں طرح طرح کے ناؤں اور ناگنوں سے پٹارے بھر کر ادھر ادھر گھومنے لگتے ہیں ساحلی ہواؤں کی مدھر لہریں دلوں کی گہرائیوں تک اترتی چلی جاتی ہیں اور رومانی طوفان برپا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات آگ بھی ان کی تحریک سے چھومنے لگتی ہے۔

اسی زمانہ میں جابجا چھوٹے چھوٹے گشتی تھیٹر اور بائسکوپ شور مچاتے نظر آتے ہیں۔ بانسوں کے اوپر پھر تیلے نٹ نئے نئے کرتب دکھاتے ہیں۔ زمین پر تالیاں بجتی ہیں اور آسمان سے قہقہوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

[illegible] پتلی تماشا، لوتھیاں لئے ناچنے والوں کی ٹکڑیاں دیکھتے دیکھتے [illegible] ہجوم اکٹھا کر لیتی ہیں [illegible] یہاں کی [illegible] اور موسم کی اہمیت سے فائدہ اٹھانا [illegible] لوگ خوب جانتے ہیں اس زمانہ میں ان کی بڑی بڑی رقمیں کمائی جاتی ہیں ہر شخص تقدیر [illegible] ہو جاتا ہے اور ان کے لئے حاتم ثانی۔

دریاؤں، تالابوں، جھیلوں اور ندیوں نالوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ شور و غل۔ بھاگ دوڑ۔ افراتفری۔ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ عورت۔ مرد۔ بچے۔ بوڑھے سب کسی نہ کسی کام میں الجھے رہتے ہیں۔ یوں تو وہ دن بھر شکار میں مشغول رہتے ہیں لیکن طلوع اور غروب آفتاب ان کے خاص اوقات ہوتے ہیں۔ چاند کی پہلی اور چودھویں رات بھی کبھی خالی نہیں جاتیں۔

شفاف سطح آب پر چمکتی اور مچلتی "چاندی" کی رانیں بہنے لگتی ہیں۔ سنہرے بنگال کے نقرئی دریاؤں کی دولت "ہلسا" یہاں کے باشندوں کے لئے "من و سلویٰ" ہے اگر ایک مرتبہ بھی یہ کسی کے منہ لگ جاتی ہے تو وہ عمر بھر نہیں چھوڑتا۔ مچھلی زیادہ تر دریائے پدما اور بھاگیرتی میں پائی جاتی ہے اس کے انڈے اور چھوٹے چھوٹے بچے خرید کر تالابوں میں بھی پالے جاتے ہیں۔ "چلن جھیل" میں خاص طور پر اس کی پرورش ہوتی ہے اس جھیل کا رقبہ تقریباً سو مربع میل ہے اس کے کنارے ایک بڑا "ٹاؤن کلم" ہے۔ یہاں پر اس مچھلی کی اچھی تجارت ہوتی ہے اور دوسرے مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔

"ہلسا" کے شکار کے لئے دریاؤں اور نالوں پر ہزاروں آدمی یلغار کرتے ہیں ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہلسا اسی کے حصہ میں آئے۔ اکثر و بیشتر دریاؤں میں "ہلسا" نشوونما پانے سے قبل ہی کافی مقدار میں شکار کر لی جاتی ہے اور مادہ گھومتی ہیں تو جال ڈال کر ماہی گیر مسلسل اس کے پیچھے جال لئے پھرتے ہیں۔ پورے سال دھڑا دھڑ اس کا شکار ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے انڈے اور بچے بھی نہیں چھوڑے جاتے۔ اس بربادی سے ہلسا کی سپلائی میں حد درجہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا اور اس کی روک تھام نہ کی گئی تو زبردست خطرہ لاحق ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ مچھلی بازاروں سے غائب ہی ہو جائے گی۔

اگست اور ستمبر کے مہینوں میں سیلابوں کی زیادتی کے سبب مچھلیوں کا دھندا کچھ ٹھنڈا رہتا ہے لیکن موسم سرما میں ان کا بازار پھر گرم ہو جاتا ہے۔

بھیٹکی اس موسم کی خاص مچھلی ہے اور ہلسا کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیتی جاڑوں میں بازاروں میں اس کی بھرمار رہتی ہے صبح سویرے دکانوں پر اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی جیسے دیکھو بھیٹکی کا شوقین ہے جو ہے بھیٹکی لئے چلا جا رہا ہے۔ یہ مچھلی دریائے گنگا کے خاص خاص اسٹیشنوں سے دوسرے مقامات کو کافی تعداد میں بھیجی جاتی ہے۔ کشور گنج۔ سامم گنج بھی گنج اور چاٹگام کے علاقے بھی مچھلیاں سپلائی کرتے ہیں۔

دریائے برہم پترا اور بھاگیرتی میں مچھلیوں کی افراط کے سبب

کھلنا اور جیسور سے لاتعداد کشتیاں مچھلیوں سے لدی پھندی دیگر کے مقام پر لائی جاتی اور پھر وہاں سے کلکتہ اور دیگر مقامات کو بھیج دی جاتی ہیں۔

مشرقی پاکستان کے تالابوں اور جھیلوں پر زمینداروں کا قبضہ ہے۔ یہ آبی خزانے انہی کی ملکیت ہیں اور قانونی معاہدوں کے بعد ماہی گیروں کو ٹھیکہ پر دے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو دس دس ماہی گیر مل کر کوئی جھیل ٹھیکہ پر لے لیتے ہیں اور لگان ادا کرتے رہتے ہیں۔ معاہدہ کی رو سے انہیں اپنی ساری مچھلیاں زمیندار ہی کو فروخت کرنا ہوتی ہیں ورنہ دوسری صورت میں ان کے پٹے منسوخ کر دئے جاتے ہیں اور اس طرح وہ اسی کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ ان پر حکومت کا کنٹرول ہو تاکہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں کہ مچھلی پکڑنے کے اوقات مقرر ہو سکیں۔ ایک معینہ اور مقررہ تعداد میں مچھلیاں پکڑنے کی پابندی ہو۔ اس طرح مچھلیوں کی پرورش اچھی طرح ہوگی۔ صحت مند مچھلیوں سے صحت مند پروٹین مہیا کیا جا سکے گا اور چھوٹی مچھلیاں قبل از وقت تباہی سے بچ جائیں گی۔

پچھلے چند سالوں سے مچھلی کی تجارت بتدریج تنزل پذیر ہے۔ سپلائی دن بدن گرتی ہی جا رہی ہے۔ صرف بھاگیرتی، جیلانگی اور مادھومتی دریاؤں میں ہی نہیں بلکہ دریائے گنگا میں بھی پیداوار بتدریج کم ہو رہی ہے۔

دراصل یہ دریا رفتہ رفتہ اتھلے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اثر تالابوں اور جھیلوں پر بھی بری طرح پڑ رہا ہے۔ یہ پرورش گاہیں بے انتہا بیش قیمت متصور کی جاتی ہیں۔ یہاں پر خشک موسم میں مچھلیوں کو اچھی طرح سانس لینے کا موقع مل جاتا ہے اور شکاریوں سے بھی پناہ ملتی ہے۔ اب چونکہ دریاؤں کے اتھلا ہونے سے ان کی سطح آب گدلی ہو رہی ہے اس سے تازہ پانی کی رو میں اور تازہ سطح آب بہتر نہ ہونے کے سبب مچھلیوں کی پیداوار اور نشوونما اچھی طرح نہیں ہو پاتی۔ نہ تو وہ توانا ہوتی ہیں اور نہ بڑھتی ہیں اگر یورپ اور جاپان کی طرح دریاؤں سے مچھلیاں پکڑ کر تالابوں میں پالی جائیں تو ترقی کے امکانات کافی سے زیادہ ہیں۔

چھوٹی سے چھوٹی مچھلیوں کی قبل از وقت تباہی سے بھی اتنی فطری پیداوار پر اثر پڑتا ہے۔ اگر کم عمر مچھلیوں کے شکار پر پابندی ہو جائے تو یقیناً ہم ہلسا اور دیگر مچھلیوں کو کبھی نہ ترسیں گے۔ اس کے نتائج ملک و قوم کے لئے بلاشبہ سودمند ہوں گے اور ارم مطلوب آب وہوا میں پروٹین اور چربی افراد سے دستیاب ہو سکے گی۔

جدید سائنٹفک اصولوں اور طریقوں کو کام میں لاکر ان شکاریوں کو بیماری سے بچایا جا سکتا ہے۔ جدید آلات نئے نئے جال ریفریجریٹر اور دخانی کشتیوں کی امداد سے ہم اپنی تجارت کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتے ہیں۔ برف کا استعمال اور وسائل آمد و رفت کی آسانی سے بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں اور اس طرح سیلاب زدہ فصلوں اور برباد شدہ اناج کی کمی کو بخوبی پورا کیا جا سکتا ہے۔

عارف حجازی

گیت، طوفان اور کنول

نگاہوں کے سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ بوڑھی گنگا ۔۔ جس کے دونوں کنارے پر کشتیاں، دخانی جہاز لنگر انداز تھے اور ان کے عقب میں قدیم ڈھاکہ کے در و دیوار، بلند و بالا حویلیاں، کائی آلود بوسیدہ مکانات، مسجدوں کے گنبد، مندروں کے کلس دور سے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے پانی کی اتھاہ گہرائی سے کوئی جہاز نما شہر ابھر آیا ہو یا البیلا دریا کوئی خوش آئند خواب دیکھ رہا ہو۔ قلعہ لال باغ سے لیکر ڈھاکہ باڑہ گنج روڈ تک کچھ ایسا ہی منظر تھا جس نے قدیم ڈھاکہ کی عظمتوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ساڑھے تین سو سال قبل یہ شہر معرض وجود میں آیا تھا۔ ۱۶۱۲ء میں جب یہ بہار اور اودھ کا صدر مقام بنا تو اسے چار چاند لگ گئے تھے۔ ۱۷۱۷ء تک کا دور اس کا سنہری دور تھا۔ انتظامی اور فوجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یہ شہر دنیا بھر میں اپنی نفیس پارچہ بافی اور ریشم جیسی ملائم ململ کا واحد مرکز بن گیا تھا جو ململ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جاتی تھی اور جس کی نفاست کی شہرت ان ملکوں کے شاہی محلوں سے نکل کر زبان زد عام ہو گئی تھی اور جب جادو بھری پارچہ کی ململ شہزادیوں کے سڈول بدنوں کے شرمیلے سنہری جسموں کو اپنے آغوش میں چھپا لیتی تو ماہ عسل کی پہلی رات کا سماں جادو کی کیفیت پیدا کر دیتا اور وہ اس شہر کے دلفریب مناظر کے نواحوں میں کھو جاتیں۔ یہ ڈھاکہ کے محنت کش جولاہوں کی انگلیوں کا جادو تھا، جس نے دنیا کے سب تماش بینوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور آج بھی وہ طلسم ہوشربا کے قصہ کی طرح "شبنم بنگال" کے نام سے مشہور ہے۔ یورپ والوں نے اس جادو کو گرفت میں لانے کے لئے جو مشینیں سوچی ہوں مگر یہ ململ کی کشیدہ کاری سے تو شاید اقتصادی ترقی کا سب سے بڑا وسیلہ تھا شہر ڈھاکے نے دنیا کی جمالیاتی تشنگی کو تسکین دہ کرنے میں کیسا اہم کردار انجام دیا ہے۔ یہ اقتصادی ترقی اس وقت تک قائم رہی جب تک اندرونی علم دستکاری میں ململ پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں یہ شہر لندن کی ٹکر کا تھا۔ مشرقی ہند میں کوئی دوسرا شہر نہ تھا جو اس کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن گردش وقت کہیے کہ ڈھاکہ کی اتنی بے پناہ اقتصادی ترقی و خوشحالی کو تھوڑی ہی مدت کے بعد زوال آنا شروع ہو گیا۔ آبادی گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار رہ گئی اور اس طرح دنیا کا یہ مشہور شہر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک گمنامی اور اقتصادی بدحالی کے اندھیروں میں کھویا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا تو اس شہر کو پھر ایک بار مشرقی بنگال اور آسام کا صدر مقام بننے کا موقع ملا لیکن سات برس کی قلیل مدت کے بعد پھر اسی مرکز پر آگیا اور کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکا۔

پھر میں سوچنے لگا۔ "قیام پاکستان سے قبل کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ڈھاکہ اپنی قدیم روایات اور سنہری دور کی یاد پھر تازہ کر دے گا اس کے در و دیوار سے ماضی کی شان و شوکت پھر جھلکنے لگی اور تقسیم سے تھوڑے عرصے پہلے اس کے گلی کوچوں میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی گئی تھی وہ اس کے روشن دور کی نقیب ثابت ہوگی۔ چنانچہ آزادی کے فوراً بعد جب ڈھاکہ کو دنیا کی پانچویں آزاد مملکت کے مشرقی بازو کا صدر مقام ہونے کا اعلان کیا گیا تو اس کی کھوئی ہوئی عظمت پھر لوٹ آئی لیکن ایک مدت تک شہر کے حالات ٹھیک نہ ہو سکے۔ دوسری طرف تخریبی عناصر اور غیر مسلم فرقہ کے لوگوں کی متعصب ذہنیت نے ایک نئی سیاسی کشمکش پیدا کر دی تھی۔ اس غیر تسلی بخش حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی جس کا واحد علاج ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب ہی تھا۔ یہ انقلاب ایک نئی زندگی شاندار مستقبل اور ترقی پسند رجحانات لیکر آیا تھا اور اس کے آتے ہی ملک دشمن عناصر کا خاتمہ ہو گیا اور اس انقلاب نے ڈھاکہ کے مستقبل کو بھی نہایت درخشاں کر دیا۔ اور ڈھاکہ کی تعمیر و ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔"

میں دیر تک دریا کے حسین نظارے کے دلکش منظر کا نظارہ کرنے کے بعد صدر گھاٹ پر آگیا۔ ... سب سے بڑے گھاٹ کا نام صدر گھاٹ تھا۔ ... کشتیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان میں ... مال بردار دخانی جہاز کھڑے تھے۔ جگہ جگہ پیلے کیلوں، اناناس اور ناریل کے ڈھیر لگے ہوئے تھے سیکڑوں قسم کی مچھلیاں بکتی تھیں۔ سواریوں اور گاہکوں کے ہجوم میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گھاٹ کی سڑک کے دوسرے کنارے پر چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ہر قسم کی مٹھائی کے خوانچے لگے ہوئے تھے جن پر رسیلے اور خوش ذائقہ رس

چلّوں سے بھرے ہوئے تھال رکھے تھے کہیں گرم گرم تلی ہوئی مچھلیاں۔ فضا جنگلی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہی تھی اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان دکانوں پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ ہم زندگی کے متحرک ماحول میں گھومتے گھماتے بھیڑ بھاڑ سے تھوڑی دور نکل آئے تو دیکھا کہ چند بدیا عورتوں کے گرد لوگوں کا بہت بڑا مجمع لگا ہوا ہے۔ دو تاروں سے ملتے جلتے ساز کی نہایت دلکش صداؤں کے ساتھ ان عورتوں کے "سپورا گیت" کی مدھر تانوں سے سُریلی فضائیں بھی جھنکار رہی تھیں ہوئے بدمست سانپ کے جوڑے کی مانند رقص کر رہی تھیں۔ ہر شخص جیسے موت کے دیوتا "یاماراج" کے دربار میں نرتی تعظیم سے کھڑا غم نصیب بیہولا دیوی کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ساز کے پردرد سُروں کے ساتھ دوسری بدیا عورت نے ایک داستان شروع کر دی۔ "جب چاند سوداگر کا جواں سال بیٹا لکھندر سانپ کے کاٹنے سے دوسری دنیا کو کوچ کر گیا تو اس کی نئی نویلی بیوی بیہولا غم کی آنچ سے نڈھال ہو گئی، خوبصورت رخساروں پر سیاہی دوڑ گئی۔ پتی کی اچانک موت نے اس من موہنی سندری کا سہاگ لوٹ کر کتنا ظلم کیا تھا مگر اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنے پیارے پتی کی نعش کو کشتی میں رکھ کر دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بالآخر کئی دنوں کے سفر کے بعد موت کے دیوتا یاماراج کے دربار میں پہنچی اور اپنے رقص کے ایسے کمالات دکھائے کہ یاماراج کو اس کے جوبن پر بڑا رحم آیا اس کے پتی لکھندر کے مردہ جسم میں پھر جیون کی لہر پیدا کر دی۔"

"سپورا گیت" اس کے ساتھ یہ دلچسپ قصہ لکھندر اور بیہولا کی محبت کا درد بھرا نغمہ، نازک بدن بدیا عورتوں کا والہانہ انداز بیان ان کی میٹھی سریلی تانیں سنکر ہم پر جیسے ایک جادو ہو گیا تھا۔ چنانچہ سانپ کا تماشہ ختم ہوتے ہی ہم سرخ العدلہ پارک کے قریب ایک ہوٹل میں آ بیٹھے یہیں سے شہر کی شہ رگ "نواب پور روڈ" گزرتی تھی۔ تقسیم انقلاب سے جہاں شہر کے دوسرے حصوں میں بڑی بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہاں نواب پور روڈ کو اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ ہٹ کولا روڈ، بنگلہ بازار، کٹ فورڈ روڈ، اسلام پور روڈ کے کیا کہنے۔ انہی شاندار سڑکوں کی طرح یہ بھی صاف ستھری چم چم کرتی نظر آتی تھی گہما گہمی نے اس کی شان اور بھی دوبالا کر دی تھی۔ سائیکل رکشوں، گھوڑے گاڑیوں، بیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ موٹروں اور بسوں کا بے پناہ تانتا اور زبردست طنطنہ۔ وہ سیدھے سادے مرد اور عورتیں ان کی شیریں کلامی میں رس گلّوں کی مٹھاس اور تر و تازہ گلاب کی خوشبوؤں کا احساس۔ قدیم شہر کی عمارتوں کی سنگین شرقیت کا رعب ایسا پڑ رہا تھا کہ ہر نووارد اور خصوصاً اہل مغرب کے لیے وہاں زیادہ ٹھہرنا محال معلوم ہوتا تھا۔ پھر شہر کے بڑے ہوٹلوں میں مغربی دلچسپیوں کا سامان کہاں۔ دکانوں میں ڈھاکیسوری کی ایک سے ایک نفیس ساڑھیاں، موسیقی اور ساز سنگیت کے آلات طبلہ اور سارنگی ستار، ہارمونیم اور موہن بانسریاں، سیپ اور مچھلی کی ہڈی کے خوبصورت بٹن، انگرکھے اور ٹوپیاں، کرتے، لنگیاں، پاجامے، بید کا سامان اور فرنیچر، ویدوں، حکیموں کے مطب، ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کی گولیاں اور دوا خانے، بیڑی بنانے والے، پان فروشوں اور حلوائیوں کی چھوٹی چھوٹی سی دکانوں کے بیچ میں کہیں کہیں بڑی بڑی فیشن ایبل عمارتیں ایسی دکانوں میں مغربی اشیاء اور ساز و سامان کی جھلکیاں جدیدیت کا احساس پیدا کر دیتی ہیں چوک بازار میں پہنچ کر تو صدیوں کی قدامت کا شدید احساس ہونے لگا۔ کبھی یہاں ایرانی، یونانی، فرنگی، کشمیری، افغانی، ارمنی اور دیگر مقامی و غیر مقامی لوگ رہا کرتے تھے۔ بیرونی تجارت کا یہی سب سے بڑا مرکز تھا اسی بازار میں مسلمان امراء و شرفاء کی شان و شوکت اور کر و فر کی جھلکیاں نظر آتی تھیں نقیب اور چوبداروں کی آوازیں گونجتی تھیں اور شاہانہ جلوس اور سواریاں گزرا کرتی تھیں۔ اسی چوک میں علماء اور مشائخ کے جلسے منعقد ہوتے تھے یہیں ایک چوگوشہ چبوترہ بھی تھا جو مقرروں کے کام آتا تھا۔ اسی مقام پر شہر کے خوش باش نوجوان تفریح کرتے نظر آتے تھے۔ پان اور شربت کی دکانوں پر ان کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں قصہ گو اور پرمذاق لوگ مغل دربار اور حرم کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑ گھڑ کر اور قہقہوں اور خوش گپیوں میں اپنے فرصت کے لمحات گزار دیتے تھے صرف فرق اتنا معلوم ہوا کہ پرانے چوک کے تاریخی ماحول کی جگہ اب مقامی رنگ کی گہما گہمی نے لے لی ہے جہاں کبھی چوکور چبوترہ ہوگا وہاں اب بساط خانے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بڑادریاں گود اور سستی تیتی کالے اور بکری کا گوشت کا سالن ملتا ہے۔ جھینگڑی ماچھ (جھینگا) اور دوسری طرح طرح کی مچھلیوں کے سالن اور کھانے ملتے ہیں۔ شام کے وقت ریڈیو اور گراموفون ریکارڈوں پر بنگالی گیتوں اور گانوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور چوک کے مرحوم علاقوں میں اچھا خاصا میلہ لگا رہتا ہے۔

قدیم ڈھاکہ کے تنگ بازاروں، چوکوں اور پر پیچ گلی کوچوں میں پرانی عمارتوں کے بے شمار کھنڈرات میں دریا کے "بک لینڈ" بند کے پاس نوابین ڈھاکہ کے محلات دیکھنے کے لائق ہیں۔ بڑا کٹرا، چوڑی ہٹہ بازار جہاں شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع نے ایک شاندار مسجد تعمیر کی تھی ایسے ہی ست گنبد ہے، مشہور صوبہ سالار شائستہ خاں کی تعمیر چھوٹا کٹرا ہے کیسی بانکی اور نرالی وضع ہے۔ ست گنبد پہلو بہ پہلو نفیس و نازک جھرمٹ گویا البیلی، خوش خرام بوڑھی گنگا کی سطح پر ایک سات ابھرے ہوئے شفاف بلبلے۔ مغلوں نے یہاں کیا کیا یادگاریں نہیں چھوڑیں۔ ہم قلعہ لال باغ سے کیسے دل و دماغ میں عہد رفتہ کے حسین جمیل تصورات کی شمعیں جلائے بغیر گزر سکتے ہیں۔ یہ اورنگزیب جیسے جری باپ کے فرزند

محمد اعظم کی یادگار ہے جس کا مشرقی حصہ منہدم ہو چکا ہے اور اپنی شکستگی میں بھی شان و شوکت کے آثار لیے ہوئے ہے۔ افغانی عہد کا جسے زمانہ کی ستم ظریفی نے جیل بنا دیا ہے۔ حسینی دالان، لال کرتی، پرانا دروازہ، تولی روپ لال، ڈھاکیسوری کا مندر رنگ و نیرنگ، افسانہ در افسانہ۔ دیدہ و دل پر نئے نئے نقش ثبت کیے جاتے ہیں۔ یہ ہے دور کہن کی کرشمہ آفرینی اور جب ماضی نے حال کا چولا بدلا تو شعور فن نے نئے نئے روپ دھار لیے۔ سلیم اللہ ہال، کرزن ہال، ڈھاکہ یونیورسٹی، شاہ باغ کا فوارہ، ہائی کورٹ (جس کی عمارت میں ڈھاکہ کا بانی اسلام خاں چشتی مدفون ہے)۔ اور زیادہ قریب آئیے تو پاکستانی عہد کی جھلکیاں دیکھتے چلے جائیے۔ انسانی شعور اور ذوق فن کے جدید ترین نقوش شاہی نگر، موتی جھیل، پرانا پلٹن اور "سیگون بگیچہ" کی رہائش گاہیں، دوسری طرف عظیم پورہ اور اسکی نئی مارکیٹ۔ دھان منڈی اور شاہ باغ کے علاقے کے صوبائی دفاتر "شاہراہ گلستان" اسٹیڈیم وغیرہ جیسے مست خرام بوڑھی گنگا نے اپنے کناروں پر موتی ہی موتی اگل دیے ہوں۔ اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہی سلسلے باقی رہ گئے ہیں۔ بالکل یوں جیسے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نئے نقوش ابھرتے جا رہے ہوں۔ یہ عمارات جیسے ابھی ابھی بنی ہوں۔ جنت کے ایک گوشے میں آ کر رمنا بھی تو جنت ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس قدر باغ و بہار، ہرے بھرے سر سبز و شاداب کنج، گھنے سایہ دار درختوں کی لہر یا بناتی ہوئی قطاریں، جھیل جھل تالاب کی سطح پر ناچتے ہوئے کنول، چاروں طرف ہرا بھرا سبزہ کہ جس کی تازگی و شگفتگی سے آنکھوں میں ایک نئی قوت اور طراوت پیدا ہو اور دل و دماغ اس بہار میں سبزہ زار اور قدرتی حسن سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رمنا کے خوبصورت مناظر اور خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی فضاؤں میں پہنچ کر ہم پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ تمام دن ہم شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور تاریخی عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے اور چلتے پھرتے جو تھکن طاری ہو گئی تھی اس کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اور ایک نئی آفریں کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ بادۂ شبینہ نے اس میں اور بھی کیف پیدا کر دیا۔ نسیم خنک، متوالی ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ کسی مہ جبین کے رنگین قہقہوں کی آواز کانوں سے ٹکراتی تو دل "ف نہ زلف دراز" کے قصے چھیڑ دیتا اور ہم ان شیریں قہقہوں سے متاثر ہو کر اپنی رفتار دھیمی کر دیتے لیکن تب کسی دوسری گلی (یعنی رنگلا) سے سرگم کے جادو بھرے بول، پائل کی چھم چھم کے ساتھ طبلے کی ہلکی ہلکی تھاپ اور ستار کی سریلی گنگناہٹ سنائی دیتی تو دل کسی البیلی رقاصہ کی طرح خود بھی رقص کرنے لگتا اور لمحہ بھر کیلئے وہاں سے قدم جموں کی طرح آگے نہ بڑھتے۔ کسی طرح لطف اندوز ہونے کے لئے آپ ہی آپ رک جاتے۔ موسیقی اور رقاصی کا یہ دلچسپ امتزاج لوگوں کی عام زندگی ہے۔ تاہم اسکے

ہے کہ ابر و مزیب سب ہی اس کے پرستار نظر آئے۔ پھر "پٹواٹولی" کی بھول بھلیوں جیسی گلیوں کے پیچ و خم کا ذکر ہی کیا۔ شام کے جادو بھرے اندھیرا ہوتے ہی جب روشنی کی لہریں حسن فروشوں کی دو کانوں میں مچلنے لگتی ہیں تو ادھ ساز و نغمگیت کے دلنواز سر تال بھی چھڑ جاتے ہیں۔ اور دل پھینک لوگ پروانوں کی مانند ان گلیوں کا طواف کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

اس خواب کے سے عالم میں ہوتے ہوئے ہم "سرکٹ ہاؤس" پہنچے وہ سرکاری قیام گاہ جو دور دراز اور قرب و جوار سے آنے والے مسافروں کو حد درجہ اپنی آغوش میں سکون و آرام بخشتی ہے یہاں پہنچ کر ہم نے گھڑی بھر سانس لی اور لمبی تان کر سو گئے۔ صبح اٹھتے ہی دیکھا کہ تمام ساتھی کوچ کی تیاری میں مصروف ہیں ہم نے بھی الٹا سیدھا اپنا سامان باندھا اتنے میں ٹیکسیاں آ گئیں اور ہم دن نکلتے نکلتے تیج گاؤں کے ہوائی مستقر پر پہنچ گئے وہاں تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ ڈھاکہ کو الوداع کہہ کر جان خدا کے سپرد کی اور "پی۔ آئی۔ اے" کے صبا رفتار ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔

حسین احمد

اُردو شاعری مشرقی پاکستان میں

تقسیم سے قبل ہی مشرقی بنگال میں اُردو شعرا اچھی تعداد میں تھے۔ اور اب تو خیر یہ خطہ اُردو ادب کا ایک مستقل اور ایک اہم مرکز ہے۔ عندلیب شادانی اور شرف الحسینی شاید مشرقی بنگال کے سب سے زیادہ جانے پہچانے شعرا میں تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس خطے میں اُردو ادب کی گراں بہا خدمت کی ہے۔

وحشت اور ناطق کے مرنے کے بعد یہاں کی ادبی فضا میں اور بھی سنجیدگی بڑھ گئی۔ ان دونوں بزرگوں کا خاطر خواہ اثر مشرقی پاکستان کے اُبھرتے ہوئے نوجوانوں پر پڑا۔ انہی کے طفیل دہلی اور لکھنؤ اسکول کی خوبیاں اور خرابیاں پورب کی شاعری میں داخل ہوئیں۔ غرض شعر و شاعری کا چرچا ذرا بڑھ گیا۔ نقلی۔ آصف بنارسی، فطرت واسطی اور سلیم اللہ فہمی نے وحشت اور ناطق کا ہاتھ بٹایا اور اپنی شاعری سے اس مرکز ادب کو چمکایا۔ نقلی اور آصف بنارسی غزلیں کہتے ہیں۔ نقلی کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے اور ان کے یہاں ایک طرح کی سادگی پائی جاتی ہے۔ آصف بنارسی — وحشت کے شاگرد ہیں۔ کلام میں صفائی اور شگفتگی ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے

کیا یہ سچ ہے سبب آؤ اِدھر بلائیں لوں

آنکھ میں ہے عتاب کیوں دل میں ہے غبار کیا

آصف اب تک ہوش نہیں ہے

چوٹ لگی ہے ایسی دل پر

فطرت واسطی رومانی نظموں کے لئے مشہور ہیں کبھی شاما کے نام ان کی نظمیں ہوا کرتی تھیں اور نوجوانوں میں خاص طور پر مقبول تھیں

سلیم اللہ فہمی شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ پرانے کلاسیکل رنگ میں غزلیں کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں خوبصورت شعر کہتے ہیں۔

لاکھ آنسو اُمڈ کے آتے ہیں

ہم بہرحال مسکراتے ہیں

دل کو آخر تباہ ہونا تھا

سچ ہے دُنیا ہے عالم اسباب

ان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے، ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں بعض راشد اور میرا جی کی یادگار ہیں اور کوئی جوش و جگر کے رنگِ کلام کو زندۂ جاوید بنانے میں کوشاں ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی بولیاں ہیں، مگر محض دو مصرعوں کو برابر دکھانے کا کام ہی شاعری نہیں ہے اس بڑی تعداد میں شاید مشکل سے چند نام ایسے ملیں گے جن کے کلام میں انفرادیت ہے یا جو منفرد اندازِ بیاں رکھتے ہیں، یا پھر جو اپنے اشعار کی بدولت مشرقی پاکستان میں سدا زندہ رہیں گے۔

اس ضمن میں جو نام سب سے پہلے آتا ہے وہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ہے، عندلیب شادانی شاعر ہیں اور ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک مخصوص قسم کی رومانیت ہے۔ موضوعاتِ شاعری بھی محدود ہیں، وارداتِ قلب کا بڑا ہی نفسیاتی بیان ان کے یہاں ملتا ہے، یہ اور بات ہے کہ "تفصیل" کی خاطر وہ کبھی کبھی ابتذال کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، ان کا اثر مشرقی پاکستان کے چند شعرا پر ہے لیکن شاید کوئی بھی ان کے مخصوص رنگ میں کامیاب نہیں ہوا۔ غالباً شادانی کی تقلید کا سب سے خراب اثر ظہور الباری اور ارشد کاکوٹی کی شاعری پر ہوا ہے۔ یہ دونوں حضرات اپنے اندر اچھے شاعر کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکے

خاص کر ارشد جو ذہین ہیں اور ان کی طبیعت بھی موزوں ہے۔ [1]

عندلیب شادانی کے بعد غالباً سب سے نمایاں نام احسن احمد اشک کا ہے۔ اشک سنجیدہ طبیعت ہیں اور سوچ سمجھ کر شعر کہا کرتے ہیں انہوں نے غزل اور نظم دونوں ہی صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب رہے ان کے یہاں بلا کا شدتِ احساس ہے۔ امیجری اور علامتی شاعری کی بھی اچھی مثالیں ان کے یہاں مل جائیں گی۔ سنتے ہیں کسی زمانے میں اشک اپنی انقلابی شاعری کیلئے مشہور تھے اور نام نہاد ترقی پسند عناصر ان کے یہاں ملتے تھے مگر اب اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اگر اشک دنیائے ادب میں یاد کئے جائیں گے تو اپنی طنزیہ شاعری کے لئے ان کی طنزیہ شاعری میں وسعت و گہرائی ہے "مجھے تسلیم کرو" موصوف اور ڈرامہ اچھی طنزیہ نظمیں ہیں اور اردو شاعری میں افسانے کا درجہ رکھتی ہیں اور اردو شاعری میں افسانے کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح ان کی غزل کے بیشتر اشعار انتخاب ادب میں اپنی خوبیوں کی بنا پر برابر جگہ پائیں گے۔ احسن احمد اشک کی شاعری کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس میں یگانہ، شاد عارفی اور شاد کا اثر کافی نمایاں ہے۔

احسن احمد اشک کے ساتھ ہی محبوب خزاں کا نام آتا ہے، مشرقی پاکستان ذرا دیر میں آئے مگر بہت جلد اس مرکز ادب کے روح رواں بن گئے۔ خزاں نئی نسل کے ان چند بڑے شعراء میں ہیں جن کی اپنی آواز ہے اپنا لب و لہجہ ہے اور ایک منفرد رنگ ہے، شدت احساس شاید خزاں کے یہاں اس دور میں ناصر کاظمی کے بعد سب سے زیادہ ہے، انکے کلام میں ایک طرح کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے مگر ایسی تشنگی جس میں مد کی دھیمی دھیمی آگ کا گمان ہوتا ہے، انکی شاعری کانپتی ہوئی روح اور کھرچتے ہوئے جسم کی پکار ہے۔ اکیلی بستیاں، چاند کے مسافر، فروری، تمہاری قسمت میں جھوٹ ہے، رات اور دن، انکی کامیاب نظمیں ہیں۔ مگر خزاں کے یہاں ایک بات شدت سے کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک طرح کی 'رکن' کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ کھل کر کہنا چاہتے ہوں مگر کہہ نہیں پاتے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک انکی نظموں میں ابہام ہوتا ہے لیکن خزاں کا حسنِ بیان انکی دکھ بھری لے انکی والہانہ سرمستی یہ سب وہ خصوصیات ہیں جو ان کی شاعری کے بعض کمزور پہلو کو نمایاں نہیں ہونے دیتے، خزاں ابھی عمر کی اس منزل پر ہیں جہاں ترقی کی گنجائش ممکن ہے، ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جلد اپنی چھوٹی کمزوریوں پر قدرت پالیں گے۔ آج مشرقی پاکستان کے شاید بیشتر نوجوان ادیبوں پر خزاں کا اثر ہے۔ ان کے رنگ میں نظمیں اور غزلیں کہی گئی ہیں، ان کے انداز بیاں کو لوگوں نے اپنایا ہے، حد تو یہ ہے کہ ان کے مصرعے افسانوں کے اب عنوان بننے لگے ہیں۔

جنوں سے کھیلتے ہیں آگہی سے کھیلتے ہیں
یہاں تو اہل سخن آدمی سے کھیلتے ہیں

اے ستارو کسے پکارتے ہو،
اس خرابے میں کوئی زندہ نہیں

اب یاد کبھی آئے تو آئینے سے پوچھو
محبوب خزاں شام کو گھر کیوں نہیں جاتے

محبت کو گلے کا ہار بھی کرتے نہیں بنتا
کچھ ایسی بات ہے انکار بھی کرتے نہیں بنتا

کیوں نہ ہو مجھ سے شکایت تمہیں اے ہوکہ پھر
اسے جلتا بھی نہ چھوڑو جسے دیوانہ کرو

چاہا تھی دل نے تجھ سے وفا کم بہت ہی کم
شاید اسی لئے ہے گلا کم بہت ہی کم

آنکھ جب اٹھے بھر آئے شعر اپنا نہ چلے
کیسے بھول جائیے بھولنے کی بات کو

آدھی جوانی روتے گذری ہے
ڈھونڈھ رہا تھا بچپن تجھ کو ہے

بے رنگ ہے حکایت خون جگر خزاں
خون جگر سے رنگ کی قیمت نہ دیجئے

عطاالرحمن جمیل کی شاعری مشرقی بنگال کی فضا میں پروان چڑھی ہے۔ اس لئے اس میں بنگال کا رس ہے۔ اس کا البیلا جادو اسکی مدھ بھری لے ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ایک سرمستی کی کیفیت ہے کہہ سکتے ہیں ان کی نظموں میں تغزل اور ان کی غزلوں سے

[1] ۱۸ فروری کو اپنے آبائی وطن پٹنہ میں انکا انتقال ہوگیا افسوس! ــ "ساقی"

زیادہ ہے۔

جمیل کی آواز بھی دردبھری ہے۔ تشنگی کا احساس انکے یہاں بھی ہے، غم کی دھیمی دھیمی آنچ ان کے یہاں بھی ہمیں ملتی ہے، قدرت نے جمیل کو فطری شاعرانہ صلاحیت عطا کی ہے، وہ گداز دل لے کر آئے ہیں، ان کے اشعار چاہے وہ نظم کے ہوں یا غزل کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ لوگوں کے دلوں پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

مگر جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی طرح ان کی طبیعت میں بھی بے نیازی ہے کہنا چاہیے اعتکاف ہے، انہیں بھی گوشہ گیری پسند ہے۔ کاش جمیل اپنی پوری توجہ صنفِ شاعری کی طرف کر سکتے۔

یہ دُنیا ہے یہاں ہر آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے۔
کہیں چھپتے پھرو آخر زمانہ ڈھونڈھ ہی لیتا

اتنا نہ بنو صاحبِ ادراک بہت ہیں
آہستہ چلو لوگ تہِ خاک بہت ہیں
مانا کہ ستاتے ہیں سرِ افلاک بہت ہیں
ہم کو بھی ہمارے خس و خاشاک بہت ہیں

آنیوالی آنکھیں جھکتی جانیوالی جا بھی چکی
ویسے تو ہر جانیوالی رات بھی آنیوالی رات
پہلے پتوں کو کبھی شاخوں کو کبھی تو اکثر چمکا چکی
مجھ سے ملنے کبھی نہ آئی تیری نازک پالی رات

اس تیرگی میں جانے کہاں کون چھوٹ جائے
مجھ سے نہ دُور جاؤ قیامت کی رات ہے

سہمی سہمی سوچ کا طائر
گہری نیند میں سوجاتا ہے
جبکہ تو ہے ہی جان کا دشمن
چپکے چپکے در آتا ہے،

نظیر صدیقی کی شاعری بھی مشرقی پاکستان میں پروان چڑھی مگر ان کے یہاں پورب کی فضا کا کوئی اثر نہیں ملتا۔ نظیر کی شاعری کی جڑیں کلاسیکل اسکول سے وابستہ ہیں۔ حسرت کا درد اور فانی کی یاسیت ان کے یہاں بھی ہے مگر اپنے انداز میں، یہ عجیب بات ہے کہ ڈھاکہ شہر والی سے قریب رہ کر بھی ان کی آزاد طبیعت نے ان کا اثر قبول نہ کیا اور یہی نہیں بلکہ نظیر کے کلام میں مشکل ہی سے کسی دوسرے شعراء کا اثر ملتا ہے۔

نظیر کا دل بھی دُکھا ہوا ہے، انہوں نے زمانے کے ہاتھوں بہت دُکھ سہے ہیں، ان کی زندگی میں شاید سکون کے لمحات بھی بہت ہی کم آئے ہیں۔ چنانچہ پے بہ پے صدموں سے ان کے لب و لہجہ میں طنزیہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

دِل اُداس رہتا ہے جی نڈھال رہتا ہے
حال پوچھنے والے اب یہ حال رہتا ہے

امید دل کے چراغ ایک ایک کر کے بجھ گئے آخر
مگر یہ کیا کہ بزمِ آرزو برہم نہیں ہوتی

ہوس کی پیاس بجھی دل کی تشنگی ہے وہی
سکونِ جاں سے تہی میری زندگی ہے وہی

کسی دل میں میرے لئے پیار کیوں ہو
یہ پندار ہے اور یہ ایثار کیوں ہو

یہ انسان خدا کا ہے شہکار
اس کی قسمت پہ ہے خدا کی مار

یہ کلام سن کے جو خاموش ہیں نظیر
ان کا گلہ نہ کیجئے ہیں اہلِ نظر وہ لوگ

اقبال عظیم، مبارک مونگیری، افسر ماہ پوری، مہر دربار ہنگوی اور وقف ملتی بھی مشرقی پاکستان کے اچھے شعراء میں ہیں۔ اقبال عظیم اور مہر دربار ہنگوی عرصے سے کہتے ہیں۔ اقبال عظیم کو الفاظ کے خوبصورت استعمال میں کافی ملکہ ہے۔ ان کی غزلیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں فکر کی پرچھائیاں ملتی ہیں، مہر مشرقی پاکستان میں پہلے، دورِ جگر کے نمائندہ اور اب ان کی یادگار ہیں۔ مگر وہ ابھی اس طرز میں بھی مجروح سلطان پوری اور بعض دوسرے پیروانِ جگر سے پیچھے ہیں۔

افسر ماہ پوری نہایت ہی سادگی مگر خوبصورتی کے ساتھ واردات قلب کو بیان کرتے ہیں، انہوں نے بعض چونکا دینے والے اشعار کہے ہیں، انہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کاش افسر شاعری کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرتے۔ شاید ان کے یہاں بھی وہ اعتکاف والی بات ہے

مبارک مونگیری کہنہ مشق شاعر ہیں۔ مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کر چکے ہیں، ان کی نیم طنزیہ نظمیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ انہوں نے ہجویں بھی اچھی تعداد میں کہیں ہیں اور شاید مشرقی پاکستان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

واقف ملکی اچھے نظم گو ہیں، ویسے انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، غزلوں میں ان کے یہاں سہلِ ممتنع کی اچھی مثالیں مل جائیں گی، زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے، کہہ سکتے ہیں کہ واقف اپنے اندر ایک اچھے نظم گو شاعر کی صلاحیت رکھتے ہیں،

میں نے اپنے مضمون "اردو شاعری تقسیم کے بعد" (ساقی اکتوبر ۱۹۶۰ء) میں کہا تھا کہ میراجی، راشد اور فیض نے نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، چنانچہ اس اثر سے مشرقی پاکستان کے بعض شعراء بھی نہیں بچ سکے۔ انسر پیامی۔ اظہر قادری۔ صلاح الدین محمد اور ادیب سہیل کو ترقی پسند قسم کے شعراء میں شمار کیا جاتا ہے، انسر پیامی، اظہر قادری فیض سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اتنے کہ کسی زمانے میں یہ لوگ بھی "لال سویرا" دیکھنے کے آرزومند تھے، پتہ نہیں اب کیا حال ہے، انسر پیامی تو کافی دنوں سے خاموش ہیں۔ ویسے اظہر قادری رُوٹھ کر تنقید کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

صلاح الدین محمد پہلے نظم گو کی حیثیت سے مشہور تھے اب غزلیں بھی کہتے ہیں۔ تہہ دار حیدری، میراجی اور فیض کے اثرات ان کے یہاں بغیر ڈھونڈھے مل جائیں گے، صلاح الدین محمد میں شاعرانہ صلاحیت ہے مگر وہ اس سے کام نہیں لیتے، اگر وہ اپنا منفرد رنگ بنا سکیں اور سنجیدگی کے ساتھ فن شاعری پر توجہ دے سکیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ اردو شاعروں کو کچھ اچھی نظمیں دے سکیں گے، ویسے موجودہ صورت میں وہ غزل میں نظم سے بہتر طور پر مفہوم کو ادا کر پاتے ہیں۔

جو رو پڑے تو گلہ ہنس پڑے تو گستاخی
تراش لیتے ہیں صاحب نظر بہانہ کوئی
یہ مشق جور ہے یا رسم عاشقانہ کوئی
خطا کسی سے ہوئی بن گیا نشانہ کوئی

ادیب سہیل نے مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے مگر ابھی پختگی کسی ایک میں بھی نہیں آئی ہے۔ وہ طویل نظمیں لکھتے ہیں جس سے اکثر بندوں میں ربط قائم نہیں رہتا۔ الفاظ کے استعمال میں بھی وہ کچھ زیادہ محتاط نہیں۔ ثقیل اور بارعب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر ادیب سہیل اپنی ان کمزوریوں پر قدرت پالیں تو شاید اچھی اور کامیاب نظمیں کہہ سکیں۔

ان شعراء سے ذرا ہٹ کر نوشاد نوری کا نام آتا ہے۔ نوشاد صرف نظمیں کہتے ہیں۔ وہ راشد کے مداح ہی نہیں بلکہ ان کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی میراجی کی طرف بھی رجوع ہو جاتے ہیں۔ مگر نوشاد کی ایک نمایاں خصوصیت بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنا بھی ایک منفرد رنگ رکھتے ہیں اور اسے کبھی ختم نہیں ہونے دیتے۔ نوشاد ہندی کے الفاظ بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ انہیں منظر نگاری کی صلاحیت غضب کی ہے۔ ان کے پاس کئی کامیاب نظمیں ہیں مگر انہیں اپنے فن کا صحیح اندازہ نہیں ہے، شاید مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ زیادتی وہاں کے نقادوں نے نوشاد کے ساتھ کی ہے،

مشرقی پاکستان میں ایک گروپ پرانے شعراء کا ہے۔ جنہیں اساتذہ ہونے کی مقبولیت حاصل ہے، ناہر فریدی، تمنا عمادی، حافظ رحمت، خواجہ عادل اور عطا آصفی اس گروپ کی نمایاں ہستیوں میں ہیں۔ زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ ان کے یہاں استادانہ رنگ ہے۔ انیس الاسلام ثمر تی اور عابد دانا پوری کی شخصیتیں مشرقی پاکستان میں کافی نمایاں ہیں۔ ثمر تی پر قطعہ تاریخ کا کہنا غالباً ختم ہے شاید حاضر جوابی میں ان کا کوئی ثانی نہیں، اسی طرح عابد دانا پوری سخت سے سخت زمین میں شعر کہہ ڈالتے ہیں اور تعریف یہ ہے کہ اکثر اشعار بہت ساری خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں۔

عتیق بزمی، اختر لکھنوی، شاعر صدیقی، دلیل شاہد، نعیم صہبا رومانی نظمیں کہتے ہیں، یہ نئی تشبیہیں اور نئی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ ان شعراء کے یہاں ترقی کے امکانات ہیں بشرطیکہ وہ سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہوں۔

مشرقی پاکستان کے شعراء کو اس بات کا برابر غم رہا ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت کو ناقدین نے مناسب اہمیت نہیں دی اور ان

(بقیہ صفحہ ۳۹۵ پر)

اعجاز الحق قدوسی

بنگال میں اسلامی تصوف کی تاریخ

بنگال میں جب آخری ہندو سلطنت کے بعد اسلامی حکومت کا آفتاب طلوع ہوا، وہ سین خاندان کی حکومت ہے۔ سین خاندان کے راجہ تقریباً سو برس تک بنگال کے اکثر حصوں پر قابض رہے۔ اس خاندان کی سلطنت کا بانی سامنت سین تھا، جو ۱۰۹۵ء کے لگ بھگ دکن سے آکر راڑھ دیس کے کنارے کاسی پوری نامی بستی میں آباد ہوا۔ سامنت سین اور اس کا بیٹا ہیمنت سین معمولی درجے کے سردار تھے لیکن جس کے زمانے میں باقاعدہ اس خاندان کی سلطنت کی بنیاد پڑی وہ ہیمنت سین کا بیٹا وجے سین تھا جس نے ۱۰۹۵ء میں پال کے بعض علاقوں پر قبضہ کرکے اپنی حکومت کو وسیع کیا اور اپنے باسٹھ سالہ دور حکومت میں اس نے کلنگا اور اڑیسہ تک اپنا اثر و رسوخ قائم کیا۔ وجے سین کے بعد اس کا بیٹا بلال سین راجہ ہوا۔ اس نے ہندو مذہب کو بڑی تقویت دی۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کی ذات پات کی تقسیم جو تقریباً مٹ چکی تھی اس تقسیم کو از سر نو رائج کیا۔ بنگال کے قدیم شہر لکھنوتی کو جو اب ایک خرابہ ہے اپنا دار السلطنت بنایا۔

بلال سین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا لکھمن سین راجہ ہوا۔ اس نے نئی راجدھانی ندیا کو اپنا دار السلطنت بنایا۔

اسی کے زمانے میں ہندوؤں کی حکومت کی بساط سلطنت الٹی اور اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے اس ملک کی بنیاد رکھی۔

بنگال کا پہلا مسلم فاتح۔

بنگال کا پہلا مسلم فاتح اختیار الدین محمد بختیار خلجی وطن گرمسیر کے بڑے لوگوں میں تھا۔ محمد ابتداً سلطان معز الدین سام (شہاب الدین غوری) کے پاس غزنی آیا لیکن چونکہ وہ وجاہت ظاہری نہ رکھتا تھا شہاب الدین غوری نے اس کا معمولی وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ بددل ہو کر دہلی چلا آیا۔ لیکن یہاں بھی اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ سپہ سالار ہزبر الدین اتابک کے پاس بدایوں پہنچا۔ وہاں کچھ دن رہنے کے بعد اودھ آکر ملک حسام الدین اغلبک کا ملازم ہوا۔ یہیں اس نے گھوڑے اور ہتھیار فراہم کئے اور سلطان شہاب الدین غوری کے مفتوحہ علاقوں سہلت اور بھیلی میں مرزاپور کے قریب جاگیر حاصل کر لی، اور یہیں سے وہ منیر اور بہار پر دھاوے بول کر فتوحات حاصل کرتا رہا۔

اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانے میں غور و خراسان اور مرو کے کچھ لوگ ہندوستان آکر ادھر ادھر پریشان پھر رہے تھے۔ انہوں نے محمد بختیار کا شہرہ سنا، وہ سب اس کے گرد آکر جمع ہو گئے۔ محمد بن بختیار کو ان کے آنے سے بڑی مدد ملی، وہ اپنے اثر و رسوخ کو قوی کرتا رہا یہاں تک کہ اس کا شہرہ سلطان قطب الدین ایبک تک پہنچا۔ سلطان قطب الدین نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔

بہار اور منیر کی صوبہ داری:۔

ریاض السلاطین میں ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک نے اسے بہار اور منیر کی صوبہ داری کا فرمان دے کر اس طرف روانہ کیا، وہ دو ایک برس تک بہار اور منیر کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حملے کرتا رہا۔ آخر اس نے بہار کو فتح کر لینے کا عزم بالجزم کر لیا اور دو سو سوار لیکر اس نے مردانہ جنگ کر کے قلعہ بہار کو فتح کر لیا۔ یہاں کا راجہ اندمن پال بھاگ کر کہیں روپوش ہو گیا۔

صاحب طبقات ناصری کا بیان ہے کہ اس زمانے میں بہار

کے باشندے سرمنڈی برہمن تھے، بودھ مذہب کے راہب تھے، کہتے ہیں کہ بہار میں ہندوؤں کا ایک کتب خانہ تھا جو بختیار خلجی کے ہاتھ لگا بختیار خاں نے بعض لوگوں کو طلب کر کے ان کتابوں کے مطالب کی تحقیق چاہی لیکن چونکہ راہب قتل ہو چکے تھے اس لئے کوئی ان کے مطالب بیان کر سکا۔

بہار کی فتح کے بعد محمد بن بختیار خلجی فاتح و منصور ہو کر سلطان قطب الدین ایبک کے پاس واپس ہوا۔ ارکان دولت میں اس کے خلاف حسد پیدا ہوا۔ اس کو ہند وستان سے نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگے اور ایک روز انہوں نے متفقہ طور پر سلطان قطب الدین ایبک سے کہا کہ محمد بن بختیار اس قدر بہادر و شجاع ہے کہ ہاتھی کا مقابلہ کر سکتا ہے، بادشاہ نے متعجب ہو کر محمد بن بختیار خاں سے پوچھا وہ شرم و غیرت کی وجہ سے انکار نہ کر سکا اور سمجھ گیا کہ ان لوگوں کا مقصد اسے دربار سے نکلوانا ہے، چنانچہ ایک روز خاص و عام کو دربار میں جمع کیا گیا اور ایک مست ہاتھی سفید محل میں لایا گیا، مست ہاتھی کا مقابلہ شروع ہوا۔ محمد بن بختیار نے مقابل ہو کر ایک گرز اس زور سے مست ہاتھی کے مارا کہ وہ چنگھاڑتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا، اس کی بہادری پر ہر طرف سے نعرۂ تحسین بلند ہوئے، سلطان نے اسے خلعت سے نوازا اور حکم دیا کہ ہر ایک امیر بھی اسے انعام دے، اس نے وہ سارے انعامات بلکہ کچھ اپنے پاس سے اضافہ کر کے وہیں حاضرین میں تقسیم کر دیئے

سلطان نے اسی وقت اسکو بہار و لکھنوتی کی حکومت عطا کی، وہ پہلے سال بہار میں متصرف ہوا، پھر دوسرے سال ممالک بنگالہ کی طرف متوجہ ہوا، اس زمانے میں بنگال میں راجہ لکھمینہ (لکھمن سین) کی حکومت تھی، محمد بن بختیار نے ایک ہزار سواروں کیساتھ اس پر حملہ کیا، راجہ لکھمن سین اس کے خوف سے کامروپ بھاگ گیا، محمد بن بختیار نے بنگال پر قبضہ کر لیا، اور شہر لکھنوتی کو اپنا دارالسلطنت بنا کر سلطان قطب الدین کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر کے تمام علاقے میں مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں، سرائیں اور سڑکیں بنوائیں۔ اور اسلام کے فروغ اور اسکی اشاعت میں مصروف ہو گیا،

تبت پر چڑھائی :-

بنگال کے فتح کرنے کے چند سال بعد اس نے کوچ بہار کی راہ سے تبت پر چڑھائی کی لیکن وہ اس مہم میں ناکام ہو گیا اس کے دس ہزار ساتھیوں میں سے بمشکل سو سوا سو ساتھی زندہ واپس آئے۔

پہلے مسلم فاتح بنگال کی وفات :-

اس مہم کی ناکامی کے صدمے نے اسے بیمار ڈال دیا یہاں تک کہ بنگال کے اس پہلے مسلم فاتح نے ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء میں دیوکوٹ میں مرض دق میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

طبقات ناصری میں ہے کہ محمد بن بختیار کا ایک سردار علی مردان خلجی اس زمانہ میں جب کہ وہ دیوکوٹ میں بیمار تھا، اپنی جاگیر سے دیوکوٹ آیا، اور محمد بن بختیار کے مکان میں جہاں تین دن سے کوئی اسے دیکھنے نہ آیا تھا، داخل ہو کر اس کے منھ سے چادر اٹھائی، اور خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ محمد بن بختیار کا جنازہ بہار لاکر دفن کیا گیا، تاریخ مگدھ کے ایک ذیلی حاشیہ میں ہے کہ قصبہ بہار میں محلہ عماد پور سے پچھم و دکن کی جانب ایک کشادہ میدان میں گنبد نما عمارت ہے جس میں چند قبریں ہیں، بعض ذی علم مقامی، بزرگوں کی تحقیق میں محمد بن بختیار انہیں قبروں میں سے ایک قبر میں مدفون ہے، اس محلہ کو نصیر پورہ بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ محمد بن بختیار نے بنگال میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس سے بہت پہلے مسلم صوفیائے کرام اپنی تبلیغ سے بنگال میں اسلام کا چراغ روشن کر چکے تھے۔ بنگال کے مشہور محقق ڈاکٹر انعام الحق پروفیسر راج شاہی یونیورسٹی نے اپنی کتاب "مسلم بنگالی ادب" میں اس دور کے جن صوفیا کے نام لکھے ہیں ان میں میر سید سلطان محمود ماہی سوار (۴۳۹ھ / ۱۰۴۷ء) شاہ محمد سلطان رومی (۴۴۵ھ / ۱۰۵۳ء) بابا آدم شہید (۵۱۹ھ / ۱۱۱۹ء) اور شاہ نعمت اللہ بت شکن خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں جو اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے بنگال میں تبلیغ اسلام میں مصروف تھے،

ڈاکٹر انعام الحق کے دیئے ہوئے ان ناموں کی فہرست سے یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ مسلم فاتحین سے پہلے بنگال میں مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام تشریف لا چکے تھے اور انہیں کی خانقاہوں سے سب سے پہلے تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام شروع ہوا۔ انہیں صوفیائے کرام نے بنگال میں سب سے پہلے مسلم معاشرے کی تعمیر کی اور انہیں کی بلندیٔ کردار اور روحانی تعلیمات نے اس ملک میں مسلم فاتحین کے لئے راہیں ہموار کیں۔

پہلے مسلم فاتح محمد بن بختیار کے بعد بنگال کی حکومت کا تعلق ہندوستان سے ہوگیا لیکن پھر بھی شمالی بنگال کی فتح کے بعد لکھنوتی کے جانشین مشرقی بنگال میں وکرم پور میں تقریباً ایک صدی تک ایک چھوٹی سی سیاست پر قابض رہے مگر ۱۲۰۲ء (۵۹۸ھ) سے ۱۳۳۸ء (۷۳۸ھ) تک بنگال میں مسلمانوں کی حکومت پھیلتی اور مضبوط ہوتی رہی اور محمد بن بختیار کے بعد ۱۳۳۸ء (۷۳۹ھ) میں فخرالدین۔ سلطان فخرالدین کے لقب سے بنگال پر متصرف ہوا۔ اور سنارگاؤں کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ادھر علی مبارک نے جو قدر خاں کے لشکر کا بخشی تھا علاءالدین کے خطاب سے بنگال کے ایک حصے کی حکومت سنبھال لی اور لکھنوتی کو اپنا دار الحکومت بنایا۔

اسی نواح میں ملک حاجی الیاس رہتا تھا جس نے سلطان علاءالدین کے لشکر کو اپنے ساتھ متفق کر کے سلطان علاءالدین کو قتل کر دیا اور لکھنوتی و بنگال پر قابض ہوگیا امراء نے اسکو سلطان شمس الدین بھنگرا کا خطاب دیا۔ یہ تیرا سال اور کچھ ماہ بنگال پر حکومت کرتا رہا یہاں تک کہ ۱۳۵۳ء (۷۵۴ھ) میں سلطان فیروز شاہ نے دہلی سے آکر اس پر حملہ کیا وہ قلعۂ اکالہ میں قلعہ بند ہوگیا۔ برسات کے موسم کی وجہ سے فیروز شاہ دہلی واپس ہوگیا۔ سلطان شمس الدین نے صلح میں خیر دیکھ کر بہت سے تحائف سلطان فیروز شاہ کو دہلی بھجوائے ۱۳۵۷ء (۷۵۹ھ) میں سلطان شمس الدین بھنگڑہ نے وفات پائی۔

سلطان شمس الدین بھنگڑہ کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ تخت پر بیٹھا ۷۶۰ھ میں پھر فیروز شاہ نے بنگالہ پر لشکر کشی کی اور لکھنوتی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح قلعۂ اکالہ میں متحصن ہوگیا۔ آخر بھاری پیش کش پیش کر کے صلح کی۔ سکندر شاہ نے نو سال اور نو ماہ حکومت کر کے وفات پائی۔

سکندر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے ۱۳۷۵ء (۷۷۵ھ) میں وفات پائی۔

سکندر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان السلاطین کے خطاب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۳۸۲ء (۷۸۵ھ) میں وفات پائی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا شمس الدین ثانی تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس نے ۷۸۸ھ میں وفات پائی اس کی وفات کے بعد اچانک راجا کنس نے (راجا گنیش) جو ایک ہندو راجہ تھا بنگال پر قبضہ کر لیا اور سات برس کی حکومت کے بعد اس نے عدم کی راہ لی۔

راجہ کنس کے بعد اس کا بیٹا جو مسلمان ہو چکا تھا جلال الدین کے لقب سے تخت آرائے سلطنت ہوا۔ اور سترہ برس کی حکومت کے بعد ۱۴۰۹ء (۸۱۲ھ) میں راہیِ عالم جاوداں ہوا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان احمد نے اس ملک کی داراثی حاصل کی۔ آخر ۱۴۲۶ء (۸۲۶ھ) میں اس نے وفات پائی۔

سلطان احمد کی وفات کے بعد اس کے ایک غلام ناصرالدین نے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ یہ چند روز بھی حکومت نہ کرنے پایا تھا کہ امرائے سلطنت نے اسے معزول کر کے سلطان شمس الدین بھنگڑہ کی اولاد میں سے ایک شہزادے کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ اس شہزادے نے سلطان ناصر شاہ کے لقب سے حکومت کی اس نے بیس برس حکومت کر کے ۱۴۵۷ء (۸۶۲ھ) میں وفات پائی۔

ناصر شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے باربک شاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ۱۴۷۴ء (۸۷۹ھ) میں اس نے بھی وفات پائی۔

باربک شاہ کے بعد اس کا بیٹا یوسف شاہ تخت بنگال کی زینت بنا جو عدل اور انصاف کا دلدادہ اور علم و فضل سے آراستہ تھا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سختی سے پابند تھا علماء اس کے دربار کی زینت تھے وہ علماء سے کہا کرتا تھا اگر تم مہمات شرعی میں کسی کی نا جائز جانب داری کرو گے تو قیامت کے دن تم پر معافی نہ رہے گی۔ اس نیک دل بادشاہ نے ۱۴۸۱ء (۸۸۶ھ) میں وفات پائی۔

اس کی وفات کے بعد امراء نے اس کے بیٹے یوسف شاہ

کو تختِ سلطنت پر بٹھایا لیکن چند دن بعد ہی اسے معزول کرکے فتح شاہ کو بنگال کے تختِ سلطنت پر متمکن کیا۔ سات سال اور کچھ ماہ کی حکومت کے بعد ۸۹۲ھ ۱۴۸۷ء میں اُسے ایک خواجہ سرا نے قتل کر دیا اور خود باربک شاہ کے لقب سے تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔

اس کے بعد ملک اندیل حبشی نے اسکو قتل کرکے تختِ بنگال پر فیروز شاہ کے لقب سے قبضہ جمایا ۸۹۹ھ ۱۴۹۳ء میں اس نے جان آفریں کے سپرد کی۔ فیروز شاہ کی وفات کے بعد سلطان محمود شاہ تختِ سلطنت بنگال پر بیٹھا جسے سیدی بدر حبشی نے قتل کرکے مظفر شاہ کے لقب سے تختِ سلطنت پر قبضہ جمایا۔

اسکی وفات کے بعد شریف مکی علاء الدین کے لقب سے بنگال کے تختِ سلطنت پر بیٹھا اس نے ۹۲۷ھ ۱۵۲۰ء میں وفات پائی۔ اسکے بعد اس کا بیٹا نصیب شاہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس کے زمانے میں سلطان ابراہیم لودھی کا بھائی سلطان محمود بنگال میں آیا۔ نصیب شاہ اس کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آیا۔ اور سلطان ابراہیم لودھی کی بیٹی جو اس کے ساتھ آئی تھی اس سے عقد کر لیا۔ ۹۲۵ھ میں جب بابر جون پور آ کر بنگال کے فتح کرنے کا ارادہ کیا تو نصیب شاہ نے بہت سے تحائف بھیج کر صلح کی درخواست پیش کی۔ بابر واپس ہو گیا ۹۴۳ھ ۱۵۳۶ء میں نصیب شاہ نے وفات پائی اور اس کے امراء میں سے سلطان محمود بنگالی نے تختِ سلطنت پر قبضہ کر لیا آخر جب شیر شاہ سوری کی حکومت کا چراغ روشن ہوا تو اس نے سلطان محمود بنگالی کو بھگا کر محمد خاں کو اس ملک کا حاکم مقرر کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیم خاں سلطان بہادر کے لقب سے بنگال کے تخت پر بیٹھا لیکن اس نے سوری سلطان سلیم شاہ کی مخالفت کی سلیم شاہ نے سلیمان کرانی کو اس کی جگہ بنگال کا حاکم مقرر کیا۔

سلیم شاہ کی وفات کے بعد سلیمان کرانی بنگال و بہار کا مستقل حاکم ہو گیا اور اس نے اڑیسہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس اکبر سے بھی تعلقات اچھے رکھے اس نے ۹۸۱ھ ۱۵۷۳ء میں وفات پائی پھر اس کا بیٹا بایزید افغان مسندِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ ایک مہینے کے بعد وہ اپنے چچا زاد بھائی ہانسو کے ہاتھ سے مارا گیا، بایزید کے بعد داؤد خاں افغان حاکم بنگالہ ہوا۔ یہ بنگال کا مستقل آخری بادشاہ تھا اسی کے زمانے میں بنگال مغل بادشاہ اکبر کی قلمرو میں شامل ہوا اور بنگال کی مستقل حکومت ختم ہوئی۔

یہ تھی بنگال کی مستقل اسلامی حکومت کی داستان، جس کے قیام کے لئے صوفیائے کرام نے اپنی تبلیغ اور جہاد سے راہیں ہموار کی تھیں۔

اُردو شاعری (سلسلہ صفحہ ۳۸۱)

کے ساتھ مناسب انصاف نہیں کیا، یہ بات بہت کچھ صحیح ہے، شادانی شرر، آصف، فہمی، اشک، خزاں، جمیل۔ نظیر، اقبال عظیم، مبارک اور فطرت واسطی اس دور کے بہت سے شعراء سے بہتر ہوتے ہوئے بھی اب تک ناقدین کی توجہ کے محتاج ہیں اور ان سے بدرجہا کمتر ین ناقدین کی دوستی کے سبب آج صفِ اول کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں اور بیشتر رسالوں میں انکے نام سرِ فہرست نظر آتے ہیں لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ انصاف پسند نقادان شعراء کی طرف بھی متوجہ ہوں اور حق پسندی کا ثبوت دیں۔

مگر مشرقی پاکستان کے شعراء کے سلسلے میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ وہ حیثیت بنانے سے پہلے حیثیت منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور شاید ادب میں کوئی شورٹ کٹ راستہ نہیں ہے وقتی شور اور ہنگامے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بغیر ریاضت کیئے ہوئے پختگی ناممکن ہے، ناتوجہی کی شکایت کچھ تو صحیح ہے مگر یہ شکایت ہر کسی کو مناسب نہیں۔

بنگال میں رہ کر ان کی شاعری ٹیگور اور نذر الاسلام سے کچھ نہ سیکھ سکی۔ وہ پوربی گیتوں نہوا، روپا اور بھاویا کی رس بھری لے سے "حسن اور شعریت اور گہرائی نچوڑ نہ سکے" اور جب تک ان کی شاعری بنگال کی فضا سے ہٹ کر سانس لیگی ترقی کی گنجائش ممکن نہیں۔

ترجمہ:۔ احمد زین الدین

"منی پوری؛ ایک دلکش قبیلہ"

منی پور تری پورا کے شمالی مشرقی پہاڑی گوشے میں واقع ہے۔ کوئی ۱۸ لاکھ بیگھے زمین پر یہاں ایک قبیلہ آباد تھا جس کو بعد میں منی پور کی نسبت سے "منی پوری" کہا جانے لگا۔ کہتے ہیں کہ ان کے اجداد کا تعلق مشہور ہندو راجہ ارجن کی بیوی چترانگدا کے ذریعہ مہا بھارت کی روایات سے جا ملتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر یہ لوگ منی پور چھوڑ کر مختلف جگہوں پر جا کر آباد ہو گئے۔ ان کی رگوں میں گرچہ چھتری خون رواں دواں ہے مگر اس کے باوجود یہ لوگ بڑے امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کرشن، ارجن کا بڑا دوست تھا، اسی تعلق سے یہ لوگ کرشن جی کے پجاری ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس قسم کی عبادت کی ابتدا منی پور کے راجہ ببرو بہان نے کی تھی، ببرو بہان ارجن کا بیٹا تھا۔ چنانچہ پورن ماشی کے موقع پر آج بھی "جھولن جاترا" ان کا سب سے بڑا تہوار مانا جاتا ہے۔ منی پور میں دوسرے مذاہب بھی تھے مگر ان میں سے کچھ اسلام کے بھی ماننے والے تھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں ان کی کل آبادی ۲۸۴۳۶۵ تھی۔

منی پوری زبان بہت ہی شیریں ہوتی ہے اس میں ناگری، آسامی، سنسکرت اور برمی زبانوں کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ مثلاً "لاؤ نانی" یعنی "آؤ بیٹھئے"۔ "بسنگ پر تیے" یعنی "پانی دیجئے"۔ "چکچھا را با" یعنی "کیا آپ نے چاول کھا لیا ہے" وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی زبان برما و آسام کی زبانوں سے بنگالی زبان کی نسبت زیادہ قریب ہے مگر ہاں! ان دنوں وہ بڑی تیزی سے بنگالی زبان سیکھ رہے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے سلہٹ کی بولی بول لیتے ہیں۔

جہاں تک نسل کا تعلق ہے ان کی رگوں میں ملایائی اور منگولی خون ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مدت تک یہ لوگ پہاڑی قبائل کی طرح رہتے سہتے تھے۔ منی پوریوں کی ایک تہائی (⅓) آبادی مسلمان ہے لیکن مقامی مسلمان انہیں نیچ سمجھتے ہیں چنانچہ آپس میں بیاہ شادی نہیں کرتے۔ ہندو منی پوریوں کی تین ذاتیں ہوتی ہیں (۱) برہمن۔ (۲) کھتری (۳) بی شا۔ یہ ذاتیں آپس میں شادی بیاہ نہیں کر سکتی ہیں۔ منی پوری اپنی روایات کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ باہر کے لوگ اگر ان کی عورتوں یا لڑکیوں سے تعلقات پیدا کر لیتے ہیں یا عشق و محبت کرتے ہیں تو وہ بہت خفا ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے وہ اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔ مرد نسبتاً آرام طلب ہوتے ہیں لیکن عورتیں بڑی جفاکش اور محنتی ہوتی ہیں۔ گھر باہر کے تمام کام خود کرتی ہیں۔ شام کو مرد عورت "کیرتن" کے لئے (ہری مندپ) عبادت خانہ جاتے ہیں۔

منی پوری کے مرد عورت بڑے ہی چست چالاک اور محنتی ہوتے ہیں، تقریباً تمام منی پوری گھروں میں ہاتھ کے کام کئے جاتے ہیں، بیکاری انہیں بالکل پسند نہیں۔ اپنے دوسرے کاموں سے فرصت پانے کے بعد بقیہ اوقات میں وہ مچھر دانی، جال، اور تھیلا وغیرہ کی بنائی کا کام کرتے ہیں۔ عورتیں طرح طرح کے کپڑے بنتی ہیں وہ ایک قسم کی چادر جسے "لباجنگ" کہتے ہیں خوب بنتی ہیں۔ اسی طرح ایک قسم کا کپڑا جسے

"کھیل" کہتے ہیں اچھا بنتی ہیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ منی پوری بڑے اچھے بڑھئی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سناری اور کچھ دستکاری کا بھی کام کرتے ہیں۔ وہ "تاڑ" کے پتّوں سے پنکھے اور لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں۔ وہ اچھے آرٹسٹ بھی ہوتے ہیں۔ مصوّری اور رقص و موسیقی سے بھی وہ اچھے پیسے کماتے ہیں۔ منی پوری اپنی فطرت کے لحاظ سے سبزی کے بڑے شائق ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ مچھلی بھی کھانے لگے ہیں مگر انڈا اور گوشت وہ کبھی نہیں کھاتے۔ عام طور پر ان کی غذا سادہ ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، دال، سبزی، رائی کا ساگ اور "بول مچھلی" وغیرہ ان کی پسندیدہ غذائیں ہیں۔

جہاں تک لباس کا تعلق ہے منی پوری دھوتی اور چادر پہنتے ہیں مگر تہوار اور تقریب کے موقعے پر صافہ باندھ لیتے ہیں۔ ان کی عورتوں کا لباس پہاڑی نسلوں سے ملتا جلتا ہے چنانچہ زیادہ تر عورتوں کا لباس تین رنگین کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جسے وہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتی ہیں۔ بن بیاہی لڑکیاں کھیس کا ایک کپڑا کمر سے نیچے تک پہنتی ہیں، سینے پر ایک سینہ بند باندھتی ہیں مگر شادی کے بعد سینہ بند نہیں باندھتیں۔ اسکی جگہ کھیس کا کپڑا کمر سے اوپر سینہ تک پہنا کرتی ہیں۔ سینہ بند ان کے ہاں نا کتخدائی کی نشانی ہے۔

ان کے زیور بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ مگر وہ سونے کے زیورات زیادہ تر پہنتی ہیں۔ یہ لوگ کھانے پینے کے برتنوں میں پیتل کا سامان استعمال کرتے ہیں اور صفائی کا یہ عالم ہے کہ ہر وقت ان کے برتن سونے کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ عورتیں بڑی نفاست پسند اور نازک طبع ہوتی ہیں، اُن کے کپڑے ہر وقت صاف ستھرے رہتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے سر کے بالوں میں خوبصورت پھول اور دیدہ زیب پرندوں کے پر سجاتی ہیں جن سے اُنکی خوبصورتی بڑی دل فریب اور دل کش ہو جاتی ہے۔

منی پوری ایک مکمل طبقے کی صورت میں رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کی ۲ ذاتیں سلہٹ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ سماجی علیحدگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً لالا بازار پولیس لائن کی بائیں جانب اونچے اونچے بانس کے درختوں کے بیچ سے ایک کچی سڑک ذرا آگے جا کر ہرے بھرے شاداب کھیتوں میں اُتر گئی ہے۔ کچھ فاصلے پر ٹیلے نظر آتے ہیں۔ دیکھئے تو ان ٹیلوں پر چھوٹے بڑے مکانات ہیں جن میں منی پوری رہتے ہیں۔ ایک نہر جو تاماکھیل کی پہاڑیوں سے نکلی ہے یہاں بہتی شور مچاتی گزر گئی ہے۔ دن کے بارہ ایک بجے اس نہر کے تیز چلتے ہوئے ٹھنڈے پانی میں پوری عورتیں اور لڑکیاں نہاتی ہیں۔ مرد درخت کاٹتے ہیں۔ یا نہر پر بیلوں کو ہانکتے ہیں بڑا حسین منظر ہوتا ہے دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔

ہر ذات کا اپنا الگ اجتماع ہوتا ہے جسے اُن کی زبان میں "منڈپ" کہتے ہیں اسی "منڈپ" میں وہ اپنے سماجی مذہبی فرائض، شادی بیاہ کی تقریب اور دوسرے متبرک کام کرتے ہیں۔ "جھولن جاترا"، "راتھا جاترا" جیسے بڑے تہوار کے موقع پر وہ اپنے منڈپ کو خوب سجاتے ہیں اور خوبصورت جوان لڑکیاں جنہیں ان کی زبان میں "لائیجابی" کہتے ہیں ناچ گانے میں خوب حصّہ لیتی ہیں۔ چنانچہ "پردا" "مادھوبی" اور بینودینی جیسی مشہور آرٹسٹ لڑکیاں ہیں۔ انہیں منی پوری لڑکیوں کے ناچ گانے برصغیر ہند و پاک میں بے حد مشہور ہیں اور منی پور کے یہی رقاص اور گلوکار سلہٹ کے آرٹ اور کلچر میں بڑا اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

کھیل کود کے معاملے میں بھی یہ لوگ دوسری قوموں سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ "کانگ جے" ان کا بڑا ہی مقبول اور پسندیدہ کھیل تھا۔ اس کھیل میں چودہ آدمی ٹٹو پر سوار ہو کر اس کھیل کو کھیلا کرتے۔ اُس زمانے میں اس قسم کا کوئی دوسرا کھیل کہیں بھی نہیں کھیلا جاتا تھا۔

انگریزوں نے یہ کھیل انہیں لوگوں سے سیکھا اور بعد میں اس کھیل کا نام پولو رکھ دیا۔ منی پور کے ٹٹو دیکھنے میں بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اُن کا قد تقریباً پچاس انچ ہوتا ہے اور غالباً یہ بھی سبب ہے کہ یہ ٹٹو ساری دُنیا میں مشہور ہیں لیکن اب وہ کھیل ماضی کی ایک داستان بن رہ گیا ہے کیونکہ اس کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ اسکے علاوہ آج بھی بیٹھ کر کھیلنے والا کھیل جسے اُن کی زبان میں "کھیلا" کہتے ہیں ان کے "منڈا" میں کھیلا جاتا ہے۔

منی پور کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی اُن کے لئے ایک مسئلہ بن گئی ہے اور ان کی اقتصادی حالت پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ زرخیز زمین کی تلاش میں باہر نکلے چھوٹے بڑے گروہ کی شکل میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور مختلف تھانوں میں جا بسے۔ تقریباً دو سو سال پہلے وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر روزی کی تلاش میں نکل پڑے تھے اور کچھار ضلع کے ایک گاؤں لشکندی میں آباد ہو گئے اور وہاں سے مختلف سمت میں منتشر ہو کر وہ لوگ مولوی بازار کے آس پاس کے علاقوں میں مثلاً بالو گاچھ، اُتر باغ، دکھن باغ، ادیتے پاڑا، لال دیگھیر پاڑا، مسیم پور اور دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا ایک گروہ ڈھاکے میں بھی آباد ہو گیا ہے اور یہ لوگ تیج گاؤں کے زراعتی فارم میں خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ دودھ گھی کی تجارت کرتے ہیں اور بڑی ہی آزادانہ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں چنانچہ انہیں کی مناسبت سے اس زراعتی فارم کا نام "منی پور فارم" پڑ گیا ہے۔

اس کے علاوہ وہ منی پوری جو بھانوگچھ نامی دیہات کی طرف تلاش معاش کی غرض سے گئے، وہ مستقل طور پر بہت ہی تھوڑے عرصے میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر آباد ہو گئے۔ اُن میں سے بیشتر کاشتکار ہیں لیکن وہ جو اطراف و جوانب میں رہتے ہیں محنت مزدوری کے ذریعہ اپنی روزی کماتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۳۹۰ پر)

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

اس زمانے میں جبکہ چاروں طرف مہنگائی بڑھتی چلی جا رہی ہے موت سستی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہم ایک صدمے سے سنبھلنے نہیں پاتے کہ ایک اور کچوکا لگ جاتا ہے۔ مارچ کا دوسرا ہفتہ شروع ہوا تھا کہ کسی اخبار میں دیکھا کہ ارشد کاکوی کا انتقال ہو گیا۔ یقین نہیں آیا۔ دوسرے دن ڈھاکہ سے ایک صاحب نے اطلاع دی کہ ارشد کاکوی سدھار گئے۔ انہیں خون کا کینسر ہو گیا تھا۔ ایسا کڑیل جوان اور یوں چٹ پٹ ہو جائے! حیف حیف!

قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے جن نوجوان ادیبوں نے واقعی کام کیا اور نام پیدا کیا اُن میں ارشد کاکوی کا نام سرفہرست تھا۔ وہ نثر اور نظم دونوں پر یکساں حاوی تھے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی جو مشرقی پاکستان میں اُردو کے سپہ سالار رہے، ارشد کاکوی ان کے لائق اور چہیتے شاگرد تھے۔ ڈھاکہ ہی میں اُردو کے لکچرار تھے۔ خوش ذوق ادیبوں کی اُنہوں نے ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی۔ ان کے دم سے ڈھاکہ کے اُردو حلقوں میں خوب رونق رہتی تھی۔ مرحوم نے اپنا ایک ادبی ماہنامہ ندیم بھی ڈھاکہ سے شائع کیا تھا جو کچھ عرصے بعد ناقدری کے ہاتھوں بند ہو گیا تھا۔ اسے دوبارہ جاری کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ بیمار رہنے لگے۔ ساقی کے مشرقی پاکستان نمبر کے لئے بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے مہینے اُنکا آخری خط آیا تھا کہ ذرا اچھا ہو جاؤں تو لکھوں گا۔ مگر کینسر نے انہیں سنبھلنے نہیں دیا اور ایک ذہین اور کام کرنیوالا ادیب ہم سے بچھڑ گیا۔ ع:-

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!

شاہد احمد دہلوی

[redacted]

ڈھاکے کے روزے

(ایک سیّاح کے قلم سے)

کہا جاتا ہے کہ جہاں ڈھاکہ اب آباد ہے وہاں پہلے ڈھاک کا ایک بڑا جنگل تھا۔ نیا شہر بنا تو وہ ڈھاکا کہلانے لگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے بننے والے شہر کا رقبہ کتنا ہو اس کے فیصلے کے لئے ڈھاکا یعنی ڈنکا بجایا گیا اور جہاں تک اُس ڈنکے کی آواز پہونچی وہاں تک شہر کو پھیلا دیا گیا، بہرحال وجہ تسمیہ کوئی بھی ہو ڈھاکہ ایک بہت شاندار ماضی اور دلکش اور پُرجلال تاریخ کا مالک ہے۔ یہاں گرمی چند روز ضرور سخت پڑتی ہے لیکن لُو کا نام نہیں اور صرف دو مہینے ایسے گزرتے ہیں جن میں بارش نہیں ہوتی اور پانی برسنے پر گرمی کی تیزی ختم ہو جاتی ہے۔ جاڑے کی بارش البتہ سردی کو چمکا دیتی ہے ورنہ عموماً سردی اتنی ہوتی ہے کہ رات ایک ہلکی رضائی میں بسر ہو جاتی ہے۔

پہلے بھی ڈھاکہ مشرقی بنگال کا دلآویز ترین شہر تھا، لیکن اب جب سے مشرقی پاکستان کا دارالسلطنت بنا ہے اپنی روز افزوں ہر قسم کی ترقیوں کی بدولت مشرقی بنگال کی ملکہ بن گیا ہے، ترقی کی رفتار کی تیزی کا یہ عالم ہے کہ وہ شخص بھی جو پانچ سال پہلے یہاں آیا تھا شہر کے نو آباد حصّوں میں پہونچ کے پہچان ہی نہیں سکتا کہ یہ وہی ڈھاکہ ہے۔ ۔۔کیں بہت کشادہ، نئی نئی کوٹھیاں دیدہ زیب اور رونق افروز اور اس اعتبار سے یہ شہر تو دُنیا کے تمام شہروں میں ممتاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں تقریباً ایک ہزار مسجدیں ہیں اور جتنا شہر بڑھتا جاتا ہے شاندار اور نئے اسٹائل کی مساجد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مساجد عموماً آباد اور بارونق ہیں اور بہت سے پیش نماز قاری اور خوش آواز بھی ہیں۔ دینی ذوق کی ایک سیاحِ مُسلم ضرور داد دیتے رہے گا ڈاڑھیاں بھی بہت نظر آئیں گی پردہ بھی پاکستان کے ہر شہر سے زیادہ، خانقاہیں بھی ہیں، مشائخ کرام بھی، شاندار مدارس اسلامیہ بھی اور مفتیانِ کرام بھی۔

اُردو کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ شہر میں اُردو میں شائع ہونے والے اخبارات کے علاوہ بکثرت مشاعرے بھی ہوا کرتے ہیں انجمن ترقی اُردو اپنی ذاتی شاندار بلڈنگ میں الگ مرکز ادب ہے اور اُس کی طرف سے جو شاندار سالانہ مشاعرہ ہوتا ہے وہ خود اپنی مثال ہے۔ مغربی پاکستان ہی سے نہیں ہندوستان سے مشہور اور خوش فکر شعرا آن کے اس میں شرکت کرتے ہیں اور مشہور عالم و شاعر مولانا تمنّا عمادی تو گویا یہاں کے "امام الشعراء" ہیں ان کے تلامذہ کے علاوہ بہت سے خوشگو شعرا بھی ڈھاکہ کے لئے سرمایۂ نازش ہیں۔ مگر شعر و شاعری کے یہ سب چرچے ماہ رمضان المبارک کے آتے ہی بند ہو جاتے ہیں۔

رمضان کا استقبال شبِ برات کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ مسالے کُٹنے لگتے ہیں۔ حقّے دُرست ہونے لگتے ہیں اور چونکہ یہاں ہفتے میں دو روز گوشت نہیں ملتا اس لئے خوش حال گھروں میں بریاں چیزیں شروع ہو جاتی ہیں اور بہت سے گھر میں اور مساجد میں تو عموماً صفائی شروع

ہوجاتی ہے۔ رمضان کے چاند کا اعلان توپ اور سائرن کی آوازت ہوتا ہے اور زیادہ تر مساجد میں تراویح شروع ہوجاتی ہے۔ عموماً سوا پارہ تراویح میں پڑھا جاتا ہے۔ شبینے بھی ہوتے ہیں جن میں متعدد حفاظ حصّہ لیتے ہیں۔ سچ ہے رمضان المبارک صحیح معنوں میں سایہ فگن ہوجاتا ہے۔ ہوٹل اور چائے خانے بند ہوجاتے ہیں اور ایک آدھ جو کھلے ہوتے ہیں ان پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ غایت احترام رمضان میں اس پردے کا نام ہی "احترام" ہے۔ کوئی مسافر اگر اس پردے کا خیال کئے بغیر دن کو ان دکانوں میں جاکے کھانے پینے کی کوئی چیز طلب کرے تو اُس سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے دیکھا نہیں "احترام" پڑا ہوا ہے۔ شراب کی دکانیں بفضل خدا یہاں قطعاً نظر نہیں آتیں لیکن جو ہوٹل پہلے شراب کو فراہم کردیتا تھا اب مسلمان طلب گار اُم الخبائث سے کہدیگا یہ مبارک مہینہ ہے۔ شہر میں کسی شاہراہ پر کوئی شخص سگریٹ نوشی کرتا ہوا نہیں پایا جائے گا۔ حد یہ ہے کہ غیر مسلم بھی بپاسِ خاطرِ مسلمین علانیہ سگریٹ نوشی سے عموماً احتراز کرتے ہیں، یوں ڈھاکہ اپنے حسنِ اخلاق کے لئے مشہور ہے اور عموماً کوئی آپکے گھر پر آئے تو آپ کچھ نہ کچھ اُس کی تواضع ضرور کریں گے لیکن اس ماہ مبارک میں اگر خود صاحب خانہ روزے سے نہیں ہے تو وہ خود بھی بیکر احترام رہے گا اور آنے والے کے سامنے بھی کچھ پیش نہ کریگا۔

افطار اور سحر کا اعلان یہاں سائرن کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اب تو سحر کے وقت ریڈیو کا بھی ایک مختصر مذہبی پروگرام ہوتا ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اگر آپ فون اکسچینج سے مثلاً تین بجے شب کو جگانے کے لئے کہدیں تو وہ تین بجے آپ کو فون ضرور کردے گا۔ ویسے جگانے والی ٹولیاں نظمیں پڑھتی ہوئی شہر کے مختلف حصّوں میں گشت کرتی رہتی ہیں۔ شام کو دکانیں گویا بیدار ہوجاتی ہیں اور عصر سے دکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ لگنا شروع ہوجاتی ہے۔

شہر کا ایک بازار ہے "چوک" اس کا نام ہے۔ یہ چوک اس مبارک مہینے میں "سوق الافطار" ہوجاتا ہے عصر کے بعد اس بازار میں ہر قسم کی ٹرافک بند کردی جاتی ہے اور دو رویہ سڑک پر افطاری، پکوان، مختلف قسم کے کبابوں اور میووں اور پھلوں کی دکانیں لگ جاتی ہیں اور اس بازار کی بدولت لوگ اپنے گھر والوں کو زحمت دئے بغیر اچھے اچھے پکوانوں اور کھانوں سے اپنے گھروں بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں۔

روزہ کشائیوں اور افطار پارٹیوں کا بہت رواج ہے اور ہر روزہ دار کوشش کرتا ہے کہ اپنے دوستوں کو دو ایک بار اپنے گھر پر افطار کرائے اور غریبوں کے ساتھ بقدرِ ہمت سلوک ہو۔ خیر و خیرات میں عام طور پر اس بابرکت مہینے میں نمایاں اضافہ ہوجاتا ہے۔ غرض یہاں کے روزے دیکھنے کی چیز ہیں۔

سنہ ۱۸۲۰ء میں برما نے منی پور پر حملہ کیا اور قابض ہوگیا۔ اُس زمانے میں گمبیر سنگھ منی پوریوں کا سردار تھا، وہ اپنے پانچ سو ساتھیوں کے ہمراہ سلہٹ چلا آیا، برطانوی حکومت نے اس کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ساتھ مالی امداد بھی کی، چنانچہ گمبیر سنگھ نے سلہٹ میں ایک محل تعمیر کروایا۔ مگر ۱۸۹۳ء کے مشہور زلزلے میں وہ محل بھی تباہ ہوگیا۔

ان ساری باتوں کے علاوہ منی پوری بڑے ہی قدامت پرست واقع ہوئے ہیں وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی نمایاں حیثیت، زندگی کے ہر موڑ پر قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ موجودہ تعلیم بھی ان کی زندگی میں بہت ہی کم تبدیلی پیدا کرسکی ہے۔!

نقش کراچی

ادبی ڈائجسٹ

نقش۔ ہر ماہ معیاری رسائل سے انتخاب پیش کرتا ہے۔

نقش۔ پاکستان میں اپنی قسم کا واحد ماہنامہ ہے۔

نقش۔ کو پاک و ہند کے تمام اچھے مُصنّفین کا تعاون حاصل ہے

نقش۔ کو پاک و ہند کے تمام معیاری رسائل کا تعاون حاصل ہے

نقش۔ کو ہر ماہ ہزاروں افراد پڑھتے ہیں۔

نقش۔ کا ایک افسانہ نمبر عنقریب شائع ہونیوالا ہے جسکے تمام افسانے غیر مطبوعہ ہونگے اور تمام اچھے افسانہ نگار حصّہ لیں گے ضخامت تقریباً پانچسو صفحات ہوگی۔

نقش۔ کی آپ مُستقل سالانہ خریداری منظور فرمائیں تو یہ افسانہ نمبر آپ کو سالانہ قیمت ہی میں پیش کیا جائے گا۔

اگر آپ خریدار بننا چاہتے ہیں تو آج ہی بارہ ۱۲ روپے منی آرڈر کے ذریعہ اس پتہ پر ارسال فرمائیے

منیجر کاشانۂ اُردو ۲/۱۱ اکبر روڈ صدر کراچی ۳

فون نمبر ۔۔ ۷۰۱۵۶

ا

رفیقِ تنہائی

پانچ معیاری ناول

تلاشِ بہاراں :- "تاریک راتوں کی سیاہی تاروں کی روشنی میں پگھل پگھل کر بہہ رہی تھی۔" اور جمیلہ زندگی کا پہلا باب لکھ رہی تھی جس کا نام "تلاشِ بہاراں" تھا۔ اپنی نوعیت اور خیا ایک گرانقدر ناول جس کا ہر کردار گھر ہو اور معاشرتی زندگی میں موجود ہے اور آپ جس کو جانتے ہیں۔ اس ناو کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے اور اس پر مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام ملا ہے۔ خوبصورت گرد پوش سے مزین قیمت

آگ اور برف

الطاف مہاس

قلب کی گہرائیوں میں دبی ہوئی چنگاری اور رگ و پے میں دوڑتی ہوئی محبت کی خنک لہروں کی تفسیر کا نام ہے "آگ اور برف"

وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا پھر بھی اس کے دامن دل میں چھپی ہوئی آتش خاموش کی لپک ہونٹوں تک پہونچتی تھی تو مسکراہٹ بن کر کھیلنے لگتی تھی۔

"الطاف مہاس" کا ایک نفسیاتی ناول جو سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر ضرب لگاتا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ خوبصورت گرد پوش۔ قیمت :- ۶ روپے ۵۰ پیسے

ماہِ درخشاں

کوئی اس کو زمین کا چاند کہتا، کوئی ...

کوئی مادر گیتی کے دل سے نکلی ہوئی دعا

وہ آدمی کا بچہ تھی۔ نک سک سے درست

ہوئے گندمی رنگ کی ایک لڑکی جس کو مقد

محبت کے بھنور میں پھنسا دیا تھا۔

ایک معاشرتی اور سبق آموز ناول جسکو بیگم

نہایت صاف ستھری زبان میں لکھا اور افسانوی دلچ

سماجی اصلاح کا مواد فراہم کیا۔ کتابت طباعت

قیمت :- ۷ روپے ۵۰ پیسے

شامِ اودھ

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

تاریخ کا ایک روشن عنوان ماضی کا ایک سنہرا باب تمدن کا ایک رنگین ورق اور معاشرے کی ایک دلچسپ داستان

ہندوپاک کے بالغ نظر نقاد اور بیباک ناول نگار ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے قلم سے یہ ناول نہ صرف لکھنؤ کے تاریخی پس منظر سے آشنا کراتا ہے بلکہ قاری کو ایک ایسے ماحول میں پہنچا دیتا ہے جہاں کی ہر شے حسن عشق درد و فراق کے تاثر میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ عمدہ کتابت طباعت اور خوبصورت گرد پوش قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

چھوئی موئی

ذکاوت حس اور سرعت اثر کسی نازک ...

شباب پر پہنچ جائے تو وہ "چھوئی موئی" بن ...

عصمت چغتائی کا یہ کردار زندگی کی ...

لطیف طنز ہے جو مختلف افسانوی کردار ...

اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت :- ۳ روپے۔

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی